وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ ۫ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (الحجر: ۲۲)

تفسیرِ کبیر

مصنفہ

حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد

خلیفۃ المسیح الثانی المصلح الموعود رضی اللہ عنہ

جلد نہم

سورۃ الفرقان، سورۃ الشعراء

تفسیرِ کبیر

از حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد

خلیفۃ المسیح الثانی المصلح الموعود رضی اللہ عنہ

(جلد نہم۔ مشتمل بر سورۃ الفرقان، سورۃ الشعراء)

Tafsir-e-Kabir **(The Grand Exegesis)**

by Hazrat Mirza Bashir-ud-Deen Mahmood Ahmad,
Khalifatul-Masih II, al-Muslih al-Mauood (1889-1965),
may Allah be pleased with him.
Volume 9
(Sūrah al-Furqān, ash-Shu'arā')

(Complete Set – Volumes 1-15)

First published in India and Pakistan between 1940-1962 (11 Volume Set)
Second edition printed in Pakistan and the UK between 1986-1994 (10 Volume Set)
Reprinted in Qadian, 2004 (5 Volume Set)
Reprinted in Qadian, 2010 (10 Volume Set)
Digitally typeset edition published in UK, 2023 (15 Volume Set)

Published by:
Islam International Publications Limited
Unit 3, Bourne Mill Business Park,
Guildford Road, Farnham, Surrey UK, GU9 9PS

Printed in the UK at:

For further information, please visit www.alislam.org

ISBN: 978-1-84880-274-2 (Set Vol. 1-15)
10 9 8 7 6 5 4 3 2 1

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم　　　　وعلیٰ عبدہ المسیح الموعود

پیش لفظ

اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ کے مامور حضرت اقدس مرزا غلام احمد قادیانی مسیح موعود و مہدی معہود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عظیم الشان رحمت کے نشان کے طور پر پسر موعود کی بشارت عطا فرمائی جو حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی المصلح الموعود رضی اللہ عنہ کے وجود میں پوری ہوئی اور کلمات الہامیہ آپ کے وجود مسعود میں جلوہ گر ہوئے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ 'اسے علوم ظاہری و باطنی سے پُر کیا جائے گا۔' قرآن مجید فرقانِ حمید کے وہ علوم و معارف بھی آپ کو سکھائے گئے جو اس سے پہلے منکشف نہ تھے۔ چنانچہ آپؓ نے تحریر فرمایا ہے کہ 'اس تفسیر کا بہت سا مضمون غور کا نتیجہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے۔' آپؓ نے قرآن کریم کی تفسیر تحریر فرمائی اور اس کے مطالب و معانی اور نکاتِ عجیبہ کو ظاہر و باطن میں پھر زندہ فرمادیا۔ یہ تصنیف لطیف موسوم بہ تفسیرِ کبیر اس مذکورہ بالا بشارت کی صداقت کا ایک زندہ ثبوت اور شاہد ناطق ہے اور لاریب قرآنی علوم و معارف کا ایک بیش بہا خزانہ ہے جو خدا تعالیٰ نے موجودہ زمانہ کی ضرورتوں کے موافق ظاہر فرمایا ہے۔

تفسیر کبیر کی پہلی جلد ۱۹۴۰ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ بعدہٗ مختلف وقتوں میں اس کی کل ۱۱ جلدیں شائع ہوئی تھیں۔

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اوائل خلافت میں ہی ارشاد فرمایا کہ تفسیر کبیر کی صد سالہ جوبلی کے تحت دوبارہ اشاعت کی جائے۔ چنانچہ اس کے پازیٹو بنوا کر گیارہ کی بجائے دس جلدوں میں شائع کیا گیا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے اس علمی خزینہ کی اشاعت کا تازہ ایڈیشن طبع کروانے کی ہدایت فرمائی ہے۔ پہلی طباعت کتابت ہو کر شائع ہوئی تھی اور باریک قلم سے لکھائی کی وجہ سے پڑھنے میں دقت محسوس ہوتی تھی۔ ہر صفحہ پر دو کالم تھے۔ چنانچہ یہ نیا ایڈیشن حسب ارشاد حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کمپوز کروایا گیا ہے، اس کا فونٹ سائز ۱۴ مقرر کیا گیا ہے اور دو کالموں کی بجائے عبارت کو ایک ہی سطر میں مسلسل کر دیا گیا ہے۔ نیز حضور انور کی ہدایت تھی کہ جلدوں کی ضخامت کو بھی متوازن اور ہلکا

رکھا جائے تا کہ پڑھتے ہوئے ہاتھوں میں پکڑ کر سنبھالنے میں دقت نہ ہو۔ اس ہدایت پر عملدرآمد کے نتیجہ میں تفسیر کبیر کی جلدوں کی تعداد دس سے بڑھ کر پندرہ ہوگئی ہے۔ اس وجہ سے حلِ لغات کے مقامات میں بھی ادل بدل کرنا پڑا ہے۔ علاوہ ازیں حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی ہدایت کے مطابق تفسیرِ کبیر عربی ایڈیشن کی طرز پر حوالہ جات کی تخریج کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں تفسیرِ کبیر عربی ترجمہ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ عربی عبارات بالخصوص حلِ لغات کے مواقع پر عربی عبارات جہاں اعراب کا اہتمام نہ تھا وہاں اعراب لگائے گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزانہ دعا ہے کہ اس تفسیر کی اشاعت کو 'دینِ اسلام کا شرف اور کلام اللہ کا مرتبہ لوگوں پر ظاہر کرنے کا موجب بنائے۔'

اس ترتیب وطباعت کے مختلف مراحل پر جن احباب کو خدمت قرآن کا موقع نصیب ہوا، ان کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کی توفیق میں برکت بخشے۔ آمین

خاکسار

منیر الدین شمس

ایڈیشنل وکیل التصنیف

اپریل ۲۰۲۳ء

سُوۡرَۃُ الۡفُرۡقَانِ مَكِّيَّةٌ

سورۃ فرقان۔ یہ سورۃ مکی ہے

وَهِيَ مَعَ الۡبَسۡمَلَةِ ثَمَانٍ وَّسَبۡعُوۡنَ اٰيَةً وَّسِتَّةُ رُكُوۡعَاتٍ

اور بسم اللہ سمیت اس کی اٹھتر (۷۸) آیات ہیں اور چھ (۶) رکوع ہیں۔ ۱؎

زمانۂ نزول ۱؎ یہ سورۃ اکثر مفسرین کے قول کے مطابق مکی ہے اور ہجرت سے پہلے نازل ہوئی ہے۔

تفسیر قرطبی میں لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ اور قتادہؒ کے نزدیک اس میں سے تین آیتیں مدنی ہیں اور وہ آیتیں وَ الَّذِيۡنَ لَا يَدۡعُوۡنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ سے لے کر وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا تک ہیں۔ یعنی آیات نمبر ۶۸، ۶۹، ۷۰ اور ہمارے نزدیک آیات نمبر ۶۹، ۷۰، ۷۱۔

جن لوگوں نے ان آیات کو مدنی قرار دیا ہے اُن کے اس قول کا موجب صرف اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ ان آیات میں قتل نفس اور بدکاری سے روکا گیا ہے اور ان لوگوں کا خیال ہے کہ چونکہ تمدن اور معاشرت اور سیاست کے متعلق تفصیلی ہدایات مدینہ منورہ میں ملی ہیں اس لئے یہ آیتیں مدنی ہیں مگر یہ کوئی دلیل نہیں۔ یہ تعلیم صحابہؓ کے اس وقت بھی زیر عمل تھی جب وہ مکہ میں رہتے تھے۔ صحابہؓ کا چال چلن اور اُن کا طریق صاف بتاتا ہے کہ یہ ہدایتیں اس وقت بھی اُن کے مدنظر رہتی تھیں۔ پس محض اس لئے کہ ان آیتوں میں قتل اور بدکاری سے روکا گیا ہے ان کو مدنی قرار دینا ہرگز معقول نہیں سمجھا جا سکتا۔

عیسائی مستشرقین نے بھی اس سورۃ کو مکی قرار دیا ہے لیکن اُن کے نزدیک یہ سورۃ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ کے بالکل ابتدائی وقت کی ہے۔ (کمنٹری آن دی قرآن مصنفہ ریورنڈ وہیری جلد ۳ ص ۲۰۷) مگر یہ بات بھی صحیح نہیں کیونکہ اُن کی بنیاد صرف اس خیال پر ہے کہ اس سورۃ میں کفار کی شدید مخالفت کا ذکر نہیں حالانکہ بعض مدنی سورتیں بھی ایسی ہیں جن میں کفار کا ذکر قریباً مفقود ہے۔ تو کیا ہم اس سے یہ نتیجہ نکالیں کہ مدینہ میں کفار کے ساتھ کوئی جنگ ہوئی ہی نہیں؟ مضمون کے لحاظ سے بھی یہ سورۃ مکی ہی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس میں خاص طور پر یہ امر بیان کیا گیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے مذہب کو قبول نہیں کریں گے جس کا مطلب یہ ہے کہ کفار سے جھگڑا شروع ہو چکا تھا (دیکھو آیت ۵۳) پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ پہلے دو تین سال کی نازل شدہ سورتوں میں سے یہ سورۃ ہے۔

بخاریؒ اور مسلمؒ کی روایت ہے اور مالکؒ اور شافعیؒ اور ابن حبانؒ اور بیہقیؒ نے بھی حضرت عمر ابن خطابؓ

سے روایت کی ہے کہ میں نے ایک دفعہ ہشام بن حکیم سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں سورۃ فرقان سنی۔ مگر وہ اس سورۃ کو اس طرح نہیں پڑھتے تھے جس طرح میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سورۃ سنی تھی۔ قریب تھا کہ میں نماز میں ہی اُن پر حملہ کر دیتا مگر میں نے صبر کیا۔ جب انہوں نے سلام پھیر دیا تو میں نے اُن کی چادر پکڑ لی اور میں نے کہا آپ کو اس سورۃ کا پڑھنا کس نے سکھایا ہے۔ انہوں نے کہا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ میں نے جواب میں کہا کہ تم جھوٹ بولتے ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس طرز پر نہیں پڑھایا جس طرز پر تم پڑھ رہے ہو۔ پھر میں اُن کو گھسیٹتا ہوا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گیا اور میں نے کہا۔ یا رسول اللہ! یہ اس طرح قرآن پڑھ رہے ہیں جس طرح آپ نے مجھے نہیں پڑھایا۔ اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہشامؓ ذرا پڑھ کر تو سناؤ۔ چنانچہ ہشامؓ نے اس طرح جس طرح میں نے اُن کو پڑھتے ہوئے سُنا تھا وہ سورۃ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھ کر سنائی۔ اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ یہ سورۃ اسی طرح نازل ہوئی ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا۔ عمرؓ تم پڑھو تو میں نے یہ سورۃ اُس طرح پڑھی جس طرح مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھنی سکھائی تھی۔ آپ نے فرمایا۔ یہ سورۃ اسی طرح نازل ہوئی ہے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ قرآن سات طریق پر نازل ہوا ہے۔ جس طرح کسی کی زبان پر چڑھے وہ اُسی طرح پڑھ لیا کرے (تفسیر فتح البیان سورۃ الفرقان ابتدائیہ۔ بخاری کتاب فضائل القرآن باب انزل القرآن علی سبعۃ احرف) اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرأتیں جن پر مستشرقین اور پادریوں نے اپنے اعتراضات کی بڑی بھاری بنیاد رکھی ہے۔ وہ درحقیقت صرف عرب کی مختلف اقوام کے لہجوں کا فرق تھا۔ اور اس قسم کے فرق عربی زبان میں بہت زیادہ پائے جاتے ہیں۔ کیونکہ عرب قوم مختلف آزاد زبانوں کے اندر گھری ہوئی تھی۔ عرب کا ایک پہلو حبشہ کے ساتھ ملتا تھا۔ دوسرا پہلو ایران کے ساتھ ملتا تھا۔ تیسرا پہلو یہودیوں اور آرامیوں کے ساتھ ملتا تھا اور چوتھا پہلو ہندوستان کے ساتھ ملتا تھا۔ ایسے مختلف زبانوں میں گھرے ہوئے لوگوں کی زبان لازماً ان زبانوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ بعض عرب بعض حروف کو ادا کر سکتے تھے اور بعض دوسرے ان حروف کو ادا نہیں کر سکتے تھے۔ مثلاً بعض ’’ر‘‘ ادا کر سکتے تھے اور بعض ’’ر‘‘ کی جگہ ’’ل‘‘ ادا کرتے تھے۔ اور بعض دفعہ کسی لفظ کے ادا کرنے میں مشکل محسوس کر کے اس کے ہم معنی کوئی دوسرا لفظ استعمال کر لیتے تھے۔ اگر ایک ادیب اپنی کتاب میں ان دونوں لفظوں کا پڑھنا جائز رکھے تو دونوں قوموں کے لئے اس کتاب کا پڑھنا آسان ہو جائے گا مگر دوسری صورت میں ایک حصہ قوم کو اس کا پڑھنا آسان ہوگا اور دوسرے حصہ قوم کو اس کا پڑھنا مشکل ہوگا اور اگر وہ اسے پڑھے گی بھی تو اپنے اختیار

سے پڑھے گی مصنف کی اجازت سے نہیں پڑھے گی۔قرآن کریم نے اس مشکل کو یوں حل کیا کہ جتنے اختلافات تھے ان کو مدنظر رکھتے ہوئے قائم مقام حروف یا قائم مقام الفاظ تجویز کر دیئے جس کی وجہ سے تمام اقوام عرب آسانی کے ساتھ قرآن کریم پڑھنے پر قادر ہوگئیں۔ یہ چونکہ ایک بالکل اچھوتا اور نیا طریق تھا اور قرآن کریم سے پہلے کسی کا ذہن اس طرف نہیں گیا تھا اس لئے لوگوں پر شروع شروع میں یہ بات شاق گزرتی تھی۔اور ہر فریق سمجھتا تھا کہ قرآن میرے قبیلہ کی زبان میں نازل ہوا ہے۔دوسرا قبیلہ اگر لہجہ بدل کر یا حرف بدل کر کسی آیت کو پڑھتا ہے تو وہ گویا قرآن کریم میں تحریف کرتا ہے۔اس لئے شروع میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات بار بار سمجھانی پڑی۔ جب لوگ سمجھ گئے تو ان کو معلوم ہوا کہ یہ عیب نہیں۔نہ معنوں میں اس سے کسی قسم کا تغیر پیدا ہوتا ہے بلکہ بعض دفعہ تو معانی میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے اور ہر قوم کے پڑھنے کے لئے اس میں آسانی ہو جاتی ہے۔

ایک مشہور عربی ادیب نے لکھا ہے کہ ایک بادشاہ تھا جس نے اپنے دربار میں ایک ایسے شخص کو وزارت کا عہدہ سپرد کیا ہوا تھا جو اپنے لہجہ کے مختلف ہونے کی وجہ سے ''ر'' نہیں بول سکتا تھا۔مگر بادشاہ کو اُس کے اس نقص کا کوئی علم نہیں تھا۔ایک دفعہ کسی نے بادشاہ کے پاس شکایت کی کہ آپ نے فلاں شخص کو اپنا وزیر مقرر کیا ہوا ہے مگر اُس کی تو یہ حالت ہے کہ وہ ''ر'' بھی نہیں بول سکتا۔اور اگر کوئی ایسا لفظ اُسے بولنا پڑے جس میں ''ر'' آتی ہو تو وہ ''ر'' کی جگہ ''ل'' پڑھ دیتا ہے۔بادشاہ نے کہا کہ مجھے تو اس کے اس نقص کا کوئی علم نہیں۔لیکن چونکہ تم نے شکایت کی ہے اس لئے اب میں اس کا ضرور امتحان لوں گا اور دیکھوں گا کہ تمہاری بات کہاں تک درست ہے۔چنانچہ اس نے وزیر کو بلوایا اور اسے حکم دیا کہ اپنے سیکرٹری کو یہ آرڈر لکھواؤ کہ

اَمَرَ اَمِیْرُ الْاُمَرَاءِ اَنْ یُّحْفَرَ الْبِئْرُ فِی الطَّرِیْقِ لِیَشْرِبَ مِنْہُ الْمَآءَ الصَّادِرُ وَالْوَارِدُ۔

یعنی شہنشاہ نے حکم دیا ہے کہ شاہی راستہ پر ایک کنواں کھودا جائے تا کہ سب آنے اور جانے والے اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

یہ فقرہ ایسا تھا جس میں اُس نے تمام ایسے الفاظ جمع کر دیئے تھے جن میں '' ر '' آتی ہے۔لیکن وہ وزیر بڑا عالم اور ہوشیار تھا۔اُس نے یہ حکم سنتے ہی فوراً اپنے سیکرٹری سے کہا کہ لکھو

حَکَمَ حَاکِمُ الْحُکَّامِ اَنْ یُّقْلَبَ الْقَلِیْبُ فِی السَّبِیْلِ لِیَنْتَفِعَ مِنْہُ الصَّادِیْ وَالْبَادِیْ۔یعنی تمام حکام کے حاکم اور سردار نے حکم دیا ہے کہ سبیل میں جو طریق کا ہم معنے تھا اور اس میں ''ر'' نہیں آتی تھی۔ایک قلیب کھودا جائے جو بئر کا ہم معنے ہے اور اس میں بھی ''ر'' نہیں آتی بلکہ

’’ل‘‘ آتا ہے تا کہ اس سے صادی اور بادی یعنی شہر میں آنے والے اور شہر سے جانے والے سب فائدہ اٹھا سکیں۔اس جگہ بھی اس نے صادر اور وارد کی جگہ ایسے الفاظ استعمال کئے جو انہیں الفاظ کے ہم معنے تھے مگر ان میں بھی ’’ر‘‘ نہیں آتی تھی۔

بادشاہ اس کی اس ہوشیاری سے بہت متاثر ہوا اور اُس نے شکایت کرنے والے سے کہا کہ تم نے تو اس لئے شکایت کی تھی کہ میں اسے اس عہدہ سے برطرف کردوں مگر میری نگاہ میں تو اس کا درجہ اور بھی بڑھ گیا ہے۔کیونکہ میری زبان سے سنتے ہی اس نے میرے فقرہ کو فوراً ایسے الفاظ میں بدل دیا جو مفہوم کے لحاظ سے میرے الفاظ کے عین مطابق تھے۔اور ان میں ’’ر‘‘ بھی نہیں آتی تھی۔اس بات نے تو ثابت کر دیا ہے کہ یہ شخص بڑا عالم ہے اور مجھے اس کی قدر کرنی چاہیے۔

اس مثال سے یہ بات بآسانی سمجھی جاسکتی ہے کہ جس طرح وہ وزیر ’’ر‘‘ نہیں بول سکتا تھا بلکہ ’’ر‘‘ کی بجائے ’’ل‘‘ بولنے پر مجبور تھا اسی طرح عرب کے مختلف قبائل میں لب ولہجہ کا اختلاف پایا جاتا تھا جس کی وجہ سے بعض لوگ بعض حروف کو پوری طرح ادا نہیں کر سکتے تھے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف قرأتوں میں قرآن کریم کی تلاوت کی اجازت دے کر ان تمام اختلافات کو مٹا دیا۔اس طرح قرآن کریم ایک عالمگیر کتاب بن گئی جس کو مختلف لہجہ رکھنے والے عرب بھی آسانی سے پڑھ سکتے تھے اور وہ کہہ سکتے تھے کہ یہ کتاب ہماری زبان میں ہی نازل ہوئی ہے۔اسی وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ یعنی جو طریق تم پر آسان ہو اس کے مطابق پڑھو۔اگر ان حروف کے بدلنے یا زیر زبر کے بدلنے سے معانی میں فرق پڑتا تو آپ یہ کیوں فرماتے کہ جس طریق پر پڑھنا تمہیں آسان ہو۔اس طریق پر پڑھ لو۔یہ فقرہ صاف بتاتا ہے کہ قرأتوں کا تعلق صرف تلفظ کے ساتھ ہے معانی کے ساتھ نہیں اور اگر کسی جگہ تلفظ سے کوئی وسعت بھی پیدا ہوتی ہے تو اصل معنوں میں فرق نہیں پڑتا۔اصل حکم وہی رہتا ہے جو قرآن کریم دینا چاہتا ہے۔

ترتیب سُور اس سورۃ کا سورۂ نُور سے قریبی تعلق یہ ہے کہ سورۂ نور کے آخر میں اسلامی تنظیم کا ذکر تھا اور بتایا گیا تھا کہ کچھ لوگ اس تنظیم کی حقیقت سے آگاہ نہیں اور کفر کے کھوکھلے نظام سے ڈرتے ہیں۔لیکن اُن کا یہ ڈر اور ان کی یہ کمزوری انہیں بچائے گی نہیں بلکہ انہیں اور زیادہ تباہی میں دھکیل دے گی۔اب اس سورۃ میں بتایا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ وہ سب جہانوں کے لئے بطور نذیر آیا ہے اور یہ کہ جو لوگ اُس کی تعلیم کے خلاف چلیں گے وہ نیچر اور اس کے منشاء کے خلاف چلیں گے کیونکہ اس کی تعلیم قانونِ فطرت اور قانونِ نیچر کے مطابق ہے

پس اس کی خلاف ورزی ایک آسمانی حکم ہی کی خلاف ورزی نہیں ہے بلکہ خود نیچر اور اس کے قوانین کی بھی مخالفت ہے اس لئے دنیا کے کسی مذہب کے پیرو اور کسی ملک کے رہنے والے قرآن کریم کو ماننے اور اس پر عمل کرنے والوں کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے۔اور جب حالت یہ ہے تو یہ لوگ جو ڈر رہے ہیں صرف ایک خیالی اور وہمی بات سے ڈر رہے ہیں۔حقیقت پر اُن کے ڈر کی بنیاد نہیں ہے۔

یہ تو ان دونوں سورتوں کا قریبی تعلق ہے۔ساری سورۃ کے مضمون کے لحاظ سے اس سورۃ کا گذشتہ سورۃ کے مضمون سے یہ تعلق ہے کہ سورۂ نور میں قوم کی اخلاقی حالت کی درستی اور عائلی اور قومی تنظیم کی اہمیت پر زور دیا گیا تھا اور بتایا گیا تھا کہ کامیابی کے لئے عقائد اور افکار اور اخلاق کی اصلاح کے ساتھ قومی تنظیم پر خاص طور پر زور دینا چاہیے اور افراد کے حقوق پر قوم کے حقوق کو مقدم رکھنا چاہیے۔اب اس سورۃ میں گو اسی مضمون کو جاری رکھا گیا ہے جو سورۂ نور میں بیان کیا گیا تھا۔مگر زیادہ تر مضمون کے اس پہلو کی طرف توجہ کی گئی ہے کہ نیک اور بد کا مقابلہ دنیا میں کس طرح چلتا ہے۔گویا ایمانی ترقی اور کفر کی ترقی کا آپس میں مقابلہ کیا گیا ہے اور ان دونوں کو مقابل پر بہنے والے دو دریا قرار دیا گیا ہے اور مسیح موعودؑ کے زمانہ تک کی اسلامی ترقی اور تنزل کا حال بیان کیا گیا ہے۔اس طرح مسلمانوں کی ترقی کی خبروں کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کی زمانی ترقی کی خبروں کو بھی شامل کر دیا ہے۔

خلاصۂ مضمون یہ قرآن دو پہلو رکھتا ہے۔ماننے والوں کے لئے رحمت اور نہ ماننے والوں کے لئے تنبیہہ۔کیونکہ اس کا نازل کرنے والا زمین و آسمان کا مالک ہے۔وہ اکیلا ہے کوئی اس کا شریک نہیں اور کائنات کا ہر ذرہ اس کی پیدائش ہے اس لئے اس کا کلام نیچر کے مطابق ہے اور اس کا انکار اور اقرار محض ایک شریعت کا اقرار یا انکار نہیں بلکہ قانونِ نیچر کا اقرار و انکار بھی ہے کیونکہ جب دونوں کا خالق ایک ہے تو کلام الٰہی اور قانونِ نیچر دونوں مختلف نہیں ہو سکتے۔(آیت ۱ تا ۴)

قرآن کے مخالف جب قرآنی تعلیم کی برتری کو دیکھتے ہیں تو مجبور ہو کر یہ کہنے لگ جاتے ہیں کہ یہ کلام ایک شخص کا نہیں بلکہ بہتوں نے مل کر یہ کلام اس شخص کو بنا دیا ہے۔یا یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ پہلے صحائف کی چوری ہے۔(آیت ۵،۶)

لیکن ان کا یہ دعویٰ جھوٹا ہے کیونکہ انسانوں نے کلام بنایا ہوتو مافوق الانسانیت باتیں اس میں نہیں چاہئیں اور اگر پہلی کتب کی نقل ہے تو ان کتب میں بھی وہ خوبیاں ہونی چاہئیں۔(آیت ۷)

بعض مخالف کہتے ہیں کہ یہ تو ایک انسان ہے۔ہماری طرح کھاتا پیتا۔لوگوں میں ملتا جلتا۔خدا نے بھجوانا تھا

تو فرشتہ کیوں نہ اُتارا۔ یا پھر اس کے ساتھ خزانہ کیوں نہ اُترا۔ یا اللہ تعالیٰ اُسے ایسے باغات دیتا جن میں سے یہ پھل کھاتا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ایک جھوٹے انسان کے پیچھے کیوں چل رہے ہو۔ ذرا دیکھو کس طرح بے جوڑ اعتراض کرتے جاتے ہیں اور کسی ایک امر پر قائم نہیں رہتے۔ (آیت ۸ تا ۱۰)

خدا تعالیٰ تو اس سے بہتر باغات تجھے دے سکتا ہے اور دے گا۔ مگر یہ لوگ اس گھڑی کا انتظار نہیں کرتے بلکہ اس کے منکر ہیں۔ لیکن جب وہ وقت آئے گا تو یہ پریشان ہو جائیں گے۔ (آیت ۱۱ تا ۱۵)

یہ جیسا باغ مانگتے ہیں کیا ان باغوں سے اچھا ہے جو مسلمانوں کو ملنے والا ہے۔ (آیت ۱۶، ۱۷)

جب مابعد الموت ان کے معبودوں سے سوال کیا جائے گا تو وہ منکر ہو جائیں گے۔ (آیت ۱۸ تا ۲۰)

ان کے اعتراض کیا وزن رکھتے ہیں۔ آخر ہر ایک قوم نبیوں کی مدعی ہے۔ کیا وہ انسان نہ تھے۔ اور انسانی ضروریات ان کے ساتھ نہ تھیں۔ ان کو بس یہ فخر ہے کہ عوام ان کے مؤید ہیں۔ اور یہ ان کو دھوکا دے سکتے ہیں۔ ورنہ ان کی باتیں محض بے سروپا ہیں۔ (آیت ۲۱)

پھر کچھ لوگ ان میں سے کہتے ہیں کہ خود ہم پر فرشتے کیوں نہ اُترے یا خدا ہم سے کیوں نہ بولا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنی شان بہت بڑی سمجھتے ہیں حالانکہ ان کو فرشتے نظر آئیں گے تو ان کے اعمال کے مطابق عذاب ہی کے دن نظر آئیں گے لیکن مومن فرشتوں کو خوشی سے دیکھیں گے۔ (آیت ۲۲ تا ۲۵)

فرماتا ہے ایک دن فرشتے ضرور اُتریں گے مگر وہ فیصلہ کا دن ہوگا۔ اور رسول لوگوں پر گواہی دے گا کہ قانونِ قدرت اور الٰہی تعلیم کا انہوں نے انکار کیا۔ (آیت ۲۶ تا ۳۱)

مگر یہ کوئی نئی بات نہیں سب نبیوں سے ایسا ہی ہوا۔ (آیت ۳۲)

پھر بعض کہتے ہیں کہ یکدم قرآن کیوں نہ اُترا۔ یہ اعتراض جتنے چاہیں کریں ہمارے پاس ان کے جواب موجود ہیں بری بات یہ نہیں کہ اعتراض ہوں۔ بُری بات تو یہ ہے کہ انسان خدا تعالیٰ کے سامنے شرمندہ ہو۔ (آیت ۳۳ تا ۳۵)

تجھ سے پہلے کئی نبی آئے اور اُن کے دشمن ہلاک ہوئے۔ (آیت ۳۶ تا ۴۱)

تجھ سے بھی یہ لوگ ہنسی کرتے ہیں۔ مگر ایسا ہونا ہی چاہیے کیونکہ اُن کے دل انسانیت سے خالی ہو چکے ہیں۔ (آیت ۴۲، ۴۵)

کاش یہ دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ ایک قوم کو ترقی دیتا ہے۔ پھر اُس پر زوال آجاتا ہے اور رات کے بعد دن کی سی

کیفیت بھی بعض قوموں پر آتی ہے پس کیوں نہیں سمجھتے کہ ان کے زوال اور مسلمانوں کی ترقی کا زمانہ آ گیا ہے۔ (آیت ۴۶ تا ۵۰)

قرآن ان کے سامنے صرف نصیحت کی بات پیش کرتا ہے کچھ ان سے مانگتا تو نہیں۔ پھر انکار پر اصرار کیوں۔ (آیت ۵۱)

ان کو یہ صدمہ ہے کہ عرب میں کیوں نبی ہوا؟ آخر نبی کہاں آتا؟ کہ جسے سب قومیں مان لیتیں۔ کیا ہر قوم اور ہر ملک میں الگ الگ نبی ایک وقت میں آجاتے۔ مگر اس سے تو اختلاف بڑھتا۔ پس تو ان کی باتوں کو نہ دیکھ۔ قرآن کی تبلیغ کئے جا۔ (آیت ۵۲، ۵۳)

کیا وہ دیکھتے نہیں کہ خدا نے دو دریا چلا رکھے ہیں۔ ایک میٹھا اور ایک کڑوا۔ پھر وہ آپس میں ملتے نہیں۔ اسی طرح یہ دو تعلیمیں متوازی چلتی چلی جائینگی۔ اور لوگ میٹھے اور کڑوے کا فرق محسوس کرتے رہیں گے۔ (آیت ۵۴)

کیا دیکھتے نہیں کہ انسان کی جسمانی پیدائش بھی پانی سے ہے۔ اسی طرح رُوحانی پیدائش بھی وحی کے پانی کی محتاج ہے۔ (آیت ۵۵)

یہ تو شرک کے عادی ہیں اور تیرا کام ان کو سمجھانا اور مفت تبلیغ کرنا اور صرف خدا پر نظر رکھنا ہے۔ (آیت ۵۶ تا ۶۰)

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ واحد خدا کی عبادت کرو جس کی وحدت پر کائنات گواہ ہے تو یہ انکار کرتے ہیں۔ (آیت ۶۱)

حالانکہ دیکھتے نہیں کہ ایک جسمانی نظام ہے اور اس سے روشنی اور حیات ملتی ہے۔ اسی طرح نیکی اور بدی بھی آگے پیچھے آتی ہیں اور مومن دنیا میں ہمیشہ امن قائم کرتے آئے ہیں اور شرارتوں کا جواب دُعا سے دیتے ہیں اور خدا تعالیٰ کے عبادت گذار رہتے ہیں اور راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اس سے دعائیں کرتے ہیں اور دنیا کی اصلاح کے لئے مال خرچ کرتے ہیں۔ لیکن نمائش نہیں کرتے۔ وہ شرک نہیں کرتے۔ قتل نہیں کرتے۔ زنا نہیں کرتے اور جو ایسا کرے گا اپنے انجام کو دیکھے گا۔ ہاں اسلام کا خدا توبہ قبول کرتا ہے اور اس کا ثبوت نیکیوں کی توفیق ملنے سے ملتا ہے۔ (آیت ۶۲ تا ۷۲)

اور مومن وہ ہوتے ہیں جو جھوٹ نہیں بولتے اور فضول باتوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور خدا تعالیٰ کی باتوں کو سن کر مرعوب ہوتے ہیں اور اپنے بیوی بچوں کی اصلاح کے لئے دعائیں کرتے ہیں اور صرف لیڈری نہیں چاہتے بلکہ نیک لوگوں کی لیڈری چاہتے ہیں۔ ان کو خدائی نعمتیں ملیں گی۔ جو دائمی ہوں گی۔ (آیت ۷۳ تا ۷۷)

یاد رکھو۔ خدا نے تم کو ایک خاص مقصد کے لئے پیدا کیا ہے۔ اگر تم اس مقصد کو پورا نہیں کرو گے تو تم پر خدا رحم نہیں کرے گا۔ (آیت ۷۸)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ﴿۱﴾

(میں) اللہ (تعالیٰ) کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔ (پڑھتا ہوں)

تَبٰرَکَ الَّذِیۡ نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ عَلٰی عَبۡدِہٖ لِیَکُوۡنَ

وہ ذات بڑی برکت والی ہے جس نے فرقان اپنے بندے پر اتارا ہے تا کہ وہ سب جہانوں کے لئے ہوشیار

لِلۡعٰلَمِیۡنَ نَذِیۡرَا ۙ﴿۲﴾ الَّذِیۡ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ

کرنے والا بنے۔ وہ (ذات) جس کے قبضہ میں آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے۔ اور جس نے

وَ لَمۡ یَتَّخِذۡ وَلَدًا وَّ لَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ شَرِیۡکٌ فِی الۡمُلۡکِ وَ

کوئی بیٹا نہیں بنایا اور جس کی بادشاہت میں کوئی شریک نہیں اور جس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے پھر اس

خَلَقَ کُلَّ شَیۡءٍ فَقَدَّرَہٗ تَقۡدِیۡرًا ﴿۳﴾

کے لئے ایک اندازہ مقرر کیا ہے۔

حل لغات۔ **تَبَارَکَ** تَبَارَکَ اللّٰہُ تَعَالٰی: تَقَدَّسَ وَتَنَزَّہَ۔ تبارک کا لفظ جب اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال ہو تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی ذات تمام صفاتِ حسنہ کی جامع اور تمام کمزوریوں سے بالا ہے۔ (اقرب)

اَلْفُرْقَانُ اَلْفُرْقَانُ کے معنے ہیں کُلُّ مَا فُرِقَ بِہٖ بَیْنَ الْحَقِّ وَالْبَاطِلِ۔ ہر وہ امر جس کے ذریعہ سے حق اور باطل میں امتیاز ہو جائے (اقرب)۔

مفردات امام راغبؒ میں ہے کہ وَالْفُرْقَانُ کَلَامُ اللّٰہِ تَعَالٰی لِفَرْقِہٖ بَیْنَ الْحَقِّ وَالْبَاطِلِ فِی الْاِعْتِقَادِ وَالصِّدْقِ وَالْکِذْبِ۔ یعنی فرقان کا لفظ اللہ تعالیٰ کے کلام پر بولا جاتا ہے کیونکہ اس کے ذریعہ سے

اعتقاداتِ حقّہ اور باطلہ کا علم ہو جاتا ہے اور اسی طرح یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ جھوٹی بات کون سی ہے اور سچّی کون سی۔(مفردات)

اَلْعَالَمِیْن العَالَمِیْن اَلْعَالَمُ کی جمع ہے اور اَلْعَالَمُ کے معنے ہیں اَلْخَلْقُ کُلُّہٗ۔تمام مخلوق۔وَکُلُّ صِنْفٍ مِنْ اَصْنَافِ الْخَلْقِ۔نیز مخلوق کی ہر قسم پر عَالَم کا لفظ اطلاق پاتا ہے۔وَقِیْلَ یَخْتَصُّ بِمَنْ یَّعْقِلُ۔بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ لفظ صرف ایسی مخلوق کے لئے بولا جاتا ہے جس میں عقل ہو جیسے انسان اور فرشتے وغیرہ جانوروں وغیرہ کے لئے۔وَقَالَ بَعْضُهُمْ هُوَ اِسْمٌ لِمَا يُعْلَمُ بِهٖ شَیْءٌ ثُمَّ سُمِّیَ بِهٖ مَا يُعْلَمُ بِهِ الْخَالِقُ۔بعض نے کہا ہے کہ یہ تخصیص درست نہیں کہ یہ لفظ صرف ذوی العقول کے لئے بولا جاتا ہے بلکہ یہ لفظ ہر اُس چیز کے لئے بولا جاتا ہے جس سے کسی دوسری چیز کا علم ہو جائے۔پھر یہ لفظ ان چیزوں کے لئے مخصوص ہو گیا جن کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ کی ذات کا علم حاصل ہوتا ہے۔(اَلْعَالَمِیْن کے متعلق مزید بحث کے لئے تفسیر کبیر جلد اوّل زیر آیت سورۃ الفاتحہ ۲ ملاحظہ فرمائیں)

اَلْعَالَمِیْنَ عَالَمٌ کی جمع ہے اور مخلوق کی ہر صنف اور قسم عالم کہلاتی ہے۔(مفردات امام راغب) اور عَالَمُوْنَ یا عَالَمِیْنَ کے سوا اس کی جمع عَلَالِمُ یا عَوَالِمُ بھی آتی ہے اور غیر ذوی العقول کی صفات میں سے ون یا ین سے صرف عَالَم یا یَاسَم دولفظوں کی جمع بنتی ہے۔اور عالم مخلوق کو اس لئے کہتے ہیں کہ اس سے خالق کا پتہ لگتا ہے (اقرب) بعض مفسرین نے کہا کہ عَالَمٌ کی جمع عَالَمُوْنَ یا عَالَمِیْنَ تب بنائی جاتی ہے جبکہ ذوی العقول کا ذکر ہو۔مثلاً انسان، فرشتے وغیرہ۔مگر یہ قاعدہ لغت کے بھی خلاف ہے۔اور قرآن کریم کے محاورہ کے بھی خلاف۔لغت کا حوالہ اوپر گزر چکا ہے۔قرآن کریم کی یہ آیت اس پر شاہد ہے۔قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ۔قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَیْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِیْنَ۔قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗۤ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ۔قَالَ رَبُّكُمْ وَ رَبُّ اٰبَآىِٕكُمُ الْاَوَّلِیْنَ۔قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِیْۤ اُرْسِلَ اِلَیْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ۔قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ مَا بَیْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ۔(الشعراء:۲۴ تا ۲۹) اس آیت میں عَالَمِین میں انسانوں کے سوا آسمان زمین اور ان کے درمیان کی سب اشیاء اور مغرب اور مشرق اور ان کے درمیان کی سب اشیاء کو عالمین میں شامل بتایا گیا ہے۔اسی طرح سورۃ حٰمٓ سجدہ میں ہے۔قُلْ اَىِٕنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَ تَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ۔وَ جَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَ بٰرَكَ فِیْهَا وَ قَدَّرَ فِیْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِیْۤ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآىِٕلِیْنَ (حٰمٓ سجدہ:۱۰،۱۱) اس آیت میں بھی زمین اور پہاڑوں وغیرہ کو عالمین میں شامل کیا گیا ہے۔

اَلْعَالَمِیْنَ کی تشریح حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے نزدیک حضرت مسیح موعودؑ بھی تحریر فرماتے ہیں۔ اَنَّ الْعَالَمِیْنَ عِبَارَةٌ عَنْ کُلِّ مَوْجُوْدٍ سِوَی اللّٰہِ ... سَوَاءٌ کَانَ مِنْ عَالَمِ الْاَرْوَاحِ اَوْمِنْ عَالَمِ الْاَجْسَامِ... اَوْ کَالشَّمْسِ وَالْقَمَرِ وَغَیْرِ ھِمَا مِنَ الْاَجْرَامِ (اعجاز المسیح، روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۱۳۹، ۱۴۰) یعنی عالم سے مراد جاندار اور غیر جاندار سب اشیاء ہیں۔ اسی طرح سورج، چاند وغیرہ کی قسم کے اجرام فلکی۔ غرض سب جاندار یا غیر جاندار اس میں شامل ہیں۔

جو صرف ذوی العقول کے لئے اسے قرار دیتے ہیں۔ وہ مَا ھُوَ اِلَّا ذِکْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ (القلم: ۵۳) کی آیت سے استدلال کرتے ہیں مگر یہ استدلال درست نہیں۔ کیونکہ جب اس کا استعمال غیر ذوی العقول کے لئے قرآن کریم میں موجود ہے تو اس آیت کے متعلق صرف یہ کہا جائے گا کہ عام لفظ خاص معنوں میں استعمال ہوا ہے چنانچہ قرآن کریم میں یہی لفظ اس سے بھی خاص معنوں میں استعمال ہوا ہے فرماتا ہے وَ اَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (البقرۃ: ۴۸) اے یہود ہم نے تم کو سب جہانوں پر فضیلت دی ہے حالانکہ مراد صرف اپنے زمانہ کے لوگ ہیں نہ کہ ہر زمانہ کے لوگ۔ کیونکہ خیر الامم مسلمانوں کو کہا گیا ہے۔ پس خاص معنوں کا استعمال جبکہ عام معنوں میں یہ لفظ استعمال ہو چکا ہے اس کے معنوں کو محدود نہیں کرتا۔ اور حق یہی ہے کہ عَالَمِیْن میں ہر قسم کی مخلوق شامل ہے۔ خواہ جاندار ہو یا غیر جاندار۔

نَذِیْرًا نذیر کے معنے اَلْاِنْذَارُ یعنی ڈرانے کے ہیں۔ نیز اس کے معنے ہیں اَلْمُنْذِرُ۔ ڈرانے والا اَلرَّسُوْلُ رسول (اقرب)

قَدَّرَہٗ قَدَّرَہٗ عَلَی الشَّیْءِ کے معنے ہیں۔ جَعَلَہٗ قَادِرًا۔ اس کو کسی چیز پر قادر بنا دیا اور قَدَّرَ الشَّیْءَ بِالشَّیْءِ کے معنے ہوتے ہیں قَاسَہٗ بِہٖ وَجَعَلَہٗ عَلٰی مِقْدَارِہٖ۔ کسی چیز کا صحیح اندازہ کیا اور اس کو اُس مقدار پر بنایا جو درست اور صحیح تھی۔ نیز کہتے ہیں قَدَّرَ فُلَانٌ اور معنے ہوتے ہیں رَوّٰی وَفَکَّرَ فِیْ تَسْوِیَۃِ اَمْرِہٖ کہ اس نے اپنے مجوزہ کام کے بارے میں غور و فکر کیا تا کہ اس کو مکمل طور پر بنا سکے۔ (اقرب)

تفسیر۔ اس آیت میں توجہ دلائی گئی ہے کہ قرآن کریم کو نازل کرنے والا خدا تمام خوبیوں کا جامع اور تمام عیبوں سے پاک ہے اور اس نے ایک ایسی کتاب نازل کی ہے جو حق و باطل میں تمیز کر کے رکھ دیتی ہے اور پھر اس نے یہ کتاب اپنے تمام بندوں کے لئے اتاری ہے خواہ وہ کسی درجہ عقل کے مالک ہوں یا کسی قسم کا رجحان رکھنے والے ہوں چنانچہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ کی جگہ عَلٰی عِبَادِہٖ بھی پڑھا ہے (تفسیر بحر محیط زیر آیت ھذا) جس میں انہی معنوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے

کہ خدائے پاک نے یہ فرقان جس سے حق و باطل میں فیصلہ کیا جاتا ہے اپنے مختلف طبیعتوں والے بندوں پر نازل کیا ہے۔تا کہ یہ کتاب تمام مخلوق کے لئے ڈرانے والی ثابت ہو گویا یہ ایک ایسی کتاب ہے جس سے ہر فطرت کا آدمی فائدہ اٹھا سکتا اور ہر مذاق کا انسان نصیحت حاصل کر سکتا ہے۔ یہ بظاہر ایک مختصر سی آیت ہے جس سے سورۂ فرقان کا آغاز کیا گیا ہے لیکن اگر غور سے کام لیا جائے تو اس چھوٹی سے آیت میں ہی مسلمانوں کے لئے ایک وسیع اور مکمل لائحہ عمل بیان کر دیا گیا ہے۔ یوں تو کروڑوں مسلمان دنیا میں ایسے پائے جاتے ہیں جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں لیکن محض نام رکھ لینے سے کسی چیز کے اندر وہ حقیقت پیدا نہیں ہو جاتی جس حقیقت کا اصل چیز کے اندر پایا جانا ضروری ہوتا ہے۔ ہماری زبان کا یہ محاورہ تو نہیں مگر اردو زبان میں اسے عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے کہ ؎

برعکس نہند نامِ زنگی کافور

(اردو لغت جلد دوم زیر لفظ برعکس صفحہ ۹۶۹ ترقی اردو بورڈ کراچی)

یعنی فلاں بات ایسی ہی حقیقت کے خلاف ہے جیسے کسی حبشی کا نام کافور رکھ دیا جائے۔ حالانکہ حبشی اپنی سیاہی میں بے مثل ہوتا ہے اور کافور اپنی سفیدی میں بے مثل ہوتا ہے۔ اسی طرح ہمارے ملک کا ایک شاعر کہتا ہے کہ دنیا بھی عجیب مقام ہے جس میں ہر ایک بات اُلٹی نظر آتی ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

رنگی کو نارنگی کہیں بنے دودھ کو کھویا
چلتی ہوئی کو گاڑی کہیں دیکھ کبیرا رویا

یعنی نارنگی جو ایک خوش رنگ رکھتی ہے لوگ اس کو نارنگی کہتے ہیں جس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اس کا کوئی رنگ نہیں۔ اور دودھ جب اپنے کمال کو پہنچ جاتا ہے تو اُسے کھویا کہتے ہیں حالانکہ کھوئی ہوئی چیز وہ ہوتی ہے جو ضائع ہو جائے۔ اسی طرح جو چیز چلتی ہے لوگ اُس کو گاڑی کہتے ہیں۔ حالانکہ گڑی ہوئی چیز وہ ہوتی ہے جو چل نہ سکے۔ کبیر کہتا ہے کہ دنیا کی یہ اُلٹی باتیں دیکھ کر میرے دل کو بہت دُکھ ہوا کہ یہ دنیا کتنی غیر معقول ہے کہ ہر چیز کا الٹا نام رکھتی ہے۔ کیا اس کی آنکھیں بھینگی ہو گئی ہیں کہ اُسے سیدھی چیز بھی اُلٹی نظر آتی ہے۔

اسی طرح جہاں تک نام کا سوال ہے کوئی نام رکھ لیا جائے خواہ وہ مسلمانوں والا ہو یا ہندوؤں والا ہو یا بدھوں والا ہو یا پارسیوں والا ہو اُس نام کی وجہ سے مذہب کی حقیقی رُوح انسان میں پیدا نہیں ہو جاتی۔ دنیا میں ہزاروں لوگ ایسے ہیں جو اپنے آپ کو ہندو یا مسلمان یا بدھ یا پارسی کہتے ہیں لیکن اُن کی زندگی۔ اُن کے افکار اُن کے رہنے سہنے کی عادات اور اُن کے لباس کو دیکھا جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ عیسائی ہیں۔ لیکن جب اُن کے نام معلوم

ہوں تب پتہ لگتا ہے کہ فلاں شخص مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوا ہے۔ فلاں شخص ہندوؤں کے گھر میں پیدا ہوا ہے اور فلاں شخص بدھوں یا پارسیوں کے گھر میں پیدا ہوا ہے۔ پس صرف نام کوئی حقیقت نہیں رکھتا اصل خوبی جو کسی چیز کی اہمیت کو بڑھانے والی ہوتی ہے وہ اس کی صفات ہوتی ہیں۔ ورنہ مٹی کا بنا ہوا کیلا بھی نام کے لحاظ سے کیلا ہی ہوتا ہے۔ مٹی کا بنا ہوا سیب بھی نام کے لحاظ سے سیب ہی ہوتا ہے۔ مٹی کا بنا ہوا آم بھی نام کے لحاظ سے آم ہی ہوتا ہے ان چیزوں کو صرف پھلوں کا نام دے دینے کی وجہ سے ان کے اندر پھلوں کی خاصیت پیدا نہیں ہو جاتی اور نہ ان چیزوں سے اس طرح فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے جس طرح حقیقی آم یا سیب یا کیلے سے فائدہ اُٹھایا جاتا ہے۔

غرض دنیا کو وہی چیز فائدہ پہنچا سکتی ہے جو اپنے نام کے مطابق اپنے اندر صفات بھی رکھتی ہو اگر اس کا نام تریاق ہو تو وہ اپنے اندر تریاقی خاصیت رکھتی ہو اور اگر اس کا نام شفا ہو تو وہ اپنے اندر شفائی اثرات رکھتی ہو۔ یہی حقیقت اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمائی ہے کہ تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ کہ بڑی برکتوں والا ہے وہ خدا جس نے حق اور باطل میں تمیز کرنے والا کلام اپنے بندے پر نازل کیا ہے۔ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے اپنے پاک اور بے عیب ہونے کا دعویٰ دنیا کے سامنے پیش کیا ہے مگر ساتھ ہی بتا دیا کہ ہمارا یہ دعویٰ صرف منہ کا دعویٰ نہیں بلکہ اس کے اندر کامل صداقت پائی جاتی ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ اس خدا نے فرقان نازل کیا ہے یعنی ایسا کلام نازل کیا ہے جس کا ایک ایک لفظ حق اور باطل میں تمیز کر کے دکھلا دیتا ہے اور بتا دیتا ہے کہ فلاں چیز مفید ہے اسے قبول کرو اور فلاں چیز مضر ہے اس سے بچو۔ عیسائیت کی تعلیم کو ہی دیکھ لو۔ وہ اپنی ظاہری شکل میں کتنی خوبصورت نظر آتی ہے۔ مسیحؑ نے کہا ہے کہ اگر کوئی شخص تیرے ایک گال پر تھپڑ مارے تو تُو اپنا دوسرا گال بھی اُس کی طرف پھیر دے (متی باب ۵ آیت ۳۹) جب عیسائی مشنری کسی چوک میں کھڑے ہو کر انجیل کی یہ تعلیم بیان کرتا ہے تو کوئی کمزور مسلمان بھی یہ کہنے لگ جاتے ہیں کہ سبحان اللہ! کیسی اچھی تعلیم ہے لیکن جب ان الفاظ پر عمل کرنے کا وقت آتا ہے تو یہ تعلیم بالکل بے کار ثابت ہوتی ہے۔ بلکہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ خود مسیح بھی اپنی زندگی میں اس تعلیم پر عمل نہ کر سکا۔ چنانچہ وہی مسیحؑ جس نے یہ کہا تھا کہ اگر کوئی شخص تمہارے ایک گال پر تھپڑ مارے تو تم اپنا دوسرا گال بھی اس کی طرف پھیر دو۔ اُسی نے دوسرے موقعہ پر کہا کہ میں صلح کرانے نہیں آیا۔ میں تلوار چلانے آیا ہوں۔ (متی باب ۱۰ آیت ۳۴) بلکہ اُس نے اپنے حواریوں سے کہا کہ اگر تمہارے پاس تلواریں خریدنے کے لئے روپے نہیں تو اپنے کپڑے بیچ کر بھی تلواریں خرید لو (لوقا باب ۲۲ آیت ۳۶)

غرض عیسائی دنیا نے اس تعلیم پر کبھی عمل نہیں کیا۔ لیکن قرآن کریم دعویٰ کرتا ہے کہ وہ سچ اور جھوٹ میں ایسا

امتیاز کر دیتا ہے کہ انسان کے لئے اُس کے مناسب حال طریق عمل بالکل واضح ہو جاتا ہے اور ہدایت اور گمراہی کی راہیں اس کے لئے روشن ہو جاتی ہیں سورۂ بقرہ میں بھی قرآن کریم کی ایک امتیازی خصوصیت اس کا فرقان ہونا بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِ (البقرة:١٨٦) یعنی رمضان کا مہینہ وہ مقدس اور بابرکت مہینہ ہے جس کے بارہ میں قرآن کریم نازل کیا گیا ہے۔ وہ قرآن جو تمام انسانوں کے لئے ہدایت کا موجب ہے اور اپنے اندر ایسے کھلے دلائل رکھتا ہے جو ہدایت پیدا کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی قرآن کریم فرقان بھی ہے یعنی ایسے نشانات پر بھی مشتمل ہے جو حق و باطل میں امتیاز کر دیتے ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب بھی کوئی نبی دنیا میں مبعوث ہوتا ہے اُسے فرقان عطاء کیا جاتا ہے یعنی اُسے ایسے نشانات معجزات عطا کئے جاتے ہیں۔ جن کے ذریعہ حق و باطل میں امتیاز ہو جاتا ہے۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسرے نبیوں پر یہ امتیاز حاصل ہے کہ دوسرے نبیوں کو کتاب اور اس کے علاوہ فرقان ملا تھا۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو کتاب نازل ہوئی وہی فرقان تھی۔ تورات اپنی سچائی کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دوسرے معجزات کی تائید کی محتاج تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے الہامات دوسرے معجزات کی تصدیق کے محتاج تھے۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب اپنی ذات میں فرقان ہے۔ یعنی وہ ایک زندہ اور کامل کتاب ہے اور اگر دوسرے معجزات لوگوں کو بھول بھی جائیں تب بھی وہ اپنی سچائی کا ثبوت اپنے اندر رکھتی ہے اور حق و باطل میں امتیاز کر دیتی ہے۔

پھر فرماتا ہے۔ وہ خدا اس لئے بھی برکتوں والا ہے کہ اُس نے اپنا کلام ایک عبد پر اتارا ہے۔ یعنی اس ہستی پر جو اپنے آپ کو کامل طور پر اللہ تعالیٰ کے تابع کر دیتی اور رات دن اس کے احکام کے پورا کرنے میں لگی رہتی ہے۔ یوں تو دنیا میں سینکڑوں لوگ قوم کی اصلاح کے مدعی ہوتے ہیں مگر جو باتیں وہ دوسروں سے کہتے ہیں اُن پر وہ خود عمل نہیں کرتے۔ وہ کہلاتے تو لیڈر اور راہنما ہیں لیکن اُن کا عمل اُن کی تعلیم کے خلاف ہوتا ہے اور اس طرح وہ دوسروں کے لئے ٹھوکر کا موجب بنتے ہیں۔ لوگ جب ان کی تعلیم کو دیکھتے ہیں تو اُسے قابلِ تعریف قرار دیتے ہیں۔ لیکن جب اُن کے اعمال کو دیکھتے ہیں تو اُن سے نفرت کرنے لگ جاتے ہیں یا اُن کی منافقت اور بے ایمانی کو دیکھ کر یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ ہمیں بھی اس قسم کی منافقت اختیار کرنی چاہیے۔ لیکن خدا تعالیٰ کا نبی لوگوں کو جو تعلیم دیتا ہے اس کا نمونہ وہ اپنے وجود کے ذریعہ دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ نبی کے آنے سے پہلے بہت حد تک صداقتیں دنیا میں موجود ہوتی ہیں لیکن لوگ اپنے کمیٔ ایمان کی وجہ سے ان صداقتوں کو پسِ پشت ڈال رہے ہوتے

ہیں۔ نبی آ کر کہتا ہے کہ سچ بولو اور دنیا کے لوگ بھی یہی کہتے ہیں کہ سچ بولو۔ نبی آ کر کہتا ہے کہ چوری نہ کرو اور دنیا کے لوگ بھی یہی کہتے ہیں کہ چوری نہ کرو۔ نبی آ کر کہتا ہے کہ ظلم نہ کرو۔ اور دنیا کے لوگ بھی یہی کہتے ہیں کہ ظلم نہ کرو لیکن اس کے باوجود دنیا کو پھر بھی نبیوں کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ انبیاء اپنے نمونہ کے ذریعہ سے انہیں قابلِ عمل ثابت کرتے ہیں۔ لوگ یہ تو کہتے ہیں کہ ظلم نہ کرو لیکن جب ظلم کی تعریف کی طرف آتے ہیں تو ہر فعل کو اپنے لئے جائز قرار دے دیتے ہیں۔ لوگ منہ سے تو یہ کہتے ہیں کہ جھوٹ نہ بولو لیکن جب موقعہ آئے تو خود جھوٹ بول لیتے ہیں۔ لوگ یہ تو کہتے ہیں کہ کسی کا مال غصب نہ کرو۔ لیکن ضرورت پر خود دوسروں کا مال چھین کر کھا جاتے ہیں اور اُن کے نزدیک ان گناہوں کی تعریفیں بہت محدود ہو جاتی ہیں۔ نبی نہ صرف ان اعمال کی تعریفوں کو مکمل کرتے ہیں بلکہ اُن پر عمل کر کے بھی دکھا دیتے ہیں بیشک ان سے پہلے بھی لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ سچ بولنا چاہیے مگر اس کے باوجود وہ جھوٹ بولتے ہیں اور اگر ان کو توجہ دلائی جائے کہ تم جھوٹ کیوں بولتے ہو تو کہتے ہیں سچ بولنے سے اس دنیا میں کام نہیں چلتا اور باوجود اس کے کہ لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ دھوکا بازی ایک بری چیز ہے پھر بھی وہ دھوکا بازی کرتے ہیں۔ اور اگر ان سے کہا جائے کہ تم دھوکا بازی کیوں کرتے ہو تو وہ کہتے ہیں کہ اس کے بغیر دنیا میں گذارہ ہی نہیں۔ اسی طرح وہ دنیا کے مال لوٹتے ہیں اور اگر اُن سے کہا جائے کہ تم لوگوں کے مال کیوں لوٹتے ہو۔ تو وہ جواب دیتے ہیں کہ اس کے بغیر دنیا میں کام ہی نہیں چلتا۔ دنیا میں ہر شخص بھیڑیا ہے۔ اگر وہ بکری کا گوشت نہیں کھائے گا تو زندہ کس طرح رہے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کئی نسلیں یہ خیال کرنے لگ جاتی ہیں کہ نیک باتیں صرف کہنے سے تعلق رکھتی ہیں ان پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن نبی دنیا کے لئے نمونہ بنتا ہے اور انہیں اُن سچائیوں اور اُن صداقتوں پر عمل کر کے دکھا دیتا ہے جن کو وہ ناقابلِ عمل تصوّر کر رہے ہوتے ہیں۔ چنانچہ جو لوگ اس لئے جھوٹ بولتے ہیں کہ اُن کے خیال میں سچ بولا ہی نہیں جا سکتا۔ اور جو لوگ اس لئے ظلم کرتے ہیں کہ اُن کے نزدیک رحم کیا ہی نہیں جا سکتا۔ انبیاء کے نمونہ کو دیکھ کر ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور جب وہ دیکھتے ہیں کہ یہ بھی ہمارے جیسا ایک انسان ہے جو سچ بولتا ہے کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ کسی کا حق نہیں مارتا اور ہر قسم کی برائیوں سے اجتناب کرتا ہے تو ان کے حوصلے بلند ہو جاتے ہیں۔ اور وہ بھی نیکیوں پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

پس انبیاء کی بعثت کی یہ دو اغراض ہوتی ہیں **اوّل** یہ کہ ان کے ذریعہ روحانی تعلیم کی علمی طور پر تکمیل ہوتی ہے۔ **دوسرے** وہ خود عمل کر کے اُس علم کی صحیح تشریح کر دیتے ہیں۔ بیشک لوگ نبی کی بعثت سے پہلے بھی یہی کہتے ہیں کہ سچ بولنا چاہیے مگر سچ کی تعریف بہت ناقص کرتے ہیں۔ وہ بیشک کہتے ہیں کہ کسی دوسرے پر ظلم نہیں کرنا چاہیے لیکن ظلم

کی تعریف غلط کرتے ہیں اس کے علاوہ ان کا عمل ان کی تعریف سے بھی ناقص ہوتا ہے۔ جس چیز کو وہ سچ کہتے ہیں اس پر بھی وہ عمل نہیں کرتے اور جس امر کو وہ ظلم کہتے ہیں اس سے بھی وہ نہیں بچتے۔ جب نبی آتا ہے تو وہ ہر قسم کی نیکی اور بدی کی ایک جامع اور مکمل تعریف اُن کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اور پھر تمام احکام پر خود عمل کر کے دکھاتا ہے اور اس طرح اپنا نمونہ پیش کر کے لوگوں کے حوصلوں کو بلند کر دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس بات کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرماتا ہے کہ بہت برکت والا وہ خدا ہے جس نے ایسا کلام بھیجا جو تمام قسم کی باریکیاں بیان کرتا ہے اور حق و باطل میں امتیاز کر کے دکھاتا ہے۔ اور پھر برکت والا وہ خدا ہے جس نے وہ برکت کسی ایسے انسان کے سپرد نہیں کی جو بد عمل ہو اور بجائے دین کی طرف راغب کرنے کے لوگوں کو دین سے بیگانہ کرنے والا ہو۔ بلکہ اُس نے وہ کتاب ایسے شخص کو دی جس نے اپنی ذات اور اپنی دنیوی زندگی پر موت وارد کی اور اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کو اپنے نفس کے اندر داخل کر لیا۔ اور اپنے نیک نمونہ سے دنیا کو نیکی کی طرف کھینچ لایا۔

پھر اگر اس روایت کو مدنظر رکھا جائے جس میں یہ ذکر آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ کی جگہ عَلٰی عِبَادِہٖ پڑھنے کی بھی اجازت دی تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ بڑی برکت والا ہے وہ خدا جس نے یہ فرقان اپنے تمام بندوں کے لئے نازل کیا ہے۔ خواہ وہ کسی قسم کی طبیعت اور رجحان رکھنے والے ہوں۔ یہ امر بھی اسلام کی صداقت اور اس کے عالمگیر مذہب ہونے کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے۔ اسلام کی تعلیم پر غور کر کے دیکھ لو اُس نے اپنے تمام احکام میں ہر قسم کی طبائع کو مدنظر رکھا ہے تا کہ انسانی نفس پر کوئی ایسا بوجھ نہ پڑے جو اس کے لئے ملال کا موجب بن جائے۔ اُس نے روٹی کھانے میں بھی اعتدال کا حکم دیا ہے اور پانی پینے میں بھی اعتدال کا حکم دیا ہے بلکہ یہاں تک فرمایا ہے کہ اگر تم نماز پڑھو تو اس میں بھی اعتدال سے کام لو۔ روزہ رکھو تو اس میں بھی اعتدال سے کام لو۔ مال خرچ کرو تو اس میں بھی اعتدال سے کام لو حدیثوں میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ اپنے گھر تشریف لے گئے تو آپ نے دیکھا کہ ام المومنین حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے چھت کے ساتھ ایک رسّا لٹکایا ہوا ہے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ یہ رسّہ کیسا ہے۔ آپؐ کو بتایا گیا کہ حضرت زینبؓ جب نماز پڑھتے پڑھتے تھک جاتی ہیں تو اس سے سہارا لے لیتی ہیں۔ آپ نے فرمایا اسے اتار دو۔ یہ کوئی نماز نہیں جب نماز پڑھتے پڑھتے انسان تھک جائے تو اُسے چاہیے کہ آرام کرے۔

(بخاری کتاب التھجد باب مایکرہ فی التشدید فی العبادۃ)

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق احادیث میں آتا ہے کہ انہوں نے ایک دفعہ عہد کیا کہ میں ہر روز

روزہ رکھا کروں گا۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع ملی تو آپ نے انہیں اس سے منع کیا اور فرمایا یہ جائز نہیں۔ اگر تمہیں بہت ہی شوق ہے تو ایک دن روزہ رکھا کرو اور ایک دن نہ رکھا کرو (بخاری کتاب الصوم باب صوم الدھر)۔ یہی اعتدال کا حکم باقی احکام میں بھی ہے۔ مثلاً اسلام اپنے مال کو خرچ کرنے کا بھی حکم دیتا ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا (بنی اسراءیل: ۳۰) یعنی نہ تو اپنے ہاتھوں کو اپنی گردن سے باندھ دو یعنی بخل سے کام لو اور نہ اپنا ہاتھ ایسا کھول دو کہ سب مال ضائع ہو جائے اور لوگ تمہیں ملامت کریں اور تم آئندہ مال کمانے کے سامانوں سے بھی محروم ہو جاؤ۔ غرض اسلام نے کوئی تعلیم ایسی نہیں دی جس کا برداشت کرنا انسانی فطرت کے لئے مشکل ہو بلکہ وہ ایک بیمار اور کمزور کے لئے بھی اُسی طرح قابلِ عمل ہے جس طرح ایک مضبوط اور طاقتور انسان کے لئے اسی طرح اُس کی تعلیم عورتوں کے لئے بھی قابلِ عمل ہے اور مردوں کے لئے بھی۔ بچوں کے لئے بھی قابلِ عمل ہے اور بوڑھوں کے لئے بھی۔ امیروں کے لئے بھی قابلِ عمل ہے اور غریبوں کے لئے بھی۔ اس کے دامانِ فیض سے دنیا کا کوئی متنفس محروم نہیں اور اس کے دائرہ ہدایت سے دنیا کا کوئی ملک اور کوئی قوم باہر نہیں جس طرح خدا تعالیٰ کا سورج ایک بادشاہ کے محلات پر بھی چمکتا ہے اور ایک غریب کی جھونپڑی کو بھی اپنے نور سے منور کرتا ہے اسی طرح اسلام کی روحانی تعلیم غریب اور امیر کو یکساں فوائد پہنچاتی اور ہر ایک کو خدا تعالیٰ کے قریب پہنچاتی ہے وہ چھوٹے اور بڑے اور غریب اور امیر اور عورت اور مرد اور مشرقی اور مغربی اور کمزور اور طاقتور اور حاکم اور رعایا اور آقا اور مزدور اور خاوند اور بیوی اور ماں باپ اور اولاد اور بائع اور مشتری اور ہمسائے اور مسافر سب کے لئے راحت اور امن اور ترقی کا پیغام ہے۔ وہ بنی نوع انسان میں سے کسی گروہ کو اپنے خطاب سے محروم نہیں کرتا۔ وہ اگلی اور پچھلی تمام اقوام کے لئے ایک ہدایت نامہ ہے جس طرح عالم الغیب خدا کی نظر پتھروں کے نیچے پڑے ہوئے ذروں پر بھی پڑتی ہے اور آسمان میں چمکنے والے ستاروں پر بھی اسی طرح اسلام کی تعلیم غریب سے غریب اور کمزور سے کمزور انسانوں کی ضرورتوں کو بھی پورا کرتی ہے۔ اور امیر سے امیر اور قوی سے قوی انسانوں کی احتیاجوں کا بھی خیال رکھتی ہے۔ وہ صرف گذشتہ مذاہب کی ایک نقل نہیں بلکہ وہ مذہب کی زنجیر کی آخری کڑی اور نظام روحانی کا سورج ہے۔ بیشک مذہب کے نام میں دنیا کے تمام مذاہب شریک ہیں اُسی طرح جس طرح کوئلہ اور ہیرا کاربن کے نام میں شریک ہیں۔ لیکن ہیرا ہیرا ہی ہے اور کوئلہ کوئلہ ہی ہے جس طرح پتھر کا نام کنکریلے پتھر اور سنگِ مرمر دونوں پر بولا جاتا ہے لیکن کنکریلا پتھر کنکریلا پتھر ہی ہے اور سنگِ مرمر سنگِ مرمر ہی دونوں میں کوئی نسبت ہی نہیں ہوتی۔

پھر فرماتا ہے لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا لِيَكُوْنَ میں چونکہ ضمیر تو ظاہر کی گئی ہے لیکن اس کا فاعل ظاہر نہیں کیا گیا۔ اس لئے ضمیر سے پہلے جتنی چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے اُن سب کی طرف اس کی ضمیر پھر سکتی ہے۔ لِيَكُوْنَ سے پہلے اللہ تعالیٰ کا بھی ذکر ہے جیسا کہ فرمایا تَبٰرَكَ الَّذِيْ اور قرآن کریم کا بھی ذکر ہے جیسا کہ فرمایا نَزَّلَ الْفُرْقَانَ۔ پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ذکر ہے جیسا کہ فرمایا عَلٰى عَبْدِهٖ۔ پس چونکہ ضمیر سے پہلے ان تینوں وجودوں کا ذکر ہے اس لئے ان تینوں کی طرف لِيَكُوْنَ کی ضمیر پھر سکتی ہے اور معنے یہ بنتے ہیں کہ اُس نے یہ فرقان اس لئے نازل کیا ہے تا کہ اللہ تعالیٰ ساری دنیا کا نذیر بن جائے یا قرآن کریم ساری دنیا کا نذیر بن جائے یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ساری دنیا کے نذیر بن جائیں۔ اور چونکہ ان میں سے کوئی معنے بھی اس جگہ متعذر نہیں اس لئے یہ تینوں معنے ہی یہاں چسپاں ہو سکتے ہیں۔

قرآن کریم کی یہ خوبی ہے کہ وہ کئی مقامات پر صرف ضمائر سے کام لیتا ہے اور اس طرح ایک وسیع مضمون کو چند الفاظ میں بیان کر دیتا ہے اگر یہاں لِيَكُوْنَ اللّٰهُ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ہوتا تو دو تہائی مضمون ضائع ہو جاتا اور ایک تہائی مضمون رہ جاتا اور اگر اللہ تعالیٰ فرماتا لِيَكُوْنَ الْفُرْقَانُ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا تو پھر بھی دو تہائی مضمون ضائع ہو جاتا۔ اور ایک تہائی مضمون رہ جاتا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ لِيَكُوْنَ عَبْدُهٗ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا فرماتا تو بھی دو تہائی مضمون ضائع ہو جاتا اور ایک تہائی مضمون رہ جاتا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ یہ فرماتا کہ لِيَكُوْنَ اللّٰهُ وَالْفُرْقَانُ وَ رَسُوْلُهٗ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا تو اس طرح عبارت میں طوالت پیدا ہو جاتی اور پھر اگر یہی طریق ہر جگہ اختیار کیا جاتا تو قرآن کریم موجودہ حجم سے کئی گنا بڑا ہو جاتا۔ پس اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ضمائر اور مصادر کو لا کر مضمون کی وسعت کو بھی برقرار رکھا ہے اور کلام میں اختصار بھی پیدا کر دیا ہے۔ ان ضمائر کو مدنظر رکھتے ہوئے لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا میں پہلا مضمون یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ ساری دنیا کا خدا ہے۔ اس لئے ضروری تھا کہ اس کی مشیت ساری دنیا کے لئے ہو اور وہ ساری دنیا کے لئے ہدایت اور رشد کا سامان پیدا کرے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے دنیا میں مختلف علاقوں کی طرف علیحدہ علیحدہ انبیاء مبعوث ہوتے تھے اور چونکہ اُن کی تعلیم میں خاص خاص قوموں کو مخاطب کیا جاتا تھا۔ اس لئے جہاں اُن قوموں نے اس تعلیم کی راہنمائی میں خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کیا وہاں اُن میں آہستہ آہستہ یہ خیال بھی پیدا ہو گیا کہ خدا تعالیٰ صرف ہمارا ہی خدا ہے دوسری قوموں کا نہیں۔ ہاں قرآن کریم نے بائیبل کو اس الزام سے بچانے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ سورۂ شعراء میں جہاں موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا ذکر آتا ہے وہاں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام سے یہی کہا کہ فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (الشعراء:۱۷)

یعنی فرعون کے پاس جاؤ اور اُسے کہو کہ ہم رب العالمین خدا کے فرستادہ ہیں جو تمہاری اصلاح کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ اس پر فرعون نے سوال کیا کہ یہ رب العالمین کون ہے؟ جس کی طرف سے مبعوث کئے جانے کا تم دعویٰ کر رہے ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ (الشعراء:۲۵) رب العالمین خدا وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان پایا جاتا ہے اُن سب کا رب ہے بشرطیکہ تم اس پر ایمان اور یقین پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے رب العالمین کے الفاظ ہی نکلوائے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام یہی تعلیم دیتے تھے کہ خدا صرف بنی اسرائیل کا خدا نہیں بلکہ ساری دنیا کا خدا ہے۔ مگر افسوس کہ باوجود اس کے کہ قرآن کریم نے یہ نکتہ بیان کر دیا تھا۔ پھر بھی یہودیوں اور عیسائیوں نے خدا تعالیٰ کو رب العالمین قرار نہیں دیا۔ بلکہ مخصوص قوموں کا رب قرار دے دیا چنانچہ بائیبل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس میں بار بار ''اسرائیل کا خدا'' کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ جو بتاتے ہیں کہ یہودیوں کے دل و دماغ پر یہی خیال غالب رہا کہ وہ خدا جسے بائیبل پیش کرتی ہے کسی اور قوم کا خدا نہیں بلکہ صرف بنی اسرائیل کا خدا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے۔

''خداوند اسرائیل کا خدا مبارک ہو جس نے تجھے آج کے دن مجھ سے ملنے کو بھیجا۔''

(۱ سموئیل باب ۲۵ آیت ۳۲)

''خداوند اسرائیل کا خدا مبارک ہو جس نے ایک وارث بخشا کہ وہ میری ہی آنکھوں کے دیکھتے ہوئے آج میرے تخت پر بیٹھے۔'' (۱۔سلاطین باب ۱ آیت ۴۸)

''خداوند اسرائیل کا خدا ازل سے ابد تک مبارک ہو۔'' (۱۔تواریخ باب ۱۶ آیت ۳۶)

''خداوند اسرائیل کا خدا مبارک ہو جس نے اپنے مونہہ سے میرے باپ داؤد سے کلام کیا۔''

(۲۔تواریخ باب ۶ آیت ۴)

''خداوند اسرائیل کا خدا مبارک ہو۔'' (زبور باب ۷۲ آیت ۱۸)

غرض بائیبل صرف بنی اسرائیل کے خدا کو پیش کرتی ہے لیکن قرآن کریم پڑھ کر دیکھ لو اس میں ہر جگہ یہی لکھا ہوا نظر آئے گا کہ میں ساری دنیا کا خدا ہوں۔ میں جن و انس کا خدا ہوں اور میں تمام مخلوق کا رب ہوں خواہ کوئی مسلمان ہو یا ہندو ہو یا عیسائی ہو یا یہودی وغیرہ ہو۔ اس تعلیم کو پڑھ کر ایک یہودی کا دل بھی یہ محسوس کرنے لگے گا کہ اس کلام کا اتارنے والا خدا اُسی طرح میرا خدا ہے جس طرح وہ مسلمانوں کا خدا ہے۔ اگر ایک عیسائی قرآن کریم

پڑھے گا تو اس کا دل بھی یہی محسوس کرے گا کہ قرآن کریم کو بھیجنے والا خدا اُسی طرح میرا خدا ہے جس طرح وہ ایک مسلمان کا خدا ہے۔ اگر ایک ہندو قرآن کریم کو پڑھے گا تو اس کا دل بھی یہ محسوس کرے گا کہ اس کتاب کو بھیجنے والا خدا اسی طرح میرا خدا ہے جس طرح ایک مسلمان کا خدا ہے لیکن یہ بات کسی اور کتاب میں نظر نہیں آتی۔

اسی طرح قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ (بنی اسراءیل:۲۱) یعنی یہ خیال کر لینا کہ اللہ تعالیٰ صرف مسلمانوں کی مدد کرتا ہے۔ غلط ہے بلکہ وہ اس قوم کی بھی مدد کرتا ہے اور اس قوم کی بھی مدد کرتا ہے یعنی ساری اقوام کی مدد کرتا ہے۔ اور اس کی رحمت کسی خاص قوم سے مخصوص نہیں بلکہ خواہ کوئی مومن ہو یا غیر مومن جو بھی اللہ تعالیٰ کے قوانین پر عمل کر کے ان سے فائدہ اٹھائے گا ترقی کر جائے گا۔ چنانچہ دنیا میں ہمیں عملی رنگ میں یہی نظر آتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا فضل دنیوی فوائد اور ترقیات کے رنگ میں عیسائیوں کو بھی پہنچ رہا ہے ہندوؤں کو بھی پہنچ رہا ہے۔ بُدھوں کو بھی پہنچ رہا ہے۔ پارسیوں کو بھی پہنچ رہا ہے۔ یہودیوں کو بھی پہنچ رہا ہے۔ اور مسلمانوں کو بھی پہنچ رہا ہے۔ ہاں روحانی فیضان صرف اس قوم کو ملتا ہے جو روحانی طور پر اللہ تعالیٰ سے منسلک ہوتی ہے۔ لیکن دنیوی کوشش جو بھی کرے اُس کو فائدہ پہنچ جاتا ہے خواہ وہ مومن ہو یا غیر مومن۔ اس کے لئے مذہب اور ایمان کوئی شرط نہیں۔

اسی طرح ویدوں کو پڑھا جائے تو ان کے مطالعہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نازل کرنے والا خدا صرف ہندو قوم سے تعلق رکھتا ہے دوسری قوموں سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ وید کے ماننے والوں میں تو ویدوں کو اس حد تک ہندوستان کی اونچی ذاتوں کے ساتھ مخصوص کیا گیا تھا کہ مَنُو جو تمام ہندو قوم آریہ اور سناتن دھرم کا تسلیم شدہ شارح قانون ہے لکھتا ہے کہ۔

’’شودر اگر وید کو سُن لے تو راجہ سیسہ اور لاکھ سے اُس کے کان بھر دے۔ وید منتروں کا اچارن (تلاوت) کرنے پر اس کی زبان کٹوا دے۔ اور اگر وید کو پڑھ لے تو اس کا جسم ہی کاٹ دے۔‘‘

(گوتم سمرتی ادھیائے نمبر ۱۲)

اسی طرح خود وید میں غیر قوموں کے لئے جو تعلیم موجود ہے۔ وہ نہایت ہی خطرناک ہے۔ رِگ وید میں ویدک دھرم کے مخالفین کو کُتّا قرار دیتے ہوئے یہ بددُعا کی گئی ہے کہ

’’اے آگ دیوتا تُو ان برے کتّوں (یعنی مخالفین) کو دُور لے جا کر باندھ دے۔‘‘

اتھروید میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ غیر ویدک دھرمی لوگوں کو جکڑ کر ان کے گھروں کو لوٹ لینا چاہیے۔ لکھا ہے کہ

’’اے ویدک دھرمی لوگو! تم چیتے جیسے بن کر اپنے مخالفین کو پھاڑ دو اور پھر ان کے کھانے تک کی چیزیں زبردستی اٹھالو۔‘‘ (اتھر وید کانڈ ۴ سوکت ۲۲ منتر ۷)

اسی طرح وید میں چاند، سورج، آگ، پانی اور اندؔر سے یہاں تک کہ گھاسؔ سے بھی یہ دُعائیں کی گئی ہیں کہ غیر ویدک دھرمی لوگوں کو تباہ و برباد کر دیا جائے۔ چنانچہ لکھا ہے

’’اے آگ تو ہمارے مخالفوں کو جلا کر راکھ کر دے۔‘‘ (یجر وید ادھیائے ۱۳ منتر ۱۲)

’’اے اندر! تو ہمارے مخالفوں کو چیر پھاڑ ڈال اور جو ہم سے نفرت رکھتے ہیں انہیں تتر بتر کردے۔‘‘ (سام وید پارٹ دوم کانڈ ۹ سوکت ۲ منتر ۹)

’’اے مخالو! تم سر کٹے ہوئے سانپوں کی طرح بے سر اور اندھے ہو جاؤ۔ اس کے بعد پھر اندر دیوتا تمہارے چیدہ چیدہ لوگوں کو تباہ کر دے۔‘‘ (سام وید پارٹ دوم کانڈ ۹ سوکت ۳ منتر ۹)

’’اے دبھ گھاس! تُو ہمارے مخالفوں کو جلا دے اور تباہ کر اور جس طرح تو پیدا ہوتے وقت زمین کو چیر کر باہر نکل آتا ہے ویسے ہی تو ہمارے مخالفوں کے سروں کو چیرتا ہوا اوپر کو نکل کر ان کو تباہ کر کے زمین پر گرادے۔‘‘ (اتھر وید کانڈ ۱۹ سوکت ۲۸ منتر ۴)

پھر ہندو دھرم میں یہ بھی تعلیم موجود ہے کہ غیر ویدک دھرمی لوگوں کے ساتھ بات چیت بھی نہ کرو (گوتم دھرم سوترا دھیائے ۵) اور اگر کوئی ویدوں پر اعتراض کرے تو اُسے ملک سے باہر نکال دو۔ یعنی اسے حبس دوام کی سزادو۔ (ہندو دھرم شاستر)

اس تعلیم کے پڑھنے سے کسی انسان کے دل میں ویدک دھرم کے متعلق محبت کے جذبات پیدا نہیں ہو سکتے۔ اور نہ کوئی انسان ایسے مذہب کو اپنی نجات کا ضامن قرار دے سکتا ہے۔ یہی حال کنفیوشس ازم اور زرتشتی مذہب کا ہے۔ انہوں نے بھی کبھی ساری دنیا کو اپنا مخاطب نہیں سمجھا اور نہ ساری دنیا کو تبلیغ کرنے کی کوشش کی۔ بلکہ جس طرح ہندو مذہب کے مطابق ہندوستان خدا تعالیٰ کے خاص بندوں کا ملک تھا۔ اسی طرح کنفیوشس ازم کے مطابق صرف چین آسمانی بادشاہت کا مظہر تھا۔ اور زرتشتیوں کے نزدیک صرف ایران آسمانی بادشاہت کا مظہر تھا۔ غرض تمام مذاہب خدا تعالیٰ کو صرف اپنی اپنی قوم کا خدا قرار دے رہے تھے اور وہ خدا جس کی ربوبیت کے فیضان سے ساری دنیا فائدہ اٹھا رہی ہے اس کی ربوبیت عالمین سے وہ ایک رنگ میں انکار کر رہے تھے۔ پس ضروری تھا کہ اللہ تعالیٰ کا وجود اپنے حقیقی حسن کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا جاتا اور خدا تعالیٰ کو رب العالمین کی شکل میں ظاہر کیا جاتا اور

بتایا جاتا کہ تمہارا خدا کسی ایک قوم یا ملک کا خدا نہیں بلکہ ساری دنیا کا خدا ہے۔ اسی مضمون کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے کہ میں وہ خدا ہوں جو ہندوؤں، عیسائیوں، آریوں، دہریوں، ایرانیوں اور یونانیوں سب کا خدا ہوں میں ہر ملک میں رہنے والوں کا خدا ہوں اور ہر زبان بولنے والوں کا خدا ہوں۔ میں گوروں کا بھی خدا ہوں اور کالوں کا بھی خدا ہوں۔ دنیا میں جس قدر اقوام ہیں ان سب کا خدا ہوں اور سارے ہی میرے بندے ہیں۔ اور میں نے سب کو بیدار اور ہوشیار کرنے کے لئے یہ کلام اتارا ہے یہ تعلیم جو قرآن کریم نے پیش کی ہے کتنی اچھی اور فطرت کے مطابق ہے۔ اس تعلیم کے پڑھنے سے انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کے نہایت گہرے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں لیکن پہلی تعلیموں کو پڑھ کر دل میں نفرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں جب تک دنیا اکٹھی نہیں ہوئی تھی اور ایک ملک کے لوگ دوسرے ملک کے لوگوں سے جُدا تھے۔ اگر اس وقت ایسی تعلیم بھیجی جاتی جو تمام دنیا کے لئے ہوتی تو بہت سے ملک اس تعلیم سے محروم رہ جاتے اس لئے اللہ تعالیٰ نے مختلف وقتوں میں مختلف تعلیمیں نازل کیں۔ وہ تعلیمیں اپنے اپنے وقت میں کامل تھیں اور اُن کے ذریعے مختلف قومیں ہدایت پاتی رہیں لیکن بعد میں جب کہ میل جول کے ذرائع وسیع ہو گئے اور رسل و رسائل کے راستے کھل گئے اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی تعلیم نازل فرمائی جو تمام دنیا کے لئے تھی اور تمام دنیا کی ضرورتوں کا علاج اس میں موجود تھا۔ تمام مؤرخ اس بات پر متفق ہیں کہ پری ہسٹارک Pre historic زمانہ سے مراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے پہلے کا زمانہ ہے اور ہسٹارک Historic زمانہ سے مراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب کا زمانہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اِن رسل و رسائل کے ذرائع کو وسیع کر کے بتادیا کہ اب لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا کا زمانہ آگیا ہے جس میں تمام دنیا کا نقطۂ مرکزی پر جمع ہونا ضروری ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں بہت برکتوں والا خدا ہوں۔ اور پھر اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں نے ایسی کتاب نازل کی ہے جو تمام دنیا کو ہدایت دینے والی ہے اور حق و باطل میں فرق کر کے دکھانے والی ہے اور جو کلام ایک زمانہ میں نازل ہو کر ہر زمانہ کے لوگوں کے لئے ہدایت کا موجب ہو وہ یقیناً اُس کلام کے بھیجنے والے کی بڑائی اور عظمت پر دلالت کرتا ہے۔ چونکہ اس کتاب کے ذریعہ ہر زمانہ کے لوگوں نے ہدایت پانی تھی اس لئے ہر زمانہ کا نام عالم رکھا گیا اور بتایا گیا کہ یہ کتاب قیامت تک آنے والی تمام نسلوں کی ہدایت کا ایک یقینی اور قطعی ذریعہ ہے۔ پہلی کتابیں بے شک اپنے اپنے وقت میں ہدایت کا موجب تھیں لیکن وہ اپنے اندر عالمگیر تعلیم نہیں رکھتی تھیں۔ یعنی نہ تو تمام قوموں کے لئے تھیں نہ تمام زمانوں کے لئے تھیں۔ مگر اب دنیا ایسے مقام پر پہنچ گئی تھی کہ اس کے لئے ایک ہی نذیر کی ضرورت تھی۔ پس برکت والے خدا نے ایک بادلیل کتاب اپنے فرمانبردار اور اعلیٰ نمونہ پیش کرنے والے بندہ پر اس لئے

نازل کی ہے تا کہ وہ گورے اور کالے اور مغربی اور مشرقی سب کو ہوشیار کر دے اور ہر زمانہ میں ہوشیار کرتا چلا جائے یہی دعویٰ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بھی فرمایا ہے کہ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (سبا:۲۹) یعنی اے ہمارے رسول! ہم نے تجھے ساری دنیا کی طرف بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے لیکن اکثر لوگ اس بات کو سمجھتے نہیں کیونکہ پہلے ہر نبی اپنی اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا اور جو تعلیم وہ لاتا تھا صرف اپنی قوم کے لئے لاتا تھا۔ چنانچہ ہندوستان میں اگر رام اور کرشن اور بُدھ حکومت کر رہے تھے تو ایران میں زرتشت حکومت کر رہے تھے۔ چین میں کنفیوشس حکومت کر رہے تھے۔ اسی طرح کوئی موسیٰ ؑ کی امت تھا تو کوئی عیسیٰ ؑ کی۔ مگر خدا نے کہا اب دنیا میں ایک ہی مذہب کی حکومت ہوگی اور ظاہری اور باطنی طور پر تمام دنیا ایک ہی جھنڈے کے نیچے ہوگی۔ گویا لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا فرما کر مسلمانوں کو توجہ دلائی گئی ہے کہ اسلام کے ظہور کی اصل غرض یہ ہے کہ دنیا کے سارے لوگوں کو خواہ وہ ہندو ہوں۔ عیسائی ہوں، یہودی ہوں، پارسی ہوں، مجوسی ہوں یا کسی اور مذہب سے تعلق رکھتے ہوں بتایا جائے کہ اس دنیا کا پیدا کرنے والا ایسا خدا ہے جو تمام دنیا کو اب ایک ہی کتاب اور ایک ہی رسول پر اکٹھا کرنا چاہتا ہے اور اس طرح مسلمانوں کو نصیحت کی گئی ہے کہ اُن کا ایک ہی وقت میں ان سب مذاہب پر تبلیغی حملہ ہونا چاہیے کیونکہ وہ برکتوں والا اُسی وقت ثابت ہوسکتا ہے۔ جبکہ مسلمان بھی اپنے عمل سے ثابت کر دیں کہ وہ برکتوں والا ہے اور اس کی خوبیوں اور کمالات کو تمام دنیا میں روشن کر دیں۔ آخر دین کے کاموں کے لئے اللہ تعالیٰ خود تو آسمان سے نہیں اُترتا اُس کے بندے ہی کام کیا کرتے ہیں۔ پس لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا تب ہی صحیح ثابت ہو سکتا ہے جب کہ تمام دنیا کو اس کا پیغام پہنچ جائے۔ اور وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ سے بہت دُور جا چکے ہیں پھر اس کے اطاعت گذار بندے بن جائیں۔ دیکھو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ؓ نے جب یہ کہا کہ قرآن کریم تمام دنیا کے لئے ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام قوموں کی طرف آئے ہیں تو انہوں نے اپنے عمل سے بھی اس بات کو سچا ثابت کر کے دکھا دیا اور ساری دنیا میں اسلام پھیلا دیا لیکن اب ہر قوم کو اور ہر جماعت کو اور ہر زبان بولنے والے کو اور ہر ملک کے رہنے والے کو تبلیغ نہیں پہنچے گی تو اس کی ذمہ داری ہماری جماعت پر ہوگی۔ کیونکہ خدا تعالیٰ نے ہمیں اسی غرض کے لئے کھڑا کیا ہے کہ ہم اسلام کو تمام دنیا پر غالب کریں اور اللہ تعالیٰ کا نام دنیا کے کونے کونے میں پہنچا دیں۔ پس لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا میں جہاں قرآن کریم کی افضلیت کا ذکر کیا گیا ہے وہاں اس میں مسلمانوں کو تبلیغِ اسلام کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے جس پر ان کی تمام کامیابیوں کا دار و مدار ہے۔

لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا کی دوسری ضمیر قرآن کریم کی طرف پھرتی ہے اور اس لحاظ سے اس آیت کے یہ معنے

ہیں کہ قرآن کریم اس لئے نازل کیا گیا ہے تا کہ ساری دنیا کے لئے نذیر ہو۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نذیر بننا ہمارا کام نہیں بلکہ قرآن کریم کا کام ہے۔اور وہی لوگوں کے لئے نذیر بن سکتا ہے یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھ لو کہ ہم دنیا کو ہدایت نہیں دے سکتے بلکہ قرآن کریم ہی دنیا کو ہدایت دے سکتا ہے۔اگر ہمارے ذریعہ سے یا دوسرے لوگوں کے ذریعہ سے دنیا کو ہدایت ملنی ہوتی تو اللہ تعالیٰ یہ فرماتا کہ لِيَكُونُوا لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا تا کہ تم تمام دنیا کے لئے نذیر بن جاؤ۔لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں کہا بلکہ اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ ہم نے قرآن کریم کو اس لئے نازل فرمایا ہے تا کہ یہ قرآن تمام دنیا کے لئے نذیر ہو۔پس اگر کوئی چیز دنیا کو بیدار کر سکتی ہے اور اگر کوئی کلام دنیا کو ڈرا سکتا ہے۔تو وہ صرف قرآن کریم ہی ہے اور جب قرآن کریم ہی دنیا کو بیدار کر سکتا ہے اور وہی دنیا کی ہدایت کا موجب بن سکتا ہے تو سوال یہ ہے کہ کیا ہم میں سے ہر ایک نے قرآن کریم پڑھا ہے یا کیا اُسے سمجھنے اور پھیلانے کی کوشش کی ہے؟ اگر ہم نے قرآن کریم نہیں پڑھا اور اُسے سمجھنے اور پھیلانے کی کوشش نہیں کی تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ہم اسلام کے سپاہی نہیں۔کیونکہ ہم نے اس ہتھیار کی طرف توجہ نہیں کی جس کے ذریعہ سے یہ دنیا فتح ہو سکتی ہے۔پس قرآن کریم کو نذیر قرار دے کر اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ تم قرآن کریم کو بار بار پڑھو اور اُسے سمجھنے اور پھیلانے کی کوشش کرو۔ یہاں تک کہ جب تم بولو تو تمہاری زبانوں سے قرآن کریم جاری ہو۔اور جب تم لکھو تو تمہاری قلموں سے قرآن کریم جاری ہو۔اور تمہارے خیالات اور تمہارے جذبات اور تمہاری خواہشات سب کی سب قرآن کریم کے تابع ہوں۔ جب تک تمہاری زبانوں سے قرآن کریم نہیں بولے گا اور جب تک تمہاری قلموں سے قرآن کریم نہیں نکلے گا اس وقت تک دنیا تمہارے ذریعہ سے ہدایت نہیں پا سکتی۔

لِيَكُونَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا کی تیسری ضمیر جیسا کہ میں نے بتایا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھرتی ہے۔پس اس لحاظ سے اس آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ بہت برکتوں والا وہ خدا ہے جس نے فرقان کے نازل کرنے کے لئے ایسے انسان کو چنا جس کا ظاہر اور باطن ایک ہے اور تمام دنیا کے لئے مثال اور نمونہ کے طور پر ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے اس لئے چُنا ہے تا کہ وہ تمام دنیا کے لئے نذیر بن جائے۔چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مادی جسم کے ساتھ ہمیشہ زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔اس لئے آپ کو قیامت تک آنے والے لوگوں کے لئے نذیر قرار دے کر مسلمانوں کو اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جب تک تم میں سے ہر شخص چھوٹا محمدؐ نہیں بن جاتا اور جب تک تم میں سے ہر فرد اس مقام پر کھڑا نہیں ہو جاتا کہ جب تم کو کوئی دیکھے تو وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر دیکھ لے اُس وقت تک تم دنیا کے انذار میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔تصویر کو دیکھ کر انسان دوسرے شخص کے معائب

بھی معلوم کرسکتا ہے اور محاسن بھی وہ دیکھ سکتا ہے کہ اس کی آنکھیں چھوٹی ہیں یا بڑی۔ اس کا چہرہ کیسا ہے۔ اُس کا سر چھوٹا ہے یا بڑا۔ اس کے اعضاء کا تناسب کیسا ہے؟ اگر کوئی شخص تصویر کو دیکھ کر یہ کہے کہ اس کا سر چھوٹا ہے تو تم یہ نہیں کہو گے کہ یہ تو تصویر ہے اصل نہیں۔ اگر تم یہ جواب دو گے تو ہر شخص تمہیں پاگل سمجھے گا۔ کیونکہ تصویر اصل انسان کا انعکاس ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر تم صحیح طور پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر نہیں بنتے تو تم باقی دنیا کو اعتراض کرنے کا موقعہ دیتے ہو۔ لیکن اگر تم اپنی زندگیاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح بنالو تو تم تمام دنیا کے لئے نذیر بن جاؤ گے اُس وقت یہ سوال ہی نہیں ہوگا کہ تم پڑھے ہوئے ہو یا اَن پڑھ ہو۔ لائق ہو یا نالائق ہو۔ بلکہ ہر حالت میں تم دنیا پر غالب آؤ گے کیونکہ تمہارے وجود میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ لوگوں کو نظر آرہا ہوگا۔

پس اس آیت میں تین چیزیں بیان کی گئی ہیں جن کو مدنظر رکھے بغیر کبھی کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی۔ **اوّل** یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تمہارا انذار ہر قوم کی طرف ہو۔ اور ہر عیسائی یہودی ہندو سکھ بدھ اور زرتشتی تمہارا مخاطب ہو۔ اور تم اللہ تعالیٰ کے اُن بندوں کو جو ہدایت کا راستہ بھول چکے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف لے آؤ۔ اگر ایک ماں کے تین بچے گم ہو جائیں اور اُن میں سے دو کو تم واپس لے آؤ اور تیسرے کو دھتکار دو تو اُن دو کے لانے سے وہ تم پر پوری طرح خوش نہیں ہوگی بلکہ وہ کہے گی کہ وہ تیسرا بچہ بھی مجھے اسی طرح پیارا ہے جس طرح یہ دونوں پیارے ہیں۔ اس لئے جاؤ اور اُسے بھی ڈھونڈنے کی کوشش کرو۔ اسی طرح اگر تم دنیا کی دو ارب آبادی میں سے ایک ارب ننانوے کروڑ، ننانوے لاکھ، ننانوے ہزار نو سو ننانوے کو بھی واپس لے آتے ہو لیکن ایک آدمی کو چھوڑ دیتے ہو اور اس کی طرف توجہ نہیں کرتے تو خدا تعالیٰ تم کو اس کے چھوڑنے پر یہ کہے گا کہ وہ بھی تو میرا بندہ تھا تم نے اُسے واپس لانے کی کیوں کوشش نہیں کی۔

دوسری بات جس کی طرف اس آیت میں توجہ دلائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کریم تمہارے دلوں اور دماغوں پر حاوی ہونا چاہیے کیونکہ قرآن کریم کے لئے فتح مقدر ہے۔ جب تم اپنے وجود کو قرآن کریم کے ساتھ وابستہ کردو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں بھی فتح عطا فرمائے گا۔

تیسری بات اس میں یہ بتائی گئی ہے کہ جب تک تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نقل نہیں کرتے اور آپ کے نقشِ قدم پر نہیں چلتے اور جب تک تم اپنے اپنے دائرہ میں چھوٹے محمدؐ بننے کی کوشش نہیں کرتے اُس وقت تک تم دنیا میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔

پھر فرماتا ہے الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَ خَلَقَ كُلَّ

شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا۔ یعنی لوگوں کی نجات اور اُن کی اُخروی فلاح و بہبود کے لئے یہ عظیم الشان کتاب نازل کرنے والا وہ خدا ہے جس کے قبضہ وتصرف میں آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے جس نے نہ کوئی بیٹا بنایا ہے اور نہ اُس کی بادشاہت میں کوئی شریک ہے۔ اُس نے ہر ایک چیز کو پیدا کیا ہے اور پھر ہر چیز کے لئے اُس نے ایک اندازہ بھی مقرر کیا ہے جو زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ خدا بڑی برکت والا ہے اور وہ ہر عیب اور نقص سے پاک ہے۔

چونکہ اسلام ایک ایسا مذہب تھا جس نے لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا کے ماتحت دنیا کے ہر مذہب اور ہر قوم کو مخاطب کرنا تھا اس لئے لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ فرما کر اللہ تعالیٰ نے اس طرف اشارہ فرمایا کہ اسلامی علماء کو دنیا کی تمام زبانیں سیکھنی چاہئیں۔ لیکن افسوس کہ سوائے کالجوں کے طالب علموں کے کوئی غیر زبان نہیں سیکھتا۔ اور وہ بھی صرف انگریزی سیکھتے ہیں جو ساری دنیا کی زبان نہیں۔ چاہیے کہ ہمارے علماء انگریزی، فرانسیسی، جرمنی، روسی، پرتگیزی، ہسپانوی، لاطینی اور ڈلندیزی وغیرہ سب زبانیں جانتے ہوں اسی طرح سیام کی زبان اور جاپان کی زبان اور فلپائن کی زبان اور دوسرے تمام ممالک کی زبانیں اُن کو آتی ہوں تا کہ ہر جگہ وہ قرآن کریم کو پھیلا سکیں۔ ہمارے احمدی مبلغین کو بھی اس طرف خاص طور پر توجہ کرنی چاہیے۔ بعض مبلغ دس دس سال سے مغربی افریقہ میں کام کر رہے ہیں لیکن ابھی تک انہیں وہاں کی زبان پوری طرح نہیں آئی۔ زبان کا سیکھنا قرآن کریم کے پھیلانے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ جو مبلغ اس طرف توجہ نہیں کرتا وہ مبلّغ کہلانے کا مستحق ہی نہیں وہ اسلام کا ایک غدار سپاہی ہے عرب لوگ اسلام کی ترقی کے زمانہ میں دنیا کی ہر زبان جانتے تھے۔

پھر دنیا کے تمام مذاہب پر تبلیغی حملہ کرنے کے نتیجہ میں چونکہ لازمی طور پر مخالفت کا ایک طوفان اُمنڈ آنا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ کہہ کر مخالفوں کو بھی بتا دیا کہ دیکھو تم اپنی طاقت پر گھمنڈ مت کرو۔ بیشک تمہارے ساتھ بڑے بڑے جتھے ہیں۔ بڑے بڑے ملک تمہارے ساتھ ہیں بڑی بڑی حکومتیں تمہاری تائید میں ہیں۔ لیکن آسمانوں اور زمین کی اصل حکومت خدا تعالیٰ کے قبضہ اور تصرف میں ہے۔ تمہارے پاس تو یہ حکومتیں محض ایک امانت کے طور پر ہیں اس لئے اگر تم نے اس امانت میں خیانت کی اور ہمارے اس پیغام کو ٹھکرا دیا تو یاد رکھو کہ زمین و آسمان کا خدا تمہارے اس انکار کو دیکھ کر خاموش نہیں رہے گا۔ بلکہ اس کی غیرت بھڑکے گی اور وہ تمہیں اس کی سزا دے گا۔ اور پھر اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے قرآن اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کو لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ کہہ کر یہ خوشخبری بھی دی ہے کہ ان کفار کے مظالم سے پریشان نہ ہونا۔ بیشک یہ تمہیں اپنے وطنوں سے بے وطن کر دیں گے تمہاری جائیدادیں چھین لیں گے۔ تمہارے مال اور املاک کو اپنے قبضہ میں لے لیں

گے مگر تمہاری یہ قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی بلکہ زمین و آسمان کا خدا تمہیں تخت وتاج کا وارث بنا دے گا اور اس طرح ساری دنیا پر ثابت ہو جائے گا کہ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ خدا تعالیٰ کے قبضہ وتصرف میں ہی ہے جس نے اس عالمگیر انذار سے فائدہ اٹھانے والوں کو بادشاہ بنا دیا اور بادشاہوں کو ان کے انکار کی سزا میں گدا بنا دیا۔

پھر الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فرما کر اللہ تعالیٰ نے اس طرف بھی اشارہ فرمایا کہ جس طرح خدا تعالیٰ کی ملکیت اور اس کا فیضان کسی ایک قوم یا ملک کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ زمین و آسمان کے ذرہ ذرہ پر اس کی حکومت ہے اسی طرح ضروری تھا کہ کسی وقت تمام قوموں اور افراد کو ایک نقطۂ مرکزی پر جمع کرنے کا بھی سامان پیدا کیا جاتا تا کہ جس طرح زمین و آسمان کا خدا ایک ہے اسی طرح وہ ساری دنیا کو ایک روحانی نقطہ پر بھی جمع کر دے۔ اگر قرآن کریم دنیا میں نہ آتا اور وہ ساری دنیا کو مخاطب نہ کرتا تو ایک عالمگیر روحانی بادشاہت کا کبھی قیام نہ ہوسکتا۔ بیشک ابتدائی زمانوں میں جب آمدورفت کے ذرائع محدود تھے اور ایک ملک کی آواز دوسرے ملک میں نہیں پہنچ سکتی تھی ضروری تھا کہ مختلف ممالک اور مختلف اقوام میں اُس کے ہادی اور رہنما آتے تا کہ دُنیا کا کوئی خطہ اُس کی ہدایت سے محروم نہ رہتا مگر جب ممالک آباد ہونے شروع ہوئے اور آبادیوں کے فاصلے کم ہوتے چلے گئے اور نسلِ انسانی نے دماغی لحاظ سے بھی ارتقاء شروع کیا اور ذرائع آمدورفت میں بھی ترقی ہونے لگی۔ بیلوں کی جگہ گدھوں نے لے لی اور موٹروں اور ریلوں کی جگہ ہوائی جہازوں نے لے لی اور زمین کی طنابیں بالکل کھچ گئیں اور پھر ہوائی جہازوں نے ترقی کرتے کرتے ایسا مقام حاصل کر لیا کہ بارہ گھنٹہ میں ساری دنیا کا چکر لگ سکتا ہے۔ بلکہ تازہ اطلاع تو یہ ہے کہ اب ایک ایسا ہوائی جہاز بھی نکل آیا ہے جو ایک سیکنڈ میں پندرہ میل چل سکتا ہے گویا ایک منٹ میں نوسو میل اور ایک گھنٹہ میں ۵۴ ہزار میل اور بارہ گھنٹہ میں چھ لاکھ اڑتالیس ہزار میل جس کے معنے یہ ہیں کہ بارہ گھنٹے میں وہ کئی دفعہ دنیا کا چکر لگا سکتا ہے تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ نے ایک عالمگیر بادشاہت کا قیام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ فرما دیا۔ اگر قرآن نازل نہ ہوتا تو دنیا پر خدا تعالیٰ کی ملکیت اپنی پوری شان سے ظاہر نہ ہوسکتی۔ دریا کی شان اُسی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جب پہاڑی نالے اس میں گر کر اُسے ایک بحرِ ذخار کی صورت میں تبدیل کر دیں۔ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور زرتشت اور کرشن اور دوسرے تمام انبیاء چھوٹی چھوٹی نہریں تھیں جن میں سے کوئی نہر بنی اسرائیل کی سیرابی کے لئے جاری کی گئی تو کوئی ایران کی پیاس بجھانے کے لئے جاری کی گئی۔ کوئی ہندوستان کے لوگوں کی تشنہ لبی فرو کرنے کے لئے اُن کے ملک میں جاری کی گئی تو کوئی چین کی سرزمین میں وہاں کے باشندوں کی روحانی پیاس بجھانے کے لئے جاری کی گئی مگر ان تمام نالوں اور نہروں کا ایک عظیم الشان دریا میں مل جانا ضروری تھا تا کہ جس

طرح زمین وآسمان کی بادشاہت خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اسی طرح ایک عالمگیر روحانی بادشاہت کا بھی نظارہ نظر آتا اور لوگوں کو رب العالمین خدا کے آستانہ کی طرف کھینچا جاتا۔ پس الَّذِیۡ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ درحقیقت دلیل ہے لِیَکُوۡنَ لِلۡعٰلَمِیۡنَ نَذِیۡرًا کی اور اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم کا نزول بلاوجہ نہیں بلکہ یہ الٰہی سکیم کا ایک اہم حصہ ہے جسے کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ خدا تعالیٰ چاہتا تھا کہ وہ تمام سابق شرائع کو منسوخ کر کے اب ایک ایسی شریعت نازل کرے جو تمام عالم کو ایک نقطۂ مرکزی پر جمع کرنے والی ہو اور اس کے لئے ضروری تھا کہ ایسی سواریاں ایجاد ہو جائیں جو ساری دنیا کی طنابیں کھینچ لیں۔ چنانچہ قرآن کریم نے گھوڑوں اور خچروں اور گدھوں کا ذکر کر کے فرمایا تھا کہ وَیَخۡلُقُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ (النحل:۹) یعنی اللہ تعالیٰ آئندہ زمانہ میں ایسی سواریاں پیدا کرنے والا ہے جو تمہارے وہم وگمان میں بھی نہیں ہیں اور اس طرح دنیا کو ایک نقطۂ مرکزی پر جمع کرنے والا ہے مگر چونکہ یہ عالمگیر مذہب کا تصور اور خدائے واحد کی زمین وآسمان کے ذرّہ ذرّہ پر حکومت کا عقیدہ اُن مذاہب میں کھلبلی ڈالنے والا تھا جو ابنیت کے قائل تھے یا نبیوں کو خدا تعالیٰ کا شریک قرار دیتے تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ ہی ان باطل مذاہب کے خیالات کی بھی تردید کی اور فرمایا وَ لَمۡ یَتَّخِذۡ وَلَدًا۔ خدا تعالیٰ کی آسمان اور زمین کے ذرّہ ذرّہ پر حکومت تو ہے مگر یہ خیال درست نہیں کہ اُس کا کوئی بیٹا ہے جو اُس کی مدد کرتا ہے بلکہ بیٹا ہونا تو الگ رہا وہ بیٹے کے مقام پر بھی کسی کو کھڑا نہیں کرتا یعنی اس حد تک بھی اس کو اپنے ساتھ مشابہت نہیں دیتا جس قدر کہ بیٹے کو اپنے باپ سے مشابہت ہوتی ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عیسائی حضرت مسیحؑ کو خدا تعالیٰ کے بیٹے کی شکل میں پیش کرتے ہیں لیکن حضرت مسیحؑ کی تاریخ اتنی مبہم ہے اور اس پر اتنے حجاب پڑے ہوئے ہیں کہ مسیحیت کی تعلیم کی صداقت عقلی طور پر قیاس میں بھی نہیں آسکتی سوائے اس کے کہ اس تعلیم کے مطابق عیسائیوں میں ایسے لوگ موجود ہوں جن کو دیکھ کر اس تعلیم کی سچائی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہو لیکن ایسے نمونے نہ عیسائی دنیا میں موجود ہیں اور نہ آئندہ پیدا ہو سکتے ہیں۔ مثلاً حضرت مسیحؑ نے کہا تھا کہ

> ’’اگر تم میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہوگا تو اس پہاڑ سے کہہ سکو گے کہ سرک کر وہاں چلا جا اور وہ چلا جائے گا اور کوئی بات تمہارے لئے ناممکن نہ ہوگی۔‘‘ (متی باب ۱۷ آیت ۲۰)

اب اگر عیسائیوں کے قول کے مطابق حضرت مسیحؑ مردے زندہ کیا کرتے تھے (یوحنا باب ۱۱ آیت ۴۳، ۴۴) اور اُن کے دلوں میں مسیحؑ پر ایک رائی کے برابر بھی ایمان پایا جاتا ہے تو اُن کا فرض ہے کہ وہ مسیحؑ کی ابنیت ثابت

کرنے کے لئے مُردے زندہ کر کے دکھائیں۔ اور اگر مسیحؑ بغیر کشتی اور جہاز کے پانی پر چلتے تھے (متی باب ۱۴ آیت ۲۵) تو عیسائی بھی جہازوں کے بغیر سمندروں پر چل کر دکھائیں۔ مگر وہ ایسا کبھی نہیں کر سکتے جس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ نہ تو اُن کے دلوں میں حضرت مسیحؑ پر کوئی ایمان ہے اور نہ وہ انجیلی تعلیم کی صداقت کا دنیا کے سامنے کوئی نمونہ پیش کر سکتے ہیں۔ پس ان کا یہ کہنا کہ مسیحؑ خدا کا بیٹا تھا ایک زبانی دعوے سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا لیکن اس کے علاوہ یہ امر خدا تعالیٰ کی عظمت اور اس کی شان کے بھی بالکل منافی ہے کیونکہ بیٹے کی ضرورت اُسی وقت تسلیم کی جاسکتی ہے جب خدا تعالیٰ کے لئے فنا کا امکان ہو لیکن اگر اس کے لئے فنا ہی نہیں تو ابنیت کا مسئلہ کس طرح درست ہوسکتا ہے اس مادی عالم میں دیکھ لو کہ سورج اور چاند اور پہاڑ اور دریا وغیرہ کے ساتھ بیٹوں کا سلسلہ جاری نہیں کیا گیا۔ کیونکہ انہوں نے اپنی ضرورت کے پورا ہونے تک خود قائم رہنا ہے لیکن انسان چونکہ فانی وجود ہے اس لئے اسے بیوی کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور بچوں کی خواہش بھی اس کے دل میں پائی جاتی ہے۔ اور جب کسی کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے تو لوگ اُسے مبارکباد دیتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اُس کے نام کو قائم رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے سامان پیدا فرمادیا ہے لیکن خدا تعالیٰ کے متعلق اس قسم کی کوئی بات تسلیم نہیں کی جاسکتی اس لئے ایک زندہ اور حی و قیوم خدا کو تسلیم کرتے ہوئے کسی کو خدا کا بیٹا قرار دینا ایک نہایت ہی جاہلانہ اور خدا تعالیٰ کی ہتک کرنے والا عقیدہ ہے۔

پھر فرماتا ہے وَ لَمْ یَکُنْ لَّہٗ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ ایک اور امتیاز اس کے اندر یہ پایا جاتا ہے کہ اس کی بادشاہت میں اور کوئی شریک نہیں۔ دنیوی بادشاہوں کا تو یہ حال ہوتا ہے کہ کہیں بادشاہوں کے خلاف ان کی بیگمات جوڑ توڑ کر رہی ہوتی ہے کہیں شہزادے اپنے باپ کا تخت حاصل کرنے کے لئے اسے قتل کرنے کے منصوبے سوچ رہے ہوتے ہیں کہیں وزراء اور امراء اس کے خلاف سازشیں کر رہے ہوتے ہیں اور موقعہ ملتے ہی وہ ان کی حکومت کا تختہ الٹ دیتے ہیں مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے جو فرقان نازل کیا اس میں اس نے بنی نوع انسان کو یہ خوشخبری دی کہ دیکھو کہ تمہارا خدا وہ ہے کہ جس کے قبضہ و تصرف میں زمین آسمان کا ذرہ ذرہ ہے اور پھر نہ اس کا کوئی بیٹا ہے اور نہ اس کی مملکت میں کوئی اور شریک ہے کہ تمہیں ادھر بیٹے کی چاپلوسی کرنی پڑتی ہے ادھر بیگمات کی خوشامدیں کرنی پڑتیں۔ ادھر وزاء اور امراء کو خوش کرنے کے لئے کئی قسم کے پاپڑ پیلنے پڑتے۔ تمہارا خدا وحدہ لاشریک ہے اور اس کی محبت کسی اور کے ساتھ بٹی ہوئی نہیں نہ کوئی جابر حاکم اس کی بادشاہت میں شریک ہے کہ تمہیں اس کو خوش کرنے کا فکر ہو۔ تمہیں اکیلے اور واحد خدا کی پرستش کا حکم دیا گیا ہے۔ پس تمہارا سر ہر حالت میں اس کے آستانہ پر جھکا رہنا چاہیے اور اسی کی آواز پر لبیک کہنا تمہارا شعار ہونا چاہیے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنی واحدانیت کے ثبوت

میں اس قانون کو پیش کرتا ہے جو ساری دنیا میں جاری ہے اور فرماتا ہے۔ وَخَلَقَ کُلَّ شَیۡءٍ فَقَدَّرَہٗ تَقۡدِیۡرًا اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور پھر اس کے لئے ایک اندازہ مقرر کر دیا ہے جس کے ماتحت وہ ترقی کرتی جاتی ہے۔ چنانچہ دیکھ لو اگر ہر چیز کا اللہ تعالیٰ پہلے سے ایک اندازہ مقرر نہ کرتا تو انسان کو نہ دنیا میں کوئی ترقی حاصل ہو سکتی اور نہ دینی معاملات میں وہ سکھ پا سکتا۔ ایک زمیندار جو گھر سے دانہ لے جا کر زمین میں ڈالتا ہے صرف اس لئے ڈالتا ہے کہ خدا نے یہ قانون مقرر کر دیا ہے کہ جب دانہ زمین میں ڈالا جائے تو اُس کے اُگنے سے کئی دانے پیدا ہو جائیں۔ لیکن اگر یہ قاعدہ مقرر نہ ہوتا بلکہ اس طرح ہوتا کہ زمیندار کو گندم کی ضرورت ہوتی اور وہ گندم بوتا تو کبھی تو گندم نکل آتی کبھی کیکر اُگ آتا اور کبھی انگور کی بیل نکل آتی۔ تو کچھ مدت کے بعد زمیندار اس بونے کے فعل کو لغو سمجھ کر بالکل چھوڑ دیتا اور اپنی محنت کو ضائع خیال کرتا۔ اسی طرح اب تو سنار کو یقین ہے کہ سونا جب آگ میں ڈالوں گا تو پگھل جائے گا اور پھر جس طرح چاہوں گا زیور بنا لوں گا۔ لیکن اگر ایسا نہ ہوتا بلکہ یہ ہوتا کہ سنار کو کوئی شخص کڑے بنانے کے لئے سونا دیتا اور جب وہ اسے پگھلاتا تو چاندی نکل آتی یا کوئی چاندی دیتا تو وہ پیتل نکل آتی کیونکہ کوئی قاعدہ مقرر نہ ہوتا تو کیا حالت ہوتی؟ یہی کہ وہ اس کام سے آئندہ کے لئے توبہ کر لیتا۔ اسی طرح اگر لوہار لوہے کو گرم کر کے اس پر ہتھوڑا مارتا کہ اسے لمبا کرے تو وہ کبھی تو خود بن جاتا کبھی ہاون کی شکل اختیار کر لیتا۔ یا وہ کدال بناتا تو تلوار بن جاتی اور اُسے پولیس پکڑ لیتی کہ ہتھیار بنانے کی اجازت تم کو کس نے دی ہے۔ یا اسی طرح ڈاکٹر بخار اتارنے کی دوائی دیتا اور اُس سے کھانسی ہو جاتی تو ڈاکٹروں کی کون سنتا۔ اب تو کسی کو کھانسی ہو تو ایک زمیندار بھی کہتا ہے کہ اسے بنفشہ پلاؤ کیونکہ تجربہ نے بتا دیا ہے کہ اس سے کھانسی کو فائدہ ہوتا ہے لیکن اگر کوئی قانون مقرر نہ ہوتا بلکہ یہ ہوتا کہ کبھی بنفشہ پلانے سے کھانسی ہو جاتی اور کبھی بخار چڑھ جاتا۔ کبھی قبض ہو جاتی اور کبھی دست آ جاتے۔ کبھی بھوک بند ہو جاتی اور کبھی زیادہ ہو جاتی تو کون بنفشہ پلاتا۔ بنفشہ تب ہی پلایا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے یہ قانون مقرر کر دیا ہے کہ اس سے فلاں قسم کی کھانسی کو فائدہ ہوگا۔ اسی طرح زمیندار تب ہی غلّہ گھر سے لا کر زمین میں ڈالتا ہے کہ اُسے یقین ہوتا ہے کہ گیہوں سے گیہوں پیدا ہوگا۔ اگر اسے یہ یقین نہ ہوتا تو کبھی نہ ڈالتا۔ وہ کہتا نہ معلوم کیا پیدا ہو جائے گا میں کیوں اس غلہ کو ضائع کروں لیکن اب وہ اسی لئے مٹی کے نیچے بیسیوں من گندم کے دانوں کو دبا دیتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے یہ تقدیر مقرر کی ہوئی ہے کہ گندم سے گندم پیدا ہو اور ایک دانے سے سو دانے تک پیدا ہوں۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اسی طرح روٹی کھانے سے پیٹ بھرتا ہے لیکن اگر ایسا ہوتا کہ کبھی ایک لقمہ سے پیٹ بھر جاتا اور کبھی انسان سارا دن روٹی کھاتا رہتا تب بھی پیٹ نہ بھرتا تو پھر کس کو ضرورت تھی کہ کھانا کھاتا اور کیوں روپیہ ضائع کرتا یا گھر میں آگ جلانے

سے کھانا پکایا جاتا ہے لیکن اگر یہ ہوتا کہ کبھی سارا دن پھلکا توے پر پڑا رہتا اور آگ جلتی رہتی لیکن وہ گیلے کا گیلا ہی رہتا۔ اور کبھی آٹا ڈالتے ہی جل جاتا اور کبھی سینک لگنے سے پھلکا پکنے لگتا اور کبھی موٹا ہو کر ڈبل روٹی بن جاتا تو کون پھلکے پکانے کی جرأت کرتا۔ اسی طرح کبھی ساگ کچا رہتا اور کبھی پک جاتا تو کون پکاتا۔ یا اب تو ہر شخص جانتا ہے کہ کھانڈ ڈالنے سے چیز میٹھی ہو جاتی ہے لیکن اگر ایسا ہوتا کہ کبھی کھانڈ ڈالنے سے چیز میٹھی ہو جاتی اور کبھی کڑوی ہو جاتی کبھی نمکین ہو جاتی اور کبھی کھٹی یا کسیلی ہو جاتی اور کبھی کسی اور مزے کی ہو جاتی تو کیا کوئی کھانڈ استعمال کر سکتا۔ غرض جس قدر کارخانۂ عالم چل رہا ہے اس کی ایک ہی وجہ ہے اور وہ مسئلہ تقدیر ہے۔ خدا تعالیٰ نے قانون مقرر کر دیا ہے کہ میٹھا میٹھے کا مزا دے۔ تُرش تُرش کا مزا دے۔ آگ سے کھانا پکے، روٹی سے پیٹ بھرے اور لوگوں نے تجربہ کر لیا ہے کہ یہ درست ہے۔ اس لئے وہ ان باتوں کے لئے روپیہ صرف کرتے اور محنت برداشت کرتے ہیں۔ اگر خواص الاشیاء پر انسان کا یقین نہ ہو تو وہ سب کوششیں چھوڑ دے اور تمام کارخانۂ عالم باطل ہو جائے۔

پھر یہی تقدیر ہستی باری تعالیٰ کا بھی ایک زبردست ثبوت ہے کیونکہ کوئی صنعت صانع کے بغیر نہیں بن سکتی ایک عمدہ تصویر کو دیکھ کر فوراً خیال ہوتا ہے کہ یہ کسی بڑے مصوّر نے بنائی ہے۔ ایک عمدہ تحریر کو دیکھ کر فوراً سمجھا جاتا ہے کہ کسی مشہور کاتب نے لکھی ہے اور جس قدر ربط بڑھتا چلا جائے اسی قدر اس کے بنانے یا لکھنے والے کی خوبی اور بڑائی ذہن نشین ہوتی جاتی ہے پھر کیونکر تصوّر کیا جا سکتا ہے کہ ایسی منظم دنیا خود بخود اور یونہی پیدا ہو گئی ہے۔ چنانچہ دیکھ لو جہاں انسان میں ترقی کرنے کے قویٰ موجود ہیں وہاں اُسے اپنے خیالات کو عملی صورت میں لانے کے لئے عقل دی گئی ہے اور اس کا جسم بھی اُس کے مطابق بنایا گیا ہے۔ چونکہ اُس نے محنت سے رزق کمانا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اُسے ایسے قویٰ دیئے کہ جن سے چل پھر کر وہ اپنا رزق پیدا کر لے۔ درخت کا رزق اگر زمین میں رکھا تو اُسے جڑیں دیں کہ وہ اس کے اندر سے اپنا پیٹ بھرے۔ اگر شیر کی خوراک گوشت رکھی تو اُسے شکار مارنے کے لئے ناخن دیئے اور اگر گھوڑے اور بیل کے لئے گھاس کھانا مقدر کیا تو اُن کو ایسی گردن دی جو جھک کر گھاس پکڑ سکے۔ اور اگر اونٹ کے لئے درختوں کے پتے اور کانٹے مقرر کئے تو اس کی گردن بھی اونچی بنائی کیا یہ سب کارخانہ اتفاق سے ہوا ہے؟ کیا اتفاق نے اس بات کو معلوم کر لیا تھا کہ اونٹ کو گردن لمبی دوں؟ اور شیر کو پنجے اور درخت کو جڑیں اور انسان کو ٹانگیں دوں؟ کیا یہ سمجھ میں آ سکتا ہے کہ جو کام خود بخود ہو گیا اس میں اس قدر انتظام رکھا گیا ہو؟ پھر اگر انسان کے لئے پھیپھڑا بنایا تو اس کے لئے ہوا بھی پیدا کی۔ اگر پانی پر اس کی زندگی کا مدار رکھا تو سورج کے ذریعے بادلوں کی معرفت اُسے پانی پہنچایا اور اگر آنکھیں دیں تو ان کے کارآمد بنانے کے لئے سورج کی روشنی بھی رکھی تا کہ وہ اس کے ذریعہ دیکھ

سکے۔ کان دیئے تو ساتھ اس کے خوبصورت آوازیں بھی پیدا کیں۔ زبان کے ساتھ ذائقہ دار چیزیں بھی عطا فرمائیں۔ ناک پیدا کیا تو خوشبو بھی مہیا کر دی۔ ممکن تھا کہ اتفاق انسان میں پھیپھڑا پیدا کر دیتا لیکن اس کے لئے ہوا کا سامان کیونکر پیدا ہو گیا۔ اور ممکن تھا کہ انسان کی آنکھیں پیدا ہو جاتیں لیکن یہ عجیب اتفاق تھا کہ جس نے کروڑوں میلوں پر جا کر ایک سورج بھی پیدا کر دیا تا کہ وہ اپنا کام کر سکیں۔ اگر ایک طرف اتفاق نے کان پیدا کر دیئے تھے تو کون سی طاقت تھی جس نے دوسری طرف آواز بھی پیدا کر دی۔ برفانی ممالک میں مان لیا کہ کتے یا ریچھ کو اتفاق نے پیدا کر دیا لیکن اس کا کیا سبب ہے کہ اُن کتوں یا ریچھوں کے بال اتنے لمبے بن گئے کہ وہ سردی سے محفوظ رہ سکیں۔ اتفاق ہی نے ہزاروں بیماریاں پیدا کیں۔ اتفاق ہی نے اُن کے علاج بنا دیئے۔ اتفاق ہی نے بچھو بوٹی بنائی جس کے چھونے سے خارش ہونے لگ جاتی ہے اور اسی نے اس کے ساتھ پالک کا پودا اُگا دیا کہ اس کا علاج ہو جائے دہریوں کا اتفاق بھی عجیب ہے کہ جن چیزوں کے لئے موت تجویز کی اُن کے ساتھ توالد تناسل کا سلسلہ بھی قائم کر دیا۔ اور جن چیزوں کے ساتھ موت نہ تھی وہاں یہ سلسلہ ہی نہ رکھا۔ انسان نے چونکہ مرنا تھا اس لئے اس کے ساتھ توالد اور تناسل کا سلسلہ لگا دیا۔ لیکن سورج اور چاند اور زمین نہ نئے پیدا ہوتے اور نہ اگلے فنا ہوتے ہیں اس لئے اُن کے ساتھ یہ سلسلہ نہ رکھا۔ پھر کیا یہ انتظام کچھ کم تعجب انگیز ہے کہ زمین اور سورج میں چونکہ کشش ہے اس لئے ان کو ایک دوسرے سے اتنی دور رکھا کہ آپس میں ٹکرا نہ جائیں۔ کیا یہ باتیں اس بات پر دلالت نہیں کرتیں کہ ان سب چیزوں کا ایک خالق ہے جو نہ صرف علیم ہے بلکہ غیر محدود علم والا ہے اور اس کے قواعد ایسے منضبط ہیں کہ اُن میں کہیں بھی رخنہ نظر نہیں آتا۔

سلطنتوں میں ہزاروں مدبر اُن کی درستی کے لئے دن رات لگے رہتے ہیں لیکن پھر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اُن سے ایسی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں کہ جن سے سلطنتوں کو خطرناک نقصان پہنچ جاتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو وہ بالکل تباہ ہو جاتی ہیں۔ لیکن اگر اس دنیا کا کاروبار صرف اتفاق پر ہے تو تعجب ہے کہ ہزاروں دانا دماغ تو غلطی کرتے ہیں لیکن یہ اتفاق غلطی نہیں کرتا۔ مگر سچی بات وہی ہے جو قرآن کریم نے بیان کی ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے جس نے یہ تمام نظام جاری کیا ہوا ہے۔ چنانچہ جس طرف نظر دوڑا کر دیکھو تمہیں معلوم ہوگا کہ ہر ایک چیز اپنا مفوضہ کام کر رہی ہے اور یہی تقدیر ہے جو خدا تعالیٰ کی ہستی کا ایک زبردست ثبوت ہے۔

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ

اور ان لوگوں نے اس (یعنی خدا) کے سوا معبود بنا چھوڑے ہیں جو کچھ (بھی) پیدا نہیں کرتے حالانکہ وہ

يُخْلَقُوْنَ وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا

خود پیدا کئے جاتے ہیں اور جو اپنی ذات کے لئے نہ کسی ضرر پر قادر ہیں نہ نفع پر نہ موت کے مالک ہیں

يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ④

اور نہ زندگی کے اور نہ پھر جی اُٹھنے کے۔

حلّ لُغَات۔ نُشُوْرًا نُشُوْرًا نَشَرَ کا مصدر ہے اور نَشَرَ اللّٰہُ الْمَوْتٰی کے معنے ہیں اَحْیَاھُمْ۔اللہ تعالیٰ نے مردوں کو زندہ کیا۔پس نُشُوْرًا کے معنے ہوں گے موت کے بعد زندہ ہونا۔(اقرب)

تفسیر ۔فرماتا ہے کفار کی عقل تو ایسی ماری گئی ہے کہ انہوں نے خدا کے سوا اور معبود بنا لئے ہیں۔جو پیدا تو کچھ نہیں کرتے ہاں آپ پیدا کئے جاتے ہیں اور خود اپنی ذات کے لئے بھی ضرر اور نفع کی کوئی طاقت نہیں رکھتے اور نہ موت اور زندگی اور دوبارہ جی اُٹھنا اُن کے ہاتھ میں ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے معبودانِ باطلہ کی تردید میں بعض اور دلائل دیئے ہیں۔فرماتا ہے کہ انہیں پہلی بات تو یہ سمجھنی چاہیے کہ خدا تعالیٰ کے لئے خالق ہونا ضروری ہے۔مگر یہ لوگ جن کو معبود قرار دیتے ہیں اُن میں سے کسی کے متعلق بھی ثابت نہیں کر سکتے کہ وہ خالق تھا۔عیسائیوں نے حضرت مسیحؑ کی طرف اس قسم کے معجزات تو منسوب کر دیئے ہیں کہ وہ مُردے زندہ کر دیا کرتے تھے لیکن انہیں خالق قرار دینے کی عیسائیوں کو بھی جرأت نہیں ہوئی البتہ مسلمانوں میں سے بعض نادانوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ حضرت مسیحؑ پرندے پیدا کیا کرتے تھے حالانکہ اگر وہ پرندے پیدا کیا کرتے تھے تو پھر وہ پرندے ہیں کہاں؟ اور آیا اُن کی نسل بھی چلی تھی یا نہیں؟ اور اگر چلی تھی تو یہ کیونکر پتہ لگ سکتا ہے کہ فلاں پرندے مسیحؑ کے پیدا کردہ ہیں اور فلاں خدا کے۔بہر حال اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ سب ڈھکوسلے ہیں۔ان معبودانِ باطلہ میں سے کوئی بھی ایسا نہیں۔جس نے کوئی چیز پیدا کی ہو پس انہیں معبود قرار دینا اپنی حماقت اور نادانی کا ثبوت پیش کرنا ہے۔

دوسری دلیل اللہ تعالیٰ نے یہ دی کہ وہ نہ صرف خالق نہیں بلکہ مخلوق ہیں۔یعنی وہ خود پیدا کئے گئے ہیں اور جن

میں اس قدر احتیاج الی الغیر پائی جاتی ہو کہ جب تک کوئی اور ہستی انہیں پیدا نہ کرتی وہ اس دنیا میں آ بھی نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے خدائی کیا کرنی ہے کیا خدا تعالیٰ کو بھی کوئی پیدا کیا کرتا ہے؟ اور جب تمہیں نظر آتا ہے کہ جن ہستیوں کو یہ لوگ خدا تعالیٰ کا شریک قرار دیتے ہیں۔ وہ سب کی سب مخلوق ہیں۔ حضرت مسیحؑ بھی مریم کے پیٹ سے پیدا ہوئے۔ اور بہاء اللہ جن کو مدعی اُلوہیت قرار دیا جاتا ہے۔ وہ بھی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے اسی طرح وہ تمام پیر اور فقیر اور سجادہ نشین جن کی قبروں پر سجدہ کیا جاتا ہے وہ بھی اپنی اپنی ماؤں کے پیٹ سے ہی پیدا ہوئے تو وہ خدا کس طرح ہوئے؟ یا اُن کی قبروں پر سجدہ کرنا کس طرح جائز ہو گیا؟

پھر ایک اور دلیل اللہ تعالیٰ اُن کے خلاف دیتا ہے اور فرماتا ہے کہ یہ لوگ جن کو تم معبود قرار دیتے ہو ان کی تو یہ حالت ہے کہ زندگی بھر نہ تو اُن میں یہ طاقت تھی کہ کسی دُکھ اور تکلیف سے اپنی خدائی کی وجہ سے بچ سکتے اور نہ اُن میں یہ طاقت تھی کہ بغیر خارجی ذرائع کی امداد کے کوئی نفع حاصل کر سکتے۔ اگر یہ دُکھوں سے بچتے تھے تو بیرونی ذرائع کی امداد سے اور اگر نفع حاصل کرتے تھے تو بیرونی اسباب کے ذریعہ۔ پھر جو لوگ اس قدر کمزور تھے کہ وہ بات بات میں دوسرے ذرائع اور اسباب کے محتاج تھے اُن کو خدا قرار دینا کتنی کوتاہ عقلی اور نادانی کا ثبوت پیش کرنا ہے۔ حضرت مسیح ناصری کو ہی دیکھ لو اگر ضرر سے بچنے کی اُن میں طاقت ہوتی تو دشمن انہیں صلیب پر کیوں چڑھاتا اور کیوں انہیں کہنا پڑتا کہ

''ایلی ایلی لما سبقتنی یعنی اے میرے خدا اے میرے خدا! تُو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔''

(متی باب ۲۷ آیت ۴۶)

اور اگر اپنے لئے وہ ہر قسم کا آرام اور فائدہ اپنے زورِ بازو سے حاصل کر سکتے تھے تو جب شیطان انہیں جنگل میں آزمانے کے لئے لے گیا تو وہ چالیس دن بھوکے کیوں رہے اور کیوں انہوں نے یہ کہا کہ

''آدمی صرف روٹی ہی سے جیتا نہ رہے گا بلکہ بات سے جو خدا کے منہ سے نکلتی ہے۔''

(متی باب ۴ آیت ۴)

اگر اُن میں یہ طاقت تھی کہ وہ اپنے آپ کو فائدہ پہنچا سکتے تو چالیس دن کا فاقہ انہیں کیوں برداشت کرنا پڑتا؟ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ ایک کشف تھا جس کو عیسائیوں نے ظاہر پر محمول کر لیا۔ ورنہ اگر وہ حضرت مسیحؑ کو واقعہ میں پہاڑ پر لے جاتا تو لوگوں کو شیطان بھی نظر آتا اور اُن کا پہاڑ پر جانا بھی نظر آتا اور پھر حواری ان کو اکیلا کس طرح چھوڑ دیتے لازماً وہ بھی ساتھ جاتے۔ پس درحقیقت یہ ایک کشف یا خواب کا نظارہ تھا جس کو ظاہر پر محمول کر کے مضحکہ خیز بنا دیا گیا ہے۔

اسی طرح حضرت مسیحؑ نے ایک موقعہ پر کہا کہ

''لومڑیوں کے بھٹ ہوتے ہیں اور ہوا کے پرندوں کے گھونسلے مگر ابن آدم کے لئے سر دھرنے کی بھی جگہ نہیں۔'' (متی باب ۸ آیت ۲۰)

اس فقرہ میں بھی حضرت مسیحؑ نے اپنے عجز اور بیچارگی کا اقرار کیا ہے اور بتایا ہے کہ میرے لئے تو دنیا میں سر چھپانے کی بھی جگہ نہیں اور جس شخص کی یہ کیفیت ہو۔ اس کے متعلق یہ کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے اندر خدائی صفات رکھتا تھا۔

پھر فرماتا ہے وَلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا۔ یہ لوگ نہ تو موت کے مالک ہیں نہ زندگی کے اور نہ پھر جی اٹھنے کے۔ موت وحیاۃ کے لحاظ سے اشیاء کے تین درجے ہی ہوتے ہیں (۱) عدم حیات یعنی موت (۲) حیات بالقوۃ یعنی حیات (۳) حیات بالفعل یعنی نشور۔ مگر چونکہ یہاں معبودانِ باطلہ کا رد کیا جا رہا ہے اس لئے وَلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا میں اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اگر یہ لوگ اپنے اندر خدائی طاقتیں رکھتے تو کم از کم موت سے ہی بچ جاتے مگر ان میں سے ہر معبود کہلانے والا موت کا شکار ہوا اور عیسائیوں نے تو اپنے بنیادی عقیدوں میں ہی شامل کر لیا کہ مسیحؑ تین دن مر کر جہنم میں رہا (۲۔ پطرس باب ۳ آیت ۱۸، ۲۰ وتفسیر بائیبل مصنفہ میتھیو پول جلد ۳ صفحہ ۹۱۱) پس جب موت کے زبردست ہاتھ سے بھی اُن کی روحیں آزاد نہیں تھیں تو وہ خدا کس طرح ہوئے۔ پھر ان کی زندگیوں کو دیکھو تو قدم قدم پر معلوم ہوگا کہ وہ ایک بالا قانون کے تابع تھے اور تمام بنی نوع انسان کی طرح کھانے پینے کے محتاج تھے۔ بیماریوں کا شکار ہوتے تھے۔ مشکلات میں مبتلا ہوتے تھے اور جب اُن کی زندگیاں بتا رہی ہیں کہ انہوں نے اپنی تمام عمر احتیاج میں گذاری تو ان کو خدا قرار دینا کس طرح درست ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد فرماتا ہے کہ انہیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے۔ یعنی نہ تو نفع کے حصول اور ضرر سے اجتناب پر ان کو کوئی قدرت حاصل تھی نہ موت کے پنجہ سے وہ چھوٹ سکا نہ زندگی کے ایک ایک لمحہ اور ثانیہ میں وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قانون سے آزاد ہوئے بلکہ انہیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کب اٹھائیں جائیں گے یعنی غیب پر بھی ان کو کوئی دسترس حاصل نہیں جیسا کہ حضرت مسیحؑ نے کہا کہ

''اس دن یا اس گھڑی کی بابت کوئی نہیں جانتا۔ نہ آسمان کے فرشتے نہ بیٹا مگر باپ۔

(مرقس باب ۱۳ آیت ۳۲، ۳۳)

پس جب کہ کوئی ایک بات بھی ان میں خدائی کی نہیں پائی جاتی تو انہیں خدا تعالیٰ کی وحدانیت کے مقابلہ میں

کھڑا کرنا کیسے جائز ہو سکتا ہے؟

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اِفْكُ ۨافْتَرٰىهُ وَ

اور کافر کہتے ہیں کہ یہ تو صرف ایک جھوٹ ہے جو اس نے بنالیا ہے اور اس کے بنانے پر ایک اور قوم نے اس کی

اَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۚ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّ زُوْرًا ۚ﴿۵﴾

مدد کی ہے۔ پس ان لوگوں نے (یہ بات کہہ کر) بہت بڑا ظلم کیا ہے اور بہت بڑا جھوٹ بولا ہے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ

وَقَالُوْۤا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ

(قرآن) تو پہلوں کی باتیں ہیں جو اس نے کسی سے لکھوالی ہیں اور اب وہ صبح شام اس کے سامنے پڑھ کر سنائی جاتی

بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا ﴿۶﴾ قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي

ہیں (تا کہ وہ قرآن اچھی طرح لکھ لے) تو کہہ دے کہ اس (قرآن) کو تو اُس (خدا) نے اتارا ہے جو آسمانوں اور

السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۷﴾

زمین کے رازوں سے واقف ہے۔ وہ بہت بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔

حلّ لُغات - **اِفْكٌ** اَلْاِفْكُ: اَلْكِذْبُ یعنی افک کے معنے کذب اور جھوٹ کے ہیں (اقرب)

زُوْر اَلزُّوْرُ - اَلْكِذْبُ - جھوٹ - اَلْبَاطِلُ باطل۔ (اقرب)

اَسَاطِيْرُ اَسَاطِيْرُ اُسْطُوْرَةٌ کی جمع ہے اور اُسْطُوْرَةٌ کے معنے ہیں مَا يُسْطَرُ جو چیز لکھی جاتی ہے۔ وَتُسْتَعْمَلُ فِي الْحَدِيْثِ لَا نِظَامَ لَهٗ، وَالْحِكَايَاتُ نیز اساطیر اُن باتوں کو بھی کہتے ہیں جو بے ترتیب ہوں اور قصے کہانیوں کو بھی کہتے ہیں۔ (اقرب)

اِكْتَتَبَهَا اِكْتَتَبَ الْكِتَابَ کے معنے ہیں خَطَّهٗ کتاب کو لکھا۔ وَقِيْلَ اِسْتَمْلَاهُ بعض ماہرین لُغت نے کہا ہے کہ اِكْتَتَبَ کے معنے ہیں کسی سے کتاب کو لکھوایا۔ نیز اس کے معنے ہیں اَمَرَ اَنْ يُّكْتَبَ لَهٗ کسی کو حکم دیا کہ وہ اس کے لئے فلاں بات لکھ دے (اقرب) پس اِكْتَتَبَهَا کے معنے ہوں گے اُس نے لکھ لیا ہے یا کسی

سے لکھوالیا ہے۔

تفسیر ۔فرماتا ہے۔کفار کہتے ہیں کہ قرآن ایک جھوٹی کتاب ہے اور محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اُس کے بنانے میں دوسرے لوگ امداد دیتے ہیں۔ان کفار نے یہ اعتراض کر کے سخت ظلم کیا ہے اور جھوٹ بولا ہے اور وہ اس اعتراض کو پکا کرنے کے لئے یوں دلیل دیتے ہیں کہ قرآن میں ہے کیا بس پُرانے لوگوں کی باتیں نقل کر دی گئی ہیں۔محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ باتیں دوسروں سے لکھوا لیتے ہیں اور وہ صبح وشام اُن کے سامنے پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔تا کہ اُن کو اچھی طرح یاد رہیں تو اُن سے کہہ کہ قرآن کو تو اس خدا نے اتارا ہے جو آسمان اور زمین کے رازوں کو جانتا ہے اور وہ بہت بخشنے والا اور مہربان ہے۔اس آیت کے الفاظ سے مترشح ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ چونکہ صبح وشام نماز کے لئے اور قرآن سیکھنے کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اکٹھے ہوتے تھے۔وہ نادان یہ خیال کرتے تھے کہ شاید اس جگہ جمع ہو کر بعض مسیحی غلام اپنی کتب کی باتیں ان کو بتاتے ہیں یا اُن سے لکھ کر صحابہؓ لے آتے ہیں اور پھر وہ صبح وشام حفظ کی جاتی ہیں۔ان جاہلوں کی عقل میں صبح شام کی نمازیں تو آ ہی نہیں سکتی تھیں وہ اس اجتماع کو منصوبہ بازی کا وقت سمجھتے تھے۔خود مجھے بھی اس بارہ میں ایک تجربہ ہو چکا ہے جس سے اس قسم کی بدگمانی کی حقیقت خوب معلوم ہو جاتی ہے۔کئی سال کی بات ہے میں ایک دفعہ لاہور گیا تو مجھ سے آریوں کے مشہور لیڈر لالہ رام بھجدت صاحب ملنے کے لئے آئے ان کے ساتھ کچھ اور صاحبان بھی تھے۔ جن میں ’’شیر پنجاب‘‘ جو سکھوں کا مشہور اخبار تھا اس کے ایڈیٹر صاحب بھی شامل تھے اتفاق سے اُسی دن میرا لیکچر تھا۔ وہ لیکچر سننے کے لئے ٹھہر گئے۔ مجھے سارا دن مختلف کاموں کی وجہ سے حوالے نکالنے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔اس لئے میں نے حافظ روشن علیؓ صاحب مرحوم کو سٹیج پر بٹھالیا اور کہا کہ میں آپ کو مضمون بتاتا جاؤں گا۔آپ مجھے آیت کے الفاظ بتاتے جایا کریں۔ چنانچہ میں نے لیکچر شروع کیا اور جہاں کسی آیت سے استدلال کی ضرورت ہوتی۔میں آہستہ سے ایک دو لفظ آیت کے پڑھ دیتا یا مضمون بتا دیتا اور وہ ساری آیت پڑھ دیتے میں اُسے پڑھ کر جو استدلال کرنا ہوتا تھا اُسے بیان کر دیتا۔دوسرے دن ’’شیر پنجاب‘‘ میں ایک مضمون نکلا کہ کل ہم بھی امام جماعت احمدیہ کے لیکچر میں تھے۔لیکچر اچھا تھا مگر ہم نے ذرا تجسس کیا اور سٹیج کے پچھلی طرف گئے تو معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنے پیچھے ایک عالم چھپایا ہوا تھا۔وہ مضمون بتاتا جاتا تھا اور مرزا صاحب اُسے دوہراتے جاتے تھے۔واقف کار لوگوں میں کئی دن اس پر خوب ہنسی اڑتی رہی اور سردار صاحب سے بھی کسی نے جا کر ذکر کر دیا۔وہ بہت شرمندہ ہوئے اور انہوں نے کہا کہ میں تو سمجھتا تھا کہ میں نے اپنی ہوشیاری سے اصل راز معلوم کر لیا ہے۔

ایسی ہی ہوشیاری مکہ والوں نے دکھائی تھی۔کام والے لوگوں کو صبح وشام ہی فرصت مل سکتی تھی وہ صبح اور شام کی نمازیں ادا کرنے کے لئے اور قرآن کریم پڑھنے کے لئے دارِ ارقم میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہو جاتے تھے۔کفار کے بعض زیادہ عقلمند لوگ خیال کرتے تھے کہ ہم نے راز معلوم کر لیا ہے۔یہ قرآن کی تصنیف کے لئے جمع ہوتے ہیں۔

عقلمند انسان کے لئے اس میں بھی ایک بڑا بھاری نشان ہے کیونکہ اس میں یہ اعتراف پایا جاتا ہے کہ قرآن کریم کوئی ایک شخص نہیں بنا سکتا۔تبھی انہوں نے اس کے بنانے میں مدد دینے والی ایک جماعت قرار دی جن میں سے اُن کے نزدیک بعض عقلی باتیں جمع کرتے تھے اور بعض پرانی کتب کی تعلیم جمع کرتے تھے۔

اب میں اس اعتراض کے وہ جواب بیان کرتا ہوں جو اس آیت میں بیان کئے گئے ہیں۔کفار کے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے اس کے دو پہلوؤں کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔(۱) اوّل یہ کہ جن غلاموں کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ قرآن کریم کے بنانے میں مدد دیتے ہیں۔کیا وہ ایسا کر سکتے تھے؟ (۲) دوسرے یہ کہ جس چیز کی نسبت کہا جاتا ہے کہ بعض غلاموں نے لکھوائی ہے کیا وہ انسانوں کی لکھوائی ہوئی ہو سکتی ہے؟

پہلے سوال کا جواب قرآن کریم نے یہ دیا ہے کہ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّ زُوْرًا۔یعنی یہ اعتراض نہایت ظالمانہ اور جھوٹا ہے۔اس جواب میں ظُلْمًا وَّ زُوْرًا کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ان کفار کا یہ دعویٰ کہ قرآن کریم کے بنانے میں بعض اور لوگ مدد دے رہے ہیں خود اپنے آپ کو باطل ثابت کر رہا ہے کیونکہ جس مذہب کے لوگوں کی طرف بھی سکھانے والوں کو منسوب کیا جائے اُسی مذہب کی قرآن کریم تردید کر رہا ہے۔اگر وہ یہ کہیں کہ سکھانے والے عیسائی غلام تھے تو قرآن تو وہ کتاب ہے جو عیسائیت کی دھجیاں بکھیر رہی ہے۔پھر یہ کس طرح مانا جا سکتا ہے کہ جس مذہب کے ماننے والوں نے آپؐ کو قرآن بنا کر دیا وہ خود اپنے مذہب کے خلاف آپؐ کو باتیں بتاتے رہے تھے۔

اسی طرح اگر کہو کہ یہودیوں نے آپ کو سکھا دیا تو یہودی مذہب کی تردید بھی قرآن کریم میں مکمل طور پر موجود ہے۔غرض جس مذہب کی طرف بھی سکھانے والوں کو منسوب کیا جائے اُسی مذہب کی تردید قرآن کریم میں پائی جاتی ہے پس یہ دعویٰ خود اپنی ذات میں اپنے جھوٹا ہونے کا ایک کھلا اور نمایاں ثبوت ہے اس کو باطل ثابت کرنے کے لئے کسی خارجی دلیل کی ضرورت ہی نہیں۔

حضرت مسیحؑ نے بھی انجیل میں اس دلیل کو استعمال کیا ہے چنانچہ جب یہودیوں نے آپ پر اعتراض کرتے

ہوئے کہا کہ یہ شخص بدروحوں کے سردار بعلزبول کی مدد سے بدروحوں کو نکالتا ہے تو حضرت مسیحؑ نے انہیں جواب دیا کہ

''اگر شیطان ہی نے شیطان کو نکالا تو وہ آپ اپنا مخالف ہو گیا۔ پھر اُس کی بادشاہی کیونکر قائم رہے گی؟'' (متی باب ۱۳ آیت ۲۶)

یعنی اگر میں شیطان کی مدد سے یہ کام کر رہا ہوں تو کیا شیطان نے مجھے اپنے خلاف ہی مدد دینی تھی؟ اگر وہ مجھے کچھ سکھاتا تو کم از کم اُسے چاہیے تھا کہ اپنے خلاف نہ سکھاتا۔ مگر تمہارے نزدیک تو شیطان نے مجھے وہ کام سکھلا دیا جو خود اس کو تباہ کرنے والا ہے۔ گویا شیطان آپ ہی اپنا دشمن ہو گیا۔

اسی طرح اگر عیسائی غلام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کریم بنا کر دیا کرتے تھے تو کیا انہوں نے اپنے مذہب پر ہی تبر رکھنا تھا۔ اور اسی کے خلاف تعلیم بنا بنا کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دینی تھی؟ پس یہ اعتراض خود اپنی ذات میں اپنے باطل ہونے کا اعلان کر رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ اس اعتراض کی بنیاد محض جھوٹ اور افتراء پر ہے۔

اسی طرح ظُلْمًا وَّ زُوْرًا کہہ کر اس طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ اگر کوئی اور جماعت ایسی کتاب بنا سکتی تھی تو اُس نے یہ کتاب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بنا کر کیوں دی۔ اُس نے یہ کتاب خود اپنی طرف کیوں نہ منسوب کر لی۔ پس دوسرے لوگوں پر ایسا اتہام لگانا بہت بڑا ظلم ہے۔ یعنی یہ اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ باوجود کامل ہونے کے انہوں نے اپنا کمال ایک گھٹیا قسم کے آدمی کو دے دیا۔

پھر ظُلْمًا وَّ زُوْرًا کہہ کر اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ جن غلاموں کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن سکھایا کرتے تھے وہ تورات اور دن اسلام کی خاطر تکلیفیں اٹھاتے رہے بلکہ اُن میں سے کئی کفار کے مظالم سہتے سہتے شہید ہو گئے۔ پھر اُن کی نسبت یہ کیونکر تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ خود قرآن بنا بنا کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے۔ جو لوگ خود ایک جھوٹی تعلیم بنا کر پیش کرتے ہوں کیا وہ اس مفتریانہ کلام کی خاطر اس قدر قربانیاں کر سکتے ہیں؟ جس قدر صحابہؓ اور صحابیاتؓ نے کیں۔ پس یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ جن غلاموں نے اپنے خونوں سے اسلام کے درخت کی آبیاری کی اُنہی پر کفار یہ اعتراض کرتے ہیں کہ انہوں نے محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قرآن بنا کر دیا۔ ان غلاموں نے اسلام کی خاطر جو جو تکالیف اٹھائیں اُن کا تو تصور کر کے بھی رونا آتا ہے۔ عرب میں غلاموں کو کوئی پوزیشن حاصل نہیں تھی۔ کوئی شہری حقوق انہیں حاصل نہیں تھے۔ آقا اُن کو مار ڈالتے تو اُن کو کوئی پوچھنے والا نہیں تھا کیونکہ وہ اپنے آقاؤں کی ملکیت سمجھے جاتے تھے۔ اُس وقت کوئی قانون نہیں تھا جو اُن کی حفاظت کر سکتا۔ جب بعض غلام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تو تپتی ریتوں پر انہیں لٹایا جاتا۔

اُن کو پتھروں پر گھسیٹا جاتا۔ یہاں تک کہ اُن کے جسم چھل جاتے اور وہ شدید زخمی ہو جاتے جب کچھ عرصہ کے بعد اُن کے زخم مندمل ہو جاتے تو پھر دوبارہ اُن کو پتھروں پر گھسیٹتے اور یہ سلوک اُن سے متواتر جاری رکھا جاتا۔ حضرت بلال ؓ کے متعلق تاریخوں میں آتا ہے کہ آپ کا آقا آپ کو پیٹھ کے بل لٹا کر جوتیوں سمیت آپ کے سینہ پر کودا کرتا۔ اور کہتا کہو خدا کے سوا اور بھی بہت سے خدا ہیں اور اس پر بار بار اصرار کرتا۔ حضرت بلال ؓ حبشی تھے اور اس وجہ سے عربی اچھی طرح بول نہیں سکتے تھے جب کفار زیادہ ظلم کرتے اور اصرار کرتے کہ آپ توحید کے خلاف کوئی بات کہیں تو آپ بڑے جوش سے کہتے اَحَدٌ اَحَدٌ خدا ایک ہی ہے۔ خدا ایک ہی ہے اس پر کفار اُن پر اور بھی مظالم کرنے لگ جاتے خباب ؓ بن الارت بھی ایک غلام تھے جو آہنگری کا کام کیا کرتے تھے وہ نہایت ابتدائی ایام میں آپ پر ایمان لائے۔ لوگ انہیں سخت تکالیف دیتے تھے حتیٰ کہ انہی کی بھٹی کے کوئلے نکال کر اُن پر انہیں لٹا دیتے اور اوپر سے چھاتی پر پتھر رکھ دیتے تاکہ آپ کمر نہ ہلا سکیں۔ اُن کی مزدوری کا روپیہ جن لوگوں کے ذمہ تھا وہ روپیہ ادا کرنے سے منکر ہو گئے۔ مگر باوجود ان مالی اور جانی نقصانوں کے وہ ایک منٹ کے لئے بھی متذبذب نہ ہوئے۔ اور ایمان پر ثابت قدم رہے آپ کی پیٹھ کے نشان آخر عمر تک قائم رہے۔ چنانچہ حضرت عمر ؓ کی خلافت کے ایّام میں انہوں نے اپنے گذشتہ مصائب کا ذکر کیا تو انہوں نے اُسے پیٹھ دکھانے کو کہا۔ جب انہوں نے اپنی پیٹھ پر سے کپڑا اٹھایا تو تمام پیٹھ پر ایسے سفید داغ تھے جیسا کہ برص کے داغ ہوتے ہیں۔

حضرت سمیہ ؓ ایک لونڈی تھیں۔ ابوجہل ان کو سخت دُکھ دیا کرتا تھا تاکہ وہ ایمان چھوڑ دیں لیکن جب اُن کے پائے ثبات میں لغزش پیدا نہ ہوئی تو ایک دن ناراض ہو کر ابوجہل نے ان کی شرمگاہ میں نیزہ مارا اور انہیں شہید کر دیا۔ حضرت عمار ؓ جو سمیہ ؓ کے بیٹے تھے انہیں بھی تپتی ریت پر لٹایا جاتا اور انہیں سخت دکھ دیا جاتا۔ ایک غلام صہیب ؓ تھے جو روم سے پکڑے ہوئے آئے تھے یہ عبداللہ بن جدعان کے غلام تھے جنہوں نے اُن کو آزاد کر دیا تھا۔ یہ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور آپ ؐ کے لئے انہوں نے کئی قسم کی تکالیف اٹھائیں (الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب زیرعنوان صھیب بن سنان الرومی)۔ پھر ابوفکیہہ ؓ ایک غلام تھے وہ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ابتدائی ایّام میں ایمان لائے۔ انہیں بھی گرم ریت پر لٹایا جاتا۔ ایک دفعہ رسی باندھ کر انہیں کھینچا جا رہا تھا کہ پاس سے کوئی جانور گذرا۔ اُن کے آقا نے اس کی طرف اشارہ کر کے انہیں کہا یہ تمہارا خدا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا میرا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے۔ اس پر اس ظالم نے اُن کا گلا گھونٹا اور پھر ایک بھاری پتھر اُن کے سینہ پر رکھ دیا جس سے اُن کی زبان باہر نکل آئی اور وہ بے ہوش ہو گئے۔ لوگوں نے سمجھا کہ وہ مر گئے ہیں اور وہ انہیں چھوڑ کر چلے گئے۔ آخر

بہت دیر کے بعد انہیں ہوش آئی۔(الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب زیر عنوان ابو فکیھہ مولیٰ بن عبدالدار)

حضرت لبینہؓ ایک لونڈی تھیں وہ بھی نہایت ابتدائی ایّام میں اسلام لائیں۔حضرت عمرؓ اپنے اسلام لانے سے پہلے انہیں اسلام کی وجہ سے بڑی تکالیف دیا کرتے تھے مگر وہ بڑی مضبوطی سے اپنے ایمان پر قائم رہیں (السیرۃ الحلبیۃ باب استخفائہ صلی اللہ علیہ وسلم و اصحابہ فی دار الارقم ...وما لقی ھو و اصحابہ من الاذی...)۔زنیرہؓ بھی ایک لونڈی تھیں اور ابتدائی ایّام میں ہی ایمان لائی تھیں۔ابوجہل نے مار مار کر اُن کی آنکھیں پھوڑ دیں۔مگر انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے انکار نہ کیا۔ابوجہل انہیں دیکھ کر غصّہ سے کہا کرتا تھا کہ کیا ہم اتنے حقیر ہو گئے ہیں کہ زنیرہؓ نے تو سچا دین مان لیا اور ہم نے نہ مانا۔

اسی طرح نہدیہؓ اور ام عبیسؓ دو کنیزیں تھیں جو مکی زندگی میں اسلام لائیں۔اور دونوں نے اسلام لانے کی وجہ سے بہت سخت مصائب برداشت کئے۔

عامر بن فہیرہؓ بھی ایک غلام تھے جنہیں حضرت ابوبکرؓ نے آزاد کر دیا تھا۔انہیں بھی اسلام لانے کی وجہ سے سخت تکالیف دی گئیں۔

حمامہؓ حضرت بلالؓ کی والدہ تھیں یہ بھی اسلام لائیں اور انہوں نے اسلام کی خاطر بڑی تکالیف اٹھائیں پھر بعض غلاموں کو مکہ والوں نے اس طرح بھی قتل کیا کہ اُن کی دونوں ٹانگیں دو اونٹوں سے باندھ دیتے اور پھر ان اونٹوں کو مخالف اطراف میں دوڑا دیتے اور وہ کٹ کر ہلاک ہو جاتے (بخاری کتاب التفسیر باب قولہ تعالیٰ اطلع الغیب ام اتخذ عند الرحمان عھدا، السیرۃ الحلبیۃ باب استخفاءہ صلی اللہ علیہ وسلم و اصحابہ فی دار الارقم ...)۔اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ خدا تعالیٰ پر افترا کرنے والے ہوتے اور یہ غلام آپ کو قرآن بنا بنا کر دیا کرتے تو یہ لوگ یقیناً آپ کے دشمن ہوتے کہ آپ پر ایمان لا کر آپ کے لئے اپنی جانیں قربان کرتے۔

کفار کے اس اعتراض کے ضمن میں دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کیا یہ کلام ان غلاموں کا سکھایا ہوا ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے یہ دیا ہے کہ جنہیں تم قصے کہتے ہو وہ قصے ہے ہی نہیں بلکہ پیشگوئیاں ہیں۔اور ان کو بیان کرنے والا آسمانوں اور زمین کے غیبوں کو جاننے والا خدا ہے۔جس نے اپنے غفور اور رحیم ہونے کے سبب سے تمہارے علاج کا سامان کیا ہے یعنی اسرارِ آسمانی اور اسرارِ زمینی دونوں کو اس کتاب میں کھول کر بیان کر دیا گیا ہے اور خدا تعالیٰ کا معاملہ جو بندوں سے ہوتا ہے اس پر بھی اس میں پوری تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے اور مختلف مواقع پر بندے جن خیالات اور جذبات کا اظہار کیا کرتے ہیں اُن کا بھی اس میں مکمل ذکر ہے، پھر جس تعلیم میں تمام قسم کی

فطرتوں کے راز بیان کر دیئے گئے ہیں خواہ وہ عرب میں ہوں یا ہندوستان میں ہوں ۔ یا امریکہ میں ہوں یا یورپ میں ہوں اور ہر قسم کی فطری ضروریات کا سامان اس میں موجود ہے ۔ ادھر خدا تعالیٰ کے وہ تمام قسم کے سلوک جو اس کے بندوں سے ہوتے ہیں چاہے وہ پہلے ہوئے ہوں یا آئندہ ہوں گے ۔ ان سب کو اس میں بیان کیا گیا ہے ۔ اس تعلیم کو ان تعلیمات کی نقل کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے ۔ آخر کون سی سابق تعلیم ایسی ہے جس میں یہ سب باتیں پائی جاتی ہیں ۔ پہلی کتابیں تو وہ تھیں جن کا دائرہ ہدایت بہت محدود تھا ۔ وہ محدود الزمان اور محدود الاوقات تعلیمات تھیں اور پھر صرف ایک ایک علاقہ کے لئے تھیں ۔ ساری دنیا کے لئے نہیں تھیں اس لئے ان کتب میں ہر فطرت کا لحاظ نہیں رکھا گیا ۔ تورات میں صرف یہودی قوم کی اصلاح کو مدنظر رکھا گیا ہے باقی قوموں کو مدنظر نہیں رکھا گیا ۔ اسی طرح اس میں سارے زمانوں کو مدنظر نہیں رکھا گیا ۔ مگر قرآن وہ کتاب ہے جو ساری قوموں اور سارے زمانوں کے لئے ہے ۔ وہ یہودیوں کے لئے بھی ہے وہ عیسائیوں کے لئے بھی ہے ۔ وہ مسلمانوں کے لئے بھی ہے ۔ وہ ہندوؤں کے لئے بھی ہے ۔ وہ یوروپین لوگوں کے لئے بھی ہے ۔ وہ چینیوں کے لئے بھی ہے وہ جاپانیوں کے لئے بھی ہے ۔ وہ وحشیوں کے لئے بھی ہے اور غیر وحشیوں کے لئے بھی ہے ۔ غرض کوئی قوم ایسی نہیں جس کی ہدایت کے لئے قرآن نہ آیا ہو ۔ اور کوئی زمانہ ایسا نہیں جس میں قرآن کی ضرورت سے انکار کیا جا سکتا ہو پھر جب قرآن کریم کی یہ شان ہے تو یہ لوگ کس طرح کہتے ہیں کہ یہ قرآن پہلی کتابوں کی نقل ہے ۔ پُرانے لوگوں کے حالات تو تاریخ سے ہر ایک کو معلوم ہو جاتے ہیں ۔ لیکن اس کتاب میں تو وہ اسرار اور پیشگوئیاں بھری ہوئی ہیں جن کو کوئی بندہ جان ہی نہیں سکتا ۔ پھر اس علمِ غیب کو پُرانے لوگوں کے واقعات کہنا کس طرح درست ہو سکتا ہے ۔ چنانچہ دیکھ لو اس زمانہ میں جبکہ اسلام ابھی مکّہ کی چار دیواری میں محدود تھا اور اسلام قبول کرنے کی وجہ سے مسلمانوں کو بڑی بڑی تکالیف دی جا رہی تھیں اُن کو قتل کیا جاتا تھا ۔ ان کو مارا پیٹا جاتا تھا ۔ اُن کا بائیکاٹ کیا جاتا تھا ۔ اُن کی جائیدادیں اور مکان چھینے جاتے تھے اور جبکہ مکّہ والوں کے زمین کے کسی گوشہ میں بھی یہ خیال نہیں آ سکتا تھا کہ وہ تباہ ہو جائیں گے اور عنانِ حکومت مسلمانوں کے ہاتھ آ جائی گی اللہ تعالیٰ نے خبر دیتے ہوئے فرمایا کہ وَ لَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ۔ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كُلِّهَا فَاَخَذْنٰهُمْ اَخْذَ عَزِيْزٍ مُّقْتَدِرٍ ۔ اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِي الزُّبُرِ ۔ اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ ۔ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَ يُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ۔ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَ السَّاعَةُ اَدْهٰى وَ اَمَرُّ (القمر : ۴۲ تا ۴۷) یعنی ہم نے موسیٰ ؑ کے ذریعہ فرعون کو جو مصر کا بادشاہ تھا اور بنی اسرائیل پر ظلم کیا کرتا تھا ڈرایا کہ دیکھو ہمارے بندے کا مقابلہ نہ کرو ورنہ نقصان اٹھاؤ گے ۔ مگر اُس نے پرواہ نہ کی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی بے اعتنائی اور تکذیب کی وجہ سے ہم نے اُس کو پکڑ لیا اور پھر

معمولی طور پر نہیں پکڑا بلکہ ایک غالب اور قادر کی حیثیت سے پکڑا۔ بعض لوگ گرفت تو کرتے ہیں مگر دشمن ان کی گرفت سے نکل جاتا ہے۔ لیکن فرماتا ہے ہماری گرفت ایسی تھی کہ ایک تو اس گرفت سے کوئی نکل نہیں سکتا تھا اور دوسرے ہماری سزا ایسی تھی جس سے کوئی بچ نہیں سکتا تھا۔ اور پھر اس میں رحم کا جزو بھی پایا جاتا تھا کیونکہ مقتدر آدمی جو جانتا ہے کہ میں ہر وقت سزا دے سکتا ہوں کبھی ایسی سختی نہیں کرتا جو نا قابلِ برداشت ہو کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ میں پھر بھی عذاب دے سکتا ہوں۔ گورنمنٹیں سزا دیتی ہیں تو بعض لوگ ان سزاؤں سے بچ بھی جاتے ہیں وہ پھانسی کی سزا دیتی ہیں تو بعض لوگ جیل والوں سے مل جاتے ہیں اور وہ انہیں زہر مہیا کر دیتے ہیں یا اپنے رشتہ داروں کے ذریعہ سے زہر منگوا لیتے ہیں اور وقت سے پہلے زہر کھا کر مر جاتے ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد جب جرمنی کو شکست ہوئی اور گوئرنگ پکڑا گیا تو بڑی شان سے اعلان کیا گیا کہ ہم فلاں دن گوئرنگ کو پھانسی پر لٹکائیں گے اور سمجھا گیا کہ اس کا لوگوں پر بڑا اثر ہوگا۔ اور وہ سمجھیں گے کہ جرمن بڑے ذلیل ہوئے ہیں لیکن جب پھانسی دینے کے لئے وہ اس کے کمرہ میں گئے تو دیکھا کہ وہ مرا پڑا تھا۔ معلوم ہوا کہ کسی نہ کسی طرح جرمنوں نے اندر زہر پہنچا دیا۔ اور وہ کھا کر مر گیا (Encyclopedia of the Second World War pg 172 underword Goring) تو انہوں نے پکڑا تو سہی مگر جو ارادہ تھا کہ ہم اُسے سزا دیں گے اس میں وہ کامیاب نہ ہوئے گویا یہ اَخْذَ عَزِیْزٍ تو تھا مگر اَخْذَ عَزِیْزٍ مُّقْتَدِرٍ نہیں تھا۔ یعنی پکڑ تو لیا مگر جس قسم کی سزا دینا چاہتے تھے اُس میں ناکام ہو گئے۔ پھر بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ لوگ سزا سے بھی پہلے نکل جاتے ہیں۔ جیل خانوں سے لوگ بھاگ جاتے ہیں ہتھکڑیاں لگنے سے پہلے فرار اختیار کر لیتے ہیں۔ اور پھر بعض دفعہ قریباً ساری عمر نہیں پکڑے جاتے۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ دنیوی حکومتوں میں یہ دو باتیں ہوا کرتی ہیں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مجرم بھاگ جاتا ہے لیکن ہم ایسا پکڑتے ہیں کہ وہ بھاگ نہیں سکتا۔ پھر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ گورنمنٹ پکڑ تو لیتی ہے مگر اُسے سزا نہیں دے سکتی۔ وہ پھانسی کی سزا تجویز کرتی ہے اور خدا تعالیٰ کی طرف سے اس کا ہارٹ فیل ہو جاتا ہے اور وہ پھانسی دینے میں کامیاب نہیں ہو سکتی لیکن ہم نے اُسے اس طرح پکڑا کہ وہ بھاگ نہ سکا اور پھر جو سزا تجویز کی وہ اُسے مل کر رہی۔

اس ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِي الزُّبُرِ اے مکّہ والو! تم بتاؤ تو سہی کہ وہ جو موسیٰؑ کے منکر تھے کیا تم اُن سے بہتر ہو۔ اگر موسیٰؑ کے منکروں کو سزائیں ملی تھیں تو تم کیا سمجھتے ہو۔ آیا یہ کہ تمہیں سزا نہیں دی جا سکتی یا یہ کہ خدائی کتابوں میں تمہارے متعلق کوئی ضمانت آئی ہوئی ہے کہ ہم مکہ والوں کو کچھ نہیں کہیں گے۔ بیشک خدا تعالیٰ نے یہ وعدہ تو کیا ہے کہ وہ خانہ کعبہ کی حفاظت کرے گا۔ مگر اس نے یہ کہیں نہیں کہا

کہ وہ تم کو بھی سزا نہیں دے گا ۔ اَمْ یَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِیْعٌ مُّنْتَصِرٌ کیا وہ کہتے ہیں کہ ہم بڑا جتھا رکھتے ہیں اور ہم ان مسلمانوں کو تباہ کر دیں گے ۔ سَیُھْزَمُ الْجَمْعُ وَ یُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ بیشک ان کفار کی طرف سے حملے ہوں گے اور قوموں کی قومیں اکٹھی ہو جائیں گی اور وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ پر حملہ کریں گی ۔لیکن سَیُھْزَمُ الْجَمْعُ اُن کے لشکر جو اکٹھے ہوں گے اُن کو شکست دی جائے گی وَ یُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ اور وہ پیٹھ دکھاتے ہوئے بھاگ جائیں گے۔

پھر فرماتا ہے بَلِ السَّاعَةُ اَدْھٰی وَ اَمَرُّ یہ جو تم پر تباہی کی گھڑی آئے گی یہ فرعون کی گھڑی سے بھی زیادہ خطرناک ہوگی ۔اب بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ فرعون کی گھڑی سب سے زیادہ خطرناک تھی کیونکہ وہ ڈوب گیا اور اس کی فوج تباہ ہوگئی ۔لیکن فرماتا ہے کہ تمہاری تباہی فرعون کی تباہی سے بھی زیادہ خوفناک ہوگی ۔ چنانچہ اگر غور کرکے دیکھا جائے تو واقعہ میں کفّارِ مکہ کو فرعونیوں سے زیادہ سخت سزا ملی ۔موسیٰ ؑ کو اپنی زندگی میں مصر کا قبضہ نہیں ملا کیونکہ اُن کے پیروؤں نے کنعان پر حملہ کرنے سے انکار کر دیا تھا لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو دشمن تھا ۔اس کو صرف شکست ہی نہیں ہوئی بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ پر قابض ہو گئے پس مکہ والوں کو موسیٰ ؑ کے دشمنوں سے زیادہ سخت سزا ملی کیونکہ وہ قومی طور پر محمد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ماتحت آ گئے ۔اب بتاؤ کیا یہ خبر ایسی تھی جسے کوئی انسان اپنی طرف سے بنا کر پیش کر سکتا تھا ۔ یا اسے پورا کرنے کی طاقت رکھتا تھا ۔ یہ خبر ایسے وقت میں دی گئی تھی جبکہ مسلمان انتہائی کمزوری اور کسمپرسی کی حالت میں تھے اور ان پر عرب کے متحدہ حملہ کا کوئی خیال بھی نہیں کر سکتا تھا ۔مگر کئی سال پہلے عالم الغیب خدا کی طرف سے خبر دی گئی کہ ایک دن مسلمان اتنی طاقت پکڑ جائیں گے کہ کفار متحدہ طور پر ان کو مٹانے کے لئے جمع ہو جائیں گے لیکن اِدھر وہ جمع ہو رہے ہوں گے اور اُدھر خدا اپنے رسول کی مدد کے لئے دوڑا چلا آ رہا ہوگا ۔اور جب دشمن وہاں پہنچے گا تو وہاں خدا موجود ہوگا جسے دیکھ کر وہ حواس باختہ ہو جائے گا ۔ چنانچہ جنگِ احزاب میں دشمن کی چوبیس ہزار فوج مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے جمع ہوئی جبکہ مسلمان صرف بارہ سو تھے ۔ اور پھر ان بارہ سو میں سے بھی پانچ سو سپاہی عورتوں کی حفاظت کے لئے الگ کر لئے گئے تھے ۔ اور باقی صرف سات سو سپاہی رہ گئے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے ایسی مدد کی کہ یہ چوبیس ہزار کا لشکر سات سو کے مقابلہ میں بھاگ گیا ۔اور خدا نے اپنے رسول کو فتح دی ۔ اللہ تعالیٰ اسی قسم کے آسمانی اسرار اور پیشگوئیوں کو کفار کے اعتراض کے جواب میں پیش کرتا ہے اور فرماتا ہے تمہارا یہ کہنا کہ یہ کتاب خدا نے نازل نہیں کی ۔ بلکہ بعض لوگوں نے مل کر بنا لی ہے بالکل جھوٹ ہے ۔ کیونکہ اس کتاب میں ایسی پیشگوئیاں ہیں جن کو کوئی انسانی دماغ وضع نہیں کر سکتا اور جن سے اس کا منجانب اللہ ہونا روزِ روشن کی طرح ثابت ہوتا ہے ۔

پھر تعجب ہے کہ کفار نے یہ اعتراض تو کر دیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سابق انبیاء اور اُن کی قوموں کے حالات عیسائی غلاموں سے لکھوا لیتے ہیں اور پھر وہ واقعات صبح شام اُن کے سامنے پڑھے جاتے ہیں تا کہ یاد رہیں مگر وہ یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ اس زمانہ میں تورات اور انجیل کا کوئی عربی نسخہ بھی موجود تھا جس کی مدد سے یہ قرآن تیار کیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں بائیبل کے عربی ترجمہ کی طرف ابھی عیسائیوں کو کوئی توجہ ہی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ مدینہ اور اس کے اردگرد جو یہودی قبائل آباد تھے اُن کے پاس بھی بائیبل کا کوئی عربی نسخہ نہیں تھا بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر کبھی کسی حوالہ کی ضرورت محسوس ہوتی تو آپ حضرت عبداللہ بن سلامؓ سے دریافت فرمایا کرتے تھے جو عبرانی زبان جانتے تھے (صحیح بخاری کتاب التفسیر سورۃ آل عمران باب قل فأتوا بالتوراۃ۔۔۔) اور وہ عبرانی تورات کو دیکھ کر آپ کو جواب دیتے۔ یہ حقیقت ایسی روشن ہے کہ خود مسیحی مصنفوں نے اس بات کا اقرار کیا ہے۔ چنانچہ ایک مشہور مسیحی مصنّف ڈاکٹر الیگزینڈر لکھتے ہیں کہ بائیبل کا پُرانا عربی ترجمہ آٹھویں صدی سے اوپر نہیں جاتا (حالانکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم چھٹی صدی میں پیدا ہوئے تھے)

The Text and Canon of the New Testament by Dr. Alexander Souter pg 74 &
Encyclopedia of Religion & Ethics vol.9 pg 481 by James Hastings

پس جبکہ اس وقت تک تورات اور انجیل کا کوئی عربی ترجمہ ہی نہیں ہوا تھا تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ عیسائی غلام بائیبل سے پُرانے واقعات آپ کو سناتے تھے اور آپ انہیں یاد کر لیتے تھے۔

یہ تو اس اعتراض کا وہ جواب ہے جو قرآن کریم نے ان آیات میں بیان فرمایا لیکن اس کے علاوہ اصولی طور پر بھی قرآن کریم نے اس سوال کا جواب دیا ہے اور فرمایا ہے کہ اگر ان کفار کا یہ خیال درست ہے کہ کئی لوگوں نے مل کر یہ کتاب بنالی ہے تو وہ ایسی ہی خوبیاں رکھنے والی کوئی اور کتاب بنا کر دکھا دیں۔ پھر دنیا پر خود بخود ظاہر ہو جائے گا کہ ان کا یہ دعویٰ درست ہے یا غلط کیونکہ جو کام چند آدمی مل کر کر سکتے ہیں ویسا ہی کام سو یا ہزار اور آدمی بھی مل کر کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر وہ اس کتاب کی کوئی مثل تیار نہ کر سکیں تو ثابت ہو جائے گا کہ ان کا یہ دعویٰ بالکل غلط ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ سورۂ بنی اسرائیل میں اس جواب کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (بنی اسرائیل: ۸۹) یعنی تو انہیں کہہ دے کہ اگر تمہارے چھوٹے بھی اور بڑے بھی اور عالم بھی اور جاہل بھی اور امیر بھی اور غریب بھی سب مل کر اس قرآن کی کوئی نظیر لانا چاہیں تو وہ اس کی نظیر کبھی تیار نہیں کر سکیں گے خواہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ اس

آیت میں بتایا گیا ہے کہ اگر یہ لوگ قرآن کریم کو انسانی کلام سمجھتے ہیں تو پھر کیوں وہ الٰہی خوبیوں جیسا کوئی اور کلام تیار کر کے نہیں دکھا دیتے۔ جس طرح قرآن کریم میں ہر ضروری دینی مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے اسی طرح وہ بھی کوئی اور ایسا کلام تیار کروا دیں جس میں عبادات اور معاملات اور اخلاق اور اقتصاد اور سیاسیات وغیرہ کے متعلق بنی نوع انسان کے سامنے ایک جامع تعلیم پیش کی گئی ہو اور جس میں کسی ایک قوم یا طبقہ کا فائدہ ملحوظ نہ رکھا گیا ہو بلکہ تمام دنیا کی ضروریات اور اُن کے فوائد پر نظر رکھتے ہوئے اُن کی دینی اور دنیوی بہبودی کے لئے ایک کامل اور بے عیب قانون پیش کیا گیا ہو۔ اگر وہ ایسا کر دیں تو پھر اُن کا یہ دعویٰ ثابت ہو جائے گا کہ اس قرآن کی تیاری میں اور لوگوں کا ہاتھ ہے۔ لیکن اگر وہ ایسا نہ کر سکیں اور قیامت تک نہیں کر سکیں گے تو پھر ثابت ہو جائے گا کہ انہوں نے جو کچھ کہا تھا غلط کہا تھا۔ چنانچہ دیکھ لو باوجود اس کے کہ قرآن کریم کے اس دعویٰ پر چودہ سو سال گذر چکے ہیں اور دنیا نے قرآن کریم کی مخالفت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی پھر بھی وہ آج تک اس قرآنی چیلنج کو قبول نہیں کر سکی اور اس طرح اپنے عجز اور بے چارگی سے وہ ثابت کر چکی ہے کہ یہ کلام انسانوں کا بنایا ہوا نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کا نازل کردہ ہے جس کا مقابلہ کرنے کی کوئی انسان طاقت نہیں رکھتا۔

وَقَالُوْا مَا لِهٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي

اور وہ کہتے ہیں کہ اس رسول کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ کھانا بھی کھاتا ہے اور بازاروں میں بھی چلتا پھرتا ہے۔

الْاَسْوَاقِ ؕ لَوْلَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ

کیوں نہ اس پر فرشتہ اتارا گیا جو اس کے ساتھ کھڑا ہو کر لوگوں کو ہوشیار کرتا یا اس پر کوئی خزانہ اتارا جاتا

نَذِيْرًا ۙ﴿۸﴾ اَوْ يُلْقٰۤى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ

یا اس کے پاس کوئی باغ ہوتا جس کے پھل وہ کھاتا۔ اور ظالم کہتے ہیں کہ تم تو

مِنْهَا ؕ وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا

ایک ایسے آدمی کے پیچھے چل رہے ہو جس کو کھانا کھلایا جاتا ہے دیکھ!

مَّسْحُوْرًا ﴿۹﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا

یہ تیرے متعلق کیسی کیسی باتیں بناتے ہیں اور وہ گمراہ ہو چکے ہیں

يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ﴿۱۰﴾ ع

پس ان کو کوئی (صحیح بات کہنے کا) رستہ نہیں ملتا۔

حلّ لُغَات۔ اَلْكَنْزُ اَلْكَنْزُ اَلْمَالُ الْمَدْفُوْنُ فِي الْاَرْضِ ۔ کنز اس مال کو کہتے ہیں جو زمین میں مدفون ہو۔ وَقِيْلَ اِسْمٌ لِلْمَالِ اِذَا اُحْرِزَ فِيْ وِعَاءٍ اور بعض ماہرین لُغت کہتے ہیں کہ کنز اُس مال کو کہتے ہیں جو کسی تھیلے وغیرہ میں جمع کیا گیا ہو۔ نیز اس کے معنے ہیں اَلذَّهَبُ : سونا اَلْفِضَّةُ : چاندی۔ مَا يُحْرَزُ فِيْهِ الْمَالُ كَالْمَخْزَنِ وَالصَّنْدُوْقِ صندوق یا اور ایسی اشیاء جن میں روپیہ وغیرہ محفوظ کیا جاتا ہے۔ (اقرب)

مَسْحُوْر مسحور سَحَرَ سے اسم مفعول کا صیغہ ہے اور سَحَرَهٗ کے معنے ہیں عَمِلَ لَهُ السِّحْرَ وَ خَدَعَهٗ۔ اُس پر جادو کیا اور اُس کو دھوکا دیا اور سَحَرَ عَنْهُ کے معنے ہیں تَبَاعَدَ۔ دور ہو گیا اور جب سَحَرَ فُلَانًا عَنِ الْاَمْرِ کہیں تو اس کے معنے ہوں گے صَرَفَهٗ اُس کو کسی بات سے روکے رکھا۔ (اقرب)

مفردات میں ہے کہ سِحْر غذا کو بھی کہتے ہیں (مفردات) پس مَسْحُوْر کے معنے ہوں گے (۱) جادو کیا ہوا (۲) دور کیا ہوا (۳) وہ شخص جس کو رشوت اور کھانے کے لئے غذا دی گئی ہو۔

تفسیر۔ فرماتا ہے۔ وہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس رسول کو کیا ہو گیا کہ یہ کھانا بھی کھاتا ہے اور بازاروں میں بھی چلتا پھرتا ہے۔ کیوں نہ اس پر کوئی فرشتہ اُترا۔ جو اس کے ساتھ مل کر لوگوں کو ہوشیار کرتا پھرتا۔ یہ اکیلا کیوں ہے یا اس پر کوئی خزانہ کیوں نہ اُترا۔ یا اس کے ساتھ کوئی باغ کیوں نہ ہوا۔ جس میں سے یہ پھل کھاتا اور ظالم کہتے ہیں کہ اے مسلمانو! تم تو ایک ایسے انسان کے پیچھے چلتے ہو جس کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔

فرماتا ہے۔ دیکھو یہ تیرے متعلق کیسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں یعنی کبھی تو یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ کیسا رسول ہے جو ہماری طرح کھانا کھاتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے اور کبھی یہ کہتے ہیں کہ اگر یہ سچا رسول ہوتا تو کسی بہت بڑے باغ کا مالک ہوتا اور اس میں سے خوب پھل کھاتا پھر بے شک ہم ایمان لے آتے۔ حالانکہ اگر کھانا کھانا نبوت کے منافی ہے تو پھل اور میوے کھانا کسی نبی کی صداقت کا ثبوت کس طرح ہو گیا؟ مگر چونکہ وہ کسی معقول

بنیاد پر اعتراض نہیں کرتے اس لئے کبھی کچھ کہہ دیتے ہیں اور کبھی کچھ۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کفار مکہ کا یہ اعتراض کرنا کہ یہ کیسا رسول ہے جو کھانا بھی کھاتا ہے بتا رہا ہے کہ مذہب اور رُوحانیت سے کلی بے گانگی کی وجہ سے ان کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہو چکا تھا کہ جن لوگوں کا خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا ہو جاتا ہے وہ کھانے پینے کی ضروریات سے مستغنی ہو کر رات دن اللہ تعالیٰ کی عبادت میں ہی مشغول رہتے ہیں۔ ہندو قوم میں بھی ہمیں یہی تخیل نظر آتا ہے چنانچہ اُن میں حضرت بدھ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ گیا کے پاس ایک بانس کے درخت کے نیچے بیٹھے اور سالہا سال بیٹھے رہے یہاں تک کہ ایک بانس کا درخت اُن کے نیچے سے نکلا اور اُن کے سر سے پار ہو گیا۔ مگر محویت کی وجہ سے اُن کو یہ پتہ ہی نہ چلا کہ یہ کیا ہو گیا ہے۔ گویا اُن کے نزدیک حضرت بدھ نے سالہا سال بغیر کچھ کھائے پیئے کے گذار دیئے۔ اسی قسم کے خیالات بدقسمتی سے مسلمانوں کے ایک طبقہ میں بھی پیدا ہو گئے ہیں۔ اور وہ بھی یہ سمجھنے لگ گئے ہیں کہ بزرگ وہی ہوتا ہے جو حد درجہ غلیظ اور گندہ ہو۔ پاکیزہ اور طیب چیزیں استعمال نہ کرے۔ پلاؤ کھانے لگے تو تھوڑا سا پاخانہ بھی اُس میں ملا لے۔ بال کبھی نہ کٹوائے۔ دانتوں کی کبھی صفائی نہ کرے اور یہ توہّم اُن میں اس قدر بڑھ گیا ہے کہ وہ مادر زاد ننگے فقیروں اور فاتر العقل انسانوں کو بھی بزرگ سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ آج بھی ہزاروں مسلمان ایسے ہیں جو اس قسم کے دیوانوں کو خدا رسیدہ سمجھتے اور اکلِ حلال اور نظافت کو بزرگی کے منافی سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں فلاں بزرگ ایک جگہ بیٹھے تو چالیس سال تک انہوں نے اپنا سر نہ اٹھایا اور زمین پر بیٹھے بیٹھے گڑھا پڑ گیا۔

بانیٔ سلسلہ احمدیہ بھی چونکہ نبوت کے مدعی تھے اس لئے آپ پر بھی کھانوں کے متعلق اعتراض کیا گیا۔ آپ بعض امراض کی وجہ سے مشک اور عنبر اور بادام روغن وغیرہ کا استعمال فرمایا کرتے تھے۔ اور یہ بات اُن لوگوں کو عجیب معلوم ہوتی تھی جو ان چیزوں کا استعمال رُوحانیت کے منافی سمجھا کرتے ہیں۔ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ ایک دفعہ درس دے کر مسجد اقصیٰ سے واپس تشریف لا رہے تھے کہ راستہ میں ایک ہندو جو ریٹائرڈ ڈپٹی تھا اور جس کا مکان بعد میں صدر انجمن احمدیہ کے دفاتر کے لئے خرید لیا گیا تھا۔ بڑے ادب کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔ مولوی صاحب میں نے ایک بات پوچھنی ہے۔ آپ خفا تو نہیں ہوں گے آپ نے فرمایا۔ مجھے خفا ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ شوق سے دریافت فرمائیں وہ کہنے لگا۔ میں نے سنا ہے کہ مرزا صاحب مشک اور عنبر اور بادام روغن اور پلاؤ وغیرہ بھی کھا لیتے ہیں۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں ٹھیک ہے وہ یہ غیر متوقع جواب سن کر سخت حیران ہوا۔ اور کہنے لگا کیا فقیروں کے لئے بھی یہ چیزیں جائز ہیں؟ آپ نے فرمایا۔ ہاں ہمارے مذہب میں فقراء کے لئے بھی پاک چیزیں کھانے کا حکم ہے۔ اس جواب سے وہ سخت حیران ہوا اور اچھا کہہ کر چلا گیا۔ یہ تو

حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے جو تہذیب اور شرافت سے بات کرنے کے عادی تھے۔ ہمارے ایک دوست جو تیز زبان تھے اور امرتسر کے رہنے والے تھے اُن کو کوئی ہندو مجسٹریٹ مل گیا۔ اور کہنے لگا کیا ہے تمہارا مرزا! تم کہتے ہو وہ خدا کا مامور ہے اور یہ ہے اور وہ ہے۔ ہم نے تو سنا ہے کہ وہ بادام اور پستہ اور مرغ سب چیزیں کھا لیتا ہے۔ وہ کہنے لگے آپ مرزا صاحب کو چڑانے کے لئے پاخانہ کھایا کریں مجھے اس پر کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ غرض جس طرح موجودہ زمانہ میں اعلیٰ درجہ کی چیزوں کا کھانا پینا پہننا اور عطر وغیرہ لگانا بزرگی کے منافی سمجھا جاتا ہے اسی طرح اس زمانہ میں کفار نے یہ اعتراض کیا کہ یہ عجیب رسول ہے جو کھانا بھی کھاتا ہے اور بازاروں میں بھی چلتا پھرتا ہے۔ اُن نادانوں نے یہ نہ سمجھا کہ رسول تو اپنی قوم کا راہنما ہوتا ہے۔ اگر وہ کھانا نہیں کھائے گا تو اس کی امت کو یہ کیونکر پتہ لگے گا کہ کس طرح کھانا چاہیے اور کیا کیا کھانا چاہیے۔ اور کن کن چیزوں کو حرام سمجھنا چاہیے۔ کھانا انسانی تمدن اور معاشرت کا ایک اہم جزو ہے۔ اور اس کے متعلق ایک جامع تعلیم اور کامل نمونہ کا موجود ہونا ضروری تھا۔ سو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کے لئے اس بارہ میں بھی نمونہ بنایا اور آپؐ کے ذریعہ اُس نے وہ تعلیم دی جو آج بھی کھانے پینے کے معاملات میں بنی نوع انسان کے لئے ایک اعلیٰ درجہ کے دستور العمل کی حیثیت رکھتی ہے اور جس سے اغماض کر کے کوئی انسان سوسائٹی میں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جا سکتا۔

بازاروں میں چلنے پھرنے کا اعتراض بھی بتاتا ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر کوئی شخص خدا رسیدہ ہونے کا مدعی ہو تو اس کی ضروریات کا خدا تعالیٰ کو خود متکفل ہونا چاہیے اور عام لوگوں کی طرح اُسے سامانِ معیشت کی بہم رسانی کے لئے مادی اسباب اور وسائل کا محتاج نہیں ہونا چاہیے۔ یہ خیال بھی ایسا ہے جو بدقسمتی سے آج کل مسلمانوں کے ایک طبقہ کے اندر پایا جاتا ہے اور وہ کہا کرتے ہیں کہ فلاں بزرگ نے جنات اپنے قابو میں کئے ہوئے تھے اور وہ جب چاہتے تھے اُن کے ذریعہ بے موسم کے پھل منگوا لیتے تھے۔ گویا انہیں خود کوئی جدوجہد اور کوشش نہیں کرنی پڑتی تھی بلکہ کسی غیر مرئی مخلوق سے ہی وہ سب کام لے لیا کرتے تھے۔ پھر انہی خیالات کا ایک نتیجہ توکل کا وہ غلط مفہوم بھی ہے جو مسلمانوں میں پیدا ہو گیا ہے اور وہ یہ سمجھنے لگ گئے ہیں کہ توکل اس بات کا نام ہے کہ انسان اسباب سے کام نہ لے اور خدا تعالیٰ پر کامل انحصار رکھے۔ غرض ایک رنگ میں یہ بھی وہی نظریہ ہے جو کفارِ مکہ کا تھا کہ خدا رسیدہ وہی ہوتا ہے جو کھانے پینے کی ضروریات اور سامان معیشت کی فراہمی سے مستغنی ہو اور اس کے لئے غیب سے رزق مہیا ہو جاتا ہو۔

پھر کفار نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور کہا کہ اگر خدا نے اسے دنیا کی ہدایت کے لئے بھجوایا تھا تو وہ اُس کے ساتھ کوئی فرشتہ تو اتارتا۔ جس طرح مسلمان کہتے ہیں کہ مسیحؑ جب آسمان سے نازل ہو گا تو فرشتوں کے کندھوں

پر اُس نے ہاتھ رکھا ہوا ہوگا اور اُسے دیکھتے ہی سب دنیا سمجھ جائے گی کہ مسیحؑ آ گیا اور اُس پر ایمان لے آئے گی۔

پھر کہتے ہیں اگر فرشتہ نہیں اُترا تھا تو کم از کم اس کے ساتھ کوئی خزانہ تو ہونا چاہیے تھا جسے دیکھ کر ہم بھی اس کے ساتھ شامل ہو جاتے مگر یہ تو دوسروں کو کچھ دینے کی بجائے اُن سے چندے مانگتا پھرتا ہے۔ایسے رسول کو ہم کس طرح مان لیں۔افسوس ہے کہ باوجود اس کے کہ کفار کے منہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ باتیں نکلوا کر اُن کی غلطی واضح کی تھی پھر بھی مسلمانوں نے نہ سمجھا اور انہوں نے بھی آنے والے مسیحؑ اور مہدی کے متعلق یہ نظریہ قائم کر لیا کہ وہ آتے ہی اس قدر مال لٹائے گا کہ کوئی شخص غریب نہیں رہے گا۔گویا زمین کے سب خزائن اُس کے قبضہ میں ہوں گے اور وہ مال و دولت کے انبار لوگوں میں تقسیم کرتا چلا جائے گا۔

پھر کفار نے کہا کہ اگر کوئی خزانہ اس پر نہیں اُترا تھا تو کم از کم اسے کوئی باغ تو ملتا جس کے یہ پھل کھایا کرتا مگر اس کی تو یہ حالت ہے کہ مکہ اور طائف کے وہ سردار جو اس کے دشمن ہیں اُن کے پاس تو بڑے بڑے باغات ہیں اور اس کے پاس کوئی چھوٹا سا باغ بھی نہیں۔یہ دلائل اُن لوگوں کے نزدیک اتنے وزنی تھے کہ وہ ان کا ذکر کر کے کہتے ہیں کہ جب ان میں سے کوئی چیز بھی اس کے پاس نہیں تو یہ شخص سچا کس طرح ہو گیا اور اس کے پیچھے چلنے والے ہدایت یافتہ کس طرح ہو گئے۔یہ تو اس بات کا ثبوت ہے کہ جو لوگ اسے مان رہے ہیں وہ نعوذ باللہ اس کے دھوکا اور فریب میں آ گئے ہیں اُن کے ان اعتراضات کا اگلی آیت میں جواب دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ تم ان اعتراضات سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلبہ کو روک نہیں سکتے۔ایک دن آنے والا ہے جب تمہارے یہ تمام اعتراضات دھرے کے دھرے رہ جائیں گے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم پر غالب آ جائیں گے۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ

بہت برکت والا ہے وہ خدا جو چاہے تو تیرے لئے (اُن کے تجویز کردہ) اُس باغ سے بہت بہتر باغات پیدا

تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ وَيَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا ﴿۱۱﴾

کر دے جن (کے سایہ) میں نہریں بہتی ہوں اور تیرے لئے بڑے بڑے محل تیار کر دے۔

تفسیر ۔فرماتا ہے۔بڑی برکت والا وہ خدا ہے جو اگر چاہے تو تجھے ان کے منہ مانگے باغ سے بہت بہتر باغات دے دے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں۔اور تجھے بڑے بڑے محلات کا مالک بنا دے۔یعنی یہ تو تجھ سے ایک باغ مانگتے ہیں مگر ان نادانوں کو کیا معلوم کہ ہم نے تیرے لئے کیسے کیسے عظیم الشان باغات اور محلات مقدر کئے

ہوئے ہیں۔ یہ مسلمانوں کی آج کی بے بسی اور ان کی کمزوری کو دیکھ کر طعنہ زنی کر رہے ہیں مگر مستقبل اُن کی نظروں سے پوشیدہ ہے۔ اور وہ یہ نہیں جانتے کہ جن باغات پر اُن کا قبضہ ہے اور جن خزانوں پر انہیں ناز ہے۔ ایک دن آنے والا ہے کہ وہ اُن کے ہاتھوں سے چھینے جائیں گے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے ساتھیوں کو دے دیئے جائیں گے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس وعدہ کو پورا کیا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی برکت سے اُس نے مسلمانوں کو بڑے بڑے باغات اور محلات عطا فرمائے۔ وہ طائف اور نخلہ کے باغوں کے بھی مالک ہوئے اور قیصر و کسریٰ کے خزانوں کے بھی مالک ہوئے اور ان ہیروں اور جواہرات کے ڈھیر اُن کے قبضہ میں آئے۔ اور یہ سب کچھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئیوں کے مطابق ہوا۔ چنانچہ غزوۂ احزاب میں جب مدینہ کی حفاظت کے لئے خندق کھودی جا رہی تھی تو اچانک ایک پتھر ایسا آ گیا جو باوجود کوشش کے صحابہؓ سے ٹوٹ نہ سکا۔ انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی تو آپ خود وہاں تشریف لے گئے اور کدال ہاتھ میں لی اور زور سے اس پتھر پر ماری۔ پتھر میں سے روشنی کی ایک شعاع نکلی اور آپ نے بلند آواز سے فرمایا اَللّٰہُ اَکْبَرُ۔ آپؐ کے نعرۂ تکبیر بلند کرنے پر صحابہؓ نے بھی زور سے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ پھر دوسری دفعہ آپؐ نے کدال ماری تو پھر اُس میں سے روشنی کی شعاع نکلی اور آپؐ نے پھر فرمایا اَللّٰہُ اَکْبَرُ۔ اور صحابہؓ نے بھی بڑے جوش سے کہا اَللّٰہُ اَکْبَرُ۔ اس کے بعد تیسری دفعہ آپؐ نے کدال ماری تو پھر اُس میں سے ایک شعاع نکلی اور آپؐ نے فرمایا اَللّٰہُ اَکْبَرُ۔ اور صحابہؓ نے بھی کہا اَللّٰہُ اَکْبَرُ۔ اور وہ پتھر ریزہ ریزہ ہو گیا۔ جب پتھر ٹوٹ چکا تو صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپؐ نے کدال مارتے وقت تین دفعہ اللہ اکبر کیوں کہا تھا۔ آپ نے فرمایا۔ جب پہلی دفعہ پتھر میں سے روشنی نکلی تو مجھے کشفی حالت میں قیصر روم کے محلات دکھائے گئے اور اُن کی کنجیاں میرے سپرد کی گئیں۔ پھر دوسری دفعہ میں نے کدال ماری تو مجھے مدائن کے سفید محلات دکھائے گئے اور مملکتِ فارس کی کُنجیاں مجھے دی گئیں۔ اس کے بعد تیسری دفعہ میں نے کدال ماری تو مجھے صنعاء کے دروازے دکھائے گئے اور مملکتِ یمن کی کنجیاں مجھے دی گئیں۔ پس تم ان خدائی وعدوں پر ایمان لاؤ اور یقین رکھو کہ دشمن تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ وہ یقیناً مغلوب ہو گا اور خدا تعالیٰ تمہیں کامیابی و کامرانی عطا فرمائے گا۔ انہی وعدوں کے مطابق اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس قدر فتوحات عطا فرمائیں کہ قیصر و کسریٰ جیسی عظیم الشان سلطنتوں کی انہوں نے اینٹ سے اینٹ بجا دی اور اُن کے بڑے بڑے محلات اور باغات اور جواہرات اور بیش قیمت نوادرات مسلمانوں کے قبضہ میں آ گئے۔ انہی فتوحات کے نتیجہ میں ایک دفعہ کسریٰ شہنشاہ ایران کا رومال جو وہ تخت پر بیٹھتے وقت اپنے ہاتھ میں رکھا کرتا تھا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آیا۔

حضرت ابوہریرہؓ کو ایک دفعہ نزلہ کی شکایت تھی۔ انہیں کھانسی اٹھی تو انہوں نے کسریٰ شہنشاہ ایران کا رومال اپنی جیب سے نکال کر اُس میں تھوک دیا اور پھر بے اختیار کہنے لگے۔ بخٍ بخٍ ابو ھریرہ! یعنی واہ واہ ابوہریرہ تیری بھی کیا شان ہے۔ پاس بیٹھنے والوں نے جب اُن کا یہ فقرہ سنا تو چونکہ وہ لوگ حدیث العہد تھے انہوں نے دریافت کیا کہ آپ نے یہ کیا بات کہی ہے۔ انہوں نے کہا ایک زمانہ مجھ پر ایسا گذرا ہے جب مجھے سات سات وقت کا فاقہ آجاتا تھا اور میں شدتِ بھوک کی وجہ سے بیہوش ہو جایا کرتا تھا۔ مگر لوگ غلطی سے یہ سمجھتے کہ مجھے مرگی کا دورہ ہو گیا ہے اور وہ اس کے علاج کے طور پر عرب کے رسم ورواج کے مطابق میرے سر پر جوتیاں مارا کرتے تھے حالانکہ مجھے بھوک کی شدت کی وجہ سے غشی ہوا کرتی تھی نہ کہ کسی بیماری کی وجہ سے۔ مگر آج محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کی برکت سے میری یہ حالت ہے کہ میں کسریٰ شہنشاہِ ایران کے رومال میں تھوک رہا ہوں (بخاری کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة باب ما ذکر النبی صلی اللہ علیہ وسلم و حضّ علی اتّفاق اھل العلم وما اجتمع علیه الحرمان)۔

اسی طرح ہجرت کے موقعہ پر جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مدینہ کی طرف تشریف لے جارہے تھے تو چونکہ مکہ والوں نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ جو شخص محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو گرفتار کر کے لے آئے گا اُسے سو اونٹنیاں انعام دی جائیں گی۔ اس لئے کئی لوگ آپ کی تلاش میں ادھر اُدھر نکل کھڑے ہوئے۔ اُنہی لوگوں میں سراقہؓ بن مالک ایک بدوی رئیس بھی تھا جو انعام کے لالچ میں آپؐ کے پیچھے روانہ ہوا۔ اور جب اُس نے آپؐ کو دیکھ لیا تو وہ خوشی سے پھُولا نہ سمایا اور اُس نے سمجھا کہ اب میں آپؐ کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا مگر اللہ تعالیٰ اُسے اپنا نشان دکھانا چاہتا تھا۔ جب وہ آگے بڑھا تو اچانک اُس کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور وہ زمین پر گر گیا۔ سراقہؓ جو بعد میں مسلمان ہو گیا تھا وہ خود اپنا واقعہ اس طرح بیان کرتا ہے کہ جب میں گھوڑے سے گرا تو عرب کے قدیم دستور کے مطابق میں نے اپنے تیروں سے فال لی کہ مجھے آگے بڑھنا چاہیے یا نہیں۔ اور فال یہ نکلی کہ آگے نہیں بڑھنا چاہیے مگر انعام کی لالچ کی وجہ سے میں پھر گھوڑے پر سوار ہو کر آپ کے پیچھے دوڑا۔ جب میں آپ کے اور قریب پہنچا تو پھر میرے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور میں نیچے گر گیا۔ اُس وقت میں نے دیکھا کہ ریت میں گھوڑے کے پاؤں اتنے دھنس گئے تھے کہ اُن کا نکالنا میرے لئے مشکل ہو گیا۔ آخر میں نے سمجھ لیا کہ خدا اس شخص کے ساتھ ہے۔ چنانچہ میں یا تو آپؐ کو گرفتار کرنے کے لئے آیا تھا اور یا خود آپؐ کا عقیدت مند اور شکار بن کر نہایت ادب کے ساتھ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور میں نے عرض کیا کہ میں اس ارادہ کے ساتھ آیا تھا مگر اب میں نے اپنا ارادہ تبدیل کر لیا ہے۔ اور واپس جارہا ہوں کیونکہ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ

خدا آپؐ کے ساتھ ہے۔ جب سراقہؓ لوٹنے لگا تو معًا اللہ تعالیٰ نے سراقہ کے آئندہ حالاتِ زندگی آپؐ پر غیب سے ظاہر فرما دیئے۔ اور آپؐ نے اُسے فرمایا۔ سراقہ! اُس وقت تیرا کیا حال ہوگا جب شہنشاہ ایران کے سونے کے کنگن تیرے ہاتھ میں ہوں گے۔ سراقہ نے حیران ہو کر کہا۔ کسریٰ بن ہرمز شہنشاہ ایران کے۔ آپؐ نے فرمایا ہاں! وہ حیرت واستعجاب کا مجسمہ بن کر واپس چلا آیا۔ مگر اللہ تعالیٰ کی شان دیکھو کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں کسریٰ کا دارالامارۃ مسلمانوں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال کیا گیا۔ اور ایران کے خزانے مسلمانوں کے قبضہ میں آئے جن میں وہ کڑے بھی تھے جو شہنشاہ ایران تخت پر بیٹھتے وقت اپنے ہاتھوں میں پہنا کرتا تھا۔ اور جو ہیروں اور جواہرات سے لدے ہوئے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے جب یہ کڑے رکھے گئے تو آپ کو فوراً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشگوئی یاد آ گئی۔ اور آپ نے فرمایا سراقہ کو بلاؤ۔ سراقہ آیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ کسریٰ کے کنگن لو اور اپنے ہاتھوں میں پہنو۔ سراقہ نے کہا اے امیر المومنین! سونا پہننا تو مردوں کے لئے منع ہے۔ آپ نے فرمایا ٹھیک ہے۔ مگر اس موقعہ کے لئے نہیں۔ خدا نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمہارے ہاتھوں میں سونے کے کنگن دکھائے تھے اس لئے تمہیں کم سے کم ایک منٹ کے لئے یہ سونے کے کنگن پہننے پڑیں گے تا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی پوری ہو ورنہ میں تمہیں سزا دوں گا۔ چنانچہ سراقہ نے وہ کنگن لے کر اپنے ہاتھوں میں ڈالے اور اس طرح مسلمانوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس عظیم الشان پیشگوئی کو اپنی آنکھوں سے پورا ہوتے دیکھا (اسد الغابۃ سراقۃ بن مالکؓ و السیرۃ الحلبیۃ باب الھجرۃ الی المدینۃ)۔

غرض اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ظاہری رنگ میں بھی عرب اور عراق اور شام اور ایران کے باغات اور اُن کے محلات کا مالک بنایا اور اس طرح یہ پیشگوئی پوری ہوئی کہ تَبٰرَكَ الَّذِيْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ وَيَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا۔ مگر چونکہ ہر ظاہر اپنے ساتھ ایک باطن بھی رکھتا ہے اس لئے جہاں اس آیت میں ظاہری باغات اور محلات کے عطا کئے جانے کی پیشگوئی تھی جو مسلمانوں کے عہد حکومت میں بڑی شان سے پوری ہوئی اور انہوں نے خود بھی اپنی ترقی کے دور میں بڑے بڑے باغات اور محلات بنائے جو اُن کی یادگار کے طور پر آج بھی دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ وہاں اس میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو روحانی باغ عطا کئے جانے کا بھی وعدہ کیا گیا تھا اور بتایا گیا تھا کہ یہ تو تجھ سے وہ باغ مانگتے ہیں جو آج سرسبز وشاداب ہوتا ہے تو کل گل سڑ جاتا ہے۔ کبھی زمین کی خرابی کی وجہ سے وہ پھل نہیں دیتا کبھی پانی کی کمی اسے خشک کر دیتی ہے۔ کبھی بیماریاں اس کے پھلوں کو تباہ کر دیتی ہیں۔ کبھی ہوائیں اس کے پھولوں کو گرا دیتی ہیں۔ لیکن ہم تجھے وہ باغات دینے والے ہیں جن کے

نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یعنی وہ باغ کبھی خشک نہیں ہوں گے بلکہ ہمیشہ ہرے بھرے اور سرسبز وشاداب رہیں گے اور دیکھنے والوں کی آنکھوں کو طراوت اور اُن کے دلوں کو راحت پہنچائیں گے۔ اور دنیا پر ہمیشہ کے لئے اسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور آپ کی حقانیت کو ظاہر کرتے رہیں گے۔ چنانچہ اس بارہ میں جب قرآن کریم پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مثیل قرار دیا ہے جیسا کہ وہ سورۂ مزمل میں فرماتا ہے کہ اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (المزمل:۱۶) یعنی اے مکہ والو! ہم نے تمہاری طرف اسی طرح ایک رسول تم پر نگران بنا کر بھیجا ہے جس طرح ہم نے موسیٰؑ کو فرعون کی طرف رسول بنا کر بھیجا تھا۔ پس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مثیل تھے اور امّتِ محمدیہ امتِ موسویہ کی مثیل ہے اور قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو دو باغ عطا فرمائے تھے جن میں سے ایک تو موسوی باغ تھا اور ایک عیسوی۔ موسوی قوم کو جو باغات ملے اُن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا ہے کہ وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّ حَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّ جَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا۔ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَ لَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْئًا ۙ وَّ فَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا (الکہف:۳۳، ۳۴) یعنی تم ان لوگوں کے سامنے دو آدمیوں (یعنی مسلمانوں اور مسیحی اقوام) کی حالت بیان کرو جن میں سے ایک یعنی موسیٰؑ کو ہم نے انگوروں کے دو باغ عطا فرمائے۔ اور انہیں ہم نے کھجوروں کے درختوں سے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ لیکن ان دو باغات کے درمیان ہم نے کچھ کھیتی بھی پیدا کی تھی۔ چنانچہ موسوی باغ بھی خوب پھولا پھلا۔ اور عیسوی باغ بھی خوب پھولا اور پھلا۔ لیکن درمیانی عرصہ میں جب کہ بخت نصر نے یہودیوں کو تباہ کر دیا اور ان کے معبد گرا دیئے اور وہ انہیں قید کر کے اپنے ساتھ لے گیا اُن کی مثال ایک کھیتی کی سی ہوگئی جو غنم القوم کے چر جانے کے خطرہ میں ہوتی ہے یعنی دشمن قومیں حملہ کر کے اسے لُوٹ کھسوٹ سکتی ہیں۔ یہی سلسلہ امت محمدیہ میں بھی دہرانے کا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ چنانچہ آپ کو موسیٰؑ کا مثیل قرار دے کر اسی طرف اشارہ کیا گیا تھا کہ موسوی قوم کے حالات ایک رنگ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی پیش آنے والے ہیں یعنی آپ کو بھی دو باغ ملیں گے۔ ایک باغ تو وہ ہوگا جس میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت بغیر کسی اور مامور کی مدد کے دنیا کو اپنا فیض پہنچائے گی۔ لیکن آخر میں جب مسلمان کمزور ہوجائیں گے اللہ تعالیٰ موسوی سلسلہ کی طرح ایک محمدی مسیح ان میں بھیجے گا جس کی جماعت ایک دوسرے باغ کی حیثیت رکھے گی لیکن ہوگی وہ بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امّت اور اُس کا باغ بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا باغ ہی کہلائے گا لیکن اس فرق سے کہ

موسوی سلسلہ کے دوسرے حصہ کی بنیاد جس مسیح سے پڑی تھی وہ مستقل نبی تھا مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ موسیٰ ؑ سے افضل ہیں اس لئے آپؐ کے دوسرے باغ کی بنیاد جس مسیح سے پڑے گی وہ امتی نبی ہوگا۔ یعنی وہ خود بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں سے ہوگا اور اُس کے ماننے والے بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں ہی ہوں گے۔ چنانچہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو باغ عطا کئے گئے۔ ایک باغ مسیح موعود کے ظہور سے پہلے زمانہ میں اور ایک باغ مسیح موعود کے ظہور کے بعد کے زمانہ میں۔ پھر پہلے زمانہ میں دنیوی لحاظ سے بھی وہی باغ آپ کو ملا جو موسیٰ ؑ کی امت کو ملا تھا۔ یعنی فلسطین اور کشمیر کا علاقہ اور یہ دونوں علاقے ایسے ہیں جو باغات کی کثرت کی وجہ سے مشہور ہیں۔ چنانچہ ۱۹۲۴ء میں جب میں یورپ گیا تو فلسطین میں بھی گیا تھا۔ میں ریل میں دمشق سے بیروت آیا۔ جب ہم بیروت کے قریب پہنچے تو میں نے دیکھا کہ ریل شہر کے اندر سے گذر رہی ہے اور ہر گھر میں باغیچے لگے ہوئے ہیں۔ اسی طرح دمشق میں مَیں نے دیکھا کہ گھر گھر میں نہریں جاری تھیں۔ اور ہر گھر میں باغ لگا ہوا تھا۔ یہی حال کشمیر کا ہے کہ وہاں چپے چپے پر باغ ہیں کچھ تو خود رُو ہیں۔ اور کچھ مغل بادشاہوں نے لگائے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مادی باغ کشمیر اس وقت ہندوؤں کے قبضہ میں ہے اور فلسطین یہودیوں کے قبضہ میں ہے مگر اللہ تعالیٰ یہ دونوں باغ اپنے فضل سے پھر محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو واپس دلائے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے چاہا تو یہ دونوں باغات رُوحانی طور پر بھی محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مل جائیں گے یعنی اللہ تعالیٰ یہودی قوم کو بھی مسلمان بنا دے گا اور وہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حلقہ بگوش ہو جائیں گے اور بجائے اس کے کہ مسلمانوں کو توپیں اور بندوقیں لے کر فلسطین پر حملہ کرنا پڑے یہودی خود آگے بڑھ کر بیت المقدس کے دروازے کھول دیں گے اور کہیں گے کہ اے مسلمانو! ہم بھی تمہارے مسلمان بھائی ہیں۔ تم خوشی سے ہمارے پاس آؤ اور مسیح موسوی کی امت بھی دوبارہ فتح کی جائے گی۔ اور اسلام لائے گی۔ پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے باغ کا ایک حصہ بن جائے گی لطیفہ یہ ہے کہ دنیا میں اور لوگ باغ لگاتے رہے لیکن وہ باغ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مل گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بڑی کوشش اور جدوجہد سے یہودی بنائے اور اُن کو فلسطین میں بسایا لیکن خدا نے محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بنا بنایا فلسطین دے دیا۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کی قوم ہجرت کر کے کشمیر آئی اور خدا تعالیٰ نے بنا بنایا کشمیر محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دے دیا۔ اور اب حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا لگا لگایا باغ بھی محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہی مل گیا۔ چنانچہ دنیا کے کناروں تک احمدی مبلغ تبلیغ کرتے اور لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ پڑھوا کر لوگوں کو اپنے ساتھ ملاتے ہیں۔ اُن میں

سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مَسِیْحِ مَوْعُوْد رَسُوْلُ اللّٰہِ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ مسیح موعودؑ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے امتی ہیں۔ کوئی مستقل نبی نہیں بلکہ آپ کو مستقل نبی قرار دینا کفر ہے۔ گویا جو درخت بھی اُن کو ملتا ہے وہ لا کر محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے چمن میں لگا دیتے ہیں۔ موسیٰ ؑ کے باغ میں تو صرف ایک بڑا درخت پیدا ہوا تھا جس کا نام داوٗد تھا۔ مگر محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے چمن کا ایک درخت یعنی مسیح موعودؑ دعویٰ کرتا ہے کہ میں ہی محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے چمن کا داوٗد نامی درخت نہیں بلکہ مجھ سے اور بھی کئی بیج نکلنے والے ہیں جن سے بہت سے داوٗد پیدا ہوں گے اور اس طرح محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے چمن میں ہزاروں داوٗدی شجر پیدا ہو جائیں گے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا۔

اک شجر ہوں جس کو داوٗدی صفت کے پھل لگے

میں ہوا داوٗد اور جالوت ہے میرا شکار

(براہین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۱۳۳)

یعنی میں محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے باغ کا ایک درخت ہوں۔ جو خود ہی داوٗد نہیں بلکہ میرے اندر جو پھل لگ رہے ہیں وہ بھی داوٗدی صفت کے ہیں۔ یعنی میں ہی داوٗد نہیں بلکہ میرے ماننے والے مریدوں میں سے بھی ہزاروں داوٗد پیدا ہوں گے۔ اسی طرح فرمایا۔

میں کبھی آدمؑ کبھی موسیٰ ؑ کبھی یعقوبؑ ہوں

نیز ابراہیمؑ ہوں نسلیں ہیں میری بے شمار

(براہین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۱۳۳)

اگر موسیٰ ؑ اور عیسیٰؑ کو بنی اسرائیل کی تعداد پر فخر ہے تو میرے ذریعے سے اللہ تعالیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بے شمار نسلیں عطا فرمائے گا۔ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا باغ دنیا کے چپہ چپہ پر پھیل جائے گا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی یہی نمونہ اللہ تعالیٰ نے دکھایا اور اس نے لوگوں کے لگائے ہوئے درخت آپؐ کے چمن میں لا کر لگا دیئے۔ چنانچہ ابوجہل کے باغ کا درخت عکرمہؓ وہاں سے اکھیڑ کر آپ کے باغ میں لگا دیا گیا۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور دشمن ولید اور عاص بن وائل تھے۔ ولید کا بیٹا خالد تھا جو ولید کے چمن سے کاٹ کر محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے چمن میں لگا دیا گیا۔ اور آج عالمِ اسلام خالد بن ولید جیسے بہادر جرنیل کے کارناموں پر فخر کرتا ہے وہ بوٹا تھا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک شدید دشمن کا۔ لیکن اُس نے پھل محمد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے باغ میں آ کر دینا شروع کیا۔اس سے پہلے وہ مکہ کے ایک نمبردار کا بیٹا تھا لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے باغ میں لگنے کے بعد روم اور کسریٰ کے بادشاہ اس کے سائے میں بیٹھنے لگ گئے۔پھر اس کے علاوہ آپؐ کے باغ کے کچھ درخت وہ تھے جو براہِ راست آپؐ نے لگائے۔جیسے ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ۔ حضرت ابوبکرؓ یہ لوگ ایک کچی کوٹھری میں مدینہ میں بیٹھے ہوتے تھے لیکن قیصر اپنے محل میں ان کے نام سے کانپتا تھا۔ اور کسریٰ اپنے محل میں ہزاروں میل پر بیٹھا ہوا اُن سے لرزہ براندام رہتا تھا۔اسی طرح محمدی باغ میں ایک پودا حضرت حسن بصریؒ کا لگا۔ایک پودا حضرت جنیدؒ بغدادی کا لگا۔ایک پودا حضرت سیّد عبدالقادر صاحب جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا لگا۔ایک شبلی رحمۃ اللہ علیہ کا لگا۔ایک حضرت محی الدین صاحب ابن عربی کا لگا۔ایک امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا لگا ایک ابن قیّم رحمۃ اللہ علیہ کا لگا۔ایک حضرت شہاب الدین صاحب سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کا لگا۔ایک حضرت بہاؤ الدین صاحب نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ کا لگا۔ایک حضرت معین الدین صاحب چشتی رحمۃ اللہ علیہ کا لگا۔ایک حضرت سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کا لگا۔ایک حضرت قطب الدین صاحب بختیار کا کی رحمۃ اللہ علیہ کا لگا۔ایک حضرت فریدالدین صاحب شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ کا لگا۔ایک حضرت نظام الدین صاحب اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کا لگا۔ایک حضرت باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کا لگا۔ایک حضرت داتا گنج بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا لگا۔ایک حضرت مجدد صاحب سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کا لگا۔ایک حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا لگا۔ایک حضرت خواجہ میر محمد ناصر رحمۃ اللہ علیہ کا لگا۔ایک حضرت سید احمد صاحب بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا لگا۔اور سب سے آخر میں باغِ محمدی کی حفاظت کرنے والے درخت مسیح موعود علیہ السلام کا پودا لگا جس کو خود مسلمانوں نے بدقسمتی سے کاٹنا چاہا۔تا کہ محمدی باغ میں دشمن گھس جائے اور اُسے تباہ کر دے۔مگر وہ پودا اس شان کا تھا کہ اُس نے کہا ۔

اے آنکہ سوئے من بدویدی بصد تبر
از باغباں بترس کہ من شاخِ مثمرم

(ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۱۸۱)

یعنی اے وہ شخص جو سوسو کلہاڑے لے کر میرے کاٹنے کے لئے دوڑا چلا آ رہا ہے تو میرے باغبان خدا سے ڈر کہ میں وہ شاخ ہوں جس کو پھل لگے ہوئے ہیں۔اگر تو مجھے کاٹے گا تو محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا پھل کٹ جائے گا اور نتیجہ یہ ہوگا کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا باغ باڑ کے بغیر رہ جائے گا۔پس تُو مجھے نہیں کاٹ رہا تو محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے باغ کو اجاڑ رہا ہے اور خدا کبھی برداشت نہیں کرے گا کہ محمدؐ رسول اللہ

کا باغ اُجڑے وہ ضرور اس کی حفاظت کرے گا۔ چنانچہ آسمان سے اللہ تعالیٰ مسیح موعود ؑ کی حفاظت کے لئے اُترا اور باوجود اس کے کہ سب مولویوں نے اکٹھے ہو کر حملہ کیا۔ اللہ تعالیٰ سینہ سپر ہو کر کھڑا ہو گیا اور اُس نے کہا کہ میں محمد ؐ رسول اللہ کے باغ کو نہیں اُجڑنے دوں گا۔ چنانچہ اُس نے تمام مخالفین کے حملوں کو ناکام کر دیا۔ غرض بڑی برکت والا ہے وہ خدا جس نے مسیح موعودؑ جیسا غلام محمد ؐ رسول اللہ کو دیا۔ جس نے محمد ؐ رسول اللہ کا باغ جب اُجڑ کے کھیتی بننے لگا تھا تو پھر اُس کو ایک ہرے بھرے باغ کی شکل میں تبدیل کر دیا اور اس کے رکھوالوں کو دنیا کے کناروں تک پھیلا دیا تاکہ وہ ہر ملک میں جائیں۔ ہر قوم میں جائیں اور ہر جگہ پر جا کر وہاں سے عیسیٰؑ کے باغ کے پودوں کو نکال نکال کر محمد ؐ رسول اللہ کے باغ میں لگائیں۔ اسی طرح موسیٰ ؑ کے پودوں کو اکھیڑ اکھیڑ کے محمد ؐ رسول اللہ کے باغ میں لگائیں۔ یہاں تک کہ دنیا کے چپّے چپّے میں محمد ؐ رسول اللہ کے باغ لگ جائیں اور اس کا نتیجہ یہ ہو کہ بنی اسرائیل جو پہلے زمانہ میں مسلمان نہیں ہوئے اس آخری موعود کے ذریعہ اسلام میں داخل ہو جائیں اور یہودیت اور عیسائیت کا جھگڑا ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے اور صرف اسلام یا محمدیت ہی باقی رہے۔

پھر فرماتا ہے۔ وَيَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا۔ اللہ تعالیٰ تجھے ایک نہیں بلکہ بہت سے قصر عطا فرمائے گا۔ یعنی ایسے شاگرد تجھے ملیں گے جو اسلام کو دشمنوں کے حملوں سے بچاتے رہیں گے۔ اور اُس کے حُسن کو دنیا پر ظاہر کرتے رہیں گے تاریخ میں لکھا ہے کہ جب حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فوت ہوئے تو ایک مجذوب اُن کے جنازہ پر آیا اور یہ شعر پڑھ کر رونے لگ گیا کہ ؎

وَا اَسَفَا عَلٰى فِرَاقِ قَوْمٍ   هُمُ الْمَصَابِيْحُ وَالْحُصُوْنُ
وَالْمُدْنُ وَالْمُزْنُ وَالرَّوَاسِىْ   وَالْخَيْرُ وَالْاَمْنُ وَالسُّكُوْنُ
لَمْ يَتَغَيَّرْ لَنَا اللَّيَالِىْ   حَتّٰى تَوَفَّا هُمُ الْمَنُوْنُ
فَكُلُّ جَمْرٍ لَنَا قُلُوْبٌ   وَكُلُّ مَآءٍ لَنَا عُيُوْنٌ

(تاریخ بغداد للخطیب بغدادی ذکر من اسمعہ الجنید)

یعنی افسوس ہے کہ موت نے ہم سے وہ لوگ جدا کر دیئے جو تاریکیوں میں ہمارے لئے شمع ہدایت تھے اور مصیبتوں میں ہمارے لئے قلعوں کا کام دیتے تھے جو فیوض اور برکات کے جامع ہونے کے لحاظ سے ایک شہر کی حیثیت رکھتے تھے اور خدا تعالیٰ کے انوار اور اس کے روحانی انعامات کی ایک بارش تھے۔ وہ عزائم کی بلندی اور حوادث کے تھپیڑوں کا مقابلہ کرنے میں ایک پہاڑ کی طرح تھے۔ اور دنیا کے لئے سراسر خیر اور امن اور سکون کا

موجب تھے۔ زمانہ نے ہمیں اسی وقت اپنے انقلاب کا شکار بنایا جب موت نے ان بابرکت وجودوں کو ہم سے جُدا کر دیا۔ اب ہمارا یہ حال ہے کہ دل اُن کی جدائی میں غم واندوہ سے انگارے کی طرح جل رہے ہیں اور آنکھیں اُن کی یاد میں پانی بن کر بہ رہی ہیں۔

یہ اشعار بتاتے ہیں کہ مردِ کامل کو بھی ایک قلعہ یا محل کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے ذریعہ سے دنیا کی حفاظت ہوتی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ تو تجھ سے دنیوی خزانے اور مادی محلات اور ظاہری شان وشوکت کے آثار طلب کرتے ہیں اور ہم نے تو تیرے لئے بڑے بڑے عالی شان محل تیار کر چھوڑے ہیں جو ان کے واہمہ اور گمان میں بھی نہیں۔ یعنی اعلیٰ درجہ کے رُوحانی شاگرد اور اولیاء اللہ تیار کئے ہیں جن کی حفاظت میں مسلمان ہمیشہ ترقی کرتے چلے جائیں گے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس وعدہ کے مطابق ہر صدی میں ایسے صلحاء اور اولیاء اور ابدال اور اقطاب اور مجدد ین کھڑے کئے جنہوں نے اسلام کو ہر قسم کے اندرونی اور بیرونی دشمنوں کے حملوں سے بچایا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لگائے ہوئے باغ کی ایک ادنیٰ چاکر اور غلام بن کر خدمت کی اور اُس کے پھولوں اور پھلوں کی حفاظت میں اپنی عمریں بسر کر دیں۔ آج بھی ہر شہر اور ہر گاؤں جس میں مسلمانوں کی آبادی ہے اس کے قبرستانوں میں کوئی نہ کوئی قبر کسی ایسے بزرگ یا ولی کی ضرور پائی جاتی ہے جس نے اسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اپنے علاقہ میں قائم کی اور اسلامی برکات سے لوگوں کو روشناس کیا۔ اور یقیناً ایسے لوگوں کو اگر شمار کیا جائے تو اُن کی تعداد لاکھوں سے بھی متجاوز ہو جائے گی۔

اس کے مقابلہ میں دنیا کا اور کوئی مذہب ایسا نہیں جس کے ماننے والے کسی ایسے شخص کو پیش کر سکیں جس نے اُن کے مذہب پر چل کر خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کیا ہو۔ یا وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے مذہب کی تجدید اور اس کی اشاعت کے لئے مبعوث ہوا ہو۔ یہ عملی نظارہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے باقی تمام مذاہب کو ترک کر دیا ہے اور صرف اسلام سے ہی اپنی محبت اور تعلق کو مخصوص کر لیا ہے۔ اب وہی شخص اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر سکتا ہے جو محمدی باغ کا خوشہ چین بنے اور اُسی شخص کے سپرد اصلاحِ خلق کا کام ہوتا ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ادنیٰ غلام بن کر آپ کے مقدس باغ کی رکھوالی کا کام کرے کیونکہ اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لگائے ہوئے باغ کے سوا باقی تمام باغ خشک ہو چکے ہیں جن کی حفاظت اور نگرانی کے لئے کسی باغبان کی ضرورت نہیں۔ ہرا بھرا باغ اور ہر قسم کے پھولوں اور پھلوں سے لدے ہوئے درخت صرف محمدی باغ میں ہی پائے جاتے ہیں۔ جس کے متعلق یہ الٰہی فیصلہ ہے کہ وہ ہمیشہ سرسبز وشاداب رہے اور قیامت تک اس کی حفاظت کے لئے خدا تعالیٰ کی طرف

سے نگرانوں اور محافظوں کا سلسلہ جاری رہے۔

بَلْ كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ ۚ وَ اَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ

حق یہ ہے کہ یہ لوگ قیامت کا انکار کر رہے ہیں۔ اور ہم نے اُس کے لئے جو قیامت کا منکر ہو بھڑکنے والے

بِالسَّاعَةِ سَعِيْرًا ۚ﴿۱۲﴾ اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ

عذاب کا انتظام کر چھوڑا ہے۔ جب وہ (یعنی جہنم) اُن کو دور سے دیکھے گی تو وہ اُس کے جوش کی اور (آنے والی)

سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّ زَفِيْرًا ﴿۱۳﴾ وَ اِذَاۤ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا

مصیبت کی آواز کو سنیں گے۔ اور جب وہ اُس (یعنی دوزخ) کے ایک تنگ حصہ میں مشکیں باندھے

ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ﴿۱۴﴾ لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ

ہوئے پھینکے جائیں گے اور وہ اُس وقت موت کی آرزو کریں گے۔ (تب خدا کے فرشتے اُن سے کہیں گے)

ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّ ادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا ﴿۱۵﴾

آج ایک موت کی آرزو نہ کرو بلکہ بار بار موت کی خواہش کرو (کیونکہ تم پر بار بار عذاب آنے والے ہیں)۔

حلّ لُغات۔ زَفِيْرٌ۔ اَلزَّفِيْرُ: تَرَدُّدُ النَّفَسِ حَتّٰى تَنْتَفِخَ الضُّلُوْعُ مِنْهُ یعنی سانس کے اندر جانے اور اُس سے پسلیوں کے پھولنے کو زفیر کہتے ہیں۔ (مفردات)

اَلزَّفِيْرُ، الدَّاهِيَةُ۔ مصیبت۔ اَوَّلُ صَوْتِ الْحِمَارِ وَالشَّهِيْقُ اٰخِرُهٗ۔ نیز گدھے کی آواز کے ابتدائی حصہ کو زفیر کہتے ہیں اور آخری آواز کو شہیق کہتے ہیں۔ (اقرب)

مُقَرَّنِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ قَرَّنَ سے اسم مفعول کا جمع کا صیغہ ہے۔ اور جب قُرِّنَتِ الْاُسَارٰى فِى الْحِبَالِ کا فقرہ کہیں تو معنے یہ ہوتے ہیں کہ جُمِّعَتْ رسیوں میں قیدیوں کو باندھا گیا (اقرب) پس مُقَرَّنِيْنَ کے معنے ہوں گے رسیوں میں باندھے ہوئے۔

ثُبُوْرًا ثُبُوْرًا ثَبَرَ کا مصدر ہے اور ثَبَرَ ثُبُوْرًا کے معنے ہیں هَلَكَ۔ وہ ہلاک ہو گیا اور جب ثَبَرَ اللّٰهُ زَيْدًا

کہیں تو اس کے معنے ہوں گے اَهْلَكَهٗ اِهْلَاكًا دَائِمًا لَا يَنْتَعِشُ بَعْدَهٗ کہ اللہ تعالیٰ نے زید کو اس طرح تباہ کیا کہ جس کے بعد اُس کے لئے اُٹھنے کا کوئی امکان نہ رہا۔ وَالنَّصْبُ فِيْ قَوْلِهٖ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا عَلَى الْمَصْدَرِ كَاَنَّهُمْ قَالُوْا ثَبَرْنَا ثُبُوْرًا۔ اور آیت دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا میں ثُبُوْرًا پر نصب آئی ہے گویا اس سے پہلے فعل محذوف ہے اور مراد یہ ہے کہ وہ پکاریں گے کہ ہم پوری طرح ہلاک ہو گئے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر ۔فرماتا ہے۔ ان لوگوں کو تو جزاء وسزا پر ایمان ہی نہیں ورنہ یہ لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات دیکھ کر آپ کی ترقی میں کسی قسم کا شبہ نہ کرتے۔ اب یہ لوگ آپؐ کی ترقی دیکھیں گے تو اُن کے دل جلتے چلے جائیں گے۔ وہ دوزخ جو اللہ تعالیٰ نے اُن کے دلوں میں تیار کی ہے جب وہ ان کو دُور سے دیکھے گی تو ان لوگوں کو نظر آجائے گا کہ اب اس دوزخ سے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں۔ اس جگہ کہا تو یہ گیا ہے کہ جب دوزخ انہیں دُور سے دیکھے گی۔ مگر مراد یہ ہے کہ جب یہ لوگ اسے دُور سے دیکھیں گے۔ اس قسم کی زبان کو عربی میں تقلیبِ نسبت کہتے ہیں۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے ہماری زبان میں کہتے ہیں کہ پرنالہ چلتا ہے حالانکہ پرنالہ نہیں چلتا بلکہ پانی چلتا ہے۔ یا کہتے ہیں کہ سورج زمین کے گرد چکر کھا رہا ہے۔ حالانکہ سورج زمین کے گرد چکر نہیں کھا رہا بلکہ زمین سورج کے گرد چکر کھا رہی ہے۔ اسی طرح یہاں بھی تقلیبِ نسبت سے کام لیتے ہوئے کہا تو یہ گیا ہے کہ جب دوزخ اُن کو دور سے دیکھے گی لیکن مراد یہ ہے کہ جب وہ لوگ دوزخ کو دور سے دیکھیں گے۔ یعنی جونہی اس دوزخ کے سامان پیدا ہوں گے تو اُن کو نظر آجائے گا کہ اب اس دوزخ سے بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں۔ اور جب وہ اس دوزخ میں ڈالے جائیں گے یعنی مسلمانوں کی ترقی کو دیکھ کر رنج وغم اور حسرت وافسوس کے دوزخ میں گریں گے تو اُس وقت اُن کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہوں گے یعنی اُن کی مقابلہ کی طاقت بالکل زائل ہو چکی ہوگی۔ اور وہ ملک کو اپنے لئے تنگ پائیں گے اور کوشش کریں گے کہ کسی دوسرے ملک میں بھاگ جائیں۔ جیسے فتح مکہ کے بعد عکرمہؓ نے چاہا کہ وہ بھاگ کر حبشہ چلا جائے (طبری ذکر الخبر عن فتح مکة) لیکن فرماتا ہے انہیں بھاگنے کی بھی کوئی جگہ نہیں ملے گی۔ کیونکہ وہ جہاں جائیں گے مسلمانوں کو غلبہ میسّر آجائے گا۔ اُس وقت یہ لوگ دعائیں کریں گے کہ یا اللہ ہم کو موت دے دے تاکہ ہم مسلمانوں کی یہ ترقی نہ دیکھیں۔ تب آسمان کے فرشتے کہیں گے کہ ایک موت کا تو سوال ہی نہیں تم پر تو ہلاکت پر ہلاکت آنے والی ہے۔ یعنی ابھی تو تم پر اور بھی عذاب آئیں گے اور تم ان کو دیکھ کر اور بھی گھبراؤ گے کیونکہ اب الٰہی فیصلہ یہی ہے کہ مسلمان بڑھتے چلے جائیں گے اور تم کمزور ہی کمزور ہوتے چلے جاؤ گے۔

ان آیات میں ساعة کا لفظ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلبہ اور آپؐ کی کامیابی کے معنوں میں استعمال کیا

گیا ہے۔ کیونکہ تمام اولوالعزم انبیاء دنیا کے لئے ایک قیامت ہوتے ہیں جو پُرانے نظام کی جگہ ایک نیا نظام قائم کرتے ہیں اور سابق عمارات کو گرا کر ایک نئی روحانی عمارت کھڑی کرتے ہیں۔ اُن کے زمانہ میں یوم القیامۃ کی یہ دونوں خصوصیات یعنی اہل زمانہ کی موت اور پھر ان کا دوبارہ احیاء اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں۔ چنانچہ ایک قیامت تو اُن کے ذریعہ یہ ظاہر ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کی جماعت کو ترقی دیتا اُسے دنیا میں غلبہ عطا کرتا اور اُسے نئے سرے سے زندگی بخشتا ہے۔ اور ایک قیامت اُن کے ذریعہ یہ ظاہر ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کے دشمنوں کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ گویا ایک طرف اگر اُن کے ذریعہ دنیا میں حشر برپا ہو جاتا ہے اور مُردے زندہ ہونے لگتے ہیں تو دوسری طرف ہلاکت کا عذاب دنیا کے ایک حصے پر وارد ہو جاتا ہے۔ اور قیامت بھی دو ہی طرح وارد ہوگی۔ ایک حشر کے ذریعہ اور ایک ہلاکت کے ذریعہ۔ قیامت اسی کا نام ہے کہ ایک زمانہ میں سب لوگ مر جائیں گے اور قیامت اسی کا نام ہے کہ ایک زمانہ میں سب لوگ زندہ ہو جائیں گے۔ پس قیامت کے دو حصے ہیں ایک لوگوں کا مر جانا اور ایک لوگوں کا زندہ ہو جانا۔ جب کبھی دنیا میں اللہ تعالیٰ کا کوئی نبی آیا ہے یہ دونوں باتیں ظاہر ہوئی ہیں۔ اس کے ذریعہ کچھ لوگ مر بھی گئے ہیں اور اس کے ذریعہ کچھ لوگ زندہ بھی ہوئے ہیں۔ جو لوگ اس کے دشمن تھے وہ بحیثیت قوم تباہ کر دیئے گئے اور جو لوگ اس کے ساتھی تھے وہ بحیثیت قوم ترقی پا گئے۔ پس اس آیت میں ساعۃ سے مراد وہ دن ہے جس دن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فتح حاصل ہوئی اور کفار کو شکست۔ جس دن دنیا نے یہ عجیب نظارہ دیکھا کہ وہ جو مکہ کی گلیوں میں بے یار و مددگار اور یکہ و تنہا پھرا کرتا تھا وہ تو بادشاہ ہو گیا اور وہ جو ملک کے بادشاہ تھے اس کے محکوم اور غلام بن گئے۔

پھر فرماتا ہے۔ وَ اَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيْرًا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی کامیابی کا انکار کرنے والوں کے لئے ہم نے ایک آگ تیار کی ہے جس کے شعلے انہیں ہر وقت بھسم کرتے رہیں گے۔ چنانچہ ایک آگ تو خدا تعالیٰ نے ان کے لئے اس طرح تیار کی کہ وہ رات اور دن جس مذہب کو مٹانے کے لئے کمر بستہ رہتے تھے اُس مذہب کو اُن کے بیٹوں اور بیٹیوں اور بھائیوں اور بہنوں نے قبول کرنا شروع کر دیا یہاں تک کہ اسلام مکہ کی چار دیواری سے نکل کر عرب کے اکناف میں پھیل گیا۔ اور پھر عرب سے نکل کر ساری دنیا کو اُس نے اپنے تسلط میں لے لیا۔ جب کفار کے اپنے بیٹے اور پوتے اسلام کی آغوش میں آ کر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ پڑھتے ہوں گے۔ تو اُن کے دل غم و غصہ کے جذبات سے کس طرح جل جل کر خاکستر ہوتے ہوں گے اور وہ کتنا بڑا عذاب محسوس کرتے ہوں گے۔

پھر دوسری آگ خدا تعالیٰ نے اُن کے لئے اس طرح بھڑکائی کہ وہ اُن کے بڑے بڑے لیڈروں کو اپنی قدرت کے زبردست ہاتھ سے اُن کے گھروں سے نکال کر **بدر** کے میدان میں لایا اور انہیں گنتی کے چند ناتجربہ کار اور غیر مسلح مسلمانوں کے ہاتھوں سے اس طرح مروایا کہ مکہ کے گھر گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی اور اُن کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ابوجہل اُن کا بڑا مشہور جرنیل تھا مگر بدر کے میدان میں دو نوعمر انصاری لڑکوں نے اُس پر ایسا تاک کر حملہ کیا کہ وہ زخموں سے نڈھال ہو کر گر گیا اور کفار ایسے سراسیمہ ہوئے کہ وہ اپنے اس مشہور جرنیل کو خاک وخون میں تڑپتا چھوڑ کر مکہ کو بھاگ کھڑے ہوئے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ جنگ کے بعد میں نے دیکھا کہ ابوجہل ایک جگہ زخموں کی شدت کی وجہ سے کراہ رہا ہے۔میں اُس کے پاس گیا اور میں نے کہا سناؤ کیا حال ہے؟ اُس نے کہا مجھے اپنی موت کا کوئی غم نہیں۔سپاہی آخر مرا ہی کرتے ہیں۔مجھے تو یہ غم ہے کہ مدینہ کے دو انصاری لڑکوں کے ہاتھوں سے میں مارا گیا اب تم صرف اتنا احسان کرو کہ تلوار سے میری گردن کاٹ دو تا کہ میری یہ تکلیف ختم ہو جائے۔مگر دیکھنا میری گردن ذرا لمبی کاٹنا کیونکہ جرنیلوں کی گردن ہمیشہ لمبی کاٹی جاتی ہے۔حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے کہا میں تیری اس آخری حسرت کو بھی کبھی پورا نہیں ہونے دوں گا اور ٹھوڑی کے قریب سے تیری گردن کاٹوں گا۔چنانچہ انہوں نے ٹھوڑی کے قریب تلوار رکھ کر اُس کا سر تن سے جُدا کر دیا (السیرۃ الحلبیۃ باب ذکر مغازیہ صلی اللہ علیہ وسلم باب غزوۃ بدر الکبریٰ)۔اب دیکھو یہ کتنی بڑی آگ تھی جو ابوجہل کو جلا کر راکھ کر رہی تھی کہ وہ مدینہ کے دو ناتجربہ کار اور نوعمر لڑکوں کے ہاتھوں مارا گیا۔اور پھر مرتے وقت اُس نے جو آخری خواہش کی تھی وہ بھی پوری نہ ہوئی۔اور ٹھوڑی کے پاس سے اُس کی گردن کاٹی گئی۔

پھر اس آگ نے صرف ابوجہل کو ہی خاکستر نہیں کیا بلکہ اُس کے شعلے مکہ کے گھر گھر پہنچے اور انہوں نے ہر کافر اور بت پرست کو اس آگ کا شکار بنا دیا۔چنانچہ تاریخ میں لکھا ہے کہ شکست کھانے کے بعد مکہ والوں کی ایسی دردناک کیفیت ہوگئی کہ انہوں نے سمجھا کہ اگر آج ماتم کیا گیا تو مکہ کی تمام عزت خاک میں مل جائے گی پس عرب کے اُن لیڈروں نے جو زندہ تھے آپس میں مشورہ کر کے فیصلہ کیا کہ کوئی شخص بدر کے مقتولین کا ماتم نہ کرے اور اگر کوئی شخص ماتم کرے تو اسے قوم میں سے نکال دیا جائے اُس کا بائیکاٹ کیا جائے اور اُس پر جرمانہ کیا جائے۔عرب ایک قبائلی قوم تھی اور جو قبائلی قومیں ہوتی ہیں اُن میں قومی روح انتہا درجہ کی شدید ہوتی ہے۔پس اس حکم کی خلاف ورزی اُن کے لئے ناممکن تھی۔مائیں اپنے کلیجوں پر سل رکھ کر۔باپ اپنے دلوں کو مسوس کر اور بچے اپنی

زبانوں کو دانتوں تلے دبا کر بیٹھ گئے۔اور اُن کے لبوں سے آہ بھی نہیں نکلتی تھی۔ کیونکہ اُن کی قوم کا یہ فیصلہ تھا کہ آج رونا نہیں تا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی خوش نہ ہوں۔اور وہ یہ نہ کہیں کہ دیکھا ہم نے مکہ والوں کو کیسی شکست دی۔مگر دل تو جل رہے تھے سینوں میں سے شعلے تو نکل رہے تھے۔جگر تو ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے تھے۔ وہ دروازے بند کر کے تاریک گوشوں میں بیٹھتے اور دبی ہوئی آوازوں کے ساتھ روتے تا کسی کو یہ پتہ نہ لگے کہ وہ رو رہا ہے۔مگر یہ رونا اُن کی تسلی کا موجب نہیں تھا۔ کیونکہ انسان غم کے وقت دوسرے سے تسلی چاہتا ہے۔ بیوی چاہتی ہے کہ خاوند میرے دکھ پر افسوس کرے۔ باپ چاہتا ہے کہ بیٹا میرے غم میں حصہ لے اور بیٹا چاہتا ہے کہ باپ میرے غم میں حصہ لے۔اسی طرح ہمسایہ چاہتا ہے کہ ہمسایہ والے میرا غم بٹائیں اور اگر کوئی ایسا ماتم ہو جائے جس کا اثر سینکڑوں اور ہزاروں لوگوں پر ہو تو اُس وقت سب لوگ چاہتے ہیں کہ ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کریں اور اس طرح اپنے دکھ درد کو کم کریں۔پس تنہائی کے گوشوں میں ان کا بیٹھ کر رونا اُن کی تسلی کا موجب نہیں تھا۔مہینہ گذر گیا اور برابر یہ حکم نافذ رہا۔اس عرصہ میں وہ آگ جو انہوں نے اپنے سینوں میں دبا رکھی تھی سلگتی رہی۔آخر مہینہ کے بعد ایک دن ایک مسافر وہاں سے گذرا۔اُس کی ایک اونٹنی تھی جو راہ میں ہی مر گئی وہ اُس اونٹنی کے غم میں چیخیں مار مار کر روتا جا رہا تھا۔اور کہتا جا رہا تھا کہ ہائے میری اونٹنی مر گئی۔ہائے میری اونٹنی مر گئی۔تب مکہ کا ایک بوڑھا شخص جو اپنے مکان کے دروازے بند کر کے اندر بیٹھا ہوا تھا۔اُس نے اپنے مکان کے دروازے کھول دئے اور بازار میں آ کر اُس نے زور زور سے پیٹنا اور چلا چلا کر یہ کہنا شروع کر دیا کہ اس شخص کو اپنی اونٹنی پر رونے کی تو اجازت ہے مگر میرے دونو جوان بیٹے مارے گئے اور مجھے اُن پر رونے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ یہ ایک نعرہ تھا جو اُس نے لگایا اور جس نے مکہ میں ایک شعلہ کا کام دیا۔اس کے بعد نہ کسی کو قانون کا خیال رہا۔نہ قوم اور برادری سے اخراج کی دھمکی کا خیال رہا۔معاً مکہ کے گھروں کے تمام دروازے کھل گئے۔اور چوکوں اور بازاروں میں عورتیں اور بچے پیٹنے لگ گئے (السیرة النبویة لابن ھشام ذکر رویا عاتکة بنت عبد المطلب زیر عنوان نواح قریش علٰی قتلاھم)۔ یہ کتنی بڑی آگ تھی جس نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منکرین کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور اُس نے اُن کی تمام شوکت اور رعب اور دبدبہ کو خاک میں ملا دیا۔

پھر یہ آگ خدا تعالیٰ نے کفار کے لئے اس طرح بھی تیار کی کہ اُس نے اسلام کو ایک کامل اور جامع تعلیم دے کر بھیجا جس سے کفار بالکل محروم تھے۔وہ جب اسلام کا اپنے مذاہب سے مقابلہ کرتے تو اُن کے دل جلتے۔اور وہ کہتے کہ ہمارے مذہب میں کیا رکھا ہے۔کاش یہی باتیں ہمارے مذہب میں بھی ہوتیں اور ہم بھی فخر سے اپنی گردن

اونچی کر سکتے ۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک یہودی حضرت عمرؓ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اگر اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ والی آیت ہماری کتاب میں موجود ہوتی تو ہم اس آیت کے نزول کے دن کو اپنے لئے عید کا دن مقرر کرتے ۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا تم تو ایک دن عید مناتے لیکن ہمارے لئے تو جس دن یہ آیت نازل ہوئی تھی دو عیدیں جمع تھیں ۔ ایک جمعہ کا دن تھا اور دوسرے حج کا دن تھا (ترمذی کتاب التفسیر القرآن سورۃ المائدۃ زیر آیت الیوم اکملت لکم ...) اسی طرح حضرت عباسؓ کے متعلق روایت آتی ہے کہ اُن سے بھی کسی یہودی نے کہا کہ اگر یہ آیت ہم پر اُترتی تو ہم اُس روز عید مناتے ۔ حضرت ابن عباسؓ نے بھی اُس کو یہی جواب دیا کہ ہمارے لئے تو اس دن دو عیدیں جمع تھیں ۔ (ترمذی کتاب التفسیر زیر آیت الیوم اکملت لکم دینکم ....)

غرض اسلامی تعلیم کی جامعیت کو دیکھ کر بھی اُن کے دل بغض و حسد کی آگ سے جل جاتے اور وہ سوائے آہیں بھرنے اور حسرت و اندوہ کا شکار ہونے کے اور کوئی راہ نہ پاتے ۔ یہی آگ اس زمانہ کے مخالفیں اسلام کو بھی جلاتی رہتی ہے ۔ آج بھی ایک عیسائی کو اگر کوئی یہودی کہہ دے کہ کیا تیرا خدا وہی ہے جس کو ہم نے کانٹوں کا تاج پہنایا اور اُسے ذلت کے ساتھ صلیب پر لٹکایا تو تم خود ہی اندازہ لگاؤ کہ اس کے دل میں کس قدر جلن پیدا ہوگی اور وہ کیسے دکھ اور عذاب میں گرفتار ہو جائے گا ۔ اسی طرح جب بُت پرستوں پر اُن کے بتوں کی بے چارگی ظاہر ہوتی ہے تو وہ اپنے آپ پر لعنتیں ڈالتے ہیں کہ ہم اشرف المخلوق ہو کر بے جان بتوں کے آگے سر جھکا رہے ہیں ۔ اسی طرح ایک مسلمان جب قرآن کریم پڑھتا ہے کہ وہ لوگ جو خدا تعالیٰ پر ایمان لاتے ہیں اُن پر فرشتوں کا نزول ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ان کو اپنے کلام سے فیضیاب فرماتا ہے تو اس کا دل اس خوشی سے اچھلنے لگتا ہے کہ اسلام پر چلنے سے میرا خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا ہو جائے گا ۔ مگر ویدوں کا ماننے والا جب وید پڑھتا ہے اور اُسے معلوم ہوتا ہے کہ میرا خدا اب مجھ سے ہم کلام نہیں ہو سکتا تو اس کا دل اس صدمہ سے کڑھنے لگتا ہے اور وہ حیران ہوتا ہے کہ وہ خدا جو وید کے رشیوں سے کلام کیا کرتا تھا اب مجھ سے کیوں کلام نہیں کرتا ۔ کیا میں اس کا سوتیلا بیٹا ہوں کہ وہ رشیوں کے ساتھ تو بولا مگر میرے ساتھ نہیں بولتا ۔ اسی طرح عیسائیوں میں کفارہ اور آریوں میں نیوگ کا مسئلہ بھی ایسے ہی مسائل میں سے ہیں جن پر بحث کے دوران میں وہ خود اپنے دلوں میں ایک ندامت اور شرمندگی محسوس کرتے ہیں اور خواہ وہ زبان سے اقرار کریں یا نہ کریں اُن کے دل اسلامی تعلیم کی برتری کو تسلیم کرتے ہیں ۔ قرآن کریم نے ان کی انہی دلی کیفیات کا ان الفاظ میں ذکر فرمایا ہے کہ رُبَمَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوْ کَانُوْا مُسْلِمِیْنَ (الحجر: ۳) یعنی بہت دفعہ کفار بھی بڑی حسرت کے ساتھ کہا کرتے ہیں کہ کاش وہ بھی ان مسائل کو ماننے والے ہوتے اور انہیں اس شرمندگی سے

نجات ملتی جواب اُن کے گلے کا ہار بنی رہتی ہے۔طلاق،خلع ،نکاح بیوگان اور ورثہ وغیرہ مسائل میں جب مشکلات اُن کا احاطہ کرتی ہیں اور تمدنی خرابیاں اُن کو الجھنوں میں ڈالتی ہیں تو وہ اسلامی تعلیم کی فوقیت کا اقرار کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

میور اسلام کا شدید ترین دشمن ہے مگر وہ بھی قرآن کریم اور بائیبل کا مقابلہ کرتے ہوئے ’’لائف آف محمدؐ ‘‘ میں ایک جگہ بڑی حسرت کے ساتھ لکھتا ہے کہ

’’مسلمانوں کی بالکل پاک اور غیر تبدیل شدہ کتاب اور ہماری کتب کے مختلف نسخوں کے باہمی اختلاف کا آپس میں مقابلہ کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ دو ایسی چیزوں کا مقابلہ کیا جائے جن میں باہم کوئی بھی مشابہت نہ ہو۔‘‘ (لائف آف محمدؐ مصنفہ سر ولیم میور)

غرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا انکار کرنے والوں کے لئے خدا تعالیٰ نے آگ کا عذاب تیار کیا ہوا ہے جس کے شعلے اُن کو ہر وقت جلاتے رہتے ہیں اور جب اسلام کو کوئی ترقی نصیب ہوتی ہے اُن کے دلوں کی یہ آگ اور بھی تیز ہو جاتی ہے۔

قُلْ اَذٰلِكَ خَيْرٌ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ

تو اُن سے کہہ دے کہ یہ (انجام) بہتر ہے یا دائمی جنت جس کا متقیوں سے وعدہ کیا گیا ہے۔وہ اُن کا (صحیح صحیح) بدلہ اور

كَانَتْ لَهُمْ جَزَآءً وَّ مَصِيْرًا ﴿۱۶﴾ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ

آخری ٹھکانہ ہوگی۔انہیں اس میں جو کچھ چاہیں گے ملے گا۔وہ اُس میں ہمیشہ کے لئے بستے چلے جائیں گے۔

خٰلِدِيْنَ ؕ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْـُٔوْلًا ﴿۱۷﴾

یہ ایک وعدہ ہے جس کا پورا کرنا تیرے رب پر واجب ہے۔

تفسیر ۔فرماتا ہے تو ان کفار سے کہہ دے کہ کیا تمہارا یہ انجام بہتر ہے یا وہ جنت بہتر ہے جس کا ان متقیوں سے وعدہ کیا گیا ہے۔یہ جنت اُن کی پوری جزاء اور ٹھکانہ ہوگی اور اس جنت میں وہ جو کچھ چاہیں گے اُن کو ملے گا اور وہ اُس میں رہتے چلے جائیں گے۔یہ اللہ تعالیٰ کا ایک ایسا وعدہ ہے جو کبھی ٹل نہیں سکتا۔ہر شخص جو تاریخ اسلام سے معمولی واقفیت بھی رکھتا ہے جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ کس شان سے پورا ہوا اور کس طرح چند سالوں

میں ہی عرب اور ایران اور روم اور مصر اور شام وغیرہ اسلامی ضرب کی تاب نہ لاکر سرنگوں ہو گئے اور فاقہ کش مزدور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کی برکت سے دنیا کے بادشاہ بن گئے اور پھر انہوں نے وہ نظام قائم کر کے دکھلا دیا جو اسلام دنیا میں قائم کرنا چاہتا ہے۔ ابتدائی ایّام میں تو مکہ کے بُت پرست مسلمانوں کو کھلے بندوں اللہ تعالیٰ کی عبادت بھی نہیں کرنے دیتے تھے۔ انہیں چھپ چھپ کر نمازیں پڑھنی پڑتی تھیں اور مخفی طور پر ایک دوسرے سے تعلقات رکھنے پڑتے تھے۔ اسی طرح تعلیم اور تبلیغ کی انہیں کوئی آزادی میسر نہیں تھی۔ بلکہ اگر کوئی ہدایت کا طالب کبھی مکہ میں آجاتا تو اُسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکان تلاش کرنے میں بھی بڑی دقّت پیش آتی اور لوگ اُسے آپ کے گھر کا پتہ بھی نہ بتاتے۔ مگر پھر وہ وقت آیا کہ مسلمان دنیا کا حاکم اور بادشاہ بن گیا اور اُس کی طاقت سے بڑی بڑی حکومتیں لرزنے لگیں۔ اُس وقت جو کچھ وہ کرنا چاہتا تھا کسی کی مجال نہیں تھی کہ اُس میں رخنہ اندازی کر سکتا کیونکہ اُس زمانہ میں مسلمان ہی قوتِ فعال تھا اور مسلمان کی مٹی میں ہی دنیا کی طنابیں تھیں۔ مگر افسوس کہ بعد میں مسلمانوں نے اپنی بداعمالی سے اس جنت کو کھو دیا اور وہ ذلیل اور رسوا ہو گئے۔ انہوں نے سمجھا کہ محض مسلمان کہلانے کی وجہ سے یہ جنت انہیں دائمی طور پر دے دی گئی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے جہاں بھی جنت کا وعدہ کیا تھا وہاں ایمان اور عمل صالح کے ساتھ اُسے مشروط کیا تھا۔ بلکہ یہاں بھی اُس نے كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْـُٔوْلًا فرما کر اس کے وعدہ ہونے پر پھر زور دیا ہے اور بتایا ہے کہ ہمارا یہ وعدہ تمہارے ایمان اور عمل کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگر تمہارے اندر ایمان نہ رہا اور عمل صالح پر تم قائم نہ رہے تو یہ وعدہ بھی قائم نہیں رہے گا۔ اسی کی طرف تَبٰرَكَ الَّذِيْۤ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ میں اِنْ شَآءَ کے الفاظ رکھ کر اشارہ کیا گیا تھا اور مسلمانوں کو توجہ دلائی گئی تھی کہ بے شک یہ جنت تمہیں ملے گی۔ مگر اس میں تمہارے کسی استحقاق یا زورِ بازو کا دخل نہیں ہوگا بلکہ اللہ تعالیٰ کی مشیئت کا دخل ہوگا۔ یعنی اگر اس نے تمہارے اعمال کو اس انعام کے قابل سمجھا تو وہ تمہیں اس انعام سے سرفراز فرما دے گا اور اگر اُس نے تمہارے اعمال کو اس انعام کے قابل نہ سمجھا تو وہ یہ نعمت تم سے واپس لے لے گا۔ چنانچہ جب تک مسلمان ایمان اور عمل صالح پر قائم رہے اللہ تعالیٰ نے انہیں بڑی بڑی نعمتوں سے نوازا۔ اور وہ صدیوں دنیا پر حکمرانی کرتے رہے۔ لیکن جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کی محبت کو بھُلا دیا اور عیش وعشرت میں مشغول ہو گئے اللہ تعالیٰ نے بھی اُن سے اپنا تعلق منقطع کر لیا اور انہیں ان جنات سے محروم کر دیا۔

پس اصل چیز جس کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے وہ ایمان اور عمل صالح ہے۔ آج بھی اگر مسلمان اپنے اندر تغیر پیدا کریں اور خدا اور اس کے رسول کی سچے دل سے پیروی کریں تو اللہ تعالیٰ انہیں ان نعمتوں کا وارث کر

دے گا جن کے پہلے مسلمان وارث ہوئے۔ اور انہیں اس جنت میں داخل کر دے گا جس سے وہ اپنی نافرمانیوں کی وجہ سے نکالے گئے تھے۔

وَ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَ مَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ

اور جب وہ ان کو اور اُن کے جھوٹے معبودوں کو اپنے حضور میں کھڑا کرے گا اور پھر اُن سے کہے گا کیا تم نے

ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰٓؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا

میرے ان بندوں کو گمراہ کیا تھا؟ یا وہ آپ ہی سیدھے راستہ سے بھٹک گئے تھے۔ (تب) وہ جواب دیں گے تو

السَّبِيْلَ ؕ﴿۱۸﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ لَنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ

پاک ہے ہمیں کوئی حق نہ تھا کہ ہم تیرے سوا اور ہستیوں کو اپنا کارساز بناتے لیکن تُو نے اُن لوگوں کو اور

مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِيَآءَ وَ لٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ وَ اٰبَآءَهُمْ حَتّٰى

ان کے باپ دادوں کو دنیوی متاع بخشے یہاں تک کہ انہوں نے تیری یاد کو ترک کر دیا۔ اور ہلاک ہونے والی

نَسُوا الذِّكْرَ ۚ وَ كَانُوْا قَوْمًۢا بُوْرًا ﴿۱۹﴾ فَقَدْ كَذَّبُوْكُمْ

قوم بن گئے پس (کفار سے کہا جائے گا کہ دیکھ لو) ان جھوٹے معبودوں نے تمہاری باتوں کو جھٹلا دیا ہے

بِمَا تَقُوْلُوْنَ ۙ فَمَا تَسْتَطِيْعُوْنَ صَرْفًا وَّ لَا نَصْرًا ۚ وَ

پس آج تم نہ تو عذاب کو ہٹا سکتے ہو اور نہ کوئی مدد حاصل کر سکتے ہو اور جو کوئی تم میں سے ظالم ہے

مَنْ يَّظْلِمْ مِّنْكُمْ نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيْرًا ﴿۲۰﴾

ہم اُسے بڑا عذاب پہنچائیں گے۔

حلّ لُغات۔ بُوْرًا۔ اَلْبُوْرُ: اَلرَّجُلُ الْفَاسِدُ وَالْهَالِكُ لَا خَيْرَ فِيْهِ۔ ایسا آدمی جو خراب وخستہ ہو اور ہلاک ہونے والا ہو۔ یہ لفظ جمع اور مفرد دونوں کے ساتھ استعمال ہو سکتا ہے۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اِمْرَأَةٌ بُوْرٌ

وَقَوْمٌ بُوْرٌ۔ یعنی ہلاک ہونے والی عورت اور ہلاک ہونے والی قوم (اقرب)

تفسیر۔ فرماتا ہے۔ کفار کو جب اُن کے معبودوں سمیت اٹھایا جائے گا تو ان معبودوں سے پوچھا جائے گا کہ کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا تھا یا وہ خود ہی گمراہ ہو گئے تھے؟ وہ جواب میں کہیں گے کہ اے خدا تُو پاک ہے۔ ہماری کیا مجال تھی کہ ہم تیرے سوا اور معبود بنا لیتے۔ بات یہ ہے کہ تُو نے ان لوگوں کو اور ان کے باپ دادوں کو دنیا کی نعماء سے متمتع کیا اور انہیں مال و دولت کی اس قدر فراوانی بخشی کہ انہوں نے تیری ہدایت بھلا دی اور برباد ہونے والی قوم بن گئے۔ پھر کہا جائے گا کہ اے مشرکو! جو کچھ تم کہتے تھے اُس کو خود تمہارے معبودوں نے جھٹلا دیا ہے۔ پس آج نہ تو تم اس عذاب سے بچ سکتے ہو اور نہ کسی قسم کی مدد حاصل کر سکتے ہو۔ اور ہمارے اس قاعدہ کو یاد رکھو کہ جو ظلم کرتا ہے اُسے سخت عذاب پہنچتا ہے۔

ان آیات میں جن معبودانِ باطلہ کا ذکر کیا گیا ہے اُن سے مراد خدا تعالیٰ کے وہ فرستادے ہیں جن کو اُن کی اُمتوں نے بعد میں اپنی نادانی سے خدا تعالیٰ کا شریک قرار دے دیا اور وہ اُن کی پرستش کرنے لگ گئے۔ جیسے حضرت مسیح ناصری ہیں کہ وہ ساری عمر اپنے آپ کو ابن آدم کہتے رہے مگر عیسائیوں نے اُن کو خدا کا بیٹا بنا لیا اور اُن کی الوہیت کا عقیدہ دنیا کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیا۔ اسی طرح ہندو حضرت رام اور کرشن کی پرستش کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ دونوں بزرگ اللہ تعالیٰ کے مقدس فرستادے تھے جو ہندو قوم کی ہدایت کے لئے بھارت میں مبعوث ہوئے تھے۔ اسی گروہ میں حضرت سیّد عبد القادر صاحب جیلانی رحمۃ اللہ علیہ بھی شامل ہیں جن سے قادری طریق کے پیرو دعائیں مانگتے اور اُن کو مردوں کو زندہ کرنے والا قرار دیتے ہیں۔ اور اُن کے متعلق عجیب و غریب قصے اور حکایات جُہلا میں مشہور کرتے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان کے کسی مرید نے ایک دفعہ اُن کی دعوت کی اور مرغ پکا کر سامنے رکھا۔ جب وہ کھا چکے تو ایک ہمسائی آئی اور کہنے لگی حضور یہ تو میرا مرغ تھا جو اس طرف کو آ گیا تھا اور اس شخص نے ذبح کر کے آپ کو کھلا دیا۔ اب میں کیا کروں۔ انہوں نے کہا گھبرانے کی کیا بات ہے۔ مرغ کی تمام ہڈیاں جمع کرو چنانچہ اُس کی ہڈیاں جمع کی گئیں اور انہوں نے ہاتھ میں پکڑ کر اُن کو دبایا تو وہ کُڑ کُڑ کرتا ہوا مرغ بن گیا اور وہ عورت اُسے اٹھا کر اپنے گھر لے گئی۔ اسی طرح کہتے ہیں کہ ایک دفعہ سید عبد القادر صاحب جیلانیؒ کے پاس اُن کا ایک مرید آیا اور کہنے لگا۔ حضور میرا بیٹا بیمار ہے۔ دُعا کریں کہ وہ اچھا ہو جائے۔ انہوں نے کہا بہت اچھا! ہم دعا کریں گے وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر وہ مر گیا اس پر وہ پھر آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ حضور میرا بیٹا تو مر گیا۔ کہنے لگے ہیں مر گیا! اب عزرائیل میں بھی اتنی جرأت ہو گئی ہے کہ وہ میرے حکم کی خلاف ورزی کرے۔ انہوں نے اُس

وقت ڈنڈا اٹھایا اور آسمان کی طرف چڑھنا شروع کر دیا۔ عزرائیل آگے آگے بھاگا جا رہا تھا اور وہ ڈنڈا اٹھائے اُس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ وہ آسمان میں داخل ہی ہونے لگا تھا کہ یہ اس کے پاس پہنچ گئے اور زور سے اُسے ڈنڈا مارا۔ جس سے وہ لنگڑا ہو گیا۔ اور رُوحوں کی تھیلی اس کے ہاتھ سے چھین کر اُس کا منہ کھول دیا۔ جس کے نتیجہ میں وہ تمام لوگ زندہ ہو گئے جن کی روحیں اس روز عزرائیل قبض کر کے لے آیا تھا۔ وہ روتا روتا خدا تعالیٰ کے پاس گیا اور کہنے لگا خدایا! میں تو تیرے کام کے لئے گیا تھا مگر عبدالقادر جیلانی نے مجھے ڈنڈا مارا اور میرے ہاتھ سے روحوں کی تھیلی چھین کر اُس نے ساری روحوں کو آزاد کر دیا۔ اب میرا کام کیا رہ گیا ہے۔ میری جگہ کسی اور کو مقرر کر دیجئے۔ پھر انہوں نے صرف وہی رُوح نہیں نکالی جو اُن کے مرید کے لڑکے کی تھی بلکہ جتنی روحیں میں نے آج نکالی تھیں وہ سب کی سب انہوں نے آزاد کر دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب یہ بات سُنی تو فرشتہ سے کہنے لگا چُپ چُپ اگر عبدالقادر جیلانی نے یہ بات سُن لی اور اُس نے اگلی پچھلی ساری رُوحیں آزاد کر دیں تب بھی میں نے کیا کر لینا ہے۔

اس قسم کے تمام شرکاء اور ان کی عبادت کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ اپنے سامنے حاضر کرے گا۔ اور مجرموں پر حجت تمام کرنے کے لئے اُن سے سوال کرے گا کہ کیا تم نے لوگوں کو اس شرک کی تعلیم دی تھی۔ وہ کہیں گے خدایا! ایسا کس طرح ہو سکتا ہے کہ ہم اُن سے وہ بات کہتے جس کے کہنے کا ہمیں کوئی حق نہیں تھا۔ ہم تو ان لوگوں کو صرف تیری پرستش کی تعلیم ہی دیتے رہے مگر جب ایک لمبا زمانہ گذر گیا۔ تو یہ اس تعلیم کو بھول گئے اور انہوں نے ہمیں تیرا شریک قرار دے دیا۔ پس ہم ان کے عقائد سے بیزار ہیں۔ یہی بات انجیل میں حضرت مسیح ناصریؑ نے بھی ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے کہ

> ''اُس دن بہتیرے مجھ سے کہیں گے کہ اے خداوند! اے خداوند! کیا ہم نے تیرے نام سے نبوت نہیں کی اور تیرے نام سے بدرُوحوں کو نہیں نکالا۔ اور تیرے نام سے بہت سے معجزے نہیں دکھائے؟ اُس وقت میں اُن سے صاف کہہ دوں گا کہ میری کبھی تم سے واقفیت نہ تھی۔ اے بدکارو! میرے پاس سے چلے جاؤ۔'' (متی باب ۷ آیت ۲۲، ۲۳)

اسی طرح لکھا ہے۔

> ''وہ شہر شہر اور گاؤں گاؤں تعلیم دیتا ہوا یروشلم کا سفر کر رہا تھا اور کسی شخص نے اُس سے پوچھا کہ اے خداوند! کیا نجات پانے والے تھوڑے ہیں؟ اُس نے اُن سے کہا۔ جانفشانی کرو کہ تنگ دروازہ سے داخل ہو کیونکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ بہتیرے داخل ہونے کی کوشش کریں گے اور نہ ہو سکیں گے۔

جب گھر کا مالک اُٹھ کر دروازہ بند کر چکا ہو اور تم باہر کھڑے دروازہ کھٹکھٹا کر یہ کہنا شروع کرو کہ اے خداوند! ہمارے لئے کھول دے اور وہ جواب دے کہ میں تم کو نہیں جانتا کہ کہاں کے ہو۔ اُس وقت تم کہنا شروع کرو گے کہ ہم نے تو تیرے رُوبرو کھایا پیا اور تُو نے ہمارے بازاروں میں تعلیم دی۔ مگر وہ کہے گا میں تم سے کہتا ہوں کہ میں نہیں جانتا تم کہاں کے ہو۔ اے بدکارو! تم سب مجھ سے دور ہو۔ وہاں رونا اور دانت پیسنا ہوگا۔'' (لوقا باب ۱۳ آیت ۲۲ تا ۲۸)

ان حوالہ جات میں حضرت مسیحؑ نے اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ میرے نام کے پیچھے چلنے والے تو بہت لوگ ہیں مگر نجات حاصل کرنے والے تھوڑے ہیں۔ جب قیامت کا دن آئے گا اُس دن میں اُن سے صاف کہہ دوں گا کہ اے بدکارو! تم سب مجھ سے دور ہو جاؤ، میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو۔ غرض جب مشرکین کے سامنے اُن کے معبود حقیقت حال کو ظاہر کر دیں گے تو اُن پر اُن کے عقائد کا بطلان واضح ہو جائے گا اور وہ سمجھ لیں گے کہ انہوں نے ان ہستیوں کو خدا تعالیٰ کا شریک قرار دے کر بڑے بھاری گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔

ان آیات سے یہ بھی ظاہر ہے کہ قوموں پر جب ایک لمبا زمانہ گذر جاتا ہے اور زمانۂ نبوت سے اُن کا بُعد ہو جاتا ہے اور دنیوی نعماء اور مادی لذات میں اُن کا انہماک ہو جاتا ہے تو رفتہ رفتہ اُن میں کئی قسم کی خرابیاں پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ جن میں سے سب سے بڑی خرابی اعتقادی رنگ میں یہ پیدا ہوتی ہے کہ وہ غلّو سے کام لے کر اللہ تعالیٰ کے اُن فرستادوں کو جو دنیا کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوتے ہیں اس کا شریک قرار دینے لگ جاتے ہیں یہ شریک قرار دینا بعض دفعہ تو علانیہ طور پر ہوتا ہے۔ جیسے عیسائیوں نے حضرت مسیحؑ کو خدا قرار دے کر یہ کہنا شروع کر دیا کہ باپ بھی ازلی ہے اور بیٹا بھی ازلی ہے۔ اور رُوح القدس بھی ازلی ہے اور بعض دفعہ وہ اپنے بزرگوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیتے اور اُن سے دعائیں کرنا اپنا معمول بنا لیتے ہیں۔ اور اس طرح اُن بزرگوں کو شریکِ باری قرار دے دیتے ہیں۔ جیسے آج کل مسلمانوں میں بڑے بڑے بزرگوں کے مقابر پر ہر سال میلے لگتے اور ہزاروں مسلمان وہاں قبروں پر سجدے کرتے اور مُرادیں مانگتے ہیں۔ یہ تمام امور شرک میں داخل ہیں جو خدا تعالیٰ کے غضب کو بھڑکانے والے ہیں۔ مومن کامل وہی ہوتا ہے جو خدا تعالیٰ کی سچی توحید پر ایمان رکھے اور ہر قسم کے مشرکانہ خیالات اور اعمال سے بچتا رہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ

اور تجھ سے پہلے ہم نے جتنے بھی رسول بھیجے تھے وہ سب کے سب کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے تھے۔

الطَّعَامَ وَ يَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ

اور ہم نے تم میں سے بعض کو بعض کے لئے آزمائش کا ذریعہ بنایا ہے (یہ دیکھنے کے لئے) کہ کیا تم (مسلمان) صبر

لِبَعْضٍ فِتْنَةً ؕ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا ﴿۲۱﴾

کرتے ہو (یا نہیں) اور (اے مسلمان) تیرا رب (حالات کو) بہت دیکھنے والا ہے۔

تفسیر ۔فرماتا ہے۔ہم نے تجھ سے پہلے جتنے بھی رسول بھیجے تھے وہ سب کے سب کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں بھی چلتے پھرتے تھے۔اور ہم نے تم میں سے بعض کو بعض کے لئے آزمائش کا موجب بنایا ہے۔تاکہ اللہ تعالیٰ دیکھے کہ کیا تم صبر سے کام لیتے ہو یا نہیں۔اور اے رسول! تیرا رب اپنے بندوں کے حالات کو خوب جانچ رہا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ خدا تعالیٰ کے وہ انبیاء جن کو یہ لوگ اپنی نادانی سے اس کا شریک قرار دے رہے ہیں اُن کی اپنی حالت تو یہ تھی کہ وہ حوائج بشریّہ سے مستغنی نہیں تھے۔وہ اسی طرح کھانے پینے کے محتاج تھے جس طرح یہ لوگ محتاج ہیں اور وہ اسی طرح بازاروں میں چلتے پھرتے اور اپنی ضروریات کی چیزیں وہاں سے خریدتے تھے جس طرح یہ لوگ خریدتے ہیں۔پھر انہیں کیا ہو گیا ہے کہ انہوں نے اپنے جیسے انسانوں کو خدا بنا لیا اور ان سے دعائیں کرنا اپنا معمول بنا لیا۔گویا بتایا کہ اللہ تعالیٰ کے اندر صمدیت کا پایا جانا ضروری ہے اور صمد اُس ہستی کو کہتے ہیں جو خود تو کسی کی محتاج نہ ہو مگر باقی سب اس کی محتاج ہوں۔لیکن ان معبودانِ باطلہ کو دیکھ لو کہ یہ سب کے سب کھانے پینے کے محتاج تھے اور سب کے سب اپنے سامانِ معیشت کی فراہمی کے لئے دوسروں کے تعاون کے حاجت مند تھے۔پھر ایسے لوگ جو خود ایک فانی جسم لے کر آئے اور موت کا شکار ہو گئے اور جن کی زندگیاں بتا رہی ہیں کہ وہ ایسے ہی ایک انسان تھے جیسے تم انسان ہو۔ان کو خدا تعالیٰ کا شریک قرار دے دینا کہاں کی دانائی ہے۔یہ لوگ بے شک خدا تعالیٰ کے فرستادہ تھے مگر ان کو شریکِ باری قرار دینا بڑا بھاری گناہ ہے۔اس زمانہ میں سب سے بڑا فتنہ عیسائیت کا فتنہ ہے جس نے حضرت مسیحؑ کو خدا قرار دے کر دنیا کے ایک بڑے حصہ کو شرک میں مبتلا کر رکھا

ہے لیکن اگر اناجیل کو دیکھا جائے تو اُن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیحؑ بھی اُسی طرح کھانے پینے کے محتاج تھے جس طرح دوسرے لوگ محتاج تھے چنانچہ انجیل میں لکھا ہے کہ

’’یسوع رُوح القدس سے بھرا ہوا یردن سے لوٹا اور چالیس دن تک روح کی ہدایت سے بیابان میں پھرتا رہا اور ابلیس اُسے آزماتا رہا۔ان دنوں میں اُس نے کچھ نہ کھایا اور جب وہ دن پورے ہو گئے تو اُسے بھوک لگی۔‘‘ (لوقا باب ۴ آیت ۱،۲)

اس جگہ عیسائیوں نے گو مبالغہ سے کام لیتے ہوئے یہ لکھ دیا ہے کہ یسوع مسیح نے چالیس دن تک کچھ نہ کھایا مگر بہر حال اتنی بات انہیں بھی تسلیم کرنی پڑی کہ چالیس دن کے بعد مسیح کو بھوک لگی اور اُس نے چاہا کہ اُسے کچھ کھانے کو ملے جس سے اس کی احتیاج ظاہر ہے۔ پھر لکھا ہے۔

’’دوسرے دن جب وہ بیت عنیاہ سے نکلے تو اُسے بھوک لگی اور وہ دُور سے انجیر کا درخت جس میں پتے تھے دیکھ کر گیا کہ شاید اُس میں کچھ پائے مگر جب اُس کے پاس پہنچا تو پتوں کے سوا کچھ نہ پایا کیونکہ انجیر کا موسم نہ تھا۔اُس نے اُس سے کہا آئندہ کوئی تجھ سے کبھی پھل نہ کھائے اور اُس کے شاگردوں نے سُنا۔‘‘ (مرقس باب ۱۱ آیت ۱۲ تا ۱۴)

اس حوالہ سے بھی ثابت ہے کہ حضرت مسیح کو اسی طرح بھوک محسوس ہوتی تھی جس طرح دوسرے لوگوں کو محسوس ہوا کرتی ہے۔ بلکہ ایک دفعہ جب انہیں کھانے کے لئے کوئی چیز نہ ملی تو وہ انجیر کے ایک درخت کی طرف گئے کہ شاید مجھے انجیریں ہی کھانے کے لئے مل جائیں۔مگر بد قسمتی سے وہ یہ بات بھول گئے کہ آج کل انجیر کا موسم ہی نہیں اور وہاں سے وہ ناکام واپس گئے۔مگر چونکہ بھوک کی وجہ سے انہیں تکلیف ہو رہی تھی۔انہیں اس ناکامی پر غصہ آ گیا اور انہوں نے اس درخت کو یہ بددعا دے دی کہ آئندہ کوئی شخص تجھ سے کبھی پھل نہ کھائے۔ یہ واقعہ بھی حضرت مسیح کی الوہیّت کو باطل ثابت کرتا ہے کیونکہ اس سے نہ صرف اُن کا عام انسانوں کی طرح بھوک محسوس کرنا ثابت ہوتا ہے بلکہ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ علمِ غیب تو الگ رہا اتنی بات بھی نہیں جانتے تھے کہ کون سے موسم میں انجیر کا درخت پھل دیا کرتا ہے۔اگر جانتے تو وہ ایسے موسم میں جب کہ انجیر کا درخت پھل ہی نہیں دیا کرتا ایک درخت کی طرف کیوں دوڑے جاتے؟ پھر جب انہوں نے خود ایک غلطی کی تو اُس کے نتیجہ میں اُن کا درخت کو بددعا دینا بھی اپنے اندر کوئی معقولیت نہیں رکھتا۔عیسائی تو خدا تعالیٰ کے عادل ہونے پر بڑا زور دیا کرتے ہیں مگر یہ عجیب انصاف ہے کہ غلطی تو انہوں نے خود کی اور بددعا ایک درخت کو دے دی۔ پھر لکھا ہے

’’جب وہ گھر میں کھانا کھانے بیٹھا تھا تو ایسا ہوا کہ بہت سے محصول لینے والے اور گنہگار آ کر یسوع اور اُس کے شاگردوں کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھے۔ فریسیوں نے یہ دیکھ کر اس کے شاگردوں سے کہا۔ تمہارا استاد محصول لینے والوں اور گنہگاروں کے ساتھ کیوں کھاتا ہے۔‘‘

(متی باب ۹ آیت ۱۰، ۱۱)

اس عبارت میں بھی حضرت مسیح کے کھانا کھانے کا وضاحتاً ذکر آتا ہے۔

پھر حضرت مسیح خود اپنے متعلق فرماتے ہیں۔

’’ابن آدم **کھاتا پیتا** آیا۔ اور وہ کہتے ہیں دیکھو کھاؤ اور شرابی آدمی محصول لینے والوں اور گنہگاروں کا یار۔ مگر حکمت اپنے کاموں سے راست ثابت ہوئی۔‘‘ (متی باب ۱۱ آیت ۱۹)

اسی طرح لکھا ہے

’’**جب شام ہوئی تو وہ بارہ شاگردوں کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھا تھا** اور جب وہ کھا رہے تھے تو اُس نے کہا میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ تم میں سے ایک مجھے پکڑوائے گا۔ وہ بہت ہی دل گیر ہوئے اور ہر ایک اُس سے کہنے لگا۔ اے خداوند! کیا میں ہوں اُس نے جواب میں کہا۔ **جس نے میرے ساتھ طباق میں ہاتھ ڈالا ہے وہی مجھے پکڑوائے گا**۔ ابن آدم تو جیسا اُس کے حق میں لکھا ہے جاتا ہی ہے۔ لیکن اُس آدمی پر افسوس جس کے وسیلہ سے ابن آدم پکڑوایا جاتا ہے۔ اگر وہ آدمی پیدا نہ ہوتا تو اس کے لئے اچھا ہوتا اس کے پکڑوانے والے یہوداہ نے جواب میں کہا۔ اے ربیّ! کیا میں ہوں؟ اُس نے اُس سے کہا تُو نے خود کہہ دیا۔ جب وہ کھا رہے تھے تو یسوع نے روٹی لی اور برکت دے کر توڑی اور شاگردوں کو دے کر کہا۔ لو کھاؤ یہ میرا بدن ہے۔ پھر پیالہ لے کر شکر کیا اور اُن کو دے کر کہا۔ تم سب اس میں سے پیؤ کیونکہ یہ میرا وہ عہد کا خون ہے جو بہتیروں کے لئے گناہوں کی معافی کے واسطے بہایا جاتا ہے۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ **انگور کا یہ شیرہ پھر کبھی نہ پیؤں گا** اُس دن تک کہ تمہارے ساتھ اپنے باپ کی بادشاہی میں نیا نہ پیؤں۔‘‘ (متی باب ۲۶ آیت ۲۰ تا ۲۹)

یہ حوالہ بھی بتا رہا ہے کہ حضرت مسیحؑ اپنے حواریوں کے ساتھ مل کر کھانا کھایا کرتے تھے۔ بلکہ بعض دفعہ تو سالن کا ایک ہی پیالہ ہوتا جس میں وہ اور اُن کے شاگرد سب شریک ہوتے۔

اسی طرح واقعۂ صلیب کے بعد جب حضرت مسیحؑ اپنے شاگردوں پر ظاہر ہوئے تو لکھا ہے۔

’’اُس نے ان سے کہا۔کیا یہاں تمہارے پاس کچھ کھانے کو ہے؟ **انہوں نے اُسے بھُنی ہوئی مچھلی کا قتلہ دیا۔اُس نے لے کر اُن کے روبرو کھایا۔**‘‘ (لوقا باب ۲۴ آیت ۴۱ تا ۴۳)

ان حوالہ جات سے ظاہر ہے کہ حضرت مسیحؑ اسی طرح بھوک محسوس کرتے تھے جس طرح دوسرے لوگ بھوک محسوس کرتے ہیں۔اور وہ اسی طرح کھانا کھاتے تھے جس طرح اُن کے شاگرد اور دوسرے تمام لوگ کھانا کھاتے تھے۔ بلکہ واقعۂ صلیب کے بعد انہوں نے خود شاگردوں سے پوچھا کہ کیا تمہارے پاس کچھ کھانے کے لئے موجود ہے۔ اور جب انہوں نے بھنی ہوئی مچھلی کا قتلہ پیش کیا تو انہوں نے سب شاگردوں کے سامنے وہ مچھلی کا قتلہ لے کر کھالیا۔ پھر انجیل یہ بھی بتاتی ہے کہ حضرت مسیحؑ بازاروں میں بھی جاتے تھے اور لوگوں کو دینی تعلیم دیتے تھے۔ چنانچہ ایک مقام پر وہ لوگوں کو اس امر کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہ نجات قربانیوں اور عمل کے ساتھ وابستہ ہے فرماتے ہیں۔

’’اُس وقت تم کہنا شروع کرو گے کہ ہم نے تو تیرے روبرو کھایا پیا **اور تُو نے ہمارے بازاروں میں تعلیم دی** مگر وہ کہے گا میں تم سے کہتا ہوں کہ میں نہیں جانتا تم کہاں کے ہو۔اے بدکارو! تم سب مجھ سے دُور ہو۔‘‘ (لوقا باب ۱۳ آیت ۲۶، ۲۷)

اسی طرح لکھا ہے کہ

’’وہ خواہ گاؤں، خواہ شہروں، خواہ بستیوں میں جہاں کہیں جاتا تھا لوگ بیماروں کو بازاروں میں رکھ کر اُس کی منت کرتے تھے کہ وہ صرف اُس کی پوشاک کا کنارہ چھولیں۔اور جتنے چھوتے تھے شفا پاتے تھے۔‘‘ (مرقس باب ۶ آیت ۵۶)

غرض حضرت مسیح ناصریؑ جن کو الوہیت میں خدا تعالیٰ کا شریک قرار دیا جاتا ہے اُن کے متعلق اناجیل سے ثابت ہے کہ وہ اُسی طرح کھانے پینے کے محتاج تھے جس طرح دوسرے لوگ محتاج تھے اور وہ بھی اُسی طرح بازاروں میں چلتے پھرتے تھے جس طرح دوسرے لوگ چلتے پھرتے تھے اور یہی حال دوسرے تمام انبیاء کا تھا۔ آدمؑ سے لے کر آج تک کوئی نبی بھی ایسا مبعوث نہیں ہوا جو کھانے پینے کا محتاج نہ ہو۔ پھر انہیں خدا قرار دینا کس طرح جائز ہوسکتا ہے؟

اس کے علاوہ اِن آیات میں کفار کے اُس اعتراض کا بھی جواب دیا گیا ہے جو انہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا تھا کہ یہ کیسا رسول ہے جو ہماری طرح کھاتا پیتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب پہلے انبیاء بھی کھانے پینے کے محتاج تھے اور وہ بھی بازاروں میں چلتے پھرتے تھے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تمہارا

یہ اعتراض کرنا درست نہیں ہوسکتا۔ اعتراض تب ہوتا جب دوسرے انبیاء و رُسُل کے خلاف کوئی نئی بات آپ میں پائی جاتی۔ لیکن جب آپؐ کا قدم اُسی نہج پر ہے جس پر پہلے انبیاء مبعوث ہوئے اور اُسی طریق پر آپؐ قدم زن ہیں جس طریق پر پہلے انبیاء چلے تو آپ پر اعتراض کرنا درحقیقت اس امر کا اظہار کرنا ہے کہ انہیں سلسلۂ نبوت پر ایمان ہی نہیں۔ مگر فرماتا ہے۔ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً۔ تمہیں دشمنوں کی مخالفت اور اُن کے اعتراضات سے گھبرانا نہیں چاہیے کیونکہ ہم نے ابتلاؤں اور امتحانات کا سلسلہ بھی جاری کیا ہوا ہے جن کے ذریعہ ہم کھوٹے اور کھرے میں امتیاز کر دیتے ہیں۔ اور انبیاء کے زمانہ میں یہ امتحانات زیادہ تر اسی رنگ میں ہوتے ہیں کہ باپ کو بیٹے سے اور بیٹے کو باپ سے۔ خاوند کو بیوی سے اور بیوی کو خاوند سے۔ بھائی کو بہن سے اور بہن کو بھائی سے جُدا ہونا پڑتا ہے۔ اور اس طرح وہ ایک دوسرے کی ایمانی آزمائش کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ پھر یہ آزمائش صرف خاندانوں تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ قوم کی قوم کو اس دور میں سے گذرنا پڑتا ہے اور کفار مومنوں کے لئے اور مومن کفار کے لئے ابتلاء اور آزمائش کا ایک ذریعہ بن جاتے ہیں۔ چنانچہ دیکھ لو جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو آپ پر ایمان لانے سے ادھر صحابہؓ کو آزمائشوں کی ایک آگ میں سے گذرنا پڑا اور اُدھر اُن کی مخالفت نے دشمنوں کی اندرونی خرابیوں کو بھی بے نقاب کر دیا۔ اگر **محمد** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث نہ ہوتے تو نہ ابوبکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ اور علیؓ کی خوبیاں دنیا پر ظاہر ہوتیں اور نہ ابوجہل اور عُتبہ اور شیبہ کی بدکرداریاں دنیا پر عیاں ہوتیں۔ یہ اسی ایمانی آزمائش کا نتیجہ تھا کہ اُس نے ایک طرف تو صحابہؓ کے اندرونی حسن کو ظاہر کر دیا اور دوسری طرف کفار کا مخفی کوڑھ لوگوں پر ظاہر ہو گیا اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث نہ ہوتے تو دنیا میں یہی سمجھا جاتا کہ ابوالحکم مکہ کا ایک بہت بڑا مدبر اور سمجھدار رئیس تھا اور ابوبکرؓ وہاں کا ایک دیانتدار اور بااخلاق تاجر تھا۔ جب مخالفت کی آگ بھڑکی تو اُس نے صحابہؓ کو کندن بنا دیا۔ اور کفار کا ملمع اتار کر ان کا پیتل ہونا لوگوں پر ظاہر کر دیا۔ غرض صحابہؓ کفار کے لئے اور کفار صحابہؓ کے لئے آزمائش کا ایک ذریعہ بن گئے۔ مگر فرماتا ہے ان آزمائشوں میں تمہارا صبر اور استقامت سے اپنے ایمان پر قائم رہنا ضروری ہے تاکہ تمہاری عظمت لوگوں پر ظاہر ہو اور یہ کبھی خیال نہ کرو کہ اگر ابتلاء اسی طرح بڑھتے چلے گئے تو شاید تمہاری ہلاکت کا باعث بن جائیں کیونکہ اللہ تعالیٰ تمام حالات کو دیکھ رہا ہے۔ اس میں یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ تم تو ان ابتلاؤں سے گھبراتے ہو لیکن اللہ تعالیٰ جو بصیر ہے وہ جانتا ہے کہ یہ ابتلاء تمہاری طاقت کو کچلنے کا باعث نہیں بلکہ تمہیں اور بھی ترقی کی طرف لے جانے والے ہیں۔ یہی نکتہ مولانا رومؒ نے اپنے اس شعر میں بیان فرمایا ہے کہ

ے ہر بلا کیں قوم راحق دادہ است
زیرِ آں گنج کرم بنہادہ است

(مثنوی مولانا روم دفتر ششم)

یعنی ہر ابتلاء جو اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ سلسلوں پر آتا ہے اُس کے نیچے رحمتِ الٰہی کا ایک بہت بڑا خزانہ مخفی ہوتا ہے جو اُس کی ترقی کا باعث ہوتا ہے۔ چنانچہ دیکھ لو مکہ کے بڑے بڑے رؤساء نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسی کیسی اذیتیں پہنچائیں مگر یہی اذّیتیں تھیں جنہوں نے سعید الفطرت لوگوں کی طبائع میں ہلچل مچا دی۔ اور وہ خون کے دریاؤں میں گذرتے ہوئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازہ تک آ پہنچے اور انہوں نے آپؐ کے آستانہ پر اپنے سر جھکا دیئے۔ اگر ابتلاء نہ آتے تو شاید اسلام کی آواز مکّہ کی چاردیواری سے بھی باہر نہ نکلتی۔ مگر ان ابتلاؤں کی وجہ سے اُس کی آواز عرب کے کونہ کونہ میں گونجنے لگی اور پھر عرب سے نکل کر دنیا کے کناروں تک جا پہنچی پس ابتلاء قومی ترقی کا ایک اہم ذریعہ ہوتے ہیں۔ آج تک کوئی نبی بھی دنیا میں ایسا نہیں آیا جس کی جماعت کو ابتلاؤں اور آزمائشوں کے دَور میں سے نہ گذرنا پڑا ہو بلکہ قرآن کریم ان کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ (البقرة:۲۱۵) یعنی ان لوگوں کو اس قدر تکالیف پہنچیں کہ وہ سر سے پیر تک ہلا دیئے گئے۔ یہاں تک کہ وقت کا رسول اور مومن بندے سب کے سب اللہ تعالیٰ کے حضور گر گئے اور انہوں نے دُعائیں کرنی شروع کر دیں کہ الٰہی تیری مدد کب نازل ہوگی۔ آخر خدا نے اُن کی پکار سُنی اور آسمان سے اُس کی مدد آ گئی جس نے اُن کو غالب کر دیا۔

پس ابتلاؤں سے گھبرانا نہیں چاہیے بلکہ انہیں جماعتی ترقی کا ایک اہم ذریعہ سمجھنا چاہیے اور دُعاؤں سے اور گریہ وزاری سے اور نیک اور پاک اعمال سے اللہ تعالیٰ کی مدد اور اس کی نصرت کو جذب کرنا چاہیے۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا (رکوع ۱۹)

اور انہوں نے جو ہماری ملاقات کی امید نہیں کرتے کہہ دیا کہ کیوں ہم پر فرشتے نہیں اتارے گئے؟ یا ہم

الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ؕ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ وَ

اپنے رب کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتے؟ انہوں نے اپنے دلوں میں اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھا ہے اور سرکشی

عَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴿۲۲﴾ يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى

میں بہت آگے نکل گئے ہیں۔ (کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ) جس دن فرشتوں کو دیکھیں گے اُس دن مجرموں کو

يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَ يَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۲۳﴾

کوئی خوشخبری نہیں ملے گی اور (وہ گھبرا کر) کہیں گے (ہم سے) پرے ہی رہو۔ اور ہم نے اُن کے ہر قسم کے عمل کی

وَ قَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً

طرف توجہ کی جو انہوں نے کیا تھا اور اُس کو ہوا میں بکھیر کر اُڑائے ہوئے ذرات کی طرح کر دیا جنتی لوگ اُس دن

مَّنْثُوْرًا ﴿۲۴﴾ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّ اَحْسَنُ مَقِيْلًا ﴿۲۵﴾

ٹھکانہ کے لحاظ سے بھی اچھے ہوں گے اور خواب گاہوں کے لحاظ سے بھی وہ اعلیٰ مقام پر ہوں گے۔

حلّ لُغات۔ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا حِجْرًا مَحْجُوْرًا اَحْجَرَهٗ کے معنے ہیں مَنَعَهٗ۔ اُس کو روک دیا۔ (اقرب)

مفردات میں ہے کہ وَ يَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَحْجُوْرًا كَانَ الرَّجُلُ اِذَا لَقِيَ مَنْ يُّخَافُ يَقُوْلُ ذٰلِكَ یعنی حِجْرًا مَّحْجُوْرًا کا فقرہ اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب کوئی آدمی کسی سے ڈرتا ہو اور وہ سمجھتا ہو کہ وہ اُسے نقصان پہنچائے گا۔ تو اس وقت وہ یہ فقرہ کہا کرتا تھا۔ جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ کاش اُس کے اور اُس کو نقصان پہنچانے والے کے درمیان کوئی روک حائل ہو جائے۔ اسی طرح کفار بھی جب عذاب کے فرشتوں کو دیکھیں گے۔ تو وہ یہ فقرہ کہیں گے۔ اس خیال سے کہ شاید کوئی روک پیدا ہو جائے اور وہ عذاب سے بچ جائیں (مفردات)

هَبَآءً اَلْهَبَآءُ اَلْغُبَارُ۔ غبار۔ اَوْيُشْبِهُ الدُّخَانَ وَهُوَ مَا يَنْبَثُّ فِيْ ضَوْءِ الشَّمْسِ یا وہ چیز جو دھوئیں کی طرح سورج کی شعاؤں میں اُڑتی نظر آتی ہے۔ اسی طرح هَبَآءً کے معنے ہیں دُقَاقُ التُّرَابِ سَاطِعَةً وَمَنْثُوْرَةً عَلٰى وَجْهِ الْاَرْضِ۔ وہ باریک مٹی جو زمین پر فضا میں بکھری ہوئی اُڑ رہی ہوتی ہے۔ (اقرب)

مَقِيْلًا مَقِيْلًا قَالَ (يَقِيْلُ) کا مصدر ہے اور قَالَ کے معنے ہیں نَامَ فِي الْقَائِلَةِ اَيْ نِصْفَ النَّهَارِ۔ دو پہر کے وقت سویا اور اُس نے آرام کیا۔ اسی طرح قَالَ کے معنے ہیں شَرِبَ فِيْ نِصْفِ النَّهَارِ دو پہر کے وقت تسکین نفس کے لئے کچھ پینے کی چیز استعمال کی (اقرب) يَقِيْلُ قَالَ سے ظرفِ مکان بھی ہوسکتا ہے۔ اس صورت

میں اس کے معنے دو پہر کے وقت آرام کرنے کی جگہ کے ہوں گے۔(مفردات و اقرب)

تفسیر۔ان آیات میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ لوگ جو ہماری ملاقات کی کوئی امید نہیں رکھتے یا جن کے دلوں میں ہماری سزا اور عذاب کا کوئی خوف نہیں ان کی بھی عجیب حالت ہے۔کبھی تو وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم پر فرشتے کیوں نہیں اُترتے اور کبھی یہ کہنے لگ جاتے ہیں کہ ہم کو خدا کیوں نظر نہیں آتا۔یہ بیوقوف اپنے آپ کو دیکھتے نہیں کہ کیسے گندے اور ناپاک ہیں۔آخر انہوں نے اپنے آپ کو کیا سمجھ رکھا ہے کہ ایسے مطالبات کرتے رہتے ہیں۔

رِجَاء کے معنے عام طور پر امید کے ہوتے ہیں مگر رِجَاء کے ایک معنے ڈر اور خوف کے بھی ہوتے ہیں (اقرب) اسی طرح لِقَاء کا لفظ جہاں ملاقات کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے وہاں اس کے ایک معنے جنگ کے بھی ہوتے ہیں۔پس لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا کے دونوں معنے ہو سکتے ہیں۔یہ بھی کہ وہ لوگ جو ہماری ملاقات کی اُمید نہیں رکھتے اور یہ بھی کہ جو لوگ ہماری سزا سے خوف نہیں کھاتے۔چونکہ دنیا میں بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کو اگر کوئی امید دلائی جائے تو وہ بڑے شوق سے کام کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔اور بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کو سزا کا خوف دلایا جائے تب وہ کام کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔اس لئے لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فرما کر اللہ تعالیٰ نے ان دونوں قسم کی طبائع کو ملحوظ رکھ لیا اور فرمایا کہ ان لوگوں نے ہمارے انعام اور برکات کے وعدوں سے کوئی فائدہ اٹھایا اور نہ عذاب کی خبروں سے اپنے اندر کوئی تبدیلی پیدا کی بلکہ برابر یہ لوگ اعتراض کرتے رہتے ہیں کہ اگر یہ رسول سچا ہے تو ہم پر خدا تعالیٰ کے فرشتے کیوں نہیں اُترتے یا ہمیں خدا تعالیٰ کی روئت کیوں نصیب نہیں ہوتی۔

اس جگہ جو لِقَاء کا لفظ استعمال کیا گیا ہے مفسرین نے اس کے مختلف معنے کئے ہیں۔بعض نے تو یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے عذاب کی پرواہ نہیں کرتے۔اور بعض نے اس کے یہ معنے کئے ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کی رؤیت کی اُمید نہیں رکھتے یا یہ کہ جزائے خیر کی اُمید نہیں رکھتے۔لیکن درحقیقت لقاء ایک روحانی مقام ہے جو اسلام پر چلنے والوں کو حاصل ہوتا ہے۔رؤیت کے معنے تو صرف اتنے ہوتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کا جلوہ دیکھ لیا جو ایک عارضی چیز ہے لیکن لقاء کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ خدا مل گیا اور ایک مستقل مقام کا نام ہے۔اس لئے صوفیاء کی اصطلاح کے مطابق رؤیت حال ہے اور لقاء ایک مستقل مقام ہے۔اور یہی ایک چیز ہے جو اسلام اور دوسرے مذاہب میں مابہ الامتیاز ہے۔دوسرے مذاہب اپنے پیروؤں سے اللہ تعالیٰ کے وصال کا صرف وعدہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ وصال قیامت کے دن ہوگا۔مگر قرآن کریم اس نظریہ کو ردّ کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ لقاء الٰہی کا مرتبہ اسی دنیا میں انسان کو حاصل ہو سکتا ہے بلکہ وہ اس پر اتنا زور دیتا ہے کہ فرماتا ہے۔مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ

اَعۡمٰی وَ اَضَلُّ سَبِیۡلًا (بنی اسراءیل: ۷۳) یعنی جو شخص اس دنیا میں خدا تعالیٰ کا عرفان نہیں رکھتا اور اس کو اپنے دل کی آنکھوں سے نہیں دیکھتا وہ آخرت میں بھی اُسے نہیں دیکھ سکے گا۔ اور سب سے بڑھ کر بھٹکا ہوا ہوگا۔ اسی طرح فرماتا ہے۔ کَلَّاۤ اِنَّهُمۡ عَنۡ رَّبِّهِمۡ یَوۡمَئِذٍ لَّمَحۡجُوۡبُوۡنَ (التطفیف: ۱۰) یعنی کفار قیامت کے دن اپنے رب کے سامنے آنے سے روکے جائیں گے جس کے معنے یہ ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رؤیت حاصل نہیں کر سکیں گے کیونکہ وہ دنیا میں اس سے محروم رہے تھے۔ اس کے مقابلہ میں مومنوں کے متعلق فرماتا ہے کہ وُجُوۡهٌ یَّوۡمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۔ اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ (القیامۃ: ۲۳، ۲۴) اُس دن خدا تعالیٰ کے حضور میں حاضر ہونے والے مومن بندوں کے مونہہ بڑے ہشاش بشاش اور خوبصورت ہوں گے اس لئے کہ وہ اپنے رب کو دیکھ رہے ہوں گے۔

اسی طرح قرآن کریم لقائے الٰہی کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ اِنَّ الَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا وَ رَضُوۡا بِالۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا وَ اطۡمَاَنُّوۡا بِهَا وَ الَّذِیۡنَ هُمۡ عَنۡ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوۡنَ ۔ اُولٰٓئِكَ مَاۡوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوۡا یَكۡسِبُوۡنَ (یونس: ۸۔۹) یعنی وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی تڑپ اپنے دلوں میں نہیں رکھتے اور دنیا پر ہی راضی ہو کر بیٹھ گئے ہیں اور اس پر اُن کو اطمینان اور سکون حاصل ہو گیا ہے اور وہ لوگ جو ہمارے نشانوں سے غافل ہیں اُن کا ٹھکانہ اُن کے اعمال کے سبب سے جہنم ہوگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام لقاء الٰہی کو روحانیت کی جان اور اسلام کا مغز قرار دیتا ہے اور فرماتا ہے کہ جو لوگ اس کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب لقاء الٰہی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ انہیں ہم سزا دیں گے اور انہیں جہنم میں ڈالیں گے افسوس ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں نے بھی یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ اب خدا تعالیٰ کے کلام اور الہام کا دروازہ بند ہو چکا ہے اور کوئی شخص امّت محمدیہ میں ایسا نہیں ہوسکتا جو اللہ تعالیٰ کے حضور ایسا مقام حاصل کر سکے کہ خدا اُس سے بولنے لگ جائے۔ حالانکہ یہی ایک مسئلہ ہے جو اسلام کی دوسرے مذاہب پر فوقیت ثابت کرنے والا ہے۔ باقی مسائل کے مقابلہ میں دوسرے مذاہب والے بھی کچھ نہ کچھ پیش کر دیتے ہیں جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ساحروں سے مقابلہ ہوا تو جادوگروں نے بھی مقابل میں رسّیاں ڈال دیں اور گو اس میں اُن کو ناکامی ہوئی مگر بہرحال انہوں نے مقابلہ کے لئے کچھ نہ کچھ تو پیش کر دیا۔ اسی طرح باقی مسائل کے مقابلہ میں دوسرے مذاہب والے کچھ نہ کچھ باتیں پیش کر دیتے ہیں خواہ وہ غلط ہی ہوں مگر لقاء الٰہی ایک ایسی چیز ہے جس کے مقابل میں دوسرا کوئی مذہب کھڑا نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اگر وہ اس کا دعویٰ کریں تو اُن کو ماننا پڑتا ہے کہ لقاء الٰہی اس دنیا میں بھی ہوسکتا ہے۔ جس کا ثبوت وہ اپنے مذہب سے پیش نہیں کر سکتے اس صورت میں اُن کو لازماً اسلام کی برتری تسلیم کرنی پڑتی ہے کیونکہ اسلام صرف لقاء الٰہی کا دعویٰ ہی نہیں کرتا بلکہ وہ اس کا ثبوت بھی پیش کرتا ہے۔ پس وہ اس

سے بچنے کے لئے لقاء الٰہی کے سرے سے ہی منکر ہو جاتے ہیں اور اسلام کے اس مسئلہ کے مقابل میں اپنی طرف سے لقاء الٰہی کا جھوٹا دعویٰ بھی پیش کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے بلکہ کہہ دیتے ہیں کہ لقائے الٰہی نہ تمہارے ہاں ہے نہ ہمارے ہاں ہے۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ لقائے الٰہی تمہارے مذہب میں نہیں اور ہمارے مذہب میں ہے۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر انہوں نے ایسا دعویٰ کیا تو وہ اُسے ثابت نہیں کر سکیں گے۔

یہ لقائے الٰہی کس طرح حاصل ہوتا ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اصولی رنگ میں قرآن کریم میں یہ ہدایت دی ہے کہ یٰٓاَیُّھَا الْاِنْسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا فَمُلٰقِیْہِ (الانشقاق:۷) یعنی اے انسان تیرے لئے اپنے رب سے ملنے کا راستہ تو ہر وقت کھلا ہے مگر شرط یہ ہے کہ تیری طرف سے کَدْح ہونا چاہیے۔ اور کدح اُس کام کو کہتے ہیں جو اتنی محنت سے کیا جائے جس کا اثر انسان کے جسم پر بھی محسوس ہونے لگے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ انسان کو اس غلط فہمی میں نہیں رہنا چاہیے کہ ادھر وہ ایمان لایا تو اُدھر اُسے روحانیت میں کمال حاصل ہو جائے گا بلکہ اس کے لئے اُسے متواتر محنت اور جدوجہد کرنی پڑے گی۔ اور قربانیوں کی ایک آگ میں سے اُسے گذرنا پڑے گا تب اُسے لقاء الٰہی کی نعمت میسر آئے گی۔

غرض ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے کفار کی بے باکی کی بڑی وجہ یہ بتائی ہے کہ وہ لقاء الٰہی کے منکر ہیں۔ جس کی وجہ سے نہ تو اُن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی محبت پائی جاتی ہے اور نہ اُس کے عذاب کا خوف پایا جاتا ہے اور پھر اُن کے ان مطالبات کا ذکر فرمایا ہے کہ اگر یہ سچا رسول ہے تو ہم پر فرشتے کیوں نہیں اترتے یا ہم خدا تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے کیوں نہیں دیکھ لیتے۔ اس سے پہلے وہ یہ اعتراض بھی کر چکے تھے کہ اگر یہ سچا رسول تھا تو چاہیے تھا کہ اس کے پاس کوئی بہت بڑا باغ ہوتا جس کے پھلوں اور میووں سے لدے ہوئے درخت اس کے دعویٰ کا ثبوت ہوتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کے نزدیک صداقت کے دو ہی ثبوت ہوا کرتے ہیں۔ **اوّل** مادی غلبہ، **دوم** سُنت اللہ کے خلاف محیر العقول کارنامے۔ چونکہ انہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ دونوں باتیں نظر نہیں آتی تھیں نہ مال و دولت اور خزانوں کے ڈھیر انہیں آپ کے پاس دکھائی دیتے تھے اور نہ سنت اللہ کے خلاف کوئی مافوق الانسانیت بات آپ میں دکھائی دیتی تھی اس لئے وہ آپ کے دعویٰ پر ہنسی اُڑاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ اُن کے ان اعتراضات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے لَقَدِ اسْتَکْبَرُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ وَعَتَوْا عُتُوًّا کَبِیْرًا۔ ان اعتراضات کا اصل باعث یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے دلوں میں ان دونوں باتوں کو بہت بڑا اور ناممکن سمجھتے ہیں اور شرارتوں میں حد سے بڑھ گئے ہیں۔ یعنی منہ سے تو وہ یہ کہتے ہیں کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) جھوٹ بول رہے ہیں اور قوم کے دشمن ہیں۔ لیکن اپنے

دلوں میں یہ خیال کرتے ہیں کہ قوم کو جس مقام تک پہنچانے کا یہ شخص مدعی ہے اُسے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ گو یا بظاہر تو مخالفت کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس شخص نے قوم سے غداری کی ہے اور بتوں کی پرستش کو چھوڑ کر خدائے واحد کی عبادت کا ڈھونگ رچا دیا ہے مگر مخالفت کی اصل وجہ اُن کے دلوں کی یہ کیفیت ہے کہ وہ ان دعووں کو نا قابلِ حصول سمجھتے ہیں اور اس مایوسی کی وجہ سے ان قربانیوں کے لئے جو آپ کے ساتھ مل کر کرنی پڑتی ہیں اپنے نفوس میں جرأت نہیں پاتے اور مخالفت پر آمادہ رہتے ہیں۔

پھر فرماتا ہے کہ فرشتوں کا یہ مطالبہ تو کرتے ہیں مگر ہمارے فرشتے یا تو الہام لایا کرتے ہیں۔ یا کفار پر عذاب نازل کیا کرتے ہیں۔ الہام کے تو یہ قابل نہیں اور جب عذاب آیا تو اس وقت یہی کہیں گے کہ خدایا اسے ٹلا دے اور اس سے دُور بھاگنے کی کوشش کریں گے گو یا اُس وقت فرشتوں کا آنا اُن کے لئے کسی برکت کا موجب نہیں ہوگا بلکہ تباہی اور بربادی کا موجب ہوگا اور ہمارا یہ عذاب بلا وجہ نہیں ہوگا۔ بلکہ اس لئے ہوگا کہ یہ لوگ صداقت کو دنیا سے مٹانا چاہتے ہیں جس میں ہم اُن کو کبھی کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔ چنانچہ جب بھی یہ لوگ صداقت پر حملہ کرنے کی طرف توجہ کریں گے ہم ان کو تباہ کر دیں گے اور انہیں ہوا میں بکھرے ہوئے ذرات کی طرح منتشر اور پراگندہ کر دیں گے اور انہیں ایسا پیسیں گے کہ اُن کے دوست اور مددگار بھی اُن کو اکٹھا نہیں کر سکیں گے۔ اس کے مقابلہ میں مومنوں کو ہماری طرف سے اعلیٰ سے اعلیٰ ٹھکانے ملیں گے اور اُن کے قیلولہ کی جگہ بھی بڑی اچھی ہوگی۔ یعنی اُن کے صبح کے کام اُن کے دوپہر کے آرام کو بڑا خوشگوار بنا دیں گے اور اُن کی قربانیاں انہیں اور اُن کی آئندہ نسلوں کو ایک لمبے عرصہ تک اللہ تعالیٰ کی برکات اور نعماء سے متمتع کرتی رہیں گی۔

وَ يَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَ نُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ

اور اُس دن (کو یاد کرو) جب آسمان پھٹ جائے گا اور بادل سر پر منڈلا رہے ہوں گے اور ملائکہ بار بار اُتارے

تَنْزِيْلًا ﴿۲۶﴾ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ ِۨالْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ؕ وَ كَانَ يَوْمًا

جائیں گے۔ اُس دن بادشاہت سچ مچ رحمٰن (خدا) کے قبضہ میں نظر آئے گی۔ اور (یہ) دن کافروں پر بڑا سخت ہوگا۔

عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ﴿۲۷﴾ وَ يَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ

اور اُس دن ظالم اپنے ہاتھوں کو کاٹے گا (اور) کہے گا۔ اے کاش! میں رسول کے ساتھ چل پڑتا۔

يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ﴿۲۸﴾ يٰوَيْلَتٰى

وائے بدبختی! کاش میں فلاں شخص کو دوست نہ بناتا۔اُس نے مجھے خدا کے ذکر

لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ﴿۲۹﴾ لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ

سے غافل کر دیا جبکہ وہ (رسول کے ذریعہ سے) میرے پاس آیا تھا۔

بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ ؕ وَ كَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ﴿۳۰﴾

اور شیطان آخر انسان کو اکیلا چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

حلّ لُغات۔خَذُوْلًا خَذُوْلًا خَذَلَ سے ہے اور خَذَلَهٗ کے معنے ہیں تَرَكَ نُصْرَتَهٗ وَاعَانَتَهٗ اُس کی اعانت اور مدد چھوڑ دی۔پس خَذُوْلًا کے معنے ہوں گے مدد اور نصرت کو چھوڑ دینے والا۔(اقرب)

تفسیر۔فرماتا ہے۔تم اُس دن کو یاد کرو جبکہ آسمان پھٹ جائے گا اور بادل ہی بادل ظاہر ہو جائیں گے۔اور کفار کو عذاب دینے کے لئے کثرت سے فرشتے نازل کئے جائیں گے۔اُس دن بادشاہت کافروں سے چھین کر خدا اپنے ہاتھ میں لے لے گا۔اور وہ دن کافروں کے لئے بڑا سخت ہوگا اور کافر اپنے ہاتھ کاٹ کاٹ کر کہے گا کہ کاش میں محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ہوتا۔کاش! میں فلاں شخص کو جو دشمنِ رسول تھا اپنا دوست نہ بناتا۔اس کم بخت دوست نے خدا تعالیٰ کا پیغام آنے کے بعد مجھے اور بھی گمراہی میں دھکیل دیا۔اور میرے لئے شیطان بن گیا۔اور شیطان ہمیشہ وقت پر ساتھ چھوڑ دیا کرتا ہے۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اُس عذاب کی تفصیلات بیان فرمائی ہیں جو کفار کے لئے آسمان پر مقدر ہو چکا تھا چونکہ اُن کا مطالبہ تھا کہ اگر یہ رسول سچا ہے تو ہم پر فرشتے کیوں نہیں اُتارے گئے۔اس لئے اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ ایک دن آنے والا ہے جبکہ فرشتے تمہاری سرکوبی کے لئے آسمان سے اتارے جائیں گے۔مگر وہ دن تمہارے لئے خوشی کا موجب نہیں ہوگا بلکہ حسرت اور افسوس کا موجب ہوگا۔آج تو تم بڑی بے باکی کے ساتھ کہتے ہو کہ وہ فرشتے کہاں ہیں جن کا روزانہ ذکر کیا جاتا ہے۔ہم پر بھی اُتریں تو ہم جانیں کہ تم سچ کہتے ہو۔مگر جب وہ نازل ہوئے تو اُس دن تم کہو گے کہ کاش! ہم پر یہ دن نہ چڑھتا اور ہم اس کی آفات سے محفوظ رہتے۔چنانچہ فرماتا ہے۔يَوْمَ تَشَقَّقُ

السَّمَآءِ ۔ایک دن آنے والا ہے جبکہ آسمان پھٹ جائے گا۔آسمان کے پھٹنے کے یہ معنے بھی ہوتے ہیں کہ عذاب نازل ہوجائے۔گویا رحمت اور عذاب دونوں کے لئے آسمان پھٹ جانے کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔چنانچہ دیکھ لو۔ ایک جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَوَ لَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ؕ وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ (الانبیاء:۳۱) یعنی کیا کفار اس امر پر غور نہیں کرتے کہ آسمان اور زمین دونوں بند تھے۔نہ آسمان سے برکاتِ الٰہیہ کا نزول ہو رہا تھا اور نہ زمین اپنی مخفی طاقتوں کو ظاہر کر رہی تھی مگر پھر ہم نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیج کر ان دونوں کو پھاڑ دیا۔اور کلام الٰہی سے ہم نے ہر چیز کو زندہ کر دیا۔اس جگہ آسمان کے پھٹنے سے رحمتِ الٰہی کی بارش برسنا مراد ہے لیکن دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ تَکَادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا۔ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا (مریم:۹۱، ۹۲) یعنی قریب ہے کہ آسمان پھٹ جائیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہوکر گر جائیں اس لئے کہ عیسائیوں نے خدائے رحمٰن کا ایک بیٹا بنالیا ہے۔اس جگہ آسمان کے پھٹنے سے مراد آسمان سے بلاؤں اور آفات کا نزول ہے یعنی قریب ہے کہ آسمان اپنی بلاؤں اور آفات کا مُنہ ان کے لئے کھول دے اور انہیں خطرناک عذابوں سے گھیر لے اس لئے کہ انہوں نے ایک انسان کو خدائے رحمٰن کا بیٹا قرار دے دیا ہے۔زیرِ تفسیر آیات میں بھی یَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ سے مراد عذابِ الٰہی کا نزول ہے کیونکہ اس کے معاً بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَ کَانَ یَوْمًا عَلَی الْکٰفِرِیْنَ عَسِیْرًا وہ دن کافروں کے لئے بڑا سخت ہوگا۔اگر یہاں آسمان کے پھٹنے سے رحمتِ الٰہی کا نزول مُراد ہوتا تو کفار کی ناکامیوں اور اُن کی حسرتوں کا ذکر نہ کیا جاتا۔

اُس دن کی ایک بڑی علامت اللہ تعالیٰ نے یہ بتائی کہ اُس دن بادل ہی بادل ظاہر ہو جائیں گے یعنی آسمان سے خوب بارش برسے گی۔اور دوسری علامت یہ بتائی کہ اُس دن اللہ تعالیٰ کے ملائکہ کفّار کو عذاب دینے کے لئے بڑی کثرت کے ساتھ اُتارے جائیں گے اسی طرح یہ بھی بتایا کہ اُس دن خدائے رحمٰن کی حکومت قائم ہو جائے گی اور کفّار اپنی ہلاکت اور بربادی سے چیخ اٹھیں گے۔

یہ عذاب جیسا کہ تاریخی واقعات سے ظاہر ہے کفّار مکہ پر جنگِ بدر کی صورت میں آیا۔ جسے قرآن کریم نے یوم الفرقان بھی قرار دیا ہے (انفال ع ۵) یہی وہ دن تھا جس میں اللہ تعالیٰ کفّار کے بڑے بڑے عمائد کو مکّہ سے نکال کر بدر کے میدان میں لایا۔اور انہیں چند کمزور اور بے سامان مسلمانوں کے ہاتھوں لقمۂ اجل بنا دیا۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ عتبہ اور شیبہ اور ابوجہل اور عقبہ بن ابی معیط اور امیّہ بن خلف اور نضر بن حارث اور دوسرے تمام سردار ایک ایک کر کے بدر کے میدان میں آچکے ہیں تو آپ نے صحابہؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ

هٰذِهٖ مَكَّةُ قَدْ اَلْقَتْ اِلَيْكُمْ أَفْلَاذَ كَبِدِهَا (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام رویا عاتکۃ بنت عبد المطلب) یعنی لو مکہ نے اپنے جگر کے ٹکڑے نکال کر تمہاری طرف پھینک دئے ہیں۔مگر چونکہ کفّار کا لشکر وادئ بدر میں مسلمانوں کے لشکر سے پہلے پہنچ چکا تھا۔اس لئے اُس نے اپنے لئے ایسی جگہ منتخب کر لی جہاں پانی اور گھاس کی کثرت تھی اور جس کی زمین چکنی اور ہموار تھی اور مسلمانوں کو ریت کے ایک ٹیلے پر اُترنا پڑا۔جہاں نہ تو پانی بافراط مل سکتا تھا اور نہ جانوروں کے لئے گھاس کا کوئی انتظام تھا۔کفار نے پختہ زمین کا انتخاب اپنے لئے اس لئے کیا تھا کہ لڑائی کی صورت میں جنگی حرکات اُس میں آسانی سے ہو سکیں گی۔اور مسلمانوں کے لئے ریتلا میدان اس لئے چھوڑا گیا تھا کہ جنگ کے وقت اُن کے پاؤں ریت میں دھنس دھنس جائیں گے اور اُن کے لئے لڑنا مشکل ہو جائے گا۔مگر وہ خدا جس نے یہ خبر دے رکھی تھی کہ يَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ اُس نے راتوں رات جنگ کا اس طرح پانسہ پلٹا کہ خوب بارش ہوئی۔جس کے نتیجہ میں ایک تو مسلمانوں نے حوض بنا بنا کر پانی جمع کر لیا اور پھر اُس کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ بارش کی وجہ سے ریتلا میدان ایک جما ہوا پختہ میدان بن گیا اور کفار کا پختہ میدان پھسلویں زمین بن گیا۔اور اُس کے سپاہیوں اور گھوڑوں کے لئے مسلمانوں کا جم کر مقابلہ کرنا مشکل ہو گیا۔پھر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی تائید کے لئے اپنے ملائکہ بھی نازل فرمائے جس کی خبر اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو الہامًا بھی دے دی تھی جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ (الانفال:۱۰) یعنی اُس وقت کو یاد کرو جبکہ تم اپنے رب سے التجائیں کرتے تھے کہ وہ تمہاری مدد کے لئے آسمان سے اُترے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری دُعاؤں کو سُنا اور اُس نے تمہیں بشارت دیتے ہوئے کہا کہ میں تمہاری ایک ہزار فرشتوں سے مدد کروں گا جن کا لشکر کے بعد لشکر بڑھ رہا ہو گا۔چنانچہ مسلمانوں کے مقابلہ میں آنے والے لشکر کی تعداد بھی ایک ہزار تھی اور مسلمان صرف ۳۱۳ تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے بھی انہیں ایک ہزار فرشتوں کے نزول کی خبر دی۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی فرشتے تھے جو ہر انسان کے ساتھ مقرر ہوتے ہیں۔جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے لشکر کا کفار سے مقابلہ ہوا تو باوجود اس کے کہ صحابہؓ ۳۱۳ تھے اور پھر وہ نہتے اور ناتجربہ کار تھے اللہ تعالیٰ نے ہر کافر کے دل میں اُس فرشتے کے ذریعہ جو اُس پر مقرر تھا رعب ڈالنا شروع کیا کہ مقابلہ کیا تو مارے جاؤ گے۔بلکہ بعض کفار کو جیسا کہ روایات سے ثابت ہے کشفی حالت میں یہ فرشتے نظر بھی آئے۔چنانچہ جب بدر کی جنگ میں کفار مسلمانوں کے مقابلہ میں بھاگ نکلے تو بعض لوگوں نے انہیں طعنہ دیا کہ تم نے کیسی بزدلی دکھائی ہے۔انہوں نے کہا تمہیں کیا پتہ اس جنگ میں سفید ابلق گھوڑوں پر کوئی عجیب قسم کی مخلوق سوار تھی۔تلواریں اُن کے ہاتھ میں تھیں اور وہ

جس پر بھی تلوار چلاتے تھے وہ فوراً کٹ کر دو ٹکڑے ہو جاتا تھا۔ پس ہمارا مقابلہ آدمیوں سے نہیں تھا بلکہ جنات سے تھا۔ چنانچہ باوجود کثرت اور ساز و سامان کے وہ اس تائید الٰہی کی وجہ سے شکست کھا گئے۔ پھر فرشتوں کا نزول اس رنگ میں بھی ہوا کہ اِدھر لڑائی ہو رہی تھی اور اُدھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے حضور سجدہ میں گر کر دعائیں فرما رہے تھے۔ بہت دیر کے بعد آپؐ نے سجدہ سے اپنا سر اُٹھایا اور پھر خیمہ سے باہر تشریف لا کر آپؐ نے ریت اور کنکروں کی ایک مٹھی اُٹھائی اور انہیں زور سے کفار کی طرف پھینکا اور بڑے جوش سے فرمایا شَاهَتِ الْوُجُوْهُ یعنی دشمنوں کے مُنہ کالے ہو گئے اور ساتھ ہی آپ نے مسلمانوں سے فرمایا کہ یکدم حملہ کر دو۔ آپ کا اُن کی طرف مٹھی بھر کنکر پھینکنا تھا کہ خدا تعالیٰ نے اس زور سے آندھی چلائی کہ کفار کی آنکھیں اور مُنہ ریت اور کنکروں سے بھر گئے۔ اور کفار کے لشکر میں بھاگڑ مچ گئی اور آن کی آن میں میدان صاف ہو گیا۔ آپؐ نے اُن کو بھاگتے ہوئے دیکھ کر فرمایا۔ یہ فرشتوں کی فوج تھی جو خدا نے ہماری مدد کے لئے نازل فرمائی تھی (بخاری کتاب المغازی باب قصة غزوة بدر)۔ خود قرآن کریم نے بھی ایک مقام پر اس نشان کا ان الفاظ میں ذکر فرمایا ہے کہ مَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (الانفال:۱۸) یعنی اے محمدؐ رسول اللہ! جب بدر کے میدان میں کفار کی طرف تو نے مٹھی بھر کنکر پھینکے تھے تو اُس وقت تُو نے کنکر نہیں پھینکے بلکہ ہم نے پھینکے تھے اور صحابہؓ کے متعلق فرماتا ہے کہ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ (الانفال:۱۸) یعنی تم نے ان کفار کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے خود ان کو قتل کیا ہے۔ یعنی ظاہر میں تو تمہارے ہاتھوں نے تلوار چلائی اور ظاہر میں تمہارے ہاتھوں سے کفار اپنے کیفر کردار کو پہنچے مگر تم بھی جانتے ہو اور دنیا بھی جانتی ہے کہ تمہاری تلواروں میں یہ طاقت نہیں تھی کہ تم اتنے بڑے لشکر کا مقابلہ کر سکتے۔ تمہارا تجربہ ان سے کم تھا۔ تمہاری طاقت ان سے کم تھی۔ تمہارے سامان ان سے کم تھے۔ مگر اس کے باوجود جو تمہیں غلبہ نصیب ہوا اور تم نے کفار کے بڑے بڑے سرداروں کو خاک و خون میں لوٹا دیا تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ تمہاری پشت پر خدائی ہاتھ تھا اور اُس کے فرشتوں کی فوج تمہاری تائید میں نازل ہو رہی تھی۔ پھر فرماتا ہے۔ اَلْمُلْكُ یَوْمَئِذِ ۣ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ اُس دن بادشاہت سچ مچ خدائے رحمٰن کے قبضہ میں نظر آئے گی کیونکہ اُس دن خدائے رحمٰن کی وہ بات پوری ہوئی جو اُس نے سالہا سال پہلے مکہ میں سنا دی تھی کہ لَئِنْ لَّمْ یَنْتَهِ ۙ۬ لَنَسْفَعًۢا بِالنَّاصِیَةِ ۔ نَاصِیَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ (العلق:۱۶، ۱۷) اگر یہ کفار اسلام کی مخالفت سے باز نہ آئے اور وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کو جن کی پیشانی ہمیشہ خدائے واحد کے آستانہ پر جھکی رہتی ہے اسی طرح مکہ کی گلیوں میں گھسیٹتے رہے تو وہ یاد رکھیں کہ ہم بھی ایک دن اُن کی جھوٹی اور خطا کار پیشانی کے بالوں کو پکڑ کر نہایت سختی کے ساتھ گھسیٹیں گے۔ چنانچہ جب بدر کی جنگ ختم ہوئی تو

ابوجہل اور دوسرے سردارانِ قریش کو جو مسلمانوں کے ہاتھوں نہایت ذلّت کے ساتھ ہلاک ہوئے تھے۔ سر کے بالوں سے گھسیٹ کر ایک گڑھے میں ڈال دیا گیا اور لات و مناۃ اور ہبل کے پجاری خدائے واحد کی قہری تلوار کا نشانہ بن گئے۔

پھر فرماتا ہے۔ وَ كَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا۔ یہ دن کفار کے لئے بڑا سخت اور عبرت ناک ہوگا۔ چنانچہ دیکھ لو ابھی جنگ شروع بھی نہیں ہوئی تھی کہ عتبہ اور شیبہ اور ولید حضرت حمزہؓ اور حضرت علیؓ کے ہاتھوں خاک و خون میں تڑپنے لگے۔ اور پھر جنگ ختم ہوئی اور کفار میدان چھوڑ کر بھاگے تو ابوجہل نے مرتے وقت کس حسرت سے کہا کہ لَوْ غَيْرَ اَكَّارٍ قَتَلَنِيْ (بخاری کتاب المغازی باب شھود الملائکۃ بدراً) یعنی اے کاش میں کسی کسان کے ہاتھ سے قتل نہ ہوتا۔ ان الفاظ سے اُس کا اشارہ مدینہ کے اُن دو نوجوان لڑکوں کی طرف تھا جنہوں نے باز کی طرح اُس پر حملہ کیا اور جنگ کے شروع ہوتے ہی اُسے زخمی کر کے گرا دیا۔ چونکہ مکہ والے انصار کو بہت ذلیل سمجھتے تھے کیونکہ ان کا کام صرف زراعت کرنا اور سبزی ترکاری بیچنا تھا۔ اس لئے جب ابوجہل دو انصاری لڑکوں کے ہاتھ سے مارا گیا تو اُس نے بڑی حسرت سے کہا کہ کاش کسی معزز آدمی کے ہاتھ سے میری موت ہوتی مجھے صدمہ ہے کہ دو کسان لڑکوں نے مجھے مار ڈالا غرض کفار کے لئے یہ ایک ایسا سانحہ تھا جس نے اُن کے تمام کبر و غرور کو خاک میں ملا دیا۔ اور یسعیاہ نبی کی اُس پیشگوئی کو بھی روزِ روشن کی طرح سچا ثابت کر دیا کہ

> ’’عرب کے صحراء میں تم رات کو کاٹو گے۔ اے دوانیوں کے قافلو! پانی لے کے پیاسے کا استقبال کرنے آؤ۔ اے تیما کی سرزمین کے باشندو! روٹی لے کے بھاگنے والے کے ملنے کو نکلو۔ کیونکہ وے تلواروں کے سامنے سے ننگی تلوار سے اور کھچی ہوئی کمان سے اور جنگ کی شدت سے بھاگے ہیں۔ کیونکہ خداوند نے مجھ کو یوں فرمایا کہ ہنوز ایک برس ہاں مزدور کے سے ایک ٹھیک برس میں قیدار کی ساری حشمت جاتی رہے گی اور تیر اندازوں کے جو باقی رہے قیدار کے بہادر لوگ گھٹ جائیں گے کہ خداوند اسرائیل کے خدا نے یوں فرمایا۔‘‘ (یسعیاہ باب ۲۱ آیت ۱۳ تا ۱۷)

اس پیشگوئی میں یسعیاہ نبی نے جنگِ بدر کی خبر دیتے ہوئے بتایا تھا کہ ہجرت مدینہ پر ٹھیک ایک سال گذرنے پر عرب میں ایک ایسی جنگ ہوگی جس سے قیدار کی ساری حشمت جاتی رہے گی اور وہ پیٹھ دکھاتے ہوئے میدان جنگ سے بھاگ کھڑے ہوں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ کفار اپنے بڑے بڑے جرنیلوں کی لاشیں میدان جنگ میں چھوڑ کر بھاگ گئے اور مسلمانوں کی تمام عرب پر دھاک بیٹھ گئی۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ ان تباہیوں کے اسباب اور بواعث کا ذکر کرتا ہے۔اور فرماتا ہے کہ انسان ہمیشہ اپنے گندے جلیسوں کی وجہ سے تباہی کے گڑھے میں گرا کرتا ہے۔وہ پہلے تو اپنے دوستوں کی مصاحبت پر فخر کرتا ہے مگر جب اسے کسی مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ بے اختیار کہہ اٹھتا ہے کہ لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا اے کاش! میں فلاں کو اپنا دوست نہ بناتا۔اُس نے تو مجھے گمراہ کر دیا اسی وجہ سے قرآن کریم نے مومنوں کو یہ خاص طور پر نصیحت فرمائی ہے کہ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (التوبۃ:۱۱۹) یعنی اے مومنو! تم ہمیشہ صادقوں کی معیت اختیار کیا کرو۔حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے گردوپیش کی اشیاء سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔اگر وہ اپنی دوستی اور ہم نشینی کے لئے اُن لوگوں کا انتخاب کرے گا جو اعلیٰ اخلاق کے مالک ہوں گے اور جن کا مطمحِ نظر بلند ہوگا تو لازماً وہ بھی اپنی کمزوریوں کو دُور کرنے کی کوشش کرے گا اور رفتہ رفتہ اس کی یہ کوشش اُس کے قدم کو اخلاقی بلندیوں کی طرف بڑھانے والی ثابت ہوگی۔لیکن اگر وہ بُرے ساتھیوں کا انتخاب کرے گا تو وہ اُسے کبھی راہ راست کی طرف نہیں لے جائیں گے بلکہ اُسے اخلاقی پستی میں دھکیلنے والے ثابت ہوں گے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو ایک دفعہ ایک سکھ طالب علم نے جو گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتا تھا اور آپ سے عقیدت اور اخلاص رکھتا تھا کہلا بھیجا کہ پہلے تو مجھے خدا تعالیٰ کی ہستی پر بڑا یقین تھا مگر اب کچھ عرصہ سے مجھے شکوک پیدا ہونے شروع ہو گئے ہیں آپ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ میرے ان شکوک کو دُور فرمائے۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُسے کہلا بھیجا کہ معلوم ہوتا ہے تمہارے ساتھیوں میں سے کوئی شخص دہریت کے خیالات اپنے اندر رکھتا ہے جس کا تم پر اثر پڑ رہا ہے۔تم کالج میں جس جگہ بیٹھا کرتے ہو اُس جگہ کو بدل لو چنانچہ اُس نے اپنی سیٹ بدل لی اور کچھ دنوں کے بعد اُس کے خیالات کی خود بخود اصلاح ہو گئی (حقائق الفرقان جلد ۳ صفحہ ۳۲۰ سورۃ القصص)۔اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بُرے ساتھیوں کا انسان پر کتنا بُرا اثر پڑتا ہے۔یہی حکمت ہے جس کے ماتحت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس کسی مجلس میں تشریف رکھتے تھے تو بڑی کثرت سے استغفار فرمایا کرتے تھے تا کہ کوئی بری تحریک آپ کے قلبِ مطہر پر اثر انداز نہ ہو۔

لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ میں اَلذِّكْرِ سے مراد قرآن کریم ہے کیونکہ قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے عمل کے لئے نازل فرمایا ہے اور اس کا ایک نام الذکر بھی رکھا ہے۔جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر:۱۰) ہم نے ہی اس ذکر یعنی قرآن کریم کو اُتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔اسی طرح فرماتا ہے وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ (الانبیاء:۵۱) یہ قرآن ایک ایسا نصیحت نامہ ہے

جس میں تمام آسمانی کتابوں کی خوبیاں جمع کر دی گئی ہیں اور جس کو ہم نے اپنی خاص حکمتوں کے ماتحت نازل کیا ہے۔ کیا تم اس عظیم الشان کتاب کے منکر ہو؟ پھر فرماتا ہے۔ وَ اِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَ لِقَوْمِكَ (الزخرف:۴۵) یہ قرآن تیرے اور تیری تمام قوم کے لئے شرف کا موجب ہے۔ یعنی جو لوگ اس کتاب پر عمل کریں گے اللہ تعالیٰ انہیں بڑی عظمت اور بزرگی عطا فرمائے گا۔

اسی طرح ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَآءَهُمْ ۚ وَ اِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ۔ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ لَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ (حٰم السجدة:۴۲،۴۳) وہ لوگ جنہوں نے اس ذکر یعنی قرآن کریم کا انکار کیا جبکہ وہ اُن کے پاس آیا حالانکہ وہ بڑی عزت والی کتاب ہے وہ اپنی تباہی کا اپنے ہاتھوں سامان کر رہے ہیں۔ یہ کتاب وہ ہے کہ نہ باطل اس کے آگے سے آسکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے اور بڑی حکمتوں اور تعریفوں والے خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ ایسی عظیم الشان اور بابرکت کتاب جو انسانیت کے لئے شرف کا باعث ہے اور جس کی پیش کردہ سچائیوں کو نہ سابق علوم غلط ثابت کر سکے ہیں اور نہ موجودہ زمانہ کے علوم اس کی کسی بات کو غلط قرار دے سکے ہیں۔ اس سے اگر کوئی شخص اعراض کرتا ہے تو وہ یقیناً اپنی ہلاکت اور بربادی اپنے ہاتھوں مول لیتا ہے۔ یہ کتاب خدا تعالیٰ نے اس لئے نازل کی ہے کہ بنی نوع انسان اسے پڑھیں۔ اس کے علوم کو سیکھیں۔ اپنے اہل و عیال کو سکھائیں۔ اور پھر تمام دنیا میں اُسے پھیلاتے چلے جائیں۔ یہاں تک کہ دنیا کے چپہ چپہ پر خدائے واحد کی حکومت قائم ہو جائے اور اسود و احمر تک خدا تعالیٰ کا نام اور اس کا پیغام پہنچ جائے۔ جو لوگ اس کتاب کو اپنا دستور العمل بنا لیں گے وہ دنیا میں بھی سربلند ہوں گے اور آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ کے انعامات کے وارث ہوں گے۔ مگر وہ لوگ جو اُسے پس پشت پھینک دیں گے وہ عذاب کے وقت اپنے بُرے ساتھیوں اور ہم نشینوں پر لعنتیں ڈالیں گے جو اُن کی گمراہی کا باعث ہے مگر اُس وقت نہ اُن کا افسوس ان کے کسی کام آئے گا اور نہ ان کا اپنے ساتھیوں پر لعنتیں ڈالنا انہیں کسی عذاب سے بچا سکے گا۔ کیونکہ اس کے نتیجہ کی ذمہ داری خود اُن پر ہوگی۔ کسی اور پر نہیں۔

وَ قَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ

اور رسول نے کہا۔اے میرے رب! میری قوم نے تو اس قرآن کو

مَهْجُوْرًا ﴿۳۱﴾

پیٹھ کے پیچھے پھینک دیا ہے۔

حلّ لُغات۔مَهْجُوْرًا مھجورًا ھَجَرَ سے اسم مفعول کا صیغہ ہے اور ھَجَرَہٗ کے معنے ہیں تَرَکَہٗ وَاَعْرَضَ عَنْہُ اس کو چھوڑ دیا اور اس سے منہ موڑ لیا (اقرب) مفردات میں ہے۔اَلْھَجْرُ وَالْھِجْرَانُ مُفَارَقَةُ الْاِنْسَانِ غَيْرَہٗ اِمَّا بِالْبَدَنِ أَوْ بِاللِّسَانِ اَوْ بِالْقَلْبِ کہ کسی سے انسان بدنی لحاظ سے علیحدہ ہو جائے اور مفارقت اختیار کرے یا اس سے کلام نہ کرے یا دلی لگاؤ اس کے ساتھ نہ رکھے تو اس وقت ھَجَر کا لفظ بولتے ہیں۔ وَقَوْلُهٗ تَعَالٰى اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا فَهٰذَا هَجْرٌ بِالْقَلْبِ اور آیت قرآنیہ میں جو آیا ہے کہ رسول اللہ فرمائیں گے کہ میری قوم نے قرآن مجید کو چھوڑ دیا ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کا دلی لگاؤ اس کے ساتھ نہیں رہے گا۔(مفردات)

تفسیر۔فرماتا ہے۔قیامت کے دن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کے حضور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہیں گے کہ خدایا میری قوم نے تیرے اس قرآن کو بالکل چھوڑ دیا۔اور اپنی پیٹھ کے پیچھے ڈال دیا۔یہ ایک نہایت مختصر سا فقرہ ہے مگر اس میں ایسا درد بھرا ہوا ہے کہ یہ میرے سامنے کبھی نہیں آیا کہ میرا دل اس کو پڑھ کر کانپ نہ گیا ہو۔دیکھو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ نہیں فرماتے کہ اے میرے رب! میری قوم نے قرآن کو بالکل ترک کر دیا حالانکہ یہ کہنا بھی کافی تھا۔بلکہ فرماتے ہیں۔اے میرے رب! میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ دیا یہاں ھٰذَا کا لفظ بہت ہی درد اور افسوس کو ظاہر کر رہا ہے فرماتے ہیں۔خدایا تُو نے میری قوم کو یہ ایک ایسی اعلیٰ درجہ کی نعمت دی تھی اور ایسی بابرکت کتاب بخشی تھی کہ جس کی دنیا میں اور کوئی مثال نہ تھی۔مگر میری قوم نے اس کو بھی چھوڑ دیا۔دنیا میں دھیلے دمڑی کی چیز کو تو کوئی چھوڑتا نہیں لیکن ایسے قرآن کو جس کے مقابل میں ساری دنیا کا مال ومتاع بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتا چھوڑ دیا گیا اور اسے پیٹھ کے پیچھے پھینک دیا گیا۔

اس جگہ قوم کے مصداق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے آپ کو نہ مانا۔

مگر آج کل کے مسلمان بھی اس کے مخاطب ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی کہلانے کے باوجود قرآن کریم کو بالکل چھوڑ بیٹھے ہیں۔ وہ قرآن جو اُن کی ہدایت کے لئے آیا تھا اور جس کے متعلق خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ انسان کو اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ تک پہنچانے کے لئے آیا ہے اُس کو آج کل اس طرح استعمال کیا جاتا ہے کہ زندگی بھر تو قرآن کا ایک لفظ بھی اُن کے کانوں میں نہیں پڑتا لیکن جب کوئی مرجائے تو اُس کو قرآن سنایا جاتا ہے حالانکہ مرنے پر سوال تو یہ ہونا ہے کہ بتاؤ تم نے اس پر کیا عمل کیا نہ یہ کہ مرنے کے بعد تمہاری قبر پر کتنی بار قرآن ختم کیا گیا۔ پھر ایک استعمال اس کا یہ ہے کہ ضرورت پڑے تو آٹھ آنے لے کر اُس کی جھوٹی قسم کھالی جاتی ہے اور اس طرح اسے دوسروں کے حقوق دبانے کا ایک آلہ بنایا جاتا ہے۔ تیسرے اس طرح کہ مُلّاں اس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ جب کوئی مرجاتا ہے تو اُس کے وارث قرآن لاتے ہیں کہ اس ذریعہ سے اس کے گناہ بخشوائیں۔ اور مُلّا نے ایک حلقہ سا بنا کر بیٹھ جاتے ہیں اور قرآن ایک دوسرے کو پکڑاتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں نے یہ تیری مِلک کی۔ اس طرح وہ سمجھتے ہیں کہ مُردہ کے گناہوں کا اسقاط ہو گیا مگر مردہ کے گناہوں کا کیا اسقاط ہونا ہے ان ملانوں اور اس مردہ کے وارثوں کے ایمانوں کا اسقاط ہو جاتا ہے۔ پھر ایک استعمال اس کا یہ ہے کہ مُلانے آٹھ آٹھ آنے کے قرآن لے آتے ہیں اور جب کسی کے ہاں کوئی مرجاتا ہے اور وہ قرآن لینے آتا ہے تو اُسے بہت سی قیمت بتادی جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ تو ایک روپیہ سے بھی کم قیمت کا ہے تو ملّاں صاحب کہتے ہیں۔ قرآن کیا سستے داموں بِک سکتا ہے۔ تھوڑی قیمت پر تو اس کا بیچنا منع ہے خود قرآن میں آتا ہے لَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا (البقرة:۴۲) کہ میری آیتوں کے بدلے میں تھوڑی قیمت مت لو۔ اس لئے اس کی تھوڑی قیمت نہیں لی جاسکتی۔ مگر وہ نادان نہیں جانتے کہ قرآن نے تو یہ بھی فرمایا ہے کہ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ (النساء:۷۸) کہ دنیا کا سب مال و متاع ایک حقیر چیز ہے۔ پھر کسی دنیوی چیز کے بدلہ میں اسے بیچنا کس طرح جائز ہوا؟ دراصل اس آیت میں ثَمَنًا قَلِيْلًا کے یہ معنے ہیں کہ دنیا کے بدلے اسے نہ بیچو۔ نہ یہ کہ تھوڑی قیمت نہ لو۔ پھر ایک استعمال اس کا یہ رہ گیا ہے کہ اسے عمدہ غلاف میں لپیٹ کر دیوار سے لٹکا دیتے ہیں۔ پھر ایک استعمال اس کا یہ ہے کہ جزدان میں ڈال کر گلے میں لٹکا لیتے ہیں تا کہ عوام سمجھیں کہ بڑے بزرگ اور پارسا ہیں ہر وقت قرآن پاس رکھتے ہیں۔ غرض آج ''مسلمانان در گور و مسلمانی در کتاب'' والی بات نظر آتی ہے۔ اسلام کا نشان صرف قرآن کریم اور احادیثِ صحیحہ اور کتبِ ائمہ میں ملتا ہے اس کا نشان لوگوں کی زندگیوں میں کہیں نہیں ملتا۔ پچھتّر فیصدی مسلمان نماز کے تارک ہیں۔ زکوٰۃ اوّل تو دیتے ہی نہیں اور جو دیتے ہیں اُن میں سے جو اپنی خوشی سے دیتے ہیں وہ شاید سو میں سے دو نکلیں۔ حج جن پر فرض ہے وہ اس کا نام نہیں لیتے اور جن کے لئے نہ صرف یہ کہ فرض

نہیں بلکہ بعض حالات میں ناجائز ہے وہ اپنی رسوائی اور اسلام کی بدنامی کرتے ہوئے حج کے لئے پہنچ جاتے ہیں۔ نماز کا ترجمہ تو عربی بولنے والے ممالک کے سوا شاید مسلمانوں میں دو چار فیصدی ہی جانتے ہوں مگر وہ بے معنی نماز بھی جو لوگ پڑھتے ہیں اُسے اس طرح چٹی سمجھ کر پڑھتے ہیں کہ رکوع اور سجدے میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور نماز میں اپنی زبان میں دعا مانگنا تو کفر ہی سمجھا جانے لگا ہے۔ روزہ اوّل تو کوئی لوگ رکھتے ہی نہیں اور جو لوگ رکھتے ہیں وہ جھوٹ اور غیبت سے اُسے موجبِ ثواب بنانے کی بجائے موجبِ عذاب بنا لیتے ہیں۔ ورثہ کے احکام پسِ پشت ڈالے جاتے ہیں۔ سود جس کا لینا خدا سے جنگ کرنے کے مترادف قرار دیا گیا ہے علماء کی مدد سے ہزاروں حیلوں اور بہانوں کے ساتھ اس کی وہ تعریف کی گئی ہے کہ اب شاید ہی کوئی سود کی لعنت سے محفوظ ہو۔ اخلاقِ فاضلہ جو کسی وقت مسلمان کا ورثہ اور اُس کا حق سمجھے جاتے تھے اب مسلمانوں سے اس قدر دُور ہیں جس قدر کفر اسلام سے۔ کسی زمانے میں مسلمان کا قول نہ ٹلنے والی تحریر سمجھا جاتا تھا۔ اور اس کا وعدہ ایک نہ بدلنے والا قانون مگر آجکل مسلمان کی بات سے زیادہ اور کوئی غیر معتبر قول نہیں اور اس کے وعدے سے زیادہ اور کوئی بے حقیقت شے نظر نہیں آتی۔ یہ تباہی جو عملی اور اعتقادی لحاظ سے مسلمانوں پر آئی اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ انہوں نے قرآن کریم کو چھوڑ دیا اور اس پر عمل کرنا ترک کر دیا۔ اگر وہ قرآن کریم پر عمل کرتے تو جس طرح صحابہؓ ساری دنیا پر غالب آ گئے تھے۔ اسی طرح وہ بھی غالب آ جاتے اور کفر اور شیطنت کا نشان تک دنیا سے مٹ جاتا۔ میں نے اپنی جماعت کے دوستوں کو بھی بارہا توجہ دلائی ہے کہ وہ اپنی اپنی جماعتوں میں قرآن کریم کے درس کا باقاعدہ انتظام کریں لیکن مجھے افسوس ہے کہ ابھی تک جماعتوں نے اس طرف پوری توجہ نہیں کی حالانکہ قرآن کریم اپنے اندر اتنی برکات رکھتا ہے کہ قیامت کے دن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کے حضور کھڑے ہو کر کہیں گے کہ اے میرے خدا مجھے اپنی قوم کے افراد پر انتہائی افسوس ہے کہ میں نے تیرا محبت بھرا پیغام اُن تک پہنچایا مگر بجائے اس کے کہ وہ تیرے پیغام کو سن کر شادیٔ مرگ ہو جاتے۔ بجائے اس کے کہ وہ اسے سن کر ممنون ہوتے۔ بجائے اس کے کہ اسے سُن کر ان کے جسم کا ہر ذرّہ اور اُن کے دل کی ہر تار کانپنے لگ جاتی۔ بجائے اس کے کہ وہ اس مژدۂ جانفزا کو سُن کر عقیدت اور اخلاص سے اپنے سر جھکا دیتے اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا انہوں نے تیرے پیغام کو اپنی پیٹھوں کے پیچھے پھینک دیا اور کہا کہ جاؤ ہم اس کی پرواہ نہیں کرتے۔ بیشک اندھی دُنیا خدا تعالیٰ کے پیغام کے ساتھ یہی سلوک کرتی چلی آئی ہے مگر وہ دنیا جو یہ جانتی نہیں کہ خدا تعالیٰ کیا ہے اور اس کا رسول کتنی بڑی شان رکھتا ہے وہ جو کچھ کرتی ہے اُسے کرنے دو۔ میں اس مومن سے پوچھتا ہوں جو کہتا ہے کہ خدا ہے جو جانتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے کلام کی کیا عظمت ہے۔ جو سمجھتا

ہے کہ خدا تعالیٰ کا بندے کو مخاطب کرنا خواہ وہ بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ ایک عظیم الشان انعام ہے کہ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے کلام کو سُنتا اور پھر اس کا جواب نہیں دیتا۔ اور اس پر عمل کرنے کے لئے اس کے دل میں کوئی ولولہ پیدا نہیں ہوتا۔ حالانکہ بسم اللہ کی ب سے لے کر والنّاس کے س تک قرآن کریم کا ایک ایک کلمہ۔ اس کا ایک ایک لفظ اور اس کا ایک ایک حرف خدا تعالیٰ کی طرف سے بندے کے لئے سلام کا پیغام لے کر آیا ہے اور اپنے اندر اتنی طاقت رکھتا ہے کہ اگر اب بھی مسلمان خدا تعالیٰ کے پیغام کے جواب کے لئے تیار ہو جائیں اور اس کی اطاعت کے لئے اپنے دلوں کے دروازے کھول دیں تو یقیناً اُن کی دنیا بدل سکتی ہے۔

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ؕ وَ كَفٰى

اور ہم نے اسی طرح مجرموں میں سے سب نبیوں کے دشمن بنائے ہیں اور تیرا رب ہدایت دینے اور

بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّ نَصِيْرًا ﴿۳۲﴾

مدد کرنے کے لحاظ سے (بالکل) کافی ہے۔

تفسیر ۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کوئی عجیب بات نہیں۔ آج تک دنیا میں کوئی بھی نبی ایسا نہیں آیا جس کی مخالفت نہ کی گئی ہو اور جس کو تباہ کرنے کے لئے دشمنانِ انبیاء نے ایڑی چوٹی کا زور نہ لگایا ہو۔ مگر تاریخ شاہد ہے کہ ہر قسم کی مخالفت کے باوجود آخر یہی نتیجہ نکلا کہ نبی اور اس کے ماننے والے جیتے اور مخالفت کرنے والے خواہ وہ کتنی بڑی طاقتوں کے مالک تھے تباہ اور برباد ہوئے۔ یہ ایک ایسا کلیہ ہے جس کے خلاف ہمیں دنیا میں کوئی نظیر نظر نہیں آتی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آدمؑ اپنے دشمنوں پر غالب نہ آیا ہو یا نوحؑ نے اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں کامیابی حاصل نہ کی ہو۔ یا ابراہیمؑ اپنے مشن میں کامیاب نہ ہوا ہو۔ یا موسیٰؑ نے فرعون پر غلبہ نہ پایا ہو۔ یا عیسیٰؑ نے یہود پر فتح حاصل نہ کی ہو یا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شدید مخالفت کے باوجود فتح وظفر نے آپ کے قدموں کو نہ چوما ہو۔ ان تمام انبیاء کے زمانہ میں شیطان نے اپنے پورے ساز و سامان کے ساتھ خدائی جماعتوں پر حملہ کیا اور ہر قسم کے ذلیل ہتھیاروں سے اُس نے صداقت کو مٹانا چاہا مگر ایک دفعہ بھی ایسا نہیں ہوا کہ خدا تعالیٰ کا کوئی نبی ہارا ہو اور شیطان جیتا ہو۔ بیشک نبیوں کو کہا گیا کہ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا (ابراھیم: ۱۴) ہم یقیناً تمہیں اپنے ملک سے نکال دیں گے یا تم ہمارے مذہب کی طرف لوٹ آ ؤ

گے۔ بلکہ انہیں یہاں تک دھمکی دی گئی کہ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَ لَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ (یٰس:۱۹) اگر تم نے اپنی تعلیم کو ترک نہ کیا تو ہم تمہیں سنگسار کر دیں گے۔ اور تمہیں دردناک عذاب پہنچائیں گے۔ مگر ان تمام دھمکیوں کے باوجود بلکہ ان دھمکیوں کو عملی جامہ پہنانے کے باوجود جب نتیجہ نکلا تو یہی دکھائی دیا کہ کفر زمین پر اوندھے منہ گرا ہوا ہے اور صداقت اپنی کامیابی پر مُسکرا رہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انبیاء کی مخالفت خدا تعالیٰ کی اُن مخفی تدابیر میں سے ایک بڑی اہم تدبیر ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے پیغام کو وسعت دیتا اور اس کے حلقۂ اثر کو وسیع کرتا ہے۔ جب مخالفت کا طوفان اُمڈ آتا ہے تو لوگوں میں ایک تہلکہ مچ جاتا ہے اور سعید طبع لوگ غور کرنے لگ جاتے ہیں کہ آخر یہ شخص کیا کہتا ہے اور اس کی کیوں مخالفت کی جاتی ہے۔ اور جب وہ تحقیق کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اُن کے سینوں کو کھول دیتا ہے اور وہ بھی صداقت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ پس مخالفت انبیاء کی آواز لوگوں کے کانوں تک پہنچانے کا ایک زبردست ذریعہ ہے جس سے جھوٹے مدعیانِ ماموریت قطعی طور پر محروم ہوتے ہیں۔ یُوں تو وہ بھی عجیب و غریب دعوے دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں مگر لوگ اُن کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے۔ بلکہ وہ اُن کے دعووں کو ایک مجنونانہ بَڑ سے زیادہ کوئی وقعت نہیں دیتے۔ وہ بسا اوقات خود بھی چاہتے ہیں کہ لوگ اُن کی مخالفت کریں تا کہ ہر کہ و مہ کی زبان پر اُن کا نام ہو اور لوگوں میں اُن کا چرچا ہو۔ مگر کوئی اُن کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ اور وہ گوشۂ گمنامی میں کس مپرسی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور کسمپرسی کی حالت میں ہی گمنامی کی موت مر جاتے ہیں۔ لیکن خدا تعالیٰ کی طرف سے جب کوئی مامور مبعوث ہوتا ہے تو بڑے کیا اور چھوٹے کیا اور عالم کیا اور جاہل کیا اور مرد کیا اور عورتیں کیا اور طاقتور کیا اور کمزور کیا سب کے سب مخالفت کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور ہر شخص جو اس پر تیر چلاتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ اُس نے بڑے ثواب کا کام کیا ہے مگر یہی مخالفت ایک دن سعید الفطرت انسانوں کو جھنجھوڑ کر انہیں کشاں کشاں اللہ تعالیٰ کے دروازہ کی طرف لے آتی ہے۔ چنانچہ دیکھ لو مکّہ والوں کی شدید مخالفت ہی تھی جس نے حبشہ میں اسلام کا نام پہنچایا۔ اور پھر مکّہ والوں کی شدید مخالفت ہی تھی جس نے مدینہ مَنوّرہ میں اسلام کا نام پہنچایا۔ پھر یہی مخالفت تھی جس کے نتیجہ میں خود مکّہ کے بڑے بڑے معاندین کے اپنے بیٹے اور بھائی اور رشتہ دار اسلام کی آغوش میں آ گئے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی جانیں قربان کرنے لگ گئے۔ باوجود اس کے کہ مکّہ والوں نے انہیں ہر قسم کی اذّیتوں کا تختۂ مشق بنایا انہیں پتھروں پر گھسیٹا گیا۔ انہیں تپتی ریت پر لٹایا گیا اُن کی عورتوں کی شرمگاہوں میں نیزے مار مار کر انہیں مارا گیا۔ اُن کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں ڈالی گئیں۔ انہیں اپنے وطن سے بے وطن کیا گیا۔ اُن کی ٹانگوں کو

اونٹوں سے باندھ کر اور پھر اونٹوں کو مخالف اطراف میں دوڑا کر انہیں ٹکڑے ٹکڑے کیا گیا۔لیکن ان تمام تکالیف کے باوجود وہ پروانوں کی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد چکر لگاتے رہے اور آپ پر اپنی جانیں نچھاور کرتے رہے۔پس گو شیطان صداقت کا ازلی دشمن ہے اور اُس کی کوشش ہمیشہ یہی ہوتی ہے کہ صداقت کا نشان تک دنیا سے مٹ جائے۔مگر آخر شیطان ہی صداقت کی اشاعت کا ایک ہتھیار بن جاتا ہے۔اور بھولے بھٹکے انسانوں کو آستانۂ الوہیّت کی طرف کھینچ لاتا ہے اس لئے جَعَلْنَا کہہ کر اللہ تعالیٰ نے اس تدبیر کو اپنی طرف منسوب کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ لمّۂ شر ہم نے اپنی حکمتِ کاملہ سے خود پیدا کیا ہے اور چونکہ یہ اعتراض پیدا ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا کیوں کیا کہ ایک طرف تو وہ اپنے پیاروں کو مبعوث فرماتا ہے اور دوسری طرف دشمنوں کو اُن پر کُتّوں کی طرح مسلط کر دیتا ہے۔اس لئے اس کا جواب یہ دیا کہ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّ نَصِيْرًا۔تیرا رب لوگوں کو ہدایت دینے اور اپنے ماموروں کی معجزانہ مدد کرنے کے لحاظ سے بڑا کافی ہے۔یعنی بظاہر تو یہ مخالفتیں تمہیں قابلِ اعتراض نظر آتی ہیں لیکن انہی مخالفتوں کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ کا ہادی اور اُس کا نصیر ہونا ظاہر ہوتا ہے۔جب مخالفت ترقی کرتی ہے تو جماعت کو بھی ترقی حاصل ہوتی ہے اور جب مخالفت بڑھتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی معجزانہ تائیدات اور نصرتیں بھی بڑھ جاتی ہیں۔اسی لئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں جب کوئی دوست یہ ذکر کرتے کہ ہمارے ہاں بڑی مخالفت ہے تو آپ فرماتے یہ تمہاری ترقی کی علامت ہے۔جہاں مخالفت ہوتی ہے وہاں جماعت بھی بڑھتی ہے کیونکہ مخالفت کے نتیجہ میں کئی ناواقف لوگوں کو بھی سلسلہ سے واقفیت ہو جاتی ہے۔اور پھر رفتہ رفتہ اُن کے دل میں سلسلہ کی کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا ہو جاتا ہے اور جب وہ کتابیں پڑھتے ہیں تو صداقت اُن کے دلوں کو موہ لیتی ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں ایک دفعہ ایک دوست حاضر ہوئے اور انہوں نے آپ کی بیعت کی۔بیعت لینے کے بعد حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُن سے دریافت فرمایا کہ آپ کو کس نے تبلیغ کی تھی وہ بے ساختہ کہنے لگے۔مجھے تو مولوی ثناء اللہ صاحب نے تبلیغ کی ہے۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حیرت سے فرمایا وہ کس طرح؟ وہ کہنے لگے میں مولوی صاحب کا اخبار اور اُن کی کتابیں پڑھا کرتا تھا۔اور میں ہمیشہ دیکھتا کہ اُن میں جماعت احمدیہ کی شدید مخالفت ہوتی تھی۔ایک دن مجھے خیال آیا کہ میں خود بھی تو اس سلسلہ کی کتابیں دیکھوں کہ ان میں کیا لکھا ہے اور جب میں نے ان کتابوں کو پڑھنا شروع کیا تو میرا سینہ کھل گیا اور میں بیعت کے لئے تیار ہو گیا۔تو مخالفت کا پہلا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے الٰہی سلسلہ کو ترقی حاصل ہوتی ہے اور کئی لوگوں کو ہدایت میسر آ جاتی ہے پھر دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معجزانہ تائید اور نصرت کے نشانات ظاہر ہونے لگ

جاتے ہیں۔ جب مخالفت اپنے انتہاء کو پہنچ جاتی ہے تو مومنوں کی عاجزانہ دُعائیں اللہ تعالیٰ کی نصرت کو آسمان سے کھینچ لاتی ہیں۔ اور اُس کی قہری تجلی بڑے بڑے دشمنوں کو ہلاک کر دیتی ہے۔ فرعون جب اپنے لاؤلشکر کے ساتھ بنی اسرائیل کے تعاقب میں چلا آ رہا تھا تو صرف چند منٹ پہلے وہ سمجھتا تھا کہ میں کامیاب ہو گیا۔ اور بنی اسرائیل یہ سمجھتے تھے کہ ہم مارے گئے بلکہ خود انہوں نے چلّا چلّا کر یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ اے موسیٰؑ! ہم تو پکڑے گئے۔ مگر موسیٰؑ جس کا اپنے خدا پر کامل ایمان تھا اُس نے کہا كَلَّا ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ (الشعراء: ۶۳) میرا رب میرے ساتھ ہے اور وہ میرے لئے اس بلائے عظیم سے نجات کا کوئی نہ کوئی راستہ ضرور پیدا کر دے گا۔ چنانچہ تھوڑی ہی دیر کے بعد موسیٰؑ تو سمندر کے پار پہنچ چکے تھے اور فرعون اور اس کی فوجیں سمندر کی لہروں میں غوطے کھا رہی تھیں۔ غرض مخالفت بھی اشاعتِ ہدایت کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے اور اس کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ کا ہادی اور اُس کا نصیر ہونا بڑی شان سے ظاہر ہوتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً

اور کافروں نے کہا کیوں نہ قرآن اس (نبی) پر ایک ہی دفعہ نازل کر دیا گیا۔ اُن کا کہنا بھی ایک طرح ٹھیک ہے

وَّاحِدَةً ۛ كَذٰلِكَ ۛ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ

لیکن ہم نے اس کو مختلف سورتوں اور وقتوں میں اس لئے اُتارا کہ ہم اس (قرآن) کے ذریعہ سے تیرے دل کو مضبوط

تَرْتِيْلًا ﴿۳۳﴾ وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَ

کرتے رہیں اور ہم نے اس کو نہایت عمدہ بنایا ہے۔ اور (تیری تردید کے لئے) وہ کوئی بات نہیں کہتے کہ ہم اس کے

اَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ﴿۳۴﴾ ط

جواب میں ایک پختہ بات بیان نہیں کر دیتے اور اس کی اچھی سے اچھی توجیہہ نہیں کر دیتے۔

حلّ لُغات ۔ رَتَّلْنٰهُ رَتَّلَ الْكَلَامَ کے معنے ہیں اَحْسَنَ تَاْلِيْفَهٗ اُس نے اپنے کلام یا مضمون کو نہایت عمدگی سے مرتب کیا اور رَتَّلَ الْقُرْاٰنَ کے معنے ہیں اُس نے قرآن کریم کی خوش آوازی سے تلاوت کی۔ پس رَتَّلْنٰهُ کے معنے ہوں گے ہم نے قرآن کریم کی ترتیب نہایت اعلیٰ درجہ کی رکھی ہے۔

تفسیر ۔ان آیات میں کفار کے اس اعتراض کا جواب دیا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سارا قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نازل نہیں ہوگیا۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خدا کا کلام نہیں بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے حسب موقع خود تصنیف کر لیتے ہیں ۔فرماتا ہے یہ درست ہے واقعہ میں یہ قرآن ایک ہی دفعہ نہیں اُترا بلکہ آہستہ آہستہ ایک لمبی مدّت میں نازل ہوا ہے ۔مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اس طریق سے تیرے دل کو ثبات بخشنا چاہتے ہیں۔اور پھر ہم نے اس کی ترتیب بھی نہایت اعلیٰ درجہ کی رکھی ہے۔اسی طرح قرآن کریم کو آہستہ آہستہ نازل کرنے کا ایک یہ بھی فائدہ ہے کہ کوئی بات جو اعتراض کے طور پر یہ لوگ بیان کر دیتے ہیں تو ہم اس کے مقابلہ میں حق اور بہتر تفسیر قرآن کریم میں بیان کر دیتے ہیں۔

تعجب ہے کہ عیسائی مستشرقین اب بھی یہی اعتراض کرتے رہتے ہیں کہ قرآن کریم کا ٹکڑے ٹکڑے نازل ہونا بتاتا ہے کہ یہ خدا کا کلام نہیں بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی تصنیف ہے۔آخر خدا کو کیا ضرورت تھی کہ اپنا کلام ٹکڑے ٹکڑے کر کے نازل کرتا اُسے تو اگلا پچھلا سب حال معلوم ہوتا ہے اور وہ اپنا کلام یکدم بھی نازل کر سکتا ہے۔اس کا آہستہ آہستہ ایک کتاب کی صورت میں مرتب ہونا بتاتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسے جیسے حالات پیش آتے جاتے تھے ویسا ہی وہ اُن کا قرآن کریم میں ذکر کر دیتے تھے (A Comprehensive Commentary on the Quran by Wherry The Preliminary Discourse sec iii pg 107,108)۔

اللہ تعالیٰ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ ہم نے اپنے کلام کے نزول کے لئے یہ طریق اس لئے اختیار کیا ہے کہ ہم اس کے ذریعہ تیرے دل کو مضبوط کرنا چاہتے ہیں ۔گویا قرآن کریم کا ٹکڑے ٹکڑے نازل ہونا خدا تعالیٰ کی کسی کمزوری کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کو ثبات اور طاقت حاصل ہو۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے آہستہ آہستہ نازل ہونے سے آپؐ کے دل کی مضبوطی کس طرح ہو سکتی تھی سو اس کے متعلق چند امور کا بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

(۱) پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر ایک ہی دفعہ سارا قرآن نازل ہو جاتا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے استدلال کرتے رہتے تو آپؐ کے دل کو ایسی تقویت حاصل نہیں ہوسکتی تھی ۔جیسے کسی امر کے متعلق فوراً کلام الٰہی کے اترنے سے ہوسکتی ہے۔ چنانچہ دیکھ لو۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو جو لطف اس میں آتا ہوگا کہ آپؐ کوئی کام کرتے اور اس کے متعلق اُسی وقت وحی نازل ہو جاتی اور خدا تعالیٰ اپنی مرضی اور منشاء کا اظہار کر دیتا۔وہ لطف ہمیں

اجتہاد سے کہاں حاصل ہوسکتا ہے۔آپ کو تو جب بھی کوئی اہم واقعہ پیش آتا اُس کے متعلق آپؐ پر کلام الٰہی نازل ہو جاتا اور اس طرح آپ کو معلوم ہو جاتا کہ اس بارہ میں خدا تعالیٰ کا کیا منشاء ہے۔اگر اجتہاد سے ہی آپؐ آیاتِ قرآنیہ کو کسی واقعہ پر چسپاں کرتے تو اس سے آپؐ کو وہ لطف نہ آتا جو اس صورت میں آتا تھا۔

(۲) قرآن کریم کا آہستہ آہستہ نزول تثبیتِ فؤاد کا اس طرح بھی موجب بنا کہ جو کتاب ساری دنیا کے عمل کے لئے آئی ہو اُسے محفوظ رکھنا بھی ضروری تھا۔اگر قرآن ایک ہی دفعہ سارے کا سارا نازل ہو جاتا تو اُسے وہی شخص حفظ کر سکتا جو اس کے لئے اپنی زندگی وقف کر دیتا۔لیکن آہستہ آہستہ اُترنے کے نتیجہ میں سینکڑوں لوگ اس کو یاد کرنے کے لئے تیار ہو گئے اور اپنے دوسرے کاروبار کے ساتھ اسے بھی حفظ کرتے گئے۔اس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا دل اس یقین سے لبریز ہو گیا کہ یہ کتاب ضائع نہیں ہوگی بلکہ قیامت تک محفوظ رہے گی۔یہی وجہ تھی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت بہت کثرت سے ایسے لوگ پائے جاتے تھے۔جنہیں قرآن کریم حفظ تھا۔مگر اب اُس نسبت کے لحاظ سے کم ہوتے ہیں اس لئے کہ تھوڑا تھوڑا نازل ہونے کی وجہ سے بہت لوگ اُسے ساتھ ساتھ یاد کرتے جاتے تھے۔

(۳) تیسری حکمت تھوڑا تھوڑا نازل ہونے میں یہ ہے کہ ایک ہی دفعہ سارا قرآن نازل ہونے کی وجہ سے وہ لوگوں کے قلوب میں اچھی طرح راسخ نہیں ہوسکتا تھا۔اب ایک ہندو جب مسلمان ہوتا ہے تو اُسے اسلامی احکام پر عمل کرنے والے مسلمان نظر آتے ہیں اس لئے وہ گھبراتا نہیں اور ان احکام پر عمل کرنا بوجھ نہیں سمجھتا لیکن اگر کسی کو کوئی کتاب لکھ کر دے دی جائے کہ اس پر عمل کرو اور کوئی نمونہ اس کے سامنے موجود نہ ہو تو وہ سو سال میں بھی اس پر عمل کرنا نہیں سیکھ سکتا پس قرآن کریم کی تعلیم کو قلوب میں راسخ کرنے کے لئے ضروری تھا کہ اُسے آہستہ آہستہ نازل کیا جاتا۔ایک حکم پر جب لوگ عمل کرنا سیکھ جاتے تو دوسرا نازل ہوتا دوسرے حکم پر عمل کرنا سیکھ جاتے تو تیسرا نازل ہوتا اور اس طرح سارے احکام پر عمل کرایا جاتا۔

(۴) اگر ایک ہی وقت میں سارا قرآن نازل ہوتا تو اس کی ترتیب وہی رکھنی پڑتی جواب ہے۔لیکن یہ ترتیب اس وقت رکھی جاتی خطرناک ہوتی جس طرح ہمارے لئے اب وہ ترتیب خطرناک ہے جس کے مطابق قرآن نازل ہوا تھا۔اگر نمازوں اور روزوں وغیرہ کے احکام شروع میں ہوتے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ثابت نہ ہو چکی ہوتی تو وہ سمجھ میں ہی نہ آتے اس کے لئے پہلے اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور اُس کی توحید اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ثابت کرنے کی ضرورت تھی اور یہ بتانا ضروری تھا کہ خدا تعالیٰ موجود ہے اور وہ ایک ہی ہے

اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے سچے رسول ہیں۔اس کے بعد عمل کی دعوت کا موقعہ تھا جس کے لئے احکام سکھائے جاتے مگر اب یہ ترتیب ضروری نہیں ہے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ کی توحید اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کو ماننے والی ایک بڑی بھاری جماعت موجود ہے۔اب جو شخص بھی اسلام میں داخل ہوتا ہے وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور اسلام کی خوبیوں سے واقف ہو کر آتا ہے اس لئے اُس کے لئے قرآن کریم کی اُسی ترتیب کی ضرورت ہے جو اب ہے۔پس قرآن کے ایک ہی دفعہ نازل ہونے سے یہ نقص پیش آتا کہ اُس کی موجودہ ترتیب اس زمانہ کے لوگوں کو سمجھ میں ہی نہ آسکتی مثلاً اگر سورۂ بقرہ شروع میں ہی نازل ہو جاتی تو ذٰلِكَ الْكِتٰبُ کو کون مسلمان سمجھ سکتا۔وہ تو یہ الفاظ سن کر حیران ہو جاتا اور کہتا کہ کتاب تو کوئی ہے ہی نہیں پھر اس میں کس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔لیکن قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کو ہر مسلمان اس وقت سمجھ سکتا تھا جس طرح آج ذٰلِكَ الْكِتٰبُ کو ہر مسلمان سمجھتا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کی ایک کامل کتاب اُس کے سامنے موجود ہے۔

(۵) اگر ایک ہی دفعہ سارا قرآن نازل ہو جاتا تو ایک حصہ میں دوسرے حصہ کی طرف اشارہ نہیں ہو سکتا تھا۔ مثلاً قرآن کریم میں یہ پیشگوئی تھی کہ ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دشمنوں کے نرغہ سے نکال کر صحیح وسلامت لے جائیں گے۔اگر ایک ہی دفعہ سارا قرآن نازل ہو جاتا تو جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ لے جایا گیا تھا اُس وقت یہ نہ کہا جا سکتا کہ دیکھو اسے ہم دشمنوں کے نرغہ سے بچا کر لے آئے ہیں۔یہ اُسی صورت میں کہا جا سکتا تھا جب پہلے ایک حصہ نازل ہوتا جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صحیح وسلامت لے جانے کی پیشگوئی ہوتی اور جب یہ پیشگوئی پوری ہو جاتی تو اُس وقت وہ حصہ اُترتا جس میں اس کے پورا ہونے کی طرف اشارہ ہوتا۔

(۶) میرے نزدیک ایک اور اہم بات یہ ہے کہ اگر قرآن کریم اکٹھا نازل ہو جاتا تو مخالفین یہ کہہ سکتے تھے کہ کسی نے بنا کر یہ کتاب دے دی ہے۔اب کچھ حصہ مکّہ میں نازل ہوا۔کچھ مدینہ میں۔مکہ والے اگر کہیں کہ کوئی شخص بنا کر دیتا ہے تو مدینہ میں کون بنا کر دیتا تھا۔پھر قرآن سفر میں بھی نازل ہوا اور حضر میں بھی نازل ہوا۔مجلس میں بھی نازل ہوا اور علیحدگی میں بھی نازل ہوا۔دن کے اوقات میں بھی نازل ہوا اور رات کی تاریکیوں میں بھی نازل ہوا۔ اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کے اس اعتراض کو باطل کر دیا کہ قرآن کریم کے بنانے میں دوسرے لوگوں کا ہاتھ ہے۔اگر اکٹھی کتاب نازل ہوتی تو کہا جا سکتا تھا کہ کوئی شخص کتاب بنا کر دے گیا ہے جسے سُنا دیا جاتا ہے۔مگر جب ہر موقعہ اور محل کے مطابق آیات اُترتی رہیں تو کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہر موقعہ پر کوئی نئی آیت بنا کر آپؐ کو دے دیتا ہے۔پس قرآن کریم کا آہستہ آہستہ نازل ہونا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تثبیتِ فؤاد کا موجب ہوا

اور ہر دن جو آپؐ پر چڑھا اُس نے آپ کے ایمان اور عرفان کو اور بھی بڑھا دیا۔

پھر فرماتا ہے۔ وَ رَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ہم نے اس قرآن کی ترتیب بھی نہایت اعلیٰ درجہ کی رکھی ہے یعنی نزولِ قرآن تو اس رنگ میں ہوا ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے لوگوں کے لئے ضروری تھا لیکن بعد کی دائمی ترتیب ہم نے اور طرح رکھی ہے تاکہ آنے والے لوگ اپنے حالات کے مطابق اس سے فائدہ اٹھائیں۔ یہ ترتیب بھی اپنی ذات میں اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ قرآن کسی انسان نے نہیں بنایا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسے خود نازل کیا ہے۔ اگر اس کتاب کی تصنیف میں کسی انسان کا دخل ہوتا تو وہ اس کی ایک ہی ترتیب رکھتا اور جس قسم کے حالات اُسے پیش آتے اُن کے مطابق وہ ایک کتاب تصنیف کرتا چلا جاتا مگر قرآن کریم چونکہ عالم الغیب خدا کی طرف سے نازل ہوا تھا اور قیامت تک آنے والے تمام لوگوں کے لئے ایک مستقل ہدایت نامہ تھا۔ اس لئے اُس نے اپنی حکمتِ کاملہ کے ماتحت اس کے نزول کی ترتیب اور رنگ میں رکھی۔ اور اس کی تحریر کی ترتیب اَور رنگ میں رکھی۔ نزول کی ترتیب تو اُس زمانہ کے اوّلین مخاطبوں کے وساوس وشبہات کے ازالہ اور اُن کے مسائل کو حل کرنے کے لئے رکھی گئی۔ اور بعد کی ترتیب اُن لوگوں کے لئے رکھی گئی جنہوں نے مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہونے کی وجہ سے مذہب سے بہت حد تک واقف ہونا تھا یا جن کے لئے مسلمانوں کی ایک قائم شدہ جماعت کو دیکھتے ہوئے وہ مسائل کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے جن مسائل پر شروع میں بحث کرنا ضروری تھا۔ مثلاً تمام محدث اور مؤرخ اس بات پر متفق ہیں کہ پہلی آیت جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی وہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ کی تھی (بخاری کتاب الوحی باب کیف کان بدءالوحی)۔ حالانکہ موجودہ قرآن میں وہ سب سے آخری پارہ میں ہے اور آخری پارہ کے بھی آخری حصہ میں ہے اب کجا سب سے پہلے نازل ہونے والی آیت اور کجا قرآن کے سب سے آخری پارہ میں اور آخری پارہ کے بھی آخری حصہ میں اس کا رکھا جانا یہ بتاتا ہے کہ الٰہی حکمت کے ماتحت قرآن کریم کی دو ترتیبیں ضروری تھیں۔ ایک ترتیب تو وہ تھی جو ابتدائی مسلمانوں کے لحاظ سے اُن کے مناسب حال تھی۔ اور ایک ترتیب وہ تھی جو آئندہ آنے والے مسلمانوں کے لحاظ سے جب قرآن مکمل ہو چکا تھا مناسب حال تھی۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ میں صرف اِقْرَاْ کہا۔ اِقْرَاْ الْكِتٰبَ نہیں کہا کیونکہ جس وقت اللہ تعالیٰ نے اِقْرَاْ فرمایا تھا اُس وقت کوئی کتاب موجود نہیں تھی مگر جب سورۂ بقرہ نازل ہوئی تو اُس وقت تک کتاب نازل ہو چکی تھی۔ اور بہت سی سورتیں مکّہ مکرمہ میں مکمل ہو چکی تھیں۔ خود اِقْرَاْ والی سورۃ بھی نازل ہو چکی تھی۔ اور سورۃ بنی اسرائیل بھی نازل ہو چکی تھی اور سورۃ کہف، مریم اور طٰہٰ وغیرہ بھی نازل ہو چکی تھیں۔ پس اُس وقت ذٰلِكَ الْكِتٰبُ کہنا بالکل درست تھا اور لوگوں کی سمجھ میں

آ سکتا تھا اس ترتیب کی دنیوی مثال یوں سمجھ لو کہ جیسے کھانا پکانے کے لئے باورچی کام شروع کرتے ہیں تو بعض دفعہ کھانے کی ترتیب کے لحاظ سے ایک چیز بعد میں آتی ہے۔لیکن پکانے کے لحاظ سے باورچی اُس کو پہلے پکاتا ہے۔ اور کوئی چیز کھانے میں پہلے آتی ہے لیکن وہ اس کو بعد میں پکاتا ہے۔اور اگر کوئی اعتراض کرے کہ یہ چیز جو پہلے کھانی تھی تم نے بعد میں کیوں پکائی تو وہ جواب دے گا کہ یہ کھانی بے شک پہلے تھی لیکن اس کے پکانے میں پندرہ منٹ لگتے ہیں۔اگر اسے پہلے ہی پکالیا جاتا تو اس وقت تک یہ خراب اور باسی ہوجاتی۔اور جو چیز بعد میں کھانی تھی بیشک وہ کھانی بعد تھی مگر اس کے پکانے میں اڑھائی تین گھنٹے لگتے ہیں۔اگر اس کو پہلے نہ پکایا جاتا تو وہ کچی رہتی۔پس اس کی ترتیب حکمت کے ماتحت ہوتی ہے۔پکانے کی اور ترتیب ہوتی ہے اور کھانے کی اور ترتیب ہوتی ہے۔جب وہ پکاتا ہے تو اس امر کو نہیں دیکھتا کہ پہلے کون سی چیز کھانی ہے بلکہ وہ یہ دیکھتا ہے کہ جلدی کون سی چیز پکے گی۔جو جلدی پک جاتی ہے اُسے وہ بعد میں تیار کر لیتا ہے۔اور جو دیر میں پکتی ہے اُسے وہ پہلے تیار کرنا شروع کرتا ہے۔جو چیز دیر میں پکتی ہے اگر وہ اُسے دیر سے چڑھائے گا تو کھاتے وقت وہ چیز کچی ہوگی۔پس وہ دیر سے پکنے والی چیز کو چولھے پر پہلے رکھ لے گا خواہ وہ آخر میں کھائی جانے والی ہو اور جلدی پکنے والی چیز کو بعد میں تیار کرے گا خواہ وہ پہلے کھائی جانے والی ہو۔اس مثال سے ظاہر ہے کہ بعض چیزوں کی استعمال میں اور ترتیب ہوتی ہے اور اُن کی تیاری میں اور ترتیب ہوتی ہے۔یہی طریق دنیا کے ہر کام میں نظر آتا ہے۔حکومتیں فوجیں تیار کرتی ہیں۔ملک کی تنظیم کرتی ہیں۔لوگوں کو تعلیم دلاتی ہیں۔اُن کو مختلف فنون سکھلاتی ہیں تو بعض لوگ جنہوں نے پیچھے کام کرنا ہوتا ہے۔اُن کی تیاری پہلے شروع کر دیتے ہیں۔اور بعض لوگ جنہوں نے پہلے کام کرنا ہوتا ہے اُن کی تیاری بعد میں ہوتی ہے۔مثلاً کسی کام کی ٹریننگ چھ ماہ میں مکمل ہوجاتی ہے اور کسی کام کی ٹریننگ میں چار سال صرف ہوتے ہیں۔اب خواہ ایک ہی وقت میں کام شروع ہونے والے ہوں تب بھی چار سال والے کی ٹریننگ پہلے رکھی جائے گی اور چھ ماہ والے کی بعد میں۔یا مثلاً عمارتیں اور پُل بنانے میں دیر لگتی ہے اُن کو پہلے بنایا جائے گا اور ریل کی سڑکیں جو جلدی تیار کر لی جاتی ہیں اُن کو بعد میں رکھا جائے گا۔فوجیں بعض دفعہ دس دس بیس بیس میل لمبی لائن ایک ہی دن میں بچھا دیتی ہیں۔ لیکن پُل بنانے پر بڑا وقت صرف ہوتا ہے اس لئے پلوں کا انتظام اور رنگ میں ہوگا اور ریلوں کا انتظام اور رنگ میں۔ یہی قرآن کریم کی ترتیب کا حال ہے۔قرآن کریم میں جو مضامین اُس وقت کے لحاظ سے ضروری تھے جب وہ نازل ہو رہا تھا اُن کو خدا تعالیٰ نے پہلے رکھا کیونکہ اس وقت قرآن کریم ابھی اپنی مکمل صورت میں اُن کے سامنے نہیں تھا۔ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ قرآن کیا ہوتا ہے۔اسلام کیا ہوتا ہے۔رسول کیا ہوتا ہے۔وحی کیا ہوتی ہے۔الہام کیا ہوتا

ہے۔خدا تعالیٰ سے تعلق کیا ہوتا ہے۔ بلکہ انہیں یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ خدا کیا ہوتا ہے۔اس لئے اُس وقت پہلے ایسے مسائل بیان کئے گئے جو بنیادی حیثیت رکھتے تھے۔مگر جب وہ مسائل زیر بحث آ گئے اور پندرہ بیس سال تک وہ لوگ قرآن کریم کی آیات اور اُس کی تعلیم سنتے رہے تو اُس کے بعد اُن کے ہاں جو اولاد پیدا ہوئی اُس نے اپنے ماں باپ سے یہ باتیں سُننی شروع کر دیں اور بچپن سے ہی اُس کے کانوں میں یہ ڈالا جانے لگا کہ خدا کیا ہوتا ہے۔ رسول کیا ہوتا ہے۔الہام کیا ہوتا ہے۔اسلام ہم سے کیا چاہتا ہے۔محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا نے کیوں مبعوث فرمایا۔پس جب وہ بڑے ہوئے تو اُن کی ذہنیت اور قسم کی تھی۔قرآن کریم جب نازل ہوا تو اُس وقت قرآن کریم کی بہت سی باتیں لوگوں کے لئے بالکل نئی تھیں۔لیکن آئندہ اولاد کے لئے وہ باتیں پُرانی ہو چکی تھیں۔مثلاً ایک مسلمان کے گھر میں جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو جاہل سے جاہل مسلمان بھی اپنے بچے کو یہ ضرور سکھاتے ہیں کہ اگر کوئی تم سے پوچھے کہ تمہیں کس نے پیدا کیا ہے تو تم کہو۔خدا نے لیکن یہی سوال مکہ کے بڑے سے بڑے آدمی سے بھی کیا جاتا تو وہ حیرت میں پڑ جاتا کہ میں اس کا کیا جواب دوں کہ مجھے لات نے پیدا کیا ہے یا منات نے پیدا کیا ہے یا عزیٰ نے پیدا کیا ہے یا ھُبل نے پیدا کیا ہے۔آخر میں کیا کہوں کہ مجھے کس نے پیدا کیا ہے۔لیکن ایک مسلمان بچے کے لئے یہ بالکل معمولی بات ہے۔اسی طرح قضاء وقدر کا مسئلہ ہے۔اس کے تفصیلی مسائل اور چیز ہیں لیکن ایک مسلمان بچے کے لئے تقدیر کا سوال بالکل معمولی ہے اور وہ جانتا ہے کہ جو کچھ کرتا ہے خدا تعالیٰ کرتا ہے۔پس جہاں تک ایمان کا تعلق ہے یقیناً ہمارا بچہ اس سے زیادہ جانتا ہے جتنا ابوجہل، عتبہ، شیبہ اور وائل جانتے تھے کیونکہ وہ یہ بحث کرتے تھے کہ بتاؤ تقدیر کیا ہے اور ہمارا بچہ چاہے جانے یا نہ جانے کہ تقدیر کیا ہوتی ہے بڑی دلیری سے کہتا ہے کہ وہی ہوتا ہے جو خدا کی مرضی ہوتی ہے۔گویا تقدیر پر اس کا ایمان ہوتا ہے چاہے تفصیلات سے وہ ناواقف ہو لیکن ابوجہل اور اُس کے ساتھیوں کو تو تقدیر کا لفظ بھی عجیب لگتا تھا وہ تو یہی سمجھتے تھے کہ سارے کام ہمارے بُت کرتے ہیں یا ہم کرتے ہیں یا دیوی دیوتا اور جن بھوت اور پریت کام کرتے ہیں۔وہ سمجھتے تھے کہ قرعہ ڈال کر بکرا کسی دیوی کے نام چڑھا دیا تو سب کام ہو گئے۔لیکن ہمارا بچہ کہتا ہے کہ سب کام خدا تعالیٰ کرتا ہے۔وہ اپنی ماں کے پاس جاتا ہے اور کہتا ہے اماں! مجھے فلاں چیز لے دو تو وہ کہتی ہے بیٹا! اللہ دے گا تو لے دوں گی۔اور اس جواب سے اس کی تسلی ہو جاتی ہے کیونکہ اس کے نزدیک تقدیر ایک یقینی چیز ہے لیکن جب قرآن کریم نازل ہوا اُس وقت یہ ایک بڑا پیچیدہ مسئلہ تھا۔اور لوگ حیران ہوتے تھے کہ قرآن نے یہ کیا بات کہہ دی۔اسی طرح توحید کو لے لو۔توحید کے مسئلہ پر بڑا زور دیا گیا ہے۔لیکن جب ابتداء میں یہ تعلیم نازل ہوئی تو مکہ کے لوگ حیران ہوتے تھے کہ یہ توحید

کیا چیز ہے۔قرآن کریم میں اُن کے خیالات کا عجیب نقشہ کھینچا گیا ہے۔فرماتا ہے کافر کہتے تھے کہ یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی عجیب انسان ہیں کہ انہوں نے سب معبودوں کو کوٹ کاٹ کر ایک معبود بنا دیا ہے۔گویا اُن کے نزدیک لات،منات اور عزیٰ وغیرہ کا قیمہ بنا کر ایک خدا بنا دیا گیا تھا۔اُن کے ذہن میں یہ آ ہی نہیں سکتا تھا کہ لات اور منات اور عزیٰ معبود ہیں ہی نہیں۔وہ ایک خدا کے یہ معنے سمجھتے تھے کہ ان سب کو ملا کر ایک بنا دیا گیا ہے۔چنانچہ وہ کہتے تھے اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا (ص:۶) ہمارے بہت سے معبود تھے مگر اس نے ان سب کو ایک بنا دیا ہے۔وہ یہ نہیں کہتے کہ یہ ایک خدا پیش کرتا ہے یا کہتا ہے کہ دنیا کا ایک ہی پیدا کرنے والا ہے بلکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس نے سارے معبودوں کو اکٹھا کر کے ایک بنا دیا ہے۔گویا اُن کے نزدیک توحید کا پیغام لات۔منات اور عزیٰ کو کوٹ کاٹ کر ایک کر دینا تھا وہ حیران ہوتے تھے کہ یہ کیا تعلیم ہے۔لیکن آج ہمارا چھوٹے سے چھوٹا بچہ بھی سمجھتا ہے کہ توحید کیا چیز ہے کیونکہ وہ لات،منات اور عزیٰ کو جانتا ہی نہیں۔وہ پیدائش سے ہی سمجھتا ہے کہ خدا ایک ہے۔اور ایک چھوٹے بچے کے لئے بھی یہ اتنا حل شدہ مسئلہ ہے کہ اگر اُسے کہو کہ ایک نہیں بلکہ کئی خدا ہیں تو وہ ہنس پڑے گا کہ مجھے بیوقوف بناتے ہو۔لیکن ابوجہل کے سامنے جب یہ بات پیش کی جاتی تھی کہ خدا ایک ہے تو وہ بھی ہنس پڑتا تھا۔اور کہتا تھا کہ مجھے بیوقوف بنایا جا رہا ہے۔گویا ہمارے بچہ کے نزدیک یہ کہنا کہ ایک سے زیادہ خدا ہیں اُسے بیوقوف بنانا ہے اور ابوجہل کے نزدیک یہ کہنا کہ زیادہ معبود نہیں بلکہ ایک ہی معبود ہے اسے بیوقوف بنانا تھا۔تو بعد میں آنے والوں کے لئے ایک نئی ترتیب کی ضرورت ہوتی ہے۔اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں پہلے سورۂ فاتحہ رکھی۔پھر سورۃ بقرہ رکھی پھر سورۃ اٰل عمران رکھی۔پھر سورۃ النساء رکھی۔

غرض ترتیبِ قرآن نہایت اہم حکمتوں پر مبنی ہے نزول کی ترتیب اُن لوگوں کے مطابق تھی جو اُس زمانہ میں تھے۔اور موجودہ ترتیب آئندہ آنے والی نسلوں کی ضرورت کے مطابق ہے اور یہ اس کلام کے منجانب اللہ ہونے کا ایک بڑا بھاری ثبوت ہے۔مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ موجودہ ترتیب بھی خدا تعالیٰ کے حکم سے خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کی ہے۔کسی اور شخص نے آپ کے سوا قائم نہیں کی۔

لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً سے مسلمان مفسرین کو ایک یہ خیال بھی پیدا ہوا ہے کہ شاید پہلے سب نبیوں پر جُمْلَةً وَّاحِدَةً کلام نازل ہوتا تھا۔تبھی دشمنوں نے یہ اعتراض کیا ہے مگر انہوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ قرآن کریم میں یہ اعتراض کفارِ مکہ کی طرف سے نقل کیا گیا ہے اور کفار مکہ تو کسی کتاب کے قائل ہی نہ تھے کجا یہ کہ وہ اس بات کے قائل ہوں کہ سب پہلے کلام یکدم نازل ہوئے تھے۔اگر یہود ونصاریٰ کی طرف سے یہ اعتراض

بیان کیا جاتا تب تو یہ شُبہ پیدا بھی ہوسکتا تھا۔لیکن انہوں نے یہ اعتراض نہیں کیا۔اس لئے اس اعتراض کی وجہ سے یہ قیاس کرنا کہ پہلے چونکہ یکدم کلام نازل ہوتا تھا اس لئے قرآن کریم پر یہ اعتراض کیا گیا کہ کیوں یہ ایک ہی دفعہ نازل نہیں ہوا درست نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اُن کے اعتراض کی بنا محض عقلی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر خدا تعالیٰ نے کلام نازل کیا ہوتا تو یکدم کر دیتا کیونکہ وہ عالم الغیب ہے۔ کلام کے آہستہ آہستہ نازل ہونے کے یہ معنے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ نئے اور بدلے ہوئے حالات کے مطابق خود ایک نیا کلام دنیا کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ اور چونکہ اُن کے اس اعتراض کی بناء محض عقلی تھی اس لئے اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ پہلے نبیوں پر اکٹھا کلام نازل ہو جاتا تھا۔لیکن بفرضِ محال اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ کفار مکہ ایسا کہتے تھے تو کیا اُن کے اس خیال کو ہم کوئی اہمیت دے سکتے ہیں۔ کیا وہ علومِ آسمانی کے ماہر تھے یا مذہبی تاریخ کا ان کو کوئی علم تھا کہ ہم ان کے اس اعتراض کو تاریخِ مذہب کے لحاظ سے کوئی اہمیت دیں؟ اگر انہوں نے ایسا کہا تب بھی تاریخی لحاظ سے یہ بالکل غلط بات تھی جسے کوئی باخبر انسان درست نہیں سمجھ سکتا۔ میرے نزدیک اس غلطی کے پیدا ہونے کی ایک اور وجہ بھی ہے اور وہ یہ کہ قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نسبت آتا ہے کہ انہیں طور پر الواح ملی تھیں (اعراف ع ۱۷) مسلمان مفسرین چونکہ اسرائیلی کتب سے واقف نہ تھے انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ الواح اور تورات ایک ہی شے ہیں۔ حالانکہ الواح صرف اُن احکام کا نام ہے جن کا خروج باب ۲۰ تا ۳۱ میں ذکر آتا ہے اور تورات اُن احکام کے علاوہ اور بھی بہت سے احکام پر مشتمل ہے۔ اور پھر قرآن کریم نے یہ کہیں ذکر نہیں کیا کہ یہ احکام موسیٰؑ پر ایک ہی وقت میں نازل ہوئے تھے پس اوّل تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طور پر مکمل تورات نہیں ملی اور پھر جو کچھ آپ پر نازل ہوا وہ بھی یکدم نازل نہیں ہوا بلکہ چالیس راتوں میں نازل ہوا۔لیکن الواحِ موسیٰؑ کے علاوہ دوسرے نبیوں کی وحی کی نسبت تو کوئی ضعیف روایت بھی ایسی نہیں جس سے معلوم ہو کہ پہلے نبیوں پر کلامِ الٰہی یکدم نازل ہو جاتا تھا اور اگر بالفرض کوئی ایسی روایت بھی ہوتی تو ہم اُسے خلافِ عقل کہہ کر رّد کر دیتے۔ کیونکہ مکالمہ ومخاطبۂ الٰہیہ انبیاء اور خدا تعالیٰ کے تعلق کو روشن کرتا ہے۔ کیا ہم یہ خیال کر سکتے ہیں کہ کسی نبی پر ایک ہی رات میں سب کلام نازل کر کے خدا تعالیٰ اُس سے دائمی طور پر اپنے کلام کا سلسلہ منقطع کر سکتا ہے؟ اور اگر ایسا ہو تو کیا وہ نبی زندہ رہ سکتا ہے میں تو سمجھتا ہوں اگر ایک دن کلام کر کے خدا تعالیٰ اپنے انبیاء سے کلام کرنا بالکل بند کر دیتا تو دشمن تو ان کو مارنے میں پھر بھی ناکام رہتے لیکن یہ خدائی فعل اُن کو مارنے میں ضرور کامیاب ہو جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر نبی کا کلام اُس کی زندگی کے مختلف حالات پر روشنی ڈالتا ہوا ایک لمبے عرصہ میں ختم ہوا کرتا ہے۔ وہ کلام ایک طرف تو خدا تعالیٰ کی صفات کے تازہ ظہور پر روشنی

ڈالتا ہے اور دوسری طرف اُس کی تائید اور نصرت کا ثبوت ہوتا ہے۔ پھر تیسری طرف خود اُس نبی کے ایمان اور اس کے یقین کے مختلف نمونوں کو پیش کر کے اُس کے رُوحانی کمالات کو دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اگر شروع میں ہی یکدم سارا کلام نازل ہو جائے تو اُس میں یہ باتیں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اور اگر یہ باتیں کسی کلام میں جمع نہ ہوں تو وہ دنیا کی ہدایت اور رشد کا ذریعہ بھی نہیں بن سکتا۔ پس ضروری ہے کہ خدا تعالیٰ کے انبیاء پر آہستہ آہستہ کلام نازل ہوتا کہ اُن کا تعلق باللہ زندگی کے ہر دور میں ظاہر ہوتا رہے۔ پھر علاوہ ان حکمتوں کے قرآن کریم کا آہستہ آہستہ نزول اس لحاظ سے بھی اس کی صداقت کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے کہ یسعیاہ نبی کے کلام میں یہ پیشگوئی پائی جاتی تھی کہ آخری زمانہ کے نبی پر جو کلام نازل ہوگا وہ آہستہ آہستہ مختلف ٹکڑوں کی صورت میں نازل ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے پیشگوئی کرتے ہوئے فرمایا۔

’’وہ کس کو دانش سکھائے گا۔ کس کو وعظ کر کے سمجھائے گا۔ کیا اُن کو جن کا دودھ چھڑایا گیا۔ جو چھاتیوں سے جدا کئے گئے کیونکہ حکم پر حکم۔ حکم پر حکم۔ قانون پر قانون۔ قانون پر قانون ہے۔ تھوڑا یہاں تھوڑا وہاں لیکن وہ بیگانہ لبوں اور اجنبی زبان سے لوگوں سے کلام کرے گا جن کو اس نے فرمایا یہ آرام ہے تم تھکے ماندوں کو آرام دو۔ اور یہ تازگی ہے پر وہ شنوا نہ ہوئے۔ پس خداوند کا کلام اُن کے لئے حکم پر حکم۔ حکم پر حکم۔ قانون پر قانون۔ قانون پر قانون۔ تھورا یہاں تھوڑا وہاں ہوگا تا کہ وہ چلے جائیں اور پیچھے گریں۔ اور شکست کھائیں۔ اور دام میں پھنسیں اور گرفتار ہوں۔‘‘

(یسعیاہ باب ۲۸ آیت ۹ تا ۱۳)

اس پیشگوئی میں بتایا گیا تھا کہ خدا تعالیٰ کا کلام ایک زمانہ میں اس قوم کے پاس آئے گا جو الہام کے دودھ سے محروم ہوگی۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُسی وقت مبعوث ہوئے جب زمانۂ نبوت پر ایک لمبا عرصہ گذر چکا تھا۔ اور بنی اسرائیل بھی جو اہل کتاب تھے الہام کے دودھ سے محروم ہو چکے تھے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ اُن کی اس روحانی پیاس کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ کہ یٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ قَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلُنَا يُبَيِّنُ لَـكُمۡ عَلٰى فَتۡرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا مَا جَآءَنَا مِنۡۢ بَشِيۡرٍ وَّلَا نَذِيۡرٍ‌ فَقَدۡ جَآءَكُمۡ بَشِيۡرٌ وَّنَذِيۡرٌ‌ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ (المائدۃ:۲۰) یعنی اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارا رسول آچکا ہے جو رسولوں کے ایک لمبے انقطاع کے بعد تم سے ہماری باتیں بیان کرتا ہے۔ تا کہ تم یہ نہ کہو کہ ہمارے پاس نہ کوئی بشارت دینے والا آیا ہے نہ ڈرانے والا۔ سو تمہارے پاس ایک بشارت دینے والا اور ڈرانے والا آ گیا ہے۔ اور اللہ ہر ایک بات پر قادر ہے۔ اسی سلسلہ میں

ایک بڑی علامت اس پیشگوئی میں یہ بتائی گئی تھی کہ وہ کلام جو اس نبی پر نازل ہوگا یکدم نازل نہیں ہوگا۔ نہ کسی ایک شہر یا گاؤں میں نازل ہوگا بلکہ حکم پر حکم اور قانون پر قانون مختلف مقامات پر اُتریں گے۔ چنانچہ قرآن کریم بعینہٖ اسی طرح اُترا۔ کچھ مکہ میں نازل ہوا اور کچھ مدینہ میں کچھ سفر میں نازل ہوا اور کچھ حضر میں۔ یہاں تک کہ دشمنوں نے بھی یہ اعتراض کر دیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سارا قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نازل نہیں ہوا۔

تعجب ہے کہ یسعیاہ نبی کی اس پیشگوئی کے باوجود مسیحی بھی آج تک قرآن کریم پر یہ اعتراض کرتے چلے جاتے ہیں اور اس طرح اپنی قلموں سے اس امر کا ثبوت مہیا کرتے رہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یسعیاہ نبی کی پیشگوئی کے مصداق تھے۔

اَلَّذِیْنَ یُحْشَرُوْنَ عَلٰی وُجُوْهِهِمْ اِلٰی جَهَنَّمَ ۙ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ

جو لوگ اپنے سرداروں سمیت جہنم کی طرف لے جائے جائیں گے اُن کا مقام بہت بُرا ہوگا اور

مَّكَانًا وَّ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۳۵﴾ ع

اُن کا رستہ بڑی گمراہی کا ہوگا۔

حلّ لُغات۔ وُجُوْهِهِمْ وجوھھم اَلْوَجْهُ کے معنے ہیں نَفْسُ الشَّیْءِ یعنی کسی چیز کا اپنا وجود۔ اور جب اَلْوَجْهُ مِنَ الدَّهْرِ کہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں اَوَّلُهٗ زمانہ کا ابتدائی حصہ۔ اسی طرح وَجْهٌ کے ایک معنے سَیِّدُ الْقَوْمِ یعنی قوم کے سردار کے بھی ہیں اور اس کے معنے اَلْجَاهُ یعنی عزت اَلْجِهَةُ: جانب۔ مَا یَتَوَجَّهُ اِلَیْهِ الْاِنْسَانُ مِنْ عَمَلٍ وَغَیْرِهٖ انسانی مطمحِ نظر اور عمل۔ اَلْقَصْدُ وَالنِّیَّةُ: قصد اور نیت اور اَلْمَرْضَاةُ یعنی رضامندی کے بھی ہیں۔ (اقرب)

تفسیر۔ وَجْهٌ کے ایک معنے جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے سردارِ قوم کے بھی ہوتے ہیں۔ پس یُحْشَرُوْنَ عَلٰی وُجُوْهِهِمْ اِلٰی جَهَنَّمَ کے یہ معنے ہیں کہ قیامت کے دن کفار جہنم میں تو جائیں گے مگر اپنے سرداروں پر لعنتیں ڈالتے ہوئے اور انہیں بُرا بھلا کہتے ہوئے جائیں گے اور وہی لوگ جن کے لئے وہ اپنی جانیں قربان کیا کرتے تھے اور جن کے اشاروں پر وہ اپنا دین اور مذہب بھی فروخت کرنے کے لئے تیار رہتے تھے انہی سے وہ نفرت اور بے زاری کا اظہار کرنے لگ جائیں گے کیونکہ اُس وقت اُن پر حقیقت روشن ہو چکی ہوگی اور انہیں معلوم

ہو جائے گا کہ انہوں نے اپنے لیڈروں کی اندھی تقلید کے نتیجہ میں کیا نقصان اُٹھایا ہے۔

قرآن کریم نے ان کی اس نفرت اور بیزاری کا ایک اور جگہ ان الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے۔ کہ وَ قَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا رَبَّنَاۤ اَرِنَا الَّذَیۡنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الۡجِنِّ وَ الۡاِنۡسِ نَجۡعَلۡهُمَا تَحۡتَ اَقۡدَامِنَا لِیَکُوۡنَا مِنَ الۡاَسۡفَلِیۡنَ (حٰمٓ السجدہ: ۳۰) یعنی اُس دن کفار کہیں گے کہ اے ہمارے رب! تُو ہمیں جن ّو انس میں سے وہ لوگ دکھا جو ہمیں گمراہ کیا کرتے تھے تا کہ ہم اُن کو اپنے پیروں تلے مسلیں اور اس کے نتیجہ میں وہ ذلیل ترین وجود بن جائیں۔

اسی طرح ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَ قَالُوۡا رَبَّنَاۤ اِنَّاۤ اَطَعۡنَا سَادَتَنَا وَ کُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوۡنَا السَّبِیۡلَا۔ رَبَّنَاۤ اٰتِهِمۡ ضِعۡفَیۡنِ مِنَ الۡعَذَابِ وَ الۡعَنۡهُمۡ لَعۡنًا کَبِیۡرًا (الاحزاب: ۶۸، ۶۹) یعنی عوام جو لیڈروں کے پیچھے چلتے رہے وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے کہیں گے کہ اے ہمارے رب ہم سے بڑی غلطی ہوئی کہ ہم نے اپنے سرداروں اور بڑے لوگوں کی اتباع کی۔ جس کے نتیجہ میں انہوں نے ہمیں سیدھے راستہ سے منحرف کر دیا اے ہمارے رب! اب تُو اُن کو جہنم میں دُگنا عذاب دے اور انہیں اپنی بہت بڑی لعنت کا نشانہ بنا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جس تعلق کی بنیاد کفر اور بے ایمانی پر ہو وہ کیسا ناپائیدار ہوتا ہے اور اس کا انجام کتنا حسرتناک ہوتا ہے۔ دنیا میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ جو خودغرض لیڈر محض اپنی لیڈری قائم رکھنے کے لئے عوام کو سبز باغ دکھانے کے عادی ہوتے ہیں جب کسی غلط راستہ پر قوم کو چلا کر اُسے تباہی کے گڑھے میں دھکیل دیتے ہیں۔ اور عوام اُن کی دھوکا دہی سے آگاہ ہو جاتے ہیں تو وہی لوگ جو پہلے اُن کے لئے ''زندہ باد'' کے نعرے بلند کیا کرتے ہیں ''مردہ باد'' کے نعرے بلند کرنے لگتے ہیں اور اُنہیں قوم کا غدار اور چھپا دشمن قرار دیا جاتا ہے۔ یہی حال عالمِ معاد میں بھی ہوگا جب کفار کو جہنم کی طرف دھکیلا جائے گا تو وہ اس تباہی کا اپنے لیڈروں کو ذمہ دار قرار دیں گے اور انہیں بُرا بھلا کہیں گے۔ مگر اُس وقت اُن کو بُرا بھلا کہنا انہیں کوئی فائدہ نہیں دے گا۔ کیونکہ عمل کا وقت گذر چکا ہوگا اور جزائے خیر اور شر کا زمانہ ظاہر ہو چکا ہوگا۔

وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ وَ جَعَلۡنَا مَعَهٗۤ اَخَاهُ هٰرُوۡنَ

اور ہم نے موسیٰؑ کو ایک (معلوم) کتاب دی تھی اور ہم نے اُس کے ساتھ اُس کے بھائی ہارونؑ کو بھی نائب

وَزِیۡرًا ﴿۳۶﴾ فَقُلۡنَا اذۡهَبَاۤ اِلَی الۡقَوۡمِ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا ؕ

بنا کر بھیج دیا تھا۔ اور ہم نے اُن سے کہا تھا کہ تم دونوں اُس قوم کی طرف جاؤ جنہوں نے ہماری آیتوں کا انکار کر دیا

فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيْرًا ﴿۳۷﴾ وَ قَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ

ہے۔ پھر (جب وہ تبلیغ کر چکے) ہم نے اُن جھٹلانے والوں کو بالکل تباہ کر دیا۔ اور قومِ نوح ؑ کو بھی جب انہوں

اَغْرَقْنٰهُمْ وَ جَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً ؕ وَ اَعْتَدْنَا

نے رسولوں کا انکار کیا ہم نے غرق کر دیا اور ہم نے انہیں لوگوں کے لئے ایک نشان بنا دیا۔ اور ہم نے

لِلظّٰلِمِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۳۸﴾ وَّ عَادًا وَّ ثَمُوْدَاۡ وَ اَصْحٰبَ

ظالموں کے لئے دردناک عذاب تیار کر چھوڑا ہے۔ اور عاد کو بھی اور ثمود کو بھی اور کنوئیں والے لوگوں کو بھی

الرَّسِّ وَ قُرُوْنًا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ﴿۳۹﴾ وَ كُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ

اور اُن کے درمیان اور بہت سی قوموں کو بھی (ہم نے تباہ کر دیا)۔ اور اُن میں سے ہر قوم کے لئے ہم نے

الْاَمْثَالَ ؗ وَ كُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا ﴿۴۰﴾

حقیقت بیان کر دی اور (جب نہ سمجھے تو) سب کو ہلاک کر دیا۔

حلّ لُغات ۔ دَمَّرْنَا هُمْ ۔ دَمَّرْنَاهُمْ دَمَّرَ سے جمع متکلم کا صیغہ ہے اور دَمَّرَ عَلَيْهِمْ کے معنے ہیں اَهْلَكَهُمْ ۔ اُن کو ہلاک کر دیا (اقرب) پس دَمَّرْنَاهُمْ کے معنے ہوں گے۔ ہم نے اُن کو ہلاک کر دیا۔

اَصْحَابَ الرَّسِّ ۔ اَصْحَابَ الرَّسِّ اَلرَّسُّ کے معنے ہیں اَلْبِئْرُ الْقَدِيْمَةُ ۔ پرانا کنواں (اقرب) مفردات میں ہے اَصْلُ الرَّسِّ اَلْاَثَرُ الْقَلِيْلُ الْمَوْجُوْدُ فِي الشَّيْءِ کسی چیز میں اگر کوئی بڑا نشان ہو اور پھر مٹتا مٹتا تھوڑا سا رہ جائے تو اُس تھوڑے سے نشان کو رس کہتے ہیں (مفردات) اَصْحَابُ الرَّسِّ قِيْلَ هُوَ وَادٍ بعض لوگوں کے نزدیک رسّ ایک وادی کا نام ہے (مفردات) پس اَصْحٰبُ الرَّسِّ کے معنے ہوں گے (۱) کنوئیں والے (۲) ایسی قوم جن کے نشان مٹتے مٹتے کچھ بقایا رہ گئے ہوں۔ (۳) وادی والے

تَبَّرْنَا تَبَّرْنَا تَبَّرَ سے جمع متکلم کا صیغہ ہے اور تَبَّرَهٗ کے معنے ہیں اَهْلَكَهٗ وَدَمَّرَهٗ ۔ اُس کو ہلاک و برباد کر دیا۔ كُلَّ شَيْءٍ : كَسَّرَتَهٗ وَفَتَّتَهٗ فَقَدْ تَبَّرَتَهٗ ۔ ہر وہ چیز جسے توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے اس کے متعلق تَبَّرَ کا لفظ بولتے ہیں (اقرب) پس تَبَّرْنَا کے معنے ہوں گے۔ ہم نے اُن کو کُلّیۃً تباہ و برباد کر دیا۔

تفسیر ۔اب بتاتا ہے کہ قیامت کے دن اپنے گناہوں کی دوسروں پر ذمہ داری ڈالنے سے کوئی انسان اپنے جرم کی سزا سے نہیں بچ سکتا کیونکہ ابتدائے آفرینش سے ہم لوگوں کی ہدایت کے لئے اپنے انبیاء مبعوث کرتے رہے ہیں ۔اور اُن کی تائید میں اپنے نشانات بھی دکھاتے رہے ہیں اگر اس سلسلۂ رسالت سے لوگ فائدہ نہیں اٹھاتے تو اُن کا یہ کہنا کہ ہمیں تو اپنے لیڈروں نے بہکا دیا تھا اُن کے جرم کو ہلکا نہیں کرسکتا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ سب سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر فرماتا ہے جن کی شریعت یہود کے لئے قریباً دو ہزار سال تک قابلِ عمل رہی۔ اور فرماتا ہے کہ دیکھو ہم نے موسیٰ ؑ کو تورات دی اور اُس کے ساتھ اُس کے بھائی ہارون ؑ کو اُس کا نائب بنایا۔ اور پھر ہم نے اُن دونوں کو کہا کہ تم فرعون اور اس کی قوم کے پاس جاؤ اور انہیں ہمارا پیغام پہنچاؤ۔ مگر فرعون اور اس کی قوم نے ہماری آیات کا انکار کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے انہیں تباہ کر دیا اور موسیٰ ؑ کو غلبہ عطا کیا۔

اس جگہ وَجَعَلْنَا مَعَهٗٓ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِيْرًا سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام کی حیثیت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایک تابع کی تھی مگر بعض لوگ جو حقائق پر پوری طرح غور کرنے کے عادی نہیں اور صرف سطحی نظر سے قرآنی آیات کو دیکھتے ہیں انہوں نے قرآن کریم کی بعض آیات سے یہ دھوکہ کھایا ہے کہ موسیٰ ؑ اور ہارونؑ دونوں صاحبِ کتاب اور صاحبِ اُمت نبی تھے۔ اُن کا صاحب اُمت ہونا تو وہ اس آیت سے ثابت کرتے ہیں جس میں جدعون کے متعلق اُن کے زمانہ کے نبی نے خبر دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَ اٰلُ هٰرُوْنَ (البقرۃ:۲۴۹) یعنی اُس کی حکومت کا نشان یہ ہے کہ تمہیں ایک تابوت ملے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے تسکین ہوگی اور اُس چیز کا بقیہ ہوگا جو موسیٰ ؑ اور ہارونؑ کی آل نے اپنے پیچھے چھوڑا اور دونوں کا صاحبِ کتاب ہونا وہ اس آیت سے ثابت کرتے ہیں کہ وَ اٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ (الصّٰفّٰت:۱۱۸) یعنی ہم نے ان دونوں کو ایک کامل کتاب دی جو تمام احکام کو کھول کھول کر بیان کرتی تھی۔ حالانکہ آل موسیٰ ؑ و آل ہارون ؑ کہنا دونوں کی الگ الگ جماعتوں کا کوئی ثبوت نہیں۔ ایک ہی جماعت آل موسیٰ ؑ بھی کہلا سکتی ہے اور آل ہارونؑ بھی اور پھر آل سے مراد متعلقین بھی ہو سکتے ہیں۔ باقی رہا کتاب کا ذکر۔ سو کتاب تو یقیناً ہارونؑ کو بھی ملی۔ لیکن کتاب ملنے کے یہ معنے نہیں کہ اُن کو کوئی مستقل کتاب ملی تھی بلکہ جو کتاب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملی وہی حضرت ہارونؑ کے لئے بھی تھی جیسے وہ کتاب جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملی وہ ہمارے لئے بھی ہے۔ مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ہم پر یہ کتاب نازل ہوئی ہے اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہم اہل کتاب ہیں۔ اسی طرح ہارونؑ بھی اہل کتاب تھے مگر اُن پر کتاب نازل نہیں ہوئی۔

حضرت موسیٰ ؑ اور حضرت ہارونؑ کے باہمی تعلقات کا علم قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات سے واضح ہو جاتا ہے۔

اوّل قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ہارونؑ کو نبوت کے مقام پر فائز کرنے کے متعلق خود حضرت موسیٰ علیہ السلام نے درخواست کی تھی اور ان الفاظ میں کی تھی کہ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ هٰرُوْنَ اَخِي اشْدُدْ بِهٖۤ اَزْرِيْ وَ اَشْرِكْهُ فِيْۤ اَمْرِيْ (طٰہٰ: ۳۰تا۳۱) یعنی اے میرے خدا! میرے اہل میں سے ایک میرا نائب مقرر کر۔ یعنی میرے بھائی ہارون کو اور اُس کے ذریعہ سے میری قوت بڑھا اور اُسے میرے امر میں شریک کر۔

ان آیات سے ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک ایسے نبی کے لئے دعا کر رہے ہیں جو اُن کا وزیر ہو اور جو اُن کی طاقت بڑھانے والا ہو۔ اور پھر صاف فرماتے ہیں کہ میرے امر میں اسے شریک کر۔ یعنی سلسلہ تو میرا ہی ہوگا اس کا نہیں ہوگا میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ وہ اس کام کو چلانے میں میرا مددگار اور شریکِ کار ہو۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تو موسیٰ ؑ کی دُعا ہے۔ خدا تعالیٰ نے نہ معلوم اس کو قبول کیا یا نہ کیا۔ سو اس کا جواب بھی اسی سورۃ میں موجود ہے۔ کیونکہ ایک دو آیات چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کا جواب بھی نقل ہے۔ جو یہ ہے کہ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى (طٰہٰ: ۳۷)۔ یعنی اے موسیٰ! تیری التجا قبول کی جاتی ہے جس سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ ؑ نے جو کچھ مانگا تھا وہی کچھ خدا نے ان کو دیا۔ اور حضرت ہارون ؑ کو وہی مقام ملا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے طلب کیا تھا۔ پس حضرت ہارون کی حیثیت باوجود ایک نبی ہونے کے اُن کے نائب اور اُن کے کام میں مددگار کی تھی نہ کہ کچھ اور۔ اور یہ امر ظاہر ہے کہ ایک شخص ایک ہی وقت میں مستقل نبی اور دوسرے نبی کا تابع نہیں ہو سکتا۔ یہ دونوں عہدے قطعی طور پر ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔

اس مضمون پر ان تعلقات کی تفصیل سے بھی خوب روشنی پڑتی ہے جو حضرت موسیٰ ؑ اور حضرت ہارونؑ کے درمیان تھے اور جن کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے مثلاً سورۂ اعراف ع ۱۷ میں ہے وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَ اَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ (الاعراف: ۱۴۳)۔ یعنی موسیٰ ؑ نے اپنے بھائی سے پہاڑ پر جاتے ہوئے کہا کہ تم میرے بعد میری قوم میں میرے نائب کی حیثیت سے کام کرو۔ اور اصلاح کو ہمیشہ مدنظر رکھو۔ اور شریروں کی باتیں نہ ماننا۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ امت کو حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی اُمت قرار دیتے ہیں اور سرداری اپنی طرف منسوب کرتے ہوئے حضرت ہارونؑ کو اپنا خلیفہ مقرر کرتے ہیں۔ شاید یہ کہا جائے کہ حضرت ہارونؑ اپنی قوم پر تو حاکم تھے ہی حضرت موسیٰ نے مزید یہ درخواست اُن سے کی ہے کہ میری قوم کے کام بھی میرے

پیچھے تم کر دینا۔ لیکن اوّل تو اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ جب یہ الگ الگ قوموں کی طرف نبی تھے تو اکٹھے کیوں رہتے تھے؟ دوسرے یہ اعتراض ہوتا ہے کہ ان کی قومیں کس اصول پر مقرر تھیں۔ اگر تو ہارونؑ کسی اور خاندان سے ہوتے تو کہا جا سکتا تھا کہ اپنی اپنی قوم اُن پر ایمان لائی تھی لیکن یہ دونوں تو بھائی تھے پھر موسیٰؑ کی قوم الگ کس اصول پر تھی اور حضرت ہارونؑ کی کس اصول پر۔ کیا دن مقرر تھے کہ فلاں دن بیعت کرنے والا موسیٰؑ کی کتاب پر ایمان لائے اور فلاں دن بیعت کو آنے والا ہارونؑ کی کتاب پر ایمان لائے؟ یا قومیں الگ الگ بانٹی ہوئی تھیں۔ یا یہ تھا کہ جو چاہے موسیٰؑ کی بیعت کرے اور جو چاہے ہارونؑ کی بیعت کرے۔ آخر ایک ماں کے دو بیٹے جو اکٹھے رہتے تھے اُن کی الگ الگ اُمتیں کس اصول پر بنائی گئی تھیں؟ پھر یہ بھی سوال ہے کہ قرآن کریم یہ فرماتا ہے وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ (الاعراف:۱۴۹) یعنی موسیٰؑ کے بعد موسیٰؑ کی اُمت نے بچھڑا بنالیا تھا۔ کیا اس سے یہ سمجھا جائے کہ حضرت ہارون کی اُمت نے بچھڑا نہیں بنایا تھا کیونکہ قرآن صرف قوم موسیٰؑ کے بگڑنے کا ذکر کرتا ہے ہارونؑ کی امت کے بگڑنے کا ذکر نہیں کرتا۔ اور اگر یہ درست ہے تو پھر ماننا پڑے گا کہ حضرت ہارونؑ نے اپنی قوم کا زیادہ خیال رکھا اور موسیٰؑ کی قوم کا چنداں خیال نہ کیا۔ پھر اس کے آگے ذکر ہے کہ حضرت موسیٰؑ حضرت ہارونؑ پر ناراض ہوئے اور انہوں نے کہا کہ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ (الاعراف:۱۵۱) اے میری ماں کے بیٹے۔ قوم نے مجھے کمزور سمجھا اور مجھے قتل کرنے لگے تھے۔ اگر حضرت ہارونؑ کی الگ اُمت تھی تو سوال یہ ہے کہ وہ اُمت کہاں گئی ہوئی تھی اور کیوں اس نے ہارونؑ کی اس موقعہ پر مدد نہ کی۔ کیونکہ اگر ہارونی امت الگ تھی تو قرآن کے الفاظ کے مطابق وہ نہیں بگڑی تھی بلکہ اپنے ایمان پر قائم رہی تھی۔

اس قابلِ اعتراض عقیدہ کی وجہ سے ایک اور مشکل بھی پیش آتی ہے جو یہ ہے کہ دوسری جگہ حضرت ہارونؑ کا یہ قول نقل ہے کہ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ۔ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى (طٰهٰ:۹۱، ۹۲) یعنی حضرت ہارونؑ نے حضرت موسیٰؑ کے واپس آنے سے بھی پہلے اُن سے کہہ دیا تھا کہ اے میری قوم! تم کو اس بچھڑے کے ذریعہ آزمائش میں ڈالا گیا ہے اور تمہارا رب تو رحمٰن خدا ہے۔ پس میری اتباع کرو اور میرے حکم کو مانو۔ مگر قوم نے کہا کہ جب تک موسیٰؑ ہماری طرف واپس نہ آئے ہم برابر اس کی عبادت کرتے رہیں گے۔ ان آیات میں حضرت ہارونؑ بگڑنے والی قوم کو اپنی قوم کہتے ہیں۔ اگر کہا جائے کہ یہ قول انہوں نے اپنی امت سے کہا تھا۔ تو پھر یہ مشکل پیش آتی ہے کہ اُن کا جواب یہ ہے کہ موسیٰؑ کے آنے تک ہم اس کام کو نہیں چھوڑیں گے تو کیا اس سے یہ سمجھا جائے کہ امت تو وہ ہارونؑ کی تھی لیکن بات موسیٰؑ کی مانا کرتی تھی۔

غرض اس عقیدہ کو قرآن کریم کی متعدد آیات رد کر رہی ہیں اور حق یہی ہے کہ حضرت ہارونؑ حضرت موسیٰؑ کے تابع نبی تھے۔ حضرت موسیٰ کی قوم ہی ان کی قوم تھی اور اُن کی کوئی الگ جماعت نہ تھی نہ الگ احکام تھے نہ کم نہ زیادہ۔ حضرت موسیٰؑ کی مدد کے لئے انہیں مقرر کیا گیا تھا اور آل ہارونؑ سے یا تو اُن کے وہ رشتہ دار مُراد ہیں جو حضرت موسیٰؑ کے رشتہ دار نہ تھے مثلاً بیویوں یا بہوؤں کی طرف سے رشتہ دار۔ یا ایک ہی قوم مراد ہے۔ صرف دونوں کی اصلاحِ خلق کی خدمات کے اظہار کے لئے دونوں کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

موسیٰؑ کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کا ذکر کیا اور فرمایا کہ موسیٰ سے اوپر چلو تو نوحؑ کی قوم کی مثال دیکھ لو۔ وہ بھی موسیٰؑ کی طرح ہمارا ایک شرعی رسول تھا مگر جب اس کی قوم نے ہمارے رسولوں کا انکار کیا تو ہم نے اس کو غرق کر دیا۔ اور اُسے لوگوں کے لئے ایک نشان بنا دیا۔ اس جگہ نوحؑ کے لئے رُسُل کا لفظ استعمال کیا گیا ہے حالانکہ وہ صرف ایک رسول تھے اس میں یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر کسی ایک رسول کا بھی انکار کیا جائے تو چونکہ تمام انبیاء منہاجِ نبوت کے لحاظ سے ایک جیسے ہوتے ہیں اور جو دلائل کسی ایک نبی کی صداقت ثابت کرتے ہیں وہی دلائل دوسرے نبی کی صداقت بھی ثابت کرتے ہیں اس لئے ایک نبی کا انکار سب نبیوں کا انکار ہوتا ہے۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے وہ شخص جس نے آم کھایا ہوا ہو وہ آم دیکھ کر نہیں کہہ سکتا کہ یہ آم نہیں ہے بلکہ خربوزہ ہے۔ مگر جس نے آم نہ دیکھا ہو وہ اُسے دیکھ کر نہیں کہہ سکتا کہ یہ آم ہے۔ اسی طرح جو شخص انبیاء کی صداقت کو صحیح طور پر پہچانتا ہو اور اُن کے دلائل اور نشاناتِ صداقت سے آگاہ ہو۔ وہ جب بھی کسی سچے نبی کو دیکھے گا اُسے پہچان لے گا اور اُس پر ایمان لے آئے گا۔ لیکن جو شخص کہتا تو یہ ہے کہ میں سب نبیوں کو مانتا ہوں لیکن بعد میں آنے والے وہ کسی رسول کا انکار کر دیتا ہے وہ اپنے عمل سے اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ اُس نے کسی نبی کو بھی نہیں پہچانا تھا۔ پس اُس کا انکار کسی ایک رسول کا نہیں بلکہ تمام رسولوں کا انکار کہلاتا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ بعض اور قوموں کی ہلاکت کا ذکر کرتا ہے اور فرماتا ہے۔ ہم نے عاد اور ثمود اور اصحاب الرس کو بھی ہلاک کیا اور اُن کے درمیان اور بھی بہت سی قومیں ہمارے عذاب کا نشانہ بنیں۔ ان میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے اپنے انبیاء کے ذریعہ حقیقت حال کو کھول کر بیان کر دیا تھا مگر جب انہوں نے سچائی کو مٹانا چاہا تو پہلی قوموں کی طرح ہم نے انہیں بھی تباہ کر دیا۔ عاد ایک بہت بڑی قوم تھی جو تمام شمالی اور جنوبی عرب پر قابض تھی۔ قرآن کریم نے عاد کا زمانہ قوم نوحؑ کے بعد بتایا ہے (اعراف ع ۹) اور اس کی طاقت کو لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ (الفجر: ۹) کے الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ اُن بلاد میں اُس جیسی طاقتور اور کوئی قوم نہیں تھی مگر اُس قوم نے بھی جب ہودؑ کا مقابلہ کیا

تو اللہ تعالیٰ نے اُسے تباہ کر دیا۔یہی حال ثمود کا ہوا جس نے قوم عاد کی جگہ لی تھی۔اس قوم کا مرکزی مقام حجر تھا جو مدینہ منوّرہ اور تبوک کے درمیان تھا۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوۂ تبوک پر تشریف لے گئے تو آپ تھوڑی دیر کے لئے اس مقام پر بھی ٹھہرے تھے مگر آپ نے صحابہؓ کو حکم دے دیا کہ کوئی شخص اس جگہ سے کنوؤں کا پانی استعمال نہ کرے۔بعض صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم تو اس پانی سے اپنے آٹے گوندھ چکے ہیں۔آپ نے فرمایا۔وہ آٹا یہیں پھینک دو کیونکہ یہ وہ مقام ہے جہاں خدا تعالیٰ کا عذاب نازل ہو چکا ہے (بخاری کتاب احادیث الانبیاء باب قول اللہ عزّ و جل و الی عاد اخاھم صالحًا)

پھر فرماتا ہے کہ ہم نے اصحاب الرس کو بھی ہلاک کیا۔اصحٰب الرس کے بارہ میں مفسرین میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔لیکن اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم ثمود کے بعد ہوئی ہے کیونکہ وَقُرُوْنًا بَیْنَ ذٰلِکَ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ ترتیب مدنظر ہے اور بحرِ محیط نے بھی اسی کی تائید کی ہے۔کیونکہ اُس میں حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول لکھا ہے کہ یہ قوم ثمود کا حصہ تھی (تفسیر بحر محیط زیر آیت و عادًا و ثمود و اصحاب الرس) اور چونکہ ثمود عاد کا آخری حصہ تھے اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم ثمود کی قائم مقام تھی۔اور نسلِ اسماعیلؑ کے عرب میں پھیلنے سے پہلے یہ لوگ ہوئے ہیں۔جب نسل اسماعیلؑ عرب میں پھیل گئی تو پھر یہ لوگ فلسطین کی طرف چلے گئے جیسا کہ قدیم آثار سے پتہ چلتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے ان گذشتہ اقوام کی مثالیں پیش کر کے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کے بدنتائج سے لوگوں کو ڈرایا ہے اور انہیں بتایا ہے کہ اگر تم نے اصلاح نہ کی تو جو حال موسیٰؑ اور نوحؑ اور ہودؑ اور صالحؑ کے جھٹلانے والوں کا ہوا وہی حال تمہارا ہوگا اور تم بھی اس صفحۂ ہستی سے معدوم کر دیئے جاؤ گے۔

وَ لَقَدْ اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِيْۤ اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ؕ اَفَلَمْ

اور یہ (مکہ کے کفار) اس بستی کے پاس سے گذر چکے ہیں جس پر ہم نے ایک تکلیف دہ بارش نازل کی تھی۔

يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا ۚ بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا ﴿۴۱﴾ وَ اِذَا

کیا یہ اس (بستی کے نشانوں) کو نہیں دیکھتے۔حقیقت یہ ہے کہ یہ دوبارہ اُٹھنے کی اُمید ہی نہیں رکھتے تھے۔

رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ

اور جب وہ تجھے دیکھتے ہیں تو تجھے صرف ایک ہنسی ٹھٹھے کی چیز سمجھتے ہیں (اور کہتے ہیں)

رَسُوْلًا ﴿۴۲﴾ اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْ لَاۤ اَنْ صَبَرْنَا

کیا اللہ (تعالیٰ) نے اس شخص کو رسول بنا کر بھیجا ہے! اگر ہم اپنے معبودوں پر قائم نہ رہتے تو یہ (شخص) تو ہم کو

عَلَيْهَا ؕ وَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ

ان سے گمراہ کرنے ہی لگا تھا۔ اور جب یہ عذاب کو دیکھیں گے تو اُن کو ضرور حقیقت معلوم ہو جائے گی

اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۴۳﴾

کہ کون اپنے طور وطریق میں زیادہ گمراہ تھا۔

تفسیر۔ اب فرماتا ہے کہ یہ مشرک اپنے سفروں میں اس بستی کے پاس سے گذرتے ہیں جس پر ہم نے تکلیف دہ بارش نازل کی تھی مگر پھر بھی وہ اس کو دیکھ کر عبرت حاصل نہیں کرتے۔

اس جگہ قریہ سے مراد قوم لوطؑ کی بستی ہے اور اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ سے یہ مراد ہے کہ زلزلہ سے خدا تعالیٰ نے اُن کی زمین کو تہ و بالا کر دیا۔ جیسا کہ ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ (الحجر: ۷۵) یعنی ہم نے اُس کی اوپر والی سطح کو نچلی سطح بنا دیا اور اُن پر سنگریزوں سے بنے ہوئے پتھروں کی بارش برسائی۔

اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ۔ سے یہ مراد ہے کہ جب یہ لوگ اپنی تجارتی اغراض کے لئے حجاز سے شام جاتے ہیں تو عین راستہ پر انہیں قوم لوطؑ کی بستی دکھائی دیتی ہے۔ اس بستی کی عبرتناک تباہی کو دیکھ کر چاہیے تھا کہ اُن کے دل لرز جاتے اور یہ اللہ تعالیٰ کے پیغام کو قبول کر لیتے۔ مگر یہ ایسے سخت دل لوگ ہیں کہ ان کھنڈرات کو دیکھنے کے باوجود کوئی عبرت حاصل نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ کے رسول کی تکذیب کرتے چلے جاتے ہیں۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ اُن کے اس انکار کی وجہ بیان کرتا ہے اور فرماتا ہے۔ بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا۔ اس انکار کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کو جزا وسزا پر کوئی ایمان نہیں اور اس وجہ سے یہ لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے دعویٰ پر غور ہی نہیں کرتے۔ اگر ان کے دلوں میں آئندہ زندگی کا کوئی خوف پایا جاتا تو یہ لوگ تکبر اور سرکشی میں نہ بڑھتے۔ رِجَاء کے ایک معنے امید کے ہوتے ہیں لیکن اس کے ایک معنے ڈر کے بھی ہوتے ہیں (اقرب) بلکہ بحرِ محیط والوں نے تو لکھا ہے کہ تہامہ کے علاقہ میں یہ لفظ صرف ڈر کے معنوں میں ہی استعمال ہوتا ہے (تفسیر بحرِ محیط زیر آیت ولقد اتوا علی القریة التی امطرت) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نیکیوں کے حصول میں اللہ تعالیٰ کی خشیت اور بعث بعد الموت کے عقیدے کا بھی بڑا دخل ہے اگر کسی کا دل اللہ تعالیٰ کے خوف سے خالی ہو جائے اور حیات بعد الموت کا ڈر اُس کے دل سے نکل جائے تو اُس کے اندر لامذہبیت اور سرکشی پیدا ہو جاتی ہے جو اس کے قدم کو ہدایت سے دُور لے جاتی ہے اور آخر اسے جہنم میں پہنچا کر رہتی ہے۔ فرماتا ہے یہی بے باکی اور سرکشی ہے جس کی بناء پر یہ لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے برابر ہنسی اور مذاق کرتے چلے جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کیا اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے؟ اگر رسول بنا کر بھیجنا تھا تو کسی اور کو بھیجتا۔ مگر پھر جب وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقبولیت اور آپ ؐ کی کشش اور جاذبیت کو دیکھتے تو کہہ اُٹھتے کہ یہ جھوٹا تو ہے مگر ہے بڑا چالاک۔ کیونکہ قریب تھا کہ اگر ہم بھی صبر سے کام نہ لیتے یعنی اپنے عقائد پر مضبوطی سے نہ ڈٹے رہتے تو یہ ہمیں ہمارے معبودوں سے منحرف کر دیتا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دلائل میں اتنا زور تھا کہ بڑے بڑے کفار بھی محسوس کرتے تھے کہ اُن کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکلی جا رہی ہے۔ اور اب بُتوں کی حقانیت ثابت کرنا اُن کے بس کا روگ نہیں رہا۔ مگر پھر کِبر اُن کے راستہ میں حائل ہو جاتا اور وہ مخالفت پر کمربستہ ہو جاتے اور لوگوں سے کہتے کہ یہ بڑا چالاک ہے اس کے پیچھے مت چلو۔ مگر فرماتا ہے جب ان پر عذاب آئے گا تب ان کو پتہ لگے گا کہ ہمارا رسول سچ کہتا تھا یا لوگوں کو دھوکا دے رہا تھا۔ چنانچہ جس طرح موسیٰ ؑ اور نوح ؑ اور ہودؑ اور صالح ؑ اور لوط ؑ کی قومیں تباہ ہوئیں اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کے ایک حصہ کو بھی مختلف جنگوں میں تباہ کر دیا گیا۔ اور جو باقی بچے وہ اُسی وقت اللہ تعالیٰ کے عذاب سے محفوظ ہوئے جب وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا کر خدا تعالیٰ کی پناہ میں آ گئے اور انہوں نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہنا شروع کر دیا۔

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ۭ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ

(اے رسول) کیا تو نے اس شخص کا حال بھی معلوم کرلیا ہے جس نے اپنی خواہشاتِ نفسانی کو اپنا معبود بنالیا۔

وَكِيْلًا ۝۴۴ اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ

کیا تُو اُس شخص پر نگران ہے (کہ تو اُسے جبراً گمراہی سے روکے) کیا تُو سمجھتا ہے کہ اُن میں سے اکثر سُنتے یا سمجھتے

يَعْقِلُوْنَ ۭ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ۝۴۵ ع

ہیں؟ وہ تو فقط جانوروں کی طرح ہیں بلکہ رویہ کے لحاظ سے اُن سے بھی بدتر۔

حلّ لُغات۔اَلْهَوٰى اَلْهَوٰى کے معنے ہیں اَلْعِشْقُ يَكُوْنُ فِي الْخَيْرِ وَالشَّرِّ۔کسی چیز کے حصول کی شدید تڑپ خواہ وہ چیز اچھی ہو یا بُری۔اِرَادَةُ النَّفْسِ نفس کی خواہش۔اَلْمَهْوِيُّ مَحْمُوْدًا كَانَ اَوْ مَذْمُوْمًا ثُمَّ غَلَبَ عَلٰى غَيْرِ الْمَحْمُوْدِ۔مطلوب ومقصود خواہ وہ اچھا ہو یا بُرا۔لیکن عام طور پر هَوٰى کا لفظ ناپسندیدہ مقصد کے لئے بولا جاتا ہے۔(اقرب)

تفسیر۔اس آیت کے متعلق مفسرین لکھتے ہیں کہ اس میں قلب واقعہ ہوا ہے۔یعنی اِتَّخَذَ کا مفعول اوّل جو اِلٰهَهٗ ہے یہ دراصل مفعولِ ثانی ہے اور هَوَاهُ جو مفعولِ ثانی ہے یہ مفعولِ اوّل ہے اور اس کے معنے یہ ہیں کہ کیا تو نے اُس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہشات نفسانی کو اپنا معبود بنالیا ہے۔ان معنوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اُن کے نزدیک اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ کفار کی یہ حالت ہے کہ جو کچھ اُن کا نفس انہیں کہتا ہے اُس کے پیچھے چل پڑتے ہیں۔انہیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ خدا اور اُس کے رسول کے کیا احکام ہیں وہ صرف اپنی نفسانی خواہشات کے غلام ہیں۔یعنی انہوں نے اپنی ہوا و ہوس کو ہی اپنا معبود بنایا ہوا ہے۔لیکن میرے نزدیک یہاں قلب نہیں بلکہ اسی طرح کلام ہے اور اس کے معنے یہ ہیں کہ اے رسول! بتا تو سہی کہ جو شخص اپنے معبود کو اپنی خواہشات نفس کا درجہ دیتا ہو۔یعنی جس طرح خواہشات پر انسان حکومت کرتا ہے اسی طرح وہ خدا پر حکومت کرنا چاہے تو ایسے شخص کو کون فائدہ پہنچا سکتا ہے۔گویا اِتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ کا یہ مفہوم ہے کہ انہوں نے اپنے معبود کو وہی مقام دیا ہے جو هَوٰى کو دیا جاتا ہے۔اور اِلٰهَهٗ کو هَوٰى انہوں نے اس طرح بنالیا کہ جس طرح هَوٰى پر انسان اقتدار رکھتا ہے اور جو بات اُس کی عقل میں آتی ہے یا اس کو مفید سمجھتا ہے اُسے قبول کر لیتا ہے اور جس بات کو وہ مضر سمجھتا ہے اُسے ردّ کر دیتا ہے۔اسی

طرح یہ لوگ خدا تعالیٰ پر بھی حکومت کرنا چاہتے ہیں اور اپنے آپ کو اس کا کلی طور پر تابع فرمان نہیں سمجھتے۔ بلکہ اگر خدا تعالیٰ کی کوئی بات اُن کی سمجھ میں نہ آئے تو وہ برملا کہہ دیتے ہیں کہ خواہ یہ بات خدا نے کہی ہو ہم اسے ماننے کے لئے تیار نہیں کیونکہ ہماری عقل اور سمجھ میں نہیں آتی۔

یہ ایک ایسا نقص ہے جس میں آجکل کے مغرب زدہ نوجوان بڑی کثرت سے مبتلا ہیں۔ وہ بجائے اس کے کہ خدا تعالیٰ کے احکام کے تابع چلیں اور اپنے دلوں میں اُن کی عظمت محسوس کریں وہ خدا تعالیٰ پر بھی اپنی حکومت جتاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ کوئی ایسا حکم دینے کا مجاز نہیں جسے وہ خود اپنے لئے مفید نہ سمجھتے ہوں۔ چنانچہ اس بارہ میں مجھے ایک لطیف مثال یاد آئی۔ ۱۹۴۷ء یا ۱۹۴۸ء میں مَیں پشاور گیا وہاں ایک دوست نے میری دعوت کی جس میں بعض غیر احمدی فوجی افسر بھی مدعو تھے۔ میں نے دوران گفتگو میں ایک آیت پیش کی اس پر ایک بڑے فوجی افسر نے اعتراض کیا کہ یہ بات تو غلط ہے۔ میں نے کہا پہلے آپ کو یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ یہ آیت قرآن میں ہے یا نہیں پھر یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ قرآن خدا کا کلام ہے یا نہیں اور اس آیت سے یہی معنے نکلتے ہیں جو میں نے کئے ہیں یا اور معنے نکلتے ہیں۔ انہوں نے کہا یہ آیت بھی قرآن میں ہے اور قرآن خدا تعالیٰ کا کلام بھی ہے اور معنے بھی اس کے وہی ہیں جو آپ نے کئے ہیں۔ اس پر میں نے کہا تب یہ سوال نہیں کہ یہ آیت درست ہے یا نہیں بلکہ سوال یہ رہ جاتا ہے کہ خدا زیادہ جانتا ہے یا آپ زیادہ جانتے ہیں۔ اس بات کو سن کر وہ خاموش ہو گئے اور ایک دو منٹ تک اُن کا چہرہ سُرخ رہا۔ اور خاموش بیٹھے رہے مگر چونکہ آدمی دیانتدار تھے اور سچی بات کہنا پسند کرتے تھے اس لئے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد انہوں نے سر اٹھایا۔ اور کہنے لگے کہ معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے کہ میں خدا سے زیادہ جانتا ہوں۔ اس پر سب مجلس کے لوگ ہنس پڑے اور وہ اور بھی شرمندہ ہوئے۔

غرض کئی لوگ خدا تعالیٰ کو بھی اپنا تابع قرار دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اُسے ہمارے ذاتی یا قومی یا سیاسی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ فرماتا ہے جو شخص اپنے کبر میں یہاں تک ترقی کر جائے اور اپنے معبود کو وہی مقام دینا شروع کر دے جو ہوا و ہوس کو دیا جاتا ہے تو ایسے انسان کو کون فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ فائدہ تو صرف ایسے لوگ ہی اُٹھاتے ہیں جو خدا تعالیٰ کو اپنا حاکم تصوّر کرتے اور انانیت کو ہر پہلو سے کچل دیتے ہیں۔ جب وہ ایسا کرتے ہیں تب اُن میں خدا تعالیٰ کا وہ نور ظاہر ہوتا ہے جو انہیں دوسرے لوگوں سے ممتاز کر دیتا ہے۔ پھر فرماتا ہے تمہیں ظاہر میں تو یہی نظر آتا ہے کہ یہ لوگ بھی دین کی باتیں سنتے اور سمجھتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ جانوروں کی طرح ہیں۔ بلکہ جانوروں سے بھی بدتر ہیں کیونکہ جانور بھی اپنے محسن کی طرف رجوع کرتا ہے اور اپنے آقا اور مالک کا تابع فرمان

رہتا ہے مگر یہ لوگ تو اپنے محسن کو چھوڑ کر بھاگے جا رہے ہیں اور اُس کی عظمت سے ان کے دل خالی ہو چکے ہیں۔ ایسے لوگوں نے خدا تعالیٰ کی رحمت اور اُس کے قرب سے کیا حصہ لینا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّكَ كَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَ لَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ

(اے قرآن کے مخاطب) کیا تجھے معلوم نہیں کہ تیرے رب نے کس طرح سایہ کو لمبا کیا ہے اور اگر وہ چاہتا تو

سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَیْهِ دَلِیْلًا ۙ﴿۴۶﴾ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ

اسے ایک جگہ ٹھہرا ہوا بنا دیتا۔ پھر ہم نے سورج کو اس پر ایک گواہ بنا دیا پھر ہم اس کو آہستہ آہستہ

اِلَیْنَا قَبْضًا یَّسِیْرًا ﴿۴۷﴾

اپنی طرف کھینچنا شروع کرتے ہیں۔

حلّ لُغات ۔دَلِیْلًا اَلدَّلِیْلُ کے معنے ہیں اَلْمُرْشِدُ ۔راستہ دکھانے والا ۔مَابِهٖ یَقُوْمُ الْاِرْشَادُ جس کے ذریعہ سے راہنمائی حاصل کی جاتی ہے۔اردو میں نشان بھی کہتے ہیں۔(اقرب)

تفسیر ۔فرماتا ہے کیا تو نے اپنے رب کے اس احسان کو نہیں دیکھا کہ اُس نے کس طرح سائے کو لمبا کر دیا ہے۔وَ لَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا اور اگر وہ چاہتا تو وہ اس کو ساکن بنا دیتا۔ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَیْهِ دَلِیْلًا پھر ہم نے سورج کو اس پر ایک دلیل بنایا ہے۔

یہ آیت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور قرآن کریم کے منجانب اللہ ہونے پر ایک زبردست دلیل ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ جب سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں ظہور فرمایا ہے اُس وقت سے لے کر آج تک برابر آپؐ کا سایہ کسی نہ کسی شکل میں ممتد ہوتا چلا جاتا ہے۔آپؐ کی زندگی میں ایک ساعت بھی تو ایسی نہیں آئی کہ آپؐ نے ترقی کی طرف قدم نہ اٹھایا ہو۔ پہلے ہی دن جب آپؐ پر الہام نازل ہوا اور آپؐ اس بات سے گھبرائے کہ یہ کام میں کیونکر سرانجام دے سکوں گا۔دلوں کا فتح کرنا کوئی معمولی بات نہیں تو آپ اُسی گھبراہٹ میں اپنے گھر تشریف لائے اور اپنی بیوی حضرت خدیجہؓ سے اس خدشہ کا اظہار فرمایا کہ اتنی بڑی ذمہ داری خدا تعالیٰ نے مجھ پر ڈال دی ہے۔اب میں کیا کروں۔اس پر پہلا ہی جواب جو آپؐ کی بیوی نے آپ کو دیا وہ یہ تھا کہ كَلَّا وَاللّٰهِ

لَا یُخْزِیْكَ اللّٰہُ اَبَدًا ۔آپ کسی قسم کا وہم اپنے دل میں پیدا نہ کریں۔خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی ذلیل یعنی ناکام نہیں کرے گا۔گویا جس وقت آپؐ نے اپنے خدشات کا اظہار فرمایا خدا تعالیٰ نے معًا آپؐ کے سایہ کو بڑھا دیا اور آپؐ کی بیوی آپؐ کے مذہب میں شامل ہو گئی۔

عورتیں بظاہر تردّد کرنے والی اور متشکک طبیعت کی ہوتی ہیں مگر حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کی بات کو سُنتے ہی کہا کہ پہلا سایہ تو میں آپؐ کا بنتی ہوں۔پس فرماتا ہے اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّكَ كَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ۔کیا دیکھتے نہیں کہ ہم کس طرح تیرے سایہ کو بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔پھر حضرت خدیجہؓ آپ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔وہ عربوں میں سے یہودی اور اسرائیلی علوم کے ماہر تھے۔جب حضرت خدیجہؓ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن کے سامنے پیش کیا اور سارا واقعہ سُنایا تو انہوں نے کہا ھٰذَا النَّامُوْسُ الَّذِیْ نَزَّلَ اللّٰہُ عَلٰی مُوْسٰی (بخاری کتاب بدء الوحی باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ؐ) ان پر تو وہی فرشتہ اُترا ہے جو خدا تعالیٰ نے موسیٰؑ پر نازل کیا تھا۔اس طرح ورقہ نے بھی بزبانِ حال کہا کہ میں بھی آپ کے سایہ میں شامل ہوتا ہوں۔یہی حقیقت اللہ تعالیٰ اس آیت میں بیان فرماتا ہے کہ اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّكَ كَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ تم دیکھتے نہیں کہ ہم تمہارے سایہ کو کس طرح بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔پہلے ہی دن جب آپ دوسرے آدمی کے پاس پہنچے تو آپؐ کا سایہ اور لمبا ہو گیا۔پھر جب گھر میں آکر اس بات کا ذکر میاں بیوی نے کیا تو ایک آزاد کردہ غلام کھڑا ہو گیا اور اُس نے کہا کہ مجھے بھی اپنے سائیوں میں شامل کر لیجئیے۔جوانی کے قریب پہنچے ہوئے علیؓ کھڑے ہوئے اور انہوں نے کہا کہ میں بھی آپ کا سایہ بنتا ہوں۔آپؐ کے بچپن کے دوست حضرت ابوبکرؓ نے جب یہ واقعہ سنا تو وہ دوڑتے ہوئے آئے اور انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ! میں بھی آپ پر ایمان لاتا ہوں۔یہی وہ حقیقت ہے جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے کہ اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّكَ كَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ۔

دنیا میں نبیوں کی مخالفتیں تو ہوا ہی کرتی ہیں اور آپ کی بھی سخت مخالفت ہوئی۔لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائی ایام میں ہی وہ لوگ جو آپ کے اردگرد رہتے تھے یا جن کی رائے کوئی اہمیت رکھتی تھی آپؐ کے ساتھ شامل ہو گئے۔اور اس طرح آپؐ کا سایہ فوراً ہی ممتد ہو گیا۔ایک دن بھی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسا نہیں گذرا کہ آپ کا سایہ لمبا نہ ہوا ہو۔یہ نہیں ہوا کہ آپ کے دعویٰ پر ایک دن گذر گیا ہو اور آپ کا کوئی تابع نہ ہوا ہو۔دو دن گذر گئے ہوں اور آپ کا کوئی تابع نہ ہوا ہو یا مہینہ دو مہینے گزر گئے ہوں اور آپؐ کا کوئی تابع نہ ہوا ہو۔بلکہ پہلے ہی دن جب آپ اللہ تعالیٰ کے الہام کا ذکر فرماتے ہیں تو فوراً آپ کا سایہ لمبا ہو جاتا ہے اور حضرت خدیجہؓ آپ پر ایمان لے آتی ہیں۔پھر اُسی دن جب آپؐ چل کر باہر ورقہ بن نوفل کے پاس پہنچتے ہیں

تو ورقہ بن نوفل آپؐ پر ایمان لے آتا ہے۔ گھر میں آپ نے بات کی تو حضرت علیؓ اور زیدؓ ایمان لے آئے۔ اور پھر اُسی شام یا دوسری شام حضرت ابوبکرؓ بھی آپ پر ایمان لانے والوں میں شامل ہو گئے۔ گویا نہ صرف خدا تعالیٰ نے فوراً آپؐ کا سایہ پیدا کر دیا بلکہ وہ اس سایہ کو لمبا کرتا چلا گیا۔ پھر بڑھتے بڑھتے اور بھی کئی جماعتیں اس سایہ میں شامل ہونی شروع ہوئیں۔ مدینہ میں خبر پہنچی تو وہاں کے کئی افراد دوڑتے ہوئے آئے اور آپ پر ایمان لے آئے۔ حبشہ میں مسلمان گئے تو نجاشی نے اسلام قبول کر لیا۔ غرض قدم قدم پر آپؐ کا سایہ بڑھتا اور ترقی کرتا چلا گیا۔

پھر فرماتا ہے۔ وَ لَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا اگر خدا تعالیٰ کی تائید اور اُس کی نصرت تیرے شاملِ حال نہ ہوتی اور تو خدا تعالیٰ کا سچا رسول نہ ہوتا تو چاہیے تھا کہ تیرے سایہ کو بڑھانے اور اس کو ترقی دینے کی بجائے خدا تعالیٰ تیرے سایہ کو چھوٹا کر دیتا۔ پس کیا تو خدا تعالیٰ کی اس مدد کو نہیں دیکھتا کہ وہ تیرے سایہ کو لمبا کرتا چلا جاتا ہے اور کیا تیرے منکروں اور دشمنوں کو یہ دکھائی نہیں دیتا کہ ہم کس طرح تیرے سایہ کو لمبا کرتے چلے جا رہے ہیں۔ پھر بعض سائے ایسے ہوتے ہیں جو اتفاقی حادثہ کے رنگ میں ظاہر ہوتے ہیں اور گو وہ سائے بھی بڑھتے اور ترقی کرتے ہیں لیکن جس قدر وہ سائے ممتد ہوتے چلے جاتے ہیں صاف ظاہر ہوتا جاتا ہے کہ دنیوی ذرائع اور مادی سامان ان کو لمبا کرنے میں کام کر رہے ہیں۔ الٰہی تائید اور نصرت کا اُن میں ہاتھ نہیں۔ مگر فرماتا ہے ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا تمہارا سایہ صرف لمبا ہی نہیں ہوا بلکہ ہم سورج کو بھی اس پر دلیل بنا رہے ہیں۔ یعنی ہر شخص کو نظر آ رہا ہے کہ یہ سایہ مصنوعی ذرائع سے پیدا نہیں ہوا۔ دنیا میں سایہ لیمپوں سے بھی بنایا جا سکتا ہے۔ ایک درخت کے پیچھے لمپ رکھ دو تو اس کا سایہ بن جائے گا۔ موم بتی جلا دو تب بھی سایہ بن جائے گا۔ مگر موم بتی اور لیمپ خدائی ذرائع نہیں انسانی ذرائع ہیں لیکن سورج ایک ایسی چیز ہے جو محض خدائی ذریعہ ہے۔ پس فرماتا ہے ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا۔ تیری ترقی الٰہی سامانوں اور نصرتوں کی وجہ سے ہے نہ کہ انسانی سامانوں اور مادی ذرائع کی وجہ سے۔ کیا دشمن اس بات کو دیکھتا نہیں کہ ایک طرف تیری ترقی پر ترقی ہو رہی ہے اور دوسری طرف تیری ترقی مادی سامانوں اور انسانی ہاتھوں سے نہیں بلکہ خدائی ہاتھ تجھ کو بڑھاتا چلا جا رہا ہے۔ یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ تو ہمارا سچا رسول ہے۔ اس کے بعد فرماتا ہے کہ ہم اس سایہ کو کھینچ لیں گے اور تین سو سال بعد اسلام پر رات آنے لگے گی۔ مگر اس کے بعد پھر دن چڑھے گا جس کی وَ جَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا (الفرقان:۴۸) میں خبر دی گئی ہے۔ اور مسلمان سورج کے نئے طلوع کے ذریعہ سے بیدار ہونے لگیں گے۔ اس آیت کے ماتحت ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں احمدیت بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک سایہ ہے۔ ہر شخص جو احمدیت میں ہوتا ہے اور ہر شخص جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام پر ایمان لاتا ہے وہ محمد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ کو اور زیادہ ممتد کر دیتا ہے۔اسی طرح ہر تائید سماوی اور ہر الٰہی نصرت جو ہمیں حاصل ہوتی ہے وہ صاف طور پر اس حقیقت کو واضح کر رہی ہے کہ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا۔یہ سب کچھ خدائی نصرت اور تائید سے ہو رہا ہے۔انسانی سامانوں سے نہیں ہو رہا۔آخر وہ کونسی چیز ہے جس میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دنیا کی اتباع کی ہے۔یا کون سا مسئلہ ہے جس کے متعلق رائج الوقت خیالات کی اصلاح کرنے کی آپ نے کوشش نہیں کی بیسیوں مسائل ہیں جن کے متعلق قرآنی تعلیم کی تشریح کرتے ہوئے آپ نے موجودہ زمانہ کی رَو کے بالکل خلاف اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے اور لوگوں کے پیچھے چلنے کی بجائے دنیا کو اپنے پیچھے چلایا ہے۔موجودہ زمانہ میں اقتصادیات کی طرف لوگوں کا بہت بڑا رجحان ہے۔چنانچہ کئی لوگ کہا کرتے ہیں کہ مذاہب کی آپس کی جنگ درحقیقت یونہی ہے اصل جھگڑا روٹی کا ہے اس جھگڑے کا فیصلہ ہو جائے تو مذاہب کی جنگ بالکل ختم ہو جائے۔لیکن حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انشورنس اور سود کو منع کر کے بظاہر لوگوں کے لئے روٹی کے سامان بالکل بند کر دیئے ہیں (ملفوظات جلد ۳ صفحہ ۱۶۷، ۱۶۸)۔اگر دنیا میں روٹی کا ہی جھگڑا ہوتا تو چاہیے تھا کہ اس تعلیم کی وجہ سے لوگ حضرت مرزا صاحب سے دُور بھاگتے اور کہتے کہ یہ شخص ہماری روٹی بند کرتا ہے۔ہمیں سود سے منع کرتا ہے ہمیں انشورنس سے روکتا ہے۔ہمیں ہر قسم کی ٹھگیوں اور دھوکا بازیوں سے مجتنب رہنے کی تعلیم دیتا ہے اور یہ چیز ایسی ہے جسے ہم برداشت نہیں کر سکتے۔مگر ہوا یہ کہ اس تعلیم کے باوجود لاکھوں لوگ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف کھنچے چلے آئے۔

دوسرے نمبر پر یہ زمانہ مذہبی آزادی کا ہے مسلمانوں کے قدیم سے قدیم خاندان بھی اسلامی ثقافت کو چھوڑتے چلے جاتے ہیں اور مذہب کے خلاف دنیا میں ایک عام رو چل رہی ہے لیکن حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے متبعین کو مذہب کی طرف توجہ دلائی۔چنانچہ خدا تعالیٰ کے فضل سے باوجود اس کے کہ ہماری جماعت میں دوسروں سے زیادہ تعلیم ہے پھر بھی وہ لوگ مذہب کی طرف دوسروں سے زیادہ توجہ کر رہے ہیں اور جماعت کے لیڈر اُن کو اس میں زیادہ سے زیادہ پختہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

پھر یہ زمانہ سڑائیکوں کا ہے۔جتھے بنا بنا کر حکومتوں کے خلاف کھڑے ہو جانا یا مالکوں اور کارخانہ داروں اور اُستادوں وغیرہ سے اپنے مطالبات منوانے کے لئے سڑائیک کر دینا ایک عام بات ہے۔اور اسے اپنے مطالبات منوانے کے لئے ایک ضروری حربہ تصوّر کیا جاتا ہے۔لیکن حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سڑائیک سے بھی منع فرما دیا (ملفوظات جلد ۵ صفحہ ۱۷۲، ۱۷۳)۔مگر باوجود اس کے ہماری جماعت میں کثرت سے طلباء اور گورنمنٹ

سروس کے نوجوان داخل ہوتے ہیں۔ حالانکہ سٹرائیکوں میں طلباء اور نوجوانوں کا ہی زیادہ تر دخل ہوتا ہے۔ اسی طرح مزدور پیشہ لوگ بھی ہماری جماعت میں داخل ہوتے ہیں۔ حالانکہ بظاہر اُن کے مفاد کے خلاف حکم دیا گیا تھا۔

غرض فرماتا ہے ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا تمہاری ترقیات جس قدر ہوں گی انسانی تدابیر سے باہر ہوں گی اس کا یہ مطلب نہیں کہ مادی تدابیر نہیں کی جائیں گی بلکہ مطلب یہ ہے کہ مادی تدابیر کے سامان بھی خدا تعالیٰ خود مہیا کرے گا تم نہیں کرو گے۔

پس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ نے ایک سایہ دار درخت بنایا ہے جو قرآن کریم کی اس پیشگوئی کے ماتحت کہ اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ دنیا میں روز بروز بڑھتا چلا جائے گا۔ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کی طرف سے نہ ہوتے تو کیا خدا تعالیٰ میں یہ طاقت نہیں تھی کہ وہ اس کو ساکن کر دیتا۔ اگر اس سایہ کے بڑھانے میں انسانی تدابیر کام کر رہی ہوتیں خدا تعالیٰ کا اس سلسلہ میں کوئی دخل نہیں تھا تو چاہیے تھا کہ خدا تعالیٰ اس کو ترقی سے محروم کر دیتا۔ مگر فرماتا ہے بجائے اس کے کہ وہ اس کو ساکن کرتا وہ اس پر دلیل بن گیا ہے اور اپنی نصرتوں اور تائیدات سے اس کو بڑھاتا چلا جا رہا ہے۔ اور جس سلسلہ کو خدا تعالیٰ مٹاتا نہیں بلکہ بڑھا رہا ہے اس کے سچا اور خدائی ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ فتح کیا تو جن شدید ترین دشمنوں نے مسلمانوں کو قتل کیا تھا یا جنہوں نے مسلمان شہداء کی ہتک کی تھی یا جنہوں نے انگیخت کر کے مسلمانوں کو شہید کیا تھا یا شہید کروایا تھا اُن میں سے بعض افراد کے متعلق اس موقعہ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دے دیا کہ وہ جہاں بھی مل جائیں اُن کو قتل کر دیا جائے۔ انہی میں سے ایک ہندہ بھی تھی جب اُسے معلوم ہوا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے قتل کرنے کا حکم دے دیا ہے تو وہ عورتوں میں چھپی چھپی آپ کے پاس پہنچ گئی۔ جب عورتوں کی بیعت ہونے لگی تو وہ بھی اُن عورتوں کے ساتھ مل کر الفاظ بیعت دوہراتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم اقرار کرو کہ ہم شرک نہیں کریں گی۔ اُس وقت ہندہ اپنی جوشیلی فطرت کے اُبھار کو روک نہ سکی اور جھٹ بول اُٹھی کہ یا رسول اللہ کیا اب بھی ہم شرک کریں گی؟ آپ اکیلے تھے اور ہم ایک زبردست قوم تھے۔ آپ اکیلے نے توحید کی آواز بلند کی اور ہماری ساری قوم نے مل کر آپ کے مقابلہ میں بتوں کی عظمت قائم کرنے کا تہیہ کیا۔ ہمارا اور آپ کا مقابلہ ہوا۔ اور اس مقابلہ میں ہم نے اپنا سارا زور صرف کر دیا مگر اس کے باوجود ہم گھٹتے چلے گئے اور آپ بڑھتے چلے گئے ہم ہارتے چلے گئے اور آپ جیتتے چلے گئے۔ اگر ہمارے بتوں میں کچھ بھی طاقت ہوتی تو کیا یہ ہو سکتا تھا کہ آپ

ہمارے مقابلہ میں جیت جاتے۔ آپ کا ہمارے مقابلہ میں اکیلے ہوتے ہوئے جیت جانا ثبوت ہے اس بات کا کہ ہمارے بت بالکل بیکار ہیں اور خدائے واحد کی ہی اس دنیا پر حکومت ہے جس نے آپ کی مدد کی اور ہم سب کو آپ کے مقابلہ میں شکست دی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہندہ ہے؟ ہندہ بھی جانتی تھی کہ اسلام کی حکومت صرف مجھ پر ہی نہیں بلکہ خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ہے۔ اُس نے کہا ہاں ہندہ ہوں۔ مگر مسلمان ہندہ۔ اب آپ کا وہ زور مجھ پر نہیں چل سکتا جو پہلے چل سکتا تھا۔ کیونکہ اسلام سب گناہوں کو مٹا دیتا ہے (طبری سنة ۸ ذکر الخبر عن فتح المکة) تو الٰہی مدد کا ہونا ثبوت ہوتا ہے اس بات کا کہ وہ شخص راستباز ہے۔ اور الٰہی مدد کا ثبوت یہ ہوتا ہے کہ باوجود دنیوی مخالفت کے ایک قوم بڑھتی چلی جاتی ہے اور کوئی روک اُس کی ترقی میں حائل نہیں ہوسکتی کیونکہ اللہ تعالیٰ مومن قوم کی پشت پر آجاتا ہے اور اس کے سایہ یعنی تصرف کو لمبا کر دیتا ہے۔ اور اگر وہ ایسا نہ کرتا تو سایہ ایک جگہ ٹکا رہتا۔ یعنی مومن دنیا میں کوئی ترقی نہ کرتے۔ پھر جس طرح سورج کے مقام کو دیکھ کر پتہ لگ جاتا ہے کہ سایہ کدھر جائے گا۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کی تائیدات کو دیکھ کر یہ پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ کونسی قوم ترقی کرے گی۔ ہاں یہ الٰہی مدد ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی۔ ایک مدت کے بعد جب قوم خراب ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کی پشت پناہی چھوڑ دیتا ہے اور وہ سایہ غائب ہو جاتا ہے۔ پس کوشش کرو کہ تمہارا خدا تمہیں اور تمہاری اولادوں کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ممتد سایہ بنا دے اور تمہیں ایسی توفیق عطا فرمائے کہ تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ کو ہمیشہ قائم رکھنے اور اُس کو آگے سے آگے بڑھانے کا موجب بنو۔ تا کہ شمس والی دلیل ہمیشہ قائم رہے اور تمہارے لئے الٰہی نصرتیں ظاہر ہوتی رہیں اور انسانی تدابیر تمہارے مقابلہ میں ہمیشہ ناکام رہیں۔

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا وَّ النَّوْمَ سُبَاتًا وَّ

اور وہی (خدا) ہے جس نے رات کو تمہارے لئے لباس بنایا اور نیند کو آرام کا موجب

جَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا ﴿۴۸﴾

اور دن کو پھیلنے اور ترقی کا ذریعہ۔

حلّ لُغات۔ اَلسُّبَاتُ أَلسُّبَاتُ کے معنے ہیں اَلدَّهْرُ۔ زمانہ۔ نیز اس کے معنے ہیں اَلنَّوْمُ۔ نیند وَقِيْلَ اِبْتِدَاؤُهُ فِي الرَّأْسِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْقَلْبَ یعنی بعض ماہرین لُغت کہتے ہیں کہ سبات کا لفظ نیند کی ابتدائی

حالت کے متعلق استعمال کرتے ہیں جبکہ وہ دماغ پر حاوی ہو کر سارے جسم پر مستولی ہو جاتی ہے۔ وَقِيْلَ اَصْلُهٗ اَلرَّاحَةُ۔ اور بعض ماہرین لُغت یہ کہتے ہیں کہ سبات کے اصل معنے راحت اور آرام کے ہیں۔(اقرب)

تفسیر۔اس میں بتایا کہ رات اور دن کا تسلسل اور انسانی نیند بھی خدا تعالیٰ کے احسانات کا ایک ظہور ہیں۔ رات تو انسان کے لئے لباس کا کام دیتی ہے اور اُس کے بہت سے عیوب کو ڈھانپ لیتی ہے چنانچہ سوتے وقت کی کئی حالتیں ایسی ہوتی ہیں جو اگر دن کے وقت ظاہر ہوں تو لوگوں کو بہت معیوب دکھائی دیں۔مگر رات کی تاریکی کی وجہ سے وہ دوسروں کی نظر سے اوجھل رہتی ہیں۔کیونکہ وہ خود بھی اُس وقت سو رہے ہوتے ہیں۔اور اس طرح انسان کے کئی نقائص پر پردہ پڑا رہتا ہے۔اسی طرح نیند انسانی راحت اور آرام کا موجب بنتی ہے۔اور جسم نئے سرے سے طاقتیں حاصل کر لیتا ہے۔اگر نیند نہ آئے تو انسان چند دنوں میں ہی پاگل ہو جائے یہ نیند ہی ہے جس کی وجہ سے انسان کی تمام طاقتیں برقرار رہتی ہیں اور وہ ہر صبح تازہ دم ہو کر اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔

پھر فرماتا ہے وَجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا اُس نے دن کو انسانوں کے اِدھر اُدھر پھیلانے کا ذریعہ بنایا ہے۔چنانچہ وہ اس کی روشنی میں چاروں طرف دوڑے پھرتے اور اپنی معیشت کا سامان مہیا کرتے ہیں۔یہی رات اور دن کا تسلسل ہمیں قومی زندگی میں بھی دکھائی دیتا ہے۔کبھی قوموں پر لیل کا زمانہ آتا ہے اور کبھی نہار کا۔زمانۂ لیل میں اُن کے تمام عیوب مخفی رہتے ہیں لیکن جب خدا تعالیٰ کا کوئی مامور اور مصلح کھڑا ہوتا ہے اور اس کے ذریعہ ایک نیا دن چڑھتا ہے تو صرف دوسرے لوگوں کو ہی اُن کے عیوب نظر نہیں آتے بلکہ خود انہیں بھی اپنی خامیاں محسوس ہونے لگتی ہیں اور اُن کے اندر اصلاح کا ایک نیا جذبہ پیدا ہونے لگتا ہے۔اور رفتہ رفتہ وہ بھی ترقی کر جاتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ بُشْرًۢا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۚ

اور وہ (خدا) ہی ہے جس نے ہواؤں کو اپنی رحمت سے پہلے بشارت دینے کے لئے بھیجا۔اور ہم نے بادل

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ﴿۴۹﴾ لِّنُحْيِۦَ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا وَّ

سے پاک (وصاف) پانی اتارا ہے۔تاکہ اس کے ذریعہ سے مردہ ملک کو زندہ کریں اور اسی طرح اُس (پانی) سے

نُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّاَنَاسِيَّ كَثِيْرًا ﴿۵۰﴾ وَلَقَدْ

اپنے پیدا کئے ہوئے چارپائیوں اور بہت سے انسانوں کو سیراب کریں۔اور ہم نے اُس (پانی) کو اُن (یعنی انسانوں)

صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا ۖ فَاَبٰۤى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا

میں خوب پھیلا دیا تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔لیکن لوگوں میں سے اکثر لوگ کفر کے سوا کسی بات پر راضی

كُفُوْرًا ۝۵۱ وَ لَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا ۝۵۲ۖ

نہیں ہوتے۔اور اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ایک ہوشیار کرنے والا (نبی یا مامور) بھیج دیتے۔پس تو کافروں کی بات

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ جَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ۝۵۳

نہ مان اور اس (یعنی قرآن) کے ذریعہ سے ان سے بڑا جہاد کر۔

تفسیر ۔فرماتا ہے وہ خدا ہی ہے جو بارشوں سے پہلے لوگوں کو بشارت دینے کے لئے ہوائیں بھیجتا ہے اور بادلوں سے پاک کرنے والا پانی نازل کرتا ہے۔جس کے نتیجہ میں مردہ بستیاں بھی زندہ ہو جاتی ہیں۔اور ہم اس پاکیزہ پانی سے جانوروں اور بہت سے انسانوں کو سیراب کرتے ہیں اور یہ سب نصیحت کی باتیں ہیں جن کو ہم انسانوں کے سامنے رکھتے ہیں تا کہ وہ ہدایت حاصل کریں۔یعنی جسمانی پانی کو دیکھ کر وہ سمجھ لیں کہ خدا تعالیٰ نے روحانی پانی بھی اُتارا ہوگا۔لیکن لوگ جسمانی پانی کی تو قدر کرتے ہیں مگر روحانی پانی سے انکار کر دیتے ہیں۔اور اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں اپنا رسول بھیج دیتے مگر ہم رسول صرف ایک ہی بستی میں بھیجتے ہیں جہاں سے وہ سارے علاقہ میں تبلیغ کرتا ہے۔پس اے ہمارے رسول! تو کافروں کی بات نہ مان اور اس قرآن کے ذریعہ اُن سے جہادِ کبیر کر۔

ان آیات میں کلام الٰہی سے تشبیہہ دینے کے لئے پہلے پانی کا ذکر کیا گیا ہے۔اور بتایا گیا ہے کہ جس طرح جسمانی پانی کو لوگوں میں پھیلا دیتے ہیں اور مردہ بستیوں کو اس کے ذریعہ زندہ کر دیتے ہیں۔اسی طرح ہم نے قرآن کریم کو اُن کے سامنے پیش کر دیا ہے مگر اکثر لوگ کفرانِ نعمت کرتے ہیں وہ پانی کی نعمت تو قبول کر لیتے ہیں مگر کلام الٰہی کی نعمت جو اس سے بہت زیادہ بہتر ہے اُسے ردّ کر دیتے ہیں۔گویا وہ کوڑیوں پر تو جان دیتے ہیں مگر اشرفیاں قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور یہ بالکل بچوں والی بات ہے۔میں ایک دفعہ بمبئی گیا تو وہاں اُن دنوں عدالت میں ایک تازہ کیس چل رہا تھا جو اس طرح ہوا کہ کسی جوہری کے ساٹھ ہیرے جو کئی لاکھ روپیہ کی مالیت کے تھے کہیں گر گئے۔اُس نے پولیس میں رپورٹ کر دی۔پولیس نے تحقیقات کرتے ہوئے ایک آدمی کو پکڑ لیا۔جس سے کچھ ہیرے بھی برآمد ہو گئے۔جب اس سے پوچھا گیا کہ اُس نے یہ ہیرے کہاں سے لئے تھے تو اُس نے

بتایا کہ میں بازار میں سے گذر رہا تھا کہ چند لڑکے ان ہیروں سے گولیاں کھیل رہے تھے۔ میں نے انہیں دو چار پیسے دے کر ہیرے لے لئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اُس جوہری نے کسی موقعہ پر اپنی جیب میں سے رومال نکالا تو یہ ہیرے جو ایک پڑیہ میں تھے اُس کے ساتھ ہی نکل کر زمین پر گر گئے۔ اور بچوں نے یہ سمجھا کہ یہ کھیلنے کی گولیاں ہیں حالانکہ وہ کئی لاکھ روپے کا مال تھا۔ یہی حال لوگوں کا ہے۔ وہ اُس پانی کی تو قدر کریں گے جو سڑ جاتا اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ناکارہ ہوجاتا ہے۔ مگر جو پانی اُن کے اور اُن کی آئندہ نسلوں کے کام آنے والا ہے اور جو نہ صرف اس زندگی میں بلکہ اگلے جہان میں بھی کام آتا اور انسان کی کایا پلٹ دیتا ہے اُس کو رّد کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم اس کو نہیں لیتے۔ لوگوں کی اسی کیفیت کا اللہ تعالیٰ ان زیر تفسیر آیات میں ذکر کرتا اور فرماتا ہے کہ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا۔ اکثر لوگ ہماری اس عظیم الشان نعمت کا کفر ہی کرتے ہیں۔ حالانکہ اگر ہم چاہتے تو دنیا کی ہر بستی میں نذیر بھیج دیتے۔ یعنی اگر ہم لوگوں پر جلدی حجت تمام کرنا چاہتے تو بجائے اس کے کہ ایک رسول بھیجتے اور اُس کی تعلیم آہستہ آہستہ پھیلتی ہر بستی میں ایک ایک نذیر بھیج دیتے مگر ہم نے ایسا کیوں نہیں کیا اس لئے کہ اگر سب لوگ کفر کرتے تو دنیا کی تمام بستیوں پر یکدم عذاب آجاتا اور سب لوگ ہلاک ہوجاتے۔ مگر اب ایسا نہیں ہوتا بلکہ اب پہلے عرب پر اتمام حجت ہوتی ہے اور اُس پر عذاب آتا ہے۔ پھر کچھ اور عرصہ گذرتا ہے تو ایران پر اتمام حجت کے بعد عذاب آجاتا ہے۔ اگر ہر بستی اور ہر گاؤں میں اللہ تعالیٰ کے نبی مبعوث ہوتے تو ہر بستی اور ہر گاؤں پر وہ عذاب نازل ہوتا جو اَب براہ راست ایک حصۂ زمین کے مخالفوں پر نازل ہوتا ہے۔ پس فرماتا ہے تو ان کافروں کی باتیں نہ مان بلکہ قرآن کریم کے ذریعہ سب دنیا کے ساتھ جہاد کر جو سب سے بڑا جہاد ہے یعنی تبلیغ کا جہاد جس کے قریب جانے سے بھی آج کل کے مسلمان کا دم گھٹتا ہے۔ وہ اس جہاد سے تو اس بہانہ سے بھاگتا ہے کہ اصل جہاد تلوار کا ہے۔ اور تلوار کے جہاد سے اس لئے بھاگتا ہے کہ دشمن بہت طاقتور ہے مولوی فتویٰ دیتا ہے کہ اے مسلمانو! بڑھو اور لڑو اور مسلمان کہتے ہیں کہ اے علماء کرام آپ آگے بڑھیں اور لڑیں کیونکہ آپ ہمارے لیڈر اور راہنما ہیں۔ اور پھر دونوں اپنے اپنے گھروں کی طرف بھاگتے ہیں۔ حالانکہ خدا نے ہمیں وہ تلوار دی ہے جسے کبھی زنگ نہیں لگ سکتا۔ اور جو کسی لڑائی میں بھی نہیں ٹوٹ سکتی۔ تیرہ سو سال گذر گئے اور دنیا کی سخت سے سخت قوموں نے چاہا کہ اس تلوار کو توڑ دیں۔ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں اور اسے ہمیشہ کے لئے ناکارہ بنا دیں مگر یہ تلوار اُن سے نہ ٹوٹ سکی۔ یہ وہ قرآن ہے جو خدا نے ہم کو دیا ہے اور یہ وہ تلوار ہے جس سے ہم ساری دنیا کو فتح کر سکتے ہیں۔ فرماتا ہے جَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا۔ تلوار کا جہاد اور نفس کے ساتھ جہاد اور دوسرے اور جہاد سب چھوٹے ہیں۔ صرف قرآن کا جہاد ہی ہے جو سب سے

بڑا اور عظیم الشان جہاد ہے۔ یہ وہ تلوار ہے کہ جو شخص اس پر پڑے گا اس کا سر کاٹا جائے گا اور جس پر یہ پڑے گی وہ بھی مارا جائے گا یا اسلام کی غلامی اختیار کر کے زندہ جاوید ہو جائے گا۔ اگر تیرہ سو سال میں بھی ساری دنیا میں اسلام نہیں پھیلا تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہ تلوار کند تھی بلکہ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں نے اس تلوار سے کام لینا چھوڑ دیا۔ آج خدا نے پھر **احمدیت** کو یہ تلوار دے کر کھڑا کیا ہے اور پھر اپنے دین کو دنیا کے تمام ادیان پر غالب کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ مگر کئی نادان مسلمان احمدیت پر حملہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ احمدی جہاد کے قائل نہیں۔ اُن کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص غلیلے لے کر قلعے پر حملہ کر رہا ہو تو یہ دیکھ کر کہ غلیلوں سے قلعہ کب فتح ہو سکتا ہے کچھ اور لوگ توپ خانہ لے کر آ جائیں۔ مگر غلیلے چلانے والا بجائے اس کے کہ اُن کا شکریہ ادا کرے اُن پر اعتراض کرنا شروع کر دے کہ یہ لوگ غلیلے کیوں نہیں چلاتے یہ نادان بھی اپنی نادانی کی وجہ سے اس شخص کو جہاد کا منکر قرار دیتے ہیں جس نے اسلام کو دنیا کے کونے کونے تک پہنچایا اور اپنے آپ کو صف اوّل کے مجاہدین میں شمار کرتے ہیں حالانکہ انہوں نے عمر بھر میں کسی ایک شخص کو بھی اسلام میں داخل نہیں کیا ہوتا۔ نہ انہیں قرآن کریم کا کوئی علم ہوتا ہے وہ ہوش سنبھالنے سے لے کر بڈھے ہونے تک صرف اور نحو پڑھتے رہتے ہیں اور یہی دو علم پڑھ پڑھ کر ان کے دماغ خالی ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے ساری عمر کبھی قرآن کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا ہوتا۔ اور نہ اس کے مطالب اور معانی پر کبھی غور کیا ہوتا ہے مگر اعتراض وہ اُس شخص پر کرتے ہیں جس کے نام سے بھی عیسائی پادریوں کا خون خشک ہوتا ہے۔ اور جس کے ادنیٰ اور معمولی درجہ کے غلاموں سے بھی وہ بحث کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے حقیقت یہ ہے کہ جس زمانہ میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے دعویٰ کیا مسلمانوں کی عملی سُستی اور بے چارگی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ عوام الناس کی قوتیں مفلوج ہو رہی تھیں اور خواص عیسائیت کے حملہ سے بچنے کے لئے اُس کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھا رہے تھے۔ اسلام کے خادم اپالوجسٹس کی صفوں میں کھڑے اُن اسلامی عقائد کے لئے جنہیں یورپ ناقابلِ قبول سمجھتا تھا معذرتیں پیش کر رہے تھے۔ اُس وقت بانئے سلسلہ احمدیہ نے ان طریقوں کے خلاف احتجاج کیا۔ اُس وقت انہوں نے اپنی تنہا آواز کو دلیرانہ بلند کیا کہ اسلام کو معذرتوں کی ضرورت نہیں اُس کا ہر حکم حکمتوں سے پُر اور اُس کا ہر ارشاد صداقتوں سے معمور ہے۔ اگر یورپ کو اس کی خوبی نظر نہیں آتی تو یا وہ اندھا ہے یا ہم شمع اُس کے قریب نہیں لے گئے۔ پس اسلام کی حفاظت کا ذریعہ معذرتیں نہیں بلکہ اسلام کی حقیقی تعلیم کو یورپ تک پہنچانا ہے۔

اُس وقت جبکہ یورپ کے اسلام لانے کا خیال بھی نہیں آ سکتا تھا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انگریزی میں اپنے مضامین ترجمہ کرا کے یورپ میں تقسیم کرائے۔ اور جب خدا تعالیٰ نے آپ کو جماعت عطا فرمائی تو

آپ نے انہیں ہدایت کی کہ جہاد اسلام کا ایک اہم جزو ہے جو کسی وقت بھی چھوڑا نہیں جا سکتا۔ جس طرح نماز اور روزہ اور حج اور زکوٰۃ اسلام کے ایسے احکام ہیں جن پر عمل کرنا ہر زمانہ میں ضروری ہے اسی طرح جہاد بھی ایسے اعمال میں سے ہے جن پر ہر زمانہ میں عمل کرنا ضروری ہے۔

پہلے علماء نے عام طور پر یہ لکھا ہے کہ نماز اور روزہ اور زکوٰۃ مقدم ہیں۔ اس کے بعد حج ہے اور پھر جہاد ہے لیکن علامہ ابن رشدؒ لکھتے ہیں کہ نماز اور روزہ اور زکوٰۃ کے بعد جہاد ہے اور پھر حج ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ پہلے علماء کی بات زیادہ درست ہے کیونکہ جو شخص نماز اور روزہ اور حج اور زکوٰۃ کا پابند نہیں اُس کے اندر جہاد کی روح ہی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اور جس کے اندر جہاد کی روح پیدا نہ ہو اُس نے جہاد کیا کرنا ہے۔ پس حقیقت یہی ہے کہ ہر مومن کے لئے نماز اور روزہ اور حج اور زکوٰۃ نہایت اہم چیزیں ہیں اور جب تک وہ ان کو پورا نہ کرے اس کے اندر اسلام کی روح پیدا نہیں ہو سکتی۔ اور اسلام کی روح پیدا ہونے کے بعد اُس کا فرض ہے کہ قرآن ہاتھ میں لے کر تمام غیر مسلم دنیا کے مقابلہ میں نکل کھڑا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے جہاد کے متعلق انفرادی طور پر مسلمانوں کو مخاطب کیا ہے نہ کہ جماعتی طور پر۔ اور ہر مسلمان پر جہاد فرض کیا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جہاد سے مراد جہاد بالقرآن ہے جہاد بالسیف نہیں کیونکہ جہاد بالسیف طاقت کے ساتھ ہو سکتا ہے اور طاقت جتھے کے ساتھ ہو سکتی ہے لیکن اگر ایک فرد بھی ایمان کامل رکھتا ہو تو اسلام اس کا فرض قرار دیتا ہے کہ وہ قرآن کے ساتھ جہاد کے لئے نکل کھڑا ہو۔ باقی لوگ اس کے ساتھ آہستہ آہستہ آملیں گے مگر اُسے اُن کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔ جیسے حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے کیا۔ وہ اکیلے عیسائیوں اور پنڈتوں وغیرہ کے ساتھ جہاد کے لئے نکل کھڑے ہوئے پھر آہستہ آہستہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جماعت بھی عطا فرمادی۔

اسی طرح آپ نے لوگوں کو یہ بھی بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے جہاد کی دو صورتیں مقرر کی ہیں۔ ایک جنگ کے ایّام کے لئے اور ایک صلح کے ایّام کے لئے۔ جب مسلمانوں پر کوئی قوم اس وجہ سے حملہ آور ہو کہ کیوں انہوں نے اسلام قبول کیا ہے اور انہیں بزور اسلام سے منحرف کرنا چاہے جیسا کہ مکہ کے لوگوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کیا۔ تو اس وقت اُن کے لئے یہ حکم ہے کہ تلوار کا مقابلہ تلوار سے کریں اور جب غیر مسلم لوگ تلوار کے ذریعہ سے لوگوں کو اسلام میں داخل ہونے سے نہ روکیں تو اُس وقت بھی جہاد کا سلسلہ ختم نہیں ہو جاتا۔ اُس وقت دلیل اور تبلیغ کی تلوار چلانے کا مسلمانوں کو حکم ہے تاکہ اسلام جس طرح جنگ کے ایّام میں ترقی کرے صلح کے ایام میں بھی ترقی کرے اور دونوں زمانے اُس کی روشنی پھیلانے کا موجب ہوں اور مسلمانوں کی قوتِ عملیہ کمزور نہ ہو۔ مگر مسلمانوں

کی عملی طاقتیں چونکہ مفلوج ہوگئی تھیں اُن کے لیڈروں نے اس مسئلہ میں بھی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی مخالفت کی اور چونکہ وہ کام نہیں کرنا چاہتے تھے اور یہ اقرار بھی نہیں کرنا چاہتے تھے کہ وہ کام سے جی چراتے ہیں انہوں نے یہ عجیب چال چلی کہ لوگوں میں شور مچانا شروع کر دیا کہ بانی سلسلۂ احمدیہ جہاد کے منکر ہیں۔ حالانکہ یہ سراسر بہتان اور جھوٹ تھا بانی سلسلۂ احمدیہ جہاد کے منکر نہیں تھے بلکہ اُن کا یہ دعویٰ تھا کہ جہاد باقی ارکانِ اسلام کی طرح ہر زمانہ میں ضروری ہے اور چونکہ تلوار کا جہاد ہر زمانہ میں نہیں ہوسکتا اور چونکہ جماعت کا سُست ہوجانا اُس کی ہلاکت کا موجب ہوتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے جہاد کی دو قسمیں مقرر کی ہیں۔ جب تلوار سے اسلام پر حملہ ہو تو تلوار کا جہاد فرض ہوتا ہے اور جب لوہے کی تلوار کا حملہ ختم ہو تو قرآن کریم کی تلوار لے کر کافروں پر حملہ کرنا ہمارا فرض ہے۔ غرض جہاد کسی وقت چھوڑا نہیں جاسکتا۔ کبھی مسلمانوں کو تلوار کے ذریعہ جہاد کرنا پڑے گا اور کبھی قرآن کے ذریعہ۔ یہ ایک عجیب اور پر لطف جنگ تھی کہ جو شخص جہاد کے لئے مسلمانوں کو بلا رہا تھا اور جہاد کو ہر زمانہ میں فرض قرار دے رہا تھا اُسے تو جہاد کا منکر کہا جاتا ہے اور جو لوگ نہ تلوار اُٹھاتے تھے اور نہ قرآن کریم کے ذریعہ جہاد کرتے تھے انہیں جہاد کا ماننے والا قرار دیا جاتا تھا۔ مگر ہر عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ اس جنگ سے سلسلہ احمدیہ کے راستہ میں روکیں تو پیدا کی جاسکتی تھیں مگر اسلام کو کیا فائدہ تھا۔ اسلام حضرت زین العابدین ؒ کی طرح میدان کربلا میں بے یارومددگار پڑا تھا۔ مسلمان جہاد کی تائید کا دعویٰ کرتے ہوئے اسلام کے لئے جہاد کرنے والوں کا مقابلہ کر رہے تھے اور دشمنانِ اسلام کے لئے انہوں نے میدان خالی چھوڑ رکھا تھا۔ مگر آج اس قدر لمبے عرصہ کے تجربہ کے بعد سب دنیا دیکھ رہی ہے کہ عملی پروگرام جو بانی سلسلہ احمدیہ نے تجویز کیا تھا وہی درست تھا۔ ستر سال تک شور مچانے کے باوجود مسلمان آج تک تلوار کا جہاد نہیں کر سکے۔ کفر کا فتویٰ لگانے والے مولویوں میں سے کسی ایک کو بھی آج تک تلوار پکڑنے کی توفیق نہیں ملی۔ لیکن قرآن کریم کے ذریعہ جہاد کرنے والے احمدیوں کو خدا تعالیٰ نے ہر میدان میں فتح عطا فرمائی ہے۔ وہ لاکھوں آدمی ان مولویوں کی مخالفت کے باوجود غیر مذاہب والوں سے چھین کر لے آئے ہیں اور یورپ اور امریکہ اور افریقہ میں ہزارہا آدمیوں کو جو پہلے ہمارے آقا اور مولیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیتے تھے حلقہ بگوشانِ اسلام بنا چکے ہیں۔ اور وہ جو ایک زمانہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے شدید دشمن تھے آج آپؐ پر درود اور سلام بھیج رہے ہیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ تغیر جماعت احمدیہ کی تنظیم کا نتیجہ ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہ تنظیم ہم میں کیوں پیدا ہوئی اور کیوں دوسروں سے تنظیم کی توفیق چھین لی گئی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ قوتِ عملیہ پیدا کرنے کا صحیح نسخہ استعمال

نہیں کیا گیا۔جس فوج کو مشق نہ کرائی جائے وہ وقت پر لڑ نہیں سکتی جس قوم کو ہر وقت جہاد میں نہ لگایا جائے وہ خاص مواقع پر بھی جہاد نہیں کر سکتی۔پس اس معاملہ میں بھی فتح حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو ہی حاصل ہوئی اور ثابت ہو گیا کہ جس نکتہ تک آپ کا دماغ پہنچا تھا دوسروں کا نہیں پہنچا۔دنیا نے آپ کا مقابلہ کیا اور شکست کھائی مگر آپ نے دنیا کے چیلنج کو قبول کیا اور فتح حاصل کی۔

اس جگہ یہ ذکر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بانی سلسلہ احمدیہ نے جہاد کے متعلق اپنے جس عقیدہ کا اعلان فرمایا ہے اُس میں بانی سلسلہ احمدیہ منفرد نہیں بلکہ دیگر علماءِ اسلام بھی اسی قسم کا مذہب رکھتے تھے۔چنانچہ امام راغبؒ اصفہانی اپنی کتاب مفردات راغب میں لکھتے ہیں۔’’اَلْجِهَادُ ثَلَاثَةُ اَضْرُبٍ مُجَاهَدَةُ الْعَدُوِّ الظَّاهِرِ وَمُجَاهَدَةُ الشَّيْطَانِ وَمُجَاهَدَةُ النَّفْسِ‘‘ (مفردات امام راغبؒ زیر مادہ جھد) یعنی جہاد تین قسم کا ہوتا ہے۔ایک وہ جہاد ہے جو اُس کھلے دشمن سے کیا جائے جو مسلمانوں سے لڑائی کرے اور ایک وہ جہاد ہے جو شیطان سے کیا جائے اور ایک وہ جہاد ہے جو اپنے نفس سے کیا جائے۔مولوی نذیر حسین صاحب دہلوی امیر جماعت اہل حدیث کے متعلق روایت ہے کہ انہوں نے بھی ۱۸۵۷ء کے غدر کو جس میں مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف تلوار چلائی تھی شرعی جہاد نہیں سمجھا بلکہ اس کو بے ایمانی و عہد شکنی و فساد و عناد خیال کر کے اُس میں شمولیت اور اُس کی معاونت کو معصیت قرار دیا (رسالہ اشاعۃ السنۃ ماہ اکتوبر ۱۸۸۳ء جلد ۶ نمبر ۱۰ صفحہ ۲۸۸) سر سید احمد خان صاحب بھی لکھتے ہیں ’’مسلمانوں کا بہت زوروں سے آپس میں سازش اور مشورہ کرنا اس ارادے سے کہ ہم باہم متفق ہو کر غیر مذہب کے لوگوں پر جہاد کریں اور اُن کی حکومت سے آزاد ہو جائیں نہایت بے بنیاد بات ہے جب کہ مسلمان ہماری گورنمنٹ کے مستامن تھے کسی طرح گورنمنٹ کی عملداری میں جہاد نہیں کر سکتے تھے۔بیس تیس برس پیشتر ایک بہت بڑے نامی مولوی محمد اسماعیل صاحب نے ہندوستان میں جہاد کا وعظ کیا اور آدمیوں کو جہاد کی ترغیب دی۔اُس وقت انہوں نے صاف بیان کیا کہ ہندوستان کے رہنے والے جو سرکار انگریزی کے امن میں رہتے ہیں ہندوستان میں جہاد نہیں کر سکتے۔اس لئے ہزاروں آدمی جہادی ہر ایک ضلع ہندوستان میں جمع ہوئے اور سرکار کی عملداری میں کسی طرح فساد نہیں کیا اور غربی سرحد پنجاب پر جا کر لڑائی کی۔‘‘

(اسباب بغاوت ہند از سر سید احمد خان تالیف و تدوین سلیم الدین قریشی صفحہ ۳۱، ۳۲)

علامہ رشید رضا صاحب اپنی تفسیر المنار جلد ۱۰ مطبوعہ قاہرہ مصر صفحہ ۳۰۷ پر لکھتے ہیں:’’یورپین لوگ اور مشرقی عیسائیوں میں سے اُن کے مقلد اور شاگرد یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جہاد کے معنے یہ ہیں کہ مسلمان ہر اُس شخص

سے لڑے جو مسلمان نہیں تا کہ اس کو مجبور کر کے اسلام میں داخل کیا جائے خواہ غیر مسلموں نے اُس پر زیادتی نہ کی ہو اور اُن سے کسی قسم کی دشمنی نہ کی ہو۔ اور اُسے پڑھنے والے تجھ پر ان دلیلوں سے جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں روشن ہو چکا ہوگا اور ان دلیلوں سے جو ہم آئندہ بیان کریں گے اور بھی روشن ہو جائے گا کہ اسلام پر غیر مسلموں کا یہ الزام سراسر جھوٹ اور افتراء ہے۔'' اسی طرح لکھتے ہیں: ''وہ تفصیل جو ہم نے اوپر لکھی ہے اس سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ جہاد بالسیف کے مسئلہ میں مسلمانوں کا اجماع صرف اس بات پر ہے کہ جب مسلمانوں پر کوئی قوم حملہ کرے تو اُس وقت یہ جہاد فرض ہوتا ہے اور اس وقت بھی اسی صورت میں فرض ہوتا ہے جبکہ امامِ واجب الاطاعت جنگِ عام کا حکم دے۔ لیکن اگر وہ صرف کچھ لوگوں کو اس لڑائی کا حکم دے تو صرف انہی لوگوں پر یہ لڑائی فرض ہوگی باقی لوگوں پر فرض نہیں ہوگی۔'' (تفسیر المنار سورۃ التوبۃ قولہ تعالیٰ قاتلوا الذین لا یومنون)

آج کل مودودی صاحب جہاد پر بہت زور دے رہے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ علماء کے فتویٰ کے مطابق وہ کن لوگوں کو جہاد کی تلقین کر سکتے ہیں۔ اگر وہ واجب الاطاعت امام ہیں تو یقیناً اُن کا فتویٰ صرف مودودیوں کے لئے ہی قابلِ عمل ہو سکتا ہے دوسرے لوگوں کے لئے نہیں۔ مگر کوئی مودودی بتائے کہ کتنے مودودی تلوار لے کر غیر مسلموں سے لڑ رہے ہیں۔ اور اگر کوئی مودودی بھی ایسا نہیں کر رہا تو اس کے معنے یہ ہیں کہ مودودیوں میں کوئی بھی صالح نہیں۔ پس مودودیوں کو صالح جماعت کہنا نادانی اور حماقت ہے۔ جو جماعت اپنے امیر کی بات بھی نہیں مانتی اور قرآن کی بات بھی نہیں مانتی اُسے صالح کون کہہ سکتا ہے۔ اور جو امیر باوجود واجب الاطاعت ہونے کے اور جہاد کو ضروری سمجھنے کے اپنے پیروؤں کو جہاد کا حکم نہیں دیتا اُس امیر کو بھی کوئی صالح نہیں کہہ سکتا۔ غرض بانی سلسلہ احمدیہ نے جہاد کے متعلق وہی تعلیم دی ہے جو پچھلے علماء بھی تسلیم کرتے چلے آئے ہیں اور اگر آپ نے کسی جگہ اس کے متعلق نسخ یا حرام کا لفظ استعمال کیا ہے جیسا کہ آپ فرماتے ہیں۔ ع

دیں کے لئے حرام ہے اب جنگ اور قتال

(تحفہ گولڑویہ، روحانی خزائن جلد نمبر ۱۷ صفحہ ۷۷)

تو اس کے معنے محض اتنے ہی ہیں کہ وہ جہاد جو اس زمانہ میں جائز نہیں وہ حرام ہے۔ یہ معنے نہیں کہ جہاد ہر صورت میں حرام ہے۔ یہ امر کہ جہاں کہیں حرام یا منسوخ کا لفظ بانی سلسلہ احمدیہ نے لکھا ہے اس کے معنے حقیقی نسخ یعنی واقعی اور دائمی نسخ کے نہیں ہو سکتے۔ اسی بات سے ثابت ہے کہ آپ اپنے آپ کو امتّی کہتے ہیں اور اگر جہاد خدا اور اُس کے رسول کا مقرر کیا ہوا ہے تو کسی امتّی کو کیا حق ہے کہ وہ خدا اور اُس کے رسولؐ کے کسی حکم کو منسوخ کرے۔

آپ نے اپنی کتب میں بار ہا یہ عقیدہ بیان فرمایا ہے کہ قرآن کریم ایک دائمی شریعت ہے جس کا ایک ایک لفظ قابلِ عمل ہے اور اُس کا کوئی حکم قیامت تک نہیں بدل سکتا۔

چنانچہ آپؑ تحریر فرماتے ہیں

''میری گردن اُس جُوئے کے نیچے ہے جو قرآن شریف نے پیش کیا ہے اور کسی کو مجال نہیں کہ ایک نقطہ یا ایک شعشہ قرآن شریف کا منسوخ کر سکے۔''

(اخبار عام لاہور ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء مجموعہ اشتہارات جلد ۳ صفحہ ۵۹۷)

اور نسخ کے یہ محدود معنے کہ عارضی طور پر کسی شئے کو روک دیا جائے عربی زبان میں عام مستعمل ہیں۔ چنانچہ مفردات راغب جیسی زبردست لُغتِ قرآن میں لکھا ہے کہ: اَلنَّسْخُ اِزَالَۃُ شَیْءٍ بِشَیْءٍ یَتَعَقَّبُہٗ کَنَسْخِ الشَّمْسِ الظِّلَّ وَالظِّلِّ الشَّمْسَ وَالشَّیْبِ الشَّبَابَ۔ یعنی نسخ کا لفظ سورج کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جبکہ وہ سائے کو دور کر دیتا ہے اور سائے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جبکہ وہ سورج کو چُھپا دیتا ہے۔ اور بڑھاپے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جب کہ وہ جوانی کو دور کر دیتا ہے یعنی کبھی تو نسخ عارضی ازالہ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جیسا کہ سورج کے سایہ کو مٹا دینے کے متعلق جو عارضی ہوتا ہے اور کبھی مستقل ازالہ کے لئے اس کا استعمال کیا جاتا ہے جیسے بڑھاپے کے جوانی کو مٹا دینے کے متعلق جو کہ مستقل ہوتا ہے۔ چونکہ قرآن کریم ایک دائمی شریعت ہے اس لئے اس کے کسی حکم کے متعلق نسخ کے لفظ کا استعمال صرف التواء کے معنوں میں ہی ہے جیسا کہ بانی سلسلہ احمدیہ نے صاف لکھا ہے کہ ؎

فرما چکا ہے سید کونین مصطفیٰؐ
عیسیٰ مسیحؑ جنگوں کا کردے گا التوا

(تحفہ گولڑویہ ضمیمہ روحانی خزائن جلد ۱۷ صفحہ ۷۸)

آپ کے اس شعر سے پتہ لگتا ہے کہ آپ نے جو کچھ بھی اس بارہ میں لکھا ہے وہ صرف التواء کے معنوں میں ہے۔ مستقل طور پر اس حکم کو منسوخ کرنے کے معنوں میں نہیں۔ اور اس عارضی التواء کے متعلق بھی آپ نے یہی تشریح فرمائی ہے کہ جہاد کے التواء کے متعلق میں نہیں کہہ رہا بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا ہے چنانچہ آپ کی ایک تحریر سے صاف ظاہر ہے کہ ہوسکتا ہے آئندہ کسی زمانہ میں مسلمانوں کے لئے تلوار کی جنگ کی بھی ضرورت پیدا ہو جائے۔ چنانچہ آپ تحریر فرماتے ہیں:

’’ممکن ہے اور بالکل ممکن ہے کہ کسی زمانہ میں کوئی ایسا مسیحؑ بھی آ جائے جس پر حدیثوں کے بعض ظاہری الفاظ صادق آسکیں۔ کیونکہ یہ عاجز اس دنیا کی حکومت اور بادشاہت کے ساتھ نہیں آیا درویشی اور غربت کے لباس میں آیا ہے اور جبکہ یہ حال ہے تو پھر علماء کے لئے اشکال ہی کیا ہے، ممکن ہے کہ کسی وقت اُن کی یہ مراد بھی پوری ہو جائے۔‘‘ (ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۱۹۷، ۱۹۸)

پس بانی سلسلہ احمدیہ نے جہاد کے متعلق وہی تعلیم دی ہے جو قرآن کریم نے دی ہے۔ اور آپ کے زمانہ میں جس جہاد کو ملتوی کیا گیا ہے وہ جہاد بالسیف ہے کیونکہ موجودہ زمانہ میں وہ حالات نہیں ہیں جن میں جہاد بالسیف ضروری ہوتا ہے لیکن جہاد بالسیف سے زیادہ تاکیدی حکم جہاد بالقرآن کا ہے جس میں آپ ساری عمر مشغول رہے اور جس کی طرف اس آیت میں توجہ دلاتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا یعنی قرآن کریم کے ساتھ تم غیر مسلموں کا مقابلہ کرو اور یہی بڑا جہاد ہے۔

چنانچہ اس آیت کے ماتحت تفسیر روح المعانی جلد ۶ صفحہ ۱۶۲ پر لکھا ہے۔ ’’اَیْ بِالْقُرْاٰنِ وَذٰلِكَ بِتِلَاوَةِ مَا فِيْهِ مِنَ الْبَرَاهِيْنِ وَالْقَوَارِعِ وَالزَّوَاجِرِ وَالْمَوَاعِظِ وَتَذْكِيْرِ اَحْوَالِ الْاُمَمِ الْمُكَذِّبَةِ فَاِنَّ دَعْوَةَ كُلِّ الْعَالَمِيْنَ عَلَى الْوَجْهِ الْمَذْكُوْرِ جِهَادٌ كَبِيْرٌ۔‘‘ یعنی اس جگہ جہاد سے مراد قرآن کریم کے ذریعہ جہاد کرنا ہے اور یہ اس طرح ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں جو براہین اور کفر کے خلاف باتیں ہیں اسی طرح جن خلافِ اخلاق امور پر زجر کیا گیا ہے اور جو جو نصائح کی گئی ہیں اُن سب کو پڑھا جائے اور نبیوں کی منکر اُمتوں کے احوال بیان کر کے لوگوں کو نصیحت کی جائے کیونکہ دنیا کے تمام انسانوں کو اسی طریق سے اسلام کی طرف بلانا ہی سب سے بڑا جہاد ہے۔ (تفسیر روح المعانی زیر آیت و جاهدهم به)۔

غرض جہاد کا لفظ جس کو عیسائیوں نے ہوا سمجھ رکھا ہے اصل میں تبلیغ کا ہی ایک نام ہے اور اصل جہاد تلوار کا جہاد نہیں بلکہ اصل جہاد وہ ہے جو قرآن کریم کے ذریعہ کیا جائے۔ یعنی جس جہاد میں دلائل استعمال کئے جائیں اور آسمانی نشانات و معجزات کے ذریعہ دلوں کو فتح کیا جائے۔ مگر افسوس کہ مسلمان صرف تلوار چلانے کا نام جہاد سمجھتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب انہیں غلبہ حاصل ہو گیا تو وہ مطمئن ہو کر بیٹھ گئے اور کفر دنیا میں موجود رہا۔ اگر مسلمان جہاد کی وہ تعریف جانتے جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کی ہے کہ جہاد ہر اُس فعل کا نام ہے جو نیکی اور تقویٰ کے قیام کے لئے کیا جائے۔ اور جہاد جس طرح تلوار سے ہوتا ہے اُسی طرح اصلاحِ نفس سے بھی ہوتا ہے اور اسی طرح تبلیغ اسلام سے بھی ہوتا ہے اور اسی طرح مال و دولت کی قربانی سے بھی ہوتا ہے۔ اور ہر قسم کے جہاد کا الگ الگ

موقعہ ہے تو آج کا روزِ بد انہیں نہ دیکھنا پڑتا۔ اگر مسلمان اس تعریف کو سمجھتے تو اسلام کے ظاہری غلبہ کے موقعہ پر وہ جہاد کے حکم کو ختم نہ سمجھتے بلکہ انہیں خیال رہتا کہ صرف ایک قسم کا جہاد ختم ہوا ہے دوسری اقسام کے جہاد ابھی باقی ہیں۔ اور تبلیغ کا جہاد شروع کر دیتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ نہ صرف اسلام مشرقی ممالک میں پھیل جاتا بلکہ یورپ بھی آج مسلمان ہوتا اور اس کی ترقی کے ساتھ ساتھ اسلام کو زوال نہ آتا۔

غرض حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے جہاد کے مواقع بتائے ہیں آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ تلوار کا جہاد دائمی طور پر ممنوع ہے بلکہ یہ فرمایا ہے کہ اس زمانہ میں شریعت کے مطابق کس جہاد کا موقع ہے اور خود بڑے زور سے اس جہاد کو شروع کر دیا اور تمام دنیا میں تبلیغ جاری کر دی۔ اگر تلوار کا جہاد ہی ضروری تھا تو سوال یہ ہے کہ کیا ہر مسلمان نے تلوار اُٹھا کر کفار کا مقابلہ کیا؟ اگر نہیں کیا تو احمدی تو خدا تعالیٰ کو یہ جواب دے دیں گے کہ ہمارے نزدیک یہ جہاد بالسیف کا وقت نہیں تھا اگر ہم نے غلطی کی تو ہماری غلطی اجتہادی تھی لیکن اُن کے مخالف مولوی کیا جواب دیں گے۔ کیا وہ یہ کہیں گے کہ اے خدا! جہاد کا تو وقت تھا اور ہم یقین رکھتے تھے کہ یہ جہاد کا وقت ہے اور ہم سمجھتے تھے کہ جہاد فرض ہو گیا ہے لیکن اے ہمارے خدا! ہم نے جہاد نہیں کیا کیونکہ ہمارے دل ڈرتے تھے۔ اور نہ ہم نے اُن لوگوں کو جہاد کے لئے آگے بھجوایا جن کے دل نہیں ڈرتے تھے کیونکہ ہم ڈرتے تھے کہ ایسا کرنے سے بھی کفار ہم کو پکڑ لیں گے۔ اب اس امر کا فیصلہ ہر منصف مزاج انسان خود کر سکتا ہے اور سمجھ سکتا ہے کہ ان دونوں جوابوں میں سے کون سا جواب خدا تعالیٰ کے نزدیک قابلِ قبول ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بانی سلسلہ احمدیہ نے جہاد کی اس تعریف سے نہ صرف آئندہ کے لئے مسلمانوں کو بیدار کر دیا ہے اور اُن کے لئے ترقی کا ایک عظیم الشان راستہ کھول دیا ہے بلکہ مسلمانوں کو ایک بہت بڑے گناہ سے بھی بچا لیا ہے۔ کیونکہ گو مسلمان یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ یہ زمانہ تلوار کے جہاد کا ہے لیکن اُسے فرض سمجھ کر اس پر عمل نہیں کرتے تھے اور اس طرح اس احساسِ گناہ کی وجہ سے گنہگار بن رہے تھے۔ اب آپ کی تشریح کو جوں جوں مسلمان تسلیم کرتے جائیں گے اُن کے دلوں پر سے احساسِ گناہ کا زنگ اُترتا جائے گا اور وہ محسوس کریں گے کہ انہوں نے تلوار کا جہاد نہ کر کے خدا اور اُس کے رسول سے غدّاری نہیں کی اور یہ کہ بانی سلسلہ احمدیہ نے انہیں تبلیغ کی طرف توجہ دلا کر اُن پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ

اور وہی ہے جس نے دو سمندروں کو چلایا ہے جن میں سے ایک تو بہت میٹھا ہے اور دوسرا نمکین (اور) کڑوا ہے۔

وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ج وَجَعَلَ بَیْنَهُمَا بَرْزَخًا

اور اُس نے (یعنی اللہ تعالیٰ نے) ان دونوں کے درمیان ایک روک بنا دی ہے۔ اور ایسا سامان بنایا ہے کہ

وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۵۴﴾

وہ ایک دوسرے کو پرے رکھتے ہیں ملنے نہیں دیتے۔

حلّ لُغَات ۔مَرَجَ مَرَجَ اللّٰهُ الْبَحْرَیْنِ الْعَذْبَ وَالْمِلْحَ کے معنے ہیں خَلَطَهُمَا حَتّٰی الْتَقَیَا ۔ دو سمندروں کو آپس میں ملایا ۔وَقِیْلَ خَلَّهُمَا لَا یَلْتَبِسُ اَحَدُهُمَا بِالْاٰخَرِ ۔اور بعض عربی زبان کے ائمہ کہتے ہیں کہ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ کے معنے ہیں کہ دو سمندروں کو اس طور پر چلایا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل نہیں سکتے۔(اقرب)

فُرَاتٌ اَلْفُرَاتُ اَلْمَآءُ الْعَذْبُ جِدًّا ۔فُرات کے معنے نہایت شیریں پانی کے ہیں ۔اَوِ الَّذِیْ یَکْسِرُ الْعَطَشَ لِفَرْطِ عُذُوْبَتِهٖ ۔یا اُس پانی پر فرات کا لفظ استعمال کرتے ہیں جو اپنی مٹھاس کی تیزی کی وجہ سے پیاس کی شدت اور تلخی کو ختم کر کے سکون دے دے ۔(اقرب)

تفسیر ۔مَرَجَ کے معنے جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے ملا دینے کے ہوتے ہیں ۔پس هُوَ الَّذِیْ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ کے یہ معنے ہوئے کہ وہ خدا ہی ہے جس نے دو سمندر دنیا میں ملا دیئے ہیں جن میں سے ایک تو اپنی خاصیت کے لحاظ سے انتہائی میٹھا ہے اور اس کا پانی انسان کے لئے تسکین بخش ہے اور دوسرا نمکین اور کڑوا ہے ۔مگر باوجود اس کے کہ دونوں سمندر ملا دئے گئے ہیں پھر بھی اُن دونوں کے درمیان ایک فاصلہ پایا جاتا ہے جو اُن دونوں کو جدا جدا رکھتا ہے۔ دنیا میں قاعدہ ہے کہ جب میٹھی اور نمکین چیز ملائی جائے تو ایک تیسری چیز پیدا ہو جاتی ہے جو اُن دونوں سے مختلف ہوتی ہے ۔جیسے بعض لوگ میٹھی چائے میں نمک ملا لیا کرتے ہیں ۔میں ایسی چائے کو ہمیشہ منافق چائے کہا کرتا ہوں اور مجھے اس سے بڑی نفرت ہے ۔لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ پانی منافق نہیں ہوں گے بلکہ باوجود اس کے کہ وہ

دونوں ملے ہوئے ہوں گے اور بظاہر جب دو چیزیں مل جائیں تو دونوں کا ذائقہ بدل کر کچھ اور ہو جاتا ہے مگر ہماری طرف سے یہ اعلان ہو رہا ہوگا کہ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا۔ اے ملنے والو! تمہارے ملنے کے یہ معنے نہیں کہ تم ایک دوسرے میں جذب ہو جاؤ بلکہ باوجود ملنے کے الگ الگ رہو۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ خدا تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ کے ماتحت جس طرح مادی پانی کی دو قسم کے ذخیرے بنائے ہیں۔ایک ذخیرہ سمندر کے پانی کا بنایا ہے جو نمکین ہوتا ہے اور ایک ذخیرہ دریا کے پانی کا بنایا ہے جو میٹھا ہوتا ہے اور ان دونوں کے درمیان اُس نے ایسی حدود قائم کر دی ہیں جن کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کو خراب نہیں کر سکتے۔نہ کڑوا سمندر میٹھے دریاؤں کو خراب کر سکتا ہے اور نہ میٹھے دریا کڑوے سمندر کی تلخی کو دُور کر سکتے ہیں۔اسی طرح آسمانی تعلیم جو میٹھے پانی کے مشابہ ہوتی ہے اور کفر کی تعلیم جو نمکین پانی سے مشابہت رکھتی ہے ان دونوں میں ایک نمایاں اور بیّن امتیاز موجود ہوتا ہے اور ایک حدِّ فاصل ان دونوں کو جُدا جُدا رکھتی ہے۔اس کے یہ معنے نہیں کہ کافر مومن نہیں بن سکتا یا مومن کافر نہیں بن سکتا۔بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ کفر ایمان کی شکل اختیار نہیں کر سکتا اور ایمان کفر کی شکل اختیار نہیں کر سکتا۔اور ان دونوں میں اتنا نمایاں اور بیّن اختلاف ہوتا ہے کہ باوجود اس کے کہ ایک ملک ایک شہر بلکہ ایک محلہ میں مومن بھی رہتے ہیں اور کافر بھی۔وہ ایک دوسرے سے تعلقات بھی رکھتے ہیں اُن سے مل کر کام بھی کرتے ہیں اُن کی خوشی اور غمی میں شریک بھی ہوتے ہیں مگر ان تمام تعلقات کے باوجود رُوحانی نقطۂ نگاہ سے وہ آپس میں کلّی مغائرت رکھتے ہیں۔اور جو میٹھے ثمرات ایک سچے مذہب پر چلنے والے انسان کو حاصل ہو رہے ہوتے ہیں دوسرا شخص اُن سے بالکل محروم ہوتا ہے۔گویا ایک برزخ ہے جو اُن دونوں کو جدا رکھتی ہے۔ایک سچے مذہب کا پیرو اللہ تعالیٰ کے کلام اور اُس کے الہام سے مشرف ہوتا ہے۔اُس کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔اُس پر آسمانی علوم اور معارف کا انکشاف ہوتا ہے۔مگر اُس کے پہلو میں بیٹھا ہوا ایک کافر انسان اس دنیا میں اندھوں کی طرح آتا اور اندھوں کی طرح ہی چلا جاتا ہے اور آبِ حیات کو زہر سمجھتے ہوئے اُس سے دُور رہتا ہے اور زہر کو تریاق سمجھتے ہوئے اُسے اپنے منہ سے لگائے رکھتا ہے۔

غرض کفر اور ایمان کا اس دنیا میں موجود رہنا خدا تعالیٰ کی حکمت کے ماتحت ہے۔لیکن ان دونوں کے درمیان ایک حد فاصل قائم کر دی گئی ہے جو کفر اور ایمان کے امتیاز کو نمایاں کرتی رہتی ہے۔مگر کفر اور ایمان کے مقابلہ کے علاوہ اس میں مغربیت اور دجالیّت کے متعلق بھی پیشگوئی پائی جاتی ہے۔چنانچہ دیکھ لو قرآن کریم نے اپنے الفاظ میں ہی اس طرف اشارہ کر دیا ہے۔فرماتا ہے ھٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ اور اُجَاجٌ سے یاجوج اور ماجوج دونوں قوموں کی طرف

اشارہ ہے اس کے مقابلہ میں عَذْبٌ فُرَاتٌ رکھا ہے۔اور حِجْرًا مَّحْجُوْرًا میں بتا دیا کہ گو تمہیں ان دونوں اقوام سے مل کر رہنا پڑے گا مگر ایسی حالت میں بھی تمہیں یاد رکھنا چاہیے کہ تم میٹھے پانی کا سمندر ہو اور وہ کڑوے پانی کا سمندر ہیں۔تم مغربیت کی کبھی نقل نہ کرو اور باوجود اُن میں ملے ہونے کے ایسے امور کے متعلق صاف طور پر کہہ دیا کرو کہ تم اَور ہو اور ہم اَور ہیں۔جیسے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ مومنوں کو ہدایت دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ تم کفار سے صاف طور پر کہہ دو کہ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۔ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ (الکافرون: ۳، ۴) گویا ایک برزخ تمہارے اور اُن کے درمیان ہمیشہ حائل رہنی چاہیے۔خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے اُس وقت سے لے کر قیامت تک دجالی فتنہ سے بڑا فتنہ اور کوئی نہیں ہوگا۔(مشکوٰۃ المصابیح باب العلامات بین یدی الساعۃ و ذکر الدجال و مسلم کتاب الفتن باب فی بقیۃ من احادیث الدجال) چنانچہ اس کی صداقت اس سے ظاہر ہے کہ پہلے زمانوں میں جو فتنے پیدا ہوئے تھے وہ صرف مقامی ہوتے تھے مثلاً ہندوستان کا فتنہ مستقل ہوتا تھا اور وہ ایرانی فتنہ سے متاثر نہیں ہوتا تھا اور ایرانی فتنہ مستقل ہوتا تھا اور وہ یونانی فتنہ سے متاثر نہیں ہوتا تھا۔اسی طرح مصری فتنہ مستقل ہوتا تھا جو یونانی اور ایرانی فتنوں سے متاثر نہیں ہوتا تھا۔اس وجہ سے ان فتنوں کا دین پر متفقہ حملہ نہیں ہوتا تھا بلکہ اُن کی مثال بالکل ایسی ہی تھی جیسے ایک ملک میں ڈاکو لوٹ مار کر رہے ہوں تو کچھ ایک طرف سے حملہ آور ہوں اور کچھ دوسری طرف سے۔ڈاکوؤں سے ملک کا امن بیشک خطرہ میں پڑ جائے گا مگر حکومت تباہ نہیں ہوگی۔حکومت ہمیشہ منظم طاقتوں سے تباہ ہوا کرتی ہے۔لیکن موجودہ فتنہ کے زمانہ میں ریل اور تار اور فون اور پریس کی ایجاد کی وجہ سے ایشیا افریقہ پر اثر انداز ہو رہا ہے اور افریقہ ایشیا پر اثر انداز ہو رہا ہے۔یورپ امریکہ پر اثر ڈال رہا ہے اور امریکہ یورپ پر اثر ڈال رہا ہے۔اس لئے مختلف ممالک میں جو مذہبی بےچینی پائی جاتی ہے وہ ساری دنیا میں یکساں طور پر پھیلی ہوئی ہے۔پس پہلے فتنوں اور موجودہ فتنہ میں یہ فرق ہے کہ یہ فتنہ ایک عالمگیر فتنہ ہے۔جاپان گو عیسائی نہیں مگر اس کے خیالات کی رو یورپ کے تابع ہے۔چین گو عیسائی نہیں مگر اُس کے خیالات یورپ کے تابع ہیں۔اسی طرح ایران، ترکستان اور عرب عیسائی نہیں ظاہراً مسلمان ممالک ہیں مگر اُن کے خیالات کی رو بھی یورپ کے تابع ہے۔غرض موجودہ زمانہ میں تمام تحریکات ایک سلک میں پروئی ہوئی اور ایک نظام کے ماتحت نظر آتی ہیں جس سے اس فتنہ کی ہیبت بہت بڑھ گئی ہے۔پہلے انسان یہ خیال کرتا تھا کہ ایرانی یا یونانی یوں کہتا ہے مگر اب یہ کہا جاتا ہے کہ دنیا کا ہر معقول پسند انسان یوں کہتا ہے۔پہلے اگر کسی کے سامنے یہ کہا جاتا تھا کہ ایرانیوں کا یہ عقیدہ ہے تو سننے والا دل میں کہہ سکتا تھا کہ شاید باقی دنیا کا عقیدہ اس کے خلاف ہو اس لئے وہ مرعوب نہیں ہوتا تھا اور عملاً بھی ایسا

ہی تھا یعنی ایک وقت میں ایک ہی بدی سارے عالم میں پھیلی ہوئی نہ تھی۔ کسی ملک میں کوئی بدی ہوتی تھی اور کسی ملک میں کوئی۔ اگر ہندوستان میں دہریت کی رَو تھی تو ایران میں بدعملی کی رو تھی۔ یونان میں فلسفہ کی رو تھی تو مصر میں مشرکانہ خیالات کی رو تھی۔ پس اُن کے اعتراضات میں یکسانیت نہیں تھی اور مخالفت میں تنظیم نہیں پائی جاتی تھی۔ لیکن اس زمانہ میں تمام خیالات ایک رو اور ایک ہی سلک کے ماتحت ہیں۔ جہاں سے بھی کوئی تحریک اٹھتی ہے اس کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے اور وہ یہ کہ دنیا کو خدا سے دُور کر دیا جائے۔ اور مادیت کی طرف اُسے مائل کیا جائے، چین، جاپان، سائبیریا، ایران، افغانستان جہاں جاؤ وہاں یہی مرض دکھائی دے گا۔ ہر شخص دنیا کو دین پر مقدم کر رہا ہوگا۔ اور ہر شخص کی یہ کوشش ہوگی کہ دنیا سے خدا تعالیٰ کی محبت کو مٹا دیا جائے۔ یہ چیز پہلے کبھی ساری دنیا میں ایک وقت میں نہیں پائی جاتی تھی۔

دوسری چیز جو امتیازی رنگ رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ پہلے جتنے حملے ہوتے تھے وہ فلسفیانہ ہوتے تھے۔ اور فلسفہ کی نبیاد واہمہ اور خیال پر ہے۔ مگر اس وقت جتنے حملے ہوتے ہیں وہ سائنس کی بناء پر ہوتے ہیں اور سائنس کی بنیاد مشاہدہ پر ہے۔ فلسفیانہ اعتراضات کے جواب میں تو انسان بڑی دلیری سے کہہ سکتا ہے کہ یہ تمہارے ڈھکو سلے ہیں لیکن مشاہدہ پر بنیاد رکھتے ہوئے جب کوئی سوال پیش کیا جائے تو اس کا جواب دینا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ کہنا کہ اس دنیا کی زندگی ہی اصل زندگی ہے مرنے کے بعد جو کچھ ہوتا ہے وہ کس نے دیکھا کہ وہاں آرام و آسائش میّسر آسکے گی۔ ایک فلسفیانہ خیال ہے اور اسے سن کر ایک انسان متاثر تو ہو سکتا ہے مگر دوسرا شخص یہ بھی تو کہہ سکتا ہے کہ یہ تو درست ہے کہ اگلے جہان کا ثواب اور عذاب کسی نے نہیں دیکھا لیکن اگلے جہان میں ثواب اور عذاب کا نہ ملنا بھی تو تم نے نہیں دیکھا۔ اس لئے دونوں نظریات سائنس کے لحاظ سے برابر حیثیت رکھتے ہیں لیکن ذراتِ عالم کی بناوٹ پر اپنے خیالات کی بنیاد رکھتے ہوئے اور یہ ثابت کرتے ہوئے کہ دنیا کا ذرہ ذرہ ایک ایسی تنظیم کی صورت رکھتا ہے کہ کارخانۂ عالم خود بخود چلتا چلا جاتا ہے۔ جب کہا جائے کہ اس دنیا کو چلانے کے لئے کسی بیرونی ہستی کی ضرورت نہیں تو یہ سوال ایک نیا رنگ اختیار کر لیتا ہے جو پہلے وسوسہ میں نہیں تھا۔ پھر پہلے خدا تعالیٰ کے وجود کے خلاف صرف فلسفی کھڑے ہوا کرتے تھے۔ مگر اب علم النفس والے بھی کھڑے ہیں۔ علم طبقات الارض والے بھی کھڑے ہیں۔ علمِ ہئیت والے بھی کھڑے ہیں۔ غرض تمام علوم مشترکہ طور پر اسلام کے خلاف پیش کئے جاتے ہیں اور یہ حملہ پہلے سے بہت زیادہ سخت ہے۔ پہلے یہ سمجھ لیا جاتا تھا کہ ایک فلسفی نے خدا تعالیٰ کی ہستی کا انکار کیا ہے نہ معلوم اُس کے قول میں سچائی بھی ہے یا نہیں۔ مگر اب یہ کہا جاتا ہے کہ جس رنگ میں بھی دیکھو یہی نتیجہ نکلے گا کہ نعوذ باللہ خدا نہیں۔ غرض آج کفر اپنے

تمام ہتھیار استعمال کر رہا ہے۔اور یہ حملہ اپنی کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے بے مثال ہے پہلے حملوں میں آدمی کم ہوتے تھے اور پھر وہ متفرق طور پر حملہ کرتے تھے۔ایرانی اور رنگ میں حملہ کرتا تھا اور جاپانی اور رنگ میں۔مگر اب تمام دنیا متفقہ طور پر حملہ کرتی اور ایک ہی محاذ پر جنگ لڑتی ہے۔پھر پہلے حملے فلسفہ تک محدود تھے مگر اب جتنے رائج الوقت علوم ہیں اُن سب کو استعمال کیا جاتا ہے۔پس اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس فتنہ کے برابر دنیا کا اور کوئی فتنہ نہیں۔آج دجالی فتنہ جس رنگ میں دنیا پر غالب ہے اس کی وجہ سے کوئی چیز بھی اسلام کی باقی نہیں رہی۔نہ اس کے تمدنی احکام قائم ہیں نہ سیاسی احکام قائم ہیں نہ اقتصادی احکام قائم ہیں اور نہ شخصی احکام قائم ہیں۔ہر چیز میں آج تبدیلی کر دی گئی ہے۔پس جب تک اسے مٹانے کے لئے ہمارے اندر دیوانگی نہ ہوگی۔جب تک ہمیں اس تہذیبِ مغربی سے بغض نہ ہوگا۔اتنا بغض کہ اس سے بڑھ کر ہمیں کسی اور چیز سے بغض نہ ہو اُس وقت تک ہم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ہم میں سے جو شخص بھی مغربی تہذیب کا دلدادہ ہے وہ روحانی میدان کا اہل نہیں۔جس تہذیب نے ہمارے مقدس آقا کی تصویر کو دنیا کے سامنے بھیانک رنگ میں پیش کیا ہے۔جس تہذیب نے اسلامی تمدن کی شکل کو بدل دیا ہے جب تک اُس کی ایک ایک اینٹ کو ہم ریزہ ریزہ نہ کر دیں کبھی چین اور اطمینان کی نیند نہیں سو سکتے۔وہ لوگ جو یورپ کی نقالی کرتے اور مغربیت کی رَو میں بہتے چلے جاتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ہمارے تن بدن میں تو اُن کی ایک ایک چیز کو دیکھ کر آگ لگ جانی چاہیے کیونکہ اسلام اور مغربیت ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔یا اسلامی ثقافت زندہ رہے گی یا مغربیت زندہ رہے گی۔دونوں کی بنیادیں متضاد اصول پر ہیں اور اُن کا ایک ہی جگہ جمع ہونا ناممکن ہے۔مغربیت کی بنیاد ساری کی ساری دنیاوی لذّات اور عیش پرستی پر ہے اور اسلام کی بنیاد کلی طور پر اللہ تعالیٰ کی رضامندی۔روحانیت اور اخلاق کی درستی پر ہے۔اس لئے ان دونوں کا اجتماع ناممکن ہے۔مگر یہ امر یاد رکھو کہ انگریز اور مغربیت میں فرق ہے۔انگریز انسان ہیں اور ویسے ہی انسان ہیں جیسے ہم اور اس لحاظ سے انگریز ہدایت پا سکتے ہیں لیکن مغربیت ہدایت نہیں پا سکتی۔وہ شیطان کا ہتھیار ہے اور جب تک اُسے توڑا نہیں جائے گا دنیا میں حقیقی امن قائم نہیں ہوسکتا۔یہی وہ برزخ ہے جس کو قائم رکھنے کے لئے میں تحریک جدید کے ذریعہ جماعت کے دوستوں کو توجہ دلا رہا ہوں کہ وہ مغربی اثرات کو کبھی قبول نہ کریں جو احمدی میٹھے پانی کا طلب گار ہے وہ ضرور اُن سے الگ رہے گا۔اور یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کڑوا اور میٹھا پانی ایک دوسرے میں جذب ہو جائیں۔اسی طرح میں سمجھتا ہوں کہ جو غیر احمدی ہیں وہ خواہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان نہ لائیں پھر بھی اُن کا فرض ہے کہ وہ مغربیت کی کبھی نقل نہ کریں۔کیونکہ یہ مسیح موعودؑ کی تعلیم نہیں یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بلکہ اُن کے بھیجنے والے خدا کی تعلیم ہے۔

مگر مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں کا ایک طبقہ ایسا ہے جو کھانے پینے پہننے اور تمدن و معاشرت سے تعلق رکھنے والے کئی امور میں مغربیت کی نقل کرتا اور اس نقل میں خوشی اور فخر محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح بعض احمدی نوجوان باوجود سمجھانے کے اس طرف جا رہے ہیں۔ یہ لوگ صرف نام کے احمدی ہیں۔ حقیقی احمدی نہیں مجھے یاد ہے۔ ایک دفعہ بعض غیر احمدیوں نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سوال کیا کہ شادی بیاہ اور دوسرے معاملات میں آپ اپنی جماعت کے لوگوں کو کیوں اجازت نہیں دیتے کہ وہ ہمارے ساتھ تعلقات قائم کریں۔ آپ نے فرمایا اگر ایک مٹکا دودھ کا بھرا ہوا ہو اور اُس میں کھٹی لسی کے تین چار قطرے بھی ڈال دیئے جائیں تو سارا دودھ خراب ہو جاتا ہے۔ مگر لوگ اس حکمت کو نہیں سمجھتے کہ قوم کی قوتِ عملیہ کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اُسے دوسروں سے الگ رکھا جائے۔ اور ان کے بد اثرات سے اُسے بچایا جائے آخر ہم نے دشمنانِ اسلام سے رُوحانی جنگ لڑنی ہے اگر اُن سے مغلوب اور اُن کی نقل کرنے والے لوگوں سے ہم مل جل کر رہیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم بھی یورپ کے نقال ہو جائیں گے اور ہم بھی جہادِ قرآنی سے غافل ہو جائیں گے۔ پس خود اسلام اور مسلمانوں کے فائدہ کے لئے ہمیں دوسری جماعتوں سے نہیں ملنا چاہیے۔ تا کہ ہم غافل ہو کر اپنا فرض جو تبلیغ اسلام کا ہے بھول نہ جائیں جس طرح دوسرے مسلمان بھول گئے ہیں۔ اسلام میں پہلے ہی سپاہیوں کی کمی ہے۔ اگر تھوڑے بہت سپاہی جو اُسے میسر ہیں وہ بھی سُست ہو جائیں تو انہوں نے اسلام کی طرف سے دشمنوں کا کیا مقابلہ کرنا ہے۔

جن دنوں ام طاہرؓ کی بیماری کے سلسلہ میں مَیں لاہور میں ٹھہرا ہوا تھا ایک روز رات کے دس بجے ایک غیر احمدی مولوی مجھ سے ملنے کے لئے آیا اور کہنے لگا کہ آپ کی جماعت بڑی اچھی ہے اور اسلام کی بڑی بھاری خدمت کر رہی ہے۔ لیکن صرف ایک خرابی ہے جو نہیں ہونی چاہیے اور وہ یہ کہ آپ ہم سے نہیں ملتے نہ ہمارے پیچھے نمازیں پڑھتے ہیں اور نہ ہمیں رشتے دیتے ہیں۔ اگر یہ خرابی دُور ہو جائے تو پھر آپ کی جماعت سے بہتر اور کوئی جماعت نہیں۔ میں نے کہا مولوی صاحب یہ لوگ جن کی آپ تعریف کر رہے ہیں یہ آپ لوگوں میں سے ہی نکل کر آئے ہیں یا کہیں اور سے آئے ہیں جب یہ آپ لوگوں میں سے ہی نکل کر آئے ہیں اور مرزا صاحب کی تعلیم نے ان میں اتنی بڑی تبدیلی پیدا کر دی ہے تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ پھر یہ دوسرے مسلمانوں کے ساتھ مل کر ویسے ہی بے عمل ہو جائیں جیسے وہ ہیں۔ وہ آدمی سمجھدار تھا کہنے لگا۔ اب میں سمجھ گیا ہوں۔ آپ مسلمانوں سے بالکل نہ ملیئے اور علیحدہ ہی رہیئے۔ اگر آپ کی جماعت کے لوگ پھر اُن سے جا ملے تو اسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کو پھیلانے کی جو جدوجہد آپ کی جماعت کر رہی ہے وہ بھی جاتی رہے گی۔ اور اسلام کی تبلیغ ختم ہو جائے گی۔ اب کم از کم کوئی

جماعت تو ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام پھیلا رہی ہے۔ تو حق یہی ہے کہ یہ میٹھا پانی کڑوے پانی سے الگ رہے گا اور ایک برزخ ان دونوں کو جدا رکھے گا۔

قرآن کریم میں بیان کیا گیا ہے کہ ذوالقرنین سے بعض قوموں نے درخواست کی کہ یاجوج و ماجوج نے ہمارے علاقوں میں بڑا فساد برپا کر رکھا ہے آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک روک بنا دیں تا کہ وہ ہم میں داخل ہو کر کوئی خرابی پیدا نہ کر سکیں۔ چونکہ اس زمانہ کے ذوالقرنین بانی سلسلہ احمدیہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں اس لئے بالکل ممکن ہے کہ ذوالقرنین کے دیوار حائل کرنے سے مراد اس زمانہ میں مغربیت اور اسلام میں ہی دیوار حائل کرنا ہو اور دو قوموں سے مراد دو قسم کے جذبات اور قومی خیالات و افکار ہوں بہرحال ہمارا فرض ہے کہ ہم مغربیت اور اسلام کے درمیان ایک ایسی دیوار حائل کر دیں جس کے بعد مغربیت کے لئے ہمارے اندر داخل ہونے کا راستہ کھلا نہ رہے۔ اور اسلامی فوج ایک ایسے قلعہ میں محفوظ ہو جائے جس پر شیطان کا کوئی حملہ کارگر نہ ہو سکے۔

وَهُوَ الَّذِىْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّ صِهْرًا ؕ

اور وہ (خدا) ہی ہے جس نے پانی سے انسان بنایا۔ پس اس کو کبھی تو نسب بنایا ہے (یعنی شجرۂ آباء) اور کبھی صہر بنایا

وَ كَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا ﴿۵۵﴾

ہے (یعنی شجرۂ سسرال) اور تیرا رب ہر چیز پر قادر ہے۔

تفسیر۔ فرماتا ہے۔ وہ خدا ہی ہے جس نے انسان کو پانی یعنی نطفہ سے پیدا کیا اور پھر اُسے ددھیال اور سسرال والا بنایا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسانی تمدن کی ترقی کا ایک بڑا بھاری ذریعہ آپس کے ازدواجی تعلقات کو قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ یہی ایک ذریعہ ہے جس سے خاندانوں اور قوموں کے آپس میں گہرے روابط اور مضبوط تعلقات قائم ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں یہ مقولہ مشہور ہے کہ فلاں شیر و شکر ہو گئے۔ یعنی جس طرح کھانڈ دودھ میں ملا دی جائے تو دونوں چیزیں یکجان ہو جاتی ہیں اسی طرح انسان بھی آپس میں مل جاتے اور شیر و شکر ہو جاتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کون سی چیز ہے جو انسانوں کو آپس میں ملانے والی ہے۔ اس سوال کا جواب اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ ذریعہ مرد و عورت کی شادی ہے۔ اس کے ذریعہ ایک انسان دوسرے انسان سے مل جاتا ہے ایک قوم دوسری قوم سے مل جاتی ہے بلکہ ایک ملک دوسرے ملک سے مل جاتا ہے۔

اور پھر اللہ تعالیٰ اس تعلق کے ذریعہ ایک نئی نسل جاری کر دیتا ہے۔ایک خاندان کے وہ پوتے پوتیاں ہوتے ہیں اور ایک خاندان کے وہ نواسے نواسیاں ہوتی ہیں۔اور دونوں اس میں اپنی اپنی شکل دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ ددھیال اور ننھیال میں تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں۔اُن میں محبت پیدا ہو جاتی ہے اور گہرے روابط قائم ہو جاتے ہیں۔غرض اللہ تعالیٰ نے شادی کے ذریعہ قوموں اور ملکوں کو آپس میں ملا دیا ہے۔اور اسی کے ذریعہ دنیا کو ترقی حاصل ہوتی ہے۔ دو مختلف خاندانوں کو اللہ تعالیٰ ایک وجود میں اکٹھا کر دیتا ہے۔ایک خاندان جو بالکل علیٰحدہ ہوتا ہے دوسرے خاندان سے مل جاتا ہے اور اس تعلق کو اللہ تعالیٰ اس قدر مضبوط کر دیتا ہے کہ بچہ کے نانا، نانی اُسے نواسہ کہہ کر اس پر جان دیتے ہیں۔اور دوسرے خاندان کے دادا، دادی اسے پوتا، پوتی کہہ کر اس پر جان دیتے ہیں۔غرض ایک ہی وجود کے ذریعہ دو الگ الگ خاندان مل جاتے ہیں بلکہ قومیں اور ملک بھی مل جاتے ہیں۔

اسلام کی رُو سے ایک ہندو اور ایک یہودی لڑکی کے ساتھ بھی نکاح ہوسکتا ہے اور گو یہ رواج آج کل نہیں ہے۔ لیکن اب بھی اگر ایک مسلمان مرد ہندو لڑکی سے یا یہودی لڑکی سے شادی کر لے تو ایک ہی وجود پر ایک طرف مسلمان اُسے پوتا کہہ کر جان دے گا تو دوسری طرف ایک ہندو اُسے نواسہ کہہ کر جان دے گا۔اور آپس کے اختلافات بہت حد تک دُور ہو جائیں گے۔لیکن یہ بات تبھی کامیاب ہوسکتی ہے جب اسے کثرت سے رائج کیا جائے۔اور پھر بچوں کی تربیت کا خاص خیال رکھا جائے۔مسلمانوں میں سے صرف اکبر نے اس پر عمل کیا۔لیکن جب باقی مسلمانوں نے اس پر عمل نہ کیا تو اکبر کا کام بھی بیکار ہو کر رہ گیا اور بجائے فائدہ رساں ہونے کے مضر ہو گیا۔

غرض اللہ تعالیٰ اس ذریعہ سے ایک طرف تو خاندانوں میں وسعت پیدا کرتا ہے اور دوسری طرف اُن کو جوڑ کر محدود کرتا ہے۔ پہلے شادی کے ذریعہ ایک نئی نسل پیدا ہوتی ہے لیکن جب وہ نسل پھیل جاتی ہے تو ایک دوسرے سے اجنبی ہونے لگ جاتی ہے۔پھر اُس کو محدود کرنے کے لئے اور شادیاں کی جاتی ہیں اور وہ جو اجنبی ہونے لگ جاتے ہیں پھر قریبی رشتہ دار بن جاتے ہیں۔

گویا شادی کے ذریعہ ایک طرف تو وسعت پیدا ہوتی ہے اور دوسری طرف تقیید پیدا ہوتی ہے اور یہ تعلق ایسا ہے جو شیر و شکر سے بڑھ کر ہے کیونکہ دودھ اور کھانڈ کے ملانے سے ایک طرف وسعت اور دوسری طرف تقیید پیدا نہیں ہوتی۔یہ وسعت اور تقیید اللہ تعالیٰ نے صرف شادی میں ہی رکھی ہے۔اور اس احسان کی طرف اُس نے اس آیت میں توجہ دلائی ہے۔

اس کے بعد فرماتا ہے۔وَ كَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا۔اور تیرا رب بڑی طاقتیں اور قوتیں رکھنے والا ہے لیکن جس طرح

اُس نے مادی دنیا میں نطفہ کے ذریعے اربوں ارب انسان پیدا کر دیئے ہیں اسی طرح خدا تعالیٰ جب کسی مقدس انسان پر اپنا کلام نازل کر کے اُسے دنیا کی ہدایت کے لئے مبعوث فرماتا ہے تو گو وہ بظاہر ایک حقیر وجود نظر آتا ہے اُسی طرح جس طرح نطفہ حقیر دکھائی دیتا ہے اور دنیا اُس کی ترقی کو ناممکن تصور کرتی ہے۔ مگر خدا تعالیٰ اسے اس قدر عظمت دیتا ہے کہ تھوڑے عرصہ میں ہی کروڑوں انسان اُس کے دامن سے وابستہ ہو جاتے ہیں اور اس کے ذریعہ ایک نئی روحانی نسل دنیا میں پھیلنی شروع ہو جاتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ شاخ در شاخ ہو کر مختلف ممالک اور اکناف میں پھیل جاتی ہے۔ یہی سلوک اللہ تعالیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی فرمائے گا اور آپ کی تعلیم کو بھی ساری دنیا میں پھیلا دے گا۔

وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَ لَا

اور وہ لوگ (یعنی کافر) اللہ (تعالیٰ) کے سوا اُن کی عبادت کرتے ہیں جو نہ انہیں نفع دے سکتے ہیں

يَضُرُّهُمْ ؕ وَ كَانَ الْكَافِرُ عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِيْرًا ﴿۵۶﴾ وَ مَاۤ

اور نہ تکلیف پہنچا سکتے ہیں۔ اور کافر ہمیشہ اپنے رب کے (جاری کردہ سلسلوں کے) خلاف ہوتا ہے اور

اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ﴿۵۷﴾

ہم نے تو تجھے صرف بشارت دینے والا اور ہوشیار کرنے والا بنایا ہے۔

حلّ لُغَات۔ ظَهِيْرٌ ظَهِيْرٌ کے معنے ہیں اَلْمُعِيْنُ مددگار و معاون۔ (اقرب)

تفسیر۔ اس میں بتایا کہ بیشک آج محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توحید کی تعلیم سن کر لوگ آپ کو تعجب اور انکار کی نگاہ سے دیکھتے ہیں مگر دلوں کو فتح کرنے والی تعلیم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہی ہے کیونکہ یہ لوگ ایسے بتوں کے آگے اپنے سر جھکا رہے ہیں جو نہ ان کو نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان اور انسانی عقل ایسے فعل سے بغاوت کرتی ہے جس کا نہ تو کوئی عملی زندگی میں فائدہ ہو اور نہ اُسے چھوڑنے سے نقصان ہو۔ اس لئے لازماً جب یہ لوگ سوچیں گے انہیں بتوں کی پرستش کو ترک کرنا پڑے گا اور اس وقت جو یہ لوگ اپنے پیدا کرنے والے خدا سے روگردان ہو کر اُس کے خلاف باتیں بنا رہے ہیں تو محض شرارتاً ایسا کر رہے ہیں۔ ورنہ اُن کے دل بھی محسوس کرتے ہیں

کہ وہ اندھی تقلید کا شکار ہو چکے ہیں۔اس کے مقابلہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے مبشر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے یعنی اس لئے مبعوث کیا ہے کہ جو لوگ آپ پر ایمان لائیں وہ ترقی کر جائیں اور جو انکار کریں وہ تباہ ہو جائیں۔ایسے شخص کا یہ مشرک کیا مقابلہ کر سکتے ہیں جن کے بت نہ انہیں نفع پہنچانے کی طاقت رکھتے ہیں اور نہ مخالفین کو نقصان پہنچانے کی طاقت رکھتے ہیں۔چنانچہ ایسا ہی ہوا۔محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے دنیا کے بادشاہ بن گئے اور بتوں کے پرستار جنہوں نے آپ کا انکار کیا تھا اپنے بتوں کی عبادت سے نہ کوئی نفع حاصل کر سکے اور نہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کو کوئی نقصان پہنچا سکے۔

قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ

تو اُن سے کہہ دے کہ میں تم سے اس (یعنی خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچانے) کا کوئی اجر نہیں مانگتا ہاں اگر کوئی شخص

اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۵۸﴾

اپنی مرضی سے چاہے تو اپنے رب کی طرف جانے والی راہ کو اختیار کر لے (وہی میرا بدلہ ہوگا)۔

تفسیر۔فرماتا ہے تو اُن لوگوں سے کہہ دے کہ میں تم سے خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچانے کے بدلہ میں کسی اجر کا طالب نہیں۔میرا اجر تو صرف اتنا ہی ہے کہ اگر کسی شخص کا دل اسلام کی صداقت قبول کرنے کے لئے کھل جائے اور وہ اپنی مرضی سے اس راہ کو اختیار کر لے جو اُسے خدا تعالیٰ تک پہنچانے والی ہے تو وہ اسلام میں داخل ہو جائے اور اپنے رب کی رضا حاصل کر لے۔

یہ آیت اسلام کے اس بلند ترین نظریہ کو دنیا کے سامنے پیش کرتی ہے کہ قبول مذہب کے بارہ میں ہر شخص کو آزادیٔ رائے کا حق حاصل ہے اور اسے اختیار ہے کہ وہ جس مذہب کو چاہے قبول کرے۔اس بارہ میں کسی پر جبر وتشدد کا روا رکھنا جائز نہیں۔جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں مبعوث ہوئے اُس وقت عرب اور دوسرے ممالک کے لوگ مذہبی معاملات میں جبر وتشدد کو روا رکھنا بالکل جائز سمجھتے تھے لیکن قرآن کریم نے اس طریق عمل کو غلط قرار دیتے ہوئے اعلان کیا کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرۃ:۲۵۷) یعنی دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ہدایت اور گمراہی میں خدا تعالیٰ نے نمایاں فرق کر کے دکھا دیا ہے پس جو سمجھنا چاہے وہ دلیل سے سمجھ سکتا ہے اس پر جبر نہیں کرنا چاہیے۔

اس آیت سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اسلام غیر مذاہب سے کس قدر رواداری کی تعلیم دیتا ہے اور مذہبی معاملات میں انہیں کس قدر آزادی عطا کرتا ہے۔مگر افسوس ہے کہ اسلام کی اس روشن تعلیم کے ہوتے ہوئے یورپین مستشرقین نے انتہائی ظلم سے کام لیتے ہوئے بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ اعتراض کیا ہے کہ آپ کا غیر مذاہب سے سلوک جبر وتشدد پر مبنی تھا اور آپ کا مذہب تلوار کا مذہب تھا (تفسیر القرآن الکریم ویری جلد اول صفحہ ۳۵۸)۔حالانکہ مذہبی رواداری پر اسلام نے اس قدر زور دیا ہے کہ جس کی نظیر کسی اور جگہ نہیں پائی جاتی۔**(۱)** آپ کی بعثت سے پہلے دنیا میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ جب تک غیر مذاہب والوں کو کلی طور پر جھوٹا ثابت نہ کر لیا جائے اپنے مذہب کی سچائی ثابت نہیں ہوسکتی۔مگر اسلام نے اس نظریہ کو غلط قرار دیا۔چنانچہ اسلام جہاں اپنی خوبیوں کو پیش کرنے کا حکم دیتا ہے وہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے نہایت واضح طور پر یہ بھی تعلیم دی ہے کہ کسی دوسرے کی خوبی کا انکار نہیں کرنا چاہیے۔اور یہ بھی کہ ہر مذہب میں کچھ نہ کچھ خوبیاں ہیں جن کا انکار کرنا سراسر ظلم ہے۔چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ وَّ قَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ وَّ هُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ (البقرۃ:۱۱۴) یعنی یہ کیسے ظلم کی بات ہے کہ عیسائی کہتے ہیں یہودیوں میں کوئی خوبی نہیں اور یہودی کہتے ہیں عیسائیوں میں کوئی خوبی نہیں حالانکہ وہ دونوں ایک ہی کتاب پڑھنے والے ہیں۔اور دونوں میں کچھ نہ کچھ خوبیاں پائی جاتی ہیں۔یعنی چاہیے تو یہ تھا کہ یہودی عیسائیوں کی خوبیوں کو تسلیم کرتے اور عیسائی یہودیوں کی خوبیوں کو تسلیم کرتے۔نہ یہ کہ یہودی عیسائیوں کے متعلق کہنا شروع کر دیتے کہ اُن میں کوئی خوبی نہیں اور عیسائی یہودیوں کے متعلق کہنا شروع کر دیتے کہ اُن میں کوئی خوبی نہیں بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ وہ دونوں ایک ہی کتاب کے حامل ہیں۔غرض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو یہ تعلیم دی کہ دوسروں کی خوبیوں کو تسلیم کرنا چاہیے۔جو شخص یہ کہتا ہے کہ دوسرے مذاہب میں کوئی خوبی ہی نہیں وہ اپنی نابینائی کا مظاہرہ کرتا ہے۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ایسی اعلیٰ درجہ کی تعلیم دی ہے کہ اس کے ذریعہ آپ نے تمام اقوام کے دل رکھ لئے ہیں۔کسی کے مذہب کے متعلق یہ کہنا کہ اس میں کوئی بھی خوبی نہیں اس مذہب کے پیروؤں کے لئے سخت تکلیف دہ بات ہوتی ہے پس اس کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اصل پیش فرمایا کہ ہر قوم کی خوبی کو تسلیم کرو۔اور اس طرح آپ نے دنیا کی تمام اقوام اور مذاہب پر بہت بڑا احسان کیا۔

(۲) پھر آپ نے فرمایا کہ کسی مذہب کے پیروؤں کے متعلق یہ نہ کہو کہ وہ اپنے مذہب کو دھوکا اور فریب سے مانتے ہیں بلکہ باوجود اس کے کہ پہلے مذاہب بگڑ چکے ہیں۔اُن کے ماننے والوں میں سے اکثر انہیں دل سے سچا سمجھ

کر ہی مانتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں یہودیوں کے متعلق آتا ہے کہ اُن میں سے بعض ایسے ہیں کہ اگر اُن کے پاس ڈھیروں ڈھیر مال بھی امانت رکھوا دیا جائے تو وہ اس میں خیانت نہیں کریں گے (آل عمران ع ۸) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں میں ایسے لوگ موجود تھے جو اپنے مذہب کو سچا سمجھ کر مانتے تھے۔ اسی طرح عیسائیوں کے متعلق قرآن کریم میں آتا ہے کہ اُن میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو خدا تعالیٰ کا ذکر سن کر رونے لگ جاتے ہیں اور خشیت سے اُن کے دل بھر جاتے ہیں (المائدۃ ع ۱۱) کیا ایسے لوگ اپنے مذہب کو فریب سے ماننے والے ہو سکتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم دے کر اپنی امت کو بتایا ہے کہ انہیں دوسرے مذاہب کے پیروؤں کے احساسات کا ہمیشہ احترام کرنا چاہیے کیونکہ خواہ وہ جھوٹے مذاہب کے پیرو ہوں مگر بہر حال وہ انہیں سچا سمجھ کر اُن کے پیچھے چل رہے ہیں۔

(۳) تیسرے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کی تمام اقوام کے متعلق اصولی طور پر یہ تعلیم دی کہ اُن میں اللہ تعالیٰ کے انبیاء مبعوث ہوتے رہے ہیں چنانچہ آپ نے فرمایا۔ وَ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (الفاطر:۲۵) یعنی دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جس میں خدا تعالیٰ کا کوئی نبی نہ آیا ہو۔ اس تعلیم کے ذریعہ چونکہ سب اقوام کے نبیوں کے تقدس کو قبول کر لیا گیا ہے اس لئے وہ منافرت جو دائرہ ہدایت کو محدود کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے دل سے دُور ہو جاتی ہے اور انسان عقیدۃً اس امر کو تسلیم کر لیتا ہے کہ سب مذاہب کی اصل سچائی پر مبنی ہے۔ اور مختلف مدارج میں ہدایت دوسرے مذاہب میں بھی پائی جاتی ہے۔ کیونکہ اُن کی ابتداء خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوئی تھی۔ پس بندوں نے ان مذاہب کو خواہ کتنا بھی بگاڑ دیا ہو پھر بھی خدا تعالیٰ کی ہدایت میں سے کچھ نہ کچھ اُن کے پاس ضرور موجود ہے۔ اس لئے باوجود اختلاف کے مجھے اُن سے اتحاد رکھنا چاہیے اور انہیں محبت اور پیار کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔

(۴) چوتھی تعلیم آپ نے یہ دی کہ جب کسی قسم کی مذہبی بحث ہو تو جوش میں آ کر گالیوں پر نہ اُتر آؤ۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ لَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ (الانعام:۱۰۹) یعنی جب تمہاری دوسری قوموں سے بحث ہو تو وہ ہستیاں جنہیں تم نہیں مانتے خواہ انہیں خدا کے مقابلہ میں پیش کیا جاتا ہو۔ پھر بھی انہیں بُرا بھلا نہ کہو ورنہ وہ بھی اس خدا کو گالیاں دینے لگیں گے جسے تم مانتے ہو۔ اور اس طرح تم خدا تعالیٰ کو گالیاں دلوانے کا موجب ہو جاؤ گے جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے باپ کو گالی نہ دے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا کوئی شخص ایسا بھی ہو سکتا ہے جو اپنے باپ کو گالیاں

دے۔آپ نے فرمایا جب تم کسی کے باپ کو گالیاں دو گے تو وہ تمہارے باپ کو گالیاں دے گا اور اس طرح تم خود اپنے باپ کو گالیاں دلوانے والے سمجھے جاؤ گے (صحیح بخاری کتاب الادب باب لا یسب الرجل والدیہ)۔

(۵) پانچویں ہدایت آپ نے یہ فرمائی کہ صرف مذہب کے اختلاف کی وجہ سے کسی قوم پر حملہ نہیں کرنا چاہیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ جس قوم سے مذہبی اختلاف ہو اُس پر حملہ کر کے اس کو تباہ کرنا جائز ہوتا ہے۔لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بالکل خلاف حکم دیا۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے ذریعہ اعلان فرمایا کہ وَقَاتِلُوا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا (البقرة:۱۹۱) یعنی تم جنگ تو کر سکتے ہو مگر صرف انہی سے جو تم پر حملہ آور ہوں۔مذہب کے اختلاف کی وجہ سے کبھی کسی پر حملہ نہ کرنا اس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حربی غیر مسلموں کو بھی حریت ضمیر عطا کی اور بتایا کہ خواہ کسی کا کوئی مذہب ہو۔ اُس کی وجہ سے کسی دوسرے کو یہ حق حاصل نہیں کہ اُسے مارے یا نقصان پہنچائے۔

(۶) چھٹا حق آپ نے غیر مسلم اقوام کا یہ قرار دیا کہ فرمایا خواہ کسی قوم سے عہد ہو تمہارا فرض ہے کہ تم اُسے قائم رکھو۔لوگوں کو یہ بہت بڑی غلطی لگی ہوئی ہے اور اس غلطی میں وہ مسلمان بھی مبتلا ہیں جو قرآن کریم پر تدبر نہیں کرتے کہ غیروں سے جو عہد ہو اُسے توڑ دینا کوئی حرج کی بات نہیں ہوتی۔حالانکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے خلاف حکم دیا ہے۔چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ (الانفال:۵۹) کہ اگر کوئی قوم عہد توڑ دے تو اُسے بتا دینا چاہیے کہ تم نے عہد توڑ دیا ہے اب ہم پر بھی عہد کی پابندی نہیں یونہی اس پر حملہ نہیں کر دینا چاہیے۔چنانچہ ابوسفیان جب صلح حدیبیہ کے بعد مکہ میں آیا اور اُس نے کہا کہ اب میں نئے سرے سے معاہدہ کرتا ہوں تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ابوسفیان تم نے یہ اعلان اپنی طرف سے کیا ہے۔میں نے نہیں کیا۔اور اس طرح اُسے بتا دیا کہ اب ہم تم پر حملہ کریں گے (السیرة النبویة لابن ھشام ذکر الاسباب الموجبة المسیر الی مکة و ذکر فتح مکة)۔اس کے مقابلہ میں آج کل جب کسی ملک پر حملہ کرنا ہوتا ہے تو اس قسم کے اعلان کئے جاتے ہیں کہ فلاں حکومت سے ہمارے بڑے اچھے تعلقات ہیں چنانچہ اٹلی نے جب ٹرکی پر حملہ کیا تو اس حملہ سے تین دن پہلے یہ اعلان کیا گیا کہ ٹرکی کے ساتھ ہمارے آجکل ایسے اچھے تعلقات ہیں کہ اس قسم کے تعلقات پہلے کبھی نہیں ہوئے۔یہ اعلان صرف اس لئے کیا گیا کہ ٹرکی غافل رہے اور اس پر اچانک حملہ کر دیا جائے۔مگر ابوسفیان نے جب اعلان کیا تو اُس وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اگر خاموش بھی رہتے تب بھی آپؐ پر کوئی ذمہ داری عائد نہ ہوتی۔کیونکہ مکہ والے معاہدہ توڑ چکے تھے۔مگر آپ

خاموش نہ رہے بلکہ فرمایا کہ یہ تمہارا اپنا اعلان ہے۔ ہمارا نہیں اس طرح اُسے اشارۃً بتا دیا کہ اب ہم حملہ کرنے والے ہیں۔

(۷) ساتویں۔ پھر آپ نے مسلم اور غیر مسلم کے تمدنی حقوق ایک جیسے قرار دیئے اور یہ بات ایسی ہے جو صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کی ہے۔ آپؐ سے پہلے یہودیوں میں یہ حکم تھا کہ تم اپنے بھائیوں یعنی یہودیوں سے سود نہ لو۔ دوسروں سے لے لیا کرو (استثنا باب ۲۳ آیت ۱۹، ۲۰ واحبار باب ۲۵ آیت ۳۵ تا ۳۷) مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سود نہ یہودیوں سے لو نہ عیسائیوں سے نہ مسلمانوں سے۔ غرض کسی سے بھی سود نہ لو۔ گویا سب سے ایک سا سلوک کرنے کا حکم دیا (بقرہ ع ۳۸) اس طرح رسول کریمؐ نے تمدنی سلوک کے بارہ میں مسلم اور غیر مسلم کے امتیاز کو اڑا دیا (بخاری کتاب المغازی باب قول اللہ تعالیٰ ویوم حنین اذأعجبتکم)۔

(۸) آٹھویں تعلیم آپ نے یہ دی کہ غلاموں کی آزادی میں بھی مسلم اور غیر مسلم کا کوئی امتیاز روا نہ رکھا جائے۔ چنانچہ جنگ حنین کے موقعہ پر سینکڑوں غلام جو پکڑے آئے۔ باوجود اس کے کہ وہ دشمن تھے آپؐ نے انہیں آزاد کر دیا۔

(۹) نویں تعلیم غیر مسلموں کے متعلق آپ نے یہ دی کہ جہاں اسلامی حکومت ہو وہاں مسلمانوں پر زیادہ بوجھ رکھا جائے اور دوسروں پر کم۔ چنانچہ اسلامی احکام کے ماتحت ضروری ہے کہ (۱) مسلمان لڑائی میں شامل ہوں (۲) عشر یعنی دسواں حصہ پیداوار کا دیں (۳) زکوٰۃ دیں لیکن غیر مسلموں کے لئے صرف 1/2 2 روپیہ کے قریب فی کس ٹیکس رکھا گیا ہے جو مسلمانوں کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ اور پھر لڑائی میں انہیں آزادی دی گئی ہے۔ سوائے اس کے کہ مسلمانوں سے اجازت لے کر اپنی خوشی سے وہ لڑائی میں شامل ہو جائیں (ابو داؤد کتاب الخراج والفیء والامارۃ باب فی اخذ الجزیۃ)۔ غرض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں کے متعلق ایسی روادارانہ تعلیم دی ہے جس کی مثال دنیا کا کوئی اور مذہب پیش نہیں کر سکتا۔ اب میں یہ بتاتا ہوں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مذاہب کے پیرؤوں کے متعلق عملی رنگ میں کیا نمونہ پیش کیا۔ سو اس بارہ میں جب ہم تاریخ پر غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ

(۱) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر اقوام کے نیک انسانوں کا عملاً احترام کیا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ جب طے قبیلہ سے جنگ ہوئی تو کچھ مشرک بطور قیدی پکڑے آئے۔ اُن میں حاتم طائی کی بیٹی بھی تھی۔ اُس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ جانتے ہیں میں کس کی بیٹی ہوں۔ آپؐ نے فرمایا کس کی بیٹی ہو۔ اُس نے کہا

میں اس شخص کی بیٹی ہوں جو مصیبتوں کے وقت لوگوں کے کام آیا کرتا تھا۔ یعنی حاتم کی۔ وہ مسلمان نہ تھا لیکن چونکہ لوگوں سے اچھا سلوک کرتا تھا اس لئے اس کی وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کی بیٹی کو آزاد کر دیا۔ اس کا بھائی گرفتاری کے خوف سے بھاگا پھرتا تھا۔ آپؐ نے اُسی وقت اُسے روپیہ اور سواری دے کر کہا کہ جا کر اپنے بھائی کو بھی لے آ۔ چنانچہ وہ گئی اور اُسے لے آئی۔ اُس پر اس سلوک کا ایسا اثر ہوا کہ وہ مسلمان ہو گیا۔ اس طرح آپؐ نے اس کی سفارش پر اُس کی ساری قوم کی سزا کو بھی معاف کر دیا (السیرۃ الحلبیۃ باب یذکر فیہ مایتعلق بالوفود التی وفدت علیہ صلی اللہ علیہ وسلم وفود عدی بن الحاتم الطائی) اس سے ظاہر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی طور پر نہ صرف غیر مذاہب کے لوگوں کی خوبیوں کا اعتراف کیا بلکہ اُن سے تعلق رکھنے والوں سے بھی حسنِ سلوک کیا۔ اور انہیں اپنے احسانات سے نوازا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں جب طے قبیلہ بعض لوگوں کے اکسانے سے بغاوت میں شامل ہو گیا تو حاتم طائی کے بیٹے نے جو خود اسلام سے بھاگا پھر رہا تھا آ کر اپنی قوم کو سمجھایا اور دوبارہ اُن کی بیعت کرائی۔ (طبری سنۃ ۱۱ ذکر بقیۃ الخبر عن غطفان)

(۲) دوسری مثال نصاریٰ نجران کا واقعہ ہے۔ نجران کے نصاریٰ کا ایک وفد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس الوہیتِ مسیحؑ کی تائید میں بحث کرنے کے لئے آیا مگر باوجود اس کے کہ وہ لوگ شرک کی تائید کے لئے آئے تھے جب اُن کی عبادت کا وقت آیا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مسجد نبویؐ میں ہی اپنے طریق پر عبادت کرنے کی اجازت دے دی اور انہوں نے سب کے سامنے مشرق کی طرف منہ کر کے نماز ادا کی (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام امر السید والعاقب و ذکر المباھلۃ) اس سلوک کو دیکھتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی جانیں لینے کے لئے اور اُن پر ظلم کرنے کے لئے آئے تھے، جو جانیں لینے کے لئے آیا کرتا ہے کیا وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی مسجد میں غیر مذاہب والوں کو عبادت کی اجازت دے سکتا ہے اور مسجد بھی وہ جس کے متعلق آپؐ نے اٰخر المساجد فرمایا ہے۔ اور جس میں نماز پڑھنا دوسری مساجد کی نسبت بہت زیادہ قابلِ ثواب قرار دیا ہے (مسلم کتاب الحج باب فضل الصلاۃ بمسجدی مکۃ والمدینۃ)۔ اس مسجد میں خدا تعالیٰ کے نبی کی موجودگی میں اور اُس نبیؐ کی موجودگی میں جو خدا تعالیٰ کی توحید قائم کرنے کے لئے آیا تھا۔ نصاریٰ صلیبیں رکھ کر عبادت کرنا چاہتے ہیں اور آپ فرماتے ہیں کیا ہرج ہے بیشک کر لو۔ آج بڑے بڑے رواداری کا دعویٰ کرنے والوں کو بھی اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ اپنی عبادت گاہوں میں غیر مذاہب کے لوگوں کو عبادت کرنے دیں صرف ہماری جماعت کی ایک مثال ہے جس نے یہ نمونہ قائم کیا اور مسجد لنڈن کی بنیاد رکھتے ہوئے ہی

اعلان کر دیا کہ ’’ یہ مسجد صرف اور صرف خدا تعالیٰ کی عبادت کے لئے بنائی جاتی ہے تا کہ دنیا میں خدا تعالیٰ کی محبت قائم ہو اور لوگ مذہب کی طرف جس کے بغیر حقیقی امن اور حقیقی ترقی نہیں متوجہ ہوں۔ اور ہم کسی شخص کو جو خدا تعالیٰ کی عبادت کرنا چاہے ہرگز اس میں عبادت کرنے سے نہیں روکیں گے بشرطیکہ وہ اُن قواعد کی پابندی کرے جو اس کے منتظم اس کے انتظام کے لئے مقرر کریں۔ اور بشرطیکہ وہ اُن لوگوں کی عبادت میں مخل نہ ہوں جو اپنی مذہبی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اس مسجد کو بناتے ہیں۔‘‘ (الفضل مورخہ ۲۰ نومبر ۱۹۲۴ء صفحہ ۵ کالم نمبر ۱) مجھے یاد ہے ایک دفعہ قادیان میں آریوں کا جلسہ ہوا جس میں انہوں نے ہمارے خلاف بہت شور مچایا۔ جلسہ کے بعد اُن کے لیکچرار مجھ سے ملنے آئے۔ میں نے اُن سے کہا کہ میں نے سُنا ہے آپ کو جگہ کے متعلق تکلیف ہوئی۔ آپ میرے پاس آتے میں اپنی مسجد میں انتظام کروا دیتا۔ وہ کہنے لگے کیا آپ اپنی مسجد میں اس کی اجازت دے دیتے؟ میں نے کہا کیوں نہیں۔ اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عیسائیوں کو اپنے طریق پر عبادت کرنے کی اجازت دے دی تھی تو میں آپ کو مسجد میں لیکچر کی اجازت کیوں نہیں دے سکتا۔ اس پر اُن میں سے ایک نے کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں آج لیکچر دے سکتا ہوں۔ میں نے کہا اجازت ہے۔ چنانچہ مسجد اقصیٰ میں اس کا لیکچر ہوا جس میں مَیں بھی شامل ہوا۔ اس کے بعد آریہ صاحبان کی موجودگی میں حافظ روشن علیؓ صاحب مرحوم نے اُن کے اعتراضات کے جواب دیئے۔ اس کا ایسا اثر ہوا کہ اُن کا جلسہ ہی بند ہو گیا اور شاید بارہ تیرہ سال کے بعد اُن کا دوبارہ جلسہ ہوا۔ غرض اسلام غیر مذاہب کے متعلق جس روادارانہ تعلیم کا حامل ہے۔ اُس کی نظیر دنیا کا کوئی مذہب پیش نہیں کر سکتا۔

(۳) غیر مذاہب سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سلوک کی **تیسری مثال** یہ ہے کہ آپ اپنے ہمسائیوں سے خواہ وہ کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھتے ہوں اچھا سلوک کرنے کا حکم دیتے تھے اور اس کے متعلق اتنا زور دیتے تھے کہ صحابہؓ ہر وقت اس کی پابندی ملحوظ رکھتے تھے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ ایک دفعہ گھر میں آئے تو انہوں نے دیکھا کہ کہیں سے اُن کے ہاں گوشت آیا ہوا ہے۔ انہوں نے گھر والوں سے پوچھا کہ کیا یہودی ہمسائے کو گوشت بھیجا ہے یا نہیں۔ اور پھر آپ نے اس بات کو اتنی دفعہ دوہرایا کہ گھر والوں نے کہا۔ آپ اس طرح کیوں کہتے ہیں انہوں نے کہا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے سُنا ہے کہ جبرائیل نے اتنی دفعہ مجھے ہمسایہ کے حق کی تاکید کی کہ میں نے سمجھا شاید اسے وراثت میں شریک کر دیا جائے گا۔

یہ عملی سلوک تھا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو آپ نے غیر مذاہب کے لوگوں سے روا رکھا۔ آپ غیر مذاہب والوں کے احساسات کا بھی بے حد خیال رکھتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت ابو بکرؓ کے سامنے کسی یہودی نے کہہ دیا کہ

مجھے موسیٰ ؑ کی قسم جسے خدا نے سب نبیوں پر فضیلت دی ہے۔اس پر حضرت ابوبکرؓ نے اُسے تھپڑ مار دیا۔ جب اس واقعہ کی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ملی تو آپ نے حضرت ابوبکرؓ جیسے انسان کو زجر کی (بخاری کتاب الانبیاء باب وفاۃ موسیٰ و ذکرہ بعد)۔غور کرو مسلمانوں کی حکومت ہے۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر حضرت موسیٰ ؑ کو ایک یہودی فضیلت دیتا ہے اور ایسی طرز سے کلام کرتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ جیسے نرم دل انسان کو بھی غصہ آ جاتا ہے اور آپ اسے طمانچہ مار بیٹھتے ہیں۔مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں ڈانٹتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔ اُسے حق ہے کہ جو چاہے عقیدہ رکھے۔

(۴) آپ کے حسنِ سلوک کی **چوتھی مثال** یہ ہے کہ فتح خیبر کے موقعہ پر ایک یہودی عورت نے آپ کی دعوت کی اور اُس نے گوشت میں زہر ملا دیا۔آپ نے صرف ایک ہی لقمہ کھایا تھا کہ آپ پر وحی نازل ہوئی کہ اس میں زہر ہے اور آپ نے کھانے سے ہاتھ اُٹھالیا۔اس کے بعد آپ نے اس عورت کو بلایا اور فرمایا کہ اس کھانے میں تو زہر ہے۔اُس نے کہا آپ کو کس نے بتلایا۔آپ کے ہاتھ میں اُس وقت بکری کا دست تھا۔آپ نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس ہاتھ نے مجھے بتایا ہے۔یہودن نے کہا میں نے یہ زہر اس لئے ملایا تھا کہ اگر آپ واقعہ میں خدا تعالیٰ کے سچے نبی ہیں تو آپ کو یہ بات معلوم ہو جائے گی اور اگر جھوٹے ہیں تُو دنیا کو آپ کے وجود سے نجات حاصل ہو جائے گی۔مگر باوجود اس کے کہ اُس نے آپ کو زہر سے ہلاک کرنے کی کوشش کی اور باوجود اس کے کہ ایک صحابیؓ اس زہر کی وجہ سے بعد میں فوت ہو گئے آپ نے اسے کوئی سزا نہ دی۔یہ کتنا بڑا نیک سلوک ہے جو آپ نے ایک ایسی دشمن عورت سے کیا جس نے آپ کی اور آپ کے جاں نثار صحابہؓ کی جان لینے کی کوشش کی اور اس طرح اسلام کو بیخ و بن سے اکھیڑنا چاہا۔(المواھب اللدنیۃ الجزء الثالث غزوۃ خیبر)۔

(۵) آپ کے سلوک کی **پانچویں مثال** یہ ہے کہ جب آپ جنگ کے لئے جاتے تو سپاہیوں کو خاص طور حکم دیتے کہ کسی قوم کی عبادتگاہیں نہ گرائی جائیں۔اُن کے مذہبی پیشواؤں کو نہ مارا جائے۔عورتوں پر اور بوڑھوں پر اور بچوں پر حملہ نہ کیا جائے (بخاری کتاب الجھاد باب تحریم قتل النساء والصبیان فی الحرب)۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے پہلے یہ رواج تھا کہ پادریوں اور راہبوں کو مار ڈالا جاتا تھا (تواریخ مسیحی کلیسیا ۳۳ سے ۶۰۰ ص ۱۵۶۔۱۸۱)۔مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے قطعی طور پر روک دیا۔اگر آپ دوسرے مذاہب کے ایسے ہی دشمن ہوتے جیسے مخالفین آپ کو قرار دیتے ہیں تو کیا آپ یہ حکم دیتے کہ ان مذاہب کے رہنماؤں کو چھوڑ دیا جائے؟ آپ تو یہ کہتے کہ سب سے پہلے ان کو مارا جائے مگر آپ نے فرمایا۔جو تلوار لے کر حملہ کرتا ہے اُسے تو بے شک

مارو۔لیکن جولوگ مذہبی کاموں میں مصروف رہتے ہوں اُن کو کچھ نہ کہو۔

(٦) پھر دنیا میں یہ طریق ہے کہ جن لوگوں سے جنگ ہوتی ہے اُن کے احساسات کا خیال نہیں رکھا جاتا اور مفتوح اقوام کو ہر طرح دبانے اور اُن کے جذبات کو کچلنے کی کوشش کی جاتی ہے۔مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان دیکھو۔مکہ والوں نے آپ پر کس قدر ظلم کئے تھے۔متواتر ۱۳ سال مکہ والے آپ پر اور آپ کے ساتھیوں پر مظالم کرتے رہے عورتوں کی شرمگاہوں میں نیزے مار مار کر ہلاک کیا گیا۔صحابہؓ کو رسیوں سے باندھ کر انہیں تپتی ریت پر گھسیٹا گیا۔بھٹیوں سے کوئلے نکال کر اُن پر مسلمانوں کو لٹایا گیا۔بعض مردوں اور عورتوں کی آنکھیں نکال دی گئیں اور یہاں تک ظلم کئے گئے کہ آخر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا اور جب مکہ چھوڑ کر آپ مدینہ تشریف لے گئے تو وہاں بھی ان لوگوں نے آپ کو چین نہ لینے دیا اور وہاں کے لوگوں کو آپ کے خلاف اکسایا۔قیصر اور کسریٰ کی حکومتوں کو اشتعال دلایا۔مگر جب ایسی قوم کے خلاف آپ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ چڑھائی کر کے گئے تو مکہ کے قریب پہنچ کر فوج کے ایک حصہ کے کمانڈر کی زبان سے یہ فقرہ نکل گیا کہ آج مکہ والوں کی خیر نہیں۔آج ہم اُن کے ظلموں کا اُن سے انتقام لیں گے۔اس پر ابوسفیان نے آگے بڑھ کر شکایت کی کہ اس شخص نے ہمارا دل دکھایا ہے۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُس وقت اس شخص کو بلوایا اور فرمایا تمہیں معزول کیا جاتا ہے کیونکہ تم نے کفار مکہ کے احساسات کا خیال نہیں رکھا۔دیکھو ابھی معلوم نہیں کہ مکہ والے کیا روّیہ اختیار کریں گے اور لڑائی کا کیا نتیجہ رونما ہوگا مگر مکہ والوں کے ایک ایسے سردار کے کہنے پر جو ساری عمر مسلمانوں سے لڑتا رہا تھا اور کفار کے لشکر کا کمانڈر رہا تھا آپ نے ایک اسلامی کمانڈر کو معزول کر دیا۔کیا دنیا کی تمام جنگوں کی تاریخ میں کوئی ایک بھی ایسی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔کمانڈر چھوڑ نائک اور لیس نائک کی مثال بھی نہیں دکھائی جاسکتی کہ اُسے اس لئے سزا دی گئی ہو کہ اُس نے میدان جنگ میں کھڑے ہوکر کہا ہو کہ آج ہم دشمن کی خبر لیں گے۔اور اُسے اپنے کئے کا مزہ چکھائیں گے۔مغربی تاریخوں میں ایک مشہور شخص ابراہیم لنکن کا ذکر آتا ہے کہ اُس کے زمانہ میں دو گروہوں میں لڑائی ہوئی۔ایک کہتا تھا غلامی قائم رہنی چاہیے اور دوسرا گروہ اسے ظلم قرار دے کر مٹانا چاہتا تھا۔ابراہیم لنکن مٹانے والوں میں سے تھا۔اُس کی بڑی خوبی یہ بیان کی جاتی ہے کہ جب دوسرے فریق کو شکست ہوئی اور اُسے فتح تو وہ سر نیچے کئے ہوئے دشمن جرنیل کے گھر پر گیا۔کہتے ہیں وہ اُس وقت دعا کر رہا تھا۔افسروں نے اُسے کہا کہ ہمیں بینڈ بجاتے ہوئے جانا چاہیے مگر اُس نے کہا نہیں۔اس طرح دوسروں کا دل دکھے گا۔یہ ابراہیم لنکن کی ایک خاص خوبی بیان کی جاتی ہے مگر وہ

ایسا شخص تھا جسے ان لوگوں نے کوئی ذاتی دُکھ نہیں دیا تھا۔لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ پر حملہ آور ہوئے تو اُن لوگوں کی غداری کی وجہ سے حملہ آور ہوئے تھے اور اُن دشمنوں پر حملہ کرنے گئے تھے جنہوں نے قریباً ربع صدی تک مسلمانوں پر ظلم کئے تھے۔جنہوں نے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو مکی زندگی کے تیرہ سال سے ہر منٹ بلکہ ہر سیکنڈ میں مارنے اور ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کے بعد سات سال تک دوسو میل دُور جا کر وہ آپ کی تباہی کی کوشش کرتے رہے تھے مگر ان تمام مظالم کے باوجود جب آپ مکہ میں داخل ہوئے تو آپ نے اپنے عفو وکرم کا وہ نمونہ دکھایا جس کے مقابلہ میں ابراہیم لنکن کا نمونہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔آپ نے مکّہ والوں کو جمع کیا اور اُن سے پوچھا کہ بتاؤ اب تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔اگر اُس وقت اُن کے جسموں کا قیمہ بھی کر دیا جاتا۔تو میں سمجھتا ہوں یہ اُن کے جرموں کے مقابلہ میں کافی سزا نہ تھی۔مگر جب انہوں نے کہا کہ ہم سے وہی سلوک کیا جائے جو یوسفؑ نے اپنے بھائیوں کے ساتھ کیا تھا تو آپ نے فرمایا لَا تَثۡرِيۡبَ عَلَيۡكُمُ الۡيَوۡمَ جاؤ تمہیں معاف کیا جاتا ہے اور تمہیں کوئی ملامت نہیں کی جاتی۔یہ وہ خاتمہ ہے جو اس عظیم الشان جنگ کا ہوا۔جو آپؐ کے اور آپ کے دشمنوں کے درمیان بیس سال تک جاری رہی۔کیا اس نمونہ کے ہوتے ہوئے کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں پر ظلم کیا اور انہیں تلوار کے زور سے اپنے مذہب میں داخل کرنے کی کوشش کی۔تعصب یا جہالت سے اعتراض کرنا اور بات ہے ورنہ جو شخص حقائق پر غور کرنے کا عادی ہو وہ یہ تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر دنیا میں اپنے دشمنوں سے نیک سلوک کرنے والا اور کوئی شخص نہیں گذرا۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت یوسفؑ نے بھی اپنے بھائیوں کو لَا تَثۡرِيۡبَ عَلَيۡكُمُ الۡيَوۡمَ کہا تھا۔مگر یوسفؑ کے سامنے اُن کے اپنے بھائی کھڑے تھے جن کی سفارش کرنے والے اُن کے ماں باپ موجود تھے۔مگر وہ لوگ جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوئے آپ کے عزیزوں اور بھائیوں کے قاتل تھے۔حضرت حمزہؓ کو قتل کرنے والے کون لوگ تھے۔حضرت خدیجہؓ کی وفات کا باعث کون لوگ تھے۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چہیتی بیٹی کو مارنے والے کون لوگ تھے جبکہ وہ حاملہ تھیں۔اور خاوند نے اس خیال سے کہ اسلام کی عداوت کی وجہ سے لوگ انہیں مکّہ میں تنگ کرتے ہیں مدینہ روانہ کر دیا تھا مگر کفّار نے راستہ میں انہیں سواری سے گرا دیا جس سے اسقاط ہو گیا۔اور اسی وجہ سے بعد میں آپ کی وفات ہو گئی۔حضرت یوسفؑ کے سامنے کون سے جذبات تھے۔سوائے اس کے کہ اُن کے بھائیوں نے ان کو وطن سے نکال دیا تھا۔مگر یہاں تو یہ حالت تھی کہ ابو طالب کی روح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے

کہہ رہی تھی کہ یہ لوگ میرے قاتل ہیں جس نے تیری خاطر سالہا سال اپنی قوم کا مقابلہ کیا۔ عالمِ خیال میں حضرت خدیجہؓ آپ کے سامنے کھڑی کہہ رہی تھیں کہ میں نے اپنا مال و دولت اور اپنا آرام و آسائش سب کچھ آپ کے لئے قربان کر دیا تھا۔ اب یہ لوگ جو میرے قاتل ہیں آپ کے سامنے کھڑے ہیں۔ حضرت حمزہؓ کھڑے کہہ رہے تھے کہ انہی میں سے وہ لوگ ہیں جنہوں نے میری لاش کی بے حرمتی کی اور میرے جگر اور کلیجہ کو باہر نکال کر پھینک دیا تھا ۔آپ کی بیٹی آپ کے سامنے کھڑی کہہ رہی تھیں کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہیں ایک عورت پر ہاتھ اُٹھاتے ہوئے شرم نہ آئی اور ایسی حالت میں مجھ پر حملہ کیا جبکہ میں حاملہ تھی اور مجھے ایسا نقصان پہنچایا جس کے بعد میری وفات ہوگئی ۔(الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب باب زینب بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم) پھر وہ سینکڑوں صحابہؓ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے بچوں سے بھی زیادہ عزیز تھے اور جن میں سے ایسے لوگ بھی تھے کہ جب اُن میں سے ایک کو کفار نے پکڑا اور قتل کرنے لگے تو انہوں نے پوچھا کہ کیا تم یہ پسند نہ کرو گے کہ اس وقت تمہاری جگہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوں۔ اور تم آرام سے اپنے بیوی بچوں میں بیٹھے ہو۔ اُس نے جواب دیا کہ میں تو یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ میں آرام سے اپنے گھر میں بیٹھا رہوں ۔اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں میں مدینہ میں چلتے ہوئے کانٹا تک چبھے (السیرۃ النبویۃ لابن ہشام الجزء الثالث ذکر یوم الرجیع، مقتل ابن الدثنۃ و مثل من وفائہ للرسول)۔ ایسے عزیز صحابہؓ کو دُکھ دے دے کر مارا گیا۔ اُن کی روحیں اس وقت عالمِ خیال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑی کہہ رہی تھیں کہ یہ لوگ ہمارے قاتل ہیں ۔اب ان سے ہمارا انتقام لیا جائے۔ مگر باوجود ان سب جذبات کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تو یہی کہا کہ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ۔ جاؤ آج تم سے کوئی باز پرس نہیں کی جائے گی۔ اتنے بڑے نمونہ کو دیکھتے ہوئے بھی اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اسلام اپنے دشمنوں سے رواداری کی تعلیم نہیں دیتا تو اُس سے زیادہ نابینا اور کوئی شخص نہیں ہوسکتا۔

اسلام کی ایسی روادارانہ تعلیم کا ہی یہ اثر تھا کہ اسلامی ملکوں میں اسلامی حکومتوں کے ماتحت غیر اقوام کے لوگ بڑے بڑے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور آپ کے خلفاء کے زمانہ میں اسلام ایک جنگی انتشار کی حالت میں سے گذر رہا تھا اور ابھی ایسی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی جس میں تمام اقوام مل کر بس جانے کا فیصلہ کرتیں اس لئے بعض سیاسی حقوق کامل طور پر غیر مسلموں کو نہیں دیئے جا سکتے تھے مگر باوجود اس کے جہاں جہاں ممکن تھا اُن کو سرداری کے حقوق دیئے گئے ہیں چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مقنا کو جو خط لکھا اُس میں صاف طور پر یہ الفاظ پائے جاتے ہیں کہ لَيْسَ عَلَيْكُمْ اَمِيْرٌ

اِلَّا مِنْ اَنْفُسِکُمْ اَوْ مِنْ اَھْلِ رَسُوْلِ اللّٰہِ (مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ، معاھدتہ صلی اللہ علیہ وسلم مع اھل مقنا صفحہ ۳۶) یعنی تمہاری قوم میں گورنر یا تم میں سے ہوگا یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان میں سے ہوگا۔ اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تسلیم فرماتے ہیں کہ کسی علاقہ کا گورنر غیر مسلم بھی ہوسکتا ہے۔

اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء کے زمانہ میں بھی حالانکہ ابھی ملک میں پُرامن طور پر ساری قومیں نہیں بسی تھیں ان حقوق کو تسلیم کیا جاتا تھا۔ چنانچہ علامہ شبلی اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''حضرت عمرؓ نے صیغۂ جنگ کو جو وسعت دی تھی اس کے لئے کسی قوم اور کسی ملک کی تخصیص نہ تھی۔ یہاں تک کہ مذہب وملت کی بھی کچھ قید نہ تھی۔ والنٹیئر فوج میں تو ہزاروں مجوسی شامل تھے جن کو مسلمانوں کے برابر مشاہرے ملتے تھے۔ فوجی نظام میں بھی مجوسیوں کا پتہ ملتا ہے۔''

(الفاروق از شبلی نعمانی حصہ دوم زیر عنوان صیغۂ فوج صفحہ ۲۵۱)

اسی طرح لکھتے ہیں:

''یونانی اور رومی بہادر بھی فوج میں شامل تھے۔ چنانچہ فتح مصر میں ان میں سے پانسو آدمی شریک جنگ تھے۔ اور جب عمرو بن العاص نے فسطاط آباد کیا تو یہ جداگانہ محلے میں آباد کئے گئے۔ یہودیوں سے بھی یہ سلسلہ خالی نہ تھا چنانچہ مصر کی فتح میں ان میں سے ایک ہزار آدمی اسلامی فوج میں شریک تھے۔'' (الفاروق حصہ دوم صفحہ ۲۵۱ زیر عنوان صیغۂ فوج)

اسی طرح تاریخ سے ثابت ہے کہ غیر اقوام کے افراد کو جنگی افسر بھی مقرر کیا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایرانیوں کو بھی فوجی افسر مقرر کیا گیا۔ اُن میں سے بعض کے نام بھی تاریخ میں موجود ہیں۔ علامہ شبلی نے چھ فوجی افسروں کے نام یہ لکھے ہیں۔

'' سیاہؔ۔ خسروؔ۔ شہریارؔ۔ شیرویہؔ۔ شہرویہؔ۔ افرودین '' (الفاروق حصہ دوم صفحہ ۲۵۱ زیر عنوان صیغۂ فوج)

ان افسروں کو تنخواہیں بھی سرکاری خزانہ سے ملتی تھیں Pay roll میں اُن کا نام تھا۔ چاروں خلفاء کے بعد حضرت معاویہؓ کے متعلق تاریخ سے ثابت ہے کہ اُن کے زمانہ میں ایک عیسائی ابن آثال نامی وزیر خزانہ تھا۔ (تاریخ عرب مصنفہ پروفیسر ہٹی پارٹ iii باب xvii صفحہ ۱۹۶) عباسی خلافت کے زمانہ میں باقاعدہ منظم حکومت قائم کی گئی اور مختلف قوموں اور علاقوں کے نمائندوں کی ایک کونسل آف سٹیٹس مقرر کی گئی۔ اس کونسل آف سٹیٹ میں عیسائی یہودی صابی اور زرتشتی بھی شامل تھے۔ (A Short History of the Saracens by Ameer Ali pg.274-275)

اس زمانہ میں ایک عیسائی وزیر جنگ بھی مقرر کیا گیا۔ چنانچہ عباسی خلیفہ معتضد کا وزیر جنگ ایک عیسائی تھا جس کا نام صابی تھا (تاریخ عرب مصنفہ پروفیسر ہٹی ایڈیشن پنجم پارٹ iii صفحہ ۳۵۵) عباسی خلیفہ المتقی کا بھی ایک عیسائی وزیر تنوخی نام کا تھا (تاریخ عرب مصنفہ پروفیسر ہٹی ایڈیشن پنجم صفحہ ۳۵۵) بولیہہ خاندان کے ایک بادشاہ عضد الدولہ کا بھی ایک عیسائی وزیر نسر بن ہارون تھا۔ (تاریخ عرب مصنفہ پروفیسر ہٹی صفحہ ۳۵۵)

سپین کی حکومت کے متعلق بھی تاریخ سے ثابت ہے کہ اُس میں قاضی القضاۃ تک کا عہدہ بھی غیر مذاہب والوں کو دیا جاتا تھا۔ چنانچہ عبدالرحمٰن ثالث بادشاہ سپین کے بیٹے الحکم ثانی کے زمانہ میں ایک عیسائی ولید بن خیز دران کو قرطبہ میں حکومت کا جج مقرر کیا گیا (تاریخ عرب مصنفہ پروفیسر ہٹی ایڈیشن پنجم پارٹ iii باب xxxviii صفحہ ۵۲۹۔۵۳۰) اسی طرح عبدالرحمٰن ثالث بادشاہ سپین کا ایک یہودی وزیر تھا جس کا نام رِبی حسدی شپروت تھا (تاریخ عرب مصنفہ پروفیسر ہٹی پارٹ iii باب xi صفحہ ۵۷۷) اسی طرح تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ سپین میں بھی ایک کونسل آف سٹیٹ مقرر کی گئی تھی جس کے ممبر غیر مسلم بھی ہوتے تھے۔ چنانچہ ایک عیسائی Gomez Son of Antony بھی اس کونسل آف سٹیٹ کا ممبر تھا اور بادشاہ عبدالرحمٰن ثالث نے ایک بڑی سیاسی میٹنگ میں جس کے لئے تمام سپینش بشپ بلائے گئے تھے اپنی بیماری کی وجہ سے اس کو اپنا قائم مقام بنا کر بھیجا اور اُسے پریذیڈنٹ مقرر کیا۔ A Short History of the Saracens by Ameer Ali chapter xxvi pg.488 اسی طرح سموئل بن عارف ایک عیسائی اسلامی حکومت غرناطہ میں وزیر مقرر کیا گیا (اخبار اندلس جلد سوم صفحہ ۱۴۶)۔

سکاٹس کی ’’تاریخ اندلس‘‘ میں یہ بھی لکھا ہے کہ جب بادشاہوں کو کوئی اہم سفارت بھیجنی ہوتی تھی تو وہ مقتدر یہودیوں کو بھیجا کرتے تھے (اخبار اندلس جلد سوم ترجمہ از خلیل الرحمٰن صاحب صفحہ ۱۴۵)۔

مصر کی فاطمی حکومت میں بھی غیر مسلموں کو بڑے بڑے درجے دیئے جاتے تھے۔ چنانچہ فاطمی بادشاہ العزیز کے زمانہ میں ایک عیسائی عیسیٰ بن نستور کو وزیر بنایا گیا (تاریخ عرب مصنفہ پروفیسر ہٹی ایڈیشن پنجم باب xiii صفحہ ۶۲۰) اسی طرح تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ بہت سے فاطمی بادشاہوں کے وزراء عیسائی اور یہودی ہوا کرتے تھے۔

(A Short History of the Saracens by Ameer Ali chapter xxvi pg.413)

ہندوستان میں سب سے زیادہ بدنام اورنگ زیب ہے لیکن اورنگ زیب کے متعلق تاریخ سے ثابت ہے کہ وہ سیاسی معاملات میں کسی قسم کا امتیاز اور فرق کرنا جائز نہیں سمجھتا تھا۔ اور دلیل یہی دیا کرتا تھا کہ قرآن کریم میں صاف حکم ہے کہ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ (الکافرون:۷)۔ چنانچہ ایک دفعہ اس کے پاس درخواست کی گئی کہ ذِمیوں کو کلیدی

عہدوں سے الگ کیا جائے۔ اس پر اُس نے جواب دیا کہ مذہب کا دنیوی معاملات سے کوئی تعلق نہیں اور اس قسم کے معاملات میں تعصّب کو کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے۔ پھر اُس نے یہ آیت پڑھی کہ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ۔ پھر اُس نے کہا کہ اگر ہم اس درخواست کو تسلیم کریں تو پھر ہمیں تمام راجوں اور اُن کی رعایا کو قتل کر دینا چاہیے۔

Preaching of Islam by Sir Thomas Arnold pg.214 Anecdotes of Aurang Zeb by Sir Jadunath Sarkar pg.97-100

اسی طرح عالمگیر کے ایک فرمان کا یہ فقرہ ہے کہ

''حکومت کے عہدے قابلیت کے اصول پر دئے جائیں۔ کسی اور خیال کے ماتحت نہ دئے جائیں۔''

Preaching of Islam by Sir Thomas Arnold pg.214

پھر مغلیہ حکومت کے متعلق ایک اور مصنف لکھتا ہے کہ

''بنگال کا حکومتی مذہب اسلام ہے۔ لیکن ملازمتوں کا یہ حال ہے کہ ایک مسلمان کے مقابلہ میں سو ہندو ہے اور تمام سرکاری عہدے اور اعتبار کی جگہیں دونوں قوموں سے چُنی جاتی ہیں۔''

A New Account of the East Indies vol.2 pg.14

اور یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ مغلیہ حکومت نے ہندو کمانڈر انچیف تک مقرر کئے۔ چنانچہ جرنیل مان سنگھ۔ جسونت سنگھ اور جے سنگھ مشہور مثالیں ہیں (اورنگزیب از رشید اختر ندوی)۔ مسلمانوں کا غیر مسلموں سے یہ رواداری سلوک اتنا نمایاں تھا کہ خود غیر مسلموں نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ مشہور عیسائی مؤرخ جرجی زیدان لکھتا ہے۔

''مسلمانوں کے نہایت تیزی کے ساتھ علمی ترقی کرنے کا ایک زبردست سبب یہ بھی تھا کہ خلفاء اسلام ہر قوم اور ہر مذہب کے علماء کے بہت بڑے قدردان تھے اور ہمیشہ اُن کو انعام و اکرام سے مالا مال کرتے رہتے تھے۔ اُن کے مذہب، اُن کی قومیت اور اُن کے نسب کا کچھ خیال نہیں کرتے تھے اُن میں نصرانی۔ یہودی۔ صابی۔ سامری اور مجوسی غرض ہر مذہب و ملت کے لوگ تھے خلفاء ان کے ساتھ نہایت عزت اور عظمت کا برتاؤ کرتے تھے۔ اور غیر مسلموں کو وہی آزادی اور درجہ حاصل تھا جو مسلمان امراء یا حکام کو حاصل ہوتا تھا۔''

(تاریخ التمدن الاسلامی جلد ۳ الکتب التی ترجمت فی النہضة العباسیة زیرعنوان محاسبة الخلفاء وللعلماء غیر المسلمین صفحہ ۱۹۴)

ان حوالہ جات سے یہ امر واضح ہے کہ اسلام غیر مسلموں کے ساتھ کسی قسم کی ناواجب سختی کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ وہ اُن کے تمام حقوق کا خیال رکھتا اور اُن پر ہر قسم کے ظلم کو ناجائز قرار دیتا ہے۔ تاریخ میں لکھا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک دفعہ ایک مسلمان نے ایک ذمی کافر کو قتل کر دیا۔ اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اس مسلمان کو قصاص کے طور پر قتل کر دیا جائے اور فرمایا ذمیوں کے حقوق کی حفاظت میرا سب سے اہم فرض ہے۔ (نصب الرأیہ فی تخریج احادیث الھدایہ کتاب الجنایات، باب مایوجب القصاص)

اسی بناء پر امام یوسف نے کتاب الخراج میں اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ عہد نبویؐ اور زمانۂ خلافت راشدہ میں ایک مسلمان اور ذمی کا درجہ تعزیرات اور دیوانی قانون کے لحاظ سے بالکل یکساں تھا۔ اور دونوں میں کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا تھا۔ (کتاب الخراج صفحہ ۱۰۸) ایک دفعہ خیبر کے یہودیوں کی شرارتوں سے تنگ آ کر بعض مسلمانوں نے اُن کے کچھ جانور لوٹ لئے اور اُن کے باغوں کے پھل توڑ لئے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا علم ہوا تو آپ سخت ناراض ہوئے اور فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ اجازت نہیں دی کہ تم رضامندی حاصل کئے بغیر اہل کتاب کے گھروں میں گھس جاؤ۔ اسی طرح تمہارے لئے یہ بھی جائز نہیں کہ تم اُن کی عورتوں کو مارو یا اُن کے باغوں کے پھل توڑو۔ (ابوداؤد کتاب الخراج باب فی تعشیر اھل الذمۃ اذا اختلفوا بالتجارۃ)۔

ایک دفعہ بعض صحابہؓ نے سفر کی حالت میں جبکہ انہیں بھوک کی تکلیف تھی کفار کی چند بکریاں پکڑ لیں۔ اور ذبح کر کے اُن کا گوشت پکانا شروع کر دیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ نے ہانڈیاں اُلٹ دیں اور فرمایا کہ لوٹ کی ہر چیز مردار سے بدتر ہے۔ (بخاری کتاب الجھاد باب مایکرہ من ذبح الابل والغنم فی المغانم) ایک دفعہ مشرکین کے چند بچے لشکر کی لپیٹ میں آ کر ہلاک ہو گئے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا بڑا صدمہ ہوا۔ اور آپ نے فرمایا۔ مشرکین کے بچے بھی تمہاری طرح کے انسان ہیں۔ اس لئے خبردار بچوں کو قتل مت کرو۔ خبردار بچوں کو قتل مت کرو۔ (مسند احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۳۰۲ حدیث الاسود بن سریعؓ)۔

ممکن ہے اس موقعہ پر کسی شخص کے دل میں سوال پیدا ہو کہ اگر اسلام غیر مذاہب کے متعلق ایسی ہی روادارانہ تعلیم کا حامل ہے تو پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مدنی زندگی میں کفار کے مقابلہ میں تلوار کیوں اٹھائی۔ سو اس کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ بیشک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کے مقابلہ میں تلوار اٹھانی پڑی مگر آپ کا یہ تلوار اٹھانا محض دفاعی طور پر تھا۔ جب عرب کے کفار نے تلوار کے زور سے اسلام کو مٹانا چاہا اور برابر تیرہ سال تک وہ ہر قسم کے مظالم سے کام لے کر مسلمانوں کو اُن کے دین اور مذہب سے منحرف کرنے کی کوشش کرتے رہے تو آخر

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اجازت دی کہ اب ان کفار کے مظالم کا جنہوں نے تلوار سے اسلام کو مٹانا چاہا ہے تلوار سے ہی جواب دیا جائے تا کہ دین اور مذہب کی اشاعت کے راستہ میں انہوں نے جو روکیں پیدا کر رکھی ہیں وہ دُور ہوں۔ پس یہ جنگیں محض دفاعی اور دشمن کے ظالمانہ حملوں کے جواب میں تھیں۔ چنانچہ اسلام نے صاف طور پر کہہ دیا کہ تم صرف اُن لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور اُس وقت تک لڑو جب تک وہ تم سے لڑتے ہیں (البقرۃ ع ۲۵) اور دفاع کے طور پر تلوار چلانا ہرگز ناپسندیدہ نہیں ہوسکتا۔ اگر اسلام تلوار سے پھیلا تھا تو تلوار چلانے والے اُس کے پاس کہاں سے آ گئے تھے۔ اور جس مذہب نے ایسے تلوار چلانے والے پیدا کر لئے تھے کہ جنہوں نے اپنا سب کچھ قربان کر کے سارے ملک کی مخالفت کے باوجود اس کو دنیا میں قائم کر دیا اُس مذہب کے لئے کیا یہ مشکل تھا کہ وہ دلائل کے زور سے دوسرے لوگوں سے بھی اپنی صداقت منوالیتا۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ وہ عیسائی مستشرق جو اسلام کو تلوار کا مذہب قرار دیتے ہیں خود اُن کی اپنی کتابوں میں کیا تعلیم دی گئی ہے اور اُن کے مسلمہ انبیاء اس اصل کے ماتحت کہاں تک راستباز اور صادق سمجھے جاسکتے ہیں۔ تورات جس کے متعلق مسیحؑ نے کہا تھا کہ اس کا ایک شوشہ تک نہیں بدل سکتا (متی باب ۵ آیت ۱۸) اُس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ تعلیم دی گئی تھی کہ اگر کسی شہر کے باشندے تجھ سے لڑائی کریں تو

''تُو اُس کا محاصرہ کر اور جب خداوند تیرا خدا اُسے تیرے قبضہ میں کر دے تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر۔ مگر عورتوں اور لڑکوں اور مواشی کو اور جو کچھ اُس شہر میں ہو اُس کا سارا لوٹ اپنے لئے لے اور تو اپنے دشمنوں کی اس لوٹ کو جو خداوند تیرے خدا نے تجھے دی ہے کھائیو۔ اسی طرح سے تُو اُن سب شہروں سے جو تجھ سے بہت دور ہیں اور ان قوموں کے شہروں میں سے نہیں ہیں یہی حال کیجئیو۔ لیکن ان قوموں کے شہروں میں جنہیں خداوند تیرا خدا تیری میراث کر دیتا ہے کسی چیز کو جو سانس لیتی ہے جیتا نہ چھوڑیو۔ بلکہ تُو اُن کو حرم کیجئیو۔ حِتّی اور اموری اور کنعانی اور فرزاری اور حوّی اور یبوسی کو جیسا کہ خداوند تیرے خدا نے حکم کیا ہے تا کہ وے اپنے سارے کریہہ کاموں کے مطابق جو انہوں نے اپنے معبودوں سے کئے تم کو عمل کرنا نہ سکھائیں اور کہ تم خداوند اپنے خدا کے گنہگار ہو جاؤ۔''

(استثنا باب ۲۰ آیت ۱۰ تا ۱۸)

مگر باوجود اس کے کہ موسیٰؑ نے یہ تعلیم دی اور باوجود اس کے کہ یشوع اور داؤد اور دوسرے انبیاء نے اس

تعلیم پر متواتر عمل کیا۔ یہودی اور عیسائی ان کو خدا کا نبی سمجھتے ہیں اور تورات کو خدا کی کتاب سمجھتے ہیں۔ موسوی سلسلہ کے آخر میں حضرت مسیحؑ ظاہر ہوئے۔ اُن کی یہ تعلیم تھی کہ ظالم کا مقابلہ نہ کرنا۔ بلکہ جو تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اُس کی طرف پھیر دے (متی باب ۵ آیت ۳۹) اس سے استنباط کرتے ہوئے عیسائی قوم یہ دعویٰ کیا کرتی ہے کہ مسیحؑ نے لڑائی سے قوموں کو منع کیا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انجیل میں اس تعلیم کے خلاف اور تعلیمیں بھی آئی ہیں۔ مثلاً انجیل میں لکھا ہے۔

''یہ مت سمجھو کہ میں زمین پر صلح کروانے آیا ہوں۔ صلح کروانے نہیں بلکہ تلوار چلانے آیا ہوں۔''

(متی باب ۱۰ آیت ۳۴)

اسی طرح لکھا ہے کہ اُس نے کہا:

''جس کے پاس تلوار نہیں اپنے کپڑے بیچ کر تلوار خریدے۔'' (لوقا باب ۲۲ آیت ۳۶)

یہ آخری دو تعلیمیں پہلی تعلیم کے بالکل متضاد ہیں اگر مسیح جنگ کروانے کے لئے آیا تھا تو پھر ایک گال پر تھپڑ کھا کر دوسرا گال پھیر دینے کے کیا معنے تھے؟ پس یا تو یہ دونوں قسم کی تعلیمیں متضاد ہیں یا ان دونوں تعلیموں میں سے کسی ایک کو اس کے ظاہر سے پھرا کر اُس کی کوئی تاویل کرنی پڑے گی۔ ہم اس بحث میں نہیں پڑتے کہ ایک گال پر تھپڑ کھا کر دوسرا گال پھیر دینے کی تعلیم قابلِ عمل ہے یا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ عیسائی دنیا نے اپنی ساری تاریخ میں جنگ سے دریغ نہیں کیا۔ جب عیسائیت شروع شروع میں روما میں غالب تھی تب بھی اُس نے غیر قوموں سے جنگیں کیں۔ دفاعی ہی نہیں بلکہ جارحانہ بھی۔ اور اب جبکہ عیسائیت دنیا میں غالب آ گئی ہے اب بھی وہ جنگیں کرتی ہے۔ دفاعی ہی نہیں بلکہ جارحانہ بھی۔ صرف فرق یہ ہے کہ جنگ کرنے والوں میں سے جو فریق جیت جاتا ہے۔ اس کے متعلق کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ کرسچن سویلزیشن کا پابند تھا۔ کرسچن سویلزیشن اس زمانہ میں صرف غالب اور فاتح کے طریق کار کا نام ہے ورنہ اس لفظ کے حقیقی معنے اب کوئی باقی نہیں رہے۔ جب دو قومیں آپس میں لڑتی ہیں تو ہر قوم اس بات کی مدعی ہوتی ہے کہ وہ کرسچن سویلزیشن کی تائید کر رہی ہے اور جب کوئی قوم جیت جاتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس جیتی ہوئی قوم کا طریقِ کار ہی کرسچن سویلزیشن ہے۔ حالانکہ کرسچن سویلزیشن کوئی چیز ہی نہیں ایک غلط لفظ ہے جس کے کوئی بھی معنے نہیں۔ مگر بہرحال مسیح کے زمانہ سے آج تک عیسائی دنیا جنگ کرتی چلی آ رہی ہے اور قرائن بتاتے ہیں کہ جنگ کرتی چلی جائے گی۔ پس جہاں تک مسیحی دنیا کے فیصلہ کا تعلق ہے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ''تم اپنے کپڑے بیچ کر تلوار خریدو'' اور یہ کہ ''میں صلح کرانے کے لئے نہیں بلکہ تلوار چلانے کے لئے آیا ہوں'' یہ اصل قانون ہے اور ''تو ایک

گال پر تھپڑ کھا کر دوسرا بھی پھیر دے۔'' یہ قانون یا تو ابتدائی عیسائی دنیا کی کمزوری کے وقت مصلحتاً اختیار کیا گیا تھا اور یا پھر عیسائی افراد کے باہمی تعلقات کی حد تک یہ قانون محدود ہے حکومتوں اور قوموں پر یہ قانون چسپاں نہیں ہوتا۔ چنانچہ بعض پادری اس کی یہی تاویل کرتے ہیں۔ دوسرے اگر یہ بھی سمجھ لیا جائے کہ مسیحؑ کی اصل تعلیم جنگ کی نہیں تھی بلکہ صلح ہی کی تھی تب بھی اس تعلیم سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ جو شخص اس تعلیم کے خلاف عمل کرتا ہے وہ خدا کا برگزیدہ نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ عیسائی دنیا آج تک موسیٰ اور یشوع اور داؤد کو خدا کا برگزیدہ قرار دیتی ہے۔ بلکہ خود عیسائیت کے زمانہ کے بعض قومی ہیرو جنہوں نے اپنی قوم کے لئے جان کو خطرہ میں ڈال کر دشمنوں سے جنگیں کی تھیں انہیں مختلف زمانہ کے پوپوں کے فتویٰ کے مطابق آج سینٹ کہا جاتا ہے۔

لیکن اسلام ان دونوں قسم کی تعلیموں کے درمیان درمیان تعلیم دیتا ہے۔ وہ نہ تو موسیٰؑ کی طرح یہ کہتا ہے کہ تُو جارحانہ طور پر کسی ملک میں گھس جا اور اس قوم کو تہ تیغ کر دے اور نہ وہ اس زمانہ کی بگڑی ہوئی مسیحیت کی طرح بآنگِ بلند تو یہ کہتا ہے کہ ''اگر کوئی تیرے ایک گال پر تھپڑ مارے تو تُو اپنا دوسرا گال بھی اُس کی طرف پھیر دے'' اور اپنے ساتھیوں کے کان میں یہ کہتا ہے کہ تم اپنے کپڑے بیچ کر بھی تلوار خرید لو۔ بلکہ اسلام وہ تعلیم پیش کرتا ہے جو فطرت کے عین مطابق ہے اور جو امن اور صلح کے قیام کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ یہ کہ تو کسی پر حملہ نہ کر۔ لیکن اگر کوئی شخص تجھ پر حملہ کرے اور اُس کا مقابلہ نہ کرنا فتنہ کے بڑھانے کا موجب نظر آئے اور راستی اور امن اُس سے مٹتا ہو۔ تب تُو اُس حملے کا جواب دے۔ اب بتاؤ کہ کیا یہ ظالمانہ تعلیم ہے یا یہی وہ تعلیم ہے جس پر عمل کر کے دنیا میں امن اور صلح قائم ہو سکتی ہے۔ اس تعلیم پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کیا۔ آپ مکہ میں برابر تکلیفیں اُٹھاتے رہے لیکن آپ نے لڑائی کی طرح نہ ڈالی۔ جب مدینہ میں آپؐ ہجرت کر کے تشریف لے گئے اور دشمن نے وہاں بھی آپ کا پیچھا کیا تب خدا تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ چونکہ دشمن جارحانہ کارروائی کر رہا ہے اور اسلام کو مٹانا چاہتا ہے۔ اس لئے راستی اور صداقت کے قیام کے لئے آپ اس کا مقابلہ کریں۔ مگر ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے وضاحتاً ہدایت دے دی کہ وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (البقرۃ:۱۹۱) یعنی اُن لوگوں سے جو تم سے جنگ کرتے ہیں محض اللہ تعالیٰ کی خاطر جس میں تمہارے اپنے نفس کا غصہ اور نفس کی ملونی شامل نہ ہو جنگ کرو۔ اور یاد رکھو کہ جنگ میں بھی کوئی ظالمانہ فعل نہ کرنا کیونکہ اللہ تعالیٰ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ پھر فرمایا قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَ اِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ۔ وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (الانفال:۳۹۔۴۰) یعنی اے محمد رسول اللہ اگر یہ لوگ

اب بھی لڑائی سے باز آجائیں تو جو کچھ وہ پہلے کر چکے ہیں انہیں معاف کر دیا جائے گا۔لیکن اگر وہ لڑائی سے باز نہ آئیں اور بار بار حملے کریں تو پہلے انبیاء کے دشمنوں کے انجام ان کے سامنے ہیں۔ان کا انجام بھی وہی ہوگا اور اے مسلمانو! تم اس وقت تک جنگ جاری رکھو جب تک کہ دنیا سے مذہب کی خاطر دُکھ دینا مٹ نہ جائے۔اور دین کو کلی طور پر خدا تعالیٰ کے سپرد نہ کر دیا جائے۔پھر اگر یہ لوگ ان باتوں سے باز آجائیں تو محض اس وجہ سے اُن سے جنگ نہ کرو کہ وہ ایک غلط دین کے پیرو ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اُن کے عمل کو جانتا ہے وہ خود جیسا چاہے گا ان سے معاملہ کرے گا۔ تمہیں اُن کے غلط دین کی وجہ سے اُن کے کاموں میں دخل دینے کی اجازت نہیں ہو سکتی۔پھر فرمایا يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰۤى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا١ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا١ٞ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ١ؕ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا١ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (النساء: ۹۵) یعنی اے مومنو! جب تم خدا کی خاطر لڑائی کرنے کے لئے باہر نکلو تو اس بات کی اچھی طرح تحقیقات کر لیا کرو کہ تمہارے دشمن پر حجت تمام ہو چکی ہے اور وہ بہر حال لڑائی پر آمادہ ہے۔اور اگر کوئی شخص تمہیں کہے کہ میں تو صلح کرتا ہوں تو یہ مت کہو کہ تُو دھوکا دیتا ہے۔اور ہمیں امید نہیں کہ ہم تجھ سے امن میں رہیں گے۔اگر تم ایسا کرو گے تو پھر تم خدا کی راہ میں لڑنے والے نہیں سمجھے جاؤ گے بلکہ تم دنیا طلب قرار پاؤ گے۔پس ایسا مت کرو کیونکہ جس طرح خدا کے پاس دین ہے اسی طرح خدا کے پاس دنیا کا بھی بہت سا سامان ہے۔تمہیں یاد رکھنا چاہیے کہ کسی شخص کا مار دینا اصل مقصود نہیں۔تمہیں کیا معلوم ہے کہ کل کو وہ ہدایت پا جائے۔تم بھی تو پہلے دین اسلام سے باہر تھے پھر اللہ تعالیٰ نے احسان کر کے تمہیں اس دین کے اختیار کرنے کی توفیق دی۔پس مارنے میں جلدی مت کرو بلکہ حقیقتِ حال کی تحقیق کیا کرو۔اور یاد رکھو جو کچھ تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے خوب واقف ہے۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ جب لڑائی شروع ہو جائے تب بھی اس بات کی اچھی طرح تحقیق کرنی چاہیے کہ دشمن کا ارادہ جارحانہ لڑائی کا ہے یا نہیں کیونکہ ممکن ہے کہ دشمن جارحانہ لڑائی کا ارادہ نہ کرتا ہو بلکہ وہ خود کسی خوف کے ماتحت فوجی تیاری کر رہا ہو۔پس پہلے اچھی طرح تحقیقات کر لیا کرو کہ دشمن کا ارادہ جارحانہ جنگ کا تھا تب اس کے سامنے مقابلہ کے لئے آؤ۔اور اگر وہ یہ کہے کہ میرا ارادہ تو جنگ کرنے کا نہیں تھا میں تو صرف خوف کی وجہ سے تیاری کر رہا تھا تو تمہیں یہ نہیں کہنا چاہیے کہ نہیں تمہاری جنگی تیاری بتاتی ہے کہ تم ہم پر حملہ کرنا چاہتے تھے۔ہم کس طرح سمجھیں کہ ہم تم سے مامون اور محفوظ ہیں بلکہ اس کی بات کو قبول کر لو اور یہ سمجھو کہ اگر پہلے اس کا ایسا ارادہ بھی تھا تو ممکن ہے بعد میں اُس میں تبدیلی پیدا ہو گئی ہو۔کیونکہ تم خود اس بات کے زندہ گواہ ہو کہ دلوں میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔

تم بھی پہلے اسلام کے دشمن تھے مگر اب تم اسلام کے سپاہی ہو۔

اس قسم کے واضح احکام کی موجودگی میں اسلام پر یہ الزام لگانا کہ وہ غیر مسلموں سے رواداراناسلوک کا حامی نہیں اور یہ کہ وہ تلوار کے زور سے دوسروں کو اپنے مذہب میں داخل کرنا جائز سمجھتا ہے دشمنانِ اسلام کی انتہائی جسارت اور اُن کی ناانصافی کا بدترین مظاہرہ ہے۔

وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ؕ وَ

اور تو اُس پر توکل کر جو زندہ ہے (اور سب کو زندہ رکھتا ہے) کبھی نہیں مرتا۔ اور اُس کی تعریف کے ساتھ ساتھ اُس کی تسبیح

كَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرَا ۚ ﴿۵۹﴾ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ

بھی کر اور وہ اپنے بندوں کے گناہوں سے خوب واقف ہے۔ وہ (خدا) جس نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ اُن کے

وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى

درمیان ہے ان سب کو چھ اوقات میں پیدا کیا ہے پھر وہ مضبوطی سے عرش پر قائم ہو گیا وہ رحمٰن ہے پس جب بھی

الْعَرْشِ ۚۛ اَلرَّحْمٰنُ فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِيْرًا ﴿۶۰﴾

(اے انسان) تو اس کے متعلق کوئی سوال کرے تو خبیر سے سوال کر جو بہت باخبر ہے (اور ٹھیک ٹھیک جواب دے سکتا ہے)۔

تفسیر ۔ فرماتا ہے۔ تمہیں چاہیے کہ تم صرف اُس خدا پر توکل کرو جو زندہ ہے اور جس پر کبھی موت وارد نہیں ہو سکتی۔ اور اُس کی تعریف کے ساتھ ساتھ اُسکی تسبیح کرو۔ اور اس امر کو اچھی طرح سمجھ لو کہ تمہارا خدا اپنے بندوں کی کمزوریوں کو خوب جانتا ہے۔

افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں توکل کے لفظ کا بڑا غلط استعمال ہو رہا ہے۔ توکل کے معنے ہوتے ہیں انسان اپنے معاملہ کو کلی طور پر خدا تعالیٰ کے سپرد کر دے اور خدا تعالیٰ کے سپرد کرنے کے یہ معنے ہیں کہ انسان خدا تعالیٰ کے بنائے ہوئے قواعد کے مطابق چلے جس کی طرف سَبِّحْ بِحَمْدِهٖ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اور لوگوں کو سمجھایا گیا ہے کہ توکل کے یہ معنے نہیں کہ انسان اُن ذرائع کو استعمال نہ کرے جو خدا تعالیٰ نے کسی کام کی کامیابی کے لئے مقرر کئے ہوئے ہیں کیونکہ اگر وہ ایسا کرے گا تو وہ قانونِ قدرت کو لغو قرار دینے والا ہوگا۔ اُس کی تعریف کرنے والا نہیں

ہوگا۔ اور اگر وہ اُن اسباب پر کلی انحصار کرے گا جو اس عالم میں پائے جاتے ہیں تب بھی وہ توکل کے خلاف چلے گا کیونکہ اُس کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ حمد کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرے اور اللہ تعالیٰ کو ہی ہر قسم کے نقائص اور کمزوریوں سے منزہ سمجھے۔ اپنے متعلق یہ کبھی تصور بھی نہ کرے کہ وہ کسی چیز پر کامل اقتدار رکھتا ہے اور جو چاہے کر سکتا ہے ہر قسم کی کمزوریوں سے پاک صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے اور ہر قسم کی تعریف اور تحمید کا بھی وہی مستحق ہے۔ پس انسان کا کام یہ ہے کہ وہ توکل کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قوانین سے بھی کام لے اور اُن کے مطابق چلے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے ہم کو ہاتھ دیئے ہیں پاؤں دیئے ہیں دماغ دیا ہے اور دنیوی سامان بھی عطا فرمائے ہیں ایسی صورت میں اپنے آپ کو خدا کے سپرد کرنے کے یہ معنے ہیں کہ جو کچھ خدا نے جس کام کے لئے پیدا کیا ہے اُس کو ہم استعمال کریں۔ پس توکل کا پہلا مقام یہ ہے کہ جو کچھ خدا تعالیٰ نے ہم کو دیا ہے اس کو ہم زیادہ سے زیادہ استعمال کریں اور پھر جو کمی رہ جائے وہ خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیں۔ اور یقین رکھیں کہ خدا اس کمی کو آپ پورا کرے گا۔ جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے مقام پر صحابہؓ کی ایک ترتیب قائم کی اُن کو اپنی اپنی جگہوں پر کھڑا کیا۔ انہیں نصیحتیں کیں کہ یوں لڑنا ہے اور اس کے بعد ایک عرشہ پر بیٹھ کر دُعائیں کرنے لگ گئے۔ یہ نہیں کیا کہ صحابہؓ کو مدینہ میں چھوڑ جاتے اور آپ اکیلے وہاں بیٹھ کر دُعائیں کرنے لگ جاتے بلکہ پہلے آپ صحابہؓ کو لے کر مقامِ جنگ پر پہنچے۔ پھر اُن کو ترتیب دی اور ان کو نصیحتیں فرمائیں اس کے بعد عرشہ پر بیٹھ گئے اور دُعائیں کرنی شروع کر دیں یہ توکل ہے جو اختیار کرنا چاہیے۔ ہر وہ شخص جو اُن سامانوں سے کام نہیں لیتا جو خدا تعالیٰ نے اس کو بخشے ہیں اور کہتا ہے کہ میں اپنا کام خدا پر چھوڑتا ہوں وہ جھوٹا ہے وہ خدا سے تمسخر کرتا ہے اور ہر وہ شخص جو سامانوں سے کام لیتا ہے اور کہتا ہے کہ اب فلاں کام میں ہی کروں گا وہ بھی جھوٹا ہے کیونکہ وہ اپنے کاموں میں خدا تعالیٰ کا دخل تسلیم نہیں کرتا۔ کام آسان ہوں یا مشکل آخر اُن کی کنجی خدا تعالیٰ کے اختیار میں ہی ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ایک بات میں نے بارہا سنی ہے۔ آپ ترکیہ کے سلطان عبدالحمید خان کا جو معزول ہو گئے تھے ذکر کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ سلطان عبدالحمید خان کی ایک بات مجھے بڑی ہی پسند ہے۔ جب یونان سے جنگ کا سوال اُٹھا تو وزراء نے بہت سے عذرات پیش کر دیئے۔ دراصل سلطان عبدالحمید کا منشاء تھا کہ جنگ ہو مگر وزراء کا منشاء نہیں تھا۔ اس لئے انہوں نے بہت سے عذرات پیش کئے۔ آخر انہوں نے کہا جنگ کے لئے یہ چیز بھی تیار ہے اور وہ چیز بھی تیار ہے لیکن کسی اہم چیز کا ذکر کر کے کہہ دیا کہ فلاں امر کا انتظام نہیں ہے۔ مثلاً یوں سمجھ لو کہ انہوں نے کہا (اور غالباً یہی کہا ہوگا) کہ تمام یورپین طاقتیں اس وقت اس بات پر متحد ہیں کہ

یونان کی امداد کریں اور اس کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں۔حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرمایا کرتے تھے کہ جب وزراء نے اپنا مشورہ پیش کیا اور مشکلات بتائیں اور کہا کہ فلاں چیز کا انتظام نہیں تو سلطان عبدالحمید نے جواب دیا کہ کوئی خانہ تو خدا کے لئے بھی چھوڑنا چاہیے۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سلطان عبدالحمید کے اس فقرہ سے بہت ہی لطف اٹھاتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ مجھے اس کی یہ بات بہت ہی پسند ہے۔تو مومن کے لئے اپنی کوششوں میں سے ایک خانہ خدا تعالیٰ کے لئے چھوڑنا ضروری ہوتا ہے۔درحقیقت سچی بات یہ ہے کہ مومن کبھی بھی ایسے مقام پر نہیں پہنچتا بلکہ دراصل کوئی شخص بھی ایسے مقام پر نہیں پہنچتا جب وہ کہہ سکے کہ اب کوئی رستہ کمزوری کا باقی نہیں رہا۔اور اگر کوئی انسان کہے کہ میں اپنا کام ایسا مکمل کرلوں کہ اس میں کوئی رخنہ اور سوراخ باقی نہ رہے تو یہ حماقت ہوگی۔مگر اُسی طرح یہ بھی حماقت ہے کہ انسان اسباب کو بالکل نظر انداز کردے۔اس وقت یورپین قومیں پہلی حماقت میں مبتلا ہیں اور مسلمان دوسری حماقت میں۔وہ ایک مکان بناتی ہیں اُس کو دروازے لگاتی ہیں۔اُس پر چھت ڈالتی ہیں اور اُسے پوری طرح مضبوط کرنے کے بعد کہہ دیتی ہیں کہ اب اسے آگ بھی نہیں لگ سکتی۔اسے زلزلہ بھی نہیں گرا سکتا۔اور مسلمان اپنے مکان کے لئے صرف آٹھ فٹ کی ایک دیوار کھڑی کرتا ہے نہ اس کی چاردیواری مکمل کرتا ہے نہ اُس پر چھت ڈالتا ہے۔نہ دروازے اور کھڑکیاں لگاتا ہے اور اُسے چھوڑ کر چلا آتا ہے اور جب پوچھو تو کہہ دیتا ہے کہ بس خدا کے توکل پر میں نے ایک دیوار کھڑی کردی ہے۔مگر یہ توکل نہیں یہ سستی اور غفلت کی علامت ہے کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ پہلے اپنے اونٹ کا گھٹنا باندھو اور پھر خدا تعالیٰ پر توکل کرو (جامع ترمذی کتاب صفة القیامة باب نمبر ۶۰ حدیث نمبر ۲۵۱۷)۔یعنی جہاں تک تم کام کرسکتے ہو کرو لیکن جب تمہارے ہاتھ شل ہوجائیں اور تمہارے تمام سامان ختم ہوجائیں۔اس وقت تم سجدے میں گر جاؤ اور اللہ تعالیٰ کی مدد مانگو اور اُس پر توکل کرو۔گویا جب تم ساری تدابیر اختیار کرلو اور تمہاری عقل کہتی ہو کہ اب کوئی چیز باقی نہیں رہی اور دنیا کے علوم کہتے ہوں کہ جتنے علاج ممکن تھے وہ سب ہوچکے۔جب فراست کہتی ہو کہ اب کوئی رخنہ باقی نہیں رہا اور جب تجربہ کہتا ہو کہ اب کوئی سقم نہیں رہا۔اُس وقت تم کہو کہ اس کام میں ضرور کوئی نہ کوئی رخنہ ہے جسے خدا پورا کرے گا۔گویا ایک توکل علمی ہوتا ہے اور ایک عملی۔عملی توکل وہ ہے جب تمہاری عقل اور دنیا کی عقل۔اور تمہارا تجربہ اور دنیا کا تجربہ متفقہ طور پر یہ فتویٰ دیتا ہو کہ اب کام مکمل ہوگیا۔اس وقت تم کہو کہ یہ ممکن نہیں ضرور اس میں کوئی رخنہ ہے جسے خدا تعالیٰ پورا کرے گا۔اور عملی توکل یہ ہے کہ جتنے ذرائع حصولِ مقصد کے خدا تعالیٰ نے مقرر کئے ہیں۔تم ان سب ذرائع کو اختیار کرو۔جتنی قربانی ممکن ہے وہ سب قربانی پیش کرو۔لیکن اگر اُس کام کی تکمیل کے لئے بعض

اور سامانوں کی بھی ضرورت ہو جن کا مہیا کرنا تمہاری استطاعت میں نہ ہو اور دنیا سمجھے کہ تم رہ گئے ہو۔اُس وقت تمہارا دل مطمئن ہو اور مایوسی تمہارے قریب بھی نہ پھٹکے۔تم اپنی قلیل پونجی خرچ کرتے جاؤ اور اپنے خون کا آخری قطرہ بہاتے جاؤ اور یقین رکھو کہ خدا تعالیٰ تم کو کبھی نہیں چھوڑے گا اور تم اُس کے فضل سے کامیاب ہو کر رہو گے۔ غرض ایک وہ توکل ہے جب تمہارا علم اور تجربہ یہ کہتا ہو کہ اب کوئی رخنہ باقی نہیں رہا اور تم یہ کہو کہ رخنہ ہے اور ضرور ہے۔ اور ایک وہ توکل ہے جب تم سمجھو کہ کامیابی کی کوئی صورت نہیں اور رخنے ہی رخنے نظر آرہے ہیں لیکن اس کے باوجود خدا تعالیٰ اس کام کو کر کے رہے گا۔خواہ چھت بھی نہ رہے اور دیواریں بھی گر پڑیں۔

غرض ایک توکل کمزوری کی حالت میں ہوتا ہے اور ایک توکل قوت کی حالت میں ہوتا ہے جو توکل قوت کی حالت میں ہوتا ہے اگر وہ صحیح ہو تو وہی اصل توکل ہے مگر دنیا میں عام طور پر جب لوگ کسی کام کو شروع کرتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے ہی یہ کام کرنا ہے اور ہم اس کو کر کے رہیں گے۔صرف سامان چاہیے اور جب سامانوں کے حصول کے لئے انہیں جدوجہد کرنی پڑتی ہے تو ہمتیں ہار کر بیٹھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم یہ کام خدا پر چھوڑتے ہیں۔ حالانکہ توکل ان دونوں حالتوں میں انسان کو الٹ راستے پر چلاتا ہے۔جب کام مکمل ہو جائے تو توکّل کہتا ہے یہ مکمل نہیں۔اور جب ہر قسم کی کوششوں اور تمام ذرائع کو استعمال کرنے کے بعد بھی کوئی کام مکمل نہ ہو۔تو توکل کہتا ہے تم سمجھو کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہ مکمل ہو جائے گا۔گویا توکل ہماری عقل کے بالکل خلاف فتویٰ دیتا ہے۔جب عقل کہتی ہے کہ سامان مکمل نہیں تباہی کے سامان بڑی سرعت سے ہو رہے ہیں تو توکّل کہتا ہے کہ تم خدا کی طرف دیکھو تمہارا خدا محی بھی ہے اور جب عقل کہتی ہے کہ اب تباہی کی کوئی صورت نہیں کامیابی کے سب سامان ہمیں حاصل ہیں تو توکّل کہتا ہے کہ تم ڈرو کیونکہ خدا صرف محی نہیں بلکہ مُمیت بھی ہے۔گویا عقل جب سب کام کر لیتی ہے تو توکّل کہتا ہے خدا تعالیٰ کی صفتِ مُمیت کو نہ بھولو۔اور جب ہمارے سب سامان رہ جاتے ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ اب موت اور تباہی آگئی اور مایوسی ہی مایوسی چاروں طرف دکھائی دیتی ہے تو توکّل کہتا ہے کیا خدا محی نہیں؟

پس توکّل کا مفہوم یہ ہے کہ جہاں تک خدا نے تم کو طاقتیں دی ہیں اُن کو پورا استعمال کرو اور اس کے بعد صوفی سے زیادہ خدا پر اعتبار کرو اور کہو کہ جو کمی رہ گئی ہے وہ خدا آپ پوری کرے گا۔اور پھر خواہ انتہائی مایوسی کا عالم ہو تم ڈٹ کر بیٹھ جاؤ اور کہو کہ ہمارا خدا ہمیں کبھی نہیں چھوڑے گا۔جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غارِ ثور میں حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا کہ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (التوبۃ:۴۰) ہمارا کام یہ تھا کہ دشمن سے بچ کر نکل آتے سو نکل آئے۔ اَب دشمن ہمارے سر پر آپہنچا ہے تو یہ خدا کا کام ہے کہ وہ ہمیں بچائے۔سو ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔خدا ہمارے

ساتھ ہے۔ یہ وہ توکّل ہے جس کی اسلام ہمیں تعلیم دیتا ہے یعنی پورے سامان استعمال کرو اور اُس کے بعد خدا تعالیٰ پر کامل یقین رکھو اور چاہے کچھ ہو جائے یہ سمجھ لو کہ خدا ہمیں نہیں چھوڑے گا مگر ہمارے ہاں بدقسمتی سے یہ طریق رائج ہے کہ جب ہمارے کسی کام کا صحیح نتیجہ نہیں نکلتا تو ہم اسے اپنی طرف منسوب نہیں کرتے بلکہ اسے خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں ہم نے تو محنت کی تھی لیکن اُس کا نتیجہ نکالنا خدا تعالیٰ کے اختیار میں تھا۔ اگر اُس نے نہیں نکالا تو اُس میں ہمارا کیا اختیار ہے۔ اس طرح ہم اپنی کمزوریوں کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ مسلمانوں نے خدا تعالیٰ کا نام اتنا غلط استعمال کیا ہے کہ انہوں نے دین کی کوئی چیز باقی نہیں چھوڑی کسی زمانہ میں جب مسلمان کہتے تھے کہ اس گھر میں خدا ہی خدا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اس گھر میں خدا تعالیٰ کی برکت پائی جاتی ہے۔ خدا تعالیٰ کی حکومت اس گھر میں ہے لیکن آج کل جب لوگ کہتے ہیں کہ اس گھر میں اللہ ہی اللہ ہے تو اس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ اس گھر میں کوئی چیز نہیں۔ گویا جن الفاظ کو خدا تعالیٰ کی حکومت اور اس کی طاقت اور قوت کے لئے استعمال کیا جاتا تھا انہیں اب نفی اور صفر کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہی معاملہ ہم نے توکّل سے کیا ہے۔ ہم ایک کام کرتے ہیں اور جب اس کے لئے غلط طریق اختیار کرتے ہیں۔ اُس کے لئے کمزور محنت کرتے ہیں یا اُس سے قطعی غفلت کا معاملہ کرتے ہیں اور لازماً اُس کا نتیجہ صفر نکلتا ہے تو اس کا الزام خدا تعالیٰ کو دے دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں اس کا موجب خدا ہے۔ ہم نے تو اپنا پورا زور لگا دیا تھا اور مقدور بھر محنت بھی کی تھی۔ لیکن خدا تعالیٰ نے ہمارا بیڑہ غرق کر دیا۔ گویا نعوذ باللہ ہر اچھا کام ہم سے سرزد ہوتا ہے اور بیڑہ غرق کرنا خدا تعالیٰ کے ذمے ہے۔ اور اگر وہ بیڑہ غرق کرنے والا نہیں بلکہ بیڑہ تیرانے والا ہے تو بیڑہ غرق ہم کرتے ہیں اور اپنی نادانیوں اور غفلتوں پر پردہ ڈالنے کے لئے اُسے خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اگر واقعہ میں ہم محنت کریں اور قربانی سے کام لیں اور خدا تعالیٰ پر توکّل بھی رکھیں تو ممکن نہیں کہ اس کا اعلیٰ نتیجہ پیدا نہ ہو۔ اور اگر ہمارے کسی کام کا اعلیٰ نتیجہ نہیں نکلتا تو ہمارا بیڑہ خدا تعالیٰ نے غرق نہیں کیا بلکہ ہم نے خود کیا ہے۔ اگر مسلمان اس نکتہ کو سمجھ لیں اور اُن کے اعمال کے جو اچھے نتائج نکلیں وہ انہیں اپنی طرف نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کریں اور ناکامی کو اپنی طرف منسوب کریں تو ان کی کایا پلٹ جائے۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں کہ وَ اِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ (الشعراء:۸۱) کہ جب میں بیمار ہو جاتا ہوں تو خدا تعالیٰ مجھے شفا دیتا ہے یعنی بیماری میری طرف سے آتی ہے اور شفا خدا تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے۔ اس میں یہی نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ ہر نیک بات خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کیا کرو۔ اور ہر بری بات اپنی طرف منسوب کیا کرو۔ جب تک تمہارے اندر

ابراہیمؑ والا ایمان پیدا نہیں ہوتا اور جب تک تمہارے اندر وَ اِذَا مَرِضۡتُ فَھُوَ یَشۡفِیۡنِ والا احساس پیدا نہیں ہوتا۔ جب تک تم یہ نہیں سمجھتے کہ جب بھی کوئی کمزوری آئے گی وہ ہماری طرف سے ہوگی۔ اور جب ہم میں قوت اور طاقت پیدا ہوگی تو وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوگی اُس وقت تک تم کامیاب نہیں ہو سکتے۔ لیکن جب تم اپنے اندر یہ تغیر پیدا کر لو گے تو تمہارے اندر کام کا ایک زبردست میلان پیدا ہو جائے گا اور تمہیں کامیابی ہی کامیابی حاصل ہوتی چلی جائے گی۔ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام صرف اِذَا مَرِضۡتُ کہہ دیتے تو پھر مایوسی ہی مایوسی ہوتی اور اگر فَھُوَ یَشۡفِیۡنِ کہہ دیتے تو اُمید ہی امید ہوتی اور یہ دونوں باتیں درست نہیں ہیں، جب تک کسی کا ایمان خوف اور رجاء کے درمیان نہ ہو۔ اُس کے کسی کام کا صحیح نتیجہ نہیں نکلتا۔ اسی لئے آپ نے فرمایا کہ خدا تعالیٰ نے مجھے اٹھنے کا موقع بھی دیا ہے اور گرنے کا موقع بھی دیا ہے۔ اگر میں پوری محنت نہیں کروں گا تو میں گروں گا اور اگر میں پوری محنت کروں گا اور اس کے ساتھ ہی خدا تعالیٰ پر توکّل کروں گا تو میں جیتوں گا۔ پس آپ نے یہ دونوں باتیں بیان کر کے واضح کر دیا کہ انسان کے لئے محنت اور توکّل دونوں چیزیں ضروری ہیں۔ اگر ہم محنت نہیں کریں گے تو ہمارے کام خراب ہوں گے۔ اور اگر ہم توکّل نہیں کریں گے تب بھی ہم کامیاب نہیں ہوں گے۔ گویا خدا تعالیٰ انسان کی محنت کی تکمیل کرتا ہے۔ اُس کا قائم مقام نہیں ہوتا۔ اگر وہ انسان کی محنت کا قائم مقام ہوتا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ بات کہ وَ اِذَا مَرِضۡتُ فَھُوَ یَشۡفِیۡنِ غلط ہوتی۔ مگر آپ نے اِذَا مَرِضۡتُ کہہ کر بتایا ہے کہ اگر میں بیمار ہونے والے افعال کروں تو خدا تعالیٰ مجھے بیمار ہونے سے نہیں روکتا۔ اور ھُوَ یَشۡفِیۡنِ کہہ کر بتایا کہ میں خود بخود کامل شفا حاصل نہیں کر سکتا۔ کامل شفا دینے والی خدا تعالیٰ کی ہی ذات ہے۔ اور یہی ترقی اور کامیابی کی کلید ہے۔ جب تک کوئی قوم اس گُر کو نہیں سمجھتی وہ کامیابی حاصل نہیں کر سکتی۔ یورپ اور امریکہ کیوں ترقی کر رہے ہیں وہ اسی لئے ترقی کر رہے ہیں کہ انہوں نے اس اصول کا ایک حصہ پورا کر دیا ہے۔ اور ہم ناکام اس لئے ہو رہے ہیں کہ ہم نے اس کے دونوں حصوں کو گرا دیا ہے۔ اگر کسی زمیندار کے پاس ایک بیل ہو تو وہ ہل چلا لیتا ہے۔ لیکن دونوں بیل ہی نہ ہوں تو ہل نہیں چلا سکتا۔ اسی طرح اگر کسی کے پاس ایک ہی گھوڑا ہو تو فٹن نہ سہی وہ ایکہ چلا سکتا ہے لیکن جس کے پاس ایک گھوڑا بھی نہ ہو تو وہ ایکہ بھی نہیں چلا سکتا۔ اسی طرح یورپ نے توکّل کرنا بیشک چھوڑ دیا ہے لیکن چونکہ اُس نے محنت والا حصہ پورا کر دیا ہے اس لئے وہ ترقی کر رہا ہے اور ہم نے دونوں حصوں کو ترک کر دیا ہے اس لئے ہم ناکام رہتے ہیں۔ پھر جب ہم کوئی کام کرتے ہیں اور اُس میں ناکام ہوتے ہیں تو اس ناکامی کو ہم اپنی طرف منسوب نہیں کرتے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے تو محنت کی تھی مگر خدا تعالیٰ نے کامیاب نہیں کیا۔ اور اگر کچھ مل جاتا ہے تو ہم اس کامیابی کو اپنی طرف منسوب کر لیتے

ہیں۔جیسے قرآن کریم میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ بعض بیوقوف انسان ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جب انہیں کوئی ترقی حاصل ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ ہمارے علم اور طاقت کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے۔اگر ہم علم اور سمجھ والے نہ ہوتے تو یہ ترقی کس طرح حاصل ہوتی (زمر ع ۵) اور جب کوئی ناکامی ہوتی ہے تو اُسے خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں (سورۂ فجر ع ۱) گویا وہ ہر عیب خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں اور ہر خوبی اپنی طرف منسوب کرتے ہیں لیکن اگر وہ اپنا رویّہ بدل لیں تو اُن میں کام کی رغبت اور محنت کی عادت اور چستی پیدا ہو جائے گی اور انہیں صحیح توکّل نصیب ہو جائے گا اور جسے صحیح توکّل نصیب ہو جاتا ہے اُس کی کامیابی میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یعنی تمہارا خدا وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ وقتوں میں پیدا کیا۔اور پھر وہ عرش پر قرار فرما ہوا۔

عرش جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کوئی مادی شئے نہیں ہے۔اور نہ ہی وہ کوئی روحانی شئے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ پھر وہ عرش پر قائم ہو گیا اور چونکہ اللہ تعالیٰ لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ (الشوری:۱۲) کا مصداق ہے یعنی اس کے سوا جو کچھ ہے وہ اس کی مانند نہیں بلکہ اور قسم کا ہے۔اس لئے اللہ تعالیٰ کا کسی مادی بلکہ رُوحانی شئے پر قائم ہونا بھی اُس کی شان کے خلاف ہے۔بلکہ قائم ہونے کا لفظ بھی اُس کی نسبت تمثیلی طور پر ہی استعمال کیا جا سکتا ہے۔نہ کہ عام معنوں کے لحاظ سے۔پس جبکہ مادی یا روحانی اشیاء پر اس کا قرار پانا ممکن نہیں تو عرش بھی کوئی مادی یا روحانی شئے نہیں ہو سکتا۔بلکہ اس سے مراد کوئی ایسی ہی شئے ہو سکتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات سے تعلق رکھتی ہو اور چونکہ ذاتِ باری سے تعلق رکھنے والی شئے صفاتِ الٰہیہ ہی ہیں۔اس لئے عرش سے مراد صفاتِ الٰہیہ کا کوئی خاص ظہور ہی ہو سکتا ہے نہ کہ کچھ اور۔اور جب قرآن کریم خدا تعالیٰ کی طرف کسی تجسم کی نسبت کو جائز ہی قرار نہیں دیتا تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ اس کی طرف یہ امر منسوب کرے کہ وہ ایک مجسّم عرش پر بیٹھا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات دو طرح ظاہر ہوتی ہیں۔ایک تنزیہی طور پر جس پر عرش کا لفظ دلالت کرتا ہے اور ایک تشبیہی طور پر جس پر خدا تعالیٰ کی ربوبیت۔رحمانیت۔رحیمیت اور مالکیت یوم الدین کا تفصیلی ظہور دلالت کرتا ہے۔تنزیہی صفات خدا تعالیٰ کی اصل صفات ہیں اور تشبیہی صفات اُن سے بطور تنزل جاری ہوتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ تشبیہی صفات سے ناواقف آدمیوں کو اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق کئی شبہات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔مثلاً رب کی صفت پر یہ شُبہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ محتاج ہے کہ بندوں کو اُس نے پیدا کیا ہے اور اُن کی ایسی تربیت کرتا ہے کہ وہ اس کی

عبادت کرسکیں۔ یہ اعتراض آج کل کے نوتعلیم یافتہ لوگوں کی طرف سے اور پرانے ہندو فلسفہ دانوں کی طرف سے بہت اٹھایا جاتا ہے۔اسی طرح صفت رب کے گرد گھومنے والی دوسری صفات پر بھی لوگوں کو شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان تشبیہی صفات سے جو جلوہ انسان کو نظر آتا ہے وہ خدا تعالیٰ کی اصل شان کو ظاہر کرنے والا نہیں ہوتا۔ بلکہ انسان کی قابلیت کے مطابق وہ صفات ڈھل جاتی ہیں۔جس طرح ایک کمزور آنکھ والا جو تیز روشنی کو نہیں دیکھ سکتا رنگ دار شیشے کی عینک لگا لیتا ہے اور اُس رنگ دار شیشے کے لگانے سے اُسے روشنی بہت ہلکی نظر آنے لگتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی صفاتِ تنزیہیہ کو تشبیہیہ کے رنگ دار شیشہ میں سے انسان کو دکھایا جاتا ہے تا کہ اُس کی آنکھیں اُس کو دیکھ سکیں۔اور صفات الٰہیہ کے جلوہ کی شدت اُس کی روحانی بینائی کو ضائع نہ کر دے۔مگر جس طرح عقلمند انسان روشنی کی قوت کا اندازہ اُس روشنی پر نہیں کرتا جو رنگ دار شیشہ میں سے نظر آتی ہے۔اسی طرح سمجھ دار انسان اللہ تعالیٰ کی صفات کے اس ظہور پر معترض نہیں ہوسکتا جو انسانی کمزوری کو مدّنظر رکھتے ہوئے تنزل اور تشبیہہ کی صورت اختیار کرتا ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایسے ظہور کی ضرورت کیا ہے کیونکہ ایسا ظہور یقیناً انسان کو اللہ تعالیٰ کے قریب کر دیتا ہے۔رنگ دار عینک گو روشنی کو کمزور کر کے دکھاتی ہے مگر بہر حال روشنی کے فوائد سے انسان کو متمتع کرتی ہے اور اُس کی ضرورت یا اس کے فائدہ کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔اگر اسے پھینک دیا جائے تو یقیناً یا تو آنکھیں جاتی رہیں گی اور یا آنکھوں کو بند رکھ کر انسان روشنی کے فوائد سے محروم ہو جائے گا۔غرض انسان کو اللہ تعالیٰ کے جلوہ سے آشنا کرنے کے لئے اور صفاتِ الٰہیہ سے اس کی قابلیت کے مطابق اُسے واقف کرانے کے لئے اُس کی آنکھ پر تشبیہہ کی عینک لگا دی جاتی ہے جس میں سے وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا عرفان بھی حاصل کرتا ہے اور اس کی روحانی آنکھ اس صدمہ سے بھی محفوظ ہو جاتی ہے جو اس جلوہ کی وجہ سے ہوتا ہے جو آنکھ کی بینائی کو پراگندہ تو کر دیتا ہے لیکن اسے کوئی علم نہیں بخشتا اور چونکہ تشبیہہ کی عینک سے انسان کو حقیقت کے متعلق بعض غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی تھیں اس لئے لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (الشوریٰ:۱۲) فرما کر اللہ تعالیٰ کی اصل شان کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اب وہ رحمٰن وغیرہ کے الفاظ سے جو تم کو دھوکا لگ سکتا ہے اُس سے بچنا چاہیے کیونکہ وہ خالی رب نہیں بلکہ وہ رَبُّ الْعَرْشِ ہے۔اُس کی ربوبیت وہ ہے جس کا ایک نقطہ مخلوق سے ملتا ہے اور دوسرا نقطہ عرش سے وابستہ ہے پس اُس کی ربوبیت کو انسانی ربوبیت پر قیاس نہیں کرنا چاہیے اور ماں باپ کی طرح احتیاج اور ضرورت کی بحثوں میں اُس کی ربوبیت کو نہیں الجھانا چاہیے۔ جو بات تم کو دیکھنی چاہیے وہ صرف یہ ہے کہ آیا واقعہ میں اس عالم کا کوئی رب ہے یا نہیں۔اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ہے تو پھر اُس کی کُنہہ معلوم کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ عرش سے آنے والی حقیقت کو فرش کا

انسان کس طرح معلوم کر سکتا ہے۔ جب ایک سچائی ثابت ہو جائے تو پھر اُس کا مان لینا ہی انسان کا کام ہے۔ اُس کا یہ حق نہیں کہ وہ اس امر کا مطالبہ کرے کہ مجھے یہ بھی سمجھایا جائے کہ ربوبیت اور رحمانیت اور رحیمیت اور مالکیت کہاں سے پیدا ہوئی اور کس طرح پیدا ہوئی؟ غرض عرش خدا تعالیٰ کی صفاتِ تنزیہہ کا نام ہے جو ازلی اور غیر متبدل ہیں اور جن میں کوئی مخلوق اس سے ایک ذرہ بھر بھی مشابہت نہیں رکھتی سوائے اس کے کہ صفاتِ تشبیہہ کے ذریعہ سے ان کا علم حاصل کیا جائے اگر صفاتِ تشبیہہ نہ ہوتیں تو اللہ تعالیٰ کے کامل الصفات ہونے کا کسی قسم کا ادراک بھی خواہ وہ کتنا ہی معمولی ہوتا ہمیں حاصل نہ ہو سکتا۔

عرش کی اس حقیقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ اس سے مراد صفاتِ تنزیہہ کا مجموعی نظام ہے جس کے لئے صفاتِ تشبیہہ بطور حامل کے ہوتی ہیں ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ کے یہ معنے ہوئے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق مکمل کر لی تو اس کی صفاتِ تنزیہہ کامل طور پر ظاہر ہونے لگ گئیں اور چونکہ صفات تنزیہیہ صفاتِ تشبیہیہ کے رنگ میں ظاہر ہوتی ہیں اس لئے ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ کا یہ مطلب ہوا کہ عرش یعنی صفاتِ تنزیہیہ کے مرکز کے تابع جس قدر صفاتِ تشبیہیہ ہیں وہ سب اپنے اپنے کام میں لگ گئیں۔ اس میں روحانی طور پر اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ اسلام کے ذریعہ چونکہ ایک نیا آسمان اور نئی زمین پیدا کر دی گئی ہے اس لئے اب خدا بھی عرش پر قرار فرما ہو گیا ہے یعنی وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید کسی ایک صفت کے ذریعہ نہیں کرے گا بلکہ اُس کی وہ تمام صفات جو صفات تنزیہیہ کے تابع ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید میں کام کرنے لگیں گی۔ کیونکہ اُس نے اپنے خدا پر سچا توکّل کیا ہے اور اُس کا پیش کردہ خدا زندہ ہے جس پر کسی زمانہ میں بھی موت وارد نہیں ہو سکتی۔ اس لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی ہر زمانہ میں تائید ہوتی چلی جائے گی اور ہر زمانہ میں اللہ تعالیٰ کی صفات اس کی سچائی کو ظاہر کرتی رہیں گی۔

پھر فرماتا ہے اَلرَّحْمٰنُ فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِيْرًا وہ رحمٰن خدا ہے جس نے اپنی صفتِ رحمانیت کے ماتحت تمہیں اپنی بے شمار نعمتوں سے نوازا اور تمہارے لئے اُس نے زمین و آسمان اور سورج اور چاند وغیرہ پیدا کر دئے اور اگر ان تمام نعمتوں کے باوجود اس کی صفتِ رحمٰن کے متعلق تمہارے دلوں میں پھر بھی کوئی سوال پیدا ہو تو اُس سے پوچھو جو خبیر ہے۔ یہ فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِيْرًا اپنی بناوٹ کے لحاظ سے ایسا ہی فقرہ ہے جیسے عربی زبان میں کہتے ہیں کہ لَقِيْتُ بِزَيْدٍ اَسَدًا میں زید کی شکل میں ایک شیر سے ملا یعنی زید اپنی شجاعت اور دلیری کے لحاظ سے ایک شیر تھا۔ یا کہتے ہیں لَقِيْتُ بِزَيْدِ الْبَحْرَ میں نے زید کی شکل میں ایک سمندر پایا۔ یعنی زید اپنے جود و کرم میں ایک سمندر تھا۔ اسی طرح

فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِيْرًا میں ہٖ کی ضمیر لفظ رحمٰن کی طرف جاتی ہے اور اس کے معنے یہ ہیں کہ تو رحمٰن سے سوال کر وہ رحمٰن جو بڑا خبیر ہے اور تمام حقائق کو جاننے والا ہے یعنی اگر تم اللہ تعالیٰ کے اس وسیع نظامِ کائنات کو دیکھ کر بھی جو ساری دنیا میں جاری ہے اور خدا تعالیٰ کے رحمٰن ہونے پر شاہد ہے یہ بات نہیں سمجھتے کہ جس طرح اُس نے مادی دنیا میں اپنی صفتِ رحمانیت کا اتنا بڑا کرشمہ دکھایا ہے اسی طرح اُس نے روحانی دنیا میں بھی اپنے بندوں کی اصلاح کے لئے کوئی انتظام جاری کیا ہوگا۔ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت تم پر منکشف نہیں ہوتی تو پھر تم اُسی خدا سے پوچھو جو خبیر ہے یعنی اس کے دروازہ کو کھٹکھٹاؤ اور اس کے حضور گڑ گڑاؤ اور دُعائیں کرو۔ وہ تمہارے حالِ زار پر رحم کرے گا اور تم پر اپنے فضل سے اصل حقیقت کا کسی نہ کسی رنگ میں انکشاف فرما دے گا لیکن بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس جگہ فَسْـَٔلْ بِهٖ میں ب عن کے معنوں میں استعمال ہوئی ہے جیسا کہ قرآن کریم کی آیت سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ (المعارج: ۲) میں ب عن کے معنوں میں استعمال کی گئی ہے اور فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِيْرًا کے وہ یہ معنے لیتے ہیں کہ فَسْـَٔلْ عَنْهُ خَبِيْرًا۔ یعنی اس کے بارہ میں خبیر سے دریافت کر۔ انہوں نے کہا ہے کہ چونکہ اس سے پہلے خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اور اِسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ کا ذکر آتا ہے اور زمین و آسمان کی پیدائش اور استواء علی العرش کی تفاصیل اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا اس لئے فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِيْرًا کے یہ معنے ہیں کہ ان امور کی تفاصیل کے بارہ میں اللہ تعالیٰ سے ہی دریافت کر و اس کے سوا اِن باتوں کو اَور کوئی نہیں جانتا۔ لیکن بعض نے کہا ہے کہ اس جگہ خبیر سے ایسا شخص مراد ہے جو اللہ تعالیٰ کے اسماء اور اُس کی صفات کا پورا پورا علم رکھنے والا ہو اور انہوں نے اس سے جبرائیل اور اہل کتاب اور علماء وغیرہ مراد لئے ہیں۔ میرے نزدیک اگر عن کے معنوں کو تسلیم کرتے ہوئے اس جگہ خبیر سے کوئی اور شخص مراد لیا جائے تو پھر خبیر سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں۔ جن کو خدا تعالیٰ نے اپنی صفاتِ کاملہ کا وحی کے ذریعہ سے علم دیا تھا۔ چونکہ کفارِ مکہ کلام الٰہی کے منکر تھے اور کلامِ الٰہی وہ نعمت ہے جو بغیر کسی عمل کے ملتی ہے اور صفتِ رحمٰن کے تابع ہے اس لئے وہ خدا تعالیٰ کو ان معنوں میں رحمٰن تسلیم نہیں کرتے تھے جن معنوں میں اسلام اسے رحمٰن قرار دیتا ہے اور چونکہ صفتِ رحمٰن اُن کے عقائد کے ردّ میں استعمال کی جاتی تھی اور انہیں بار بار کہا جاتا تھا کہ تمہیں خدا نے پتھروں کا مالک بنایا تھا۔ تمہیں خدا نے کائناتِ عالم کے ذرّہ ذرّہ پر حکمران بنایا تھا اور یہ تمام چیزیں وہ ہیں جو خدا تعالیٰ نے محض اپنی صفتِ رحمانیت کے ماتحت تمہارے لئے مہیا کیں مگر تم نے انہی پتھروں سے بنے ہوئے بتوں کے آگے اپنے سر جھکانے شروع کر دیئے اور خدا تعالیٰ کے رحمٰن ہونے کا انکار کر دیا اس لئے طبعی طور پر اُن کے دلوں میں یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ رحمٰن کیا چیز ہے۔ سو اللہ تعالیٰ نے انہیں نصیحت فرمائی کہ اگر تم خدا تعالیٰ کے ان عظیم الشان احسانات سے

آنکھیں بند کر رہے ہو جو صفتِ رحمانیت کے ماتحت اُس نے ساری دنیا پر کئے ہیں اور کلامِ الٰہی کی ضرورت بھی تسلیم نہیں کرتے جو صفتِ رحمانیت کے ماتحت نازل ہوا ہے تو اُس کا ایک علاج تو یہ ہے کہ تم خدا تعالیٰ کے حضور جھکو اور اُس سے دعائیں کرو کہ وہ تم پر اسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت روشن کر دے۔ اور توحید کی عظمت تم پر ظاہر کر دے۔ اور اگر تم خلوصِ دل سے اُس کی طرف رجوع کرو گے اور دعاؤں سے اُس کی رحمت کو جذب کرنے کی کوشش کرو گے تو خدا تعالیٰ کسی نہ کسی ذریعہ سے تمہارے دل کے تاریک گوشوں کو بھی اپنے نور سے منور کر دے گا اور تم پر اُس روحانی سورج کی حقیقت کو واضح کر دے گا جو اُس نے اس مادی دنیا کی تاریکیوں کو دُور کرنے کے لئے روشن کیا ہے۔ اور دوسرا علاج یہ ہے کہ تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ اور اُنہی سے اپنی عقدہ کشائی چاہو۔ اگر تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ گے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا وجود خدا تعالیٰ کی صفتِ رحمانیت کے ظہور کا ایک زندہ ثبوت ہے اور آپ کی پیدائش سے لے کر جوانی تک اور جوانی سے لے کر دعویٔ نبوت تک اور پھر دعویٰ نبوت سے لے کر آپ کے یوم وصال تک خدا تعالیٰ نے آپ پر اس قدر احسانات کئے ہیں کہ اُن کو دیکھ کر ایک شدید سے شدید مخالف کے لئے بھی خدا تعالیٰ کے رحمٰن ہونے کا اقرار کئے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا۔ قرآن کریم نے اپنے ان بیشمار انعامات کا ایک مقام پر چند نہایت ہی مختصر الفاظ میں اس طرح ذکر فرمایا ہے کہ اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰى۔ وَ وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۔ وَ وَجَدَكَ عَآىِٕلًا فَاَغْنٰى (الضحٰی: ۷۔۸) یعنی اے محمد رسول اللہ کیا خدا نے تجھے یتیم پا کر اپنے زیرسایہ جگہ نہیں دی اور کیا ایسا نہیں ہوا کہ جب اُس نے تجھے خدا تعالیٰ کی محبت اور اپنی قوم کی اصلاح کے غم میں سرگرداں پایا تو اُس نے تجھے صحیح راستہ بتا دیا۔ اور جب اُس نے تجھے کثیر العیال پایا تو اپنے فضل سے تجھے غنی کر دیا۔ ان آیات میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا نہایت ہی خوبصورتی کے ساتھ اجمالی رنگ میں نقشہ کھینچا گیا ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی رحم مادر میں ہی تھے کہ آپ کے والد محترم فوت ہو گئے اور آپ پیدائش سے پہلے ہی یتیم ہو گئے (السیرة الحلبیة باب وفاة والدہ صلی اللہ علیہ وسلم)۔ مگر اللہ تعالیٰ کی رحمانیت نے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور آپ کے پیدا ہوتے ہی آپ کے دادا حضرت عبد المطلب کے دل میں اُس نے آپ کی ایسی محبت پیدا کر دی کہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی آپ کا اپنی آنکھوں سے اوجھل ہونا برداشت نہیں کر سکتے تھے اور بڑے ناز اور محبت کے ساتھ آپ کی پرورش فرماتے رہے (السیرة الحلبیة باب وفاة امه صلی اللہ علیه وسلم و السیرة النبویة لابن هشام وفاة آمنة وحال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم مع جده)۔ اسی طرح جب آپ کے لئے دودھ پلانے والی دایہ کی تلاش ہوئی تو پھر اللہ تعالیٰ کی رحمانیت آ گے

بڑھی اور وہ حلیمہ کو آپ کے دروازہ پر کھینچ لائی ۔حلیمہ ایک غریب عورت تھی جسے مکہ کا کوئی خاندان اپنا بچہ سپرد کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔مگر اللہ تعالیٰ نے اُس کی غربت اور بے بسی کو دیکھ کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا لعل بے بہا اُس کی گود میں ڈال دیا۔اور پھر اس کے دل میں بھی آپ کی ایسی محبت پیدا کردی کہ اگر آپ ذرا بھی اِدھر اُدھر ہوجاتے تو وہ اپنے بچوں کو ڈانٹتی کہ تم اسے کیوں چھوڑ آئے ہو۔پھر عبدالمطلب فوت ہوئے تو خدا تعالیٰ کی رحمانیت نے ابوطالب جیسا چچا آپ کو دے دیا جس نے انتہائی تکلیف دہ گھڑیوں میں بھی آپ کا ساتھ دیا اور قوم کی دھمکیوں کے باوجود آپ کو نہ چھوڑا۔جوان ہوئے تو خدا تعالیٰ کی صفتِ رحمانیت نے حضرت خدیجہؓ کے دل میں آپ کی نیکیوں کو دیکھ کر آپ کی محبت پیدا کردی اور انہوں نے خود آپ کو شادی کا پیغام بھجوایا (السیرة النبویة لابن ھشام حدیث تزویج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدیجة ؓ)۔دوستوں کی ضرورت محسوس ہوئی تو خدا تعالیٰ کی صفتِ رحمانیت نے ابوبکرؓ جیسے وفا شعار دوست آپ کو مہیا کردیئے۔پھر جب قوم کی گری ہوئی حالت کو دیکھ کر آپ کا دل بیتاب ہوا اور حرا میں آپ نے اپنی سجدہ گاہ کو آنسوؤں سے تر کردیا تو خدائے رحمٰن کی نگاہِ انتخاب نے آپ کو چُنا اور اُس نے دنیا کی ڈوبتی ناؤ کو بچانے کے لئے آپ کو آسمانی کشتی بان مقرر کردیا۔اسی طرح جب آپ کو قومی امور کی سرانجام دہی کے لئے مال کی ضرورت محسوس ہوئی تو خدائے رحمٰن نے حضرت خدیجہؓ کے دل میں تحریک کی اور انہوں نے اپنی تمام جائیداد آپ کے سپرد فرمادی اور پھر روحانی اور جسمانی طور پر خدا تعالیٰ نے اپنی صفتِ رحمانیت کے ماتحت آپ کے دائرہ فیوض کو اتنا وسیع کیا کہ لاکھوں لوگوں نے آپ کے چشمۂ فیض سے اپنی روحانی پیاس بجھائی اور لاکھوں لوگ آپ کی غلامی کی برکت سے شتربانی سے جہاں بانی تک جا پہنچے۔اسی طرح قرآن کریم کا نزول جو ایک دائمی شریعت ہے خود اپنی ذات میں اللہ تعالیٰ کے رحمٰن ہونے کا ایک زبردست ثبوت ہے۔کیونکہ کلامِ الٰہی بندوں کی کسی نیکی کے بدلہ میں نازل نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمانیت کے نتیجہ میں بطور احسان نازل ہوتا ہے۔اسی لئے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ (الرحمٰن: ۲۔۳) یعنی قرآن سکھلانے والا خدا رحمانیت کی صفت رکھتا ہے۔اگر وہ رحمٰن نہ ہوتا تو قرآن جیسی نعمت ایک جسمانی بندے پر کبھی نازل نہ ہوتی۔

غرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی بھی اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمانیت کے ظہور کا ایک زندہ گواہ ہے اور آپؐ پر نازل ہونے والا کلام بھی خدا تعالیٰ کے رحمٰن ہونے پر شاہد ہے۔پس اگر خدائے رحمٰن کی رحمانیت کے بارہ میں کسی کے دل میں کوئی سوال پیدا ہو تو اُسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور آپ پر نازل ہونے والے کلام پر تدبّر کرنا چاہیے۔اگر وہ غور کرے گا تو جس طرح کائنات عالم کا ایک ایک ذرّہ خدا تعالیٰ کی صفتِ رحمانیت پر

شاہد ہے۔اسی طرح اُسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ہر ورق اور آپؐ پر نازل ہونے والے کلام کی ایک ایک آیت خدا تعالیٰ کی رحمانیت کا ایک زندہ گواہ نظر آئے گی۔ پھر امتِ محمدیہ کے وہ تمام صلحاء اور اولیاء اور ابدال اور اقطاب اور مجدّدینِ و مصلحین وغیرہ جنہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی میں اللہ تعالیٰ کی بیشمار برکات اور اُس کے تفضلات کا مشاہدہ کیا اور جو اپنے اپنے دائرہ میں ایک چھوٹے محمدؐ بن گئے۔اُن کا اپنا وجود بھی خدا تعالیٰ کے رحمٰن ہونے کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے کیونکہ انہوں نے جو کچھ پایا اپنے زور بازو سے نہیں پایا بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی میں اُس بحرِ ناپیدا کنار سے پایا جسے خدا نے اس پیاسی دنیا کی سیرابی کے لئے محض اپنے فضل سے جاری کیا ہے۔اسی حقیقت کو بانی سلسلہ احمدیہ نے اپنے اس شعر میں نہایت لطیف پیرایہ میں بیان فرمایا ہے کہ ؎

ایں چشمۂ رُواں کہ بخلق خدا دہم

یک قطرۂ زبحرِ کمالِ محمدؐ است

(مجموعہ اشتہارات جلد اول صفحہ ۱۹۷ اشتہار نمبر ۲۰)

یعنی یہ چشمۂ فیض جس سے میں لاکھوں بندگانِ خدا کو سیراب کر رہا ہوں یہ میرا چشمہ نہیں بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات کے سمندر کا ایک حقیر قطرہ ہے جسے میں پیاسی دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔پس وہ روحانی وجود جن کے ذریعہ دنیا میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں وہ بھی فَسْئَلْ بِهٖ خَبِیْرًا میں ہی شامل ہیں۔کیونکہ اُن کو دیکھ کر بھی خدا تعالیٰ کی رحمانیت کو بھولنے والے اُس کے رحمٰن ہونے کا اقرار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَ مَا الرَّحْمٰنُ ۗ

اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کے سامنے سجدہ میں گر جاؤ تو کہتے ہیں رحمٰن کیا چیز ہے؟ کیا ہم اس کے

اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَ زَادَهُمْ نُفُوْرًا ۩ ﴿۶۱﴾

آگے سجدہ کریں جس (کے آگے سجدہ کرنے) کا تو حکم دیتا ہے؟ اور یہ بات ان کو نفرت میں اور بھی بڑھا دیتی ہے۔

حل لغات۔ نُفُوْرًا نَفَرَ کا مصدر ہے اور نَفَرَتِ الدَّآبَّةُ کے معنے ہیں جَزِعَتْ وَتَبَاعَدَتْ گھبرا کر اور ڈر کر جانور دُور بھاگ گیا۔اور جب نَفَرَ الْقَوْمُ کہیں تو معنے ہوں گے لوگ بکھر گئے اور جب نَفَرَ الْقَوْمُ عَنْ كَذَا کا فقرہ استعمال کریں تو اُس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اَعْرَضُوْا وَصَدُّوْا۔لوگوں نے کسی بات سے

اعراض کیا۔اور وہ اُس کو قبول کرنے سے رُک گئے۔(اقرب)

تفسیر ۔اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے رحمٰن اُس کی ایک مشہور صفت ہے جس کا قرآن کریم میں بار بار ذکر آتا ہے اور رحمٰن اُس ہستی کو کہا جاتا ہے جو بلا مبادلہ اور ہماری کوشش اور سعی کے بغیر ہم پر احسان کرتی ہے۔جیسے اللہ تعالیٰ نے سورج چاند اور تمام نظام شمسی وقمری وغیرہ پیدا کئے ہیں جن کی پیدائش میں ہمارے کسی عمل کا دخل نہیں۔ اسی طرح شریعت کے ذریعے ہمیں جو ہدایت میسر آتی ہے یہ بھی صفتِ رحمانیت سے ہی تعلق رکھتی ہے۔ہمارے کسی عمل کے بدلہ میں ہمیں نہیں ملی بلکہ شریعت آتی ہی اُس وقت ہے جب دنیا بدعمل ہو جاتی ہے اور خدا تعالیٰ کو چھوڑ بیٹھتی ہے۔

رحمٰن کے ان معنوں کی صداقت کا ثبوت یہ ہے کہ

(۱) اہل عرب نے کبھی بھی سوائے اللہ کے رحمٰن کا لفظ بطور صفت بغیر قید کے کسی پر استعمال نہیں کیا۔ دوسروں کے لئے اوّل تو اس لفظ کا استعمال ہی نہیں کیا گیا اور اگر کیا گیا ہے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوے کے بعد جس سے صاف ظاہر ہے کہ ضد سے ایسا کیا گیا ہے۔مگر اُس وقت بھی مطلقاً اس لفظ کا استعمال نہیں کیا گیا۔ بلکہ اضافت کے ذریعہ سے اُسے مقید کر دیا گیا ہے۔جیسا کہ مسیلمہ کذاب کے ماننے والے اُسے رحمٰنِ یمامہ کہتے تھے۔مگر ان لوگوں کو بھی یہ جرأت نہیں ہوئی کہ خالی رحمٰن کا لفظ بغیر اضافت کے اس کے لئے استعمال کریں۔یا رحمٰن کا لفظ اس کے لئے استعمال کریں جس کے معنے ہیں سب مخلوق کا رحمٰن۔کیونکہ وہ جانتے تھے کہ عربی زبان اس کی کسی صورت میں بھی اجازت نہیں دے سکتی۔(لسان العرب)

عربی زبان کی یہ خصوصیت بتاتی ہے کہ اس لفظ میں ایک ایسی رحمت کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف سے ظاہر نہیں ہو سکتی اور وہ قسم بلا مبادلہ رحم کرنا ہی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے سوا باقی مخلوق کا رحم یا ماضی کا احسان اتارنے کے لئے ہوتا ہے یا حاضر یا مستقبل کی امیدوں پر مبنی ہوتا ہے۔اور اگر احسان کرنے والے کی نیت بدلہ کی نہ بھی ہو تب بھی بدلہ اُسے ضرور مل جاتا ہے۔چنانچہ انسان جس قدر رحم کرتے ہیں وہ دو صورتوں سے خالی نہیں ہوتا۔یا تو اُس میں رضاء الٰہی مدّنظر ہوتی ہے اور اس میں بھی بدلہ کی صورت موجود ہوتی ہے اور یا پھر تمدن کے قیام کا خیال غالب ہوتا ہے اور وہ بھی بدلہ کے خیال پر مشتمل ہے۔اور اگر یہ خیال نہ بھی ہو تب بھی انسان اپنی نیکی کا بدلہ کسی نہ کسی شکل میں حاصل کر لیتا ہے۔لیکن اللہ تعالیٰ کا احسان خالص احسان ہوتا ہے۔

(۲) عربی زبان کے ماہروں کے کلام میں بھی ان معنوں کی طرف اشارات ملتے ہیں۔ چنانچہ بوعلی فارسی جو امام نحو کہلاتے ہیں اور عربی زبان کے بہت بڑے ماہر گذرے ہیں وہ کہتے ہیں۔ اَلرَّحْمٰنُ اِسْمٌ عَامٌّ فِیْ جَمِیْعِ اَنْوَاعِ الرَّحْمَۃِ یَخْتَصُّ بِہٖ اللّٰہ تَعَالٰی وَالرَّحِیْمُ اِنَّمَا ھُوَ فِیْ جِھَۃِ الْمُؤْمِنِیْنَ کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی وَکَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا (فتح البیان جلد اوّل تفسیر سورۃ الفاتحۃ، بسم اللہ الرحمن الرحیم) یعنی رحمٰن عام ہے اور سب قسم کی رحمتیں اُس میں شامل ہیں۔ لیکن رحیم کی صفت کا ظہور مومنوں کے بارے میں ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ مومنوں کے بارہ میں رحیم ہے۔

(۳) احادیث سے بھی ان معنوں کو صداقت کا ثبوت ملتا ہے۔ چنانچہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپؐ فرماتے تھے۔ اَنَا الرَّحْمٰنُ خَلَقْتُ الرَّحِمَ وَشَقَقْتُ لَھَا اِسْمًا مِنْ اِسْمِیْ فَمَنْ وَصَلَھَا وَصَلْتُہٗ وَمَنْ قَطَعَھَا بَتَتُّہٗ (ترمذی ابواب البر و الصلۃ باب ماجاء فی قطیعۃ الرحم) یعنی خدا تعالیٰ فرماتا ہے میں رحمٰن ہوں میں نے رحم پیدا کیا ہے اور اپنے نام سے اس کا نام نکالا ہے پس جو رحم کے تعلقات کو جوڑے وہ مجھ سے تعلقات کو جوڑتا ہے اور جو اُسے قطع کرے وہ میرے تعلق کو قطع کرتا ہے۔ اس حدیث سے بھی رحمٰن کے معنوں کی وضاحت ہوتی ہے کیونکہ رحمی تعلقات سب سے زیادہ رحمانیت سے مشابہت رکھتے ہیں۔ جیسے ماں کی اپنے بچہ سے محبت بالکل طبعی ہوتی ہے اور گو وہ بعض رنگ میں بچہ سے فائدہ بھی اُٹھاتی ہے مگر اس کے بچہ سے سلوک میں کسی بدلہ کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ پس ماں اور بچہ کے تعلقات کا رحمانیت سے نکلا ہوا ہونا بتاتا ہے کہ رحمانیت بلا مبادلہ سلوک کا نام ہے۔

(۴) پھر قواعدِ زبان سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ رحمٰن فعلان کے وزن پر ہے اور عربی زبان میں جو لفظ اس وزن پر آتے ہیں وہ پھیلاؤ۔ وسعت اور غلبہ پر دلالت کرتے ہیں۔ اور رَحِیْمٌ فَعِیْلٌ کے وزن پر ہے۔ اور فعیل کا لفظ بار بار وقوع پر دلالت کرتا ہے۔ پس رحمٰن کے معنے ہیں۔ نہایت ہی وسیع رحمت والا جس کی رحمت میں لاتعداد افراد شامل ہیں اور جس کی رحمت سے دنیا کی کوئی چیز باہر نہیں۔ اُس کی رحمت صرف عمل کرنے والے کے ساتھ ہی تعلق نہیں رکھتی۔ بلکہ اس کا تعلق سب مخلوقات سے ہے۔ مومن، کافر، جاندار، غیر جاندار سب اس کی رحمانیت سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ رحمانیت کی صفت کی اہمیت اُس سے ظاہر ہے کہ انسان جب بھی کسی نئے مقام پر پہنچتا ہے اُسے بعض نئی چیزوں کی ضرورت پیش آتی ہے بلکہ انسان کے سوا دوسری تمام چیزوں کی ترقی بھی تدریجی ہے اور ہر مرحلہ پر بعض نئے سامانوں کی احتیاج ہوتی ہے۔ پہاڑوں کے سلسلہ کو ہی دیکھ لو کہ وہ یکدم اونچے نہیں ہوتے

بلکہ آہستہ آہستہ بلند ہوتے جاتے ہیں۔ پہلے زمین پر صرف نشیب وفراز نظر آتا ہے پھر معمولی پتھر آتے ہیں اس کے بعد چھوٹے چھوٹے ٹیلے۔ پھر چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ان کے بعد ان سے اونچی پہاڑیاں اور پھر پہاڑ آجاتے ہیں۔ یہی حال سبزیوں اور ترکاریوں کا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اُن کی ترقی میں بھی کئی مدارج نظر آئیں گے۔ پہلے بیج بویا جاتا ہے پھر وہ پھوٹتا ہے اور روئیدگی ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ جڑ پکڑتا ہے اور بڑھتا ہے۔ حتّٰی کہ کونپل نکل آتی ہے۔ گویا اس کے بڑھنے کے بھی مختلف مدارج ہیں۔ غرض تمام چیزوں کے مختلف مدارج ہوتے ہیں اور ہر درجے پر اس چیز کو نئے سامانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

انسان کی بھی یہی حالت ہے کہ وہ ترقی کے ایک درجہ کو حاصل کر لیتا ہے تو اُسے اُس سے اگلے مقام کے لئے نئے سامانوں کی حاجت ہوتی ہے۔ بچہ پیدا ہوتا ہے تو اُسے نرم غذا کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ اُسے ماں کی چھاتیوں سے ملتی ہے۔ جب ذرا طاقت پکڑ جاتا ہے اور ٹھوس غذا کا محتاج ہوتا ہے تو اس کے دانت نکل آتے ہیں۔ پھر اور بڑا ہوتا ہے اور نسل کے پیدا کرنے کے قابل ہوتا ہے تو اُس کے لئے خدا تعالیٰ نے جوڑا مہیا کیا ہوا ہوتا ہے۔ اسی طرح آنکھ کھلتی ہے تو سورج موجود ہوتا ہے تاکہ اس کی روشنی میں وہ تمام چیزوں کو دیکھ سکے۔ پھر آنکھ کے لئے ضروری تھا کہ خوبصورت اشیاء ہوں تاکہ اُس میں طراوت پیدا ہو۔ اس کے لئے اُس نے حسین مناظر۔ خوبصورت انسان۔ رنگ رنگ کے پھول مختلف قسم کی سبزیاں، عجیب وغریب درخت ہزاروں قسم کی جڑی بوٹیاں اور سینکڑوں چرند اور پرند پیدا کر دئے۔ پھر اُس نے کان دیئے تو ساتھ ہی آوازیں بھی پیدا کر دیں۔ مگر ان آوازوں میں بھی بے شمار فرق رکھ دیئے۔ اگر سب کی آواز ایک جیسی ہوتی تو امتیاز کرنا مشکل ہوتا۔ مگر گھوڑے اور گدھے کی آواز سن کر انسان فوراً امتیاز کر لیتا ہے کہ گھوڑا ہنہنا رہا ہے یا گدھا رینگتا ہے۔ پھر ہر انسان کی آواز میں کچھ نہ کچھ فرق رکھ دیا جس سے ہر شخص دوسرے کی آواز سے ہی اُسے پہچان لیتا ہے۔ اسی طرح اُس نے چھونے کی طاقت دی تو ساتھ ہی چھونے کے لئے چیزیں بھی پیدا کر دیں۔ پھر ان چیزوں میں سے بھی کسی کو نرم بنایا اور کسی کو سخت۔ کوئی پھسلنی بنائی اور کوئی کھردری۔ پھر نرمی اور سختی میں ہزاروں قسم کے فرق رکھ دیئے۔ ہم ریشم پر ہاتھ رکھتے ہیں تو اُس میں اور قسم کی ملائمت ہوتی ہے۔ ربڑ پر ہاتھ رکھتے ہیں تو اُس میں اور قسم کی ملائمت ہوتی ہے اور ہماری چھونے کی طاقت دونوں میں فوراً ایک امتیاز قائم کر لیتی ہے۔ غرض جس چیز پر بھی نگاہ ڈالی جائے اُس کی صرف ایک کڑی معلوم نہیں ہوتی بلکہ کڑیوں کا ایک لمبا سلسلہ نظر آتا ہے۔ اور ہر کڑی کے مکمل ہونے پر ایک نئی ضرورت پیش آتی ہے جس کے لئے پہلے سے سامان تیار ہوتا ہے۔ اور اَلرَّحْمٰن کے معنوں میں یہی مفہوم شامل ہے کہ وہ ہر چیز کی ترقی کے سلسلہ میں ہر کڑی پر جن سامانوں

کی ضرورت ہوتی ہے پہلے سے مہیا کر دیتا ہے۔ ہر نئی منزل پر جو ضرورتیں ہوتی ہیں خواہ وہ مادیات کی قسم کی ہوں یا روحانیات کی قسم کی۔ خواہ علمی ہوں سب کے لئے ضرورت کے مطابق پہلے سے سامان تیار کر دیتا ہے۔

سائنس کے ذریعہ اب یہ ایک نئی بات معلوم ہوئی ہے کہ دماغ ایک کوٹھڑی کی طرح ہے جس میں تمام باتیں جو انسان اپنے حواس سے معلوم کرتا ہے جمع رہتی ہیں۔ یہ کوٹھڑیاں یعنی سیلز اگر کسی وقت ختم ہو جائیں تو دماغ میں اَور زیادتی ہو جاتی ہے۔ یہ نئی تحقیق نہایت لطیف مثال رحمانیت کی مہیا کرتی ہے۔ کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترقی کی ہر منزل پر آئندہ ترقی کے لئے سامان اللہ تعالیٰ پیدا کر دیتا ہے اور ممکن نہیں کہ صحیح ضرورت ہو اور سامان موجود نہ ہو۔

بعض لوگوں نے غلطی سے یہ سمجھا ہے کہ رَحْمٰن کا لفظ معرب ہے یعنی کسی دوسری زبان سے عربی میں منتقل کیا گیا ہے اور مبرد جیسے ادیب نے بھی اس غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ چنانچہ ابن الانباری نے زاھر میں مبّرد کا یہ قول نقل کیا ہے کہ رحمٰن عبرانی لفظ ہے عربی نہیں (ابن کثیر سورۃ الفاتحۃ)۔ مگر یہ قول بالبداہت غلط ہے کیونکہ رحمٰن عبرانی کا لفظ نہیں بلکہ عربی میں قبل از بعثتِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم عرب کے شعراء کے کلام میں بھی اس لفظ کا استعمال پایا جاتا تھا۔ چنانچہ سلامت بن جندب الطھوری کا شعر ہے۔

عَجِلْتُمْ عَلَيْنَا اِذْ عَجِلْنَا عَلَيْكُمْ وَمَا يَشَاِ الرَّحْمٰنُ يَعْقِدْ وَيُطْلِقِ

یعنی جب ہم نے تمہاری طرف جلدی کی تو تم نے ہماری طرف جلدی کی اور جو کچھ رحمٰن چاہے وہ ہو کر ہی رہتا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

اصل بات یہ ہے کہ لفظ رحمٰن کی نسبت یہ شبہ کہ یہ لفظ عربی نہیں قرآن کریم کی ہی اس آیت کو نہ سمجھنے سے پیدا ہوا ہے کہ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَ مَا الرَّحْمٰنُ ۤ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَ زَادَهُمْ نُفُوْرًا ۔ یعنی جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو وہ کہتے ہیں کہ یہ رحمٰن کون ہے؟ کیا تم جسے حکم دو ہم اُسے سجدہ کرنے لگ جائیں گے؟ اور یہ بات انہیں نفرت میں اور بھی بڑھا دیتی ہے۔

اس آیت سے بعض لوگوں نے دھوکا کھایا ہے کہ شاید لفظ رحمٰن عربی نہیں۔ اس لئے عرب کے لوگ رحمٰن کا لفظ نہ سمجھ سکے۔ اس غلط فہمی کو بخاری کی اس روایت سے مزید تقویت ہوئی کہ جب صلح حدیبیہ کے موقعہ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ لکھنے کا حکم دیا تو کفار کے نمائندوں نے کہا کہ لَا نَعْرِفُ الرَّحْمٰنَ وَلَا الرَّحِيْمَ ۔ یعنی ہم نہ رحمٰن کو پہچانتے ہیں اور نہ رحیم کو۔ پس یہ نہ لکھو لیکن اس حدیث کے الفاظ ہی بتاتے ہیں کہ کفار کو رحمٰن کا لفظ جاننے سے انکار نہ تھا۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ ہم رحیم کو بھی نہیں جانتے۔ حالانکہ

رَحِیۡم کا لفظ تو سب کے نزدیک عربی ہے۔ پس رحیم کے انکار سے صاف ظاہر ہے کہ اُن کو ان لفظوں کے عربی ہونے سے انکار نہیں تھا بلکہ اس امر پر اعتراض تھا کہ معاہدہ کو بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ سے کیوں شروع کیا گیا ہے۔ عرب لوگ صرف بِسۡمِ اللّٰہِ کہتے تھے اور رَحۡمٰنِ رَحِیۡم کی زیادتی کو اسلامی بدعت سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے انہوں نے ان دونوں لفظوں کے اضافہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو روکنا چاہا کہ اس طرح ہم پر اسلام کو ہماری غفلت میں مسلّط کر رہے ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ سورۂ فرقان کی اس آیت میں جو اِن لوگوں نے رحمٰن کے نہ جاننے کا ذکر کیا ہے تو اس کا کیا مطلب ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ امر قرآن کریم سے ثابت ہے کہ عرب لوگ اس لفظ سے واقف تھے۔ چنانچہ سورۂ زخرف میں کفار کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ لَوۡ شَآءَ الرَّحۡمٰنُ مَا عَبَدۡنٰهُمۡ (الزخرف:۲۱) اگر رحمٰن چاہتا تو ہم بت پرستی نہ کرتے اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ کفار یہ لفظ استعمال کیا کرتے تھے۔ اور اس سے واقف تھے۔ پس اس کی موجودگی میں سورۂ فرقان کی اس آیت کا صرف یہ مطلب ہے کہ گو کفار رحمٰن لفظ سے آگاہ تھے مگر بوجہ آسمانی علم سے عدم واقفیت کے وہ اس کے باریک معنوں سے ناواقف تھے جو اسلام نے پیش کئے ہیں۔ یعنی بلا مبادلہ رحم کرنے والا اور چونکہ یہ معنے اُن کے عقائد کے خلاف تھے اس لئے وہ چڑ کر کہہ دیتے تھے کہ ہم نہیں جانتے کہ رحمٰن کیا ہوتا ہے۔ اور اس سے اُن کی یہ مراد نہیں ہوتی تھی کہ ہم اس لفظ کو نہیں جانتے بلکہ یہ مراد ہوتی تھی کہ ہم ان معنوں کے مطابق کسی کو رحمٰن ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ غرض کفار کا اعتراض لفظ رحمٰن پر نہیں تھا بلکہ اُس اصطلاح پر تھا جو قرآن کریم نے رحمٰن کے ذریعہ پیش کی تھی۔ جو عربوں میں رائج نہ تھی۔ جیسے صلوٰۃ عربی زبان کا لفظ ہے مگر اصطلاحی صلوٰۃ قرآن کریم نے ہی پیش کی ہے۔ اس کے متعلق بھی کفار کہہ سکتے تھے کہ ہم نہیں جانتے کہ صلوٰۃ کیا ہوتی ہے۔ پس ان لوگوں کا اعتراض درحقیقت اصطلاح پر تھا اور انہوں نے یہ کہا کہ اس کا جو مطلب قرآن پیش کرتا ہے اُس کو ہم نہیں مانتے۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے قرآن کریم میں آتا ہے کہ وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِهٖ (ابراھیم:۵) یعنی ہم نے ہر رسول کو اس کی قوم کی زبان میں ہی وحی دے کر بھیجا ہے۔ مگر سورۂ ہود میں آتا ہے۔ یٰشُعَیۡبُ مَا نَفۡقَهُ کَثِیۡرًا مِّمَّا تَقُوۡلُ (ھود:۹۲) یعنی کفار نے کہا کہ اے شعیبؑ ہماری سمجھ میں تیری اکثر باتیں نہیں آتیں۔ اب اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضرت شعیبؑ کسی ایسی زبان میں باتیں کرتے تھے جسے وہ لوگ نہیں جانتے تھے بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو دینی باتیں وہ بیان کرتے تھے انہیں وہ لوگ نہیں سمجھتے تھے۔ اسی طرح رحمٰن کا لفظ تو وہ بولا کرتے تھے مگر قرآن کریم نے رحمٰن اس ہستی کو قرار دیا ہے جو بغیر محنت کے انعام دیتی ہے اور یہ بات وہ لوگ نہیں

مانتے تھے کیونکہ اس کے ماننے سے اُن کا شرک باطل ہو جاتا تھا۔

اب بھی عیسائی رحمٰن کا لفظ استعمال نہیں کرتے کیونکہ اس کے جو معنے قرآن کریم نے پیش کئے ہیں اُن سے عیسائیت کا کفارہ ردّ ہو جاتا ہے۔ اور ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کی کمزوریوں کو بخش دیتا ہے اور یہ کفارہ کے خلاف ہے۔ لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ عیسائی رحمٰن کا لفظ نہیں جانتے بلکہ یہ ہیں کہ وہ اس اصطلاح کے قائل نہیں جو قرآن نے پیش کی ہے۔ چنانچہ وہ اپنی کتابوں سے پہلے کبھی بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ نہیں لکھتے بلکہ بِسۡمِ اللّٰہِ الرحیم یا بسم اللہ الھادی الجواد وغیرہ الفاظ لکھتے ہیں۔

تَبٰرَكَ الَّذِیۡ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوۡجًا وَّ جَعَلَ فِیۡهَا

برکت والی ہے وہ ہستی جس نے آسمان میں ستاروں کے ٹھہرنے کے مقام بنائے ہیں اور اُس میں چمکتا ہوا

سِرٰجًا وَّ قَمَرًا مُّنِیۡرًا ﴿۶۲﴾ وَ هُوَ الَّذِیۡ جَعَلَ الَّیۡلَ وَ النَّهَارَ

چراغ بنایا ہے اور نُور دینے والا چاند بنایا ہے۔ وہی ہے جس نے رات کو اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے

خِلۡفَةً لِّمَنۡ اَرَادَ اَنۡ یَّذَّكَّرَ اَوۡ اَرَادَ شُكُوۡرًا ﴿۶۳﴾

آنے والا بنایا ہے اُس شخص کے (فائدہ کے) لئے جو نصیحت حاصل کرنا چاہے یا شکر گزار بندہ بننا چاہے۔

حلّ لُغَات۔ بُرُوۡجٌ اَلْبُرُوْجُ اَلْبُرْجُ کی جمع ہے اور اَلْبُرْجُ کے معنے ہیں اَلرُّکْنُ وَالْحِصْنُ قلعہ، نیز محل کو بُرج کہتے ہیں (اقرب) اسی طرح آسمان میں ستاروں کی منازل مختصہ کو بھی بروج کہتے ہیں۔ (مفردات) صاحب بحرِ محیط مشہور لُغوی ابوصالح کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ بُرج کے معنے بڑے ستارہ کے بھی ہوتے ہیں (تفسیر بحر محیط زیر آیت تبارک الذی۔۔۔)۔ اس لحاظ سے اس آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ اُس نے آسمان میں بڑے بڑے ستارے بنائے ہیں۔

اَلسِّرَاجُ اَلسِّرَاجُ دِیئے کو کہتے ہیں جو رات کو جلایا جاتا ہے۔ نیز سورج کو سراج کہتے ہیں کیونکہ وہ دن کو روشن کرتا ہے۔ (اقرب)

خِلۡفَةٌ خِلْفَةٌ۔ اَلْخِلْفَةُ یُقَالُ فِیْ اَنْ یُّخْلِفَ کُلٌّ وَّاحِدٍ الْاٰخَرَ۔ یعنی خِلْفَةٌ کے معنے ایک دوسرے کے

پیچھے آنے کے ہیں (مفردات) نیز عرب کہتے ہیں۔ لَہٗ وَلَدَانِ خِلْفَانِ اور اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اَحَدُھُمَا طَوِیْلٌ وَالْاٰخَرُ قَصِیْرٌ اَوْ اَحَدُھُمَا اَبْیَضُ وَ الْاٰخَرُ اَسْوَدُ۔ یعنی اس کے دو بچے ہیں جن میں سے ایک لمبے قد کا اور دوسرا چھوٹے قد کا ہے یا یہ کہ ایک سفید ہے اور دوسرا سیاہ۔ پس خِلْفَۃً کے معنے ہوں گے (۱) ایک دوسرے کے بعد آنے والے (۲) بڑا چھوٹا یا سفید و سیاہ۔

تفسیر۔ فرماتا ہے تم کہتے ہو رحمٰن کیا چیز ہے رحمٰن تو وہ ہے جس نے آسمانوں میں ستاروں کے ٹھہرنے کے مقام بنائے ہیں اور اُس میں چمکتا ہوا سورج اور روشن چاند بنایا ہے۔ اور وہی ہے جس نے رات اور دن کو ان لوگوں کے فائدہ کے لئے جو نصیحت حاصل کرنا چاہیں یا اللہ تعالیٰ کے شکر گذار بندے بننا چاہیں آگے پیچھے آنے والا بنایا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار کو اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جس خدا نے انسانی جسم کی پرورش کے لئے سورج اور چاند اور ستارے اور ہوا اور پانی اور آگ اور خاک اور ہزاروں قسم کی غذائیں تیار کی ہیں یہ کس طرح ممکن ہے کہ اُس نے انسان کی ہدایت کے لئے کوئی آسمانی ہدایت نامہ نہ اتارا ہو۔ کیونکہ یہ تو معمولی عقل کے آدمی کا بھی کام نہیں کہ ادنیٰ ضرورت کو پورا کرے اور اعلیٰ ضرورتوں کو نظر انداز کر دے۔ پھر اللہ تعالیٰ کب ایسا فعل کر سکتا ہے۔ جب اس کی رحمانیت نے انسانی آنکھ کے لئے روشنی اور کان کے لئے آواز اور ناک کے لئے خوشبو اور زبان کے لئے مختلف ذائقے پیدا کئے ہیں تو یقیناً اُس نے عقل کے لئے بھی ایک ہدایت نامہ ارسال کیا ہوگا تا کہ انسانی عقل حیرت اور شبہ میں ہی عمر نہ گذار دے بلکہ یقین اور اطمینان کے مقام پر کھڑی ہو کر زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کر سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح دنیوی زندگی کے لئے سورج اور چاند کی ضرورت ہے اسی طرح روحانی زندگی کے لئے ایک روحانی سورج اور چاند کی ضرورت ہے۔ اگر وہ نہ ہوں تو انسان پر روحانی موت آ جائے اور وہ باوجود کھانے اور پینے کے بھوکا اور پیاسا ہو اور باوجود بصارت کے اندھا ہو اور باوجود قوتِ شنوائی کے بہرہ ہو اور باوجود زندہ ہونے کے اس پر ایک موت طاری ہو۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ (الانفال: ۲۵) یعنی اے مومنو! خدا اور رسول کی آواز کو سنو اور قبول کرو۔ جبکہ وہ تم کو زندہ کرنے کے لئے بُلائے۔ گویا باوجود اس کے کہ صحابہؓ کرام زندہ تھے اور کھاتے پیتے اور چلتے پھرتے تھے پھر بھی خدا نے اُن کو حکم دیا کہ جب تم کو زندہ کرنے کے لئے بلایا جائے تو تم سرتابی نہ کرو۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ موت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک جسمانی اور ایک روحانی۔ جسمانی موت تو وہ ہے جس میں

انسان کی روح جسم خاکی سے جدا ہو جاتی ہے۔اور روحانی موت وہ ہے جب کہ انسان خدا تعالیٰ سے تعلق توڑ بیٹھتا ہے۔پس جس طرح اس جسمانی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے کنویں کھودے جاتے ہیں اور نہریں نکالی جاتی ہیں اور مختلف قسم کے اناج بوئے جاتے ہیں اور باغ لگائے جاتے ہیں۔ویسے ہی روحانی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ روحانی پانی اور روحانی غذا سے اس کو قائم رکھا جائے۔اور جیسا کہ ایک کسان اپنی کھیتی کو پکانے کے لئے اس کو پانی دیتا ہے اور سورج اور چاند کی روشنی سے اُس کو فائدہ پہنچتا ہے ویسے ہی انسانوں کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ کلامِ الٰہی کے پانی سے اپنے دل کی کھیتی کو سیراب کریں اور خدا تعالیٰ کے جلوے اور اس کے نبیوں کی روشنی کے پرتو سے اُس کو پکائیں تا کہ اُن کی روحانی زندگی قائم رہ سکے۔غرض انسان کو ظاہری سورج اور چاند کی مثال دے کر اُس باطنی انتظام کی طرف متوجہ کیا گیا ہے جس سے اُس کی روحانی زندگی قائم رہتی ہے۔اسی طرح رات اور دن کے آگے پیچھے آنے کی مثال سے بھی یہی سکھایا گیا ہے کہ جیسے ظاہری سورج ایک وقت چڑھتا ہے اور دن کی روشنی تمام دنیا میں پھیلا دیتا اور تاریکی کو نور سے بدل دیتا ہے اور تمام پوشیدہ چیزوں کو ظاہر کر دیتا ہے اور اس کے چڑھنے کے بعد بُری اور بھلی اور پاک اور ناپاک چیزوں میں فرق کرنا آسان ہو جاتا ہے اور انسان اطمینانِ قلب کے ساتھ اپنے دنیاوی کاموں میں مشغول ہو جاتا ہے اور اپنی آئندہ زندگی کے لئے سامان مہیا کرنے کی فکر میں لگ جاتا ہے اور حتی الوسع اُس کو بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔اسی طرح جب روحانی آفتاب اپنا جلوہ دکھاتا ہے اور قلوب کی سر زمین پر روشنی پھیلا دیتا ہے اور بدیوں کی ظلمت کو نیکیوں کے نور سے بدل دیتا ہے اور وہ گناہ جو انسان میں چھپے ہوئے ہوتے ہیں اُن کو ظاہر کر دیتا ہے اور طرح طرح کی بُرائیاں اور خُبث اور گند اور بیماریاں جو انسان کے روحانی وجود کے ساتھ پیوستہ ہوتی ہیں اُن سے اُس کو پاک کرتا ہے اور شفا دیتا ہے تو اُس وقت اُس میں بُرے بھلے کے پرکھنے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اپنے خلوص دل اور صحتِ نیّت کے ساتھ اپنی روحانی زندگی کی بہتری کے لئے کوشاں ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ سے سچا تعلق پیدا کر لیتا ہے۔پس وہ کام جو کہ مادی سورج اس زمین پر طلوع ہو کر کرتا ہے اُس سے بڑھ کر روحانی سورج سے ظہور میں آتا ہے کیونکہ یہ تو صرف اس چندروزہ زندگی کے لئے سامان مہیا کرتا ہے اور وہ دائمی زندگی کے لئے توشہ جمع کر دیتا ہے اور انسان کو خدا سے ملا دیتا ہے۔اسی طرح جب رات پڑتی ہے تو تمام دنیا میں اندھیرا چھا جاتا ہے اور اُس وقت انسان اپنے سب دنیوی کاروبار کو چھوڑ کر آرام کرنے کے لئے لیٹ جاتا ہے اور ایسی غفلت کی نیند اُس پر طاری ہو جاتی ہے کہ اس کو دنیا و مافیہا کی کچھ بھی خبر نہیں رہتی۔اسی طرح جب روحانی زندگی پر رات کا تاریک زمانہ آتا ہے تو اکثر انسان دین کو چھوڑ کر دُنیا کی غفلت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔اور وہ لوگ جو

کچھ کام کرنا چاہتے ہیں وہ مامور من اللہ سے استفادہ کرنے والے لوگوں سے جو کہ چاند اور ستاروں کی مانند ہوتے ہیں فائدہ اُٹھاتے اور اس روشنی کے منتظر رہتے ہیں جو کہ رات کے بعد پیدا ہونے والی ہوتی ہے اور يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا کے مطابق دعاؤں اور گریہ وزاری سے اللہ تعالیٰ کی رحیمیت کو جذب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پس ان آیات میں انسان کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ وہ اس ظاہری نظام کو دیکھ کر اُس روحانی نظام کی طرف توجہ کرے جس سے دائمی زندگی وابستہ ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا۔ یعنی یہ باتیں اس لئے بیان کی گئی ہیں تا کہ انسان اُن سے نصیحت حاصل کرے اور خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرے کہ اُس نے صرف جسمانی طور پر ہی اُس کی دست گیری نہیں کی بلکہ روحانی طور پر بھی اُس کے لئے امن و آسائش کے سامان مہیا کئے ہیں۔

لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بتایا ہے کہ دنیا میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ ہوتے ہیں جن کی نیکی کا پہلو اتنا کمزور ہوتا ہے کہ وہ شیطانی راہوں پر چلتے چلے جاتے ہیں اور اس بات کے مستحق ہوتے ہیں کہ انہیں انتباہ کیا جائے اور برے افعال سے بچنے کی نصیحت کی جائے اور دوسرے وہ لوگ ہوتے ہیں جو گو اس روشنی اور نُور سے محروم ہوتے ہیں جو مذہب کی اتباع میں انسان کو حاصل ہوتا ہے۔ مگر اُن کے اندر جذبۂ شکر گذاری پایا جاتا ہے وہ خدا تعالیٰ کی نعماء اور اُس کی عطا کردہ قوتوں کا غلط استعمال نہیں کرتے بلکہ اُن سے خود بھی فائدہ اٹھاتے اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ گویا ایک تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو نیکی اور اخلاق سے حصہ نہیں رکھتے اور ایک وہ لوگ ہوتے ہیں جو نیکی اور اخلاق سے حصہ رکھتے ہیں اور چونکہ لیل و نہار کے آنے جانے میں اللہ تعالیٰ نے اس طرف اشارہ فرمایا تھا کہ کبھی خدا کے نبی اور رسول دنیا کی اصلاح کے لئے آتے ہیں اور کبھی تاریکی اور ظلمت کا دَور دَورہ ہوتا ہے۔ اس لئے لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا۔ میں بتایا کہ روحانی رات اور دن کے یکے بعد دیگرے آنے جانے میں کیا حکمت ہے۔ ہم کیوں رات کے بعد دن لاتے ہیں اور کیوں روحانی تاریکی کے بعد آفتابِ ہدایت روشن کرتے ہیں۔ فرماتا ہے ہماری غرض اس سے یہ ہوتی ہے کہ دنیا میں جو لوگ گنہگار ہوں۔ اُن کو اس سلسلہ رسالت کے ذریعہ نیک بنا دیا جائے۔ اور جو لوگ فطری نیکی کے مقام پر کھڑے ہوں انہیں خدا کا کلام اور الہام اس سے بھی اعلیٰ مقام یعنی مقامِ شکر کی طرف لے جائے۔ گویا لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا۔ میں دو قسم کے مدارج رکھنے والے لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک تو اُن کا جو نصیحت کی بات سن کر اپنے نقائص دور کر لیتے ہیں اور دوسرے ان کا جو صرف اسی پر اکتفاء نہیں کرتے بلکہ ترقی کرتے کرتے اللہ تعالیٰ کے احسانات اور

اُس کے انعامات کو دیکھ کر ہر وقت اُس کے ثناء خواں اور اُس کے انعامات کے شکر گذار رہتے ہیں۔

لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ دُنیا میں ہر شخص کی اصلاح ہوسکتی ہے۔ پس عیسائیوں کا یہ نظریہ کہ انسان فطرتی طور پر گنہگار رہے غلط ہے۔ اگر پیدائشی لحاظ سے ہر انسان ناپاک ہوتا تو بدوں کو نیکی کی طرف اور نیکوں کو اعلیٰ درجہ کے روحانی مقام کی طرف نہ لایا جاسکتا۔

اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نظامِ عالم کا قیام تو ایک ایسی چیز ہے جس سے کفار بھی فائدہ اٹھا رہے ہیں پھر لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ۔ میں صرف دو گروہوں کی تخصیص کیوں کی گئی ہے۔ سو اس کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بعض احادیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو فرمایا لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ یعنی اگر تُو نے نہ آنا ہوتا تو میں زمین و آسمان بھی پیدا نہ کرتا۔ اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دنیا کی تمام چیزیں جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں یہ کفار کے لئے نہیں بلکہ اصل مقصود وہ مومن ہیں جو خدا تعالیٰ کے احکام پر عمل کرتے ہیں۔ کفار صرف ضمنی طور پر ان اشیاء سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے ہم کسی دوست کی دعوت کریں تو نوکر کو بھی اس دعوت سے حصہ مل جاتا ہے۔ اسی طرح یہ نظامِ ارضی اور سماوی سب مومنوں کے لئے بنایا گیا ہے مگر چونکہ بنی نوع انسان میں سے ہی کچھ کافر بن جاتے ہیں اس لئے توابع کے طور پر وہ بھی فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ ورنہ ان کی حیثیت ایسی ہی ہوتی ہے جیسے قرآن کریم میں آتا ہے کہ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا (الفرقان:۴۵) وہ لوگ چوپائیوں کی طرح ہیں بلکہ چوپائیوں سے بھی بدتر ہیں۔ پس وہ اگر فائدہ اٹھاتے ہیں تو اُس کی مثال ایسی ہی ہوتی ہے جیسے آقا گھوڑے پر کہیں جاتا ہے تو اُس کا گھوڑا بھی چارہ کھا لیتا ہے۔ ورنہ زمین و آسمان کی اصل پیدائش اسی کے لئے ہے جو اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ۔ کا مصداق ہے۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا

اور رحمٰن کے سچے بندے وہ ہوتے ہیں جو زمین پر آرام سے چلتے ہیں (یعنی تکبر کے ساتھ نہیں چلتے) اور جب

خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿۶۴﴾ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ

جاہل لوگ اُن سے مخاطب ہوتے ہیں (یعنی جہالت کی باتیں کرتے ہیں) تو وہ (لڑتے نہیں بلکہ) کہتے ہیں کہ ہم تو

لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا ﴿۶۵﴾ وَ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ

تمہارے لئے سلامتی کی دعا کرتے ہیں اور وہ لوگ بھی جو اپنے رب کے لئے راتیں سجدوں میں کھڑے ہو کر

عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ﴿۶۶﴾ إِنَّهَا

گذار دیتے ہیں۔ اور وہ (یعنی رحمٰن کے بندے) کہتے ہیں۔ اے ہمارے رب ہم سے جہنم کا عذاب ٹلا دے

سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا ﴿۶۷﴾

اُس کا عذاب ایک بہت بڑی تباہی ہے۔ وہ (دوزخ) عارضی ٹھکانہ کے طور پر بھی بری ہے اور مستقل ٹھکانہ کے طور پر بھی (بری ہے)۔

حلّ لُغَات۔ هَوْنًا هَوْنًا هَانَ کا مصدر ہے اور هَانَ عَلَيْهِ الْاَمْرُ کے معنے ہیں لَانَ وَ سَهُلَ کسی کے لئے کوئی امر آسان ہو گیا اور اَلْهَوْنُ کے معنے ہیں اَلسَّكِيْنَةُ وَالْوَقَارُ۔ سکینت اور وقار۔ (اقرب)

يَبِيْتُوْنَ يَبِيْتُوْنَ يَبِيْتُ سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور بَاتَ (يَبِيْتُ) کے معنے ہیں أَدْرَكَهُ اللَّيْلُ نَامَ اَوْلَمْ يَنَمْ۔ اُس پر رات آ گئی اور اُس نے وہ وقت گذارا خواہ سوتے ہوئے خواہ جاگتے ہوئے۔ وَقَالَ الْفَرَّاءُ سَهِرَ اللَّيْلَ كُلَّهُ فِيْ طَاعَةٍ أَوْ مَعْصِيَةٍ۔ فرّاء جو عربی لغت کے ماہر گذرے ہیں وہ کہتے ہیں کہ بَاتَ کے معنے ہیں اُس نے ساری رات خدا تعالیٰ کی اطاعت یا معصیت میں جاگ کر گذاری وَمِنْهُ هٰذِهِ الْاٰيَةُ اور قرآن مجید کی آیت يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ میں یہی معنے مراد ہیں کہ مومن خدا تعالیٰ کی عبادت میں رات جاگ کر گذارتے ہیں (اقرب)

غَرَامًا غرامًا۔ اَلْغَرَامُ۔ اَلشَّرُّ الدَّائِمُ یعنی غرام کے معنے دائمی تکلیف اور مصیبت کے ہیں۔ نیز اس کے معنے ہیں اَلْهَلَاكُ۔ ہلاکت۔ اَلْعَذَابُ۔ دُکھ تکلیف۔ (اقرب)

تفسیر۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے عِبَادُ الرَّحْمٰنِ کی تعریف بیان فرمائی ہے اور بتایا ہے کہ ان میں کیا کیا صفات پائی جاتی ہیں۔ یوں تو بہت لوگ ہیں جو بڑے شوق سے اپنے لڑکوں کا نام عبدالرحمٰن رکھتے ہیں اور بہت ہیں کہ جب اُن سے پوچھا جائے کہ کون ہو تو بڑے فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بندے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ صرف نام کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں یا حقیقت اور اصلیت کے لحاظ سے بھی اُس کے بندے ہیں۔ آخر اللہ تعالیٰ کا بندہ ہونے کے لحاظ سے تو تمام کافر اور منافق بھی خدا تعالیٰ کے بندے ہی ہیں۔ مگر پھر اُنہی

بندوں کو خدا تعالیٰ نے اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (الاعراف:۱۸۰) قرار دے کر چوپائیوں سے بھی بدتر قرار دیا ہے۔ انہی بندوں میں سے بعض کے متعلق فرماتا ہے کہ وہ بندر اور سؤر بن گئے (المائدۃ ع ۹) پھر انہی بندوں میں سے بعض کے متعلق فرماتا ہے کہ وہ شَرُّ الْبَرِيَّةِ یعنی تمام مخلوق سے بدتر ہیں (البیّنۃ ع ۱) اس سے معلوم ہوا کہ صرف نام کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کا بندہ کہلانا کسی انسان کے لئے باعث فخر نہیں ہوسکتا۔ اگر صرف بندہ کہلانے سے کوئی انسان اللہ تعالیٰ کا مقرب بن سکتا تو خدا تعالیٰ نفسِ مطمئنہ رکھنے والے کو کیوں فرماتا کہ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (الفجر: ۳۰، ۳۱) یعنی آ اور میرے بندوں میں داخل ہوجا۔ آ اور میری جنت میں داخل ہوجا۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عباد میں داخل ہونا ایک بہت بلند مقام ہے جو نفسِ مطمئنہ رکھنے والوں کو حاصل ہوتا ہے۔ ورنہ جہاں تک اُن کی پیدائش کا سوال ہے وہ پہلے بھی اللہ تعالیٰ ہی کے بندے تھے اور خدا تعالیٰ ہی اُن کا رازق اور مالک تھا۔ پھر فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ جو فرمایا تو معلوم ہوا کہ خدا کا بندہ ہونا دو رنگ میں ہوتا ہے۔ ایک لحاظ سے تو تمام انسان خدا تعالیٰ ہی کے بندے ہیں لیکن ایک لحاظ سے بعض اُس کے بندے ہوتے ہیں اور بعض نہیں ہوتے۔ جو لوگ اس کے احکام کی اطاعت کرتے ہیں وہ تو اُس کے بندے کہلاتے ہیں اور جو نہیں کرتے وہ خدا کے بندے نہیں کہلاتے بلکہ شیطان کے یا اپنے نفس کے بندے ہوتے ہیں۔ ان آیات میں خدا تعالیٰ نے کچھ صفات بیان فرمائی ہیں اور بتایا ہے کہ خدا تعالیٰ کے پاک نفس بندے کن صفات کے حامل ہوتے ہیں۔ مگر اس جگہ بجائے عِبَادُ اللّٰہِ کہنے کے اللہ تعالیٰ نے عِبَادُ الرَّحْمٰنِ کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں کیونکہ کفار کی طرف سے بار بار یہ سوال ہوتا تھا کہ رحمٰن کون ہے؟ سو اللہ تعالیٰ نے پہلے تو انہیں اپنی صفتِ رحمانیت کے ثبوت میں زمین و آسمان اور سورج اور چاند اور ستاروں وغیرہ کی طرف توجہ دلائی اور پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا وجود اُن کے سامنے پیش کیا جو صفتِ رحمانیت کے ایک کامل مظہر تھے۔ اب اللہ تعالیٰ انہیں بتاتا ہے کہ اگر یہ شواہد بھی تمہاری آنکھیں کھولنے کے لئے کافی نہیں اور تمہیں خدا تعالیٰ کی رحمانیت کا جلوہ نظر نہیں آتا تو تم خدا تعالیٰ کے اُن بندوں کو دیکھ لو جو اس کی رحمانیت کے چلتے پھرتے مجسّمہ ہیں۔ یعنی جس طرح سورج زمین کو اپنی شعاعوں سے منور کرتا اور ہر قسم کی تاریکیوں کو دُور کرتا ہے اسی طرح وہ لوگ جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے ہیں وہ آپ کے فیضِ صحبت کی برکت سے دنیا کو ہر قسم کی علمی اور عقلی روشنی بہم پہنچا رہے ہیں اور انہیں اخلاق اور مذہب اور روحانیت کے میدان میں ہلاکت اور بربادی کے گڑھوں سے بچاتے ہوئے ترقی اور کامیابی کی راہیں دکھا رہے ہیں اور جس طرح چاند سورج سے نور اخذ کرتا اور زمین پر اپنی فرحت بخش روشنی پھیلا دیتا ہے۔ اسی طرح یہ لوگ خدا تعالیٰ سے وحی والہام کا نور پا کر دنیا کو اپنی اُن

برکات سے متمتع کر رہے ہیں جن کا منبع انسانی عقل نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا تازہ الہام ہے۔اور جس طرح رات لوگوں کے لئے آرام اور سکون کا موجب ہوتی ہے اسی طرح یہ لوگ غریبوں کے ہمدرد۔مسکینوں کے ملجاء اور بیواؤں اور یتامیٰ کے ماوٰی ہیں اور دنیا سے ہر قسم کے جھگڑوں اور فسادات کو مٹا کر ایک عالمگیر امن کی بنیاد رکھ رہے ہیں اور جس طرح آسمان سے اس مادی دُنیا پر بارشیں نازل ہوتی اور پیاسی زمینیں سیراب ہو جاتی ہیں۔اسی طرح یہ لوگ علم وعرفان کی ایک بارش ہیں جس سے دنیا میں ایک نیا انقلاب پیدا ہو رہا ہے اور جس طرح بارش سے پھل اور پھول اور میوے اور طرح طرح کی غذائیں پیدا ہوتی ہیں۔اسی طرح اُن کے ذریعہ نئے نئے علوم دنیا میں ایجاد ہو رہے ہیں۔اور جس طرح زمین ہر ایک کے لئے فرش کا کام دیتی ہے۔اسی طرح ان کا دامنِ فیض بھی دنیا کی ہر قوم کے لئے وسیع ہے اور ہر مشرقی اور مغربی اور عربی اور عجمی کے لئے اُن کی محبت بھری گود کھلی ہے۔غرض یہ لوگ خدائے رحمٰن کی صفتِ رحمانیت کا ایک زندہ ثبوت ہیں۔یہ پانی کی طرح خدا تعالیٰ کی طرف بہتے اور ہواؤں کی طرح اس کی طرف اُڑتے اور مشکلات اور حوادث میں زمین کی طرح ثابت قدم رہتے اور آگ کی طرح ہر قسم کی شیطنت کو جلاتے اور پہاڑوں کی طرح دنیا کی حفاظت کے فرائض سرانجام دیتے ہیں پس اُن کو دیکھ کر بھی خدائے رحمٰن کی رحمانیت انسان کی آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ ان عباد الرحمٰن کی علامات بیان کرتے ہوئے سب سے **پہلی علامت** یہ بیان فرماتا ہے کہ یَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وہ زمین پر بڑے سکون اور وقار کے ساتھ چلتے ہیں۔اس کے ایک معنے تو یہ ہیں کہ وہ اپنی دنیوی زندگی بڑے اعتدال کے ساتھ بسر کرتے ہیں۔یعنی نہ تو بے جا غضب اور تیزی سے کام لے کر لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور نہ سُستی اور جمود کا شکار ہو کر اپنے مفوضہ فرائض کی ادائیگی سے غافل ہو جاتے ہیں بلکہ جس طرح آسمان کا وجود زمینی قوتوں کے نشوونما کے لئے ضروری ہوتا ہے اسی طرح اُن کا وجود لوگوں کی ترقی اور اُن کی فلاح و بہبود کا موجب بنتا ہے اُن کی تباہی اور بربادی کا موجب نہیں بنتا۔وَ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا اور جب جاہل لوگ چاہتے ہیں کہ انہیں اپنی حرکات سے جوش دلائیں اور کوئی جھگڑا اور فساد کھڑا کریں تو وہ طیش میں آکر ناجائز اور اوچھے ہتھیاروں پر نہیں اُتر آتے بلکہ ایسی حالت میں بھی اُن کی سلامتی ہی چاہتے ہیں یعنی ایسے ذرائع استعمال میں لاتے ہیں جن سے اُن کی اصلاح ہو جائے۔اور دنیا میں امن اور سلامتی کا دَور دَورہ ہو۔

مگر ان معنوں کے علاوہ اس میں ایک اور مضمون بھی بیان کیا گیا ہے۔جس کی طرف عام طور پر بہت کم توجہ کی جاتی ہے اور وہ یہ کہ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کو جب غلبہ واقتدار حاصل ہوگا تو اُس وقت اُن میں کیا کیا صفات پائی جائیں گی۔یہی حکمت ہے جس کی بناء پر خدا تعالیٰ نے اس جگہ یَمْشُوْنَ فِي الْاَرْضِ نہیں فرمایا بلکہ یَمْشُوْنَ

عَلَی الْاَرْضِ فرمایا ہے۔ اگر صرف چلنے کا ذکر ہوتا تو یَمْشُوْنَ فِی الْاَرْضِ کافی تھا مگر اس جگہ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ کہہ کر عَلیٰ کو استعلاء کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے اور اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ انہیں دنیا پر غلبہ حاصل ہوگا اور وہ پورے اقتدار کے ساتھ ایک غالب اور فاتح قوم کے افراد کی طرح چلیں گے گویا اُن کا چلنا عام لوگوں کی طرح نہیں ہوگا بلکہ اقتدار اور غلبہ اُن کے ساتھ ہوگا اور وہ ایسے مقام پر کھڑے ہوں گے کہ لوگوں کو اپنی طاقت سے کچل سکیں۔ یہ ایسا ہی فقرہ ہے جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق ایک نملہ نے کہا کہ یٰۤاَیُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا یَحْطِمَنَّكُمْ سُلَیْمٰنُ وَ جُنُوْدُهٗ ۙ وَ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ (النمل :۱۹) یعنی اے نملہ قوم سے تعلق رکھنے والو۔ اپنے اپنے گھروں میں چلے جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ سلیمانؑ اور اُس کے طوفانی لشکر تمہارے حالات سے بے خبر ہونے کی وجہ سے تمہیں اپنے پیروں کے نیچے مسل دیں۔ اگر خالی چلنے کا یہاں ذکر ہوتا تو یَمْشُوْنَ فِی الْاَرْضِ کہنا کافی تھا۔ لیکن علیٰ کا صلہ لاکر ایک دوسرا مفہوم پیدا کر دیا گیا ہے کہ وہ ایسی طاقت رکھیں گے کہ دنیا کو اپنے پاؤں کے نیچے روند سکیں۔ مگر جس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق ذکر آتا ہے کہ وہ نہایت احتیاط کے ساتھ چلتے تھے تا ایسا نہ ہو کہ کوئی قوم اُن کے ذریعہ کچلی جائے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ان آیات میں مسلمانوں کے متعلق بیان فرماتا ہے کہ جب وہ دنیا پر غالب آئیں گے تو اس امر کی خاص احتیاط رکھیں گے کہ کوئی قوم اُن کے پاؤں کے نیچے روندی نہ جائے۔ گویا اُن کے اندر یہ طاقت تو ہوگی کہ وہ دنیا کو روند ڈالیں مگر چونکہ وہ نیک اور پارسا ہوں گے اس لئے یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا کا مصداق ہوں گے۔ یعنی وہ اس طرز پر چلیں گے کہ ہر وقت یہ امر اُن کے مدنظر رہے گا کہ کسی فرد یا قوم کو اُن کے ہاتھوں کوئی ناجائز تکلیف نہ پہنچے۔

اس کے بعد وَ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا کہہ کر اس طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ حاکم انسان دوسرے کو دکھ دے سکتا ہے۔ اور بالعموم حکام کی عادت میں یہ بات داخل ہوتی ہے کہ جب اُن کے سامنے کوئی گستاخانہ کلام کرے تو وہ کہتے ہیں ہم تمہاری اچھی طرح خبر لیں گے اور تمہیں بتائیں گے کہ تمہاری اس گستاخی کی کیا سزا ہے۔ مگر مسلمانوں کی یہ حالت ہوگی کہ حکومت اور طاقت اور غلبہ اور رعب کے باوجود جب اُن سے کوئی خطابِ جہالت کرے گا تو وہ مسکراتے ہوئے کہہ دیں گے کہ ہم کچھ بُرا نہیں مناتے۔

حدیثوں میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک دفعہ ایک یہودی آیا اور اُس نے آپ سے کسی قرض کا نہایت سختی سے مطالبہ کیا۔ صحابہؓ یہ حالت دیکھ کر غصّہ سے بیتاب ہو گئے اور انہوں نے اپنی تلواریں سونت لیں مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے فرمایا۔ جانے دو جس کا حق ہوتا ہے وہ دوسرے پر سختی کر ہی

بیٹھتا ہے(بخاری کتاب الوکالۃ باب الوکالۃ فی قضاء الدّیون)۔اسی طرح ایک اَور شخص نے ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہہ دیا کہ آپ نے جو اموال کی تقسیم کی ہے اُس میں انصاف سے کام نہیں لیا۔حضرت عمرؓ تلوار لے کر کھڑے ہو گئے تا کہ اس کا سر اُڑا دیں مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جانے دو اور اسے کچھ نہ کہو(مسند احمد، مسند عبد اللہ بن عمرو بن العاص ؓ)۔غرض وَ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مومنوں کو جب غلبہ حاصل ہوگا تو ایسی حالت میں بھی وہ کسی کے خطابِ جہالت پر بُرا نہیں منائیں گے بلکہ اُن کی سلامتی اور تحفظ حقوق کو مدنظر رکھیں گے۔اور درحقیقت غلبہ کے وقت ہی انسان کے اعلیٰ اخلاق کا پتہ چلتا ہے ورنہ کمزوری کی حالت میں کسی کا مار کھا لینا تو ستر بی بی از بے چادری والی بات ہوتی ہے۔لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ مار نہ کھائے تو کیا کرے اُس کے اندر مقابلہ کی طاقت تو ہے ہی نہیں۔لیکن جب کوئی شخص طاقت رکھتے ہوئے عفو سے کام لیتا ہے اور سزا دینے کی طاقت رکھتے ہوئے کچھ نہیں کہتا تو اُس وقت ظاہر ہو جاتا ہے کہ فی الواقعہ وہ اعلیٰ درجہ کے اخلاق کا مالک ہے۔

پھر فرماتا ہے۔وَ الَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا۔وہ لوگ اپنی راتیں خدا تعالیٰ کے حضور سجدہ و قیام کرتے ہوئے گذار دیتے ہیں۔اس میں جہاں عباد الرحمٰن کی یہ خصوصیت بتائی گئی ہے کہ وہ مصائب اور مشکلات کے اوقات میں جو رات کی تاریکیوں سے مشابہت رکھتے ہیں دُعاؤں اور گریہ وزاری سے کام لیتے اور خدا تعالیٰ کے آستانہ پر جھکے رہتے ہیں۔وہاں اس میں تہجد کی ادائیگی بھی عباد الرحمٰن کا شعار قرار دیا گیا ہے۔اور بتایا گیا ہے کہ اُن کی راتیں خراٹے بھرتے ہوئے نہیں گذرتیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی یاد اور اُس کی محبت اور عبادت میں گذرتی ہیں۔وہ جسمانی تاریکی کو دیکھ کر ڈرتے ہیں کہ کہیں اُن پر روحانی تاریکی بھی نہ آ جائے اور وہ دعاؤں اور استغفار اور انابت سے خدا تعالیٰ کی رحمت کو جذب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے نماز تہجد کی اہمیت ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے کہ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّ اَقْوَمُ قِيْلًا (المزمل:۷) یعنی رات کا اٹھنا انسانی نفس کو مسلنے میں سب سے زیادہ کامیاب نسخہ ہے اور رات کو خدا تعالیٰ کے حضور سجدہ میں گرے رہنے والوں کی روحانیت ایسی کامل ہو جاتی ہے کہ وہ ہمیشہ سچ کے عادی ہو جاتے ہیں۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز تہجد کا اس قدر خیال رہتا تھا کہ آپ بعض دفعہ رات کو اُٹھ کر چکر لگاتے اور دیکھتے کہ کون کون تہجد پڑھ رہا ہے۔ایک دفعہ مجلس میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا ذکر آ گیا کہ وہ بڑی خوبیوں کے مالک ہیں۔آپ نے فرمایا ہاں بڑا اچھا ہے بشرطیکہ تہجد بھی پڑھے(صحیح بخاری کتاب التہجد باب فضل من تعارّ من اللیل فصلّٰی)۔معلوم ہوتا ہے اُن دنوں حضرت

عبداللہ بن عمرؓ تہجد پڑھنے میں سُستی کرتے ہوں گے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ذریعہ سے انہیں توجہ دلائی کہ وہ اپنی اس سُستی کو دُور کریں۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اُسی دن سے تہجد کی نماز میں باقاعدگی اختیار کر لی۔

ایک دفعہ رات کے وقت آپ اپنے داماد حضرت علیؓ اور اپنی بیٹی حضرت فاطمہؓ کے گھر گئے اور باتوں باتوں میں دریافت فرمایا کہ کیا تم تہجد بھی پڑھا کرتے ہو۔ حضرت علیؓ نے کہا یا رسول اللہ! پڑھنے کی کوشش تو کرتے ہیں لیکن جب خدا تعالیٰ کے منشاء کے ماتحت کسی وقت آنکھ نہیں کھلتی تو نماز رہ جاتی ہے۔ آپ اُسی وقت اُٹھ کر اپنے گھر کی طرف چل پڑے اور بار بار فرماتے وَ كَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا (بخاری کتاب التہجد باب تحریض النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی قیام اللیل والنوافل من غیر ایجاب) یعنی انسان اپنی غلطی تسلیم کرنے کی بجائے مختلف قسم کی تاویلیں کر کر کے اپنے قصور پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ آپ کا مطلب یہ تھا کہ بجائے اس کے کہ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرتے انہوں نے یہ کیوں کہا کہ جب خدا کا منشاء ہوتا ہے کہ ہم نہ جاگیں تو ہم سوئے رہتے ہیں اور اس طرح اپنی غلطی کو اللہ تعالیٰ کی طرف کیوں منسوب کیا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ اگر رات کو میاں کی آنکھ کھلے اور وہ تہجد کے لئے اُٹھے تو اپنی بیوی کو بھی تہجد کے لئے جگائے۔ اور اگر وہ نہ اٹھے تو اُس کے مُنہ پر پانی کا ہلکا سا چھینٹا دے اور اگر بیوی کی آنکھ کھل جائے اور اس کا میاں جگانے کے باوجود نہ اٹھے تو اس کے منہ پر پانی کا ہلکا سا چھینٹا دے۔ (سنن ابی داؤد ابواب الوتر باب الحث علی قیام اللیل) ۔ آپؐ تہجد کی اہمیت پر اس قدر زور دیا کرتے تھے کہ آپؐ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ رات کے آخری حصّہ میں اپنے بندوں کے قریب آجاتا ہے اور اُن کی دعاؤں کو دن کی نسبت بہت زیادہ قبول فرماتا ہے۔ (بخاری کتاب التہجد باب الدعا فی الصلاۃ من آخر اللیل) ۔

آپؐ نے ایک دفعہ فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے بتایا ہے کہ انسان نوافل کے ذریعہ مجھ سے اتنا قریب ہوجاتا ہے کہ میں اُس کے کان ہوجاتا ہوں جن سے وہ سُنتا ہے اُس کی آنکھیں ہوجاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے۔ اُس کے ہاتھ ہوجاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے اور اُس کے پاؤں ہوجاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے (صحیح بخاری کتاب الرقاق باب التواضع) ۔ اس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ رات کا اُٹھنا انسان کو اللہ تعالیٰ کے کس قدر قریب کر دیتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اس زمانہ میں تہجد پڑھنے کی عادت بہت کم ہوگئی ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے عبادالرحمٰن کی یہ ایک خاص خوبی بیان کی ہے کہ وہ اپنی راتیں خدا تعالیٰ کے حضور سجدہ و قیام میں گذار دیتے ہیں۔ مگر چونکہ یہ آیات مسلمانوں کے دَورِ حکومت کی امتیازی خصوصیات کی بھی حامل ہیں اس لئے يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کو جب دنیا پر غلبہ حاصل ہوگا تو وہ عیش و عشرت میں منہمک نہیں ہوں گے بلکہ اُن کی راتیں خدا تعالیٰ

کے حضور سجدہ و قیام کرتے ہوئے گذریں گی۔ چنانچہ جب تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں مسلمانوں کی اس امتیازی خصوصیت کا بھی نہایت واضح طور پر علم حاصل ہوتا ہے۔ تاریخوں میں لکھا ہے کہ جب روم کے ساتھ مسلمانوں کی لڑائی ہوئی تو رومی جرنیل نے اپنا ایک وفد مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لینے کے لئے بھیجا اور اُس نے کہا کہ تم مسلمانوں کے لشکر کو جا کر دیکھو اور پھر واپس آکر بتاؤ کہ اُن کی کیا کیفیت ہے وہ وفد اسلامی لشکر کا جائزہ لے کر واپس گیا تو اُس نے کہا ہم مسلمانوں کو دیکھ آئے ہیں۔ وہ ہمارے مقابلہ میں بہت تھوڑے ہیں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی جن ہیں کیونکہ ہم نے دیکھا کہ وہ دن کو لڑتے ہیں اور رات کو تہجد پڑھنے کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ ہمارے سپاہی جو دن بھر کے تھکے ماندے ہوتے ہیں وہ تو رات کو شرابیں پیتے اور ناچ گانے میں مشغول ہو جاتے ہیں اور جب اِن کاموں سے فارغ ہوتے ہیں تو آرام سے سو جاتے ہیں ۔مگر وہ لوگ کوئی عجیب مخلوق ہیں کہ دن کو لڑتے ہیں اور راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر خدا تعالیٰ کی عبادت کرتے اور اُس کا ذکر کرتے ہیں (البدایة والنھایة الجزء وقعة الیرموک)۔ ایسے لوگوں سے لڑنا بے فائدہ ہے۔ چنانچہ دیکھ لو۔ اس ذکر الٰہی کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ بھی آسمان سے اُن کی مدد کے لئے اُترا اور اُس نے انہیں بڑی بڑی طاقتور حکومتوں پر غالب کر دیا۔ عرب کی ساری آبادی ایک لاکھ اسّی ہزار تھی مگر انہوں نے روم جیسے ملک سے ٹکر لے لی جس کی بیس کروڑ آبادی تھی۔ پھر انہوں نے کسریٰ کے ملک پر حملہ کر دیا اور اس کی آبادی بھی بیس تیس کروڑ تھی۔ گویا پچاس کروڑ کی آبادی رکھنے والے ممالک پر ایک لاکھ اسی ہزار کی آبادی رکھنے والے ملک کا ایک حصّہ حملہ آور ہوا۔ اور پھر یہ ملک اتنے طاقتور تھے کہ ہندوستان بھی اُن کے ماتحت تھا۔ چین بھی اُن کے ماتحت تھا۔ اسی طرح ٹرکی ۔ آرمینیا۔ عراق اور عرب کے اوپر کے ممالک یعنی فلسطین اور مصر وغیرہ بھی اُن کے ماتحت تھے۔ مگر باوجود اتنی کثرت کے مٹھی بھر مسلمان نکلے تو انہوں نے ان لوگوں کا صفایا کر دیا اور بارہ سال کے عرصہ میں اُن کی فوجیں قسطنطنیہ کی دیواروں سے جا ٹکرائیں ۔ یہ فتوحات جو مسلمانوں کو حاصل ہوئیں صرف ذکر الٰہی اور يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا کا نتیجہ تھیں۔ لیکن جب مسلمان بگڑ گئے اور انہوں نے ذکر الٰہی میں اپنی راتیں بسر کرنے کی بجائے رنگ رلیوں اور ناچ گانوں میں راتیں بسر کرنی شروع کر دیں ۔ جب انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اسحاق موسوی بڑا اچھا گانے والا ہے۔ فلاں کنچنی خوب ناچتی ہے تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی تباہی کے لئے ہلاکو خاں کو بغداد پر مسلّط کر دیا اور اُس نے ایک دن میں اٹھارہ لاکھ مسلمانوں کو قتل کر دیا اور شاہی خاندان کی کوئی عورت ایسی نہ چھوڑی جس کے ساتھ بدکاری نہ کی گئی ہو۔ اُس وقت مسلمان ایک بزرگ کے پاس گئے اور انہیں کہا کہ دُعا کریں بغداد تباہی سے بچ جائے۔ انہوں نے کہا میں کیا دُعا کروں میں تو جب بھی ہاتھ اٹھاتا

ہوں اللہ تعالیٰ کے فرشتے مجھے یہ آوازیں دیتے سنائی دیتے ہیں کہ اَیُّہَا الْکُفَّارُ اُقْتُلُوا الْفُجَّارَ (تاریخ ابن خلدون مجلد ۳ صفحہ ۵۳۷) یعنی اے کافرو! ان فاجر و فاسق مسلمانوں کو خوب مارو۔ چنانچہ بغداد تباہ ہو گیا۔ اور عباسی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ حالانکہ ایک زمانہ میں اُن کی طاقت کا یہ عالم تھا کہ رومی حکومت کے لشکر کو جو ساٹھ ہزار کی تعداد میں تھا مسلمانوں کے صرف ساٹھ آدمیوں نے شکست دے دی تھی اور اُن کے ساٹھ میں سے بھی صرف بارہ تیرہ شہید ہوئے اور بیس کے قریب خطرناک زخمی ہوئے باقی سب خیریت کے ساتھ واپس آ گئے (فتوح الشام للواقدی زیر عنوان وقعۃ الیرموک)۔ یہ تائید مسلمانوں کو صرف اس لئے حاصل ہوئی کہ وہ طاقت اور غلبہ کو اپنی عیاشی کا ذریعہ نہیں بناتے تھے بلکہ ہر قسم کی طاقت اور ہر قسم کا غلبہ حاصل کرنے کے باوجود اُن کی زبانیں ذکر الٰہی سے تر رہتی تھیں اور اُن کی راتیں خدا تعالیٰ کے حضور قیام اور سجود میں گذر جاتی تھیں۔ دنیا میں بڑی بڑی فاتح اقوام گذری ہیں مگر ہمیں کسی قوم کی تاریخ میں یہ مثال نظر نہیں آئے گی کہ وہ اتنے خدا ترس ہوں کہ ان کی تلوار کسی عورت کسی بچے کسی بوڑھے اور کسی دینی شغف رکھنے والے انسان پر نہ اٹھتی ہو۔ اُن کی تلوار کسی ایک انسان کا بھی ناجائز طور پر خون نہ بہاتی ہو اور راتوں کو وہ خدا تعالیٰ کے حضور روتے اور گڑگڑاتے ہوں۔ یہ عظیم الشان خوبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ میں ہی پائی جاتی تھی۔ جن کے اعلیٰ درجہ کے اخلاق اور بلند کردار کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے کفار کو بتایا ہے کہ دیکھو یہ لوگ تمہارے ہی ملک اور تمہارے ہی شہر کے رہنے والے تھے اور تمہارے ہی ساتھ انہوں نے اپنی عمروں کا بیشتر حصہ بسر کیا مگر تم بھی جانتے ہو اور باقی سب لوگ بھی اس بات کے گواہ ہیں کہ نہ اُن میں يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا والی بات پائی جاتی تھی اور نہ اُن میں يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا والی کیفیت پائی جاتی تھی بلکہ اس کے برعکس ظلم و ستم اُن کا شیوہ تھا۔ اور شراب خوری اور عیاشی میں انہماک اُن کا رات دن کا شغل تھا مگر جب انہوں نے خدائے رحمٰن کے کلام کو قبول کیا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلے تو اُن کی دنیا بھی بدل گئی اور اُن کی اخلاقی اور روحانی حالت میں بھی ایک تغیّر عظیم واقع ہو گیا۔ اگر یہ خدائے رحمٰن کے کلام کو قبول کرنے کی برکت نہیں تو بتاؤ اُن میں یہ خوبیاں کہاں سے پیدا ہوئیں اور کس چیز نے انہیں ان اعلیٰ درجہ کے اخلاق کا مالک بنا دیا۔

پھر عباد الرحمٰن کی ایک اور **علامت** یہ بتائی کہ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا۔ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا۔ یعنی وہ لوگ اللہ تعالیٰ سے یہ دُعائیں کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! عذابِ جہنم کو ہم سے دُور رکھ۔ کیونکہ اُس کا عذاب ایک بہت بڑی تباہی ہے اور جہنم بہت برا ٹھکانہ ہے۔ خواہ

وہ عارضی وقت کے لئے ہو یا مستقل وقت کے لئے۔

اس جگہ جہنم سے گو اخروی جہنم بھی مراد ہے جس سے ہر سچّا مومن اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہے مگر دنیوی نقطہ نگاہ سے ہر وہ امر جو انسان کے لئے دکھ اور تکلیف کا موجب ہو اور جس سے اس کی جان و مال یا عزت اور آبرو کو خطرہ ہو اور جو اُسے قوم اور ملک کی نظروں میں گرانے اور ذلیل کرنے والا ہو وہ بھی اس کے لئے جہنم کا ہی رنگ رکھتا ہے۔ دراصل جہنم **جَهَنَ** اور **جَهَمَ** سے مرکب ہے۔ **جَهَنَ** کے معنے کسی چیز کے قریب ہونے کے ہوتے ہیں اور **جَهَمَ** کے معنے منہ کے بگڑ جانے کے ہیں۔ پس جہنم کے لفظ کا اطلاق ہر ایسی چیز پر ہو سکتا ہے جس کی طرف انسان پہلے تو بڑے شوق اور حرص کے ساتھ بڑھے مگر جب وہ اس کے قریب پہنچے تو اُس کا منہ بگڑ جائے اور وہ گھبرانے لگ جائے اس نام میں درحقیقت جہنمی افعال کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ انسان پہلے تو عیاشیوں اور بدکاریوں کو بڑا اچھا فعل سمجھتا اور اُن کے قریب پہنچنے کی کوشش کرتا ہے مگر جب وہ اُن بدیوں میں ملوّث ہو جاتا ہے اور اُن کا بُرا انجام آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو اس کا مونہہ بگڑ جاتا ہے اور وہ رونے اور چیخیں مارنے لگ جاتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ میں نے تو بڑی غلطی کی۔ ان معنوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس آیت میں عباد الرحمٰن کی یہ علامت بتائی گئی ہے کہ وہ اٹھتے بیٹھتے اللہ تعالیٰ سے یہ دُعائیں کرتے رہتے ہیں کہ الٰہی ہمیں ہر ایسے کام سے بچا ئیو جو ہمیں دنیا و آخرت میں ذلیل کرنے والا ہو۔ تو ہمیں افلاس اور تنگدستی کے جہنم سے بچا۔ ہمیں جہالت اور کم علمی کے جہنم سے بچا۔ ہمیں بداخلاقی اور عیاشی کے جہنم سے بچا۔ ہمیں دنیا داری اور ہوس پرستی کے جہنم سے بچا۔ ہمیں اپنی آئندہ نسلوں کی خرابی کے جہنم سے بچا۔ ہمیں کفر اور شیطنت کے جہنم سے بچا۔ ہمیں لا مذہبیت اور اباحت کے جہنم سے بچا۔ ہمیں منافقت اور بے ایمانی کے جہنم سے بچا۔ ہمیں خودسری اور جھوٹ اور ظلم اور تعدی کے جھنم سے بچا۔ ہمیں اپنی محبت اور رضا سے دوری کے جہنم سے بچا۔ کیونکہ خواہ یہ بُرائیاں ہم میں عارضی طور پر پیدا ہوں یا مستقل طور پر بہر حال ان کا پیدا ہونا ہمارے لئے تباہی اور رسوائی کا باعث ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ مستقل طور پر ان خرابیوں کا پیدا ہونا تو الگ رہا ہم میں عارضی اور وقتی طور پر بھی یہ خرابیاں پیدا نہ ہوں اور ہمیشہ ہمارا قدم صراطِ مستقیم پر قائم رہے۔ گویا وہی دُعا جو سورۂ فاتحہ میں غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ کے الفاظ میں سکھائی گئی ہے اس جگہ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ کے الفاظ میں دہرادی گئی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں کی یہ علامت بتائی گئی ہے کہ باوجود اس کے کہ انہیں دنیا پر غلبہ حاصل ہوتا ہے پھر بھی قومی تنزل کا خوف ہر وقت اُن کو آستانۂ ایزدی پر جُھکائے رکھتا ہے اور وہ رات دن دُعائیں کرتے رہتے ہیں کہ الٰہی ہم میں اور ہماری آئندہ نسلوں میں کسی قسم کی خرابی پیدا نہ ہو تاکہ وہ جنت جو تُو نے

محض اپنے فضل سے ہمیں عطا فرمائی ہے وہ ہمیشہ قائم رہے اور کوئی ابلیس سانپ کی شکل اختیار کر کے ہماری ایڑی کو نہ کاٹ لے۔ اگر مسلمان اپنے غلبہ کے اوقات میں اس قرآنی دُعا کو ہمیشہ یاد رکھتے اور ہر کامیابی کے حصول پر قومی تنزل کے خطرات سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے تو اللہ تعالیٰ اُن پر دائمی طور پر اپنا فضل نازل کرتا اور ہمیشہ اُن کا قدم ترقی کے میدان میں آگے ہی آگے بڑھتا رہتا۔

مگر اِن معنوں کے علاوہ اس آیت میں اُخروی جہنم کے عذاب سے بھی بچنے کی دُعا سکھلائی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ جہنم عارضی رہائش کے لحاظ سے بھی بہت بُرا ٹھکانا ہے اور مستقل رہائش کے لحاظ سے بھی بہت برا ٹھکانہ ہے۔ ان الفاظ میں قرآن کریم کی یہ تعلیم بیان کی گئی ہے کہ دوزخ غیر محدود نہیں ہوگی کیونکہ دوزخ کو مستقر قرار دیا گیا ہے جس کے معنے عارضی قرارگاہ کے ہوتے ہیں اور چونکہ اس جگہ یہ کہا گیا ہے کہ دوزخ خواہ عارضی ہو یا مستقل بڑی تکلیف دہ جگہ ہے اس لئے ان الفاظ میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ دوزخ کا تھوڑا عذاب بھی سزا دینے کے لئے کافی ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اُسے لمبا کیا جائے یا اُسے مستقل بنا دیا جائے۔

قرآن کریم نے اس مضمون کو بعض اور مقامات پر بھی نہایت واضح الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ مثلاً فرماتا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذاریات: ۵۷) یعنی میں نے جن وانس کو صرف اس غرض کے لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میرے عبد بن جائیں۔ اور جب انسان کو پیدا ہی اس غرض کے لئے کیا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا عبد بنے تو اگر وہ دائمی طور پر دوزخ میں رکھا جائے تو وہ اس غرض کو پورا ہی نہیں کر سکتا اور پیدائشِ عالم کا مقصد بالکل فوت ہو جاتا ہے۔ اس مضمون کی مزید تشریح اس آیت سے ہوتی ہے کہ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (الفجر: ۳۰،۳۱) یعنی اللہ تعالیٰ نفسِ مطمئنہ رکھنے والوں سے فرمائے گا کہ آؤ اور میرے بندوں میں شامل ہو جاؤ۔ آؤ اور میری جنّت میں داخل ہو جاؤ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے حقیقی عبد کا مقام جنت ہے۔ اور جب ہر انسان عبد بننے کے لئے پیدا کیا گیا ہے تو لازماً ہر انسان کے متعلق ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ جنت میں جائے گا۔ پس دوزخ ایک عارضی قرارگاہ ہے مستقل مقام نہیں۔ پھر فرماتا ہے وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ؕ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ؕ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ (انبیاء: ۴۸) یعنی قیامت کے دن ہم ایسے تول کے سامان پیدا کریں گے کہ جن کی وجہ سے کسی جان پر ذرا سا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا اور اگر کسی نے رائی کے دانہ کے برابر بھی کوئی نیکی یا بدی کی ہوگی تو ہم اُس کو بھی لے آئیں گے۔ اور ہم حساب لینے میں کافی ہیں۔ اب اگر کوئی شخص بدیوں کی کثرت کی وجہ سے جہنم میں چلا جائے اور پھر ابدالاباد تک اُسی میں رہے تو اُسے اپنی نیکیوں کا بدلہ

نہیں مل سکتا۔ پس ضروری ہے کہ اس کی سزا ایک دن ختم ہوتا کہ اس کی نیکیوں کی اُسے جزا دی جائے۔ ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ اسی مضمون کو ان الفاظ میں بیان فرماتا ہے کہ اَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ (القارعۃ:۹۔۱۰) یعنی جس کی نیکیاں کم ہوں گی اُس کی ماں ہاویہ ہوگی یعنی جس طرح بچہ رحم مادر میں ایک معیّن عرصہ تک رہتا ہے اور پھر اُس کے پیٹ سے باہر آجاتا ہے۔ اسی طرح جب دوزخیوں کی سزا کی میعاد ختم ہوجائے گی تو اللہ تعالیٰ انہیں باہر لے آئے گا۔ اور اپنی جنّت میں داخل کردے گا۔

اسی طرح فرماتا ہے۔ فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ۔ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ (ھود:۱۰۷ تا ۱۰۹) یعنی جو لوگ بدبخت ثابت ہوں گے وہ آگ میں داخل کئے جائیں گے۔ اُس میں کسی وقت تو اُن کے غم سے لمبے لمبے سانس نکل رہے ہوں گے اور کسی وقت رو رو کر ہچکی بندھ جائے گی۔ وہ اُس میں اُس وقت تک رہتے چلے جائیں گے جب تک کہ آسمان اور زمین قائم ہیں سوائے اس کے کہ تیرا رب کچھ اور ارادہ کرے اور تیرا رب اپنے ارادہ کو پورا کرنے والا ہے۔ اور جو لوگ خوش نصیب ہوں گے وہ جنت میں داخل کئے جائیں گے۔ اور وہ اُس وقت تک اُس میں رہتے چلے جائیں گے جب تک کہ آسمان اور زمین قائم ہیں۔ سوائے اس کے کہ تیرا رب کچھ اور چاہے مگر یہ ایسی عطا ہوگی جو کبھی کاٹی نہیں جائے گی۔

اس آیت میں جہنمیوں کے متعلق تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم اُن کو جہنم سے نکال سکتے ہیں اور ہمارے ارادہ میں کون حائل ہوسکتا ہے لیکن مومنوں کے متعلق فرماتا ہے کہ ہم اگر چاہیں تو اُن کو بھی جنت سے نکال سکتے ہیں مگر ہم نے یہی چاہا ہے کہ اُن کے انعام کو کبھی ختم نہ کیا جائے۔ اس مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ کا عذاب ایک دن منقطع ہونے والا ہے کیونکہ دوزخیوں کو جہنم سے نکلنے کی امید دلائی گئی ہے۔ لیکن جنتیوں کو کہا گیا ہے کہ انہیں غیر مقطوع یعنی نہ ختم ہونے والے انعام سے نوازا جائے گا۔

پھر فرماتا ہے عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ وَ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (الاعراف:۱۵۷) میں اپنا عذاب جس کو چاہتا ہوں پہنچاتا ہوں مگر میری رحمت ہر ایک چیز پر حاوی ہے اور جب اس کی رحمت ہر ایک چیز پر حاوی ہے تو ضروری ہے کہ دوزخ بھی ایک دن اُس کی رحمت کے سایہ تلے آجائے اور دوزخیوں کو اُس میں سے نکال کر جنت میں داخل کردیا جائے۔

حدیثوں میں بھی آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا يَاْتِيْ عَلٰى جَهَنَّمَ زَمَانٌ لَيْسَ فِيْهَا اَحَدٌ

وَ نَسِيْمُ الصَّبَا تُحَرِّكُ اَبْوَابَهَا (تفسیر معالم التنزیل جلد ۳ صفحہ ۲۴۳ زیر آیت و اما الذین سعدوا۔) یعنی جہنم پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ اُس میں کوئی شخص نہیں ہوگا اور ہوا اُس کے دروازے کھٹکھٹائے گی۔ یعنی وہ کھلے ہوں گے اور دوزخ کے اندر کوئی قیدی نہیں رہے گا۔

غرض اسلامی تعلیم کے ماتحت جزائے نیک تو دائمی ہوگی مگر دوزخ کا عذاب دائمی نہیں وہ بیشک ایک بھیانک اور تکلیف دہ چیز ہے مگر آخر خدا تعالیٰ کی محبت جوش میں آئے گی اور وہ گنہگاروں کو بھی اپنے سایۂ رحمت میں لے آئے گی۔

اس جگہ ایک شبہ کا ازالہ کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ قرآن کریم میں ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ (البقرۃ:۱۶۸) یعنی دوزخی دوزخ کی آگ سے ہرگز نہیں نکل سکیں گے۔ اس آیت سے یہ دھوکا ہرگز نہیں کھانا چاہیے کہ اس میں تو لکھا ہے کہ دوزخ میں سے کوئی نہیں نکلے گا۔ کیونکہ اس میں اُن کے اپنے زور سے نکلنے کی نفی کی گئی ہے خدا تعالیٰ کے فضل کی نفی نہیں کی گئی۔ پس اس آیت کا صرف یہ مطلب ہے کہ دوزخی اپنے زور سے اُس میں سے نہیں نکل سکیں گے۔ ہاں اللہ تعالیٰ کے فضل سے وہ ایک دن نکال دیئے جائیں گے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ

اور وہ (اللہ کے بندے) ایسے ہوتے ہیں کہ جب خرچ کرتے ہیں تو فضول خرچی سے کام نہیں لیتے اور نہ بخل

بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴿۶۸﴾

کرتے ہیں۔ اور اُن کا (خرچ) اِن دونوں حالتوں کے درمیان ہوتا ہے۔

حلّ لُغات۔ لَمْ يُسْرِفُوْا لم یسرفوا اَسْرَفَ سے مضارع يُسْرِفُ بنتا ہے اور لَمْ يُسْرِفُوْا اس سے جمع مذکر غائب منفی کا صیغہ ہے اور اَسْرَفَ مَالَهٗ کے معنے ہوتے ہیں ۔بَذَّرَهٗ وَقِيْلَ اَنْفَقَهٗ فِيْ غَيْرِ طَاعَةٍ۔ اُس نے مال کو خرچ کیا اور ماہرین لُغت کہتے ہیں کہ اسراف کا لفظ اُس وقت بولیں گے جب اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کی اطاعت کے خلاف مال خرچ کیا جائے نیز اُس کے معنے ہیں جَاوَزَ الْحَدَّ فِيْهِ وَاَفْرَطَ مال کے خرچ کرنے میں حد سے بڑھ گیا۔ اَخْطَاءَ۔ اُس نے مال کے خرچ کرنے میں غلطی کی یعنی غلط جگہ پر خرچ کیا۔ جَهِلَ یا مال کے خرچ میں نادانی سے کام لیا (اقرب) پس لَمْ يُسْرِفُوْا کے معنے ہوں گے (۱) وہ اپنے اموال خدا تعالیٰ کی

اطاعت کے خلاف خرچ نہیں کرتے (۲) یا جہاں جہاں جتنا خرچ کرنا چاہیے اتنا خرچ کرنے میں جائز حد سے زیادہ خرچ نہیں کرتے (۳) یا مال غلط جگہ خرچ نہیں کرتے۔

لَمْ يَقْتُرُوْا لَمْ يَقْتُرُوْا قَتَرَ (يَقْتِرُ) عَلٰى عِيَالِهٖ کے معنے ہیں ضَيَّقَ عَلَيْهِمْ فِي النَّفَقَةِ۔اُس نے اہل و اعیال کو خرچ دینے میں تنگی اور بخل سے کام لیا اور جب قَتَرَ الشَّيْءَ کہیں تو معنے ہوں گے ضَمَّ بَعْضَهٗ اِلٰى بَعْضٍ کہ کسی چیز کے مختلف حصّوں کو ایک دوسرے پر رکھ کر جمع کیا۔اور جب قَتَرَ الْاَمْرَ کہیں تو مطلب یہ ہوگا کہ لَازَمَهٗ یعنی اس معاملہ سے چمٹا رہا۔اور قَتَرَ مَا بَيْنَ الْاَمْرَيْنِ کے معنے ہوتے ہیں قَدَّرَهٗ وَخَمَّنَهٗ دو معاملوں کا اندازہ اور تخمینہ کیا۔(اقرب)

لَمْ يَقْتُرُوْا يَقْتُرُ سے نفی کا صیغہ ہے اس لئے اس کے معنے ہوں گے (۱) وہ اپنے رشتہ داروں اور اقارب پر اپنے مال خرچ کرنے میں تنگی نہیں کرتے۔(۲) وہ مال جمع نہیں کرتے بلکہ موقعہ اور محل پر خرچ کرتے ہیں (۳) وہ مالوں کے ساتھ چمٹے نہیں رہتے۔

قَوَامًا قوامًا اَلْقَوَامُ : اَلْاِعْتِدَالُ یعنی قوام کے معنے میانہ روی کے ہیں۔نیز اس کے معنے ہیں مَا يُعَاشُ بِهٖ۔وہ چیز جس کے ذریعہ سے زندگی گذاری جائے۔(اقرب)

تفسیر۔فرماتا ہے رحمٰن کے بندوں کا ایک یہ بھی نشان ہے کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو دو باتیں اُن کے مدّنظر رہتی ہیں۔**اوّل** یہ کہ وہ اسراف سے کام نہیں لیتے اور **دوسرے** وہ بخل نہیں کرتے۔اسراف کا مرض اس زمانہ میں اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ آجکل مسلمان کی تعریف اور علامت ہی یہی سمجھی گئی ہے کہ جو کچھ اُس کے پاس ہو وہ سب خرچ کر دے اور اپنے پاس کچھ بھی نہ رکھے۔گویا قرآن کریم تو کہتا ہے کہ سچا مسلمان وہ ہے جو اسراف نہ کرے اور آج کل کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سچا مسلمان وہ ہوتا ہے جو سب کچھ بیچ کر کھا جائے۔حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ سُنایا کرتے تھے کہ ایک شخص کو اپنے باپ کی بہت سی دولت مل گئی۔اُس نے اپنے دوستوں اور آشناؤں کو بلا کر پوچھا کہ مجھے دولت خرچ کرنے کا کوئی طریق بتاؤ۔کسی نے کچھ بتایا اور کسی نے کچھ لیکن اسے کوئی پسند نہ آیا۔ایک دن وہ بازار سے گذر رہا تھا کہ بزاز کی دوکان سے کپڑے پھاڑنے کی آواز آئی جو اُسے پسند آ گئی اور اُس نے اپنے نوکروں کو حکم دیا کہ میرے سامنے روزانہ کپڑے کے تھان لا لا کر پھاڑا کرو۔چنانچہ روزانہ اُس نے کپڑوں کے تھان پھڑوانے شروع کر دیئے اور صبح سے شام تک اُس کا یہی شغل رہتا کہ لوگ بیٹھے تھان پھاڑ رہے ہیں اور وہ چر چر کی آواز سُن کر خوش ہو رہا ہے۔اب خرچ کرنے کو تو اُس نے بھی اپنا روپیہ خرچ کیا مگر یہ کیسا نامعقول خرچ تھا۔اس طرح

تو اگر کسی کے پاس کروڑوں روپیہ بھی ہو تو وہ سب کچھ خرچ کر کے کنگال اور نادار بن سکتا ہے۔قرآن کریم نے وَ تَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا (الفجر:۲۰) میں کفّار کو اُن کے اس نقص کی طرف توجہ دلائی ہے کہ تمہیں اپنے باپ دادا سے مال ملا۔مگر بجائے اس کے کہ تم اُسے ترقی دیتے تم نے اس دولت کو اپنے ذاتی عیش و آرام کے لئے تباہ کرنا شروع کر دیا جس کی وجہ سے تمہاری عملی قوتیں بیکار ہو گئیں اور تم تنزل اور انحطاط کا شکار ہو گئے۔

حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ روپیہ کمانا آسان ہوتا ہے مگر اُسے خرچ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے اور حقیقتاً یہ بالکل درست ہے۔دنیا میں بہت لوگ ہیں جو روپیہ کماتے ہیں لیکن چونکہ انہیں خرچ کرنا نہیں آتا اس لئے وہ ہمیشہ مالی مشکلات میں مبتلا رہتے ہیں۔اور بہت ہیں جو کم کماتے ہیں مگر چونکہ انہیں روپیہ خرچ کرنا آتا ہے۔اس لئے وہ تھوڑے روپیہ میں بھی آسانی سے اپنا گذارہ کر لیتے ہیں۔

بہرحال اسلام نے عبادالرحمٰن کی یہ علامت بیان فرمائی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ انہیں زمین پر غلبہ عطا فرماتا ہے تو وہ خزائن الارض کی تقسیم میں کسی قسم کے اسراف یا بخل سے کام نہیں لیتے۔یعنی نہ تو قومی روپیہ کو اس طرف غلق میں بند کر کے رکھتے ہیں کہ قومی و ملکی ترقیات میں روک واقعہ ہو جائے اور عوام کو شکایت کا موقعہ پیدا ہو جائے۔ہم دیکھتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عملی زندگی میں ایسا ہی نمونہ دکھایا۔آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے بادشاہ بھی بنایا اور لاکھوں روپیہ کے اموال آپ کے قبضہ میں آئے۔مگر آپ نے کبھی اُن کے خرچ کرنے میں اسراف سے کام نہیں لیا اور نہ ہی کسی جگہ بخل سے کام لے کر حقدار کو اس کے حق سے محروم کیا۔آپ قومی اموال کی تقسیم اور اُن کے خرچ کرنے میں اس قدر محتاط واقعہ ہوئے تھے کہ حدیثوں میں آتا ہے کہ ایک دفعہ بعض جنگی قیدی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو حضرت فاطمہؓ کو اس کا علم ہوا تو وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لے گئیں مگر انہوں نے آپ کو گھر پر نہ پایا۔چونکہ وہ اُس وقت زیادہ انتظار نہیں کر سکتی تھیں اس لئے انہوں نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں تو میری طرف سے آپ کو عرض کیا جائے کہ چکی پیستے پیستے میرے ہاتھوں پر آبلے اُٹھ آئے ہیں۔اگر جنگی قیدیوں میں سے کوئی قیدی مجھے بھی عطا فرما دیا جائے اور وہ آٹا پیس دیا کرے تو مجھے سہولت ہو جائے گی۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لائے تو حضرت عائشہؓ نے یہ تمام واقعہ آپ کی خدمت میں عرض کر دیا۔رات کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیٹی کے ہاں تشریف لے گئے اور فرمایا بیٹی کیا میں تمہیں ایک ایسی بات نہ بتاؤں جو اُس چیز سے جو آج تم نے مانگی ہے بہت بہتر اور بڑی برکت والی ہے۔انہوں نے کہا یا رسول اللہ! ضرور بتایئے آپ نے فرمایا۔جب تم سونے لگو تو ۳۳ دفعہ سبحان اللہ۔۳۳ دفعہ الحمد للہ اور ۳۴

دفعہ اللہ اکبر کہہ لیا کرو۔(بخاری کتاب النفقات باب عمل المرأة فی بیت زوجها)

یہ واقعہ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے اُس دَور سے تعلق رکھتا ہے جبکہ آپ بادشاہ بن چکے تھے بتاتا ہے کہ گو آپ اپنی بیٹی کو جنگی قیدی عطا فرما سکتے تھے کیونکہ آپ نے بہر حال اُن کو صحابہؓ میں ہی تقسیم کرنا تھا اور حضرت علیؓ کا ویسا ہی حق تھا جیسے باقی صحابہؓ کا مگر آپ نے یہ پسند نہ فرمایا کہ کوئی جنگی قیدی اپنے خاندان میں تقسیم کریں تا ایسا نہ ہو کہ آنے والے بادشاہ آپ کے اس نمونہ سے غلط نتائج اخذ کر کے دوسروں کے اموال اپنے لئے جائز سمجھ لیں۔ بیشک وہ اموال جن میں خدا تعالیٰ نے آپ کا اور آپ کے رشتہ داروں کا حق مقرر فرمایا تھا اُن میں سے آپ ضرورت پر خود بھی خرچ فرما لیتے تھے اور اپنے متعلقین کو بھی دے دیتے تھے۔ مگر جب تک کوئی چیز آپ کے حصہ میں نہ آجائے اُس وقت تک باوجود ایک با اقتدار بادشاہ ہونے کے ایک جَو کے دانہ کے برابر بھی کوئی چیز آپ اپنے عزیز سے عزیز رشتہ دار کو بھی نہیں دیتے تھے۔ اور ایک لحہ کے لئے بھی یہ پسند نہیں فرماتے تھے کہ قومی روپیہ ضائع ہو یا کسی ایسی جگہ خرچ ہو جو ناجائز ہو۔

ایک دفعہ صدقہ کی کچھ کھجوریں آئیں اور حضرت حسنؓ اور حسینؓ جو اُس وقت چھوٹے بچے تھے اُن کھجوروں سے کھیلنے لگے۔ کھیلتے کھیلتے اُن میں سے کسی نے ایک کھجور اپنے منہ میں ڈال لی۔ اچانک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی نظر جا پڑی۔ آپ نے فوراً اُس کے منہ سے انگلی ڈال کر کھجور نکال لی اور فرمایا تمہیں معلوم نہیں کہ یہ غرباء کا حق ہے۔ آلِ محمدؐ غرباء کا مال نہیں کھایا کرتی۔(بخاری کتاب الزکاة باب اخذ صدقة التمر عند صرام النخل)۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم قومی اموال کی کس سختی کے ساتھ محافظت فرمایا کرتے تھے اور اُس کے خرچ میں کتنی احتیاط ملحوظ رکھتے تھے۔

یہی کیفیت خلفاء راشدین کے زمانہ میں بھی جاری رہی اور انہوں نے بھی قیصر و کسریٰ سے زیادہ طاقت رکھنے کے باوجود سرکاری اموال کو کبھی بے جا خرچ نہیں کیا۔ بلکہ ایک ایک پیسہ اور ایک ایک پائی کی حفاظت کی اور اگر کسی جگہ انہوں نے روپیہ کا بے جا خرچ دیکھا تو بڑی سختی سے اُس کو روکا اور افسروں کو معزول کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ تاریخوں میں لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب اپنے زمانۂ خلافت میں بیت المقدس تشریف لے گئے تو آپ نے دیکھا کہ بعض صحابہؓ نے ریشمی کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ ریشمی کپڑوں سے مراد وہ کپڑے ہیں جن میں کسی قدر ریشم ہوتا ہے ورنہ خالص ریشم کے کپڑے تو سوائے کسی بیماری کے مردوں کو پہننے ممنوع ہیں۔ آپ اُن لوگوں پر سخت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ کیا تم اب ایسے آسائش پسند ہو گئے ہو کہ ریشمی کپڑے پہنتے ہو۔ اس پر اُن میں سے

ایک شخص نے اپنی قمیص اٹھا کر دکھائی تو معلوم ہوا کہ اُس نے نیچے موٹی اون کا سخت کُرتہ پہنا ہوا تھا۔ اُس نے حضرت عمرؓ سے عرض کیا کہ ہم نے ریشمی کپڑے اس لئے نہیں پہنے کہ ہم ان کو پسند کرتے ہیں بلکہ اس لئے پہنے ہیں کہ اس ملک کے لوگ بچپن سے ایسے امراء دیکھنے کے عادی ہیں جو نہایت شان و شوکت سے رہتے تھے۔ پس ہم نے بھی اپنے لباسوں کو صرف ملکی سیاست کے طور پر بدلا ہے ورنہ ہم پر اس کا کوئی اثر نہیں۔ صحابہؓ کے اس عمل سے پتہ لگتا ہے کہ انہوں نے اپنے غلبہ کے زمانہ میں بھی کبھی اسراف سے کام نہیں لیا اور اگر کسی مقام پر اُن سے کوئی لغزش بھی ہوئی تو خلفاء نے اُن کو ڈانٹا اور انہیں نصیحت کی کہ وہ اموال کے خرچ میں افراط و تفریط سے بچیں اور سادگی اختیار کریں۔

اس زمانہ میں زیادہ تر شادی بیاہ کے موقعہ پر لوگ اپنی ناک رکھنے کے لئے زیورات وغیرہ پر طاقت سے زیادہ روپیہ خرچ کر دیتے ہیں۔ جو انجام کار اُن کے لئے کسی خوشی کا موجب نہیں ہوتا کیونکہ انہیں دوسروں سے قرض لینا پڑتا ہے جس کی ادائیگی انہیں مشکلات میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اگر کسی کے پاس وافر روپیہ موجود ہو تو اُس کے لئے شادی بیاہ پر مناسب حد تک خرچ کرنا منع نہیں لیکن جس کے پاس نقد روپیہ موجود نہیں وہ اگر ناک رکھنے کے لئے قرض لے کر روپیہ خرچ کرے گا تو اس کا یہ فعل اسراف میں شامل ہوگا۔ مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اسراف کی شکلیں ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں۔ مثلاً اگر ایک شخص کی آمد دو چار ہزار روپیہ ماہوار ہے اور وہ پندرہ بیس روپے گز کا کپڑا پہنتا ہے یا پانچ سات سوٹ تیار کرا لیتا ہے تو اُس کے مالی حالات کے مطابق اسے ہم اسراف نہیں کہیں گے۔ لیکن اگر خدا نخواستہ اُس کی بیوی بچے بیمار ہو جائیں اور وہ ایسے ڈاکٹروں سے علاج کروائے جو قیمتی ادویات استعمال کروائیں اور ہزار میں سے پانچ سات سو روپیہ اس کا دواؤں پر ہی خرچ ہو جائے اور اس کے باوجود وہ اپنے کھانے پینے اور پہننے کے اخراجات میں کوئی کمی نہ کرے تو پھر اس کا یہی فعل اسراف بن جائے گا حالانکہ عام حالات میں یہ اسراف میں شامل نہیں تھا۔ اسی طرح جب بھی کسی خرچ کے مقابلہ میں دوسری ضروریات بڑھ جائیں تو اُس وقت پہلے خرچ کو اُسی شکل میں قائم رکھنا جس شکل میں پہلے تھا اسراف میں شامل ہو جائے گا۔ مثلاً اس زمانہ میں اسلام کی اشاعت کے لئے ہمیں کروڑوں روپیہ کی ضرورت ہے۔ مختلف ممالک اور اکناف سے آوازیں آ رہی ہیں کہ ہماری طرف ایسے لوگ بھیجے جائیں جو ہمیں اسلام کی تعلیم سکھائیں۔ ایسا لٹریچر بھیجا جائے جو ہمارے شبہات کا ازالہ کرے۔ اگر اس وقت ہماری جماعت کا کوئی فرد اپنے کھانے اور پینے اور پہننے کے اخراجات میں تخفیف نہیں کرتا اور زیادہ سے زیادہ روپیہ اسلام کی اشاعت کے لئے نہیں دیتا تو گو عام حالات میں اُس کا اچھا کھانا پینا اور پہننا اسراف میں شامل نہ ہو مگر موجودہ زمانہ میں اس کا اپنے کھانے پینے اور پہننے پر زیادہ خرچ کرنا یقیناً اسراف میں شامل ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ میں

نے جماعت میں **تحریکِ جدید** جاری کی اور اسے ہدایت کی کہ وہ ایک کھانا کھائے۔جن لوگوں کے پاس کپڑوں کے چند جوڑے موجود ہوں وہ اُن کے خراب ہونے تک محض شوق پورا کرنے کے لئے نئے جوڑے نہ بنوایا کریں۔جو لوگ نئے کپڑے زیادہ بنوایا کرتے ہوں وہ نصف یا تین چوتھائی یا 4/5 پر آجائیں۔عورتیں اپنے اوپر یہ پابندی عائد کریں کہ وہ محض پسند پر کپڑا نہیں خریدیں گی بلکہ ضرورت پر کپڑا لیں گی۔اور گوٹہ کناری اور فیتہ وغیرہ نہیں خریدیں گی نہ نئے نئے زیورات پر اپنا روپیہ برباد کریں گی۔اسی طرح میں نے ڈاکٹروں سے کہا ہے کہ وہ اپنا سارا زور لگائیں کہ روپوؤں کا کام پیسوں میں ہو اور جب تک وہ یہ نہ سمجھیں کہ بغیر قیمتی دوا کے استعمال کے مریض کی جان کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے اُس وقت تک قیمتی ادویات پر روپیہ خرچ نہ کروائیں۔وہ اپنے دماغ پر زور دے کر ایسے نسخے لکھیں جو سستے داموں تیار ہو سکیں۔اور پیٹنٹ ادویہّ استعمال کرا کے نئی نئی دواؤں کے تجربہ پر اپنے ملک کا روپیہ ضائع نہ کریں لیکن افسوس ہے کہ ڈاکٹروں نے میری یہ بات نہیں مانی اور مجھے اپنی ساری خلافت کی زندگی میں تلخ ترین تجربہ احمدی ڈاکٹروں کا ہوا ہے۔ولیمہ کے متعلق بھی میں نے ہدایت دی کہ اس موقعہ پر صرف چند دوستوں کو بُلا لینا کافی ہوتا ہے زیادہ لوگوں کو بُلا کر اپنا روپیہ ضائع نہیں کرنا چاہیے بلکہ یہ بھی کافی ہے کہ لوگ اپنا اپنا کھانا لا کر ولیمہ والے گھر میں بیٹھ کر کھالیں اور ایک آدمی کا کھانا اُس گھر والے کی طرف سے بھی ہو جائے۔یہ ہدایات میں نے اسی لئے دیں کہ اس زمانہ میں اسلام کو مالی قربانیوں کی ضرورت ہے۔اگر کھانے پینے پہننے اور آسائش و زیبائش کے کاموں پر ہی سارا روپیہ خرچ کر دیا جائے گا تو اسلام کی ضروریات کہاں سے پوری ہوں گی۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام ہر وقت ایک قسم کی قربانی کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ مختلف حالات میں مختلف قسم کی قربانیوں کا تقاضا کرتا ہے۔اگر ایسا نہ ہوتا تو حضرت ابوبکرؓ ایک خاص جنگ کے وقت اپنا سارا اور حضرت عمرؓ اپنا آدھا مال پیش نہ کرتے۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بیسیوں جنگیں ہوئی ہیں مگر حضرت ابوبکرؓ نے ہر جنگ کے موقعہ پر اپنا سارا مال اور حضرت عمرؓ نے اپنا آدھا مال نہیں دیا۔صرف ایک جنگ کے موقعہ پر حضرت عمرؓ کو یہ خیال آیا کہ آج زیادہ قربانی کا موقعہ ہے۔میں حضرت ابوبکرؓ سے بڑھ جاؤں اور اس خیال کے آنے پر وہ اپنا آدھا مال لے کر آ گئے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اس سے پہلے کبھی اپنا آدھا مال بھی نہیں دیا تھا۔ورنہ حضرت عمرؓ کو یہ کس طرح خیال آ سکتا تھا کہ میں اپنا آدھا مال دے کر حضرت ابوبکرؓ سے بڑھ جاؤں گا لیکن حضرت ابوبکرؓ اس موقعہ کی نزاکت کو دیکھ کر اپنا سارا مال دینے کا فیصلہ کر چکے تھے چنانچہ جب وہ اپنا سارا مال لے کر گئے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو اُن کے گھر کی حالت سے واقف تھے اسے دیکھتے ہی فرمانے لگے کہ ابوبکرؓ

اپنے گھر میں کیا چھوڑا۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا کہ خدا اور اُس کے رسول کا نام (ترمذی ابواب المناقب باب رجاء ان یکون ابوبکر ممن یدعی من جمیع ابواب الجنة) حضرت عمرؓ نے یہ بات سنی تو انہوں نے سمجھ لیا کہ میں ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کو کبھی زیادہ قربانیوں کی ضرورت ہوتی ہے اور کبھی کم۔ لیکن بہرحال ایک مومن کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے اخراجات کو ایک حد کے اندر رکھے تاکہ جب بھی قربانی کی آواز آئے وہ لبیک کہتے ہوئے اُس کی طرف دوڑ پڑے اور اسراف کی عادت اس کی راہ میں حائل نہ ہو۔

پھر فرماتا ہے وَ لَمْ یَقْتُرُوْا۔ عبادالرحمٰن کی ایک یہ بھی **علامت** ہے کہ وہ بخل سے بھی کام نہیں لیتے۔ جیسا کہ حلِّ لغات میں بتایا جاچکا ہے قاتر کے ایک معنے اُس شخص کے ہوتے ہیں جو مال کو جمع کرتا رہتا ہے اور اسی سے بُخل کے معنے نکالے گئے ہیں کیونکہ انسان تبھی مال جمع کرسکتا ہے جبکہ وہ خرچ نہ کرے۔ اور اُسی کو بخیل کہتے ہیں جو روپیہ کے ہوتے ہوئے اُسے اپنے جائز مصرف میں نہ لائے۔ پس قاتر کے اصل معنے یہ ہیں کہ جو مال جمع کرے اور اُن لوگوں پر خرچ نہ کرے جن پر خرچ کرنا اُس کے لئے ضروری ہو۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ جو شخص اپنے رشتہ داروں اور محتاجوں وغیرہ پر روپیہ خرچ نہیں کرتا وہ بُرا ہے کیونکہ جس کے پاس مال نہ ہو وہ بھی تو خرچ نہیں کرتا۔ پھر کیا وہ خدا تعالیٰ کے نیک بندوں میں سے نکل جائے گا؟ مثلاً ایک شخص خود بھوکا ہے اُس سے کوئی محتاج آکر مانگتا ہے کہ مجھے کھانے کو دو۔ لیکن وہ کچھ نہیں دیتا تو ایسا آدمی خدا تعالیٰ کے حضور بخیل نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ ہاں ایسا شخص جس کے پاس دوسرے کو دینے کے لئے موجود ہے مگر وہ پھر بھی نہیں دیتا۔ وہ بے شک اللہ تعالیٰ کے نزدیک گنہگار ہوگا۔ تو یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ خدائے رحمٰن کا وہ بندہ ہے جو خرچ نہیں کرتا بلکہ وَ لَمْ یَقْتُرُوْا فرمایا ہے۔ اور قاتر اُس کو کہتے ہیں جو مال جمع رکھے اور اپنے رشتہ داروں، مسکینوں اور محتاجوں وغیرہ پر خرچ نہ کرے۔ پس ایک ہی لفظ میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بتادیا کہ جس کے پاس مال نہ ہو اُس پر کوئی اعتراض نہیں۔ اعتراض صرف اس پر ہے جس کے پاس مال ہو اور وہ بجائے حاجتمندوں پر خرچ کرنے کے اُسے جمع کرتا رہے اور پھر اس لفظ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بتادیا کہ خالی مال جمع کرنا بُرا نہیں بلکہ مال کے ساتھ چمٹے رہنا اور اُسے اُن لوگوں پر خرچ نہ کرنا جن کی نگرانی یا خورد نوش کے اخراجات اُس کے ذمہ ہوں۔ یہ بُرا ہے اور اس سے ہر مومن کو اجتناب اختیار کرنا چاہیے۔

بخل ایک ایسا خطرناک عیب ہے جسے دنیا کی تمام قوموں کے ضابطۂ اخلاق میں بُرا قرار دیا گیا ہے چنانچہ اگر کسی کو بخیل کہہ دیا جائے تو وہ سمجھتا ہے کہ مجھے گالی دی گئی ہے۔ لوگ جب کسی کی مذمت کرنا چاہیں تو کہتے ہیں

''کنجوس مکھی چوس'' جس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ یہ شخص ایسا بخیل ہے کہ اگر مکھی بھی اُس کے کھانے میں گر پڑے تو یہ اُس کو بھی چوس لیتا ہے۔لیکن کنجوسی بعض نہایت معمولی اور چھوٹے چھوٹے امور کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔اگر ماں باپ بچپن میں ہی کوشش کریں تو وہ اپنی آئندہ نسل کو بخل کے مرض سے بچا سکتے ہیں۔بُخل کا مرض ایک تو اس طرح پیدا ہوتا ہے کہ جب کوئی فقیر دروازہ پر آتا ہے اور وہ خیرات مانگتا ہے تو بجائے اس کے کہ اُسے ملاطفت کے ساتھ کچھ دے کر رخصت کر دیا جائے بعض لوگ غصّہ سے کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ اسے کچھ نہ دیا جائے۔یہ خود کمائے اور کھائے۔چھوٹے بچے اُن کی بات سنتے ہیں تو اُن میں بھی بُخل کی عادت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جن بچوں کو بچپن میں اجابت روکنے کی عادت ہوتی ہے اُن میں بھی بڑے ہو کر بُخل کا مرض پیدا ہو جاتا ہے۔ جب وہ سمجھ دار ہو جاتے ہیں تو گو وہ اس عادت کو لغو سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں مگر بچپن کی اس عادت کا اُن کے اخلاق پر یہ اثر پڑتا ہے کہ وہ بڑے ہو کر جائز مصارف میں بھی اپنا مال خرچ نہیں کرتے اور اُسے روک کر بیٹھ جاتے ہیں جس کی وجہ سے وہ خود بھی ہر قسم کی سہولتوں سے محروم رہتے ہیں اور اپنوں اور بے گانوں کی نگاہ میں بھی انہیں کوئی عزّت حاصل نہیں ہوتی۔چنانچہ قرآن کریم نے بُخل کا ایک بہت بڑا نقصان یہی بیان کیا ہے کہ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ (محمد:۳۹) یعنی جو شخص بُخل کرتا ہے اُس کا نقصان خود اُسی کو ہوتا ہے کیونکہ بُخل کی وجہ سے نہ تو وہ اچھا کھانا کھاتا ہے نہ اچھا لباس پہنتا ہے۔نہ رہائش کے لئے کوئی مکان بنانے پر آمادہ ہوتا ہے، نہ بیمار ہونے پر دواؤں کے لئے روپیہ خرچ کرتا ہے۔نہ مصیبت میں اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے کام آتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خود بھی تکلیف میں زندگی بسر کرتا ہے اور اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے حلقہ میں بھی اُسے کسی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔اسی طرح جب وہ قومی کاموں کے لئے روپیہ صرف نہیں کرتا تو قوم بھی اُسے ذلیل سمجھنے لگ جاتی ہے۔لیکن خدائے رحمٰن کے بندے ان تمام عیوب سے پاک ہوتے ہیں۔وہ نہ تو اپنے روپیہ کو معصیت کے کاموں میں خرچ کرتے ہیں نہ غلط طور پر خرچ کرتے ہیں اور نہ خرچ میں جائز حدود سے تجاوز اختیار کرتے ہیں جو اسراف کی مختلف شکلیں ہیں اور نہ اپنے مالوں کو اس طرح روک کر بیٹھ جاتے ہیں کہ دولت کی ہوس میں اپنے فرائض اور واجبات کو بھی ترک کر دیں۔بلکہ اُن کا روّیہ ہمیشہ میانہ روی کا ہوتا ہے اور افراط و تفریط کا عیب اُن میں نہیں پایا جاتا۔

وَ الَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَ لَا يَقْتُلُوْنَ

اور وہ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اللہ (تعالیٰ) کے سوا کسی اور معبود کو نہیں پکارتے۔ اور نہ کسی جان کو جسے اللہ (تعالیٰ)

النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ لَا يَزْنُوْنَ ۚ وَ مَنْ

نے حفاظت بخشی ہو قتل کرتے ہیں سوائے (شرعی) حق کے۔ اور نہ زنا کرتے ہیں اور جو کوئی ایسا کام کرے گا وہ

يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴿۶۹﴾ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ

اپنے گناہ کی جزا کو دیکھ لے گا۔ قیامت کے دن اُس کے لئے عذاب زیادہ کیا جائے گا اور وہ اُس میں ذِلّت

الْقِيٰمَةِ وَ يَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ﴿۷۰﴾ اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ

کے ساتھ رہتا چلا جائے گا سوائے اس کے جس نے توبہ کر لی اور ایمان لایا اور ایمان کے مطابق

عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ

عمل کئے۔ پس یہ لوگ ایسے ہوں گے کہ اللہ (تعالیٰ) اُن کی بدیوں کو نیکیوں سے بدل دے گا۔

حَسَنٰتٍ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۷۱﴾ وَ مَنْ تَابَ وَ

اور اللہ (تعالیٰ) بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔ اور جو توبہ کرے اور اُس کے مطابق عمل کرے تو وہ شخص

عَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ﴿۷۲﴾

حقیقی طور پر اللہ (تعالیٰ) کی طرف جھکتا ہے۔

حلّ لُغات ۔اَلْاَثَامُ اَلْاَثَامُ: جَزَآءُ الْاِثْمِ یعنی اثام کے معنے گناہ کی سزا کے ہوتے ہیں۔(اقرب)

تفسیر ۔فرماتا ہے۔رحمٰن کے بندوں کی ایک یہ بھی **علامت** ہے کہ وہ شرک نہیں کرتے۔ اور کسی ایسی جان کو قتل نہیں کرتے جس کا قتل کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہوا ہے۔ ہاں خدا تعالیٰ کے مقرر کردہ طریق پر قتل کرنا پڑے تو ایسا کر دیتے ہیں۔ جیسے جہاد میں یا قاتل کو اُس کے قتل کی سزا دینے کے لئے یہ علامات بھی ہمیں رسول کریم

صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کی زندگیوں میں نہایت نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہیں۔انہوں نے توحید کی اشاعت کے لئے وہ وہ قربانیاں پیش کیں کہ آج بھی تاریخ کے صفحات میں ان کا ذکر پڑھ کر انسانی قلب لرز جاتا ہے۔ وہ خدائے واحد ویگانہ پر ایمان لانے کی وجہ سے قتل کئے گئے۔اُن کے اموال چھین لئے گئے۔اُن کی عورتوں کی آبروریزی کی گئی۔انہیں اپنے وطن سے بے وطن کیا گیا۔انہیں تپتی ریت پر لٹایا گیا۔اُن کے سینوں پر بڑے بڑے بھاری پتھر رکھ کر اُن پر جوتوں سمیت کودا گیا اور انہیں لات ومنات اور عزّیٰ کی پرستش پر مجبور کیا گیا مگر وہ لوگ خدا تعالیٰ کے عشق میں کچھ ایسے سرشار تھے کہ اُن کی زبانوں سے اگر کوئی فقرہ نکلا تو صرف یہی کہ خدا ایک ہے۔خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کفّارِ مکہ نے یہاں تک پیشکش کی کہ ہم آپ کو اپنا بادشاہ تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں صرف اتنا مطالبہ آپ منظور کر لیں کہ ہمارے بتوں کو بُرا بھلا نہ کہیں۔مگر اتنی بڑی پیشکش کے باوجود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے مطالبہ کو نہایت حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا اور ایک لمحہ کے لئے بھی یہ برداشت نہ کیا کہ خدائے واحد کی توحید میں کوئی خلل واقع ہو۔بلکہ ایک موقعہ پر آپ نے فرمایا کہ اگر یہ لوگ سورج کو میرے دائیں اور چاند کو میرے بائیں بھی لا کر کھڑا کر دیں تب بھی میں خدا تعالیٰ کی توحید کے اعلان سے باز نہیں رہ سکتا۔پھر آپ کی آنکھوں کے سامنے محض توحید کو تسلیم کرنے کے جُرم میں آپ کے عزیز ترین صحابہؓ پر بڑے بڑے مظالم توڑے گئے خود آپ کو اور آپ کے خاندان کو اُن کے پیہم مظالم کا تختۂ مشق بننا پڑا۔مگر آپ نے ان تمام تکالیف کے باوجود دنیا کی ہر اُس قوم سے لڑائی کی جو توحید کی دشمن تھی۔آپ نے مشرکین مکہ کا بھی مقابلہ کیا جو سینکڑوں بتوں کے پجاری تھے۔آپ نے عیسائیوں کا بھی مقابلہ کیا جو مسیح ناصری کو ابن اللہ کہتے تھے۔آپ نے یہود کا بھی مقابلہ کیا جو عزیر کو خدا تعالیٰ کا بیٹا قرار دیتے تھے آپ نے مجوسیوں کا بھی مقابلہ کیا جو آگ کے پجاری تھے اور آخر عرب میں ہی نہیں بلکہ ساری دنیا میں توحید کو غالب کر کے دکھا دیا اور بتوں کے پرستاروں کو خدائے واحد کے آستانہ پر لا ڈالا۔پھر جب آپؐ کی وفات کا وقت آیا تو حدیثوں میں آتا ہے کہ آپؐ کرب واضطراب کے ساتھ کبھی ایک کروٹ بدلتے اور کبھی دوسری اور بار بار فرماتے خدا تعالیٰ یہود اور نصاریٰ پر لعنت کرے کہ انہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔(بخاری کتاب المغازی باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم ووفاتہ وقول اللہ تعالیٰ۔۔۔)اس طرح آپ نے صحابہؓ کو نصیحت فرمائی کہ دیکھنا میری قبر کو کبھی سجدہ گاہ نہ بنانا۔دیکھنا میرے بشر ہونے کے مقام کو کبھی فراموش نہ کرنا۔ چنانچہ آپ کی اسی تعلیم اور تعہد کا یہ نتیجہ ہے کہ آج دنیا کے ہر شہر اور ہر گاؤں اور ہر قریہ میں دن کی روشنی اور رات کی تاریکیوں میں پانچ مرتبہ یہ آواز بلند ہوتی سُنائی دیتی ہے کہ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔

میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا تعالیٰ کے سوا اور کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے سچّے رسول ہیں۔ غرض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ نے توحید کا جھنڈا اتنی مضبوطی سے بلند کیا کہ وہ آج تک اپنی پوری شان کے ساتھ دنیا میں لہرا رہا اور کفار کے سینوں میں ناسُور ڈال رہا ہے۔ پس عباد الرحمٰن کی ایک بڑی علامت یہ ہے کہ وہ شرک کے کبھی قریب نہیں جاتے اور خدا تعالیٰ کی توحید کو زمین پر پھیلانے کے لئے ہر قسم کی جائز کوششیں عمل میں لاتے رہتے ہیں کیونکہ شرک خدا تعالیٰ کی صفتِ رحمانیت کے بالکل منافی ہے۔

اسی طرح عباد الرحمٰن کی ایک اور **علامت** یہ بتائی کہ وہ کسی کو ناجائز طور پر قتل نہیں کرتے۔ یہ علامت بھی اپنی پوری شان کے ساتھ ہمیں صحابہؓ کے مقدس وجود میں جلوہ گر دکھائی دیتی ہے۔ وہ اس حکم پر اتنی سختی سے عمل کرتے تھے کہ باوجود اس کے کہ وہ ایسی اقوام سے برسرِ پیکار رہے جو بزورِ شمشیر اُن سے اپنا مذہب بدلوانا چاہتی تھیں۔ پھر بھی اُن کی تلوار صرف اُن افراد پر اُٹھتی تھی جو عملاً جنگ میں شامل ہوں کسی عورت کسی بچے کسی بوڑھے کسی راہب اور کسی پنڈت یا پادری پر نہیں اٹھتی تھی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اسلام صرف لڑنے والے افراد سے جنگ کرنا جائز قرار دیتا ہے دوسرے افراد کو قتل کرنا خواہ وہ دشمن قوم سے ہی کیوں نہ تعلق رکھتے ہوں جائز قرار نہیں دیتا۔ آج دنیا کی بڑی بڑی حکومتیں جو اپنے آپ کو عدل و انصاف کا علمبردار قرار دیتی ہیں اور جن کا وجود امنِ عالم کے قیام کی ضمانت سمجھا جاتا ہے اُن کی یہ کیفیت ہے کہ وہ دشمن اقوام کو ہمیشہ ایٹمی ہتھیاروں سے ہلاک کرنے کی دھمکی دیتی رہتی ہیں بلکہ عملاً گذشتہ جنگِ عظیم میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرا کر لاکھوں بے گناہ جاپانی مردوں اور عورتوں اور بچوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور اسے امنِ عالم کے قیام کے لئے ایک بڑا بھاری کارنامہ قرار دے کر اسے سراہا گیا۔ لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے زمانہ میں کہیں ایسا ظلم دکھائی نہیں دیتا کہ برسرِ پیکار ہونے کی حالت میں بھی انہوں نے بے گناہ مردوں اور عورتوں اور بچوں کو تہ تیغ کیا ہو۔ مگر یہ لاکھوں افراد کے ناجائز خون سے اپنے ہاتھ رنگنے والے تو عدل و انصاف کے مجسمہ کہلاتے ہیں اور وہ مسلمان جنہوں نے اپنے پاؤں تلے کبھی ایک چیونٹی کو بھی نہیں مسلا تھا انہیں یہ لوگ ڈاکو اور لٹیرا قرار دیتے ہیں۔ ع

بہ بیں تفاوت راہ از کجا است تا بہ کُجا

پھر فرماتا ہے عباد الرحمٰن کی ایک یہ بھی **علامت** ہے کہ وہ زنا نہیں کرتے۔ اور جو کوئی ایسا کرے وہ اپنے وبال کو اس دنیا میں طرح طرح کی بیماریوں یا بدنامیوں کے ذریعہ دیکھ لے گا۔ اور اگلے جہان میں جو اس کو عذاب ملے گا وہ بہت زیادہ ہوگا۔ اور پھر وہاں بھی عذاب کے علاوہ بڑی بھاری رسوائی ہوگی۔ ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے زنا

کی حرمت ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے کہ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓی اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا (بنی اسرائیل: ۳۳) یعنی تم زنا کے قریب بھی نہ جاؤ کیونکہ وہ یقیناً ایک کھلی بے حیائی اور نہایت بُرا راستہ ہے۔ یعنی اوّل تو اس سے دل میں ناپا کی پیدا ہوتی ہے کیونکہ جرم کا احساس اور چوری کا خیال دل میں پیدا ہوتا ہے اور دوسرے یہ اُس مقصود کے حصول کے لئے جس کے لئے عورت اور مرد کے تعلقات قائم کئے جاتے ہیں ایک غلط راستہ ہے۔ کیونکہ شہوت کی اصل غرض بقائے نسل کی غرض پورا کرنا ہے اور ناجائز تعلقات سے اصل غرض برباد ہوجاتی ہے کیونکہ نسل محفوظ نہیں رہتی یا مشتبہ ہوجاتی ہے۔ پس اس راستہ سے اصل مقصد حاصل نہیں ہوسکتا اور اگر کبھی حاصل بھی ہوجائے تو سیدھے راستہ کو ترک کر کے ٹیڑھا راستہ اختیار کرنا کونسی عقلمندی ہے ہاں جو توبہ کریں گے اور رسمی ایمان کی بجائے حقیقی ایمان اپنے اندر پیدا کرلیں گے اور ایمان کے مناسبِ حال عمل کریں گے تو اللہ تعالیٰ اُن کی بدنامیوں کو نیک نامیوں سے اُن کی ذلت کو عزت سے اور اُن کے دکھوں کو انعام سے بدل دے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ اور جو شخص توبہ کرے اور اس کے مناسبِ حال عمل کرے تو اس کی یہ علامت نہیں کہ وہ صرف منہ سے توبہ کرے بلکہ اس کی علامت یہ ہے کہ اس شخص کا دل خدا تعالیٰ کی طرف جھکتا چلا جائے۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے گناہوں کی مغفرت کے لئے توبہ پر زور دیا ہے اور ایمان اور عمل صالح کا حصول اس کے بغیر ناممکن قرار دیا ہے۔ مگر دنیا میں بہت لوگ ہیں جو توبہ کی حقیقت سے ناواقف ہوتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ صرف منہ سے یہ کہہ دینے سے کہ ’’میری توبہ‘‘ توبہ مکمل ہوجاتی ہے۔ حالانکہ اس کے لئے سات امور کا ہونا ضروری ہے اور جب تک وہ سارے کے سارے موجود نہ ہوں اُس وقت تک توبہ کبھی بھی صحیح معنوں میں توبہ نہیں کہلا سکتی چنانچہ توبہ کے لئے **پہلی شرط** تو یہ ہے کہ انسان اپنے گذشتہ گناہوں کو یاد کرکے اور اُن کو اپنے سامنے لا کر اس قدر نادم ہو کہ گویا پسینہ پسینہ ہوجائے۔ **دوسری شرط** یہ ہے کہ پچھلے فرائض جس قدر رہ چکے ہیں اُن میں سے جن کو ادا کیا جا سکے اُن کو ادا کرنے کی کوشش کرے۔ مثلاً اگر صاحبِ استطاعت ہونے کے باوجود اُس نے حج نہیں کیا تھا تو اَب حج کرلے یا اگر زکوٰۃ نہیں دی تھی تو ساری عمر کو جانے دے اُسی سال کی زکوٰۃ دے دے۔ **تیسری شرط** یہ ہے کہ پچھلے گناہوں میں سے جن کا ازالہ ممکن ہو اُن کا ازالہ کرنے کی کوشش کرے۔ مثلاً اگر کسی کی بھینس چُرا کر اُس نے اپنے گھر رکھی ہوئی ہو تو اُسے واپس کردے۔ **چوتھی شرط** یہ ہے کہ جس شخص کو کوئی دکھ پہنچا یا ہو اُس کے دُکھ کا ازالہ کرنے کے علاوہ اُس سے معافی طلب کرے۔ یہ ایک باریک رُوحانی مسئلہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے بندوں کے گناہوں کی معافی کے لئے یہ شرط رکھی ہے کہ اُن کے متعلق بندوں سے ہی معافی طلب کی جائے اور اگر وہ معاف کردیں تو پھر

خدا تعالیٰ اُن کا مواخذہ نہیں کرتا۔شبلیؒ ایک بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں وہ خلافتِ عباسیہ کے دَور میں کسی علاقہ کے گورنر تھے۔ایک دفعہ وہ کسی کام کے سلسلہ میں بادشاہ سے مشورہ کرنے کے لئے بغداد آئے۔انہی دنوں ایک بہت بڑا جرنیل ایران کی مہم میں کامیابی حاصل کرکے واپس آیا اور بادشاہ نے اُس کے اعزاز میں دربار خاص منعقد کیا اور فیصلہ کیا کہ بھرے دربار میں اُسے خلعتِ فاخرہ دی جائے اور اُس کی عزت افزائی کی جائے۔اتفاق سے اس روز اُسے نزلہ کی شکایت تھی جب اُسے خلعت دیا گیا اور دربار میں چاروں طرف سے اُس پر پھول برسائے جانے لگے تو اُسے چھینک آ گئی اور ناک سے پانی بہ پڑا۔اُس نے جلدی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا مگر رومال موجود نہیں تھا۔یہ دیکھ کر اُس نے گھبراہٹ میں اُسی خلعت سے اپنی ناک پونچھ لی۔بادشاہ نے اُسے دیکھ لیا اور اُس نے سخت غضبناک ہو کر حکم دیا کہ اس شخص نے ہمارے خلعت کی ناقدری کی ہے اُس کا خلعت اتارلو اور اسے دربار سے نکال دو۔چنانچہ اُس کا خلعت اُتار لیا گیا اور اُسے ذلت کے ساتھ دربار سے نکال دیا گیا۔شبلیؒ جو یہ تمام نظارہ دیکھ رہے تھے یکدم اُن کی چیخ نکلی اور انہوں نے زاروقطار رونا شروع کر دیا۔بادشاہ نے حیران ہو کر پوچھا کہ یہ رونے کا کون سا مقام ہے ناراض تو میں جرنیل پر ہوا ہوں تم خواہ نخواہ کیوں روتے ہو۔وہ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے حضور میرا استعفیٰ منظور فرمائیں، بادشاہ نے پھر کہا یہ استعفیٰ کا کون سا موقعہ ہے۔انہوں نے کہا بادشاہ سلامت یہ شخص آج سے دو سال پہلے ایک خطرناک مہم پر روانہ کیا گیا تھا۔یہ رات اور دن دشمن کے مقابلہ میں رہا۔ہر روز موت اس کے سر پر منڈلاتی تھی اور ہر رات اس کی بیوی بیوگی کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے سوتی تھی۔یہ گھر سے بے گھر اور وطن سے بے وطن رہا۔جنگلوں میں دھکے کھاتا رہا۔مصائب اور آلام برداشت کرتا رہا اور آخر فتح یاب ہو کر واپس آیا۔آپ نے اس کی آمد کی خوشی میں یہ دربار منعقد کیا اور اُسے چند گز کپڑا خلعت کے طور پر عطا فرمایا۔مگر صرف اس لئے کہ اُس نے اُس خلعت سے اپنی ناک پونچھ لی آپ اتنے غضبناک ہوئے کہ آپ نے اُسے دربار سے باہر نکال دیا۔اور اس کا خلعت چھین لیا۔میں اس نظارہ کو دیکھ کر سوچتا ہوں کہ جب چند گز کپڑے کی آپ ہتک برداشت نہیں کر سکے تو میرا خدا جس نے مجھے کروڑوں کروڑ نعمتیں عطا فرمائی ہوئی ہیں اور جس کی نعمتوں کی میں روزانہ ہتک کرتا ہوں وہ قیامت کے دن مجھ سے کیا سلوک کرے گا۔میں اب اس ملازمت سے باز آیا۔میرا استعفیٰ قبول کیجیئے۔میں اب اپنی بقیہ عمر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں ہی بسر کروں گا۔چنانچہ وہ استعفیٰ دے کر چلے گئے۔اور پھر اپنے گناہوں کی معافی کے لئے مختلف بزرگوں کے پاس گئے مگر وہ اتنے ظالم مشہور تھے کہ کسی نے اُن کی بیعت لینے کی جرأت نہ کی۔آخر وہ حضرت جنیدؒ کے پاس پہنچے۔انہوں نے فرمایا۔تمہاری توبہ قبول ہو سکتی ہے مگر شرط یہ ہے کہ پہلے تم اُس شہر میں واپس جاؤ

جہاں تم گورنر رہے تھے اور ایک ایک دروازہ پر پہنچ کر لوگوں سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو اور جب سب لوگوں سے معافی لے چکو تو پھر میرے پاس آؤ۔ چنانچہ وہ اس علاقہ میں گئے اور انہوں نے گھر گھر پھر کر لوگوں سے معافیاں لینی شروع کیں۔ پہلے تو لوگ سمجھے کہ یہ رسمی طور پر معافی مانگ رہے ہیں۔مگر جب انہوں نے دیکھا کہ شبلیؒ معافی بھی مانگتے ہیں اور اپنے گناہوں پر ندامت کے آنسو بھی بہاتے ہیں تو انہوں نے سمجھ لیا کہ آج اس شخص کے دل پر بھی خدائے رحمٰن کی حکومت قائم ہوگئی ہے۔ چنانچہ پھر تو یہ کیفیت ہوئی کہ جب وہ معافی مانگتے تو لوگ کہتے آپ ہمیں کیوں شرمندہ کرتے ہیں آپ تو ہمارے قابلِ احترام بزرگ ہیں۔غرض اس طرح انہوں نے گھر گھر پھر کر معافی حاصل کی اور پھر وہ حضرت جنیدؒ کے پاس آئے۔حضرت جنیدؒ نے جب دیکھا کہ انہوں نے سچے طور پر توبہ کر لی ہے تو انہوں نے اُس کی بیعت قبول کی اور پھر اُن کی تربیت میں انہوں نے اتنی بڑی ترقی کی کہ آج شبلیؒ بھی اولیاء امّت میں سے سمجھے جاتے ہیں (تذکرۃ الاولیاء از سید رئیس احمد صفحہ ۳۴۔۳۵ ذکر ابوبکر شبلی)۔پس توبہ کی ایک ضروری شرط یہ ہے کہ جن لوگوں کو کوئی دکھ پہنچایا ہو اور اُن کی رضا حاصل کرنا ممکن ہو اُن سے معافی طلب کی جائے۔مگر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ خدا تعالیٰ بڑا ستار ہے وہ انسان کی بڑی بڑی برائیوں پر پردہ ڈالے رکھتا ہے۔اس لئے انسان کو چاہیے کہ اپنی ستاری آپ بھی کرے اور وہ گناہ جن کو خدا تعالیٰ نے چُھپا رکھا ہو اُن کو خود ظاہر نہ کرے مثلاً کسی کی چوری کی ہو تو اُسے یہ نہیں چاہیے کہ خود جا کر اُسے بتلائے کہ میں نے تمہاری چوری کی تھی۔ایسا کرنا بجائے خود گناہ ہوگا۔ہاں بعض گناہ ایسے ہوتے ہیں جو اَور لوگوں کو بھی معلوم ہوتے ہیں۔مثلاً اگر وہ کسی کو گالی دیتا ہے یا کسی کو پیٹنے لگ جاتا ہے تو اُس کا اَوروں کو بھی علم ہوتا ہے۔ایسے گناہوں کا ازالہ کرنا چاہیے اور جن لوگوں کو دُکھ پہنچایا گیا ہو اُن سے معافی طلب کرنی چاہیے۔

پانچویں شرط یہ ہے کہ جن لوگوں کو اُس نے نقصان پہنچایا ہو اُن سے مقدور بھر احسان کرے اور اگر کچھ نہیں کر سکتا تو اُن کے لئے دعا ہی کرے۔اولیا کرام نے بھی لکھا ہے کہ اگر کسی نے دوسرے کا مال ناجائز طور پر لیا ہو اور اُس کے ادا کرنے کی طاقت نہ ہو تو وہ خدا تعالیٰ سے دُعا کرے کہ الٰہی مجھے تو اس کا مال دینے کی طاقت نہیں تو اپنے پاس سے ہی اسے دیدے اور اس کمی کو پورا فرما دے۔

چھٹی شرط یہ ہے کہ وہ اپنے دل میں آئندہ گناہ نہ کرنے کا پختہ عہد کرے اور فیصلہ کرے کہ اب میں کوئی گناہ نہیں کروں گا۔

ساتویں شرط یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کو نیکی کی طرف رغبت دلانا شروع کر دے۔اور اپنے دل کو پاکیزہ

بنانے کی کوشش کرے تاکہ آئندہ ہر قسم کے نیک کاموں میں وہ دلی شوق سے حصہ لے سکے۔

یہ سات باتیں توبہ کے لئے ضروری ہیں۔ جب تک یہ تمام شرائط نہ پائی جائیں کوئی توبہ مکمل نہیں کہلا سکتی۔

بعض لوگ توبہ کے مسئلہ کے متعلق اپنی نادانی سے یہ خیال کرتے ہیں کہ توبہ کا دروازہ کھولنے سے بدی کا دروازہ بھی ساتھ ہی کھل جاتا ہے۔ اور بجائے اخلاق میں ترقی کرنے کے انسان بداخلاقی کے ارتکاب پر اور بھی دلیر ہوجاتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میں جب چاہوں گا توبہ کرلوں گا اور خدا سے صلح کرلوں گا۔ لیکن یہ خیال بالکل غلط اور توبہ کی حقیقت کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ ''جب چاہوں گا توبہ کرلوں گا'' کا خیال کبھی ایک عقلمند انسان کے دل میں پیدا ہی نہیں ہوسکتا کیونکہ اُسے کیا معلوم ہے کہ میں کب مروں گا۔ اگر اچانک موت آجائے تو توبہ کس وقت کرے گا۔

علاوہ ازیں توبہ کی حقیقت کو یہ لوگ نہیں سمجھتے۔ توبہ کوئی آسان امر نہیں اور نہ انسان کے اختیار میں ہے کہ وہ جب چاہے اپنی مرضی سے توبہ کرلے۔ کیونکہ توبہ اُس عظیم الشان تغیّر کا نام ہے جو انسان کے قلب کے اندر پیدا ہوکر اس کو بالکل گداز کر دیتا اور اُس کی ماہیت کو ہی بدل ڈالتا ہے۔

توبہ کے معنے جیسا کہ اوپر بتایا جاچکا ہے اپنے پچھلے گناہوں پر شدید ندامت کا اظہار کرنے اور آئندہ کے لئے پورے طور پر خدا تعالیٰ سے صلح کر لینے اور اپنی اصلاح کا پختہ عہد کر لینے کے ہیں۔ اب یہ حالت یکدم کس طرح پیدا ہوسکتی ہے۔ یہ حالت تو ایک لمبی کوشش اور محنت کے نتیجہ میں پیدا ہوگی۔ ہاں شاذ و نادر کے طور پر یکدم بھی پیدا ہوسکتی ہے مگر جب بھی ایسا ہوگا کسی عظیم الشان تغیّر کی وجہ سے ہوگا جو آتش فشاں مادہ کی طرح اُس کی ہستی کو ہی بالکل بدل دے۔ اور ایسے تغیرات بھی انسان کے اپنے اختیار میں نہیں ہیں۔ پس توبہ کی وجہ سے کوئی شخص گناہ پر دلیر نہیں ہوسکتا۔ بلکہ توبہ اصلاح کا حقیقی علاج اور مایوسی کو دُور کرنے کا ایک زبردست ذریعہ ہے جو انسان کو کوشش اور ہمت پر اکساتا ہے۔ اور یہ دھوکا کہ توبہ گناہ پر اکساتی ہے محض عربی زبان کی ناواقفیت اور اس خیال کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے کہ توبہ اس امر کا نام ہے کہ انسان کہہ دے کہ یا اللہ میرے گناہ معاف کر حالانکہ گناہوں کی معافی طلب کرنے کا نام توبہ نہیں استغفار ہے۔ توبہ گناہوں کی معافی طلب کرنے کو نہیں کہتے بلکہ گناہوں کی معافی سچی توبہ کا صحیح نتیجہ ہوتا ہے۔ اور اس دروازہ کو کھول کر اسلام نے انسانی روح کو مایوسی کا شکار ہونے سے بچا لیا ہے بلکہ اُس کے لئے لامتناہی ترقیات کا دروازہ کھول دیا ہے کیونکہ جب انسان کو معلوم ہوجائے کہ اُس کے لئے ترقی کا دروازہ کھلا ہے اور وہ بھی پاکیزگی حاصل کرسکتا اور خدا تعالیٰ کا مقرب بن سکتا ہے تو وہ ہمت نہیں ہارتا اور اپنی اصلاح کی فکر میں لگا رہتا ہے اور آخر وہ اس مقصد میں کامیاب ہوجاتا ہے اور اُس کی روح ہر قسم کی سفلی آلائشوں سے پاک ہوکر عالم بالا کی طرف پرواز کرنے لگتی ہے۔

وَ الَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَ اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا

اور وہ لوگ بھی (اللہ کے بندے ہیں) جو جھوٹی گواہیاں نہیں دیتے اور جب لغو باتوں کے پاس سے گذرتے ہیں تو

كِرَامًا ﴿۷۳﴾

بزرگانہ طور پر (بغیر اُن میں شامل ہونے کے) گذر جاتے ہیں۔

حلّ لُغَات۔ اَلزُّوْرُ اَلزُّوْرُ: اَلْكِذْبُ۔ زور کے معنے جھوٹ کے ہیں۔ نیز اس کے معنے ہیں اَلشِّرْكُ بِاللّٰهِ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا۔ مَجْلِسُ الْغِنَاءِ: گانے کی مجلس مَا يَعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ اللہ کے سوا معبودانِ باطلہ جن کی عبادت کی جاتی ہے۔ اَلْقُوَّةُ۔ طاقت۔ لِيْنُ الثَّوْبِ: کپڑے کی نرمی۔ اسی طرح زُور کے ایک معنے عقل کے بھی ہیں۔ (اقرب)

كِرَامٌ كِرَامٌ كَرِيْمٌ کی جمع ہے اور اَلْكَرِيْمُ کے معنے ہیں ذُوالْكَرَمِ: عزت والا قِيْلَ الْكَرِيْمُ قَدْ يُطْلَقُ عَلَى الْجَوَادِ الْكَثِيْرِ النَّفْعِ۔ بعض ائمہ لُغت کہتے ہیں کہ کریم کا لفظ سخی اور نفع رساں شخص کے لئے بولا جاتا ہے۔ وَقَدْ يُطْلَقُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ عَلٰى اَحْسَنِهٖ كَمَا قِيْلَ اَلْكَرِيْمُ صِفَةٌ مَا يُرْضَى وَيُحْمَدُ فِيْ بَابِهٖ۔ نیز کریم کا لفظ ہر اس وجود کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی نوع میں سے اعلیٰ درجہ کا ہو۔ اسی طرح کریم کا لفظ ہر اُس چیز کی حقیقت کے طور پر استعمال ہوتا ہے جو اپنی نوع میں اعلیٰ درجہ کی ہو اور ہر شخص کو پسند آئے۔ چنانچہ کہتے ہیں رِزْقٌ كَرِيْمٌ یعنی اعلیٰ درجہ کا اور اتنا کثیر رزق جو پسند کیا جائے۔ نیز کہتے ہیں قَوْلٌ كَرِيْمٌ اور اس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ نرم اور عمدہ بات اسی طرح کہتے ہیں كِتَابٌ كَرِيْمٌ اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایسی کتاب جو اپنے الفاظ، معانی اور فوائد میں بے نظیر اور اعلیٰ درجہ کی ہو۔ (اقرب)

تفسیر۔ فرماتا ہے۔ رحمٰن کے بندوں کی ایک یہ بھی علامت ہے کہ وہ زُور کے ساتھ گواہی نہیں دیتے زُور کے ایک معنے جیسا کہ حلّ لغات میں بتایا جا چکا ہے جھوٹ کے بھی ہیں۔ پس اس لحاظ سے لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ کے معنے یہ ہیں کہ لَا يَشْهَدُوْنَ بِالزُّوْرِ یا لَا يَشْهَدُوْنَ شَهَادَةَ الزُّوْرِ۔ یعنی عبادالرحمٰن کی ایک یہ علامت ہے کہ وہ جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔

حقیقت یہ ہے کہ توحید کے بعد سب سے بڑی نیکی اور سب سے بڑا مشکل کام جو اس دنیا میں انسان کے

سامنے پیش آتا ہے وہ سچائی ہی ہے۔ ہزاروں انسان ایسے دیکھے جاتے ہیں جو رحم کرنے والے بھی ہوتے ہیں۔ انصاف کرنے والے بھی ہوتے ہیں لیکن جب انہیں گواہی دینی پڑے اور وہ یہ دیکھیں کہ اُس کے نتیجہ میں اُن کی اپنی ذات کو یا اُن کے کسی رشتہ دار اور دوست کو نقصان پہنچے گا تو وہ اس میں کچھ نہ کچھ ضرور تبدیلی کر دیں گے۔ اور یہ مرض اس قدر پھیل گیا ہے کہ ہمارے ملک میں لوگ بڑی دلیری کے ساتھ قسمیں کھا کھا کر جھوٹ بولتے ہیں اور ساتھ ہی اس بات پر ناراض بھی ہوتے ہیں کہ اُن کے جھوٹ کو سچ کیوں نہیں مانا جاتا۔ عدالتوں میں پہلے یہ رواج تھا کہ گواہ کے ہاتھ میں قرآن کریم دے کر اُس سے قسم لیتے تھے اور اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ قرآن کریم میں جو وعید نازل ہوئے ہیں انہیں مدّنظر رکھتے ہوئے میں قسم کھاتا ہوں اور اگر میری قسم جھوٹی ہو تو مذکورہ وعید اور سزائیں مجھے ملیں۔ لیکن اُن گواہوں میں سے کئی ایسے ہوتے تھے جو قسم کھا کر بھی جھوٹ بولتے تھے۔ مرزا سلطان احمد صاحب مرحوم جو ہمارے بڑے بھائی تھے اور ای۔اے۔سی تھے۔ وہ اپنا تجربہ سنایا کرتے تھے کہ جتنے جوش سے کوئی شخص قرآن کریم ہاتھ میں لے کر میرے سامنے گواہی دیتا تھا۔ میرے تجربہ میں اُتنا ہی وہ جھوٹا ہوتا تھا۔ وہ ایک لطیفہ سنایا کرتے تھے کہ ایک شخص جو میرا اچھا واقف تھا اُس کا مقدمہ میرے سامنے پیش ہوا۔ وہ کہنے لگا مجھے کوئی اور تاریخ دی جائے کیونکہ جو گواہ میں نے پیش کرنے تھے وہ فلاں فلاں وجہ سے حاضر نہیں ہو سکتے۔ میں نے ہنس کر کہا میں تو تمہیں بڑا عقلمند اور ہوشیار آدمی سمجھا کرتا تھا۔ لیکن اب میری طبیعت پر یہ اثر ہوا ہے کہ تم بڑے بے وقوف ہو۔ وہ کہنے لگا کیوں۔ میں نے کہا گواہوں کے لئے جگہ اور وقت کی کیا ضرورت ہے۔ اگر تمہارے پاس کچھ ہے تو روپیہ اٹھنی دے کر بعض آدمی گواہی کے لئے لے آؤ۔ چنانچہ وہ باہر چلا گیا اور عملی طور پر تھوڑی دیر کے بعد ہی کچھ گواہ لے آیا۔ گواہی لیتے وقت میں ہنستا بھی جاؤں اور اُن سے مذاق بھی کرتا جاؤں۔ وہ لوگ قرآن کریم سر پر رکھ کر اور قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ واقعہ یوں ہوا ہے حالانکہ تھوڑی دیر ہوئی میں نے خود مدعی کو اس غرض کے لئے باہر بھیجا تھا کہ وہ کچھ دے دلا کر چند گواہ لے آئے۔ جب وہ گواہی دے چکے تو میں نے انہیں پکڑا اور اُن سے کہا کہ تم بڑے کذاب ہو۔ تمہیں واقعہ کا کچھ بھی علم نہیں لیکن محض چند ٹکوں کی وجہ سے تم اتنا جھوٹ بول رہے ہو کہ قرآن کریم کی بھی پروا نہیں کرتے۔ جس قوم کے افراد کی یہ حالت ہو اُس کا یہ شور مچانا کہ ہم جیتتے کیوں نہیں بالکل غلط بات ہے۔ دنیا میں وہی قومیں جیتا کرتی ہیں جن میں صداقت اور راستبازی ہوتی ہے۔ میں عیسائی دنیا کو دیکھتا ہوں کہ انہوں نے مشق کے ساتھ اپنے اندر سچائی کی اتنی عادت پیدا کر لی ہے کہ جہاں حکومت کی خاطر وہ ہر قسم کا جھوٹ بول لیتے ہیں وہاں جب ذاتیات کا سوال آتا ہے تو وہ جھوٹ نہیں بولتے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ یورپ اور امریکہ کی ترقی سائنس کی

وجہ سے ہوئی ہے حالانکہ اُن کی ترقی نہ سائینس کی وجہ سے ہوئی ہے اور نہ گولہ بارود کی وجہ سے ہوئی ہے بلکہ اُن کی ترقی محض اخلاق کی وجہ سے ہوئی ہے۔ انگریزی عدالتوں میں چلے جاؤ اور وہاں اُن کے واقعات دیکھو۔ جج پوچھتا ہے تم نے یہ جرم کیا ہے وہ کہتا ہے ہاں کیا ہے۔ پھر پوچھتا ہے تم فلاں جگہ پر تھے۔ وہ کہتا ہے جی ہاں تھا۔ ہماری عدالت میں چلے جاؤ۔ چور کو پولیس والے عین سیندھ کے اوپر سے پکڑ کر لاتے ہیں اور جج پوچھتا ہے تم وہاں تھے تو وہ کہتا ہے۔ میں تو اس محلہ میں تھا ہی نہیں۔ وہ پوچھتا ہے تم کہاں تھے۔ وہ کہتا ہے میں تو فلاں شہر میں تھا۔ پھر وہ پوچھتا ہے ارے پولیس نے تم کو وہاں سے نہیں پکڑا۔ وہ کہتا ہے جھوٹ ہے۔ ان کو مجھ سے فلاں پرانی عداوت تھی اس کی وجہ سے یہ مجھے پکڑ کر لے آئے ہیں۔ غرض شروع سے لے کر آخر تک جھوٹ ہی جھوٹ چلتا ہے اور وہاں گو مجرم اپنے بچاؤ کی بھی کوشش کرتا ہے۔ ٹرِک Trick بھی کرتا ہے۔ لیکن غیر ضروری ٹرِک Trick نہیں کرتا۔ اور یہاں غیر ضروری جھوٹ بولا جاتا ہے۔ مثلاً چوری کے ساتھ اس امر کا کوئی تعلق نہیں کہ اُس نے اُس وقت کالا کوٹ پہنا ہوا تھا یا لال لیکن اگر وہ کہیں گے کہ کالا کوٹ پہنا ہوا تھا تو یہ کہے گا نہیں میں نے تو لال پہنا ہوا تھا۔ یا مثلاً وہ کہہ دیں گے کہ تمہارے ہاتھ میں چھڑی تھی اب اس کا چوری کے ساتھ کوئی تعلق نہیں لیکن یہ کہے گا۔ نہیں میرے ہاتھ میں چھڑی نہیں تھی۔ میرے ہاتھ میں قرآن تھا۔ غرض یہ غیر ضروری جھوٹ جس کا مقدمہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا وہ بھی یہ بولتا ہے اور ہر بات میں اُن کی تردید کرتا چلا جائے گا اور کہے گا یہ نہیں تھا وہ تھا۔ لیکن یورپ میں چلے جاؤ۔ سو میں سے ننانوے باتیں ملزم مان لے گا۔ کوئی ایک اپنی جان بچانے کے لئے ٹرِک Trick بھی کر جائے گا لیکن باقی سب باتوں کے متعلق کہے گا کہ ٹھیک ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کا کچھ نہ کچھ باعث آجکل کی اخلاقی حالت بھی ہے۔ جن لوگوں کے سامنے آج کل مقدمات پیش ہوتے ہیں وہ سچ کی قیمت نہیں سمجھتے وہ خیال کرتے ہیں کہ اس نے جتنا سچ بولا ہے مجبوراً بولا ہے ورنہ اور سچ ابھی اس کے پیچھے ہے۔ مثلاً ایک شخص نے دوسرے کو تھپڑ مار دیا۔ وہ کہتا ہے میں نے تھپڑ اس لئے مارا تھا کہ مجھے اشتعال آ گیا تھا۔ لیکن اب بجائے اس کے کہ جج اس کی قدر کرے اور کہے کہ اس نے سچ بولا ہے وہ کہتا ہے کہ اس نے ضرور پانچ تھپڑ مارے ہوں گے۔ صرف ایک تھپڑ کا اس نے اقرار کیا ہے۔ غرض جھوٹ دنیا میں اتنا سرائت کر گیا ہے کہ کیا جج اور کیا وکیل اور کیا دوسرے لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ کوئی شخص سو فیصدی بھی سچ بول سکتا ہے۔ چونکہ اُن کا اپنا ماحول ایسا ہوتا ہے کہ اُن کے دوست اور رشتہ دار جھوٹ بولتے ہیں اس لئے اگر ان کے سامنے کوئی سچ بولے تو اس کی بھی قدر نہیں کی جاتی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جھوٹ لوگ ضرور بولتے ہیں اس لئے اس نے بھی کچھ نہ کچھ جھوٹ ضرور بولا ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سچ بولنے والا گھبرا جاتا ہے اور گھبرا کر وہ خود بھی جھوٹ

بولنے لگ جاتا ہے۔لیکن مومن کو یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ اس کے گردوپیش کے لوگ کیا کہتے ہیں۔ بلکہ اُسے یہ دیکھنا چاہیے کہ خدا کیا کہتا ہے۔آخر ایمان کے کچھ نہ کچھ معنے تو ہونے چاہئیں۔جب ایک شخص ایمان کی وجہ سے ساری دُنیا سے لڑائی جھگڑا کرتا ہے فساد مول لیتا ہے تو اس کے کچھ معنے تو ہونے چاہئیں۔اور ایمان کے کم سے کم معنے یہ ہیں کہ ایک انسان یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اُسے خدا دوسری چیزوں سے مقدم ہے۔اب جن چیزوں کو وہ مؤخر قرار دیتا ہے اگر اُن کو مقدم کرنے لگ جائے تو اس کا ایمان کہاں باقی رہا۔ایک طرف خدا کہتا ہے کہ سچ بولو اور دوسری طرف اس کے ساتھی کہتے ہیں کہ جھوٹ بولو۔چاہے وہ منہ سے کہیں یا عمل سے دنیا میں دونوں طریق ہوتے ہیں۔کبھی انسان دوسرے کو کہتا ہے کہ جھوٹ بولو اور کبھی دوسرا جھوٹ بولتا ہے تو اُسے منع نہیں کرتا۔اور اس طرح جھوٹ کی تائید کرنے والا بن جاتا ہے۔بہرحال خدا کا منشاء یہ ہے کہ ہم سچ بولیں۔اب اگر ہم جھوٹ بولیں اور سچائی کو چھپائیں تو ہماری نگاہ میں خدا کی کوئی قدر نہ رہی۔یا یوں کہو کہ ہم خدا کی بادشاہت کو قائم کرنے کی بجائے شیطان کی بادشاہت کو دنیا میں قائم کرنے والے بن جائیں گے۔خدا کی بادشاہت تو اسی صورت میں قائم ہوسکتی ہے جب سچی گواہی دیتے وقت انسان نہ اپنے باپ سے ڈرے نہ اپنے بیٹے سے ڈرے نہ ماں سے ڈرے نہ بھائی سے ڈرے نہ دوست سے ڈرے اور نہ کسی اور رشتہ دار سے ڈرے۔ایک باپ اگر جھوٹ کی جرأت کرتا ہے تو اسی لئے کہ وہ سمجھتا ہے میرا بیٹا میری تائید کرے گا یا میری بیوی میری تائید کرے گی لیکن اگر عدالت میں معاملہ پیش ہو اور بیٹا کہے کہ یہ ہیں تو میرے باپ لیکن انہوں نے یہ بات کی ہے۔بیوی کہے کہ یہ ہیں تو میرے خاوند لیکن انہوں نے یہ بات کی ہے۔تو دوسرے ہی دن وہ جھوٹ چھوڑ دے گا۔وہ اگر جھوٹ بولتا ہے تو اس لئے کہ وہ سمجھتا ہے اس کے افعال پر پردہ پڑا رہے گا۔ بھائی اس لئے جھوٹ بولتا ہے کہ دوسرا بھائی اُس کی ہاں میں ہاں ملا دے گا۔بیٹا اس لئے جھوٹ بولتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے میرا باپ میری تائید کرے گا۔خاوند اس لئے جھوٹ بولتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے میری بیوی میرے عیب کو چھپائے گی۔اور میری تصدیق کرے گی بیوی اگر جھوٹ بولتی ہے تو اس لئے کہ وہ سمجھتی ہے میرا خاوند میرا ساتھ دے گا۔لیکن اگر وہ سچے مسلمان ہوں تو باپ کے خلاف بیٹا گواہی دینے کے لئے کھڑا ہو جائے گا اور خاوند کے خلاف بیوی گواہی دینے کے لئے کھڑی ہو جائے گی اور وہ بالکل گھبرا جائے گا۔اور کہے گا ایسی حالت میں میرا جھوٹ بولنا بے فائدہ ہے اور اس روح کا اپنے اندر قائم کرنا کوئی بڑی بات نہیں۔اگر ہر بچہ ہر بوڑھا ہر جوان ہر مرد اور ہر عورت یہ عہد کرلے کہ میں نے سچ بولنا ہے چاہے اس کے نتیجہ میں مَیں کسی مقدمہ میں پھنس جاؤں یا پھانسی پر چڑھ جاؤں تو تھوڑے دنوں میں ہی تم اپنے اندر ایک عظیم الشان تغیر محسوس کرنے لگو گے۔یہ مت خیال کرو کہ سچ بولنے پر پھانسی

ملتی ہے۔ جو شخص سچ بولنے والا ہو وہ ایسے کام ہی نہیں کرتا جن کے نتیجہ میں اُسے پھانسی ملے لیکن جھوٹ بولنے والا سمجھتا ہے کہ اگر میں نے جھوٹ بولا تو شاید بچ جاؤں اس لئے وہ دلیری سے ایسے افعال میں مبتلا ہو جاتا ہے جن کا نتیجہ بعض دفعہ نہایت خطرناک ہوتا ہے اور یا پھر سچ بولنے والا اُس وقت پھانسی چڑھتا ہے جب وہ سمجھتا ہے کہ اب میرا مذہبی فرض ہے کہ میں اپنی جان پیش کر دوں۔ پھر وہ دلیری کے ساتھ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے بے شک پھانسی دے دو۔

غرض سچائی ایک بڑی اہمیت رکھنے والی چیز ہے۔ انبیاء نے اس پر خاص زور دیا ہے اور انسانی اخلاق کا یہ ایک بنیادی حصہ ہے۔ مگر آج کل سیاسی اور قومی مفاد کی خاطر جھوٹ کو جھوٹ سمجھا ہی نہیں جاتا۔ بلکہ اُسے ایک نہایت ضروری چیز قرار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ جھوٹ فطرت کے خلاف ہے جھوٹ اس چیز کا نام ہے کہ کان نے جو کچھ سنا ہو اس کے متعلق کہہ دیا جائے کہ میں نے نہیں سنا۔ آنکھ نے جو کچھ دیکھا ہو اُس کے متعلق کہہ دیا جائے کہ میں نے نہیں دیکھا۔ ہاتھ نے ایک چیز اٹھائی ہو لیکن انسان یہ کہہ دے کہ میرے ہاتھ نے فلاں چیز نہیں اٹھائی۔ ایک شخص کے پاؤں ایک طرف چلیں لیکن وہ کہہ دے کہ میرے پاؤں اس طرف نہیں چلے۔ گویا انسان غیر کی نہیں اپنی تردید کرتا ہے۔ اور اس سے زیادہ فطرت کے خلاف اور کیا چیز ہوگی۔ شبہ اس چیز میں ہو سکتا ہے جس میں قیاس کا دخل ہو۔ حواسِ خمسہ کے افعال پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور حواسِ خمسہ کے افعال کے خلاف بات کہنے کو جھوٹ کہتے ہیں۔ جو شخص حواسِ خمسہ کی تردید کرتا ہے وہ گویا اپنی زبان، ہاتھ، پاؤں، ناک اور کان کی تردید کرتا ہے اور پھر وہ اس میں سب سے زیادہ لذت محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے خلاف آپ گواہی دے رہا ہے۔ ایک انسان کے ہاتھ ایک چیز کو پکڑتے ہیں اور وہ کہتا ہے میں نے فلاں چیز نہیں پکڑی تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں کو کہتا ہے تم نے فلاں چیز نہیں پکڑی۔ ایک چیز اس کی زبان چکھتی ہے لیکن وہ کہتا ہے میں نے فلاں چیز نہیں چکھی۔ تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی زبان سے کہتا ہے کہ تم نے فلاں چیز نہیں چکھی یا اس کے کان ایک بات سنتے ہیں اور وہ اس کا انکار کر دیتا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے کانوں سے کہتا ہے کہ تم نے فلاں بات نہیں سُنی۔ اب یہ کتنی مضحکہ خیز اور عجیب بات ہے مگر لوگ اس کی پرواہ نہیں کرتے اور موقعہ آنے پر جھوٹ بول دیتے ہیں۔ اور اگر ایک جھوٹ بولے تو دوسرا اس کی تائید کرنے لگ جاتا ہے۔ قاضی کے سامنے معاملہ جائے گا تو بیٹا کہے گا کہ میرا باپ تو وہاں تھا ہی نہیں وہ تو فلاں جگہ تھا۔ حالانکہ یہ بالکل جھوٹ ہوتا ہے۔ اسی طرح عورتوں میں بھی جھوٹ کا مرض زیادہ پایا جاتا ہے بلکہ اُن میں جھوٹ کی عادت مردوں سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیعت لیتے وقت عورتوں

سے یہ عہد لیا کرتے تھے کہ ہم جھوٹے اتہام نہیں باندھیں گی (ممتحنہ ع ۲) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب عورتوں میں اتہام لگانے کی عام عادت تھی پھر اُن کے جھوٹ بولنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ بچوں کو بھی اس کی عادت پڑ جاتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جب ہماری ماں جھوٹ بولتی ہے تو ہم کیوں نہ بولیں۔ اور پھر وہ ایسے ایسے جھوٹ بولتے ہیں کہ زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں، کہتے ہیں دو دوست آپس میں اکٹھے ہوئے تو اُن میں سے ایک نے کہا کہ اپنے اپنے خاندان کی کوئی بات سُناؤ۔ اس پر ایک کہنے لگا کہ اب تو وہ بات نہیں رہی ہم تو بڑے رئیس ہوا کرتے تھے چنانچہ ہمارے نانا کا اتنا بڑا اطویلہ تھا کہ جب قحط پڑا کرتا تو سارے شہر کے جانور اُس کے ایک کونے میں سما جاتے تھے۔ دوسرا کہنے لگا ہمارے نانا جان کے پاس ایک ایسا بانس تھا کہ جب کبھی بارش نہ ہوتی تو وہ بانس سے بادلوں کو چھید کر بارش برسا لیتے۔ دوسرے کو غصّہ آ گیا کہنے لگا تمہارے نانا جان یہ بانس رکھا کہاں کرتے تھے وہ کہنے لگا تمہارے نانا جان کے طویلہ میں۔ اور کہاں؟ اب دیکھو یہ کتنا بڑا جھوٹ ہے جو اُن دونوں نے بولا اسی طرح میں نے ایک دفعہ قصّہ پڑھا کہ ایک انگریز کی لڑکی سکول میں داخل ہوئی۔ ادھر سے ایک حلوائی کی لڑکی بھی داخل ہوئی۔ ایک نے دوسری سے پوچھا کہ تم کون ہو۔ تو حلوائی کی لڑکی کہنے لگی کہ میرے ابّا ڈپٹی ہیں۔ دوسری کہنے لگی کہ میرے ابّا بڑے بینکر ہیں۔ ساہوکارہ کام ہے اور بیسیوں ہمارے مکان ہیں۔ ایک دفعہ اُس نے اپنی سہیلی کی دعوت کر دی۔ اب بینکر کی لڑکی کے ہاں نوکر تو تھے نہیں۔ اُس نے اپنے بھائی بہنوں کو نوکر بنایا۔ پیسٹری رکھی۔ بازار سے چائے کے برتن منگوائے اور جب ڈپٹی کی لڑکی آئی تو دونوں طرف سے باتیں ہونے لگیں۔ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک ہمسائی آئی جب اس کی نظر دوسری لڑکی پر پڑی تو کہنے لگی یہ تو ہمارے انگریز بھائی کی لڑکی ہے۔ حلوائی کی لڑکی کہنے لگی یہ تو بینکر کی لڑکی ہے۔ وہ کہنے لگی بالکل غلط ہے یہ تو ہمارے محلہ کی فلاں انگریز کی لڑکی ہے اب یہ پاکھنڈ صرف اس لئے بنایا گیا کہ وہ اس کو امیر سمجھے اور یہ اُس کو۔ مگر یاد رکھو سچ کے یہ معنے بھی نہیں کہ آنکھ نے جو کچھ دیکھا ہے وہ تم لوگوں میں بیان کرتے پھرو قرآن کریم نے بعض باتوں کے بیان کرنے سے انسان کو روکا ہے۔ پس اگر کوئی شخص اُن اُمور کو بیان کرتا ہے تو وہ سچ نہیں بولتا بلکہ فتنہ و فساد پھیلاتا ہے۔ سچ کے معنے صرف یہ ہیں کہ اگر تم کوئی بات کہو تو ضرور سچ کہو۔ یہ نہیں کہ تم وہ بات ضرور کہو۔ مثلاً اگر کوئی چور تمہارے پاس راز لینے کے لئے آتا ہے تو تم اس سے کہہ سکتے ہو کہ میں نہیں بتاتا۔ جاؤ نکل جاؤ۔ یہ جھوٹ نہیں ہوگا لیکن یہ ضرور جھوٹ ہوگا کہ تم اُسے اصل جگہ چھپا کر دوسری جگہ بتا دو۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی کا عیب دیکھتا اور اُسے ہر جگہ بیان کرتا پھرتا ہے تو یہ بھی سچ نہیں بلکہ اپنے بغض و کینہ کا اظہار اور غیبت ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک دفعہ صحابہؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ کیا کسی کے متعلق سچی بات کا

بیان کرنا بھی غیبت ہے؟ آپؐ نے فرمایا یہی تو غیبت ہے ورنہ اگر وہ سچی بات نہ ہو تو اس کا بیان کرنا غیبت نہیں بلکہ جھوٹ ہے۔ (ترمذی ابواب البر و الصلة باب ما جاء فی الغیبة)۔ پس سچ بولنے کے یہ معنے نہیں کہ دوسروں کی کمزوریوں کو ہر جگہ بیان کرتے پھرو۔ بلکہ سچ بولنے کے یہ معنے ہیں کہ جب قاضی کے سامنے شہادت کا موقعہ آئے تو بغیر اس بات کا خیال کئے کہ سچا واقعہ بیان کرنے سے تمہارے دوست یا بھائی یا باپ یا بیوی پر کوئی الزام آئے گا۔ تم ہر سوال کا جواب سچ سچ دے دو یہی وجہ ہے کہ شریعت نے حکم دیا ہے کہ گواہی صرف قاضی لے کیونکہ بعض جگہیں ایسی ہوتی ہیں جہاں شریعت کہتی ہے کہ گواہی نہ لو۔ اَب اگر گواہی لینے والا قاضی نہ ہو تو ہو سکتا ہے وہ کوئی ایسی بات پوچھ لے جس کے پوچھنے کی شریعت نے اُسے اجازت نہیں دی اور اس طرح فتنہ پھیل جائے۔ پس سچ کے یہ معنے نہیں کہ جو کچھ تم دیکھو اُسے ضرور بیان کرو اور نہ سچ کے یہ معنے ہیں کہ تم جو کچھ دیکھو اُسے ہر ایک کے سامنے بیان کرو۔ اگر غیر قاضی تم سے سوال کرتا ہے تو تم کہہ دو میں نہیں بتاتا۔ اسی طرح اگر تم کسی شخص کو کوئی جرم کرتے دیکھتے ہو تو تمہارا اُس پر پردہ ڈال دینا سچ کے خلاف نہیں تمہارا سچ کے خلاف فعل اس وقت متصور ہوگا جب قاضی یا قائم مقام قاضی جسے شریعت نے اپنے دائرہ میں گواہی لینے کا حق دیا ہے۔ تم سے دریافت کرے اور تم سچ نہ بولو لیکن اگر وہ تمہیں گواہی کے لئے نہ بلائے تو خواہ وہ بات درست ہی ہو اُس کا چھپانا سچ کے خلاف نہیں بلکہ اس طرح تم صلح پسند بنتے ہو۔ اور فتنہ و فساد سے اپنے آپ کو اور اپنی قوم کو محفوظ رکھتے ہو۔

(۲) **زُور** کے دوسرے معنے جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے عقل کے ہیں۔ اس لحاظ سے اس آیت کا یہ مفہوم ہوگا کہ رحمٰن کے بندے عقل سے گواہی نہیں دیتے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بے عقلی سے گواہی دیتے ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ واقعات کے مطابق گواہی دیتے ہیں قیاسی گواہی نہیں دیتے۔

(۳) **زُور** کے تیسرے معنے طاقت کے ہیں۔ اس لحاظ سے اس آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ رحمٰن کے بندے اپنی طاقت کے گھمنڈ میں غریب آدمی کو ذلیل کرنے کے لئے گواہی نہیں دیتے۔

(۴) **زُور** کے چوتھے معنے شرک کے ہیں۔ اس لحاظ سے وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ کے یہ معنے ہوں گے کہ رحمٰن کے بندے شرک کی مجالس میں نہیں جاتے۔

(۵) **زُور** کے پانچویں معنے مَجْلِسُ الْغِنَاءِ یعنی گانے بجانے کی مجلس کے ہیں۔ اس لحاظ سے اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ رحمٰن کے بندے گانے بجانے کی مجلس میں نہیں جاتے تا کہ اُس کے زہریلے اثرات سے وہ محفوظ رہیں اور خدا تعالیٰ سے غافل ہو کر ہوا و ہوس کے پیچھے نہ چل پڑیں اسی بناء پر میں نے اپنی جماعت کو یہ ہدایت کی ہے کہ وہ

سینما نہ دیکھا کرے۔ کیونکہ اس میں بھی گانا بجانا ہوتا ہے جو انسانی قلب کو خدا تعالیٰ کی طرف سے غافل کر دیتا ہے پہلے یہ چیز تھیٹر میں ہوا کرتی تھی لیکن جب سے ٹاکی نکل آئی ہے سینما میں بھی یہ چیزیں آ گئی ہیں بلکہ تھیٹر سے زیادہ وسیع پیمانہ پر آئی ہیں۔ کیونکہ تھیٹر کا صرف ایک شو ہوتا تھا جس میں بڑے بڑے ماہرِ فن گویّوں کو بلانا بہت بڑے اخراجات کا متقاضی ہوتا تھا جس کو وہ برداشت نہیں کر سکتے تھے اور پھر ایک شو صرف ایک جگہ ہی دکھایا جا سکتا تھا۔ مگر اب ایک شو سے ہزاروں فلمیں تیار کر کے سارے ملک میں پھیلا دی جاتی ہیں اور بڑے بڑے ماہرِ فن گویّوں اور موسیقاروں کو بلایا جاتا ہے۔ اس لئے تھیٹر سے سینما کا ضرر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے کہ گانا بجانا اور باجے وغیرہ یہ سب شیطان کے ہتھیار ہیں جن سے وہ لوگوں کو بہکاتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کی اس واضح ہدایت کو بھلا دیا اور وہ اپنی طاقت کے زمانہ میں رنگ رلیوں میں مشغول ہو گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر انہیں اپنی حکومت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ خلافتِ عباسیہ تباہ ہوئی تو محض گانے بجانے کی وجہ سے۔ ہلاکو خاں اپنے لاؤلشکر کے ساتھ منزلوں پر منزلیں طے کرتا ہوا بغداد کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا اور مستعصم باللہ ناچ گانے میں مشغول تھا اور بار بار کہتا تھا کہ تم گانے والیوں کو بلاؤ۔ بغداد پر کوئی حملہ نہیں کر سکتا۔ جو حملہ کرے گا وہ خود تباہ ہو جائے گا لیکن ہلاکو خاں نے پہنچتے ہی سب سے پہلے بادشاہ کو قتل کروایا پھر اُس کے ولی عہد کو قتل کیا اور پھر بغداد پر حملہ کر کے اُس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور اٹھارہ لاکھ آدمی قتل کر دیئے (الفخری زیرعنوان آخر الخلفاء الدھین خلافۃ المستعصم باللہ و تاریخ العرب الجزء الثانی صفحہ ۵۸۱، ۵۸۲)۔ اسی طرح مغلیہ حکومت کی تباہی بھی گانے بجانے کی وجہ سے ہی ہوئی۔ ’’محمد شاہ رنگیلے‘‘ کو رنگیلا اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ گانے بجانے کا بہت شوقین تھا۔ بہادر شاہ جو ہندوستان کا آخری مغل بادشاہ تھا وہ بھی اسی گانے بجانے کی وجہ سے تباہ ہوا۔ انگریزوں کی فوجیں کلکتہ سے بڑھ رہی تھیں۔ الٰہ آباد سے بڑھ رہی تھیں کانپور سے بڑھ رہی تھیں۔ میرٹھ سے بڑھ رہی تھیں۔ سہارنپور سے بڑھ رہی تھیں اور بادشاہ کے دربار میں گانا بجانا ہو رہا تھا۔ آخر انگریزوں نے اُس کے بارہ بیٹوں کے سر کاٹ کر اور خوان میں لگا کر اُس کی طرف بھیجے اور کہا کہ یہ آپ کا تحفہ ہے (بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد باب ۱۴ شاہی خاندان کی بپتا صفحہ ۸۳۸۔۸۳۹)۔ اندلس کی حکومت بھی گانے بجانے کی وجہ سے تباہ ہوئی۔ مصر کی حکومت بھی گانے بجانے کی وجہ سے تباہ ہوئی۔ مصر پر صلاح الدین ایوبی نے حملہ کیا تو فاطمی بادشاہ اُس وقت گانے بجانے میں ہی مشغول تھا مگر اتنی بڑی تباہی دیکھنے کے باوجود مسلمانوں کو اب بھی یہی شوق ہے کہ سینما دیکھیں اور گانا بجانا سُنیں اور وہ اپنی تاریخ سے کوئی عبرت حاصل نہیں کرتے۔ حالانکہ قرآن کریم نے وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ میں بتا دیا ہے کہ اگر مسلمان عباد الرحمٰن

بننا چاہتے ہیں تو اُن کا اوّلین فرض یہ ہے کہ وہ گانے بجانے کی مجالس کو ترک کریں۔ اور خدائے واحد سے لو لگائیں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو کامیاب ہو جائیں گے۔ اور اگر نہیں کریں گے تو اس کے تباہ کن نتائج سے وہ محفوظ نہیں رہ سکیں گے۔

پھر فرماتا ہے۔ وَ اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا۔ عباد الرحمٰن کی ایک یہ بھی **علامت** ہے کہ جب وہ لغو باتوں کے پاس سے گذرتے ہیں تو دنیوی لذّات سے متاثر ہو کر اُن میں شامل نہیں ہو جاتے۔ جیسے مسیحؑ کی امت ذکر الٰہی کو بھول کر ناچ گانے اور موسیقی میں مشغول ہو گئی بلکہ وہ اپنے نفس پر قابو رکھتے ہوئے اُن میں شامل ہوئے بغیر بزرگانہ طور پر وہاں سے گذر جاتے ہیں اور دنیوی لذّات پر رضاءِ الٰہی کو مقدم رکھتے ہیں۔

میرے نزدیک موجودہ زمانہ میں جو لغویات پائی جاتی ہیں اُن میں سب سے مقدم سینما ہے جو قومی اخلاق کے لئے ایک نہایت ہی مہلک اور تباہ کن چیز ہے اور تمدنی لحاظ سے بھی ملکی امن کے لئے خطرہ کا موجب ہے۔ میں نے کچھ عرصہ ہوا فرانس کے متعلق پڑھا کہ وہاں کئی گاؤں صرف اس لئے ویران ہو گئے کہ لوگ سینما کے شوق میں گاؤں چھوڑ چھوڑ کر شہروں میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ اور گورنمنٹ کو فکر پڑ گئی کہ اس رَو کو کس طرح روکا جائے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سینما اپنی ذات میں بُرا نہیں مگر اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اس کا بُرے طور پر استعمال کر کے اس زمانہ میں اسے انتہائی طور پر نقصان رساں اور تباہ کن بنا دیا گیا ہے۔ ورنہ اگر کوئی شخص ہمالیہ پہاڑ کے نظاروں کی فلم تیار کرے اور وہاں کی برف اور درخت اور چشمے وغیرہ لوگوں کو دکھائے جائیں۔ اُس کی چٹانوں اور غاروں اور چوٹیوں کا نظارہ پیش کیا جائے اور اس میں کسی قسم کا باجا یا گانا نہ ہو۔ تو چونکہ یہ چیز علمی ترقی کا موجب ہوگی اس لئے یہ جائز ہوگی۔ اسی طرح اگر کوئی فلم کلی طور پر تبلیغی ہو یا تعلیمی ہو اور اُس میں گانے بجانے یا تماشہ کا شائبہ تک نہ ہو تو اس کے دیکھنے کی بھی ہم اجازت دے دیں گے۔ اسی طرح تربیتی یا جنگی اداروں کی طرف سے جو خالص علمی تصاویر آتی ہیں جن میں جنگلوں دریاؤں کے نظارے یا کارخانوں کے نقشے یا لڑائی کے مختلف مناظر ہوتے ہیں وہ بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کے دیکھنے سے علمی ترقی ہوتی ہے یا بعض صنعتی یا زرعی تصویریں ہوتی ہیں جن میں کسانوں کو کھیتی باڑی کے طریق سکھائے جاتے ہیں۔ فصلوں کو تباہ کرنے والی بیماریوں کے علاج بتائے جاتے ہیں۔ زراعت کے نئے نئے آلات سے روشناس کیا جاتا ہے۔ عمدہ بیج اور اُن کی پیداوار دکھائی جاتی ہے۔ ایسی چیزیں لغو میں شامل نہیں کیونکہ اُن کے دیکھنے سے علمی لحاظ سے انسان کو ایک نئی روشنی حاصل ہوتی ہے اور اس کا تجربہ ترقی کرتا ہے اور وہ بھی اپنی تجارت یا صنعت یا زراعت کو زمانہ کی دوڑ کے ساتھ ساتھ بڑھانے اور ترقی دینے کے وسائل اختیار کر سکتا ہے لیکن جھوٹی فلم خواہ جغرافیائی ہو خواہ تاریخی ناجائز ہے۔ مثلاً نپولین کی جنگوں کی کوئی شخص فلم بنائے تو یہ جھوٹی ہوگی اور باوجود نام نہاد

تاریخی فلم ہونے کے ناجائز ہوگی۔جغرافیائی اور تاریخی فلم سے مراد محض سچی فلم ہے جھوٹی فلم مراد نہیں۔بہر حال سینما کی وہ فلمیں جو آجکل تمام بڑے بڑے شہروں میں دکھائی جاتی ہیں اور جن میں ناچ بھی ہوتا ہے اور گانا بجانا بھی ہوتا ہے یہ ایک بدترین لعنت ہے جس نے سینکڑوں شریف گھرانوں کے لوگوں کو گویّا اور سینکڑوں شریف خاندانوں کی عورتوں کو ناچنے والی بنادیا ہے۔میں چونکہ ادبی رسائل وغیرہ دیکھتا رہتا ہوں میں نے دیکھا ہے کہ سینما کے شوقین اور اس سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں کے مضامین میں عموماً ایک تمسخر ہوتا ہے اور اُن کے اخلاق اور اُن کا مذاق ایسا گندہ ہوتا ہے کہ حیرت آتی ہے۔سینما والوں کی غرض تو محض روپیہ کمانا ہوتی ہے نہ کہ لوگوں کو اخلاق سکھانا۔اور وہ روپیہ کمانے کے لئے ایسے لغو اور بے ہودہ افسانے اور گانے پیش کرتے ہیں کہ جو اخلاق کو سخت خراب کرنے والے ہوتے ہیں اور شرفا جب ان کو دیکھنے جاتے ہیں تو اُن کا اپنا مذاق بھی بگڑتا ہے اور اُن کے بچوں اور عورتوں کا بھی مذاق بگڑ جاتا ہے جن کو وہ سینما دکھانے کے لئے ساتھ لے جاتے ہیں یا جن کو واپس آ کر وہاں کے قصّے سُناتے ہیں۔غرض سینما ملک کے اخلاق پر ایسا تباہ کن اثر ڈال رہے ہیں کہ میں سمجھتا ہوں اگر میری طرف سے ممانعت نہ ہوتی تب بھی ہر سچے اور مخلص مومن کی روح اس سے اجتناب کرتی۔بعض احمدی پوچھتے ہیں کہ انگریزی فلموں میں تو کوئی لغو بات نہیں ہوتی۔اُن کو دیکھنے کی اجازت دی جائے۔حالانکہ کوئی انگریزی فلم ایسی نہیں ہوتی جس میں گانا بجانا نہ ہو اور گانا بجانا اسلام میں سخت منع ہے اور قرآن کریم کی اس آیت سے پتہ لگتا ہے کہ انسان خدا تعالیٰ کا بندہ ہی نہیں بن سکتا جب تک وہ گانے بجانے کی مجلسوں سے الگ نہ ہو۔

دوسری چیز جو لغویات میں امتیازی مقام رکھتی ہے قمار بازی ہے۔آجکل قمار بازی یورپ اور امریکہ کے لوگوں کا نہ صرف محبوب مشغلہ ہے بلکہ اُن کے تمدن کا ایک جزو لاینفک ہو گیا ہے۔زندگی کے ہر شعبہ میں جوئے کا کسی نہ کسی صورت میں دخل ہے۔معمولی طریق کا جؤا تو مجالسِ طعام کے بعد اُن کا ایک معمول ہے۔لیکن اس کے علاوہ لاٹریوں کی وہ کثرت ہے کہ یوں کہنا چاہیے کہ تجارت کا کام بھی ایک چوتھائی حصہ جوئے کی نظر ہو رہا ہے۔ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک سب لوگ جُؤا کھیلتے ہیں۔اور کبھی کبھی نہیں قریباً روزانہ اور جوئے کی کلبیں شائد سب کلبوں سے زیادہ امیر ہیں۔اٹلی کی کلب مانٹی کارلو میں جو امراء کے جوئے کا مقام ہے بعض اوقات ایک ایک دن میں کروڑوں روپیہ بعض لوگوں کے ہاتھوں سے نکل کر بعض دوسرے ہاتھوں میں چلا جاتا ہے۔غرض اس قدر جوئے کی کثرت ہے کہ یہ کہنا نادرست نہ ہوگا کہ تمدنِ جدید میں سے جوئے کو نکال کر اس قدر عظیم الشان خلاء پیدا ہو جاتا ہے کہ اُسے کسی اور چیز سے پُر نہیں کیا جا سکتا۔حالانکہ جُوا ایسی خطرناک چیز ہے کہ اس کا عادی انسان بعض دفعہ آدھ گھنٹہ کے جُوا کی خاطر

اپنی ساری جائیداد برباد کر دیتا ہے۔ اور اگر جیتتا ہے تو اور ہزاروں گھروں کی بربادی کا موجب بن کر۔ پھر جوئے باز میں روپیہ کو لُٹانے کی عادت لازمی طور پر پیدا ہو جاتی ہے۔ شاید ہی کوئی جوئے باز ایسا ہوگا جو اپنے روپیہ کو سنبھال کر رکھتا ہو۔ بالعموم سارے جوئے باز بے پرواہی سے اپنا مال لٹا دیتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ روپیہ کمانے کے لئے انہیں زیادہ جدوجہد نہیں کرنی پڑے گی۔ گویا ایک طرف تو وہ دوسرے لوگوں کو برباد کرتے ہیں اور دوسری طرف خود اپنے مال سے بھی صحیح رنگ میں فائدہ نہیں اٹھاتے کیونکہ روپیہ کمانے کے لئے انہیں کوئی محنت نہیں کرنی پڑتی۔ پھر جُوا عقل اور فکر کو بھی کمزور کر دیتا ہے اور جوئے باز ہار جیت کے خیال سے ایسی چیزوں کے تباہ کرنے کے لئے بھی تیار ہو جاتا ہے جنہیں کوئی دوسرا عقلمند تباہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ پُرانے زمانہ کی ہندو تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ حضرت کرشنؑ کے پھوپھی زاد بھائی یدھشٹر نے اپنی بیوی تک جوئے میں ہار دی تھی۔ پس یہ ایک لغو چیز ہے جس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

تیسری چیز جو موجودہ زمانہ کے لحاظ سے لغو میں شامل ہے وہ ناچ ہے۔ انگریزوں میں کسی زمانہ میں ناچ بہت بُرا سمجھا جاتا تھا۔ مگر آہستہ آہستہ لوگوں نے اسے اختیار کرنا شروع کر دیا۔ پہلے عورت اور مرد صرف ہاتھ پکڑ کر ناچتے تھے۔ پھر سینہ کی طرف سینہ کر کے ناچنے لگے پھر یہ سلسلہ اَور بڑھا اور درمیانی فاصلہ تین انگشت تک آ گیا۔ اب بہت جگہ پر یہ بھی اڑ گیا ہے۔ قرآن کریم نے وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ (النور: ۳۲) میں عورتوں کے لئے اپنے پیروں کو اس طرح زمین پر مار کر چلنے سے بھی منع فرمایا ہے جس سے اُن کی زینت کا اظہار ہو۔ اور ناچ میں تو زینت کے اخفاء کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پس ناچ بھی مال اور اخلاق کو تباہ کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ دنیا میں ایسے ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو کنچنیوں کے ایک ایک ناچ پر اپنی ساری جائیدادیں دے دیتے ہیں۔ ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو ڈوموں کے لطیفوں پر اپنے قیمتی اموال لٹا دیتے ہیں۔ پس گانے کی طرح ہر قسم کا ناچ بھی ایک لعنت ہے۔ جس سے نوجوانوں کے اخلاق بگڑتے اور قوم کے اموال تباہ ہوتے ہیں۔

چوتھی چیز جو لغویات میں شامل ہے اور جس کا ترک کرنا نہایت ضروری ہے وہ حقّہ ہے۔ لوگ پہلے تو اس کو اس لئے شروع کرتے ہیں کہ اس سے قبض کھل جاتی ہے۔ مگر پھر اُن کی ایسی حالت ہو جاتی ہے کہ پاخانہ میں بیٹھ کر تین تین دفعہ چلمیں بھرواتے ہیں تب انہیں اجابت ہوتی ہے۔ پھر حقہ پینے والوں کو ہمیشہ گلے اور سینہ کی خرابی اور کھانسی کا عارضہ لاحق رہتا ہے کیونکہ جو چیز جسم کو سُن کر دیتی ہے وہ آخر میں اعصاب کو ڈھیلا اور کمزور کر دیتی ہے اور کئی امراض کا موجب بن جاتی ہے مگر اس زمانہ میں حُقّہ اور سگریٹ کا اس قدر رواج ہے کہ اکثر نوجوان بلکہ بچے بھی اس

میں مبتلا دیکھے جاتے ہیں۔ مگر چونکہ یہ ایک نشہ آور چیز ہے اس لئے رفتہ رفتہ وہ اس کے اس قدر عادی ہوجاتے ہیں کہ اگر ضرورت محسوس ہونے پر انہیں حقہ یا سگریٹ یا نسوار وغیرہ نہ ملے تو وہ پاگلوں کی طرح دوڑے پھرتے ہیں۔

مجھے یاد ہے ہم ایک دفعہ پہاڑ پر جا رہے تھے تو میرے ساتھیوں میں ایک احمدی پٹھان بھی تھے جنہیں نسوار کھانے کی عادت تھی مگر بدقسمتی سے وہ اپنی ڈبیا گھر میں بھول آئے تھے۔ راستہ میں ایک کشمیری مزدور آ رہا تھا جس نے اپنے کندھے پر لکڑیاں اٹھائی ہوئی تھیں وہ اُسے دیکھتے ہی نہایت لجاجت کے ساتھ کہنے لگے اے بھائی کشمیری۔ اے بھائی کشمیری جی۔ اے بھائی جی۔ آپ کے پاس نسوار ہے مجھے یہ بات سُن کر بے اختیار ہنسی آگئی کہ جو شخص تکبر کی وجہ سے اپنی گردن بھی نیچی نہیں کرتا تھا آج نشہ پورا نہ ہونے کی وجہ سے کس قدر لجاجت پر اُتر آیا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں جو دوست باہر سے آپ کی ملاقات کے لئے آتے تھے اُن میں سے بعض لوگ حُقّہ کے بھی عادی ہوتے تھے۔ اُن دنوں قادیان میں اور تو کسی جگہ حُقّہ نہیں ہوتا تھا صرف ہمارے ایک تایا کے پاس ہوا کرتا تھا جو سخت دہریہ اور دین سے بے تعلق تھے۔ مگر حقہ کی عادت کی وجہ سے وہ اُن کے پاس بھی چلے جاتے اور انہیں مجبوراً اُن کی باتیں سُننی پڑتیں۔ ہمارے یہ تایا دین سے ایسے بے تعلق تھے کہ ایک دفعہ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ نے اُن سے پوچھا کہ آپ نے کبھی نماز بھی پڑھی ہے۔ وہ کہنے لگے میں تو بچپن سے ہی بڑا سلیم الطبع واقعہ ہوا ہوں۔ میں چھوٹی عمر میں ہی جب دیکھتا کہ لوگوں نے سر نیچے اور سرین اوپر کئے ہوئے ہیں۔ تو میں ہنستا کہ یہ کیسے بے وقوف لوگ ہیں اور اَب تو مَیں بہت سمجھدار ہوں۔ میں نے نماز کیا پڑھنی ہے ایک دوست نے سُنایا کہ ایک دفعہ ایک احمدی وہاں حقہ پینے کے لئے چلا گیا اور تھوڑی دیر کے بعد اپنے آپ کو گالیاں دیتے ہوئے واپس آ گیا۔ کسی دوست نے پوچھا کہ کیا بات ہے وہ کہنے لگا کہ میں اپنے آپ کو اس لئے بُرا بھلا کہہ رہا ہوں کہ محض حقہ کی عادت کی وجہ سے مجھے اس کے پاس جانا پڑا اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خلاف باتیں سُننی پڑیں۔ اگر مجھے یہ بری عادت نہ ہوتی تو میں اس کے پاس کیوں جاتا اور اپنے آقا کے خلاف اس کے منہ سے کیوں باتیں سُنتا۔

غرض حقہ بھی لغویات میں شامل ہے جس کو چھوڑنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اور اگر کوئی شخص خود نہ چھوڑ سکے تو اُسے کم از کم یہ کوشش ضرور کرنی چاہیے کہ اُس کی اگلی نسل اس بدی سے محفوظ رہے اور اُس کی عمر کے خاتمہ کے ساتھ اس لغو فعل کا بھی اُس کے خاندان میں خاتمہ ہوجائے۔

پھر لغویات میں بے کار بیٹھ کر گپیں ہانکنا اور دوسروں سے بے تعلق باتیں پوچھتے رہنا بھی شامل ہے۔ ہمارے ملک میں یہ ایک عام نقص ہے کہ مرد بھی اور عورتیں بھی دوسروں سے ایسی باتیں پوچھتے ہیں جن کا اُن کی ذات کے

ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مثلاً عورت بلاوجہ دوسری سے پوچھتی رہتی ہے کہ یہ کپڑا کتنے کا لیا۔ یہ زیور کہاں سے بنوایا اور جب تک اُس کی ساری ہسٹری معلوم نہ کر لے اُسے چین ہی نہیں آتا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سنایا کرتے تھے کہ ایک عورت نے انگوٹھی بنوائی لیکن کسی اور عورت نے اُس کی طرف توجہ نہ کی۔ اُس نے تنگ آ کر اپنے گھر کو آگ لگا دی۔ لوگوں نے پوچھا کہ کچھ بچا بھی ہے۔ اُس نے انگوٹھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ سوائے اس انگوٹھی کے اور کچھ نہیں بچا۔ ایک عورت نے کہا بہن تم نے یہ انگوٹھی کب بنوائی تھی یہ تو بہت خوبصورت ہے۔ وہ کہنے لگی اگر یہی بات تم پہلے پوچھ لیتیں تو میرا گھر کیوں جلتا۔ اسی طرح مرد السلام علیکم کہنے کے بعد ہی پوچھنے لگ جاتے ہیں کہ کہاں سے آئے ہو؟ کہاں جاؤ گے؟ کیا کام ہے؟ آمدنی کیا ہے؟ کتنے بچے ہیں؟ شادی شدہ ہیں یا غیر شادی شدہ؟ حالانکہ اُس کا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ انگریزوں میں یہ کبھی نہیں ہوتا کہ وہ ایک دوسرے سے بلاوجہ پوچھیں کہ کہاں ملازم ہو؟ تعلیم کتنی ہے؟ تنخواہ کیا ملتی ہے؟ وہ کبھی کرید کرید کر دوسرے کے غیر متعلق حالات معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ مگر ہمارے ہاں اس کو بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ جن لوگوں کو بڑی بڑی باتوں کا خیال ہوتا ہے انہیں چھوٹی باتوں کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ اگر لوگوں کو دین کا فکر ہو اور انہیں معلوم ہو کہ اسلام آج کن مصیبتوں میں گھِرا ہوا ہے اور اس کی اشاعت کے لئے کتنی بڑی قربانیوں کی ضرورت ہے تو انہیں لغو کاموں اور لغو باتوں کا خیال بھی پیدا نہ ہو۔ اگر کسی کے گھر میں آگ لگ جائے تو وہ بیٹھ کر گپیں مارنے نہیں لگ جاتا بلکہ دیوانہ وار دوڑتا اور آگ کو بُجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح اگر مسلمان غور کریں اور اُن کی روحانی آنکھ کھلی ہو تو انہیں معلوم ہو کہ آج کفر اور ایمان کی ایک بڑی بھاری جنگ لڑی جا رہی ہے۔ شیطان اپنے تمام ہتھیاروں سمیت میدان میں اُترا ہوا ہے اور رحمٰن خدا کا لشکر بھی کفر کی سرکوبی کے لئے کھڑا ہے اور دونوں لشکروں میں وہ آخری جنگ جاری ہے جس میں ابلیس کا سر ہمیشہ کے لئے کچلا جائے گا اگر ایسے نازک وقت میں بھی انہوں نے لغویات کو ترک نہ کیا اور اپنے فرائض کو سمجھنے کی کوشش نہ کی تو اُن سے زیادہ بدقسمت اَور کون ہوگا۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ

اور وہ لوگ بھی کہ اُن کے رب کی آیات جب انہیں یاد دلائی جائیں تو اُن سے بہروں اور اندھوں کا

عُمْيَانًا ﴿۷۴﴾

معاملہ نہیں کرتے۔

حلّ لُغَات۔ يَخِرُّوْا يَخِرُّوْا خَرَّ کے معنے ہوتے ہیں سَقَطَ سُقُوْطًا يُسْمَعُ مِنْهُ خَرِيْرٌ۔ ایسے طور پر گرنا کہ اُس سے آواز سُنائی دے وَالْخَرِيْرُ يُقَالُ لِصَوْتِ الْمَآءِ وَالرِّيْحِ وَغَيْرِ ذٰلِكَ مِمَّا يَسْقُطُ مِنْ عُلُوٍّ اور خریر اُس آواز کو کہتے ہیں جو کسی چیز کے اوپر سے گرنے سے یا ہوا اور پانی کے چلنے سے پیدا ہو۔ وَقَوْلُهٗ خَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا فَاسْتِعْمَالُ الْخَرِّ تَنْبِيْهٌ عَلٰى اجْتِمَاعِ أَمْرَيْنِ۔ اَلسُّقُوْطِ وَحُصُوْلِ الصَّوْتِ مِنْهُمْ بِالتَّسْبِيْحِ۔ اور قرآن کریم میں جو خَرُّوْا سُجَّدًا کے الفاظ آتے ہیں تو اس سے دو باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ اوّل گرنا دوم تسبیح کرنے کی وجہ سے آواز کا پیدا ہونا (مفردات) اور خَرَّ عَلَيْنَا قَوْمٌ مِنْ بَنِيْ فُلَانٍ کے معنے ہوتے ہیں هَجَمُوْا عَلَيْنَا مِنْ مَكَانٍ لَا يُعْرَفُ قوم نے کسی نامعلوم جگہ کی طرف سے حملہ کر دیا ہے۔ (اقرب)

عُمْيَانًا عُمْيَانٌ اَعْمٰى کی جمع ہے اور اَعْمٰى کے معنے اندھے کے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر۔ فرماتا ہے رحمٰن کے بندوں کی ایک یہ بھی علامت ہے کہ جب اُن کے سامنے اُن کے رب کی آیات کا ذکر کیا جائے تو وہ اُن کی طرف بہرے اور اندھے ہو کر توجہ نہیں کرتے بلکہ کان اور آنکھیں کھول کر آیاتِ الٰہیہ کو سُنتے اور روحانی بصیرت کے ساتھ اُن سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

اس آیت کے متعلق علامہ ابوحیان صاحب بحرِ محیط لکھتے ہیں کہ لَمْ يَخِرُّوْا میں جو نفی استعمال کی گئی ہے اُس کا تعلق صُمًّا وَّ عُمْيَانًا کے ساتھ ہے۔ يَخِرُّوْا کے ساتھ نہیں ہے۔ اور یہ طریق کلام عربی زبان میں عام مستعمل ہے مثلاً کہتے ہیں لَمْ يَخْرُجْ زَيْدٌ اِلَى الْحَرْبِ جَزِعًا یعنی زید جنگ کے لئے جزع فزع کرتے اور بُزدلی کا اظہار کرتے ہوئے نہیں نکلا۔ اور مراد یہ ہوتی ہے کہ اِنَّمَا خَرَجَ جَرِيًّا وہ بڑی دلیری اور بہادری کے ساتھ نکلا ہے۔ اسی طرح اس آیت کے یہ معنے نہیں کہ عباد الرحمٰن کو جب اللہ تعالیٰ کی آیات یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ اُس کے حضور عاجزی اور مسکنت کے ساتھ نہیں گرتے بلکہ صرف بہرے اور اندھے ہونے کی حالت میں گرنے کی نفی کی گئی ہے اور مراد یہ

ہے کہ اِذَا ذُکِّرُوْا بِھَا اَکَبُّوْا عَلَیْھَا حِرْصًا عَلٰی اِسْتِمَاعِھَا وَاَقْبَلُوْا عَلَی الْمُذَکِّرِ بِھَا بِاٰذَانٍ وَاعِیَۃٍ وَاَعْیُنٍ رَاعِیَۃٍ بِخِلَافِ غَیْرِ ھِمْ مِنَ الْمُنَافِقِیْنَ وَاَشْبَاھِھِمْ ۔یعنی جب انہیں خدا تعالیٰ کی آیات یاد دلائی جائیں تو وہ اُن کے سُننے کے شوق میں اُن کی طرف جھکے چلے جاتے ہیں اور اُن نشانات کی طرف جن کے ذریعہ انہیں نصیحت کی جاتی ہے کان کھول کر اور اپنی آنکھوں کو کھلا رکھ کر توجہ کرتے ہیں۔ بخلاف کافروں اور منافقوں کے طریق کے جو بہرے کان اور اندھی آنکھیں رکھتے ہیں یعنی نہ تو وہ کسی نصیحت کی کسی بات سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور نہ کوئی نشان اُن کی بند آنکھوں کو کھولنے کا موجب بنتا ہے۔ یہ عبادالرحمٰن کی وہی خوبی ہے جو قرآن کریم کی اس آیت میں بیان کی گئی ہے کہ اِنَّمَا یُؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِھَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّھِمْ وَ ھُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ (السجدۃ:۱۶) یعنی ہماری آیتوں پر وہی لوگ سچا ایمان رکھتے ہیں کہ جب انہیں آیات الٰہیہ کے متعلق توجہ دلائی جائے تو وہ سجدہ کرتے ہوئے زمین پر گر جاتے ہیں اور اپنے رب کی تعریف اور تسبیح کرتے ہیں اور تکبر سے کام نہیں لیتے۔ اس کے مقابلہ میں کفار کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَ اِذَا ذُکِّرُوْا لَا یَذْکُرُوْنَ۔ وَ اِذَا رَاَوْا اٰیَۃً یَّسْتَسْخِرُوْنَ (الصّٰفّٰت:۱۴،۱۵) کہ جب انہیں کوئی نصیحت کی جاتی ہے تو وہ نصیحت حاصل نہیں کرتے اور جب کوئی نشان دیکھتے ہیں تو اُس کی ہنسی اُڑاتے ہیں۔ گویا وہ کانوں سے بھی بہرے ہوتے ہیں اور آنکھوں سے بھی اندھے ہوتے ہیں۔ نہ نصیحت کی بات سن کر وہ کوئی فائدہ اٹھاتے ہیں اور نہ اللہ تعالیٰ کا نشان دیکھ کر کوئی عبرت حاصل کرتے ہیں۔ غرض سچے مومنوں کی آنکھیں بھی کھلی ہوتی ہیں اور اُن کے کان بھی کھلے ہوتے ہیں۔ وہ خدا تعالیٰ کی باتوں کو پوری توجہ سے سُنتے ہیں اور پھر اُن سے فائدہ اٹھانے کے لئے اُسی وقت عمل پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ مگر ان معنوں کے علاوہ قرآن کریم کی اس آیت میں اس طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ عبادالرحمٰن کے سامنے جب اُن کے رب کی آیات بیان کی جاتی ہیں تو وہ انہیں اندھا دھند نہیں مانتے بلکہ سوچ سمجھ کر اور دلائل کے ساتھ مانتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ ایک اور مقام پر اسی حقیقت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ (یوسف:۱۰۹) یعنی اے ہمارے رسول! اپنے منکروں سے کہہ دو کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف علیٰ وجہ البصیرت بلاتا ہوں اور میں اور میرے متبع کسی بے دلیل بات کو نہیں مانتے بلکہ سوچ سمجھ کر اور دلائل قطعیہ کی بنا پر جو شک و شبہ سے بالا ہوتے ہیں ایمان لاتے ہیں۔ اسی وجہ سے قرآن کریم نے بے دلیل ماننے والوں کو بار بار ملزم قرار دیا ہے جیسے سورۂ نجم میں فرماتا ہے۔ اِنْ ھِیَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْھَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُکُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰہُ بِھَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ مَا تَھْوَی الْاَنْفُسُ (النجم:۲۴) یعنی یہ تو صرف چند نام ہیں جو تم لوگوں نے اور تمہارے باپ دادوں نے خود ہی رکھ

لئے ہیں خدا تعالیٰ نے اس کی کوئی دلیل بیان نہیں کی۔ یہ لوگ صرف اپنے اوہام کی یا اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کر رہے ہیں۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم دشمنانِ اسلام پر یہ اعتراض کرتا ہے کہ وہ اُن بے دلیل باتوں کو جن کے لئے نہ آسمانی شہادت ہوتی ہے نہ عقلی مانتے ہیں اور اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں اور وہمی باتوں کے پیچھے چلتے ہیں۔

اسی طرح قرآن کریم کی متعدد آیات میں اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ ایمان دلائل اور براہین پر مبنی ہونا چاہیے نہ کہ وہم اور گمان پر۔ چنانچہ سورۂ احقاف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ؕ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَاۤ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (الاحقاف:۵) یعنی مجھے بتاؤ تو سہی کہ خدا کے سوا جن وجودوں کو تم پکارتے ہو کیا اُن میں کوئی حقیقت بھی ہے؟ اگر ہے تو مجھے بتاؤ کہ انہوں نے زمین میں سے کس چیز کو پیدا کیا ہے؟ یا یہ ثابت کرو کہ آسمانی بادشاہت میں ان کا کوئی حصہ ہے۔ اگر تم سچے ہو تو اس کے لئے یا تو قرآن سے پہلے کسی آسمانی کتاب سے دلیل پیش کرو یا اپنے باپ دادا کی بتائی ہوئی کسی علمی بات کو ہی پیش کرو۔ یعنی تمہارے شرکیہ مسائل نہ تو کسی آسمانی کتاب سے ثابت ہیں نہ کسی علمی دلیل سے ثابت ہو سکتے ہیں۔ پھر ان پر ایمان لانا کس طرح جائز ہو سکتا ہے؟ اسی طرح فرماتا ہے اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوْا بِهٖ يُشْرِكُوْنَ (الروم:۳۶) یعنی کیا اللہ تعالیٰ کے شریک قرار دینے کی کوئی دلیل بھی ہے جو اللہ تعالیٰ نے مہیا کی ہو۔ اور وہ شرک کی صداقت پر گواہ ہو۔ اگر ایسا نہیں تو پھر بے دلیل بات کو یہ لوگ کس طرح مان رہے ہیں۔ اسی طرح فرماتا ہے۔ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ۔ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ (الانعام:۱۴۹، ۱۵۰) یعنی کفار سے کہہ دو کہ کیا تمہارے پاس اپنے دعاوی کی کوئی دلیل بھی ہے جسے تم ہمارے سامنے پیش کر سکو۔ تمہارے پاس ہرگز کوئی دلیل نہیں بلکہ تم صرف وہم کی پیروی کرتے ہو اور ڈھکونسلے مار رہے ہو۔ پھر فرماتا ہے کہ اے ہمارے رسول ان سے یہ بھی کہو کہ اللہ تو وہ باتیں اپنے بندوں سے منواتا ہے جن کے دلائل مکمل طور پر موجود ہوتے ہیں۔ پس جو بات بلا ثبوت ہو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ وَ مَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا (الانعام:۱۰۵) یعنی تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے کھلے کھلے دلائل آ چکے ہیں۔ اب جو شخص ان دلائل کو دیکھے گا وہ فائدہ اٹھالے گا اور جو نہیں دیکھے گا وہ نقصان اٹھائے گا۔

ان آیات سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسی ایمان کو حقیقی ایمان قرار دیا ہے جس کی بصیرت پر بنیاد ہو اور جسے

کھلی آنکھوں اور کھلے کانوں کے ساتھ اختیار کیا گیا ہو۔ اگر کوئی شخص بغیر تحقیق کے کسی بات کو مان لیتا ہے اور حقیقی شعور اسے حاصل نہیں ہوتا۔ تو قرآنی اصطلاح میں وہ ایمان کا دعویٰ کرنے کے باوجود بھی اندھا اور بہرہ ہوتا ہے کیونکہ نہ تو اُسے دین پر ثبات حاصل ہوتا ہے اور نہ خدا تعالیٰ کے قرب کی برکات سے اُسے کوئی حصہ ملتا ہے۔

اسی طرح لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ عُمْيَانًا کے ایک یہ بھی معنے ہیں کہ جب انہیں خدا تعالیٰ کی آیات یاد دلائی جائیں تو وہ اس کلام کے ذریعہ اُس طرح ٹھوکریں نہیں کھاتے جس طرح منافق اور کافر ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ منافقوں کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے کہ جب غزوۂ احزاب کے موقعہ پر عرب کے تمام قبائل مدینہ پر لشکر لے کر آ گئے تو انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا (الاحزاب:۱۳) یعنی خدا اور اس کے رسول نے ہم سے کامیابی کا ایک جھوٹا وعدہ کیا تھا لیکن جب مومنوں نے حملہ آور لشکروں کو دیکھا تو وہ اپنے ایمان اور یقین میں اَور بھی بڑھ گئے اور انہوں نے کہا کہ هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ صَدَقَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ (الاحزاب:۲۳) یعنی یہ تو وہ لشکر ہیں جن کا اللہ اور اُس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول نے بالکل سچ کہا تھا۔ گویا خدا تعالیٰ کی ایک عظیم الشان پیشگوئی کے پورا ہونے پر منافق تو ٹھوکر کھا گئے اور مومن اپنے ایمان اور اطاعت میں اور بھی بڑھ گئے۔ اسی طرح جب بھی کوئی نشان خدا تعالیٰ اپنے دین کی تائید کے لئے ظاہر کرتا ہے تو منافق جو اپنے دلوں میں بغض وحسد کی آگ لئے ہوئے ہوتے ہیں وہ تو اُن نشانات سے فائدہ اٹھانے کی بجائے ہنسی اور تمسخر میں مشغول ہو جاتے ہیں اور اُن نشانات کی قدر و قیمت کو کم کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں لیکن مومنوں کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ خدائی نشانات کے ظہور پر اپنے دل کے کانوں کو اس طرح کھول دیتے ہیں کہ الٰہی نور اُن میں پہلے سے بھی زیادہ زور سے داخل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اور اپنی روحانی بینائی میں ایسی تیزی پیدا کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی معرفت اور اُس کی محبت کے میدان میں وہ پہلے سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔ منافقوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ایک اور مقام پر وضاحتاً فرمایا ہے کہ۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰۤى اَبْصَارَهُمْ (محمد:۲۴) یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے اور اُس نے اُن کے کانوں کو بہرہ اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے۔ یعنی باوجود اس کے کہ خدا تعالیٰ کے نشانات بارش کی طرح برس رہے ہیں اور قرآن کریم کے ذریعہ دنیا کو زندہ کیا جا رہا ہے۔ بدی کی جگہ نیکی نے اور فسق و فجور کی جگہ تقویٰ وطہارت نے اور ظلم وستم کی جگہ عدالت وانصاف نے اور بے مروّتی کی جگہ وفا اور اخلاص نے لے لی ہے پھر بھی یہ منافق اپنی شرارتوں سے باز نہیں آتے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی روحانی آنکھیں بند ہیں اور ان کے روحانی کان بھی بند ہیں۔ اگر ان کے کان

کھلے ہوتے تو اللہ تعالیٰ کی آیات پر تدبر کر کے یہ لوگ ہدایت پا سکتے تھے۔اور اگر ان کی آنکھیں کھلی ہوتیں تو یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اور نشانات دیکھ کر اپنی شرارتوں سے توبہ کر سکتے تھے۔مگر ان لوگوں نے ہدایت کے ان دونوں راستوں کو بند کر رکھا ہے۔اس لئے مسلمانوں میں شامل ہونے کے باوجود ان لوگوں پر خدا تعالیٰ کی لعنت برس رہی ہے بڑے سے بڑا نشان بھی ان کے سامنے ظاہر ہوتو وہ اس طرح پیٹھ پھیر کر چلے جاتے ہیں کہ گویا کوئی بات ہی نہیں ہوئی اور اپنی منافقت میں اَور بھی بڑھ جاتے ہیں۔مگر مومنوں کی یہ کیفیت نہیں ہوتی۔ اُن کی آنکھیں خدا تعالیٰ کے حضور اُس کے نشانات دیکھ کر جھک جاتی ہیں اور ان کے کان خدا تعالیٰ کی باتیں سُننے کے لئے ہمہ تن تیار رہتے ہیں۔اسلام کی طرف سے جب بھی کوئی آواز اٹھتی ہے وہ اُسے بہرے کانوں کے ساتھ نہیں سُنتے بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے سے ہی بیتابی سے خدائی ہدایت کے منتظر تھے۔اور جب ان کی آنکھیں کسی نشان کو دیکھتی ہیں تو وہ اس سے مونہہ نہیں پھیرتے بلکہ اس نشان کو اپنے دل میں جگہ دیتے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں جس نے انہیں اپنے نشانات کے ذریعہ اپنی ہستی کا ثبوت دیا۔غرض سچا مومن خدا تعالیٰ کی آیات کے ظہور پر اَور بھی خدا تعالیٰ کے قریب ہوجاتا ہے۔مگر کافر اور منافق اپنے کفر اور نفاق میں ترقی کر جاتا اور اس کا پچھلا حال پہلے سے بھی بدتر ہوجاتا ہے۔

مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اس جگہ آیات الٰہیہ سے صرف قرآنی آیات یا اللہ تعالیٰ کے نشانات ہی مراد نہیں بلکہ وہ تمام ربّانی علماء اور مصلحینِ امت جن کا کام خدا تعالیٰ کی بھولی بھٹکی مخلوق کو راہِ راست پر لانا اور انہیں صراطِ مستقیم پر قائم کرنا ہے اُن کا وجود بھی آیات الٰہیہ میں ہی شامل ہے۔جیسے قرآن کریم نے حضرت مسیح ناصریؑ اور اُن کی والدہ حضرت مریم صدیقہؓ کے متعلق فرمایا۔وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗۤ اٰيَةً (مومنون:۵۱) کہ ہم نے مسیح ناصریؑ اور اُن کی والدہ کو دنیا کے لئے ایک آیت بنادیا تھا اور يَخِرُّوْا کے معنے جیسا کہ حل لغات میں بتایا جاچکا ہے صرف جھکنے اور گرنے کے نہیں بلکہ حملہ کرنے کے بھی ہیں۔پس وَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ عُمْيَانًا میں اس طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ غلبہ اور اقتدار کی حالت میں بھی عباد الرحمٰن کو جب اللہ تعالیٰ کے کسی مامور یا مصلح یا مجدد کے ذریعہ اُن کی خامیوں کی طرف توجہ دلائی جائے تو وہ اپنی طاقت کے گھمنڈ میں اندھے اور بہرے ہوکر اُن پر حملہ نہیں کر دیتے جیسے بدقسمتی سے بعض مسلمان بادشاہوں نے اولیاء اُمت سے ناروا سلوک کیا اور اُن پر بڑے بڑے مظالم توڑے بلکہ وہ فوراً اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہوجاتے ہیں اور اپنی خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔وہ یہ نہیں دیکھتے کہ فوج اور طاقت ہمارے ہاتھ میں ہے۔اور یہ ہمیں نصیحت کرنے والا ایک معمولی فرد

ہے بلکہ وہ اس نقطۂ نگاہ سے اُس کی آواز پر کان دھرتے ہیں کہ یہ ہمارے خدا کا ایلچی ہے اور اگر ہم نے اس کی آواز پر کان نہ دھرا تو ہماری دنیا بھی تباہ ہوگی اور ہماری عاقبت بھی برباد ہوگی۔ گویا دنیا کے بادشاہ ہونے کے باوجود خدا تعالیٰ کے پاک بندے اُس کے در کے بھکاری اور اُس کی آواز پر لبیک کہنے والے ہوتے ہیں اور کبر اور رعونت کا کوئی شائبہ تک اُن کے دلوں میں نہیں پایا جاتا۔

وَ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّیّٰتِنَا

اور وہ لوگ بھی (رحمٰن کے بندے ہیں) جو یہ کہتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم کو ہماری بیویوں کی

قُرَّةَ اَعْیُنٍ وَّ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا ﴿۷۵﴾ اُولٰٓئِكَ یُجْزَوْنَ

طرف سے اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں متقیوں کا امام بنا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو

الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَ یُلَقَّوْنَ فِیْهَا تَحِیَّةً وَّ سَلٰمًا ﴿۷۶﴾

اُن کے نیکی پر قائم رہنے کی وجہ سے (بہشت میں) بالا خانے دیئے جائیں گے اور ان کو اُس میں دُعائیں دی جائیں

خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا ﴿۷۷﴾

گی اور سلامتی کے پیغام پہنچائے جائیں گے وہ اُن میں رہتے چلے جائیں گے۔ وہ (یعنی جنت) عارضی قرار گاہ کے طور پر بھی بڑی اچھی ہے اور مستقل قرار گاہ کے طور پر بھی (بڑی اچھی ہے)۔

حلّ لُغات ۔ اَلْاِمَامُ اَلْاِمَامُ مَنْ یُؤْتَمُّ بِہٖ اَیْ یُقْتَدٰی بِہٖ ۔ یعنی امام اس شخص کو کہتے ہیں جس کی پیروی کی جائے۔ (اقرب)

اَلْغُرْفَةُ اَلْغُرْفَةُ اَلْعِلِّیَّةُ ۔ غرفہ کے معنے عمارت کے اوپر کے حصہ یعنی بالا خانہ کے ہوتے ہیں (اقرب) نیز اس کے معنے ہیں اَلسَّمَآءُ السَّابِعَةُ ۔ ساتواں آسمان۔ (اقرب)

صَبَرُوْا صَبَرُوْا صَبْرٌ کے معنے ہیں تَرْكُ الشَّكْوٰی مِنْ اَلَمِ الْبَلْوٰی لِغَیْرِ اللّٰهِ لَا اِلَی اللّٰهِ ۔ یعنی مصیبت کا شکوی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے پاس نہ کرنا۔ فَاِذَا دَعَا اللّٰهَ الْعَبْدُ فِیْ كَشْفِ الضُّرِّ عَنْهُ لَا یُقْدَحُ فِیْ صَبْرِهٖ ۔ اگر بندہ اپنی رفع مصیبت کے لئے خدا تعالیٰ کے پاس فریاد کرے تو یہ امر اس کے صبر کے منافی نہیں سمجھا جا سکتا۔

کلیات ابی البقاء میں لکھا ہے کہ اَلصَّبْرُ فِی الْمُصِیْبَةِ صبر مصیبت کے وقت ہوتا ہے۔ وَصَبَرَ الرَّجُلُ عَلَی الْاَمْرِ نَقِیْضُ جَزِعَ أَیْ جَرُؤَ شَجُعَ وَ تَجَلَّدَ اور صبر جزع فزع کرنے کے مقابل کا لفظ ہے اور صبر کے معنے ہوتے ہیں جرأت اور ہمت دکھائی۔ اور صَبَرَ عَنِ الشَّیْءِ کے معنے ہیں اَمْسَکَ عَنْہُ کسی چیز سے رُکا رہا۔ اور جب صَبَرَ کا مفعول دَآبَّة کا لفظ ہو تو اس کے معنے ہوتے ہیں حَبَسَھَا بِلَا عَلَفٍ جانور کو چارہ نہ دیا۔ اور صَبَرْتُ نَفْسِیْ عَلٰی کَذَا کے معنے ہوتے ہیں حَبَسْتُھَا میں نے فلاں بات پر ثابت قدمی دکھائی۔ گویا جب صبر کا صلہ علٰی آئے تو اس کے معنے کسی امر پر ثابت قدم رہنے کے ہوتے ہیں اور جب اس کا صلہ عن ہو تو اس کے معنے کسی چیز سے رُکنے یا کسی کو اُس سے روک دینے کے ہوتے ہیں (اقرب)۔ تاج العروس میں لکھا ہے کہ مصنف بصائر کے نزدیک صَبْرٌ کے لغوی معنے روکنے اور رُکنے کے ہیں۔ اور جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں نے صبر کیا تو اس کے معنے ہوتے ہیں حَبْسُ النَّفْسِ عَنِ الْجَزَعِ وَحَبْسُ اللِّسَانِ عَنِ الشَّکْوٰی وَحَبْسُ الْجَوَارِحِ عَنِ التَّشْوِیْشِ۔ یعنی جزع فزع سے رُکنا۔ زبان سے شکوہ نہ کرنا اور اپنے اعضاء سے کسی قسم کی گھبراہٹ کا اظہار نہ ہونے دینا۔ پس صبر کے معنے برائیوں سے رُکے رہنے اور نیکیوں پر مضبوطی سے قائم رہنے کے ہیں۔ اسی طرح صبر کے یہ معنے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں کسی تکلیف پر جزع فزع کا اظہار نہ کیا جائے۔ نہ زبان سے نہ اعضاء وجوارح سے اور نہ کسی اور طریق سے۔

تفسیر۔ پھر فرماتا ہے۔ رحمٰن کے بندوں کی ایک یہ بھی علامت ہے کہ وہ دُعا کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں اپنی بیویوں اور اولادوں کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما۔ اور ہمیں متقیوں کا امام بنا۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دورِ اقتدار میں اس دُعا کو بھی نظر انداز کر دیا اور وہ اپنی آئندہ نسلوں کی تربیت سے غافل ہو گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ایک کر کے تمام حکومتیں اُن کے قبضہ سے نکل گئیں اور اغیار نے اُن کے ملکوں پر قبضہ کر لیا۔ اگر مسلمان اپنے دورِ حکومت میں اُن بلند اخلاق کے حامل رہتے جن کا اس سورۃ میں ذکر کیا گیا ہے اور وہ رات اور دن اللہ تعالیٰ سے یہ دعائیں کرتے رہتے کہ خدایا ہمیں ایسی اولاد عطا فرما جو ہماری آنکھوں کے لئے ٹھنڈک کا موجب ہو۔ اور وہ اپنی آئندہ نسلوں کی نیک تربیت سے کبھی غافل نہ ہوتے تو وہ نالائق بادشاہ امتِ محمدیہؐ میں کیوں پیدا ہوتے جنہوں نے تخت وتاج کو اپنی عیاشیوں کی نذر کر دیا۔ اور وہ حکومتیں جو اُن کے آباؤ اجداد نے بڑی بڑی قربانیوں کے بعد حاصل کی تھیں اُن کو اپنی بدکرداریوں سے ضائع کر دیا۔ یہ تنزل مسلمانوں پر اس لئے آیا کہ وہ عباد الرحمٰن کے فرائض بھولتے چلے گئے اور جب انہوں نے خدا تعالیٰ کو بھلا دیا تو خدا بھی انہیں بھول گیا۔ اور اُس نے انہیں تاج وتخت سے محروم کر دیا بیشک یہ جو کچھ ہوا نہایت افسوسناک ہے لیکن اگر آئندہ کے لئے ہی مسلمان

عبرت حاصل کریں اور اپنی آئندہ نسلوں کی تربیت کی طرف توجہ کریں اور خدا تعالیٰ سے دُعائیں کرتے رہیں کہ وہ ان کی زندگی میں بھی اور اُن کی موت کے بعد بھی اُن کی نسلوں کو نیکی پر قائم رکھے اور ہمیشہ اُن کا وجود اُن کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک کا موجب بنے تو اب بھی وہ اپنی کھوئی ہوئی متاع کو دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں۔ پس انہیں اپنی ہمتوں کو بلند کرنا چاہیے اور مایوسی کو اپنے قریب بھی نہیں آنے دینا چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بتایا ہے کہ مومن چھوٹی چھوٹی باتوں پر راضی نہیں ہوتا بلکہ وہ لیڈر اور امام بننے کی دُعا کرتا ہے۔ مگر کن کا امام؟ متقیوں کا امام، غیر متقیوں کا نہیں۔ ممکن ہے بعض لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہو کہ ہر شخص کس طرح لیڈر اور امام بن سکتا ہے۔ سو انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ اگر مرد کوشش کرے کہ میری بیوی دین سے واقف ہو۔ نماز روزہ کی پابند ہو۔ دینی کاموں میں حصّہ لینے والی ہو بچوں کی نیک تربیت کرنے والی ہو تو مرد امام ہوگا اور بیوی ماموم۔ اسی طرح اگر ماں اپنی اولاد کی اعلیٰ تربیت کرے تو وہ امام ہوگی اور اولاد ماموم۔ اور اولاد کے نیک کام بھی اس کی طرف منسوب کئے جائیں گے۔ عورت قبر میں سو رہی ہوگی مگر جب اس کے بچے صبح کی نماز پڑھیں گے تو فرشتے لکھ رہے ہوں گے کہ اس بی بی نے صبح کی نماز پڑھی۔ اسی طرح اگر اُس نے اپنی اولاد کو تہجد کی عادت ڈالی ہوگی تو فرشتے لکھ رہے ہوں گے کہ اُس نے تہجد کی نماز پڑھی۔ یہی حال مردوں کا ہے وہ بھی جتنے لوگوں کی ہدایت کا موجب بنیں گے اُن سب کے نیک اعمال کے ثواب میں وہ بھی شریک ہوں گے۔ اس طرح وہ امام ہوں گے اور دوسرے لوگ ماموم۔

غرض اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پاک بندے ہمیشہ اپنی آئندہ نسل کی دینی و دنیوی ترقیات کے لئے دُعائیں کرتے رہتے ہیں تا کہ وہ نورِ ایمان جو اُن کے دلوں میں پایا جاتا ہے صرف اُن کی ذات تک محدود نہ رہے بلکہ قیامت تک چلتا چلا جائے اور کوئی زمانہ بھی ایسا نہ آئے جس میں اُن کی اولاد یا اُن کے متبع اور شاگرد دنیا داری کی طرف مائل ہو جائیں اور خدا اور رسول کے احکام پر دنیا کو مقدم کرلیں۔ قرآن کریم نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی ایک بڑی خوبی یہ بیان فرمائی ہے کہ كَانَ يَأْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ (مریم:۵۶) یعنی وہ اپنے بیوی بچوں اور رشتہ داروں کو نماز اور زکوٰۃ کی تاکید کیا کرتے تھے تا کہ خدائے واحد کی حکومت دنیا میں ہمیشہ قائم رہے۔ اور ہمیشہ کے لئے نماز اور زکوٰۃ کا سلسلہ جاری رہے۔ اور یہی ہر مومن کا کام ہے اور اس کا فرض ہے کہ جہاں وہ اپنی اولاد کی نیک تربیت سے کبھی غافل نہ ہو وہاں وہ اللہ تعالیٰ سے دُعائیں بھی کرتا رہے اور خود اُن کا معلم بنے اور انہیں اس قابل بنائے کہ وہ ہمیشہ اسلام کا جھنڈا اونچا رکھیں۔ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بلند کرتے رہیں۔

فرماتا ہے اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا جو لوگ خدا تعالیٰ کے لئے اس قسم کے نیک کام کریں گے اور

کوشش کریں گے کہ اُن کی آئندہ نسل نیک ہو اور وہ رات دن اُن کے لئے دعائیں کرتے رہیں گے قیامت کے دن ہم اُن کو اُن کے صبر کرنے کی وجہ سے یعنی اس وجہ سے کہ انہوں نے اپنے نفس کو بدیوں سے روکا اور اپنی اولاد کی اعلیٰ تربیت کی اور آئندہ نسل کو نیکی پر قائم کیا اونچے سے اونچے مقامات دیں گے اور خدا تعالیٰ کی طرف سے انہیں سلامتی کے پیغام پہنچیں گے اور یہ پیغام صرف ایک دفعہ پہنچ کر ختم نہیں ہو جائیں گے بلکہ دائمی طور پر پہنچتے چلے جائیں گے۔ گویا جس طرح دنیا میں انہوں نے اپنے بچوں کو جھوٹ سے اور فریب سے اور گالیوں سے اور چغل خوری سے اور خیانت سے اور ظلم سے اور فساد سے اور خونریزی سے اور چوری سے اور بہتان سے اور استہزاء سے اور سُستی سے اور ناواجب طرفداری سے اور لغویات میں حصّہ لینے سے اور اسی طرح اور ہزاروں کی قسم کی بدیوں سے روکا اور سلامتی پھیلائی اسی طرح جب وہ جنت میں جائیں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ یہ وہ بندے ہیں جن سے میرے بندے دنیا میں امن میں رہے۔ اس لئے جاؤ اور انہیں دارالسلام میں داخل کردو جہاں سلامتی ہی سلامتی ہے۔

پھر غُرْفَة کے ایک معنے جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے ساتویں آسمان کے بھی ہیں۔ اس لحاظ سے اس آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ وہ عباد الرحمٰن جنہوں نے دنیا میں انکسار اور عدل وانصاف کے ساتھ اپنی عمر بسر کی۔ جو دن کے اوقات میں بھی احکامِ الٰہی کے تابع رہے اور رات کی تاریکیوں میں بھی سجدہ و قیام میں اللہ تعالیٰ کے حضور گڑ گڑاتے اور دعائیں کرتے رہے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اُن کے درجات کو بلند کرتے ہوئے انہیں ساتویں آسمان پر جگہ عنایت فرمائے گا یعنی وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ رکھے جائیں گے کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ساتویں آسمان پر ہی ہیں (مسند احمد بن حنبل حدیث مالک بن صعصعۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی الاخلاق من قسم الاقوال) اس کی طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بھی اشارہ فرمایا ہے کہ اِذَا تَوَاضَعَ الْعَبْدُ رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَى السَّمَآءِ السَّابِعَةِ (کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۲۵ ایڈیشن اول، ترمذی ابواب البر و الصلة باب ما جاء فی التواضع) کہ جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے ساتویں آسمان میں جگہ دیتا ہے چونکہ ان لوگوں نے خدا کے لئے ھون اور تذلل اختیار کیا ہوگا اس لئے خدا تعالیٰ بھی انہیں سب سے اونچا مقام رفعت عطا فرمائے گا اور انہیں منازلِ قرب میں سے سب سے اونچی منزل عطا کی جائے گی۔ مگر چونکہ ان آیات کا تعلق مسلمانوں کے اس دَور کے ساتھ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا پر حکومت اور غلبہ عطا فرمانا تھا اس لئے اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا فرما کر اللہ تعالیٰ نے اس طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ خدائے رحمٰن کے وہ پاک بندے جو دنیا پر حکمرانی کرتے وقت اخلاقِ فاضلہ کا ایک مجسّم نمونہ ہوں گے۔ جو اپنے نشۂ حکومت میں کمزور اور

ناطاقت ممالک پر حملہ نہیں کریں گے۔ اُن کے حقوق کو سلب نہیں کریں گے اور اپنی راتیں بجائے شراب اور ناچ گانے میں بسر کرنے کے عبادت اور ذکرِ الٰہی اور دعاؤں میں بسر کریں گے اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعائیں کرتے رہیں گے کہ وہ انہیں تنزل کا شکار ہونے سے محفوظ رکھے۔ انہیں بداعمالیوں کے جہنم سے بچائے۔ انہیں دین سے غفلت اور لاپرواہی اور خدا تعالیٰ سے دُوری اور اُس سے بے تعلقی کے جہنم سے بچائے۔ اور جو اپنی حکومت کے دوران میں کسی قسم کے اسراف سے کام نہیں لیں گے اور قوم کا روپیہ اپنی عیاشیوں میں صرف نہیں کریں گے۔ نہ قومی روپیہ کے خرچ کرنے میں کس قسم کے بخل سے کام لیں گے یعنی نہ تو وہ روپیہ کا بے محل استعمال کریں گے اور نہ ایسا ہو گا کہ وہ روپیہ تو جمع کرتے رہیں اور قوم بھوک اور افلاس کا شکار رہے اور وہ اس کی ترقی کے لئے سکول اور کالج اور کنوئیں اور شفاخانے اور کارخانے اور ڈاکخانے وغیرہ جاری نہ کریں۔ اسی طرح وہ لوگ جو اپنے دورِ حکومت میں اس بات کی سختی سے نگرانی رکھیں گے کہ توحید کا قیام ہو اور اسلام کی تبلیغ اور اُس کی اشاعت کا کام وسیع پیمانہ پر جاری رہے اور وہ لوگ جو اپنی حکومت کے بل بوتے پر ناجائز خون نہیں بہائیں گے نہ زناکاری کے قریب جائیں گے نہ بالا افسروں کی خوشامد اور اُن کی چاپلوسی کے لئے جھوٹی گواہیاں دیں۔ نہ سینما اور شراب اور جوّا اور حقّہ اور دوسری منشیات اور لغویات کے قریب جائیں گے۔ اسی طرح وہ لوگ جو اپنی طاقت کے زمانہ میں خدا تعالیٰ کا نام آنے پر لرز جائیں گے۔ اور انہیں جب بھی خدا تعالیٰ کا نام لے کر کوئی نصیحت کی جائے گی تو وہ اُسے توجہ سے سُنیں گے اور اپنی کمزوریوں کو دُور کرنے کی کوشش کریں گے اور وہ لوگ جو ہمیشہ یہ دُعائیں کرتے رہیں گے کہ الٰہی تو نے ہمیں اپنے فضل سے حکومت تو عطا فرما دی ہے۔ اب ایسا فضل فرما کہ ہماری آئندہ نسل بھی حکومت کی اہل رہے اور وہ بھی تیرے نام کو بلند کرنے والی اور ہماری آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے والی ہو۔ تو اللہ تعالیٰ ایسے پاکباز لوگوں کی ان اعلیٰ درجہ کی نیکیوں اور دعاؤں کو کبھی ضائع نہیں کرے گا۔ بلکہ انہیں اپنے فضل سے ایسا غلبہ عطا فرمائے گا کہ ساری دنیا اُن کے زیرِ نگیں ہو جائے گی اور دنیا کا کونہ کونہ خدا تعالیٰ اور اُس کے رسول کے نام سے گونج اُٹھے گا۔

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ

(اے رسول) تُو ان سے کہہ دے کہ میرا رب تمہاری پرواہ ہی کیا کرتا ہے اگر تمہاری طرف سے دعا (اور استغفار)

فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ﴿۷۸﴾ ع ۶

نہ ہو۔ پس جبکہ تم نے پیغامِ الٰہی کو جھٹلا دیا تو (اب) اس کا عذاب (تم سے) چمٹا چلا جائے گا۔

حلّ لُغَات۔ مَا يَعْبَؤُ امَا يَعْبَؤُا عَبَأَ سے منفی کا صیغہ ہے اور عَبَأَ لَهٗ کے معنے ہیں قَصَدَ لَهٗ۔ اُس کا قصد کیا۔ اسی طرح کہتے ہیں مَا عَبَأْتُ بِهٖ شَيْئًا اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ لَمْ أَعُدَّهٗ شَيْئًا میں اُس کو کسی گنتی میں نہیں لاتا۔ نیز کہتے ہیں مَا أَعْبَأُ بِهٖ اور اُس کے معنے ہوتے ہیں۔ مَا كَانَ لَهٗ عِنْدِيْ وَزْنٌ وَلَا قَدْرٌ کہ اُس کی میرے ہاں کوئی قدر اور عزت نہیں۔ اسی طرح اس کے معنے ہیں مَا أُبَالِيْ۔ یعنی میں اُس کی پرواہ نہیں کرتا (اقرب)

لِزَامٌ لِزَامٌ کے معنے ہیں اَلْمَوْتُ۔ موت۔ اَلْحِسَابُ۔ حساب۔ اَلْمُلَازِمُ جِدًّا۔ سختی سے چمٹ جانے والا۔ اَلْفَصْلُ فِي الْقَضِيَّةِ۔ مقدمہ کا فیصلہ (اقرب)۔

تفسیر۔ عبادالرحمٰن کی علامات بیان کرنے کے بعد اب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے ہمارے رسول تُو ان لوگوں کو میری طرف سے سنا دے کہ اگر تم میرے ایسے بندے بنو جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے تب تو خدا تعالیٰ کی نگاہ میں تم عزت کے مستحق سمجھے جاؤ گے لیکن اگر تمہاری طرف سے دعا اور استغفار کا سلسلہ جاری نہ رہے اور تم خدا تعالیٰ کے حضور جھکنا اور عجز و انکسار اختیار کرنا اپنا شعار نہ بناؤ تو تمہارا رب تمہاری کیا پرواہ کرتا ہے۔

مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ میں مَا نافیہ بھی ہوسکتا ہے اور استفہامیہ بھی۔ مفہوم دونوں کا ایک ہی رہے گا مگر طرزِ کلام بدل جائے گی۔ اگر مَا نافیہ ہو تو آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ اے ہمارے رسول کہہ دے کہ اگر تم دُعا سے کام نہیں لو گے اور خشوع و خضوع اختیار نہیں کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری کوئی پرواہ نہیں کرے گا اور اگر مَا استفہامیہ قرار دیا جائے تو اس آیت کے معنے یوں ہوں گے کہ اے ہمارے رسول! تو ان لوگوں سے کہہ دے کہ اگر تم دعائیں نہیں کرو گے اور تضرع سے کام نہیں لو گے تو یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہاری پرواہ ہی کیا کرتا ہے۔ یعنی اُس کو تمہاری ضرورت ہی کیا ہے۔ وہ تو خود مستغنی ہے اور سب کی ضرورتیں پوری کر رہا ہے۔ یعنی صمد ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان اگر اپنی ہستی پر غور کرے تو وہ آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اُس کی کوئی احتیاج

نہیں بلکہ خود اُسے اللہ تعالیٰ کی ہر آن اور ہر لمحہ احتیاج ہے۔لیکن بعض لوگ اپنی نادانی سے یہ خیال کر لیتے ہیں کہ ہمارا نماز پڑھنا یا ہمارا صدقہ دینا یا ہمارا زکوٰۃ ادا کرنا یا ہمارا حج کرنا نعوذ باللہ خدا تعالیٰ پر کوئی احسان ہے۔اسی وجہ سے جب وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہوتے ہیں تو کہتے ہیں۔معلوم نہیں خدا نے ہمیں کیوں مصیبت میں ڈالا۔ہم تو نمازیں بھی پڑھتے ہیں اور روزے بھی رکھتے ہیں اور حج بھی کرتے ہیں اور زکوٰۃ بھی دیتے ہیں اور اسی طرح دوسرے مذہبی احکام پر بھی عمل کرتے ہیں گویا وہ اپنے دل میں یہ محسوس کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے اُن سے بدسلوکی کی ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمایا کرتے تھے کہ کسی شخص کا بیٹا مر گیا اور اُس کا ایک دوست تعزیت کے لئے اُس کے پاس گیا تو وہ چیخ مار کر رو پڑا اور کہنے لگا خدا نے مجھ پر بڑا بھاری ظلم کیا ہے گویا نعوذ باللہ اُس کا کوئی حق خدا تعالیٰ نے مار لیا تھا۔جس کا اُسے شکوہ پیدا ہوا۔مگر سوچنا چاہیے کہ وہ کون سا حق ہے جو بندہ نے خدا تعالیٰ پر قائم کیا ہے۔مجھے ہمیشہ تعجب آتا ہے کہ وہ لوگ جو اپنی نماز اور روزہ اور زکوٰۃ اور حج اور تقویٰ وطہارت پر فخر کیا کرتے ہیں وہ تو کسی تکلیف کے موقعہ پر چلا اُٹھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے ہم پر ظلم کیا۔لیکن ہندوستان کا وہ مشہور شاعر جو دین سے بالکل ناواقف تھا ایک سچائی کی گھڑی میں باوجود شراب کا عادی ہونے کے کہہ اٹھا کہ ؎

جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

(دیوان غالب صفحہ ۱۵۰)

غور کرنا چاہیے کہ جو چیز بھی انسان کے پاس سے جاتی ہے وہ آئی کہاں سے تھی؟ ذرا اپنی حیثیت کو تو دیکھو وہ کونسی چیز ہے جسے اپنی کہہ سکتے ہو۔انسان کہتا ہے میری بیوی ہے۔مگر وہ کہاں سے آئی؟ بچے جنہیں اپنا کہا جاتا ہے کہاں سے آئے ہیں۔اسی طرح مکان زمین اور سب ضروری اشیاء جنہیں اپنی سمجھا جاتا ہے کہاں سے آتی ہیں۔اگر ان چیزوں کی حقیقت پر غور کیا جائے تو بآسانی معلوم ہو جائے گا۔کہ یہ چیزیں انسان کی نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی طرف سے موہبت اور عطیہ ہیں اور عطیہ دینے والے کا حق ہے کہ وہ جب چاہے واپس لے لے بلکہ عطیہ بھی اُسے کہتے ہیں جو کبھی واپس نہ لیا جائے۔مگر دنیا میں انسان کو جو کچھ ملتا ہے وہ آخر اُس سے لیا جاتا ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں انسان کو حقیقی عطیہ بھی نہیں ملتا۔بلکہ تمام اشیاء عاریتاً استعمال کے لئے دی جاتی ہیں۔اور اس طرح چیز دینے والے کا حق ہوتا ہے کہ وہ جب چاہے واپس لے لے۔

اسی حقیقت کو بیان کرنے کے لئے ایک عرب شاعر کہتا ہے۔

أَنْتَ الَّذِیْ وَلَدَتْكَ اُمُّكَ بَاكِيًا

وَالنَّاسُ حَوْلَكَ يَضْحَكُوْنَ سُرُوْرًا

فَاحْرِصْ عَلٰی عَمَلٍ تَكُوْنُ اِذَا بَكَوْا

فِیْ وَقْتِ مَوْتِكَ ضَاحِكًا مَسْرُوْرًا

یعنی تُو وہی تو ہے کہ جب تو پیدا ہوا تھا تو تُو رو رہا تھا کیونکہ ہر بچہ پیدا ہونے کے بعد روتا ہے۔اور تیرے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگ ہنس رہے تھے کہ لڑکا پیدا ہوا ہے۔پس اب تُو ایسے اعمال کے لئے جدوجہد کر کہ جب تُو مرنے لگے تو تُو ہنس رہا ہو کہ میں اپنے خدا سے نیک بدلے لینے کے لئے جارہا ہوں اور تیرے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگ رو رہے ہوں کہ ایسا اچھا انسان ہم سے چھینا جارہا ہے۔

تو خدا تعالیٰ فرماتا ہے مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّیْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ۔تم اپنی ہستی کو کیا سمجھتے ہو؟ آخر انسان ہے کیا چیز کہ خدا تعالیٰ اُس کی پرواہ کرے۔اگر خدا تعالیٰ انسان کو خود ہی بطور احسان اپنی طرف بلانے کا سامان نہ کرتا اور اُسے فرش سے اٹھا کر عرش تک نہ پہنچا دیتا تو اپنی ذات میں وہ کیا حقیقت رکھتا تھا کہ اُس کی طرف توجہ کی جاتی۔یہ خدا تعالیٰ کا احسان ہی ہے جس نے انسان کو اٹھایا اور اُسے ترقی عطا فرمائی۔چنانچہ لَوْلَا دُعَآءُ كُمْ کے ایک معنے یہی ہیں کہ لَوْلَا دُعَآؤُهٗ اِيَّاكُمْ اِلٰی طَاعَتِهٖ یعنی اگر اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے یہ لازم نہ کرلیا ہوتا کہ میں اپنے بندوں کو پکاروں گا اور اُن کی ترقی کے سامان کروں گا تو تم ایک مشتِ خاک سے زیادہ کوئی حقیقت نہ رکھتے تھے یہ محض خدا تعالیٰ کا احسان ہی ہے کہ وہ دنیا کی گمراہی پر اپنا کوئی مامور اور مصلح کھڑا کرتا اور بھٹکتی ہوئی مخلوق کو پھر راہِ راست کی طرف لے آتا ہے۔وہ اُس کے ذریعہ گری ہوئی قوموں کو عزت دیتا اور گمنامی میں زندگی بسر کرنے والوں کو دنیا کا معلم اور بادشاہ بنا دیتا ہے۔اگر اُس نے تمہارے لئے اپنا کلام نازل نہ کرنا ہوتا تو وہ تمہاری اس قدر خاطر و مدارات کیوں کرتا اور تمہارے لئے زمین و آسمان کیوں بناتا۔پھر تو تمہاری طرف اُسے اس قدر توجہ کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔یہ محض اُس کا احسان ہے کہ وہ تمہیں اپنی طرف بلا کر تمہارے لئے عزت کے سامان پیدا کرتا ہے چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی دیکھ لو۔آپ تمام جہان سے منقطع ہو کر ایک گوشۂ گمنامی میں پڑے تھے اور غارِ حرا میں عبادتیں کیا کرتے تھے۔آپ نے وہ تمام ذرائع جو دنیوی ترقی کے حصول کے ہیں ترک کر رکھے تھے مگر آپ کے پاس خدا تعالیٰ کا فرشتہ آیا اور اُس نے کہا اُٹھ خدا تجھے بلاتا ہے۔اور پھر اُس گوشہ گمنامی سے نکال کر

اللہ تعالیٰ نے آپ کو دنیا کا بادشاہ بنادیا اور ایسی ترقی عطا کی کہ مذہب اور سیاست اور تمدن اور معاشرت سب پر آپ کا رنگ چھا گیا۔ حتّٰی کہ آپ کے غلام یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کئے بغیر اور لیبارٹریز میں تجربات کرنے کے بغیر ہی ہر فن میں دنیا کے استاد بن گئے اور جس میدان میں بھی انہوں نے قدم رکھا تمام دنیا سے آگے بڑھ گئے۔ اگر یہ خدا کی موہبت نہیں تو اور کیا چیز ہے؟

ایک صحابیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک دفعہ ایک اشرفی دی اور فرمایا کہ قربانی کے لئے بکری لے آؤ۔ میں نے سوچا کہ مدینہ میں تو اس رقم میں ایک ہی بکری ملے گی مگر کسی گاؤں سے دو مل جائیں گی اس لئے میں نے ایک گاؤں سے ایک اشرفی میں دو بکریاں خرید لیں۔ جب واپس آیا تو مدینہ میں کسی نے پوچھا کہ کیا بکری فروخت کرو گے میں نے کہا۔ ہاں؟ اور ایک بکری ایک اشرفی میں اُس کے پاس فروخت کردی۔ پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر میں نے بکری بھی پیش کردی اور اشرفی بھی۔ اور آپ کے دریافت فرمانے پر مَیں نے یہ تمام واقعہ عرض کردیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہوئے اور آپ نے مجھے دُعا دی آپ کی اس دُعا کا یہ نتیجہ ہوا کہ باوجود یہ کہ عرب ایرانیوں اور رومیوں جیسے تاجر نہ تھے پھر بھی وہ صحابیؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُس دعا کے طفیل میری یہ کیفیت ہوگئی کہ اگر میں نے مٹی بھی خریدی تو وہ سونے کے بھاؤ بک گئی۔ لوگ زبردستی اپنا روپیہ میرے پاس تجارت کے لئے چھوڑ جاتے تھے اور میں لینے سے انکار کرتا رہتا تھا۔

یہ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ کی صداقت ہی کا ایک کرشمہ تھا ورنہ اس میں اپنے کسی ہنر یا محنت کا دخل نہ تھا۔ یہ خدا تعالیٰ کی اپنی آواز تھی جس کے ذریعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھے اور آپ کے ساتھ ہی آپ کے وابستگانِ دامن بھی بڑھتے چلے گئے۔ جیسے اگر کوئی شخص گھوڑے پر سوار ہو تو اُس کا کوٹ اور پاجامہ اور دوسرے کپڑے بھی ساتھ ہی سوار ہو جاتے ہیں۔ پھر صحابہؓ نے یہاں تک ترقی کی کہ قیصر وکسریٰ کے خزائن مسلمانوں کے قبضہ میں آئے اور وہ بڑے بڑے ملکوں کے بادشاہ بن گئے۔ یہ بھی لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ کی صداقت کا ہی ظہور تھا کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت خدا تعالیٰ کے فضل کے نتیجہ میں ہوئی اور پھر جب آپ بڑھے تو آپ کے وابستگانِ دامن بھی ساتھ ہی ترقی کر گئے۔ یہی حکمت ہے جس کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (التوبة:۱۱۹) کی تاکید فرمائی ہے کیونکہ جب صادقین کے لئے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا پھاٹک کھلتا ہے تو ساتھ ہی اُن کی معیّت اختیار کرنے والے بھی داخل ہو جاتے ہیں۔

پھر لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ کے دوسرے معنے یہ ہیں کہ لو لا تضرعکم الیہ یعنی اگر تم اس کو نہ پکارو۔ اور اُس کے حضور گریہ و بکا نہ کرو اور عجز اور انکسار کے ساتھ اُس کے آگے جھک کر یہ نہ کہو کہ الٰہی ہمارا تو کوئی حق نہیں اگر تو ہم پر

احسان کر دے تو تیری ذرہ نوازی ہے تو اللہ تعالیٰ کو تمہاری کیا پرواہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہب کی جان اور اُس کا خلاصہ اور اس کی رُوح اگر کوئی چیز ہے تو وہ صرف دُعا ہی ہے۔ مگر دُعا اس امر کا نام نہیں کہ انسان صرف مونہہ سے ایک بات کہہ دے اور سمجھ لے کہ دُعا ہوگئی۔ دعا اللہ تعالیٰ کے حضور پگھل جانے کا نام ہے دُعا ایک موت اختیار کرنے کا نام ہے۔ دُعا تذلل اور انکسار کا مجسم نمونہ بن جانے کا نام ہے۔ جو شخص صرف رسمی طور پر مونہہ سے چند الفاظ دہراتا چلا جاتا ہے اور تذلّل اور انکسار کی حالت اس کے اندر پیدا نہیں ہوتی۔ جس کا دل اور دماغ اور جس کے جسم کا ہر ذرّہ دُعا کے وقت محبت کی بجلیوں سے تھرتھرا نہیں رہا ہوتا وہ دُعا سے تمسخر کرتا ہے۔ وہ اپنا وقت ضائع کر کے خدا تعالیٰ کا غضب مول لیتا ہے۔ پس ایسی دُعا مت کرو جو تمہارے گلے سے نکل رہی ہو اور تمہارے اندر اس کے مقابل پر کوئی کیفیت پیدا نہ ہو۔ وہ دعا نہیں بلکہ الٰہی قہر کو بھڑکانے کا ایک شیطانی آلہ ہے۔ جب تم دُعا کرو تو تمہارا ہر ذرہ خدا تعالیٰ کے جلال کا شاہد ہو تمہارے دماغ کا ہر گوشہ اس کی قدرتوں کو منعکس کر رہا ہو۔ اور تمہارے دل کی ہر کیفیت اس کی عنایتوں کا لطف اٹھا رہی ہو۔ تب اور صرف تب تم دُعا کرنے والے سمجھے جا سکتے ہو۔ یہ کیفیت پیدا ہونی بظاہر مشکل نظر آتی ہے مگر جس شخص کے ایمان کی بنیاد عشقِ الٰہی پر ہو۔ اس کے لئے اس سے زیادہ آسان اور کوئی شئ نہیں بلکہ اُس کی طبیعت کا یہ کیفیت ایک خاصہ بن جاتی ہے اور وہ ہر وقت اس سے لطف اندوز ہو رہا ہوتا ہے۔ ایسے انسان کو یہ ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ الگ جا کر اور مصلّٰی پر بیٹھ کر دُعائیں کرے بلکہ وہ خلوت وجلوت میں دُعا کر رہا ہوتا ہے۔ اور جب اُس کی زبان پر اَور اَور کلام جاری ہوتے ہیں اور اس کی آنکھوں کے آگے اَور اَور نظارے پھر رہے ہوتے ہیں اُس کی رُوح اپنے مالک وخالق کے عتبۂ رحمت پر گری ہوئی اپنے لئے اور ساری دنیا کے لئے طلب گارِ رحمت ہو رہی ہوتی ہے۔ مگر فرماتا ہے فَقَدۡ کَذَّبۡتُمۡ فَسَوۡفَ یَکُوۡنُ لِزَامًا۔ چونکہ تم پہلے ہی خدا تعالیٰ کے پیغام کو ردّ کر چکے ہو اس لئے اب اس تکذیب کا وبال تمہارے سر پر پڑے گا۔ اور اس کا عذاب تمہارے ساتھ چپک جائے گا۔ یعنی وہ لمبا ہوتا چلا جائے گا اور تم خود بھی اس دنیا میں ذلیل ہو گے اور تمہاری آئندہ نسلیں بھی ہر قسم کی برکتوں سے محروم رہیں گی۔ یہ کتنا خطرناک وعید اور انذار ہے۔ کاش دنیا کے لوگ اس بات کو سمجھیں کاش وہ اپنی عاقبت برباد نہ کریں۔ کاش وہ اپنی اصلاح کریں۔ کاش وہ خدا کی باتوں کی طرف توجہ کریں تا کہ واحد ویگانہ خدا اُن کی پرواہ کرنے لگے اور وہ اُن کے دلوں کو پاک کر کے پھر اپنی محبت کی گود میں بٹھا لے۔

وَاٰخِرُ دَعۡوٰنَاۤ اَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ

سُوْرَةُ الشُّعَرَآءِ مَكِّيَّةٌ

سورۃ شعراء یہ سورۃ مکّی ہے۔

وَهِيَ مَعَ الْبَسْمَلَةِ مِائَتَانِ وَثَمَانٍ وَّعِشْرُوْنَ اٰيَةً وَّاَحَدَ عَشَرَ رُكُوْعًا

اور بسم اللہ سمیت اس کی دوسو اٹھائیس (۲۲۸) آیتیں ہیں۔اور گیارہ رکوع ہیں

زمانۂ نزول سورۂ شعراء اکثر مفسرین کے نزدیک مکی ہے مگر مقاتل کہتے ہیں کہ اس میں کچھ آیتیں مدنی بھی ہیں۔جیسا کہ وہ آیت جس میں شعراء کا ذکر ہے (آیت ۲۲۵) اسی طرح وہ آیت جس میں ذکر ہے کہ کیا ان کے لئے یہ نشان کم ہے کہ علماء بنی اسرائیل بھی اس قرآن کو پہنچانتے ہیں یعنی سمجھتے ہیں کہ یہ قرآن انبیاء بنی اسرائیل کی پیشگوئیوں کے مطابق ہے۔(آیت ۱۹۸)

ابن عباسؓ اور قتادہؒ کا قول ہے کہ اس میں سے صرف چار آیتیں مدنی ہیں باقی سب سورۃ مکی ہے اور وہ چار آیتیں وہ ہیں جو وَ الشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ سے آخر تک چلتی ہیں۔(آیت ۲۲۵ تا ۲۲۸)(تفسیر القرطبی سورۃ الشعراء ابتدائیہ) لیکن اس قسم کی موشگافی کی وجہ یا تو یہ ہوا کرتی ہے کہ بعض مضامین کو مفسرین مدینہ یا مکہ کے مناسب حال سمجھ لیتے ہیں یا کسی ایسے واقعہ کو جو ان آیات سے مناسبت رکھتا ہے اپنے قیاس کا موجب بنا لیتے ہیں۔ ورنہ بلا کسی خاص دلیل یا تاریخی گواہی کے یہ تفریق پیدا کرنا درست نہیں۔مثلاً مقاتل نے اَوَ لَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (آیت ۱۹۸) کو صرف اس لئے مدنی قرار دے دیا ہے کہ اس میں علماء بنی اسرائیل کا ذکر ہے حالانکہ سورۂ مریم قطعی اور یقینی طور پر مکی ہے (تفسیر القرطبی سورۃ مریم ابتدائیہ) اور وہ ساری کی ساری عیسائیت اور یہودیت کے ذکر سے پُر ہے۔اسی طرح سورۂ طٰہٰ قطعی اور یقینی طور پر مکی ہے (تفسیر القرطبی سورۃ طٰہٰ ابتدائیہ) مگر وہ بھی بنی اسرائیل کے ذکر سے پر ہے۔اور ابن عباسؓ اور ان کے دو شاگردوں نے آخری آیتوں کو صرف اس لئے مدنی قرار دے دیا ہے کہ ان میں شعراء کا ذکر ہے۔اور شعر پر زور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مدنی میں دیا گیا تھا۔اس سے پہلے مسلمانوں میں شاعر نہ تھے اور ان آیات میں یہ ذکر ہے کہ شاعر محض تُک بند ہوتے ہیں سوائے نیک شاعروں کے۔مگر یہ استدلال درست نہیں کیونکہ بغیر کسی واقعہ کے بھی تو اصول بیان کئے جاتے ہیں۔ اگر اسی طرح دلائل قائم کئے جائیں تو شاید ارسطو کی کتب اور سقراط کی کتب سے اس کے عجیب وغریب سوانح زندگی تیار کر لئے جائیں۔آخر انسان واقعات سے جُدا ہو کر بھی تو سوچتا ہے پھر اس کے لئے یہ کیا مشکل ہے کہ وہ یہ سمجھ لے

کہ اگر قرآن خدا کا کلام نہیں تو بھی اس میں جاری واقعات سے الگ ہو کر بھی کوئی مضمون آسکتا ہے۔ سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ غلطی ابتدا میں خود مسلمانوں کو لگی ہے پھر مسیحیوں نے اُسے اُچھالا ہے۔ مگر جس نے بھی غور کیا ہے باوجود دشمن کے اس استدلال کی غلطی کو سمجھ گیا ہے۔ چنانچہ ریورنڈ وہیری نے اپنی تفسیر میں اس قسم کے استدلال کو غلط قرار دیا ہے۔ اور اس سورۃ کو یقینی طور پر مکی قرار دیا ہے (تفسیر القرآن از وہیری جلد ۳ صفحہ ۱۹، ۲۰ سورۃ الشعراء ابتدائیہ) پس اس قسم کا اجتہاد قطعاً درست نہیں ہوسکتا خواہ مسلمان ایسا کریں یا عیسائی کریں۔ سورتوں کا زمانہ ہم صرف تاریخی شواہد سے متعین کر سکتے ہیں۔ اور وہ بھی محض اس حد تک کہ فلاں سورۃ یا اس کا معتدبہ حصہ فلاں زمانہ میں اترا ہے۔ اس سے زیادہ باتیں جو قیاس سے معلوم کی جائیں ہمیں غلطی کی طرف لے جاسکتی ہیں۔ لیکن ان سے فائدہ کوئی نہیں ہوسکتا۔

ترتیب سور سورۃ الفرقان کے آخر میں یہ بتایا گیا تھا کہ یہ خیال مت کرو کہ اللہ تعالیٰ اس نظام کو تباہ کر دے گا جو اس وقت دیر سے قائم شدہ مذہبوں کے ذریعہ سے دنیا میں جاری ہے بلکہ یہ سوچو کہ اللہ تعالیٰ نے تو انسان کو اپنی آواز پر لبیک کہنے اور اپنے اخلاق کو ظاہر کرنے کے لئے پیدا کیا تھا اگر وہ اس غرض کو پورا نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ کو ایسے انسان یا اس کے نظام کے قائم رکھنے کی ضرورت کیا ہے۔ اور اُسے اس کے تباہ کرنے کا غم کیوں ہو؟ اب اس سورۃ میں یہ بتایا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی محبت اور بنی نوع انسان کی ہمدردی کی وجہ سے اس پیش نظر خطرہ سے گھبراتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ بجائے تباہی کے اگر انسان کو بچا لیا جائے تو اچھا ہے۔ یہ بے شک ان کی محبت کا ثبوت ہے لیکن خدا تعالیٰ کی سکیم کے مطابق نہیں۔ کیونکہ خدائی سکیم یہ ہے کہ انسان کو علم و عرفان دے کر اس امر کا موقع دیا جائے کہ وہ اپنی مرضی اور اپنی کوشش سے خدا تعالیٰ کے قرب کا راستہ تلاش کرے اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کے طبعی نتائج بھگتے۔ اگر اللہ تعالیٰ ایسا نہ کرتا تو انسان ایک مشین تو بن جاتا مگر خدا تعالیٰ کی شکل پر بنایا ہوا وجود نہ ہوتا۔ پس باوجود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمدردی اور محبت اور شدید خواہش کے انسان کو خدائی سکیم کے مطابق چلنا ہوگا۔ اس کے بغیر وہ حقیقی نجات نہیں پاسکتا۔

اس سورۃ سے مسیحیوں اور یہودیوں سے خطاب جو سورۂ یونس سے شروع تھا اُس کا رُخ بدل کر پھر مسلمانوں کی طرف کیا گیا ہے اور اسی وجہ سے مقطعات میں تبدیلی کی گئی ہے۔

اس سورۃ کا نام **شعراء** اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس سورۃ کا مضمون بتاتا ہے کہ انسانی ترقی قول اور عمل میں یک رنگی سے ہی حاصل ہوتی ہے اور وہ لوگ جو کہتے کچھ اور ہیں اور کرتے کچھ اور ہیں شعراء کی طرح وہ کامیاب نہیں

ہوتے۔ گویا بتایا کہ اس زمانہ میں صرف مسلمان ہی ایسے ہوں گے جن کا قول و فعل یکساں ہوگا۔ اس لئے وہی جیتیں گے۔ دوسرے لوگ مثالی طور پر شعراء کی طرح ہیں۔ یعنی دعوے تو بہت کرتے ہیں لیکن عمل کم ہے اس وجہ سے وہ مسلمانوں کے مقابل پر نہیں جیت سکتے۔

سورۃ شعرآء کے مضامین کا خلاصہ اس سورۃ کے شروع میں بتایا گیا ہے کہ اس سورۃ اور اس کی تابع سورتوں میں اللہ تعالیٰ کی ان تین صفات کی تشریح کی گئی ہے۔ (۱) **لطیف** (۲) **سمیع** اور (۳) **مجید**۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے مخفی سے مخفی رازوں کے واقف ہونے، دعاؤں کے سننے اور اس کے مجید ہونے پر یعنی ان قوانین پر جن سے اس کی اعلیٰ شان ظاہر ہوتی ہے ظلم اور جبر ثابت نہیں ہوتا اِس سورۃ میں روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کے دلائل دیئے گئے ہیں۔ (آیت ا و ۲)

یہ کتاب اپنے دعاوی کے دلائل خود دیتی ہے۔ کسی اَور کی مدد اور وکالت کی محتاج نہیں ہے (آیت ۳)

پچھلی سورتوں میں جو کفار کی تباہی کی خبر دی گئی تھی اور کہا گیا تھا کہ خدا ان پر رحم نہیں کرے گا۔ اس پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کی خیر خواہی کی وجہ سے سخت تکلیف پہنچی ہے مگر یہ غم بیکار ہے۔ کیونکہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ جبراً ہی مومن بنا سکتا ہے اور اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ (آیت ۴ و ۵)

ذاتی طور پر یہ لوگ حقائق کے ماننے سے دور ہو چکے ہیں اور ہر سچائی پر ہنسی اُڑاتے ہیں۔ (آیت ۶ و ۷)

دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ہر ضرورت کے سامان پیدا کئے ہیں اور قسم قسم کے جوڑے بنائے ہیں پھر کیوں خدائی سلسلہ میں بھی جوڑے نہ ہوں۔ یعنی مثیل موسیٰ ؑ اور مثیلِ عیسیٰ ؑ پیدا نہ ہوں۔ اگر ایسا ہو تو قابل اعتراض امر نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی طاقت اور اُس کی رحمت ہی کا ثبوت ملتا ہے۔ (آیت ۸ تا ۱۰)

کیا یہ لوگ موسیٰ ؑ کو نہیں دیکھتے کہ خدا نے اُسے فرعون کی طرف بھیجا۔ اور اُس نے جانے سے بھی پہلے اپنے مُلکیوں کی سنگدلی سے خوف کیا اور چاہا کہ عذر سن کر اُسے معاف کیا جائے اور ہارون کو مقرر کر دیا جائے۔ لیکن خدا تعالیٰ نے اُس کا عذر نہ سنا کیونکہ وہی سب سے بہتر وجود اس کام کے لئے تھا ہاں ہارون کو اس کے ساتھ ملا دیا۔ اور فرمایا کہ جا کر فرعون کو ہمارا پیغام سنا دو۔ ہم تمہارے ساتھ ہوں گے اور اس سے کہہ دو کہ وہ بنی اسرائیل کو ملک سے نکلنے دے۔ (آیت ۱۱ تا ۱۸)

فرعون نے اس پر سابق احسان جتائے اور اس کی زندگی پر کچھ اعتراضات کئے۔ اور اُسے احسان فراموش قرار دیا۔ موسیٰ ؑ نے اِس کے جواب دیئے اور کہا کہ اگر مَیں ایسا ہوتا تو خدا مجھے اپنی رسالت کے لئے کیوں چن

لیتا۔ (آیت ۱۹ تا ۲۲)

اور پھر کہا کہ تیرے احسان مجھ پر اس جرم کے مقابل کیا ہیں کہ تُو نے میری ساری قوم کو غلام بنا رکھا ہے (آیت ۲۳)

فرعون نے شرمندہ ہو کر بات بدلی اور خدا تعالیٰ کی ہستی کے متعلق سوالات شروع کر دیئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیئے۔ آخر تنگ آ کر اُس نے دھمکی دی کہ میرے سوا کوئی اور معبود مانا تو قید کر دوں گا۔ موسیٰ ؑ نے کہا۔ خدا کے شواہد تو دیکھ۔ اُس نے کہا۔ اگر کچھ شواہد ہیں تو لا۔ اِس پر موسیٰ ؑ نے اپنا عصا پھینکا جو فرعون کو ایک اژدہا نظر آیا۔ اور موسیٰ ؑ نے اپنا ہاتھ بغل سے نکالا تو وہ چمک رہا تھا۔ فرعون نے اِن امور کو سحر قرار دیا۔ اور قوم کو بھڑکایا کہ یہ سیاسی فضیلت چاہتا ہے۔ انہوں نے ساحروں سے مقابلہ کروانے کا مشورہ دیا۔ ساحر بلوائے گئے تو وہ مغلوب ہوئے اور موسیٰ ؑ پر ایمان لے آئے۔ (آیت ۲۴ تا ۵۲)

اِس پر ہم نے موسیٰ ؑ کو اپنی قوم اس ملک سے نکال لے جانے کا حکم دیا۔ (آیت ۵۳)

فرعون نے قوم کو غیرت دلائی۔ پیچھا کیا لیکن برباد ہوا اور جو نعمتیں اُسے حاصل تھیں ویسی ہی نعمتیں موسیٰ ؑ کو عطا کرنے کی خدا نے تدبیر کی (چنانچہ شام کا علاقہ مصر سے بالکل مشابہ کہا جا سکتا ہے بلکہ وہ علاقہ مصر سے بھی بہتر ہے)۔ (آیت ۵۴ تا ۶۰)

فرعون اپنے لشکروں سمیت آگے بڑھا تو موسیٰ ؑ کی قوم ڈری۔ مگر موسیٰ ؑ نے تسلی دی۔ پھر اللہ تعالیٰ معجزانہ طور پر موسیٰ ؑ کو سمندر میں سے خشک نکال کر لے گیا اور فرعون کو غرق کر دیا۔ (آیت ۶۱ تا ۶۹)

پھر ابراہیم ؑ کو دیکھ۔ اس نے اپنی قوم کو توجہ دلائی کہ خدا تعالیٰ سنتا ہے اور تمہارے بت سنتے نہیں اور بے طاقت ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ کچھ ہو ہم اپنے باپ دادا کے مذہب کو نہیں چھوڑ سکتے۔ ابراہیمؑ نے کہا کہ وہ سب حق کے خلاف تھے لیکن مَیں تو اُسی خدا کو مانتا ہوں جو فعّال ہے اور دنیا کے کاموں میں اس کا دخل جاری ہے۔ اُس کی طرف سے ہدایت بھی آتی رہتی ہے۔ جسمانی رزق بھی آتا رہتا ہے۔ شفا بھی آتی رہتی ہے۔ موت کے بعد حیات بھی آتی رہتی ہے اور مرنے کے بعد بھی اُسی پر امیدیں ہیں۔ (آیت ۷۰ تا ۹۰)

اللہ تعالیٰ کی ہمیشہ سے یہ سنت چلی ہوئی ہے کہ وہ نیکوں کی مدد کرتا ہے اور بدوں کو سزا دیتا ہے۔ مجرم لوگ پہلے تو اکڑتے ہیں۔ لیکن پھر منت وسماجت پر اُتر آتے ہیں۔ یہ سب باتیں خدا تعالیٰ کے بادشاہ اور رحمٰن ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ (آیت ۹۱ تا ۱۰۵)

پھر نوح ؑ کو دیکھو۔ اُس نے بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہونے کا دعویٰ کیا۔ نیکی کی تعلیم دی۔ اور بغیر

کوئی بدلہ لئے خدمت کرنی چاہی ۔لیکن لوگوں نے اس پر یہ اعتراض کیا کہ اس کے ماننے والے ادنیٰ درجہ کے لوگ ہیں یہ کیونکر جیت سکتے ہیں ۔مگر نوحؑ نے کہا کہ ادنیٰ اور اعلیٰ کا معیار اعمال صالحہ پر ہے ۔نہ کہ قوم اور حکومت پر ۔(آیت ۱۰۶ تا ۱۱۶)

مخالفوں نے بجائے جواب کے دھمکیاں دینی شروع کر دیں ۔اِس پر انہوں نے خدا سے فیصلہ چاہا ۔اور مخالفوں کے دنیوی سامان سب دھرے کے دھرے رہ گئے ۔اور وہی ہوا جو خدا نے چاہا تھا ۔(آیت ۱۱۷ تا ۱۲۳)

پھر عاد کے رسول ہودؑ آئے ۔اُن سے بھی اِسی طرح ہوا ۔انہوں نے بھی قوم کو توجہ دلائی کہ ظاہری شان وشوکت سے قوم زندہ نہیں رہتی باطنی اخلاق سے زندہ رہتی ہے ۔اور وہ تم میں مفقود ہیں ۔انہوں نے کہا کہ یہ باتیں پہلے بھی لوگ کہتے رہے ہیں ۔مگر کسی کا کچھ نہیں بگڑا ۔مگر آخر وہ بھی پکڑے گئے ۔(آیت ۱۲۴ تا ۱۴۱)

پھر ثمود کی قوم کی طرف صالحؑ آئے ۔انہوں نے بھی بے بدلہ خدمت کا اعلان کیا اور بتایا کہ ظاہری شان وشوکت روحانی طاقت کے بغیر تباہی کی طرف لے جاتی ہے ۔مگر قوم نے انکار کیا کہ اپنے جیسے آدمی کی اطاعت کیوں کریں ۔آخر وہ بھی پکڑے گئے ۔(آیت ۱۴۲ تا ۱۶۰)

اِسی طرح لوطؑ آئے اور ان کی قوم کے ساتھ بھی اِسی طرح کا معاملہ گذرا ۔وہ اخلاقی بدیوں کا شکار تھے ۔(آیت ۱۶۱ تا ۱۷۶)

پھر اصحاب الایکہ کا زمانہ آیا ۔ان کے نبی شعیبؑ کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ ہوا ۔اور ان کے مخالف پکڑے گئے وہ تجارتی بددیانتی کا شکار تھے ۔(آیت ۱۷۷ تا ۱۹۲)

یہ قرآن بھی خدائی کلام ہے اور اپنی دلیلیں خود دیتا ہے ۔پہلے نبیوں نے اس کی پیشگوئیاں کی ہیں اور بنی اسرائیل کے علماء بھی اپنی کتب کے ذریعہ سے اس کی صداقت جانتے ہیں ۔پھر وہ اپنی پہلی مخاطب قوم کی زبان میں آیا ہے ۔اگر غیر زبان ہوتی تو وہ اُسے سمجھ نہ سکتے مگر اب غور نہ کرنے کی کیا وجہ ہے ۔وجہ وہی ہے جو پہلے نبیوں کی قوموں کے نہ ماننے کی تھی ۔یہ عذاب کے منتظر ہیں مگر جب وہ آیا تو اُنہیں کیا فائدہ ہوگا ؟ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واقعہ میں سچے ہیں تو ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ ان کا آنا اصلاح نہ کرنے والوں کے لئے عذاب کا اعلان ہے ۔(آیت ۱۹۳ تا ۲۱۰)

لوگ اس کی تعلیم کو دیکھیں کہ کیا اس میں شیطان کی تائید ہے ؟ اگر نہیں تو شیطان نے خدا کی تائید کیوں کرنی تھی اور وہ اعلیٰ پُر معارف کلام کس طرح کر سکتا تھا اِس میں تو نبیوں والی باتیں ہیں اور نبیوں والی باتوں کو شیطان سن ہی

نہیں سکتا۔ پس اے ہمارے رسولؐ! خدائے واحد کی تبلیغ کرتا چلا جا۔ اور سب سے پہلے اپنی قوم کو تبلیغ کر۔ اور جو ایمان لائیں ان کی تربیت کر اور جو نافرمانی کریں اُن سے برأت ظاہر کر اور عزیز و رحیم خدا پر توکل کر۔ وہ تجھے دیکھتا ہے اور تجھ کو طاقتور بنانے والا ہے۔ عنقریب مسلمانوں کا بکھرے ہوئے ہونا دور ہو جائے گا۔ اور وہ ایسی جگہ پر جائیں گے جہاں اُنہیں اکٹھا رہنے کا موقعہ ملے گا۔ اور وہ خدائے واحد کی عبادت آزادی سے کریں گے۔ کیونکہ وہ فریادیں سننے والا ہے۔

شیطان تو ان لوگوں پر اُترتے ہیں جو جھوٹے اور گنہگار ہوں۔ وہ آسمانی باتیں سننے کے لئے کان رکھتے ہیں اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہیں۔ اور شعراء کی پیروی آوارہ گرد لوگ کرتے ہیں۔ جنہیں صرف زبان کا چسکہ ہوتا ہے۔ عمل نہ اُستاد کریں نہ شاگرد۔ لیکن مومن تو عبادت گذار اور سچ کے مبلّغ ہوتے ہیں۔ وہ سچ کی وجہ سے تکلیفیں بھگتتے ہیں اور مجبور ہو کر جواباً ہاتھ اُٹھاتے ہیں۔ لیکن ان کے سچا ہونے کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ کمزور ہوتے ہوئے وہ اپنے دشمنوں پر غالب آجاتے ہیں۔ (آیت ۲۱۱ تا ۲۲۸)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ﴿۱﴾

(میں) اللہ (تعالیٰ) کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (پڑھتا ہوں)

طٰسٓمّٓ ﴿۲﴾ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ ﴿۳﴾

طاہرؔ (اور) سمیعؔ (اور) مجید (خدا اِس سورۃ کا نازل کرنے والا ہے) یہ آیتیں اس کتاب کی ہیں جو (اپنے مضامین

لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفۡسَکَ اَلَّا یَکُوۡنُوۡا مُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۴﴾

کو) کھول کر بیان کرتی ہے۔ شاید تُو اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالے گا کہ وہ کیوں نہیں مومن ہوتے۔

حلّ لُغات۔ مُبِیْنٌ مُبِیْنٌ اَبَانَ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے اور اَبَانَ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ یعنی کبھی اِس کے معنے ظاہر کرنے کے ہوتے ہیں اور کبھی ظاہر ہونے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اقرب الموارد میں لکھا ہے۔ اَبَانَ الشَّیْءُ اِتَّضَحَ یعنی اَبَانَ الشَّیْءُ کے معنے ہوتے ہیں فلاں چیز ظاہر ہوگئی اور اَبَانَ فُلَانٌ الشَّیْءَ کے معنے ہوتے ہیں اَوْضَحَہٗ کسی بات کو خوب واضح اور نمایاں کیا۔ (اقرب الموارد)

بَاخِعٌ باخع بَخَعَ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ اور بَخَعَ بِالشَّاۃِ کے معنے ہیں بَلَغَ بِذَبْحِھَا الْقَفَا۔ بکری کی گردن پر چھری چلاتے اور اُسے ذبح کرتے ہوئے کوئی شخص اس کی گردن کے آخری حصہ تک اپنی چُھری لے گیا (اقرب) نیز اَلْبَخَعُ بَخَعَ کا مصدر ہے۔ اور اس کے معنے ہیں قَتْلُ النَّفْسِ غَمًّا اپنے نفس کو غم کی وجہ سے ہلاک کر دینا۔ (مفردات)

تفسیر۔ طٰسٓمّٓ جو حروف مقطعات میں سے ہیں اِن میں سے طؔ لطیف کا سؔ سمیع کا اور مؔ مجید کا قائم مقام ہے۔ گویا اس سورۃ اور اس کی تابع سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے محسنِ عظیم ہونے اُس کے مخفی سے مخفی رازوں سے واقف ہونے۔ اپنے بندوں کی دعائیں سننے اور اس کے مجید ہونے پر یعنی ان قوانین پر جن سے اُس کی اعلیٰ اور بلند شان ظاہر ہوتی ہے ظلم اور جبر ثابت نہیں ہوتا روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور اس کے دلائل دیئے گئے ہیں۔ (مقطّعات کی تفصیلی بحث کے لئے دیکھیں تفسیر کبیر سورۃ یونس)

اسلام کو دوسرے مذاہب پر جو امتیازی خصوصیات حاصل ہیں ان میں سے ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ

اسلام نے صفاتِ الٰہیہ کا ایک ایسا مکمل نقشہ پیش کیا ہے جو پہلی الہامی کتب میں سے کسی کتاب میں بھی نہیں پایا جاتا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جہاں تک خدا تعالیٰ کی ہستی کو پیش کرنے کا سوال ہے دنیا کی ہر الہامی کتاب نے اُس کے وجود کو پیش کیا ہے اور اس پر ایمان لانے کی اہمیت کو ظاہر کیا ہے۔ کیونکہ مذہب کا نقطۂ مرکزی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور اگر کوئی مذہب اللہ تعالیٰ کو ہی پیش نہ کرے تو اُس کا وجود اور عدم برابر ہوجاتا ہے۔ مگر یہ کہ خدا تعالیٰ اپنی ذات میں کیا صفات رکھتا ہے یا اپنے بندوں سے وہ کس رنگ میں تعلقات رکھتا اور ان سے سلوک کرتا ہے۔ اِن امور پر ان کتب میں کوئی تفصیلی روشنی نہیں ڈالی گئی۔ صرف یہ کہہ دینا کہ ہمارا خدا محبت ہے (یوحنا باب ۴ آیت ۸) یا ہمارا خدا بڑا دیالو اور کرپالو ہے اُس کی صفاتِ حسنہ کا کوئی حقیقی اور صحیح نقشہ نہیں کہلا سکتا۔ بلکہ اس قسم کی صفات کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا دنیوی خیالات اور رجحانات کا بھی نتیجہ کہلا سکتا ہے۔ مثلاً جب دیکھا کہ لوگ رحم کرنا پسند کرتے ہیں تو کہہ دیا کہ خدا تعالیٰ بھی بڑا رحم کرنے والا ہے یا جب دیکھا کہ لوگ حسنِ سلوک کو بڑا اچھا وصف سمجھتے ہیں تو خدا تعالیٰ کے متعلق بھی کہہ دیا کہ وہ بڑا کرپالو ہے۔ پس محض چند صفات کے ذکر سے یہ ثابت نہیں ہوسکتا کہ پہلے مذاہب نے اس مسئلہ پر کوئی تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ پھر اگر بعض صفات کا ان کتب میں ذکر موجود بھی ہے تو ان صفات کی تشریح ان میں موجود نہیں اور نہ ہی صفاتِ الٰہیہ کا باہمی تعلق واضح کیا گیا ہے۔

مجھے یاد ہے ایک دفعہ میں نے رؤیا میں دیکھا کہ ایک جرمن نومسلم نے مجھ سے کوئی سوال کیا ہے جس کے جواب میں مَیں نے اللہ تعالیٰ کی بعض صفات پیش کی ہیں جن میں سے ایک ربّ بھی ہے۔ اس پر اُس جرمن نومسلم نے کہا کہ ان صفات کا ذکر تو بائیبل میں بھی آتا ہے۔ اس فقرہ کے دونوں معنے ہوسکتے تھے۔ یہ بھی کہ چونکہ بائیبل میں بھی بعض صفات کا ذکر ہے اس لئے یہ دلائل عیسائیوں پر بھی اثر کرسکتے ہیں اور یہ معنے بھی ہوسکتے تھے کہ گویا قرآن کریم بائیبل کی نقل کرتا ہے۔ میں نے ان دونوں معنوں کا خیال کرکے دل میں سوچا کہ یہ نومسلم ہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے دل میں یہ خیال آیا ہو کہ قرآن کریم کی بہت سی تعلیم بائیبل سے ملتی جلتی ہے پھر اس کی فضیلت کیا ہوئی؟ اس خیال کے پیدا ہونے پر میں نے بڑے جوش سے ان کے سامنے تقریر شروع کی کہ بائیبل میں جو یہ صفات آئی ہیں ان سے قرآنی صفات کو امتیاز حاصل ہے۔ بائیبل میں محض رسمی ناموں کے طور پر وہ صفات بیان کی گئی ہیں اور قرآن کریم نے ان صفات کی باریکیوں کو بیان کیا ہے اور ان مضامین میں وسعت پیدا کی ہے اور ان کے راز بیان کئے ہیں۔ چنانچہ میں نے کہا۔ دیکھو ربّ کا لفظ ہے بائیبل نے بھی خدا تعالیٰ کو پیدا کرنے والا یا پالنے والا کہا ہے یا زمین و آسمان کا خالق کہا ہے۔ لیکن قرآن کریم یہ نہیں کہتا بلکہ قرآن کریم سورۂ فاتحہ میں خدا تعالیٰ کو رَبُّ الْعَالَمِيْنَ

کے طور پر پیش کرتا ہے اور لفظ ربّ اور لفظ عالمین دونوں اپنے اندر امتیازی شان رکھتے ہیں۔ ربّ صرف اسی مضمون پر دلالت نہیں کرتا کہ وہ پیدا کرنے والا ہے اور پالنے والا ہے بلکہ اس امر پر بھی دلالت کرتا ہے کہ وہ نہایت ہی مناسب طور پر انسان کی باریک در باریک قوتوں اور طاقتوں کو درجہ بدرجہ اور مناسبِ حال ترقی دیتا چلا جاتا ہے۔ اور عالمین کا لفظ محض زمین اور آسمان پر دلالت نہیں کرتا بلکہ زمین و آسمان کے علاوہ مختلف اصناف کی مختلف کیفیتوں پر بھی دلالت کرتا ہے اور یہ مضمون پہلی کتب میں بالکل بیان نہیں ہوا۔ مثلاً عالمین میں جہاں یہ مراد ہے کہ اس جہان کا بھی ربّ ہے اگلے جہان کا بھی ربّ ہے۔ آسمانوں کا بھی ربّ ہے اور زمینوں کا بھی ربّ ہے۔ وہاں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ عالمِ اجسام اور عالمِ ارواح اور عالمِ نساء اور عالمِ رجال اور پھر عالم فکر اور عالمِ شعور اور عالمِ تصور اور عالمِ تقدیر اور عالمِ عقل ان سب کا بھی وہ ربّ ہے یعنی وہ صرف روٹی ہی مہیا نہیں کرتا۔ وہ صرف انہی چیزوں کو مہیا نہیں کرتا جو جسموں کو پالنے والی ہیں بلکہ وہ ارواح کے پالنے کا بھی سامان کرتا ہے اور پھر مختلف تقاضے جو انسان کی فطرت میں پائے جاتے ہیں ان میں سے ہر ایک کی نشوونما کے لئے اس نے قرآن کریم میں تعلیم دی ہے۔ چنانچہ اس قسم کے مضمون پر میں تفصیلی لیکچر ان کے سامنے دے رہا ہوں اور خود مجھے بھی نہایت لذت اور سرور حاصل ہو رہا ہے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ ایک نیا مضمون اور نئی کیفیت میرے اندر پیدا ہو رہی ہے۔ یہی لیکچر دیتے دیتے میری آنکھ کھل گئی۔

غرض اول تو ان کتب میں صفات الٰہیہ پر نہایت اجمالی رنگ میں روشنی ڈالی گئی ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی حقیقی شان جلوہ گر نہیں ہوتی۔ اور پھر جن صفات کا ذکر کیا گیا ہے ان کی بھی تشریح نہیں کی گئی اور نہ ہی صفات الٰہیہ کے باہمی ربط اور تعلق کو واضح کیا گیا ہے۔

لیکن اسلام نے اس بارہ میں ایک جامع تعلیم بنی نوع انسان کے سامنے پیش کی ہے اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اپنے اندر دو قسم کی جلوہ گری رکھتی ہیں۔ اس کا ایک جلوہ تو صفاتِ تنزیہی کے رنگ میں ظاہر ہوتا ہے جو اس کو ان تمام قسم کی کثافتوں سے جو مادیّات میں پائی جاتی اور مخلوقات میں دکھائی دیتی ہیں منزّہ اور پاک ٹھہراتا ہے۔ اور ایک جلوہ صفاتِ تشبیہی کے رنگ میں ظاہر ہوتا ہے یعنی ایسی صفات کی شکل میں جو مخلوق کی صفات کے مشابہ نظر آتی ہیں چنانچہ وہ بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو تمام کائنات کا نقطۂ مرکزی ہے وہ اَحَدٌ یعنی اپنی ذات میں اکیلا اور منفرد ہے۔ وہ الصَّمَدُ یعنی ایسی ہستی ہے جس کے سب محتاج ہیں مگر وہ کسی کا محتاج نہیں۔ وہ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ ہے۔ یعنی نہ تو اس سے آگے کوئی اولاد پیدا ہوتی ہے اور نہ وہ خود کسی کی اولاد میں سے ہے۔ وہ لَمْ یَکُنْ لَّهٗ کُفُوًا اَحَدٌ ہے۔ یعنی

نہ تو کوئی متوازی طاقت اس کے ساتھ موجود ہے اور نہ اس کے بالمقابل کوئی اور طاقت موجود ہے۔ وہ اول و آخر ہے۔ یعنی تمام اشیاء کی علّت العلل ہے۔ اور سب کی سب مخلوق اسی کی طرف لوٹتی ہے۔ وہ قدیر ہے یعنی ہر اس بات پر قادر ہے جس کا وہ ارادہ کرتا ہے۔ وہ اَلْحَيُّ ہے یعنی ہمیشہ زندہ رہنے والا اور دوسروں کو زندہ رکھنے والا ہے۔ وہ اَلْقَيُّوْمُ ہے یعنی اپنی ذات میں قائم اور سب کو قائم رکھنے والا ہے۔ وہ رَبُّ الْعَالَمِيْن ہے یعنی سب جہانوں کو پیدا کرنے والا اور ان کو پالنے والا ہے۔ وہ اَلرَّحْمٰنُ ہے یعنی بنی نوع انسان کو جس قدر ضروریات پیش آنے والی تھیں ان تمام ضروریات کو اس نے انسان کی پیدائش سے پہلے ہی محض اپنے فضل اور انعام کے طور پر مہیا کر دیا ہے۔ وہ اَلرَّحِيْمُ ہے یعنی تمام محنتوں اور کوششوں کے اعلیٰ نتائج پیدا کرنے والا ہے۔ وہ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ہے۔ یعنی ان نتائج کے علاوہ جو اس کی طرف سے طبعی قانون کے ماتحت نکلتے رہتے ہیں اُس نے ہر کام کی ایک انتہا مقرر کی ہے۔ جہاں پہنچ کر اس کا آخری فیصلہ صادر ہو جاتا ہے اور نیک انسان اپنے کاموں کا اچھا بدلہ اور بُرا انسان اپنی برائیوں کی سزا پالیتا ہے۔ مگر یہ بدلے اور جزائیں اللہ تعالیٰ کی مالکیّت کے ماتحت ہوتی ہیں۔ یعنی وہ صرف سزا ہی نہیں دیتا بلکہ اگر چاہتا ہے تو اپنے بندوں کو معاف بھی کر دیتا ہے۔ وہ عَلِيْمٌ ہے۔ یعنی ایک ایک ذرّہ کا اس کو علم ہے۔ بلکہ انسانی فطرت کے مخفی اسرار تک سے آگاہ ہے۔ وہ سَمِيْعٌ ہے۔ یعنی لوگوں کی دعاؤں اور ان کی التجاؤں کو سننے والا ہے۔ وہ قہّار ہے یعنی ہر ایک چیز اس کے قبضہ قدرت میں ہے۔ وہ جبّار ہے یعنی ہر فساد کی اصلاح کرتا ہے۔ وہ وھاب ہے یعنی بندوں کو اپنے انعامات سے وافر حصہ دیتا ہے۔ وہ غَفُوْر ہے یعنی لوگوں کی خطاؤں سے چشم پوشی کرتا ہے۔ وہ مُهَيْمِن ہے یعنی ہر ایک چیز کا محافظ اور نگران ہے۔ وہ اَلسَّلَام ہے یعنی لوگوں کو سلامتی دینے والا ہے۔ وہ اَلْقَابِض ہے یعنی ہر ایک چیز کو ایک حد کے اندر رکھنے والا ہے۔ وہ اَلْبَاسِط ہے یعنی کشائش اور فراخی پیدا کرنے والا ہے۔ وہ اَلرَّافِع ہے یعنی پستی سے بلندی تک پہنچانے والا ہے۔ وہ اَلْحَفِيْظ ہے یعنی مخلوق کی حفاظت کرنے والا ہے۔ وہ اَلْمُتَكَلِّم ہے یعنی لوگوں سے کلام کرنے والا اور ان پر اپنے الہامات نازل کرنے والا ہے۔

غرض اسلام ایک کامل الصفات خدا دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ وہ عیسائیت کی طرح صرف یہ کہہ کر خاموش نہیں ہو جاتا کہ خدا محبت ہے۔ نہ تورات کی طرح صرف چند صفات بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہے بلکہ اس نے ان تمام صفات کا تفصیلاً ذکر کیا ہے جن کا انسانی پیدائش کے ساتھ تعلق ہے۔ گویا سب آسمانی ڈیپارٹمنٹس کو اس نے ننگا کر کے دکھا دیا ہے جو اُس کے مِنَ السَّمَاء ہونے کا ثبوت ہے۔

پھر اسلام نے صرف صفات الٰہیہ کا ایک جامع نقشہ پیش کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نے بنی نوع انسان کو یہ بھی بتایا ہے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس کا طریق یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے رنگ میں رنگین ہونے یعنی اس کی صفات کی نقل کرنے کی کوشش کرو۔ وہ فرماتا ہے۔ وَ لَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ (الاعراف:۱۲) یعنی ہم نے تمہیں پیدا کیا پھر تمہیں صورت بخشی اور پھر ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدمؑ کی اطاعت کرو۔ اِس پر فرشتوں نے تو آدمؑ کی اطاعت کی مگر ابلیس نے نہ کی۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی دو پیدائشیں ہیں۔ ایک بشری اور ایک روحانی۔ بشری پیدائش کے متعلق تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَ لَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ہم نے تم کو پیدا کیا۔ یعنی تمہیں ایک ذی حیات وجود بنایا اور پیدائش روحانی کے متعلق فرمایا۔ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ پھر ہم نے تمہاری ایک روحانی شکل بنائی جس کے ذریعہ تم دوسری مخلوق سے ممتاز طور پر پہچانے جاتے ہو۔ اسی کی طرف بائیبل میں بھی ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ

’’خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔‘‘ (پیدائش باب ۱ آیت ۲۷)

لیکن بائیبل نے جو الفاظ استعمال کئے ہیں ان سے خدا تعالیٰ کے جسمانی ہونے کا دھوکا لگتا ہے۔ لیکن قرآن کریم نے جو الفاظ استعمال کئے ہیں ان سے صاف پتہ لگتا ہے کہ یہاں صورت سے روحانی شکل مراد ہے جسمانی نہیں۔ کیونکہ جسمانی پیدائش کا اس سے پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ پس صَوَّرْنٰکم کے معنے یہ ہیں کہ ہم نے تمہارے اندر صفات الٰہیہ کا حامل بننے کی قابلیت پیدا کی یعنی پہلے تو ہم نے انسان کی جسمانی خلق کی۔ اس کے ناک، کان، ہاتھ اور پاؤں وغیرہ بنائے اور پھر ہم نے اس کے دماغ کی ایسی تربیت کی اور اس کی قوتوں کا اس طرح ارتقاء شروع کیا کہ وہ صفات الٰہیہ کو اپنے اندر جذب کرنے کے قابل ہو گیا اور اس کے اندر ان کے اظہار کی اہلیّت پیدا ہو گئی۔ اس کے بعد ہم نے ملائکہ سے کہا کہ اب تم اس انسان کو سجدہ کرو۔ چونکہ قرآن کریم میں اس بات پر بڑا زور دیا گیا ہے کہ سجدہ خدا تعالیٰ کے سوا اور کسی کے لئے جائز نہیں اس لئے اس سجدہ سے مجازی سجدہ ہی مراد ہے۔ اور اس کے معنی اطاعت اور فرمانبرداری کے ہیں۔ مگر مجازی سجدہ بھی تو مجازی خدا کے سامنے ہی ہو سکتا ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ کہ پہلے تو ہم نے تمہارے اندر خدائی صفات پیدا کیں اور جب تم خدائی صفات کو جذب کرنے اور ان کا اظہار کرنے کے قابل ہو گئے تو پھر ہم نے ملائکہ سے کہا کہ سجدۂ حقیقی تو بہرحال میرے سوا کسی اَور کے سامنے ناجائز ہے لیکن ہم تم کو ایک مجازی سجدہ کا حکم دینے لگے ہیں اور اس مجازی سجدہ کے لئے ایک مجازی خدا کی ضرورت تھی۔ سو وہ مجازی خدا وہ انسان ہے جس کے اندر الٰہی صفات پائی جائیں۔

لیکن اگر اسْجُدُوْا سے ہر انسان کے آگے سجدہ کرنا مراد لیا جائے تو اس کے معنے یہ بنیں گے کہ وہ چوری کرے توتم بھی چوری میں اس کی مدد کرو۔ وہ ڈاکہ مارے توتم بھی ڈاکہ مارو۔ وہ قتل کرے توتم بھی قتل کرو۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ سجدہ بہرحال اسی آدم کے آگے ہوسکتا ہے جو کبھی چوری نہیں کرسکتا۔ کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ کبھی فریب نہیں کرسکتا۔ کبھی شرک نہیں کرسکتا۔ کبھی بد دیانتی نہیں کرسکتا۔ کبھی ظلم نہیں کرسکتا۔ اور کبھی کسی اور خرابی میں مبتلا نہیں ہوسکتا اور چونکہ وہ خود ان صفات کا حامل ہوگا جو ملائکہ کی صفات سے بڑی ہیں اس لئے اگر ایسے آدم کی اطاعت کی جائے تو یہ بالکل درست ہوگا۔ جو شخص خدائی صفات کا مظہر ہوگا ملائکہ کی کیا طاقت ہے کہ وہ اس کے خلاف چلیں۔ اس کے متعلق تو ان کا فرض ہوگا کہ وہ اس کے ساتھ چلیں۔ پس ہر شخص کے اندر خدا تعالیٰ نے یہ طاقت پیدا کی ہے کہ وہ صفاتِ الٰہیہ کا مظہر بن سکے۔ اور اگر وہ اپنے اندر صفاتِ الٰہیہ پیدا کرلے تو پھر ملائکہ کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اس کی مدد کریں۔ اسی کی طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں اشارہ فرمایا ہے کہ جب خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کے کسی بندے کی مقبولیت دنیا میں پھیلے تو وہ ملائکہ کو حکم دیتا ہے اور وہ اس کی مقبولیت دنیا میں پھیلانا شروع کردیتے ہیں۔ (بخاری کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائکۃ صلوات اللہ علیہم) پس ہر انسان کے اندر یہ قابلیت ہے کہ وہ صفات الٰہیہ کو اپنے اندر پیدا کرلے۔ اور جب وہ صفات الٰہیہ اپنے اندر پیدا کرلیتا ہے تو فرشتوں کو خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اس کے پیچھے پیچھے چلیں کیونکہ وہ ایک خدا نما وجود بن جاتا ہے اور اس کا خدا تعالیٰ کے ساتھ اتصال ہوجاتا ہے۔ دنیا میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ہر چیز دوسری چیز کے مشابہ بن کر ہی اُس سے پیوست ہوسکتی ہے ورنہ نہیں۔ مثلاً لکڑی کے ساتھ ہم لوہے اور چمڑے کو تو پیوست کرسکتے ہیں کیونکہ ان دونوں میں ٹھوس ہونے کی مشابہت پائی جاتی ہے مگر لکڑی کے ساتھ ہم ہوا یا پانی کو پیوست نہیں کرسکتے کیونکہ ان میں مشابہت نہیں پائی جاتی۔ اسی طرح جو چیزیں روحانی ہوتی ہیں ان میں بھی مشارکت کا پایا جانا ضروری ہوتا ہے۔ پس خدا سے ملنے کے لئے ضروری ہے کہ بندے اور خدا میں روحانی مشارکت ہو اور وہ مشارکت یہی ہے کہ انسان اپنے اندر الٰہی صفات پیدا کرے۔ جب کوئی شخص اپنے اندر الٰہی صفات پیدا کرلیتا ہے تو وہ اپنے اندر الوہیت کا رنگ پیدا کرلیتا ہے اور جب اس کے اندر الوہیت کا رنگ آجائے تو اس کا خدا تعالیٰ سے اتصال اسی طرح ممکن ہوجاتا ہے جیسے لکڑی کا لوہے سے۔ اور گو وہ خدا نہیں بن جاتا مگر خدا نما ضرور ہوجاتا ہے۔ جیسے لکڑی لوہا نہیں بن سکتی یا لوہا لکڑی نہیں بن سکتا مگر وہ آپس میں جڑنے کے قابل ہوجاتے ہیں۔ پس خدا تعالیٰ سے اتصال اور اس کے قرب کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ انسان اپنے اندر صفات الٰہیہ پیدا کرے اور اس کی محبت کو اپنے اندر جذب کرے۔ پھر جس

طرح مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے اسی طرح محبت الٰہی اسے خدا تعالیٰ کی طرف کھینچنے لگ جاتی ہے۔

یہ تعلیم جو اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کی ہے اتنی اہم ہے کہ اگر اس کے مطابق ہر انسان اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہر بنانے کی کوشش کرے تو یقیناً اس دنیا کا نقشہ پلٹ جائے اور ہر انسان نیکی کے ایسے بلند مقام پر کھڑا ہو جائے کہ جس سے اس کا قدم کبھی منحرف نہ کیا جا سکے۔ یہی حقیقت ایک دفعہ مجھے رؤیا میں بھی بتائی گئی تھی۔ مَیں نے دیکھا کہ مَیں تقریر کر رہا ہوں اور میرے ہاتھ میں ایک آئینہ ہے۔ میں تقریر کرتے ہوئے لوگوں سے کہتا ہوں کہ دیکھو انسان کا دل خدا تعالیٰ نے ایک آئینہ کی مانند بنایا ہے۔ جس طرح انسان آئینہ میں اپنا حسن دیکھتا ہے اسی طرح خدا تعالیٰ بھی اپنا حسن انسان کے آئینۂ قلب میں دیکھنا چاہتا ہے۔ پس اگر انسان کا دل خدا تعالیٰ کی صفات کو اعلیٰ طور پر ظاہر کرنے والا ہو تو خدا تعالیٰ بھی اس دل کی قدر کرتا اور اُسے ایک قیمتی متاع قرار دیتا ہے۔ لیکن اگر انسان کا دل میلا اور داغدار ہو۔ اور اس میں سے خدا تعالیٰ کا چہرہ نظر نہ آئے یا نظر تو آتا ہو لیکن غلط طور پر آتا ہو تو خدا تعالیٰ بھی ایسے دل کو پرے پھینک دیتا ہے۔ اور جب مَیں نے یہ الفاظ کہے تو وہ آئینہ جو میرے ہاتھ میں تھا اُسے مَیں نے زور سے زمین پر دے مارا اور کہا کہ ایسے دل کو خدا تعالیٰ بھی اُٹھا کر اسی طرح دے مارتا ہے اور وہ چُور چُور ہو جاتا ہے (روزنامہ الفضل ۱۳ / دسمبر ۱۹۱۴ء صفحہ ۱۲)۔

اِس رؤیا میں یہی نکتہ بتایا گیا ہے کہ انسان کو خدا تعالیٰ نے اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کا نور ظاہر کرے۔ اور اس کے ذریعہ خدا تعالیٰ کی صفات کا ظہور ہو۔ پس ضروری ہے کہ ہر انسان اپنے دائرہ میں ربّ بھی ہو رحمٰن بھی ہو، رحیم بھی ہو۔ مالك یوم الدین بھی ہو۔ جبار بھی ہو۔ ستّار بھی ہو۔ غفّار بھی ہو۔ علیم بھی ہو۔ شکور بھی ہو۔ حمید بھی ہو۔ مجید بھی ہو۔ ودود بھی ہو۔ غرض خدا تعالیٰ کی ساری صفات کو وہ ظاہر کرنے والا ہو جن کے متعلق مشہور تو یہ ہے کہ وہ ننانوے ہیں مگر ہیں وہ اِس سے بھی زیادہ (بخاری کتاب الشروط باب ما یجوز من الاشراط)۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو وہ اپنے مقصد حیات کو پورا کر لیتا ہے اور اگر اس کے آئینۂ قلب میں خدائی صفات کا انعکاس نہیں ہوتا تو وہ ایک ٹوٹا ہوا برتن ہے جو کسی کام نہیں آتا یا ایک میلا اور داغدار شیشہ ہے جس سے خدا تعالیٰ کا چہرہ نظر نہیں آسکتا۔ اور جس طرح کوئی انسان میلا اور داغدار شیشہ اپنے پاس نہیں رکھتا اسی طرح خدا تعالیٰ بھی ایسا آئینہ اپنے ہاتھ میں نہیں رکھتا جس کی غرض تو یہ تھی کہ وہ خدا نمائی کا آلہ بنے مگر میلا ہونے کی وجہ سے وہ خدائی حسن کو ظاہر نہیں کر سکتا۔

غرض اسلام صفات الٰہیہ پر خصوصیت سے زور دیتا اور بنی نوع انسان کو اس امر کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ تمہارا

تمام حسن اس امر پر منحصر ہے کہ تم صفاتِ الٰہیہ کے رنگ میں اپنے آپ کو رنگین کرنے کی کوشش کرو۔ اور اس امر کو اچھی طرح یاد رکھو کہ جتنا جتنا کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی صفات کو اپنے اندر پیدا کرتا چلا جائے گا اُتنا ہی وہ اعلیٰ اخلاق کا حامل ہوگا اور اُسی نسبت سے اُسے اللہ تعالیٰ کا قرب بھی حاصل ہوگا۔ گویا اسلام نیکی اور بدی کی تعریف ایک جدید زاویہء نگاہ سے پیش کرتا ہے اور اعلیٰ اخلاق کی بنیاد صفاتِ الٰہیہ کے انعکاس پر رکھتا ہے۔ یہ نظریہ جو اسلام نے پیش کیا ہے اتنا اہم ہے کہ اگر غور سے کام لیا جائے تو اس نے مذہبی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے اور اس نے نیکی اور بدی کی تعریف ہی بدل دی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ جو گہرے غور وفکر کے عادی نہیں صرف اتنا ہی دیکھا کرتے ہیں کہ چونکہ فلاں کام کرنے کو ہمارا جی چاہتا ہے اس لئے ہم وہ کام کریں گے یا فلاں کام کرنے کو چونکہ ہمارا جی نہیں چاہتا اس لئے ہم وہ کام نہیں کریں گے۔ ایسے لوگوں کے نزدیک اچھے کام کی تعریف صرف یہی ہوتی ہے کہ جس کے کرنے پر ان کا جی چاہے اور بُرے کام کی تعریف یہ ہوتی ہے کہ جس کے کرنے کو ان کا جی نہ چاہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ یہ تعریف بالکل غلط ہے کیونکہ ہزاروں انسان ایسے ہوتے ہیں جن کا جی کسی کام کے کرنے کو آج تو چاہتا ہے مگر کل نہیں چاہتا۔ یا آج تو ایک شخص چاہنے والی بات کو نہیں چاہتا مگر کل وہ اُسے چاہنے لگتا ہے۔ اور اگر اس سے کوئی شخص سوال کرے کہ تمہارے اُس وقت چاہنے اور اب نہ چاہنے یا اُس وقت نہ چاہنے اور اب چاہنے کی کیا وجہ ہے تو وہ کہہ دیتا ہے کہ اُس وقت میرے حالات اَور تھے اور اب اَور ہیں۔ یا بسا اوقات وہ کہہ دیتا ہے کہ جب میں نہیں چاہتا تھا تو اُس وقت میں غلطی کر رہا تھا اور اب جبکہ چاہنے لگا ہوں تو درست کر رہا ہوں۔ مگر اس کی یہ بات بھی قطعی نہیں کہلا سکتی۔ کیونکہ عین ممکن ہے کہ کل وہ پھر اپنی چاہی ہوئی چیز سے نفرت کرنے لگ جائے پھر اگر کسی شخص کا کسی کام کو چاہنا ہی نیکی ہو سکتی ہے تو فرض کرو زید چاہتا ہے کہ بکر کے باپ کو قتل کر دے اور وہ اُسے قتل کر دیتا ہے تو کیا بکر اس لئے خاموش ہو جائے گا کہ وہ اِس کام کو چاہتا تھا؟ یا کسی شخص کا ملازم کام میں سستی کرتا ہے تو کیا اس کا آقا ملازم کے یہ کہنے پر کہ اس کام کا تعلق میری مرضی کے ساتھ ہے خاموش ہو جائے گا؟ اگر کسی شخص کا کسی کام کو چاہنا ہی نیکی ہوسکتا ہے تو بکر کا اپنے باپ کے قاتل کے خلاف مقدمہ دائر کرنا بے انصافی ہوگا۔ اِسی طرح آقا کا اپنے ملازم کو اس کی سستی پر سزا دینا ظلم ہوگا۔ کیونکہ زید چاہتا تھا کہ بکر کے باپ کو قتل کر دے اور ملازم چاہتا تھا کہ وہ کام میں سستی کرے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہی شخص جو خود نیکی اور بدی کے متعلق ایک فارمولا تجویز کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جس چیز کو انسان کا جی چاہے وہ نیکی ہے۔ اور جس کو نہ چاہے وہ بدی۔ اُسی شخص کے باپ کو جب کوئی شخص قتل کر دیتا ہے تو وہ سخت غصہ میں آ جاتا ہے اور کہتا ہے میں اس سے بدلہ لے کر رہوں گا۔ حالانکہ چاہیے تھا کہ جب اس کے باپ

کا قاتل اُسی کے مجوزہ فارمولا پر عمل کررہا تھا تو وہ خوش ہوتا کہ اُس نے نیکی کی ہے۔ اِسی طرح ملازم کے سستی کرنے پر اور یہ کہہ دینے پر کہ میرا جی چاہتا تھا کہ مَیں سستی کروں وہ خاموش ہو جاتا بلکہ خوش ہوتا کہ وہ نیکی کے راستہ پر گامزن ہے۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ پس نیکی اور بدی کی یہ تعریف درست نہیں۔

پھر بعض لوگوں نے اس تعریف سے ذرا اَور ترقی کی ہے اور کہا ہے کہ جس کام کو سوسائٹی چاہتی ہے وہ نیک ہے اور جس کام کو سوسائٹی نہیں چاہتی وہ بد ہے۔ مگر اس تعریف پر بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہندو سوسائٹی چاہتی ہے کہ گائے نہ کھائی جائے۔ اور مسلمان سوسائٹی چاہتی ہے کہ گائے کھائی جائے۔ یا سکھ سوسائٹی چاہتی ہے کہ جھٹکا کھایا جائے اور مسلمان سوسائٹی چاہتی ہے کہ جھٹکا نہ کھایا جائے۔ اِسی طرح یوروپین سوسائٹی چاہتی ہے کہ شراب پی جائے۔ لیکن مسلمان سوسائٹی چاہتی ہے کہ شراب نہ پی جائے۔ اب جبکہ ہندو سوسائٹی یہ چاہتی ہے کہ گائے نہ کھائی جائے کیونکہ ایسا کرنا سخت گناہ ہے اور مسلمان سوسائٹی چاہتی ہے کہ گائے کھائی جائے کیونکہ اُس کا کھانا ہمارے مذہب میں جائز ہے۔ سِکھ سوسائٹی چاہتی ہے کہ جھٹکا کھایا جائے لیکن مسلمان سوسائٹی چاہتی ہے کہ جھٹکا نہ کھایا جائے کیونکہ جھٹکا کھانا حرام ہے۔ یورپین سوسائٹی چاہتی ہے کہ شراب پی جائے۔ لیکن مسلمان سوسائٹی چاہتی ہے کہ شراب بالکل نہ پی جائے کیونکہ اس کا پینا حرام ہے۔ تو ہم کون سی سوسائٹی کی خواہش کے مطابق فیصلہ کریں گے آیا ہم مسلمان سوسائٹی کے چاہنے کے مطابق فیصلہ کریں گے یا سِکھ سوسائٹی کے چاہنے کے مطابق فیصلہ کریں گے یا ہندو سوسائٹی کے چاہنے کے مطابق فیصلہ کریں گے یا یورپین سوسائٹی کے چاہنے کے مطابق فیصلہ کریں گے۔ اگر ہم ہندو سوسائٹی کے چاہنے کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں کہ گائے کھانا سخت جرم ہے تو مسلمان کہے گا گائے کھانا جائز ہے۔ اگر ہم سکھ سوسائٹی کے چاہنے کے مطابق فیصلہ کریں کہ جھٹکا کھانا چاہیے تو ایک مسلمان کہے گا جھٹکا کھانا حرام ہے۔ اگر ہم یورپین سوسائٹی کے چاہنے کے مطابق فیصلہ کریں گے کہ شراب پینی چاہیے تو مسلمان کہے گا شراب پینا حرام ہے۔ غرض ہمیں کوئی ایک سوسائٹی بھی ایسی نظر نہیں آتی جس کے چاہنے کے مطابق فیصلہ کر دیا جائے تو اس پر باقی تمام سوسائٹیاں متفق ہو جائیں۔ ہزاروں ہزار نیکی اور عیب کی باتیں ایسی ہیں جن میں لوگوں کے اندر شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک سوسائٹی ایک کام کو بہت بڑی نیکی قرار دیتی ہے تو دوسری سوسائٹی اس کو بہت بڑا جرم قرار دیتی ہے یا ایک سوسائٹی ایک کام کو سخت گناہ سمجھتی ہے تو دوسری سوسائٹی اسی کام کو عین ثواب سمجھتی ہے۔ یورپین لوگ شراب کو بہت اچھا سمجھتے ہیں لیکن مسلمان شراب پینا سخت گناہ سمجھتے ہیں۔ آیا ہم شراب پینے کو یورپ کے معیار کے مطابق نیکی قرار دیں یا اسلام کے معیار کے مطابق بدی قرار دیں۔ ایک یورپین کسی مسلمان کو شراب کا گلاس پیش کرتا ہے

اور مسلمان اس کے پینے سے انکار کرتا ہے تو کیا ہم یورپ کے معیار کے مطابق مسلمان کے شراب پینے سے انکار کو بدتہذیبی قرار دیں گے یا اسلام کے معیار کے مطابق نیکی قرار دیں گے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ ہم مسلمان سوسائٹی کی بات مانیں اور عیسائی سوسائٹی کی بات کو ردّ کر دیں۔ یا عیسائی سوسائٹی کی بات مانیں اور مسلمان سوسائٹی کی بات ردّ کر دیں۔

پھر بعض لوگوں نے ایک اور قدم اٹھایا ہے۔ وہ کہتے ہیں نیکی وہ ہے جسے دنیا کے اکثر لوگ اچھا کہیں اور بدی وہ ہے جسے دنیا کے اکثر لوگ برا کہیں۔ مگر یہ تعریف بھی کوئی معین تعریف نہیں کہلا سکتی۔ کیونکہ دنیا کی اکثریت کو اسی صورت میں نیکی اور بدی کی شناخت کا صحیح معیار قرار دیا جا سکتا ہے جب خود اکثریت ہمیشہ ایک بات پر قائم رہے۔ لیکن ہمیں تو ہر زمانہ اور ہر ملک بلکہ قوم کی اکثریت کے خیالات ایک دوسرے سے مختلف دکھائی دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں دنیا کی اکثریت کو نیکی اور بدی کی شناخت کا معیار کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے۔ پھر اگر اس تعریف کو درست سمجھا جائے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ اگر اکثریت کہتی ہو کہ خدا کوئی نہیں تو اُس وقت خدا تعالیٰ کا انکار کرنا نیکی ہوگا۔ اور اگر اکثریت کہتی ہو کہ خدا ہے تو خدا کو ماننا نیکی ہوگا۔ لیکن دوسرے وقت وہی اکثریت ہستی باری تعالیٰ کی قائل ہو جائے تو پھر خدا تعالیٰ پر ایمان لانا نیکی قرار پائے گا اور اس کا انکار کرنا بدی قرار پائے گا۔ گویا اکثریت کے عقائد بدلنے کے ساتھ نیکی اور بدی کی تعیین بھی مختلف ہوتی چلی جائے گی پس نیکی اور بدی کی یہ تعریف بھی کوئی معین تعریف نہیں کہلا سکتی۔

پھر بعض لوگ کہتے ہیں کہ نیکی وہ عمل ہے جس سے سب سے زیادہ خوشی حاصل ہو۔ اور بدی وہ عمل ہے جو اُنہی حالات میں اُتنی خوشی پیدا نہ کرے۔ مگر یہ تعریف بھی صحیح نہیں کیونکہ اِس کے معنے یہ ہیں کہ اگر ایک شخص کو ڈاکہ مار کر سب سے زیادہ خوشی حاصل ہوتی ہو۔ تو اس کے لئے ڈاکہ مارنا ہی سب سے بڑی نیکی ہوگا حالانکہ اِسے کوئی بھی درست تسلیم نہیں کرتا۔

پھر بعض لوگ کہتے ہیں کہ نیکی وہ ہوتی ہے جس کا دنیا کے سب سے زیادہ لوگوں کو فائدہ پہنچے۔ لیکن اس تعریف کو صحیح سمجھا جائے تو ماننا پڑے گا کہ اگر فرانس بلجیم پر حملہ کر کے اُسے لوٹ لے تو جائز ہوگا کیونکہ فرانس کے باشندے بلجیم کے باشندوں سے بہت زیادہ ہیں بیشک بلجیم کے تھوڑے سے لوگوں کو نقصان پہنچے گا لیکن چونکہ فرانس کے بہت زیادہ لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے اس لئے ان کا بلجیم پر حملہ کر کے وہاں کے مال ومتاع کو لوٹ کر لے جانا نیکی ہوگا۔ اسی طرح جو قوم بھی اکثریت میں ہو۔ اس تعریف کے ماتحت اس کے لئے جائز ہوگا کہ وہ اقلیت کو لوٹ لے اور کہے کہ یہ نیکی ہے۔ اور جب کوئی سوال کرے کہ یہ نیکی کس طرح ہوئی تو وہ کہہ دے کہ دیکھو کتابوں میں اسی طرح

لکھا ہے کہ نیکی وہی ہے جس کا دنیا کے زیادہ لوگوں کو فائدہ پہنچے۔اس کے مقابلہ میں اگر اقلیت رکھنے والی قومیں اکثریت پر حملہ کریں اوران کے مال واسباب لوٹنا چاہیں تو ان کا یہ فعل بدی کہلائے گا۔کیونکہ اس طرح تھوڑوں کو فائدہ پہنچتا ہے اور بہتوں کو نقصان پہنچتا ہے۔

پھر بعضوں نے کہا ہے کہ جس چیز کا زیادہ سے زیادہ اور لمبے عرصہ تک فائدہ پہنچے وہ نیکی ہے۔مگر اس تعریف کے ماننے سے بھی یہ لازم آتا ہے کہ اگر کوئی قوم سوسال تک لوٹ مار کرتی ہے تو وہ کم نیکی کرتی ہے اور اگر وہ دوسو سال تک لوٹ مار کرتی تو یہ زیادہ نیکی ہوتی۔

پھر بعض لوگ کہتے ہیں نیکی وہ ہے جس سے اپنی ذات کو زیادہ نفع پہنچے اور بدی وہ ہے جس سے اپنی ذات کو نقصان پہنچے۔مگر اس پر بھی یہ اعتراض پڑتا ہے کہ اگر جھوٹ بولنے سے کسی کی ذات کو زیادہ فائدہ پہنچ سکتا ہو تو اس تعریف کے ماتحت جھوٹ بولنا بھی اُس کے لئے نیکی ہوگا۔حالانکہ اسے کوئی بھی درست نہیں سمجھتا۔

پھر بعض لوگوں نے کہا ہے کہ نیکی اور بدی کی فطرت پر بنیاد رکھنی چاہیے۔یعنی جس چیز کو فطرت نیک کہے وہ نیکی ہے اور جس چیز کو فطرت بد کہے وہ بدی ہے۔یہ تعریف ایک حد تک تو درست ہے۔مگر کلّی طور پر نہیں۔میں نے بارہا ایک مثال بیان کی ہے کہ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک چور کو میں نے سمجھانا شروع کیا کہ چوری بہت بُرا فعل ہے۔تمہیں محنت کر کے حلال کی کمائی کھانی چاہیے۔اُس نے کہا۔مولوی صاحب ہم چوری کے لئے بڑی محنت کرتے ہیں اور ہمیں فلاں فلاں دشواریوں اور دِقتوں کا سامنا ہوتا ہے۔اس لئے یہ فعل ہمارے لئے بالکل جائز ہے۔آخر جب چور کو کہا گیا کہ اگر تم کچھ چُرایا ہوا سونا سنار کے پاس لے جاؤ اور اس کے پاس رکھ کر۔دو چار دنوں کے بعد اس سے واپس مانگو اور وہ دینے سے انکار کر دے تو پھر کیا ہو؟ اس پر وہ چور کہنے لگا کہ کیا ایسا بھی کوئی خبیث ہوسکتا ہے جو دوسرے کا مال کھا جائے۔پس بے شک انسانی فطرت بعض باتوں کے متعلق بولتی تو ہے مگر محدود حد تک۔کیونکہ انسانی فطرت بسا اوقات بُرے ماحول کے نتیجے میں مسخ بھی ہو جاتی ہے۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ پھر نیکی کس چیز کا نام ہے اور بدی کس چیز کا نام ہے۔کیا نیکی وہ ہوگی جس کو مذہب نیکی قرار دیتا ہے اور بدی وہ ہوگی جس کو مذہب بدی قرار دیتا ہے۔لیکن اگر یہ درست ہو تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کون سے مذہب کی نیکی نیکی کہلائے گی اور کون سے مذہب کی بدی بدی کہلائے گی۔اور یہ سوال ایسا ہے کہ اس کا حل کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ دنیا میں کئی مذاہب پائے جاتے ہیں۔اور ان کی تجویز کردہ نیکیوں اور بدیوں میں آپس میں بہت کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ایک مذہب ایک کام کو نیکی قرار دیتا ہے تو دوسرا مذہب اُسی کام کو بدی قرار دیتا ہے۔

اس لئے اس تعریف سے بھی ہمیں نیکی اور بدی کا حقیقی علم حاصل نہیں ہوسکتا۔ پھر سوال یہ ہے کہ اگر کوئی چیز بغیر کسی حکمت کے صرف شریعت کے روکنے کی وجہ سے گناہ ہوتی ہے تو شریعت کا یہ فعل لغو قرار پاتا ہے۔ اور اگر بُرائی کی وجہ سے بُری ہوتی ہے تو پھر یہ دلیل نہ ہوئی کہ جس سے شریعت روکے وہ بری ہے بلکہ یہ ہوئی کہ جو بُری شے ہو اُس سے شریعت روکتی ہے اور پھر اس حکم یا نہی کو اُس حکمت کی طرف منسوب کرنا پڑے گا۔ صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں ہوگا کہ جس سے شریعت روکے وہ برائی ہے۔ اور جس کا حکم دے وہ نیکی ہے۔

اسلام ان تمام نظریات کے خلاف دنیا کو یہ بتاتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی صفات کی موافقت اختیار کرنا نیکی ہے اور اس کی صفات کے خلاف کام کرنا بُرائی ہے۔ چنانچہ وہ اس بارہ میں مومنوں کو ہدایت دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً (البقرة:۱۳۹) یعنی اے مومنو! تم اللہ تعالیٰ کا رنگ اختیار کرو۔ اور اللہ تعالیٰ سے بہتر اَور کون ہے جس کا رنگ اختیار کیا جاسکے یعنی جس طرح خدا ربُّ العالمین ہے۔ وہ الرَّحْمٰن اور اَلرَّحِیْم ہے۔ وہ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ہے اسی طرح تم بھی کوشش کرو کہ تم اُس کی ربوبیتِ عالمین کے مظہر بن جاؤ۔ تم اس کی رحمانیت کے مظہر بن جاؤ۔ اُس کی رحیمیّت کے مظہر بن جاؤ۔ اس کی مَالِکِیَّتِ یَوْمِ الدِّیْن کے مظہر بن جاؤ۔ اسی طرح کوشش کرو کہ تم بھی ایک قسم کے سَتَّار بن جاؤ۔ ایک قسم کے غَفَّار بن جاؤ۔ ایک قسم کے قَهَّار بن جاؤ۔ ایک قسم کے حَمِیْد بن جاؤ۔ ایک قسم کے مَجِیْد بن جاؤ۔ ایک قسم کے شَکُوْر بن جاؤ۔ ایک قسم کے وَدُوْد بن جاؤ۔ تا کہ تمہیں اللہ تعالیٰ سے ایک رنگ کی مشارکت حاصل ہوجائے اور تم صفات الٰہیہ کے مظہر بن کر اخلاق کا اعلیٰ مقام حاصل کرلو۔

پس اسلام کے نزدیک حقیقی خوبی وہ ہے جو حسنِ ازلی کے نقشہ میں ہو اور گناہ یا عیب ہر اس فعل کا نام ہے جو صفات الٰہیہ کے منافی ہو۔ اور چونکہ انسان کو خدا تعالیٰ کی صفات کا مظہر بننے کی طاقت دی گئی ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لو۔ کہ خدا تعالیٰ اصل ہے اور انسان اس کی تصویر ہے۔ اس لئے تصویر کا حسن اسی میں ہے کہ وہ اصل کے مطابق ہو۔ اور اس کا عیب یہ ہے کہ وہ اصل کے خلاف ہو پس انسان جو عمل بھی ایسا کرتا ہے جو اسے خدا تعالیٰ کی صفات کے موافق بناتا ہے وہ نیکی ہے اور جو عمل اسے خدا تعالیٰ کی صفات سے دور لے جاتا ہے وہ بدی ہے۔ گویا نیکی کی حقیقی تعریف اسلام نے یہ پیش کی ہے کہ نیکی اس عمل یا خیال کا نام ہے جو خدا تعالیٰ سے جو ایک کامل اور بے عیب ذات ہے مشابہت پیدا کرتا ہو۔ اور بدی اُس فعل یا خیال کا نام ہے جو اس کامل اور بے عیب ذات کی پسندیدگی یا فعل کے خلاف ہو۔

بیشک ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ مَیں خدا تعالیٰ کو ہی نہیں مانتا۔ اس صورت میں ہمارا فرض ہوگا کہ ہم اس کو خدا تعالیٰ کی ہستی کے متعلق دلائل دیں۔ لیکن خدا تعالیٰ کی ہستی ثابت کر دینے کے بعد اخلاقِ صحیحہ کی پہچان کا صحیح معیار یہی ہوگا۔ کہ جو کام الٰہی صفات کے مطابق ہو وہ اچھا ہے اور جو کام الٰہی صفات کے خلاف ہو وہ بُرا ہے۔ کیونکہ وہی ایک ایسی ہستی ہے جو ہر عیب سے پاک ہے اور ہر قسم کی اعلیٰ صفات رکھنے والی ہے۔ اس تعریف کی تعیین کے بعد ہمارے لئے اخلاق فاضلہ اور اخلاق سیئہ کی شناخت کچھ بھی مشکل نہیں رہتی کیونکہ جب ایک ماڈل مل جائے تو خیالی تصویر کی ضرورت نہیں رہتی۔ ہم اس بات کو روز روشن کی طرح ثابت کر سکتے ہیں۔ کہ اپنے اندر ہر قسم کی اعلیٰ صفات رکھنے والی ایک ایسی ہستی موجود ہے جس کے نمونہ پر چل کر انسانی افعال درست ہو سکتے ہیں اور وہ ہستی اتنی حسین ہے کہ اس کی نقل کر کے انسانی افعال بھی حسین ہو سکتے ہیں۔ پس اگر خدا تعالیٰ کی کوئی ہستی ہے اور ضرور ہے اور وہ اپنے اندر تمام قسم کی صفات حسنہ رکھتی ہے۔ تو جو بھی اس ہستی کے افعال کی نقل کرے گا اپنے اندر اخلاق فاضلہ پیدا کرنے کے قابل ہو جائے گا۔

پس اخلاق فاضلہ وہ ہیں جو خدا تعالیٰ کی صفات اور اس کے افعال کی نقل کر کے حاصل کئے جائیں اور اخلاق سیئہ وہ ہیں جو اسے خدا تعالیٰ کی صفات کا مظہر بننے سے دور لے جائیں۔ کیونکہ اصل منبع اور مبدء خدا ہے اور انسان درحقیقت اس کی ایک تصویر ہے پس جتنا زیادہ کوئی شخص خدا تعالیٰ کی صفات کی نقل کرے گا اتنا ہی زیادہ اس کے اندر اخلاقِ فاضلہ آتے چلے جائیں گے اور جتنا زیادہ کوئی شخص خدا تعالیٰ کی صفات سے دور رہے گا اُتنا ہی زیادہ وہ اخلاقِ فاضلہ سے بھی دور ہوتا چلا جائے گا یہی حکمت ہے جس کی بناء پر اسلام نے صفات الٰہیہ پر خاص طور پر زور دیا ہے اور بار بار اُن کا ذکر فرمایا ہے تا کہ اگر ایک طرف یہ صفات اُس کے وجود کا ثبوت ہوں تو دوسری طرف انسان اُن کا مظہر بن کر ایک خدا نما وجود بن جائے۔ جس کے اندر حُسن ہی حُسن ہو اور کوئی عیب اور نقص اس میں دکھائی نہ دے۔

سورۃ الشعراء کی ابتداء بھی اللہ تعالیٰ کی تین صفات کے ذکر سے کی گئی ہے جن میں سے پہلی صفت جس کی طرف اِس سورۃ میں توجہ دلائی گئی ہے صفتِ لطیفؔ ہے۔

لطیف کے معنوں پر بحث کرتے ہوئے لُغت میں لکھا ہے کہ اس کے معنے ہیں اَلْبَرُّ بِعِبَادِهٖ اَلْمُحْسِنُ اِلٰی خَلْقِهٖ بِاِیْصَالِ الْمَنَافِعِ اِلَیْهِمْ بِرِفْقٍ وَلُطْفٍ اَوِ الْعَالِمُ بِخَفَایَا الْاُمُوْرِ وَدَقَائِقِهَا (اقرب الموارد) یعنی اللہ تعالیٰ کے لئے جب لطیف کا لفظ استعمال ہو تو اس کے دو معنے ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ وہ لوگوں کی خبر گیری کرنے والا اور محبت اور احسان کے ساتھ ان کا نفع پہنچانے والا ہے اور دوسرے یہ کہ وہ اپنی مخلوق کی مخفی سے مخفی باتوں کو جاننے

والا اوران کی تمام حاجات اورضروریات کا علم رکھنے والا ہے۔ان معنوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر نظام عالم پر نگاہ دوڑائی جائے تو ہمیں یہ دونوں باتیں اپنے پورے کمال کے ساتھ دنیا میں دکھائی دیتی ہیں۔اوراس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ واقعہ میں ایک لطیف ہستی ہے جس نے اپنی مخلوق کو فائدہ پہنچانے اوراس کی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے اِس قسم کی نعمتوں سے اسے نوازا ہے۔اوراس کی بقاء کے لئے اتنے بڑے سامان پیدا کئے ہیں کہ کوئی شخص اگر ساری عمر بھی ان نعمتوں کا شکرادا کرتا رہے تب بھی وہ پوری طرح شکرادانہیں کرسکتا۔ چنانچہ دیکھ لو اللہ تعالیٰ کا یہ کتنا بڑا احسان ہے کہ آسمان پر لاکھوں میل دور سورج اور چانداور ستارے اس کے بندوں کے لئے رات دن اپنے کام میں مشغول ہیں۔اورزمین الگ اپنے کام میں مصروف ہے۔انسان تھوڑا سا بیج ڈال کر اپنے گھر چلا آتا ہے مگر تھوڑے ہی عرصہ میں اس چندسیر بیج کے بدلے ہزاروں من غلہ وہ اپنے گھرلے جاتا ہے۔وہ اپنے گھر میں آرام سے سورہا ہوتا ہے اورزمین اس کے کام میں مصروف ہوتی ہے اوراس کے لئے غلہ اُگارہی ہوتی ہے۔سبزی اُگارہی ہوتی ہے اورانواع واقسام کے پھل اور پھول پیدا کررہی ہوتی ہے۔یہ سویا ہوا اُٹھ کرآتا ہے اوراپنی ضرورت کے مطابق اُگا اُگایا اور پکا پکایا پھل لے کر چلا جاتا ہے۔اسی طرح انسانی جسم پر نگاہ ڈالو۔کان ایک چھوٹی سی چیز ہے مگر یہ بھی خدا کی عطا ہے۔ہوا کی لہریں جن کے ذریعہ سے ان میں آواز پہنچتی ہے وہ بھی خدا کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ گلے کے پردے جن سے آواز نکلتی ہے وہ بھی خدا کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ایک اچھا گویّا انہی پردوں کے ذریعہ سے گاتا ہے جو خدا نے دیئے ہیں مگر لوگ کہتے ہیں فلاں گویّا کتنا اچھا ہے۔ یا لوگ کہتے ہیں فلاں شخص کا حافظہ کتنا تیز ہے۔مگراس کے حافظہ والی جگہ یعنی دماغ بھی خدا نے بنایا ہے۔دماغ کے اندر جو سیلز ہوتے ہیں وہ بھی خدا نے بنائے ہیں۔اسی طرح انسان نماز پڑھتا ہے تو زبان جس سے وہ الفاظ ادا کرتا ہے خدا تعالیٰ کی پیدا کردہ ہوتی ہے۔ جس مقام پر وہ ان الفاظ کو محفوظ رکھتا ہے یعنی دماغ وہ بھی خدا نے بنایا ہے۔وہ رکوع کرتا ہے یا سجدہ کرتا ہے یا قیام کرتا ہے تو اس کے لئے وہ جتنی قوتوں سے کام لیتا ہے وہ سب کی سب خدا تعالیٰ کی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔انسان کا ان کی پیدائش میں کوئی ہاتھ نہیں ہوتا۔اسی طرح اگر وہ زکوٰۃ دیتا ہے تو زکوٰۃ کا روپیہ خدا تعالیٰ کا دیا ہوا ہوتا ہے۔جن طاقتوں سے اس نے روپیہ کمایا تھا وہ بھی خدا تعالیٰ کی دی ہوئی تھیں۔جس ہاتھ سے اس نے زکوٰۃ دی وہ بھی خدا کا دیا ہوا تھا۔ پھرانسان روزہ رکھتا ہے تو اس میں بھی اس کا کیا ہے اگر خدا نے اس کے اندراتنی طاقت نہ رکھی ہوتی کہ وہ دس بارہ یا پندرہ گھنٹے بھوکا رہ سکے تو وہ کس طرح روزہ رکھ سکتا تھا۔ پس اگر وہ روزہ رکھتا ہے تو وہ بھی خدا تعالیٰ کی دی ہوئی قوتوں کے نتیجہ میں ہی رکھتا ہے۔اپنے زوراور بل پر نہیں رکھتا۔ یا مثلاً ایک لوہار اپنے پیشہ سے شہرت حاصل کرتا

ہے تو وہ اپنے پیشہ میں جس قدر چیزیں استعمال کرتا ہے سب خدا تعالیٰ ہی کی عطا ہوتی ہیں۔لوہے کو خدا نے پہلے پیدا کیا ہوا ہے۔کوئلہ اس نے پہلے سے پیدا کر رکھا ہے۔آگ جس پر وہ لوہے کو گرم کرتا ہے خدا تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے۔اعصاب جن سے وہ کام لیتا ہے خدا تعالیٰ کے عطا کردہ ہیں۔غرض جتنی چیزوں سے وہ کام لیتا ہے سب خدا کی پیدا کی ہوئی ہوتی ہیں۔اس کا اپنا صرف ارادہ ہی ہوتا ہے اَور کچھ نہیں ہوتا۔لیکن اتنے بڑے انعامات کے باوجود کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے۔اوراس وقت وہ ایسا ناشکرا بن جاتا ہے کہ اسے کوئی بھی نعمت دکھائی نہیں دیتی۔کوئی بھی فضل نظر نہیں آتا۔کسی رحمت سے بھی اس کے قلب میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔

ہم نے بڑے بڑے مالداروں کو دیکھا ہے۔وہ موٹروں میں پھرتے ہیں۔دس دس کھانے ان کے دسترخوانوں پر موجود ہوتے ہیں۔مگر جب کھانے کے لئے بیٹھتے ہیں تو کہتے ہیں۔یہ بھی خراب ہے وہ بھی خراب ہے کھانے کا کوئی مزہ ہی نہیں آتا۔اس کے مقابلہ میں غریب آدمی کو دیکھو کہ وہ روٹی کا سوکھا ٹکڑا کس مزے سے کھاتا ہے اور کس طرح وہی سوکھا ٹکڑا اسے دنیا کی تمام نعمتوں سے زیادہ لذیذ معلوم ہوتا ہے۔مجھے یاد ہے۔میری دو تین سال کی عمر تھی کہ میری آنکھیں دُکھنے آگئیں۔ڈاکٹروں نے ایسی حالت میں مجھے روٹی کھلانی منع کر دی۔ایک دن صبح کے وقت مجھے آنکھوں میں سخت تکلیف محسوس ہوئی کیونکہ صبح کے وقت رات بھر آنکھ بند رہنے کی وجہ سے پانی اندر بھر جاتا ہے اور آنکھوں میں درد ہوتا ہے۔اوراس کی وجہ سے لازمی طور پر بچہ رونے لگ جاتا ہے۔بہرحال آنکھیں دُکھنے کی وجہ سے مجھے تکلیف ہوئی اور میں نے رونا شروع کر دیا۔ہمارے گھر کی ایک خادمہ نے یہ دیکھ کر مجھے اُٹھالیا اور پچکارنا شروع کر دیا۔اس وقت وہ روٹی کا ایک باسی ٹکڑا ہاتھ میں پکڑے ہوئے بڑے مزے سے کھاتی جاتی تھی۔اور ساتھ ساتھ مجھے پچکارتی جاتی تھی۔مجھے ساری عمر میں کبھی کسی کھانے کا اتنا مزہ نہیں آیا جتنا مجھے اس باسی ٹکڑہ کی خوشبو کا محسوس ہوا۔کیونکہ وہ اپنے دل کے اطمینان کی وجہ سے اس باسی ٹکڑہ میں بھی اتنا لطف محسوس کر رہی تھی کہ اس نے وہ لطف اور وہ لذت کا احساس میرے اندر بھی پیدا کر دیا۔حالانکہ وہ بغیر کسی سالن کے اور بغیر کسی ایسی چیز کے کھا رہی تھی جو اس ٹکڑے کو نرم کر دے۔مگر جس مزے سے وہ کھا رہی تھی اور جس طرح وہ مچاکے مار رہی تھی۔وہ مچاکے محسوس کراتے تھے کہ اس کے نزدیک دنیا کا سب سے بڑا کھانا وہی ہے۔لطیفہ یہ ہے کہ تین چار سال کے بعد ایک دفعہ اماں جانؓ نے مجھ سے پوچھا کہ تمہارا کس چیز کو دل چاہتا ہے تو میری طبیعت پر اس کا اتنا اثر تھا کہ میں نے کہا۔میرا جی چاہتا ہے کہ میں باسی روٹی کھاؤں۔تو جب انسان قناعت سے کام لے اور شکر

گذاری کے جذبات کے ساتھ ہر چیز کو دیکھے تو اسے معمولی سے معمولی چیز بھی دنیا کی اعلیٰ ترین نعمت دکھائی دینے لگتی ہے۔

حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ سنایا کرتے تھے کہ ایک بڑھیا تھی جو بڑی نیک اور عبادت گذار تھی ۔ میں نے ایک دفعہ اس سے کہا کہ مائی مجھے کوئی خدمت بتاؤ۔ میں چاہتا ہوں کہ اگر تمہاری کوئی خواہش ہو تو اس کو پورا کر کے ثواب حاصل کروں ۔ وہ کہنے لگی ۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے ۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ۔ میں نے پھر اصرار کیا اور کہا کہ کچھ تو بتاؤ۔ میری بڑی خواہش ہے کہ میں تمہاری خدمت کروں ۔ وہ کہنے لگی ۔ نور الدین ؓ! مجھے اَور کیا چاہیے ۔ کھانے کے لئے روٹی اور اوڑھنے کے لئے لحاف کی ضرورت ہوتی ہے اللہ تعالیٰ مجھے دو روٹیاں بجھوا دیتا ہے ۔ ایک میں کھا لیتی ہوں اور ایک میرا بیٹا کھا لیتا ہے ۔ اور ایک لحاف ہمارے پاس موجود ہے جس میں ہم دونوں ماں بیٹا سو رہتے ہیں ۔ میں ایک پہلو پر سوئے ہوئے تھک جاتی ہوں تو کہتی ہوں ۔ بیٹا! اپنا پہلو بدل لے اور میں دوسرے پہلو پر لیٹ جاتی ہوں ۔ اس کا ایک پہلو تھک جاتا ہے تو وہ مجھے کہتا ہے اور میں اپنا پہلو بدل لیتی ہوں ۔ بس بڑے مزے سے عمر گذر رہی ہے ۔ اَور کسی چیز کی کیا ضرورت ہے ۔ میں نے پھر اصرار کیا ۔ تو کہنے لگی اچھا ۔ اگر تم بہت ہی اصرار کرتے ہو تو پھر مجھے ایک موٹے حرفوں والا قرآن لا دو ۔ میری نظر اب کمزور ہو گئی ہے اور باریک حروف نظر نہیں آتے ۔ موٹے حرفوں والا قرآن مل جائے تو میں آسانی سے قرآن پڑھ سکوں گی ۔ اب ایک طرف اس بڑھیا کی حالت کو دیکھو اور دوسری طرف اس امر کو سوچو ۔ کہ اب اگر کوئی چار سو روپیہ ماہوار کماتا ہے تو وہ بھی بے چین ہے ۔ پانچ سو روپیہ ماہوار کماتا ہے تو وہ بھی بے چین ہے ۔ دو ہزار روپیہ ماہوار کماتا ہے تو وہ بھی بے چین ہے ۔ حالانکہ مال حاصل کرنا اصل مقصود نہیں بلکہ اصل مقصود راحت اور چین ہوتا ہے ۔ اور اگر یہی حاصل نہ ہو تو روپیہ لے کر کسی نے کیا کرنا ہے لیکن اگر انسان اپنے دل میں شکر گذاری کا جذبہ پیدا کرے تو اسے عالم کا ذرہ ذرہ اپنا محسن دکھائی دیتا ہے ۔ اور چونکہ عالم کا ہر ذرہ خدا تعالیٰ کے احسان کے نیچے ہے اس لئے اسے خدا ہی اپنا محسن حقیقی نظر آتا ہے ۔

حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ دلی کے ایک بہت بڑے بزرگ گذرے ہیں ۔ ان کے متعلق لکھا ہے کہ انہیں لڈّو بہت پسند تھے ۔ دِلّی میں بالائی کے لڈو بنتے ہیں جو بہت لذیز ہوتے ہیں ۔ ایک دفعہ وہ اپنی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ کوئی شخص بالائی کے دو لڈو ان کے پاس ہدیۃً لایا ۔ ان کے ایک شاگرد غلام علی شاہ بھی اس وقت پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے وہ دونوں لڈو ان کو دے دیئے ۔ بالائی کے لڈو بہت چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں اخروٹ کے برابر بلکہ اس سے بھی چھوٹے ہوتے ہیں ۔ انہوں نے ایک دفعہ ہی وہ دونوں لڈو اُٹھائے اور مونہہ میں ڈال لئے ۔ جب وہ کھا چکے تو حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ نے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا ۔ میاں غلام علی! معلوم

ہوتا ہے تم کو لڈو کھانے نہیں آتے۔ وہ اس وقت تو خاموش ہو گئے مگر کچھ دنوں کے بعد ان سے کہنے لگے۔ حضور مجھے لڈو کھانے سکھا دیجئے۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ نے کہا کہ اگر اب کسی دن لڈو آئیں تو مجھے بتانا۔ میں تمہیں لڈو کھانا سکھا دوں گا۔ کچھ دنوں کے بعد پھر کوئی شخص ان کے لئے بالائی کے لڈو لایا۔ میاں غلام علی صاحب کہنے لگے۔ حضور! آپ نے میرے ساتھ وعدہ فرمایا ہوا ہے کہ میں تمہیں لڈو کھانا سکھا دوں گا۔ آج اتفاقاً پھر لڈو آ گئے ہیں۔ آپ مجھے بتائیں کہ لڈو کس طرح کھائے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنا رومال نکالا۔ اور اس پر وہ لڈو رکھ کر ایک لڈو سے ذرہ سا ٹکڑہ توڑ کر اپنے منہ میں ڈالا اور سبحان اللہ! سبحان اللہ کہنے لگ گئے۔ پھر فرمانے لگے۔ واہ مظہر جان جاناںؒ تجھ پر تیرے رب کا کتنا بڑا فضل ہے۔ یہ کہہ کر پھر سبحان اللہ! سبحان اللہ کہنے لگ گئے اور اپنے شاگرد کو مخاطب کر کے فرمایا۔ میاں غلام علی! یہ لڈو کن کن چیزوں سے بنتا ہے۔ انہوں نے چیزوں کے نام گنانے شروع کر دیئے کہ اس میں کچھ بالائی ہے کچھ میٹھا ہے۔ کچھ میدہ ہے۔ یہ سن کر انہوں نے پھر سبحان اللہ! سبحان اللہ کہنا شروع کر دیا اور فرمایا۔ میاں غلام علی! تمہیں پتا ہے یہ میٹھا جو اس لڈو میں پڑا ہے کس طرح بنا۔ انہوں نے بتایا کہ زمیندار نے پہلے گنا بویا۔ پھر بیلنے میں اس کو بیلا۔ پھر رس تیار ہوئی اور اس سے شکر بنائی گئی۔ حضرت مظہر جان جاناںؒ فرمانے لگے۔ دیکھو وہ زمیندار جس نے نیشکر کو بویا تھا وہ کس طرح اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ کر راتوں کو اُٹھ اٹھ کر اپنے کھیتوں میں گیا اس نے ہل چلایا۔ کھیتوں کو پانی دیا اور ایک لمبے عرصہ تک محنت و مشقت برداشت کرتا رہا۔ صرف اس لئے کہ مظہر جان جاناںؒ ایک لڈو کھالے۔ یہ کہہ کر وہ پھر اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید میں مشغول ہو گئے۔ اور تھوڑی دیر بعد فرمانے لگے۔ چھ ماہ زمیندار اپنے کھیت کو پانی دیتا رہا۔ پھر کس محنت سے اس نے نیشکر کو بیلا۔ اس سے رس نکالی اور پھر آگ جلا کر کتنی دفعہ وہ اس دنیا کے دوزخ میں گیا۔ محض اس لئے کہ مظہر جان جاناںؒ ایک لڈو کھالے۔ اس کے بعد انہوں نے اسی طرح میدہ اور بالائی کے متعلق تفاصیل بیان کرنی شروع کر دیں۔ کہ کس طرح ہزاروں آدمی دن رات ان کاموں میں مشغول رہے۔ انہوں نے اپنی صحت کی پرواہ نہ کی۔ انہوں نے اپنے آرام کو نہ دیکھا انہوں نے اپنی آسائش کو نظر انداز کر دیا۔ اور یہ سارے کام خدا تعالیٰ نے ان سے محض اس لئے کرائے کہ مظہر جان جانان ایک لڈو کھالے۔ یہ کہہ کر ان پر پھر ربودگی کی کیفیت طاری ہو گئی اور وہ سبحان اللہ! سبحان اللہ کہنے لگ گئے۔ اتنے میں عصر کا وقت آ گیا اور وہ اٹھ کر نماز کے لئے چلے گئے۔ اور لڈو اسی طرح پڑا رہا۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی ہم نے دیکھا ہے۔ آپ کا یہ طریق تھا کہ جب آپ روٹی کھاتے تو روٹی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا توڑ کر اپنے منہ میں ڈال لیتے اور اس وقت تک کہ دانت اس کو چبا سکیں اچھی طرح چباتے

رہتے ۔آپ کی عادت بڑا لقمہ لینے کی نہیں تھی بلکہ آپ ہمیشہ چھوٹا لقمہ لیتے اور جہاں اس پہلے لقمہ کو دیر تک چباتے رہتے وہاں روٹی کا ایک اَور ٹکڑا لے کر اپنے ہاتھ میں ملتے جاتے اور ساتھ ہی سبحان اللہ سبحان اللہ کہتے جاتے ۔ کچھ دیر کے بعد اس میں سے کوئی ٹکڑہ سالن لگا کر منہ میں ڈال لیتے اور روٹی کے باقی ٹکڑے دستر خوان پر پڑے رہتے دیکھنے والے بعض دفعہ کہا کرتے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام روٹی کے ٹکڑوں میں سے حلال اور حرام ذرّے الگ الگ کرتے ہیں اور چونکہ روٹی کے بہت سے ٹکڑے آپ کے دستر خوان پر جمع ہوجاتے تھے اس لئے جب آپ کھانے سے فارغ ہوجاتے تو لوگ تبرّک کے طور پر ان ٹکڑوں کو آپس میں تقسیم کرلیا کرتے تھے۔

تو اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں اتنی وسیع ہیں کہ اگر انسان غور کرے اور سوچے تو اسے معلوم ہو کہ ہر قدم جو انسان اٹھاتا ہے ۔ ہر لمحہ جو انسانی زندگی پر گذرتا ہے ۔ ہر ساعت جو اس پر آتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے بے انتہا فضلوں اور اس کی بے انتہاء برکات کو اپنے ساتھ لے کر آتی ہے اور پھر اگر انسان اور زیادہ غور کرے تو اسے معلوم ہو کہ سارا جہان اس کی خدمت میں لگا ہوا ہے ۔اور دن رات اللہ تعالیٰ کے فضلوں سے وہ حصہ پا رہا ہے ۔ ہر ہاتھ جو وہ لمبا کرتا ہے ۔ ہر آنکھ جو وہ جھپکتا ہے ۔ ہر آواز جو وہ سنتا ہے ۔ ہر تھوک جو وہ نگلتا ہے اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کے احسان کا ہی نتیجہ ہے ۔ ورنہ خود انسان میں یہ کہاں طاقت تھی کہ وہ ایسا کرسکتا ۔اگر ڈاکٹر ہائیڈروکلورک ایسڈ پلا پلا کر انسان کی قوت ہضم کو درست کرتے تو وہ چند دنوں کے اندر اندر مر جاتا ۔لیکن اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر ایک ایسی مشین لگادی ہے کہ جونہی کوئی غذا استعمال میں آتی ہے وہ مختلف قسم کی تبدیلیوں کے بعد اسے انسانی خون میں شامل کردیتی ہے ۔اور پھر خون اس غذا کو لے کر فوراً دل میں پہنچتا ہے جہاں اس کی صفائی کے لئے اسے پھیپھڑوں میں سے گذارا جاتا ہے ۔ پھر صاف شدہ خون دل کے بائیں حصہ میں آنے کے بعد ایک بڑی رگ کے ذریعہ دل سے باہر نکلتا ہے جو آگے چل کر دو حصوں میں منقسم ہوجاتی ہے ۔ ایک حصہ سر کی طرف خون لے جاتا ہے اور دوسرا حصہ دل کے مقام سے نچلے حصہ کی طرف خون لے جاتا ہے ۔اور اس طرح ہر عضو اپنی اپنی ضرورت کے مطابق غذا حاصل کرلیتا ہے ۔مثلاً دماغ کے وہ اعلیٰ حصے جو عقل اور شعور کے مرکز ہیں وہ اس سے اپنی غذا لے لیتے ہیں اور جسم کے مختلف اعضاء کو حرکت میں لانے والے مراکز اپنی غذا لے لیتے ہیں ۔اسی طرح آنکھ، کان ، ناک ، زبان اور دوسرے اعضاء اپنی غذا لے لیتے ہیں ۔غرض ایک عظیم الشان نظام ہے جو زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر جاری کیا ہوا ہے۔

لوگ کارخانے دیکھتے ہیں تو تعجب کرتے ہیں ۔ چکیّوں کو دیکھتے ہیں تو حیران ہوجاتے ہیں ۔ کہ یہ کس طرح

آٹا پیس رہی ہیں۔ مگر انہیں کبھی احساس نہیں ہوتا کہ ان تمام مشینوں سے ایک بڑی مشین اللہ تعالیٰ نے خود انسانی جسم کے اندر پیدا کر رکھی ہے۔ جو پیس بھی رہی ہے۔ جو صاف بھی کر رہی ہے۔ جو طاقت بھی پہنچا رہی ہے۔ جس طرح بعض مشینیں ایسی ہوتی ہیں جو میدہ الگ نکالتی جاتی ہیں اور سبوس الگ نکالتی جاتی ہیں اسی طرح انسانی جسم میں اللہ تعالیٰ نے جو مشین بنا رکھی ہے ان میں سے کوئی خون صالح پیدا کرتی ہے۔ کوئی عقل کو طاقت دیتی ہے۔ کوئی سمع کو طاقت دیتی ہے۔ کوئی بصر کو طاقت دیتی ہے۔ کوئی قوت گویائی کو طاقت دیتی ہے۔ غرض ایک نظام ہے جو انسان کے اندر دن رات کام کر رہا ہے۔ اور بیسیوں چیزیں ہیں جو اس سے پیدا ہوتی ہیں۔ ان میں سے کوئی انسانی حِس کو طاقت دیتی ہے۔ کوئی قوت شامہ کو طاقت دیتی ہے۔ کوئی اعصاب کو طاقت دیتی ہے۔ اسی طرح انسانی دماغ میں مختلف قسم کے ڈیپارٹمنٹ بنے ہوئے ہیں۔ اتنے بڑے ڈیپارٹمنٹ دنیوی گورنمنٹوں میں بھی نہیں ہوتے جتنے انسانی دماغ میں اللہ تعالیٰ نے بنائے ہوئے ہیں۔ مگر انسان کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ مجھ پر اللہ تعالیٰ کے کیا کیا احسانات ہو رہے ہیں۔ وہ اندھے کی طرح گذر جاتا ہے اور اس کا دل اللہ تعالیٰ کی محبت سے ہمیشہ خالی رہتا ہے۔ لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ آپ کھانا کھاتے تو بسم اللہ پڑھتے۔ کھانا کھا چکتے تو اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے۔ اسی طرح کپڑے پہنتے تو خدا تعالیٰ کی حمد کرتے حالانکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑے ہی کیا تھے بہت معمولی اور سادہ کپڑے ہوا کرتے تھے۔ آج کل ململیں اور لٹھے اور کئی قسم کے آرام دہ کپڑے لوگ پہنتے ہیں۔ اور ان کے دلوں میں خدا تعالیٰ کے شکر کا کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ وہ مومن کہلاتے ہیں وہ خدا اور اس کے رسولؐ کو ماننے والے کہلاتے ہیں مگر انہیں کبھی خیال نہیں آیا کہ خدا کا وہ رسول جس کے متعلق یہ کہا گیا تھا کہ لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ (فوائد المجموعة مصنفه علّامه شوکانی صفحه ۱۱۶ و موضوعات کبیر صفحه ۷۰) اسے اپنے پہننے کے لئے جو کپڑے نصیب ہوئے ان سے ہزاروں گنا زیادہ اعلیٰ اور زیادہ آرام دہ کپڑے آج ہر ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان کو نصیب ہیں۔ مگر حالت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد اور اس کے شکر کے جو اعلیٰ ترین جذبات معمولی کپڑے پہن کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں پیدا ہوتے تھے وہ آج ہمارے دلوں میں پیدا نہیں ہوتے۔ یہ تمنا اور خواہش پیدا نہیں ہوتی کہ کاش یہ نعمتیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ملتیں کیونکہ ان نعمتوں کے اصل مستحق آپؐ ہی تھے۔

حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کے پاس ایک دفعہ ایک شخص آیا اور کہنے لگا۔ میں سیّد ہوں۔ میری بیٹی کی شادی ہے۔ آپ اس موقعہ پر میری کچھ مدد کریں۔ حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ یوں تو بڑے مخیّر تھے مگر طبیعت کا رجحان ہے جو بعض دفعہ کسی خاص پہلو کی طرف ہو جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ میں تمہاری بیٹی کی شادی کے لئے وہ

سارا سامان تمہیں دینے کے لئے تیار ہوں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیٹی فاطمہؓ کو دیا تھا۔ وہ یہ سنتے ہی بے اختیار کہنے لگا۔ آپ میری ناک کاٹنا چاہتے ہیں۔ حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ نے فرمایا کیا تمہاری ناک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناک سے بھی بڑی ہے۔ تمہاری عزت تو سیّد ہونے میں ہے۔ پھر اگر اس قدر جہیز دینے سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتک نہیں ہوئی تو تمہاری کس طرح ہو سکتی ہے۔

تو حقیقت یہ ہے کہ آج ایک ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان بھی دنیوی نعمتوں کے لحاظ سے اس سے زیادہ نعمتیں رکھتا ہے جتنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پائیں مگر اس کا دل محبت کے جذبات سے خالی ہوتا ہے۔ وہ ہزاروں گنا زیادہ نعمتیں دیکھ کر بھی اپنے رب کا شکر یہ ادا نہیں کرتا۔ لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں خدا تعالیٰ کے شکر کے جذبات اس قسم کے پائے جاتے تھے کہ آسمان سے جب بارش برستی تو وہ زمیندار جس کی کھیتیاں اس بارش سے تیار ہوتیں خاموشی کے ساتھ گذر جاتا۔ اسے پانی جمع کرتے ہوئے کبھی خیال بھی نہ آتا کہ یہ کہاں سے آ گیا ہے۔ وہ شہر جن میں کنوئیں نہیں ہوتے اور جہاں کے رہنے والے بارش پر تالابوں میں پانی جمع کر لیتے ہیں تا کہ سال بھر ان کی ضروریات پوری ہوتی رہیں وہ بھی اپنے لئے اور اپنے جانوروں کے لئے پانی جمع کرتے مگر ان کے دلوں میں بھی یہ احساس پیدا نہ ہوتا کہ ان کے رب نے ان پر یہ کتنا بڑا احسان کیا ہے کہ وہ سورج کی شعاعوں کے ذریعے سمندروں کا پانی بخارات کی صورت میں تبدیل کرتا اور پھر ہواؤں کے ذریعے ان کے ملک میں لا کر برسا دیتا ہے۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن کے نہ تالاب تھے نہ کھیتیاں تھیں نہ جانور تھے بارش آتی تو آپؐ کمرہ سے نکل کر باہر صحن میں آ جاتے۔ اپنی زبان باہر نکال لیتے اور جب اس پر پانی کا قطرہ گرتا تو آپؐ فرماتے۔ یہ میرے رب کا تازہ احسان ہے۔ یہ محبت اور پیار کا کیسا دلفریب رنگ ہے۔ لوگ پلاؤ اور زردہ کھا کر بھی خدا تعالیٰ کی محبت کا جوش اپنے دلوں میں نہیں پاتے اور اس کے فضلوں کے شکر گذار نہیں ہوتے۔ لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اللہ تعالیٰ سے محبت اس پایہ کی تھی کہ آپؐ اپنی زبان باہر نکال کر اس پر بارش کا قطرہ لیتے اور خدا تعالیٰ کی اس تازہ نعمت کا شکر ادا کرتے۔ اسی وجہ سے قرآن کریم میں بار بار اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرو۔ اور اس کے احسانات کو ہمیشہ یاد رکھو۔ جب انسان ہر چیز کو خدا تعالیٰ کا انعام سمجھتا اور اس کی نعمتوں کی قدر کرتا ہے تو اسے ایک ایسی سیڑھی مل جاتی ہے جو اسے خدا تعالیٰ تک پہنچا دیتی ہے۔ نہ شیطان اس کی راہ میں روک بنتا ہے اور نہ اس کا نفس اسے نیچے گرا سکتا ہے۔ وہ اس سیڑھی پر چڑھتے ہوئے سیدھا خدا تک پہنچ جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے دل میں خدا تعالیٰ کے احسانات کو دیکھ دیکھ کر شکر کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے جو اسے اوپر ہی اوپر لے جاتا ہے نیچے

گرنے سے اسے کلی طور پر محفوظ کر دیتا ہے۔

لطیف کے دوسرے معنے جیسا کہ اوپر بتایا جاچکا ہے اَلْعَالِمُ بِخَفَایَا الْاُمُوْرِ وَدَقَائِقِھَا کے ہیں۔یعنی ایسی ہستی جو تمام امور کے مخفی در مخفی پہلوؤں کو جاننے والی اور کائنات عالم کے تمام اسرار اور غوامض کا علم رکھنے والی ہے۔ان معنوں کے لحاظ سے اس میں یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ انسان کی نگاہ اپنے تمام علوم اور ایجادات کے باوجود صرف ظاہر تک محدود رہتی ہے۔ان امور کے پس پشت جو اللہ تعالیٰ کا عظیم الشان غیب کام کر رہا ہوتا ہے اور جو باریک در باریک حکمتیں ان میں مخفی ہوتی ہیں ان سے وہ آگاہ نہیں ہوتا اور اگر کائنات عالم کے رموز اور اسرار اس پر منکشف ہوتے ہیں تو اسی وقت جب اللہ تعالیٰ اپنی صفتِ لطیف کے ماتحت اسے اپنے حقائق سے آشنا کرتا اور اخفاء کے پردوں کو اس کی آنکھوں سے دور کرتا ہے۔اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے کہ تو لوگوں سے یہ کہہ دے کہ وَ لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَا سْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚۛ وَ مَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ (الاعراف:۱۸۹) یعنی اگر میں غیب کا واقف ہوتا تو بھلائیوں میں سے اکثر اپنے لئے جمع کر لیتا اور مجھے کبھی کوئی تکلیف نہ پہنچتی۔درحقیقت اگر غور سے کام لیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے علم غیب کو اپنے ہاتھ میں رکھ کر انسان کے لئے دو برکتیں پیدا کر دی ہیں۔ایک برکت تو پردۂ غیب کی وجہ سے اسے حاصل ہوتی ہے اور ایک برکت کشف غیب کی وجہ سے اسے حاصل ہوتی ہے۔پردۂ غیب کی وجہ سے جو برکت اسے حاصل ہے وہ تو اس سے ظاہر ہے کہ انسان کی ساری زندگی جدوجہد سے تعلق رکھتی ہے اور جدوجہد کی ساری بنیاد ہی غیب پر ہے۔اگر غیب کا پردہ حائل نہ ہو تو سعی و عمل کا تمام سلسلہ ختم ہو جائے۔مثلاً بچوں کو ان کے والدین سکول میں پڑھنے کے لئے بھیجتے ہیں۔اور وہ بھی اگر محنتی اور ذہین ہوں تو وہ سمجھتے ہیں کہ ہم اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے دنیا میں عزت حاصل کر لیں گے۔لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب ان کا امتحان قریب آتا ہے تو ان میں سے بعض لڑکے بیماریوں یا اچانک حادثات کی وجہ سے وفات پا جاتے ہیں۔اب اگر خدا تعالیٰ نے علم غیب اپنے ہاتھ میں نہ رکھا ہوتا اور ایک طالب علم کو یہ یقینی طور پر معلوم ہوتا کہ میں نے پندرہ سال کی عمر کو پہنچ کر مر جانا ہے۔تو وہ اسی وقت سے مغموم رہنا شروع کر دیتا۔اور اس کے والدین بھی رونے پیٹنے لگ جاتے اور وہ اپنی عمر کو بالکل ضائع کر دیتا۔لیکن پردۂ غیب کے حائل ہونے کی وجہ سے وہ برابر محنت کرتا چلا جاتا ہے۔اور گو بعد میں آکر وہ فوت ہو جاتا ہے مگر جس طرح ایک ٹوٹنے والے ستارے کی روشنی سے بھی کئی بھولے بھٹکے مسافر راہ پا لیتے اور کئی گڑھوں میں گرتے ہوئے سنبھل جاتے ہیں۔اسی طرح وہ دوسرے لڑکوں کے لئے ایسی روشنی چھوڑ جاتا ہے جو ان کی ترقی کا موجب بن جاتی ہے۔کیونکہ کئی لڑکے ایسے تھے جن کے سامنے اگر

اس کا وجود نہ ہوتا۔تو وہ کبھی محنت نہ کرتے ۔انہوں نے اگر محنت کی تو اسی لئے کہ اس لڑکے کی محنت اور ذہانت کو دیکھ کر ان کے دلوں میں بھی رشک پیدا ہوا۔اور انہوں نے بھی تعلیم میں دلچسپی لینی شروع کر دی اور رفتہ رفتہ وہ ترقی کر گئے۔

اسی طرح انسان اپنے دوستوں اور رشتہ داروں میں پھرتا ہے۔جن میں سے بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی دوستی خود غرضانہ ہوتی ہے۔یا وہ اپنے دل میں اس کے خلاف کئی قسم کے منصوبے سوچتے رہتے ہیں۔یا اس کے رشتہ دار بظاہر اس سے محبت کرتے ہیں۔لیکن وہ اپنے دلوں میں اس کے بدخواہ ہوتے ہیں۔اگر پردۂ غیب حائل نہ ہوتا اور انسان کو پتہ لگ جاتا کہ میرا فلاں دوست اپنے دل میں میرے متعلق اس قسم کے خیالات رکھتا ہے یا میرا فلاں رشتہ دار میرا بدخواہ ہے تو ایک قیامت برپا ہو جاتی۔جس گھر میں دیکھو لڑائی ہو رہی ہوتی۔ایک کہہ رہا ہوتا کہ تم نے میرے خلاف فلاں فلاں بات کیوں سوچی تھی۔اور دوسرا کہہ رہا ہوتا کہ تمہارے دل میں میرے خلاف اس قسم کے خیالات کیوں آ رہے تھے۔بیوی خاوند سے ناراض ہوتی اور خاوند بیوی سے ناراض ہوتا۔اور امن اور سکون دنیا سے اٹھ جاتا۔ پس پردۂ غیب جو اللہ تعالیٰ نے حائل کر رکھا ہے یہ اس کی ایک بڑی رحمت ہے۔

پھر اگر پردۂ غیب نہ ہوتا تو لڑائیوں میں تمام دنیا تباہ ہو کر رہ جاتی۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اَلْحَرْبُ خُدْعَةٌ (ترمذی ابواب الجهاد، باب ما جاء فی الرخصة فی الكذب) یعنی لڑائی لڑنے کا سارا کمال اس میں ہے کہ سب باتیں پردۂ اخفاء میں رہیں اور لڑنے والے اپنی سیاست اور تدبیر پر اعتماد کریں۔لیکن اگر پردۂ غیب نہ ہوتا اور جنگوں میں ایک طرف والوں کو پتہ لگ جاتا کہ ہمارا دشمن اس وقت فلاں جگہ پر ہے تو وہ اپنی توپوں کا منہ عین اسی طرف کر دیتے جدھر دشمن ہوتا۔اسی طرح دوسری طرف سے بھی توپوں کے گولے عین اسی جگہ آ کر گرتے۔جہاں دشمن موجود ہوتا اور اس طرح کوئی متنفس بھی نہ بچ سکتا۔اب تو ایسا ہوتا ہے کہ اگر ایک لاکھ فوج میدان میں جاتی ہے تو اس میں سے چند ہزار مر جاتے ہیں اور باقی فوج صحیح وسلامت رہتی ہے۔لیکن اگر پردۂ غیب نہ ہوتا اور فریقین کو ایک دوسرے کے حالات کا علم ہو جاتا۔تو نشانہ عین دشمن پر بیٹھتا اور کوئی شخص بھی محفوظ نہ رہ سکتا۔اسی طرح سائینس کی ترقی اور علوم جدیدہ کے انکشاف کی بنیاد بھی غیب پر ہی ہے۔اگر ہر چیز ظاہر ہوتی تو سعی وعمل اور ایجادات کا تمام سلسلہ ختم ہو جاتا اور انسان ایک ناکارہ وجود بن کر رہ جاتا۔غرض دنیا کے تمام کاروبار غیب پر چل رہے ہیں اگر غیب نہ رہے تو دنیا کا تمام کارخانہ بھی ختم ہو جائے۔اسی طرح روحانی عالم میں جزاء وسزا کی بنیاد بھی پردۂ غیب پر رکھی گئی ہے۔اگر پردۂ غیب ہٹا دیا جائے تو نہ نیکی قابل جزا سمجھی جائے اور نہ بدی سے اجتناب قابل ثواب سمجھا جائے۔

ہم ایک دفعہ لکھنؤ گئے۔ وہاں ایک سرحدی مولوی عبدالکریم تھا۔ جو ہماری جماعت کا شدید مخالف تھا۔ اس نے ہمارے آنے کے بعد ایک تقریر کی جس میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ایک واقعہ کو اس نے نہایت تحقیر کے طور پر بیان کیا۔ وہ واقعہ یہ تھا کہ ایک دفعہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام دِلّی گئے وہاں ہمارے ایک رشتہ دار کے ماموں مرزا حیرت دہلوی تھے۔ انہیں ایک دن شرارت سوجھی اور وہ جعلی انسپکٹر پولیس بن کر آ گئے۔ اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ڈرانے کے لئے کہنے لگے کہ میں انسپکٹر پولیس ہوں اور مجھے حکومت کی طرف سے اس لئے بھیجا گیا ہے کہ میں آپ کو نوٹس دوں کہ آپ یہاں سے فوراً چلے جائیں۔ ورنہ آپ کو سخت نقصان ہوگا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تو اس کی طرف توجہ نہ کی۔ مگر جب بعض دوستوں نے تحقیق کرنی چاہی کہ یہ کون شخص ہے تو وہ وہاں سے بھاگ گئے۔ اس واقعہ کو مولوی عبدالکریم سرحدی نے اس رنگ میں بیان کیا کہ دیکھو وہ خدا کا نبی بنا پھرتا ہے مگر وہ دلّی گیا تو مرزا حیرت انسپکٹر پولیس بن کر اس کے پاس چلا گیا۔ وہ کوٹھے پر بیٹھا ہوا تھا۔ (حالانکہ یہ بات بالکل جھوٹ تھی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نیچے دالان میں بیٹھے ہوئے تھے) جب اس نے سنا کہ انسپکٹر پولیس آیا ہے تو وہ ایسا گھبرایا کہ سیڑھیوں سے اترتے وقت اس کا پیر پھسلا اور وہ مونہہ کے بل زمین پر آ گرا۔ لوگوں نے یہ تقریر سن کر بڑے قہقہے لگائے اور ہنستے رہے۔ لیکن اسی رات مولوی عبدالکریم کو خدا تعالیٰ نے پکڑ لیا۔ وہ اپنے مکان کی چھت پر سویا ہوا تھا۔ کہ رات کو وہ کسی کام کے لئے اٹھا اور چونکہ اس چھت کی کوئی منڈیر نہیں تھی اور نیند سے اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں اس کا ایک پاؤں چھت سے باہر جا پڑا اور وہ دھڑم سے نیچے آ گرا (حیات احمد جلد ۳ جزء اول صفحہ ۲۷۴، ۲۷۵) ۔ اور گرتے ہی مر گیا۔ اب دیکھو اگر اس کو غیب کا پردہ نہ ہونے کی صورت میں پتہ ہوتا کہ مجھے گستاخی کی یہ سزا ملے گی تو وہ کبھی گستاخی نہ کرتا بلکہ آپ پر ایمان لے آتا گو ایسا ایمان اس کے کسی کام نہ آتا۔ کیونکہ جب غیب ہی نہ رہا تو ایمان کا کیا فائدہ۔ ایمان تو وہی کارآمد ہوسکتا ہے جو غیب کی حالت میں ہو۔ ثواب یا عذاب سامنے نظر آنے پر تو ہر کوئی ایمان لاسکتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ جب ایمان لائے تو یہ سمجھ کر ایمان لائے تھے کہ مجھے دین کے راستہ میں قربانیاں کرنی پڑیں گی اور اپنی جان دینی پڑے گی اور اگر پردۂ غیب نہ ہوتا۔ اور ان کو پہلے سے معلوم ہوتا کہ ان کے لئے انعامات مقدر ہیں اور وہ ان انعامات کی لالچ میں ایمان لے آتے تو ان کا ایمان کہاں رہتا۔ اسی طرح حضرت عمرؓ جب ایمان لائے تو ان کو یہ پتہ نہیں تھا کہ وہ خلیفہ بنیں گے۔ بلکہ وہ تو اس ارادہ سے نکلے تھے کہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دوں گا۔ مگر جب اپنی بہن سے انہوں نے قرآن کریم کے چند اوراق لے کر پڑھے تو ان پر حق کھل گیا۔ اور وہ ایمان لے آئے اور ان حالات

میں ایمان لائے کہ وہ جانتے تھے کہ مجھے مسلمان ہو کر اب اپنی جان قربان کرنی پڑے گی (السیرة النبویة لابن ھشام جزء اول اسلام عمر رضی اللہ عنہ)۔

اسی طرح حضرت عثمانؓ ایک خاموش طبع انسان تھے مگر ان کی قربانیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی عزت بخشی کہ صلح حدیبیہ کے وقت تمام صحابہؓ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی کہ یارسول اللہ! اگر ہم میں سے کوئی شخص مکہ میں جانے کے قابل ہے تو وہ عثمانؓ ہی ہیں۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ مکہ گئے اور چونکہ ان کی رشتہ داری مکہ میں بہت زیادہ تھی۔ رؤساء نے ان سے کہا کہ آپ کعبہ کا طواف کرلیں مگر حضرت عثمانؓ نے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ جب تک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم طواف نہیں کریں گے میں بھی نہیں کروں گا۔ حضرت عثمانؓ کو مکہ والوں سے بات چیت کرتے ہوئے دیر ہوگئی اور اندھیرا ہونے لگا۔ تو مسلمانوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا گیا ہے۔ اسی لئے وہ ابھی تک واپس نہیں لوٹے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ خبر پہنچی۔ تو آپؐ نے تمام صحابہؓ کو جمع کیا اور ان سب سے بیعت لی وہ ایک ہی بیعت تھی جو آپ نے موت کے نام پر لی۔ اس بیعت کے موقعہ پر آپؐ نے صحابہ سے یہ اقرار لیا کہ ہم دشمن کے مقابلہ سے پیچھے نہیں ہٹیں گے چاہے ہم سب کے سب مارے جائیں۔ جب سب صحابہؓ بیعت کر چکے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا۔ اس وقت عثمانؓ یہاں نہیں ہے۔ اور ممکن ہے وہ مارا گیا ہو۔ لیکن چونکہ اس کے زندہ ہونے کا بھی امکان ہے اس لئے (آپ نے اپنا دوسرا ہاتھ اپنے ہاتھ پر رکھتے ہوئے فرمایا) میں عثمانؓ کی جگہ اپنا ہاتھ بیعت کے لئے رکھتا ہوں۔ (تاریخ الخمیس بیعة الرضوان و السیرة النبویة لابن ھشام امر الحدیبیة.... و ذکر بیعة الرضوان) اب دیکھو عثمانؓ کے لئے یہ کتنا بڑا اعزاز تھا۔ اس کے مقابلہ میں اگر ان کی ہزار سالہ زندگی بھی قربان ہو جاتی تو ہیچ تھی۔ لیکن اگر حضرت عثمانؓ کو پتہ ہوتا کہ مجھے یہ اعزاز ملنے والا ہے اور میرے لئے فلاں فلاں انعامات مقدر ہیں اور وہ محض ان انعامات کا لالچ کرتے ہوئے ایمان لے آتے تو ان کے ایمان کی کیا حقیقت رہ جاتی۔

اسی طرح حضرت علیؓ جب ایمان لائے تو وہ ابھی بچے ہی تھے اور وہ بھی یہ سمجھ کر ایمان لائے تھے کہ مجھے اسلام کے لئے ہر قسم کے مصائب برداشت کرنے پڑیں گے یہاں تک کہ اگر جان قربان کرنے کا وقت آیا تو مجھے اپنی جان بھی خدا تعالیٰ کی راہ میں پیش کرنی پڑے گی۔ حدیثوں میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رسالت کے ابتدائی ایام میں ایک دعوت کی جس میں بنو عبد المطلب کو بلایا۔ تا کہ ان تک پیغام حق پہنچایا جائے۔ چنانچہ آپؐ کے بہت سے رشتہ دار اس دعوت میں شریک ہوئے۔ جب سب لوگ کھانا کھا چکے تو آپؐ نے کھڑے

ہو کر تقریر کرنا چاہی۔ مگر ابولہب نے ان سب لوگوں کو منتشر کر دیا اور وہ آپؐ کی بات سنے بغیر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ آپؐ بہت حیران ہوئے کہ یہ اچھے لوگ ہیں جو دعوت کھا کر بھی بات نہیں سنتے۔ مگر آپؐ مایوس نہیں ہوئے بلکہ آپؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ دوبارہ ان کی دعوت کی جائے۔ چنانچہ دوبارہ ان سب کو کھانے پر مدعو کیا گیا۔ جب وہ سیر ہو کر کھا چکے تو آپؐ کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ دیکھو اللہ تعالیٰ کا یہ تم پر کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے اپنا نبی تمہارے اندر بھیجا ہے۔ میں تمہیں خدا کی طرف بلاتا ہوں۔ اگر تم میری بات مانو گے تو تم دینی اور دنیوی نعماء کے وارث قرار پاؤ گے۔ کیا تم میں سے کوئی ہے جو اس کام میں میرا مددگار بنے؟ یہ سن کر ساری مجلس پر سناٹے کی سی حالت طاری ہو گئی مگر یکلخت ایک کونے سے ایک نوعمر بچہ اُٹھا اور اس نے کہا کہ گو میں ایک کمزور ترین فرد ہوں اور عمر میں سب سے چھوٹا ہوں مگر میں آپ کا ساتھ دوں گا۔ یہ بچے حضرت علیؓ تھے جنہوں نے اس وقت اسلام کی تائید کا اعلان کیا (السیرۃ الحلبیۃ باب ذکر اول الناس ایمانا بہ صلی اللہ علیہ وسلم)۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت علیؓ کو یہ عظیم الشان قربانی کرنے کی توفیق عطا فرمائی کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے لئے رات کے وقت اپنے گھر سے نکلنا چاہا۔ تو آپؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ تم میرے بستر پر لیٹ جاؤ تا کہ کفار اگر جھانک کر دیکھیں تو انہیں یہ دکھائی دیتا رہے کہ کوئی شخص بستر پر سو رہا ہے اور وہ تعاقب کے لئے ادھر ادھر نہ نکل کھڑے ہوں۔ اس وقت حضرت علیؓ نے یہ نہیں کہا کہ یا رسول اللہ۔ مکان کے اردگرد تو قریش کے چنیدہ نوجوان ہاتھ میں تلواریں لئے کھڑے ہیں اگر صبح کو انہیں معلوم ہوا کہ آپ کہیں باہر تشریف لے جا چکے ہیں تو وہ مجھ پر حملہ کر کے مجھے قتل کر دیں گے۔ بلکہ وہ بڑے اطمینان کے ساتھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر لیٹ گئے اور آپؐ نے اپنی چادر ان پر ڈال دی۔ جب صبح ہوئی اور قریش نے دیکھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بجائے حضرت علیؓ آپؐ کے بستر سے اٹھے ہیں۔ تو وہ اپنی ناکامی پر دانت پیس کر رہ گئے۔ اور انہوں نے حضرت علیؓ کو پکڑ کر مارا پیٹا۔ مگر اس سے کیا بن سکتا تھا۔ خدائی نوشتے پورے ہو چکے تھے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سلامتی کے ساتھ مکہ سے باہر جا چکے تھے (السیرۃ الحلبیۃ باب عرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نفسہ علی القبائل من العرب ان یحموہ و ینا صروہ...)۔ اُس وقت حضرت علیؓ کو کیا معلوم تھا کہ مجھے اس ایمان کے بدلے میں کیا ملنے والا ہے۔ ہاں اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ اس قربانی کے بدلہ میں صرف حضرت علیؓ ہی عزت نہیں پائیں گے بلکہ حضرت علی کی اولاد بھی عزت پائے گی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت علیؓ پر پہلا فضل تو یہ کیا کہ اُن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دامادی کا شرف بخشا اور دوسرا فضل اللہ تعالیٰ نے اُن پر یہ کیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں اُن کے لئے اتنی محبت پیدا کی کہ

آپؐ نے بارہا اُن کی تعریف فرمائی۔ جب حضرت علیؓ بڑی عمر کو پہنچے ہوں گے تو اُن کو اللہ تعالیٰ کے یہ فضل دیکھ کر کتنا فخر محسوس ہوتا ہوگا۔ اور اُن کو کتنی راحت ہوتی ہوگی۔ پھر ایک دفعہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی جنگ کے لئے باہر تشریف لے گئے۔ تو آپؐ نے حضرت علیؓ کو مدینہ میں رہنے کا حکم دیا۔ حضرت علیؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور انہوں نے کہا۔ یا رسول اللہ! کیا آپؐ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑ چلے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا۔ اَلَا تَرْضٰی اَنْ تَكُوْنَ مِنِّيْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُّوْسٰی (ترمذی ابواب المناقب باب مناقب علیؓ) یعنی اے علیؓ! کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ تمہاری مجھ سے وہی نسبت ہو جو ہارونؑ کو موسیٰ سے تھی۔ یعنی ہارونؑ کو بھی تو موسیٰؑ اپنے پیچھے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ پھر کیا ہارون کی عزت کم ہوگئی تھی۔ اب دیکھو یہ اعزاز جو حضرت علیؓ کو حاصل ہوا۔ اس کے مقابلہ میں اُن کی قربانیاں کیا چیز تھیں۔ اسی طرح اس امت کے اکثر اولیاءؒ اور صوفیاء حضرت علیؓ کی اولاد میں سے ہی تھے۔ اور پھر ان کے ذریعے خدا تعالیٰ نے ایسے ایسے معجزات ظاہر کئے کہ ان کو دیکھ کر حیرت آتی ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے میں نے ایک واقعہ سنا ہوا ہے۔ کہ ہارون الرشید نے امام موسیٰؒ رضاؒ کو کسی وجہ سے قید کر دیا۔ اور اُن کے ہاتھوں اور پاؤں میں رسیّاں باندھ دی گئیں۔ اُس زمانہ میں سپرنگ دار گدیلے تو نہ تھے۔ عام روئی کے گدیلے ہوتے تھے۔ ہارون الرشید اپنے محل میں آرام دہ گدیلوں پر سویا ہوا تھا کہ اُس نے خواب میں دیکھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں۔ اور آپؐ کے چہرہ پر غضب کے آثار ہیں۔ آپؐ نے فرمایا۔ ہارون الرشید! تم ہم سے محبت کا دعویٰ کرتے ہو۔ مگر تمہیں شرم نہیں آتی کہ تم تو آرام دہ گدیلوں پر گہری نیند سو رہے ہو۔ اور ہمارا بچہ شدّت گرما میں ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے قید خانہ کے اندر پڑا ہے یہ نظارہ دیکھ کر ہارون الرشید بیتاب ہو کر اُٹھ بیٹھا۔ اور ایک کمانڈر کو ساتھ لے کر اُسی جیل خانہ میں گیا اور اپنے ہاتھ سے اُن کے ہاتھوں اور پاؤں کی رسیاں کھولیں۔ انہوں نے ہارونؔ الرشید سے کہا۔ آپ تو اتنے مخالف تھے اب کیا بات ہوئی کہ خود چل کر یہاں آ گئے۔ ہارونؔ الرشید نے اپنا خواب سنایا اور کہا میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ میں اصل حقیقت کو نہ جانتا تھا۔ اب دیکھو اس زمانہ میں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؓ کے زمانہ میں کتنا بڑا فاصلہ تھا۔ ہم نے کئی بادشاہوں کی اولادوں کو دیکھا ہے کہ وہ دربدر دھکے کھاتی پھرتی ہیں میں نے خود دلّی میں ایک سقّہ دیکھا جو شاہانِ مغلیہ کی اولاد میں سے تھا۔ وہ لوگوں کو پانی پلاتا پھرتا تھا مگر اُس میں اتنی حیا ضرور تھی کہ مانگتا کچھ نہ تھا۔ دوسری طرف حضرت علیؓ کی اولاد کو دیکھو کہ اتنی پشتیں گزرنے کے بعد بھی خدا تعالیٰ ایک بادشاہ کو رؤیا میں ڈراتا ہے۔ اور اُن سے حُسن سلوک کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ اگر حضرت علیؓ کو اس اعزاز کا پتہ ہوتا اور اُن کو غیب کا علم حاصل ہوتا اور وہ

محض اس عزت افزائی کے لئے اسلام قبول کرتے تو ان کا ایمان صرف سودا اور دوکانداری رہ جاتا۔ کسی انعام کا موجب نہ بنتا۔ (ملفوظات حضرت مسیح موعود علیہ السلام جلد ۵ صفحہ ۴۹۳)

اِسی طرح حضرت خدیجہؓ جب ایمان لائیں تو اُن کو کیا معلوم تھا کہ اس ایمان کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے اُن کے لئے کیا کچھ برکات مقدّر کر رکھی ہیں۔ بیشک انہوں نے اسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کے لئے اپنا تمام مال قربان کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ مکہ کی متمول ترین عورت ہوتے ہوئے غربت اور تنگدستی کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئیں۔ اور پھر شعب ابی طالب میں متواتر تین سال تک انہوں نے ایسی ایسی تکالیف برداشت کیں کہ اُنہی کے نتیجہ میں آپ وہاں سے نکلتے ہی انتقال فرما گئیں (السیرة النبویة لابن هشام حدیث تزویج رسول اللهؐ خدیجةؓ و خبر الصحیفة و وفاة ابی طالب و خدیجةؓ) مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی قربانیوں کو ایسا نوازا کہ آج تک عالمِ اسلام اُن کا نام عزت اور ادب کے ساتھ لے رہا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں ان کی ایسی محبت ڈالی کہ جنگ بدر میں جب رسول کریم صلی اللہ علیہ سلم کے داماد ابوالعاص جو ابھی تک اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے قید ہو کر آئے تو آپؐ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ نے جو ابھی مکہ میں ہی تھیں اُن کے فدیہ کے طور پر اپنے گلے کا ہار اتار کر بھیج دیا۔ یہ وہ ہار تھا جو حضرت خدیجہؓ نے اپنی بیٹی کو جہیز میں دیا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ہار کو دیکھا تو آپؐ کو حضرت خدیجہؓ یاد آ گئیں۔ اور آپؐ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ پھر آپؐ نے صحابہ سے فرمایا۔ اگر تم چاہو تو خدیجہؓ کی یہ یادگار اُن کی بیٹی کے پاس محفوظ رہے (السیرة النبویة لابن هشام ذکر رؤیا عاتکة بنت عبد المطلب)۔

اِسی طرح حضرت خدیجہؓ کی وفات کے کئی سال بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ اپنے گھر میں تشریف رکھتے تھے۔ کہ حضرت خدیجہؓ کی بہن ہالہؓ آپؐ سے ملنے کے لئے آئیں اور دروازے پر کھڑے ہو کر انہوں نے کہا۔ کیا میں اندر آ سکتی ہوں۔ ہالہؓ کی آواز چونکہ اپنی بہن حضرت خدیجہؓ سے بہت کچھ ملتی جلتی تھی۔ اس لئے اس آواز کے کان میں پڑتے ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں حضرت خدیجہؓ کی یاد تازہ ہو گئی۔ آپؐ بے تاب ہو کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا۔ آہ میرے خدا! یہ تو خدیجہؓ کی آواز معلوم ہوتی ہے (بخاری کتاب مناقب الانصار باب تزویج النبیؐ خدیجة و فضلها ؓ)۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اُن پر ایسا احسان کیا کہ ابراہیمؓ کے سوا جو حضرت ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی باقی تمام اولاد حضرت خدیجہؓ سے ہی پیدا ہوئی (اسد الغابة کتاب النساء حرف میم ماریه القبطیة)۔ چنانچہ حضرت خدیجہؓ کے بطن سے آپ کے تین لڑکے

اور چار لڑکیاں پیدا ہوئیں ۔ لڑکے تو سب کے سب بچپن میں ہی وفات پا گئے۔مگر حضرت زینبؓ حضرت رقیہؓ ،حضرت ام کلثومؓ اور حضرت فاطمہؓ چاروں لڑکیاں زندہ رہیں۔اور اسلام میں داخل ہوئیں (اسد الغابة کتاب النساء حرف الخاء خدیجةؓ)۔حضرت امام حسنؓ اور امام حسینؓ حضرت فاطمة الزہراؓ کے بطن سے ہی پیدا ہوئے تھے جو حضرت خدیجہؓ کی صاحبزادی تھیں۔اور انہی کی اولاد آج سادات کہلاتی ہے۔غرض اللہ تعالیٰ نے انہیں اور ان کی تمام نسل کو اپنے غیر معمولی انعامات سے نوازا۔لیکن اگر حضرت خدیجہؓ کو یہ معلوم ہوتا کہ انہیں ایک دن یہ اعزاز حاصل ہونے والا ہے کہ تمام عالمِ اسلام انہیں اُم المومنین کہے گا اور قیامت تک ان کی نسل کو معزز اور مکرم قرار دیا جائے گا اور وہ اللہ تعالیٰ کے لئے نہیں بلکہ محض اس عزت اور مقام کے حصول کے لئے ایمان لاتیں تو ان کا ایمان لانا ان کے کس کام آتا۔

اسی طرح ابوجہل جو سمجھتا تھا کہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو مار ڈالوں گا اور اسلام کو مٹا دوں گا۔اگر اس کو یہ علم ہوتا کہ اس کی مخالفانہ کوششوں کے باوجود اسلام دنیا میں پھیل جائے گا اور دنیا میں اس کا نام لعنت کے ساتھ لیا جائے گا بلکہ خود اس کا بیٹا اسلام میں داخل ہو جائے گا اور وہ اسلام کے لئے دشمنوں سے لڑتا ہوا مارا جائے گا تو وہ کبھی اسلام کے خلاف اپنی آواز بلند نہ کرتا۔غرض اگر پردۂ غیب حائل نہ ہوتا تو نہ ابوبکرؓ ابوبکرؓ ہوسکتا۔نہ ابوجہل ابوجہل بن سکتا۔لیکن جہاں دینی اور دنیوی کاروبار پردۂ غیب کی وجہ سے چل رہا ہے وہاں مومنوں کے ایمان کی ترقی انکشافِ غیب سے تعلق رکھتی ہے۔جب انبیاء دنیا میں آتے اور لوگوں کو غیب کی خبریں سناتے ہیں اور پھر مخالف حالات میں ان کی بتائی ہوئی خبریں پوری ہو جاتی ہیں تو دلوں میں ایک نیا ایمان پیدا ہوجاتا ہے اور خدا تعالیٰ کی ہستی اس طرح عریاں ہو کر لوگوں کے سامنے آجاتی ہے کہ اس کے وجود کا کوئی دیانتدار انسان انکار نہیں کرسکتا۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ میں ایک دفعہ کپورتھلہ کے احمدیوں اور غیر احمدیوں کا وہاں کی ایک مسجد کے متعلق مقدمہ ہوگیا۔جس جج کے پاس یہ مقدمہ تھا اس نے مخالفانہ رویہ اختیار کرنا شروع کردیا۔اس پر کپورتھلہ کی جماعت نے گھبرا کر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دعا کے لئے خط لکھا۔حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اس کے جواب میں انہیں تحریر فرمایا کہ اگر میں سچا ہوں تو مسجد تم کو مل جائے گی۔مگر دوسری طرف جج نے اپنی مخالفت بدستور جاری رکھی اور آخر اس نے احمدیوں کے خلاف فیصلہ لکھ دیا۔مگر دوسرے دن جب وہ فیصلہ سنانے کے لئے عدالت میں جانے کی تیاری کرنے لگا تو اس نے نوکر سے کہا۔مجھے بوٹ پہنا دو۔نوکر نے ایک بوٹ پہنایا اور دوسرا

ابھی پہنا ہی رہا تھا۔ کہ کھٹ کی آواز آئی۔ اس نے اوپر دیکھا۔ تو جج کا ہارٹ فیل ہو چکا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد دوسرے جج کو مقرر کیا گیا۔ اوراس نے پہلے فیصلہ کو بدل کر ہماری جماعت کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ جو دوستوں کے لئے ایک بہت بڑا نشان ثابت ہوا۔ اوران کے ایمان آسمان تک جا پہنچے (اصحاب احمد جلد ۴ صفحہ ۲۳ تا ۲۵)۔ غرض اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ وہ اپنے انبیاء کے ذریعہ متواتر غیب کی خبریں دیتا ہے۔ جن کے پورا ہونے پر مومنوں کے ایمان اَور بھی ترقی کر جاتے ہیں۔ یہ غیب کی خبروں کا ہی نتیجہ تھا کہ جو لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے ان کے دل اس قدر مضبوط ہو گئے کہ اور لوگ تو موت کو دیکھ کر روتے ہیں۔ مگر صحابہؓ میں سے کسی کو جب خدا تعالیٰ کی راہ میں جان دینے کا موقعہ ملتا تو وہ خوشی سے اچھل پڑتا۔ اور کہتا فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ۔ ربِ کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہو گیا۔ آخر یہ روح ان کے اندر کہاں سے آ گئی تھی۔ یہ وہی روح تھی جو اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غیب کی خبریں بتا بتا کر مومنوں کے اندر بھر دی تھی۔ اگر ان پر انکشافِ غیب نہ ہوتا تو وہ اس اعلیٰ مقام پر کبھی کھڑے نہ ہو سکتے جس پر مسلمان پہنچے۔ پس یہ دونوں چیزیں اپنی اپنی جگہ بنی نوع انسان کے لئے منفعت بخش ہیں۔ غیب بھی اپنی جگہ فائدہ مند ہے اور انکشافِ غیب بھی اپنی جگہ نفع رساں ہے۔ ساری لذتیں غیب کے ساتھ ہیں اور ساری روحانیت کشفِ غیب کے ساتھ وابستہ ہے۔

خدا تعالیٰ کی دوسری صفت جس کی طرف ان مقطّعات میں توجہ دلائی گئی ہے وہ اس کی صفت سمیع ہے۔ اَلسَّمِیْعُ کے معنے ہیں کہ وہ لوگوں کی دعائیں سنتا اور انہیں نرالے طور پر قبول کرتا ہے اور یہ کہ اس کے سوا نہ زندہ آدمی دوسروں کی دعائیں سن سکتے ہیں اور نہ مردہ۔ صرف خدا ہی ہے جو لوگوں کی دعائیں سنتا اور ان کو قبول فرماتا ہے۔ چنانچہ دیکھ لو۔ کوئی یورپ میں دعا مانگ رہا ہوتا ہے۔ کوئی ایشیا میں دعا مانگ رہا ہوتا ہے۔ کوئی چین میں مانگ رہا ہوتا ہے۔ کوئی جاپان میں مانگ رہا ہوتا ہے۔ کوئی روس میں مانگ رہا ہوتا ہے۔ کوئی مصر، شام اور فلسطین میں مانگ رہا ہوتا ہے۔ مگر خدا ان سب کی دعائیں سن رہا ہوتا ہے۔ پس اس صفت کے ذریعے بنی نوع انسان کو اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ تمہارا خدا وہ ہے جو تمہاری دعاؤں کو سننے والا اور تمہاری تمام ضروریات اور حاجات میں کام آنے والا ہے تمہیں جب بھی کوئی مشکل پیش آئے۔ تمہارا فرض ہے کہ تم خدا تعالیٰ کے حضور جھکو۔ اور اس سے دعا کرو۔ اس کے لئے کسی مال کی ضرورت نہیں۔ کسی ہنر کی ضرورت نہیں۔ کسی طاقت اور قوت کی ضرورت نہیں۔ اگر کسی کے دونوں ہاتھ شل ہو چکے ہوں یا کوئی شخص اتنا نحیف اور کمزور ہو چکا ہو کہ وہ چارپائی سے اٹھ کر نماز کی حرکات بھی ادا نہ کر سکے۔ تب بھی وہ دعا کر سکتا ہے۔ کیونکہ دعا ان چیزوں کی محتاج نہیں۔ وہ بیشک لیٹا رہے اور اللہ تعالیٰ سے

دعا کرتا چلا جائے۔ بلکہ اگر اس کی زبان پر فالج گرا ہوا ہے اور وہ دعا کے لئے اپنی زبان بھی نہیں ہلا سکتا۔ تو وہ دماغ میں ہی دعائیہ فقرات کو دوہراتا رہے اور اگر اس کا دماغ بھی کام کرنے سے رہ جائے تو پھر اس کا زمانہ عمل ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن جب تک ایک انسان دنیا میں رہتا ہے اور انسانیت کی حدود سے وہ ادھر ادھر نہیں ہوتا اس وقت تک ایک معذور سے معذور انسان بھی اس میں حصہ لے سکتا ہے یہاں تک کہ وہ گونگا جس کی زبان نہیں وہ بہرہ جس کے کان نہیں۔ وہ مفلوج جس کے جسم کی حِس ماری گئی ہو۔ اور وہ گوشت کا لوتھڑہ بن کر چارپائی پر پڑا ہوا ہو وہ بھی اسی جوش وخروش سے اپنے رب سے دعا کر سکتا ہے جس طرح ایک تندرست اور طاقتور انسان۔

غرض دعا ایک ایسی چیز ہے جس نے دنیا کے تمام چھوٹوں اور بڑوں اور امیروں اور غریبوں کو ایک سطح پر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ اور دعا ہی وہ ہتھیار ہے جس کے متعلق خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے کہ اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ (النمل: ۶۳) وہ کون سی ہستی ہے جو بندہ کی دعائے مضطر سن کر بیتاب ہو جاتی اور دوڑ کر اس کے پاس آجاتی ہے۔ فرمایا۔ وہ میں ہوں۔ پس یہ عمل سب اعمال سے زیادہ طاقتور ہے بیشک نماز بھی ایک ضروری چیز ہے۔ روزہ بھی ایک ضروری چیز ہے۔ زکوٰۃ بھی ایک ضروری چیز ہے۔ حج بھی ایک ضروری چیز ہے۔ جہاد بھی ایک ضروری چیز ہے۔ مگر دعا وہ عمل ہے جس کے متعلق خدا تعالیٰ نے کہا ہے کہ اگر کوئی مجھے سچے دل سے پکارے تو میں ضرور اس کے پاس پہنچ جاتا ہوں۔ چنانچہ وہ فرماتا ہے۔ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ (البقرۃ: ۱۸۷)۔ یعنی جب کبھی میرے بندے انسانی خداؤں سے ناامید ہو کر پوچھیں کہ ہمارا آسمانی خدا کہاں ہے۔ ہم پر تو فرعون نے اور نمرود نے اور شدّاد نے اتنا تصرف کر لیا ہے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کہاں جائیں اور کس طرح ان کے مصائب اور آفات سے رہائی حاصل کریں تو تُو انہیں کہہ دے کہ تمہیں میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں۔ اِنِّیْ قَرِیْبٌ میں خود تمہارے قریب آیا ہوا ہوں۔ اگر تمہارا باپ تمہارے کام آسکتا۔ یا تمہارا چچا تمہاری مدد کر سکتا۔ یا تمہارا اَور کوئی رشتہ دار تمہارے قریب ہوتا تو تمہیں دوڑ کر اس کے پاس جانا پڑتا۔ مگر اب تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ میں خود تمہارے قریب آیا ہوا ہوں۔ پس تمہاری فریاد سنی جانے میں کوئی وقت نہیں لگ سکتا۔ دنیا میں تو تمہیں مدد حاصل کرنے کے لئے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے پاس جانا پڑتا ہے۔ مگر میں تو آپ دوڑ کر تمہارے قریب آچکا ہوں پھر تمہیں کیا مشکل پیش آسکتی ہے۔

یہ پیغام جو اسلام نے دنیا کے ہر فرد کو دیا ہے اتنا اہم اور اس قدر عظیم الشان انقلاب پیدا کرنے والا ہے کہ اس کی موجودگی میں دنیا کا کوئی دکھ انسان کو پریشان نہیں کر سکتا۔ دشمن خواہ آسمان سے بھی اونچے چلے جائیں اگر کوئی

شخص سچے دل سے اپنے رب کو پکارے تو اللہ تعالیٰ آسمان سے اپنا ہاتھ بڑھا کر ان کی گردنیں مروڑ سکتا ہے۔ بیشک وہ چھان چھان کر پانی پئیں۔ بیشک وہ رات اور دن پرہیز کرتے رہیں اگر خدا تعالیٰ ان کی ہلاکت کا فیصلہ فرما دے تو وہ ہیضہ یا طاعون یا انفلوئنزا کے کیڑوں کو بھی حکم دے سکتا ہے کہ تم اتنی تعداد میں فلاں شخص کے اندر داخل ہو جاؤ۔ کہ دنیا کی کوئی دوائی اس پر اثر نہ کر سکے اور وہ تڑپ تڑپ کر ہلاک ہو جائے اور میرا مومن بندہ خوش ہو جائے کہ میں نے اس کی مدد کی ہے۔ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ ان کے محلہ میں شاہی دربار کے بعض آدمی رات کو گانے بجانے کا شغل رکھتے تھے۔انہوں نے کئی دفعہ سمجھایا کہ لوگوں کی نیندیں اور نمازیں خراب ہوتی ہیں تم اس شغل کو ترک کر دو۔ مگر وہ نہ مانے۔جب انہوں نے بار بار کہا تو اس خیال کے ماتحت کہ کہیں یہ محلہ والوں سے مل کر ہمیں روکنے کا تہیہ نہ کر لیں۔انہوں نے شاہی پہرہ داروں کا انتظام کر لیا۔جب اس بزرگ کو اطلاع ملی تو انہوں نے کہا اچھا اِنہوں نے اپنی حفاظت کے لئے فوج بلالی ہے تو ہم بھی رات کے تیروں سے ان کا مقابلہ کریں گے۔معلوم ہوتا ہے ان لوگوں کے دلوں میں ابھی کچھ نیکی باقی تھی۔جونہی ان لوگوں کے کان میں یہ آواز پڑی کہ ہم رات کے تیروں سے مقابلہ کریں گے۔وہ دوڑتے ہوئے اس بزرگ کے پاس آئے اور کہنے لگے۔ان تیروں کے مقابلہ کی ہم میں طاقت نہیں۔ہم اپنے شغل سے باز آئے۔پس دعا ایک ایسا ہتھیار ہے کہ اگر کوئی شخص کامل یقین اور پختہ ایمان کے ساتھ اس سے کام لے تو بظاہر ناممکن نظر آنے والی باتیں بھی اس کے لئے ممکن ہو جاتی ہیں۔

مجھے یاد ہے ایک دفعہ میں دریا پر گیا۔ بھائی عبدالرحیم صاحب جو بچپن میں میرے استاد رہے ہیں اور کچھ اَور دوست میرے ساتھ کشتی میں سوار تھے۔جب ہم کشتی میں بیٹھے ہوئے دریا کی سیر کر رہے تھے تو میرے لڑکے ناصر احمد نے اپنے بچپن کے لحاظ سے کہا کہ ابا جان! اگر اس وقت ہمارے پاس مچھلی بھی ہوتی تو بڑا مزہ آتا۔میں نے کہا۔ لوگ کہتے ہیں کہ پانیوں میں خواجہ خضر کی حکومت ہے۔اگر خواجہ خضر کوئی مچھلی ہماری طرف پھینک دیں تو تمہاری یہ خواہش پوری ہو سکتی ہے۔جب میں نے یہ فقرہ کہا تو بھائی عبدالرحیم صاحب جھنجھلا کر کہنے لگے کہ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں اس بچے کی عقل ماری جائے گی میں نے کہا۔ ہمارے خدا میں تو سب طاقتیں ہیں وہ چاہے تو ابھی مچھلی بھجوا دے۔میں نے یہ فقرہ ابھی ختم ہی کیا تھا کہ یکدم پانی کی ایک لہر اٹھی اور ایک بڑی سی مچھلی کود کر ہماری کشتی میں آ گری۔میں نے کہا دیکھ لیجئے خدا تعالیٰ نے اپنی قدرت نمائی کر دی۔اور ہمارے دل میں جو خواہش پیدا ہوئی تھی وہ اس نے پوری کر دی۔خواجہ خضر بے شک وفات پا چکے ہوں مگر ہمارا خدا جو ہمارا خالق اور مالک ہے اور سَمِیْعُ الدُّعَا ہے وہ تو زندہ ہے اور وہ ہمارے جذبات کو جانتا ہے اس نے اس خواہش کو دیکھا اور میری بات کو پورا کر دیا۔

اسی طرح ایک دفعہ بڑی تپش کے بعد بارش آئی جس کمرہ میں مَیں رہتا تھا۔اس کی کھڑکی میں نے کھولی اور بارش کا نظارہ دیکھنے لگا۔ چونکہ بڑی دیر کے بعد بارش آئی تھی ۔اس لئے مجھے اس بارش کا بڑا مزہ آیا۔مگر اس روز مجھے پیچش کی شکایت تھی۔ میں ابھی بارش کا نظارہ دیکھ ہی رہا تھا کہ مجھے اجابت محسوس ہوئی ۔جب میں جانے لگا تو بے ساختہ میرے منہ سے نکلا کہ خدایا! تو ایسا فضل فرما کہ خواہ درمیانی عرصہ میں یہ بارش بند ہو جائے جب میں واپس آؤں تو پھر بارش شروع ہو جائے ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جونہی میں گیا۔ بارش بند ہو گئی ۔اور جب میں کمرہ میں واپس آیا اور میں نے دوبارہ کھڑکی کھولی تو یکدم بارش شروع ہو گئی جو آدھ گھنٹہ یا پون گھنٹہ تک جاری رہی ۔اب دیکھو بارش میرے اختیار میں نہیں تھی مگر خدا تعالیٰ نے ایسا فضل کیا کہ ادھر میں کمرہ میں پہنچا اور اُدھر بارش شروع ہو گئی ۔ اسی طرح حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک جماعت نے بڑے اصرار سے مجھے اپنے پاس بلایا ۔جب میں واپس آرہا تھا تو چلتے چلتے کسی آئندہ خرچ کے خیال سے میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو ایک روپیہ کم تھا ۔اس وقت میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی ۔کہ اللہ میاں مجھے ایک روپیہ بھیجیں ۔ابھی میرے دل سے یہ دعا نکل ہی رہی تھی کہ قریب کے گاؤں سے ایک آدمی ہماری طرف آتا دکھائی دیا ۔جماعت کے دوست جلدی سے حفاظت کے لئے میرے اردگرد جمع ہو گئے ۔ میں نے کہا کیا ہوا۔ کہنے لگے یہ ہمارے سلسلہ کا شدید دشمن ہے اور احمدیوں پر اکثر حملے کرتا رہتا ہے۔ ہم آپ کے گرد اس لئے کھڑے ہو گئے ہیں کہ وہ آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے ۔جب ہم اس گاؤں کے قریب پہنچے تو وہ دوڑتا ہوا آیا اور میرے ساتھیوں کو دھکا دے کر آگے بڑھا اور پھر اس نے ادب کے ساتھ میری طرف ہاتھ بڑھایا اور ایک روپیہ میرے ہاتھ پر رکھ کر چلا گیا۔ میں نے کہا۔ آپ لوگ تو کہتے تھے یہ مارنے آیا ہے اور اس نے تو ایک روپیہ نذرانہ کے طور پر دے دیا ہے۔ پھر میں نے انہیں بتایا کہ ابھی میرے دل میں خیال آیا تھا کہ خدا مجھے ایک روپیہ بھیجے ۔سو خدا نے اس شخص کو بھیج دیا اور اس نے مجھے ایک روپیہ نذرانہ کے طور پر دے دیا۔ غرض انسان کو اگر خدا تعالیٰ پر کامل یقین ہو تو وہ اس کے لئے بڑے بڑے نشانات ظاہر کر دیتا ہے۔

حدیثوں میں آتا ہے کہ سابقہ امتوں میں سے ایک امت کے تین آدمی ایک دفعہ ایک طوفان میں پھنس گئے اور وہ اس طوفان سے پناہ لینے کے لئے ایک پہاڑ کی غار میں چھپ گئے ۔اتفاقاً زور کی جو آندھی آئی تو پتھر کی ایک بڑی بھاری سِل لڑھک کر اس غار کے منہ کے آگے آ گئی اور نکلنے کا راستہ بند ہو گیا۔ وہ ایک چھوٹی مصیبت سے بچنے کے لئے پہاڑ کی غار میں گئے تھے مگر اس سے بڑی مصیبت میں پھنس گئے ۔اس جنگل میں جبکہ وہ ایک پہاڑ کی غار میں محبوس تھے کوئی آدمی ایسا نہ تھا جو انہیں اس مصیبت سے نجات دلاتا۔ وہ سخت گھبرائے اور جب انہیں اپنی نجات کی

کوئی صورت دکھائی نہ دی۔ تو ایک شخص کو دعا کی تحریک ہوئی اور اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ آؤ ہم نے اپنی عمر میں جو سب سے زیادہ نیکی کا کام کیا ہے اس کا واسطہ دے کر خدا تعالیٰ سے کہیں کہ وہ اس پتھر کو ہٹا دے۔ تب ان میں سے ایک نے کہا کہ اے خدا! تجھے معلوم ہے کہ ایک مزدور میرے پاس آیا اس نے میری مزدوری کی اور پھر پیشتر اس کے کہ وہ مجھ سے اجرت لیتا چلا گیا۔ میں نے اس کی اجرت کے پیسوں سے تجارت شروع کی اور اس میں سے نفع اٹھاتے ہوئے ایک بکری خریدی اس بکری سے اور بکریاں پیدا ہوئیں یہاں تک کہ سینکڑوں بکریوں اور بھیڑوں کا گلہ میرے پاس ہوگیا۔ وہ کئی سال کے بعد میرے پاس آیا اور کہنے لگا میری اٹھنی رہتی ہے وہ مجھے دی جائے۔ میں اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ اور سینکڑوں بکریوں اور بھیڑوں کا گلّہ اسے دکھا کر کہا یہ تیری امانت ہے اسے لے جا۔ وہ کہنے لگا۔ مجھ سے کیوں مذاق کرتے ہو۔ میری صرف اٹھنی رہتی تھی وہ مجھے دے دو۔ میں نے اسے کہا۔ اس اٹھنی سے ہی میں نے تجارت شروع کی تھی اور اب اس قدر بھیڑیں اور بکریاں ہوگئی ہیں۔ وہ کہنے لگا۔ پھر تو یہ میری نہ ہوئیں۔ تمہاری ہوئیں۔ میں نے اسے کہا نہیں میں نے اپنے لئے نہیں بلکہ تمہارے لئے تجارت کی تھی۔ تب وہ نہایت ہی حیران ہوا۔ مگر میرے مجبور کرنے پر وہ بھیڑوں اور بکریوں کے گلّوں کو ہانک کر اپنے گھر لے گیا۔ اے خدا! اگر میں نے یہ کام تیری رضا اور خوشنودی کے لئے کیا تھا تو تُو مجھ پر رحم فرما اور یہ پتھر راستہ سے ہٹا دے۔ اس دعا کے نتیجہ میں زور سے آندھی کا ایک طوفان اٹھا اور وہ پتھر ذرا سا لڑھک گیا۔ مگر ابھی ان کے نکلنے کا راستہ نہ بنا۔ تب دوسرے نے کہا۔ اے خدا تو جانتا ہے کہ مجھے ایک لڑکی سے جو میری رشتہ دار تھی بڑی محبت تھی مگر وہ کسی طرح میرے قابو نہیں آتی تھی۔ ایک دفعہ ملک میں شدید قحط پڑا۔ اور وہ اور اس کے رشتہ دار بھوکے مرنے لگے۔ آخر مجبور ہوکر وہ لڑکی میرے پاس مدد کے لئے آئی۔ میں نے اسے کہا کہ میں تمہاری مدد کے لئے تو تیار ہوں مگر پہلے تم میرے ساتھ ہمبستری کرو۔ وہ مجبوراً اس کام کے لئے رضامند ہوگئی۔ جب میں اس کے قریب گیا۔ تو اس لڑکی نے کہا۔ میں تمہیں خدا کا واسطہ دے کر کہتی ہوں کہ تو مجھے گناہ میں مبتلا مت کر۔ یہ سنتے ہی میں الگ ہوگیا۔ اور میں نے کہا۔ اب تو نے ایک بڑی ذات کا مجھے واسطہ دیا ہے میں اسی کی رضا کے لئے اس کام کو ترک کرتا ہوں۔ چنانچہ وہ لڑکی اُٹھی اور اپنے گھر چلی گئی اور میں نے روپیہ بھی اسے دے دیا۔ اے خدا! اگر میں نے یہ کام محض تیری رضا اور خوشنودی کے لئے کیا تھا تو تُو اس پتھر کو ہمارے راستہ سے ہٹا دے۔ تب پھر زور سے ایک طوفان اٹھا اور پتھر تھوڑا سا اور سرک گیا۔ مگر راستہ پھر بھی نہ بنا کیونکہ چٹان بہت بڑی تھی اور ابھی وہ اتنی نہیں لڑھکی تھی کہ ان کے نکلنے کا راستہ بن جاتا۔ تب تیسرا شخص خدا تعالیٰ کے حضور جھکا اور اس نے کہا اے خدا تجھے معلوم ہے کہ میں بکریاں چرایا کرتا ہوں اور دودھ پر

میرا گزارا ہے۔ایک دن مجھے بکریاں چراتے چراتے دیر ہوگئی اور میں جلدی گھر نہ پہنچ سکا۔میرے ماں باپ بہت بوڑھے تھے اور بچے چھوٹے چھوٹے ۔جب میں گھر پہنچا تو میرے ماں باپ سو چکے تھے اور بیوی بچے جاگ رہے تھے اور بھوک کی وجہ سے میرا انتظار کر رہے تھے۔جب میں پہنچا تو انہوں نے کہالاؤ ہمیں دودھ پلاؤ۔تا کہ ہم دودھ پی کر سو جائیں ۔مگر میں نے کہا جب تک میرے ماں باپ دودھ نہ پی لیں ۔کسی اور کو دودھ نہیں دے سکتا۔ چنانچہ میں نے دودھ کا پیالہ بھرا اور اپنے والدین کی پائنتی کے پاس کھڑا ہو گیا۔میری بیوی زاری کرتی رہی اور میرے بچے چیختے رہے ۔مگر میں نے ان کی چیخ و پکار کی کوئی پروا نہ کی۔اور دودھ کا پیالہ اپنے ہاتھ میں لئے برابر کھڑا رہا۔ یہاں تک کہ صبح ہوگئی اس وقت میرے والدین اٹھے تو میں نے انہیں دودھ پلایا اور پھر اپنی بیوی اور بچوں کو دودھ پلایا۔اے خدا! اگر میرا یہ کام محض تیری رضا اور خوشنودی کے لئے تھا اور دنیا کی کوئی غرض اس میں نہ تھی تو تو مجھ پر رحم فرما اور اس پتھر کو راستہ سے ہٹا دے۔تب پھر زور کا طوفان اٹھا اور پتھر لڑھک کر نیچے گر گیا۔اور وہ تینوں شخص غار سے باہر نکل آئے۔(ریاض الصالحین باب الاخلاص و النیۃ و بخاری کتاب الاجارۃ باب من استأجر اجیرا فترک أجرہ)

غرض دعا ایک بہت بڑا ہتھیار ہے جو ہر مصیبت میں انسان کے کام آتا اور اسے ہر قسم کی مشکلات سے رہائی عطا کرتا ہے۔اتنے بڑے ہتھیار کے ہوتے ہوئے بڑا ہی نادان وہ شخص ہے جو مصیبت کے آنے پر کسی اور کی طرف بھاگے اور اس سے مدد مانگے ۔سچا مومن وہی ہے جو اپنی ہر ضرورت خدا تعالیٰ سے مانگے ۔یہاں تک کہ اسے اگر اپنی جوتی کے لئے تسمہ کی بھی ضرورت ہو تو وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی سے مانگے ۔اور اس امر پر کامل یقین رکھے کہ اللہ تعالیٰ اس کی ہر ضرورت کو پورا کرنے پر قادر ہے اور وہ اسے اپنے دروازے سے کبھی خائب و خاسر واپس نہیں لوٹائے گا۔ جب مومن کے اندر یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو وہ سب دنیا کو بھول جاتا اور صرف اللہ تعالیٰ کو ہی اپنا حقیقی کارساز سمجھتا ہے۔

میں نے پہلے بھی کئی دفعہ بیان کیا ہے کہ ہماری جماعت کے ایک دوست مولوی امام الدین صاحب جو گولیکی ضلع گجرات کے رہنے والے اور قاضی اکمل صاحب کے والد تھے اور اب فوت ہو چکے ہیں وہ صوفی منش آدمی تھے۔ اور مجھے ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ وہ روحانی مقام احمدیت میں ہمیں نصیب نہیں ہو سکا جس کے متعلق ہم بہت کچھ سنا کرتے تھے میں نے ایک دفعہ ان سے پوچھا کہ وہ کیا مقام تھا جس کا آپ ذکر سنا کرتے تھے ۔کہنے لگے ہمارے پیر صاحب کہا کرتے تھے کہ جو شخص ہماری صحبت میں چند دن رہے اسے ہم عرش پر سجدہ کرا سکتے ہیں اور وہ خدا تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔میں احمدیت کو اپنی پہلی حالت سے بالا تو تسلیم کرتا ہوں مگر وہ نظارہ مجھے احمدیت

میں نظر نہیں آتا۔ میں نے ان کو ایک لطیفہ سنایا کہ حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک صوفی طرز کے پیر نے جب سنا کہ میں نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بیعت کر لی ہے تو اس نے اپنے ایک مرید کے ذریعہ مجھے کہلا بھیجا کہ مرزا صاحب کو مان کر اور ان کی بیعت کر کے کیا حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر آپ میری بیعت کر لیں تو مجھے اتنا کمال حاصل ہے کہ میں آپ کا پہلا سجدہ ہی عرش پر کروا دوں۔ جب اس کے مرید نے مجھے صوفی کا یہ پیغام سنایا تو میں نے کہلا بھیجا کہ مجھے عرش پر سجدہ کرنے سے جوتیاں نہ پڑیں گی۔ خدا تعالیٰ کہے گا میں نے زمین پر سجدہ کرنے کا حکم دے رکھا ہے اور تو آسمان پر سجدہ کرنے آ گیا ہے۔ اس پر مولوی امام الدین صاحب مرحوم کہنے لگے یہ تو ٹھیک ہے مگر اس سے میری تسلی نہیں ہوئی۔ غرض وہ جب بھی مجھ سے ملتے اسی قسم کی بات کرتے اور میں کسی نہ کسی رنگ میں ان کو جواب دیا کرتا مگر ان کے دل کی خلش دور نہ ہوتی۔ آخر ایک دن میں نے ان سے کہا مولوی صاحب کبھی آپ نے سوچا ہے کہ جس شخص کو خدا تعالیٰ نظر آ جائے اور اسے اتنے کمالات حاصل ہو جائیں کہ وہ خدا تعالیٰ کے عرش پر سجدہ کرنے لگ جائے۔ تو ایسے آدمی کی کیا حالت ہوتی ہے ایسے آدمی کا کفیل خود خدا تعالیٰ ہو جاتا ہے اور اسے بندوں کی کوئی احتیاج نہیں رہتی بلکہ وہ جو کچھ مانگتا ہے خدا تعالیٰ ہی سے مانگتا ہے اور چاہے بندے اس کی مدد کریں لیکن اس کی حالت يَنْصُرُكَ رِجَالٌ نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ کی سی ہوتی ہے۔ اور جو لوگ اس کی مدد کرتے ہیں وہ خود محتاج ہوتے ہیں اسی بات کے کہ اس کی مدد کریں۔ وہ اس بات کا محتاج نہیں ہوتا کہ کوئی اس کی مدد کرے۔ ایسے شخص کو کچھ دینے والا سمجھ رہا ہوتا ہے کہ میں اس کی مدد کر رہا ہوں۔ مگر لینے والا سمجھ رہا ہوتا ہے کہ میں اس سے لے کر اس پر احسان کر رہا ہوں۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ دینے والا زید ہو یا بکر۔ اسے خدا تعالیٰ نے ہی میری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے بھیجا ہے۔ میں کسی زید یا بکر کا ہرگز محتاج نہیں۔ ایسے شخص کو چاہے کسی ذریعہ سے کوئی چیز پہنچے وہ سمجھتا یہی ہے کہ یہ خدا نے مجھے بھیجی ہے۔ اب آپ بتائیں کہ کیا آپ کے پیر صاحب کو بھی یہ مقام حاصل تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ ان کی تمام ضروریات کو پورا کرتا ہو؟ جب میں نے ان سے یہ سوال کیا تو وہ خاموش ہو گئے اور کہنے لگے کہ میں اب سمجھ گیا ہوں۔ ہمارے پیر صاحب جو کہتے تھے کہ ہم یوں نظارے دکھاتے ہیں اور عرش پر سجدہ کرا دیتے ہیں۔ جب کبھی فصل وغیرہ کا موقعہ آتا تو زمینداروں کے پاس جاتے ان سے کہتے کہ ہمارا بھی خیال رکھنا۔ اب میں اس بات کو اچھی طرح سمجھ گیا ہوں کہ اگر فی الواقعہ ان کا خدا تعالیٰ کے ساتھ سچا تعلق ہوتا تو کسی بندے سے کیوں کہتے کہ میرا بھی خیال رکھنا۔ غرض خدا تعالیٰ کو اپنی آنکھوں کے ساتھ دیکھ لینے والے کے سامنے صرف خدا تعالیٰ کی ہی ذات رہتی ہے اور وہ اسی سے اپنی ہر ضرورت طلب کرتا اور اسی کو حقیقی

کارساز سمجھتا ہے۔مگر جہاں ایک مومن کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ سے ہمیشہ دعائیں مانگتا رہے وہاں اس کے لئے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ وہ لالچ اور حرص کے جذبات سے کلیتہً بالا رہے اور کبھی خدا تعالیٰ کا شکوہ اپنی زبان پر نہ لائے۔اللہ تعالیٰ مومنوں کو اس بارہ میں نصیحت کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَى مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّأَبْقَى (طٰہٰ:۱۳۲) یعنی تم اپنی گردن لمبی کر کر کے یہ نہ دیکھا کرو کہ فلاں کو جو کچھ ملا ہے وہ مجھے کیوں نہیں ملا۔تمہیں کیا پتہ کہ اس چیز کا ملنا تمہارے لئے فائدہ بخش تھا یا نہیں۔اگر وہی کچھ تمہیں مل جاتا تو ممکن تھا تم تکلیف میں پڑ جاتے۔بیشک اگر کسی کے پاس دس ارب روپیہ بھی موجود ہو تو وہ یہ دعا کر سکتا ہے کہ خدایا میں تیرے مزید فضلوں کا محتاج ہوں لیکن اگر کسی کے پاس صرف دس روپے ہوں اور وہ ہر وقت کُڑھتا رہے اور ایک بے چینی اور اضطراب اس میں پایا جائے اور وہ کہے کہ فلاں کے پاس تو سو روپیہ ہے اور میرے پاس صرف دس روپے ہیں اور وہ خدا تعالیٰ کا شکوہ کرتا پھرے تو یہ درست نہیں ہوگا۔پس بے شک اللہ تعالیٰ کے فضلوں اور اس کے انعاموں کو طلب کرو۔مگر ہمیشہ یہ عادت ڈالو کہ خدا تعالیٰ نے تمہیں جس مقام پر رکھا ہے اس مقام کے متعلق تمہارے دل میں کبھی خفگی پیدا نہ ہو۔اور تم یہ نہ سمجھو کہ خدا تعالیٰ نے تمہیں گرایا ہوا ہے اور تمہارا غیر تم سے اچھا ہے۔

مثنوی رومی والوں نے ایک حکایت لکھی ہے۔وہ لکھتے ہیں ایک سپیرا تھا جس نے ایک ایسا سانپ پکڑا جو کسی اور سپیرے کے پاس نہیں تھا۔وہ سانپ اس نے نہایت سنبھال کر رکھا ہوا تھا اس کے دوست آشنا آتے تو وہ بڑے شوق سے وہ سانپ ان کو دکھاتا۔ایک دن جو وہ صبح کو اٹھا تو اس نے دیکھا کہ گھڑے میں سے سانپ نکل گیا ہے۔اتفاقاً اس کا ڈھکنا کھلا رہ گیا اور سانپ نکل گیا۔اب اسے بڑی گھبراہٹ ہوئی اور اس نے خدا تعالیٰ کے حضور رونا اور چلانا شروع کر دیا۔کہ خدایا میرا سانپ مجھے مل جائے۔خدایا میرا سانپ مجھے مل جائے۔گھنٹہ دو گھنٹہ دعا کرنے کے بعد وہ گھڑے کا منہ کھول کر دیکھتا کہ سانپ اس میں واپس آ گیا ہے یا نہیں۔مگر سانپ کہاں آتا۔وہ پھر دعا میں مشغول ہو جاتا اسی طرح وہ سارا دن اور ساری رات دعا کرتا رہا۔جب صبح ہوئی تو ایک شخص آیا اور اس نے اسے آ کر کہا کہ فلاں گھر میں چلئے وہاں ایک نئی قسم کے سانپ نے ایک شخص کو کاٹا ہے اور وہ مر گیا ہے۔سب سپیرے وہاں جمع ہیں سانپ پکڑا ہوا ہے اور آپ کو بھی بلایا گیا ہے تا کہ آپ اس سانپ کو دیکھ لیں۔جب وہ گیا اور اس نے سانپ دیکھا تو وہ وہی تھا جو اس کے گھر سے بھاگا تھا اور جس کے لئے چوبیس گھنٹے سے دعائیں کر رہا تھا۔معلوم ہوتا ہے اس کے اندر کوئی نیکی تھی جو اللہ تعالیٰ کو پسند آ گئی۔سانپ اس کے گھر سے بھاگا اور دوسرے گھر میں چلا گیا۔دوسرا شخص یہ

سمجھ کر کہ یہ نئی قسم کا سانپ ہے اسے پکڑنے لگا تو سانپ نے اسے ڈسا اور وہ مر گیا جب اس نے یہ نظارہ دیکھا تو وہ پھر اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ میں گر گیا اور کہنے لگا خدایا میں تو سمجھتا تھا کہ تو نے میری دعا نہیں سنی۔مگر درحقیقت تو نے میری دعا سن لی تھی اور اس کا نہ ملنا ہی میرے لئے مفید اور بابرکت تھا (مثنوی مولانا روم دفتر دوم صفحہ ۳۱، مارگیر)۔تو ہزاروں دفعہ انسان ایسی خواہشیں کرتا ہے جو مضر ہوتی ہیں۔اولادیں ہی بعض دفعہ ایسی گندی نکلتی ہیں کہ وہ انسان کے لئے بدنامی کا باعث بن جاتی ہیں اور ان کو دیکھ دیکھ کر روتا ہے۔آخر اتنا تو سوچو کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کی جب شادی ہوئی ہوگی تو وہ بھی دعا کرتے ہوں گے کہ اللہ میاں ہمیں اپنے فضل سے بیٹا دے۔مگر ظاہر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ بھی ایک غریب گھرانے کی تھیں اور آپؐ کے والد بھی کوئی مالدار آدمی نہیں تھے۔ ان کی شادی بہت معمولی سرمایہ سے ہوئی ہوگی۔اور صرف چند آدمی ہوں گے جو اس شادی میں شریک ہوئے ہوں گے لیکن اس کے مقابلہ میں ابوجہل کے باپ کی جب شادی ہوئی ہوگی تو کس دھوم دھڑکے سے ہوئی ہوگی اور کس طرح سات سات آٹھ آٹھ دن تک اونٹ ذبح کر کر کے مکہ والوں کی ضیافتیں کی گئی ہوں گی۔لیکن اس دھوم دھڑکے کی شادی سے ابوجہل پیدا ہوا اور اس چپ چپاتے کی شادی سے محمد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔بظاہر ابوجہل کے باپ کی شادی پر دنیا کہتی ہوگی کہ کیا برکت والا گھر ہے۔اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے باپ کی شادی پر دنیا کو رحم آتا ہوگا اور لوگ کہتے ہوں گے کہ کیسا غریب گھرانہ ہے۔مگر اس وقت کسی کے واہمہ اور گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ جسے ''یہ برکت والا گھر'' سمجھا جاتا ہے وہ عرب کو تباہ کر کے رکھ دے گا اور جس کو قابل رحم سمجھا جاتا ہے ان کی شادی کے نتیجہ میں وہ وجود پیدا ہونے والا ہے جو نہ صرف عرب کو تباہی سے بچانے والا ہوگا بلکہ وہ ساری دنیا کے لئے رحمت اور برکت کا موجب ہوگا۔

غرض کوئی انسان نہیں جانتا کہ وہ جو کچھ اپنے لئے مانگ رہا ہے وہ اس کے لئے مفید بھی ہوگا یا نہیں۔اس بات کا علم صرف خدا تعالیٰ کو ہی ہوتا ہے اور جب انسان اس قدر محدود علم رکھنے والا ہے تو وہ خدا تعالیٰ کے کسی سلوک کو یا اس کی کسی عطا کردہ نعمت کو برا کیوں سمجھے۔بیشک وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح یہ بھی کہے الٰہی تیری طرف سے جو بھی خیر نازل ہو اس کا میں محتاج ہوں۔(القصص:۲۵) اگر وہ دس کروڑ دے تو تم کہو الٰہی میں دس ارب کا محتاج ہوں لیکن یہ نہ کہو کہ مجھ پر کتنی سختی ہوئی ہے کتنا ظلم ہوا ہے کتنی تکلیف میں میں مبتلا ہوں۔کیونکہ اس طرح خدا تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری ہوتی ہے جو جائز نہیں۔

تیسری صفت جس کی طرف ان مقطّعات میں توجہ دلائی گئی ہے وہ مجید کی صفت ہے۔مجید کے معنے یہ ہیں کہ

خدا تعالیٰ بڑی بزرگی اور شان رکھنے والا ہے۔قرآن کریم نے ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کی اس صفت کی طرف ان الفاظ میں بھی اشارہ فرمایا ہے کہ کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ (الرحمٰن:۳۰) یعنی تمہارا خدا وہ ہے جو ہر وقت ایک نئی شان میں جلوہ گر ہوتا ہے اور ہمیشہ اپنے ایسے نشانات ظاہر کرتا ہے جن سے اس کی اعلیٰ وارفع شان دنیا پر ظاہر ہوتی ہے حقیقت یہ ہے کہ دیکھی ہوئی چیز کو دوبارہ دیکھنا انسان کو کوئی خاص لطف نہیں دیتا۔انسانی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے جدت کا مادہ رکھا ہوا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ نئے نئے جلوے اس کے سامنے ظاہر ہوں۔جب ریل گاڑی جاری ہوئی تو شروع شروع میں لوگ اسے عجوبہ سمجھتے ہوئے اس پر پھولوں کے ہار ڈالتے تھے لیکن آہستہ آہستہ ان کا جوش ختم ہو گیا۔پھر ہوائی جہاز اور دوسری سواریاں نکلیں۔تو ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔غرض فطرت انسانی کو ہمیشہ نئی چیزوں سے لطف آتا ہے اور وہ نئی نئی چیزوں سے تسلی پاتی ہے۔کیونکہ جب وہ کوئی نئی چیز دیکھتا ہے تو ایک نئی امید اس کے اندر پیدا ہو جاتی ہے۔اور وہ سمجھتا ہے کہ شاید کوئی نیا جلوہ مجھے نظر آنے لگا ہے۔اسی فطرت کے تقاضہ کو پورا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے موسم بدلتے ہیں اور نئے نئے پھل پیدا ہوتے ہیں۔اور انسان بھی کبھی اپنے لباس میں تغیر کرتا ہے کبھی مکان میں اور کبھی نئے نئے کھانے تیار کرتا ہے کیونکہ نئی چیز سے انسانی فطرت تسکین پاتی اور ایک لطیف حظ محسوس کرتی ہے۔اسی فطری تقاضا کے مطابق مجھے قرآن پڑھ کر بھی بڑا مزہ آتا ہے۔لیکن جب کبھی رات کو خدا تعالیٰ میرے کان میں کوئی بات کہتا ہے تو کچھ نہ پوچھو کہ اس کا کیا مزہ ہوتا ہے۔کیونکہ وہ ایک نئی چیز ہوتی ہے جو دل کو لذت اور سرور سے بھر دیتی ہے۔غرض اسلام بتاتا ہے کہ تمہارا خدا مجید ہے اور وہ ہمیشہ اپنی ایسی قدرتیں ظاہر کرتا ہے جن سے اس کی اعلیٰ شان اور مجد کا اظہار ہوتا ہے۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی دیکھ لو کسریٰ نے یہودیوں کی انگیخت پر گورنر یمن کو آرڈر بھجوایا۔کہ عرب میں جو ایک نیا مدعی نبوت پیدا ہوا ہے اسے گرفتار کر کے میرے پاس بھجوا دیا جائے۔گورنر یمن نے آپؐ کی گرفتاری کے لئے اپنے سپاہی بھجوا دیئے اور انہیں کہا کہ میری طرف سے انہیں پیغام دے دیا جائے کہ مجھے تو معلوم نہیں کہ آپ کا کیا قصور ہے لیکن بہتر یہی ہے کہ آپ آجائیں۔ورنہ ممکن ہے کسریٰ کی فوجیں عرب پر دھاوا بول دیں اور سارا ملک ایک مصیبت میں گرفتار ہو جائے۔جب وہ پیغامبر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے آپ کو اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہا تو آپؐ نے فرمایا ٹھہرو میں تمہیں پھر جواب دوں گا۔چنانچہ وہ دو دن ٹھہرے اور پھر حاضر ہوئے۔آپؐ نے فرمایا ایک دن اور ٹھہر جاؤ۔تیسرے دن جب وہ آپ سے ملے تو آپؐ نے فرمایا۔جاؤ اپنے گورنر سے کہہ دو کہ آج رات میرے خدا نے تمہارے خداوند کو مار ڈالا ہے۔وہ سخت حیران ہوئے کہ آپؐ نے یہ کیا بات کہی ہے اور انہوں نے پھر آپ سے ساتھ چلنے کی درخواست کی۔مگر آپ نے

فرمایا میں نے تمہیں جواب دے دیا ہے۔ جاؤ اور اپنے گورنر سے یہ بات کہہ دو۔ چنانچہ انہوں نے واپس جا کر گورنر سے یہی بات کہہ دی۔ گورنر یمن نے یہ بات سنی تو وہ کہنے لگا کہ یا تو یہ شخص پاگل ہے اور یا پھر خدا کا سچا نبی ہے۔ ہم چند دن انتظار کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس کی یہ بات سچی ثابت ہوتی ہے یا نہیں۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد یمن کی بندرگاہ پر ایک جہاز لنگر انداز ہوا۔ اور اس میں سے ایک سفیر اُترا۔ جو گورنر یمن کے نام ایک سربمہر لفافہ لایا۔ گورنر یمن نے لفافہ دیکھا تو اس پر ایک نئے بادشاہ کی مہر تھی۔ اس نے وہ مہر دیکھتے ہی اپنے درباریوں سے کہا کہ عرب کے نبی کی بات سچ معلوم ہوتی ہے۔ پھر اس نے خط کھولا تو وہ کسریٰ کے بیٹے شیرویہ کا تھا اور اس کا مضمون یہ تھا کہ ہمارا باپ سخت ظالم تھا اور اس نے تمام ملک میں تباہی مچا رکھی تھی میں نے اسے فلاں رات قتل کر دیا ہے اور اب میں اس کی جگہ تختِ حکومت پر بیٹھا ہوں۔ تمہارا فرض ہے کہ تم اپنی مملکت کے تمام لوگوں سے میری اطاعت کا اقرار لو اور مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اس نے جو سفاکیاں کی تھیں ان میں سے ایک یہ بھی سفاکی تھی کہ اس نے عرب کے ایک مدعی نبوت کے متعلق لکھا تھا کہ اسے گرفتار کر کے میرے پاس بھجوا دیا جائے۔ ہم اس حکم کو بھی منسوخ کرتے ہیں۔ (طبری ذکر خروج رسل رسول اللہ الی الملوک)۔ اب دیکھو کسریٰ نے چاہا کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گرفتار کر کے آپ کو سزا دے اور اس طرح دنیا میں آپ کو ذلیل کرے مگر مجید خدا نے آپ کی بزرگی اور عظمت کو اور بھی دوبالا کر دیا اور کسریٰ کو اس کے اپنے بیٹے کے ہاتھوں قتل کروا دیا۔

اسی طرح حضرت نظام الدین صاحب اولیاءؒ جو دِلّی کے ایک بہت بڑے بزرگ گذرے ہیں۔ ان کے زمانہ کا بھی ایک بادشاہ غیاث الدین تغلق ان کا مخالف ہو گیا۔ وہ اس وقت بنگال کی طرف کسی جنگ پر جا رہا تھا۔ اس نے کہا کہ جب میں واپس آؤں گا تو انہیں سزا دوں گا۔ ان کے مریدوں نے یہ بات سنی تو بڑے گھبرائے اور انہوں نے شاہ صاحب سے آ کر کہا کہ حضور جو لوگ شاہی دربار میں رسوخ رکھتے ہیں اگر ان کی ذریعہ بادشاہ کے پاس سفارش ہو جائے تو بہتر ہو گا۔ آپ نے فرمایا۔ ہنوز دِلّی دور است۔ ابھی تو اس نے لڑائی کے لئے جانا ہے اور پھر دشمن سے جنگ کرنی ہے ابھی سے کسی فکر کی کیا ضرورت ہے۔ اس وقت تو وہ دلی میں موجود ہے اور لڑائی کے لئے گیا بھی نہیں۔ پھر آٹھ دس دن اَور گذر گئے۔ تو مرید پھر گھبرائے ہوئے آپ کے پاس آئے۔ اور کہا۔ حضور اب تو آٹھ دس دن گذر چکے ہیں اور بادشاہ لڑائی کے لئے جا چکا ہے۔ اب تو کوئی علاج سوچنا چاہیے۔ مگر آپ نے پھر یہی جواب دیا کہ ہنوز دلی دور است۔ آخر جس جنگ پر وہ گیا تھا اس کے متعلق خبر آ گئی کہ اس میں بادشاہ کو فتح حاصل ہو گئی ہے اور وہ واپس آ رہا ہے۔ مرید پھر گھبرائے ہوئے آپ کے پاس پہنچے اور بادشاہ کی واپسی کی خبر دی۔ مگر آپ نے پھر یہی

جواب دیا کہ ہنوز دلی دوراست۔ ابھی تو وہ دو چار سو میل کے فاصلہ پر ہے۔ ابھی کسی فکر کی کیا ضرورت ہے۔ جب وہ آٹھ دس منزل کے فاصلہ پر پہنچ گیا تو وہ پھر آئے اور انہوں نے کہا کہ اب تو وہ بہت قریب آ گیا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ ہنوز دلی دوراست۔ جب وہ اور زیادہ قریب آ گیا اور دو تین منزل تک پہنچ گیا تو پھر آپ کے مرید سخت گھبراہٹ کی حالت میں آپ کے پاس پہنچے مگر آپ نے پھر یہی جواب دیا کہ ہنوز دلی دوراست۔ آخر ایک دن پتہ لگا کہ بادشاہ کی فوجیں فصیل کے باہر ٹھہر گئی ہیں۔ ان کے مرید یہ خبر سن کر پھر آپ کے پاس آئے اور کہا۔ حضور اب تو وہ دلی کی فصیلوں تک آ پہنچا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ ہنوز دلی دوراست۔ ابھی تو وہ فصیل کے باہر ہے۔ اندر تو داخل نہیں ہوا کہ ہمیں گھبراہٹ ہو۔ اسی رات ولی عہد نے فتح کی خوشی میں ایک بہت بڑی دعوت کی اور شاہانہ جشن منایا ہزاروں لوگ اس دعوت اور رقص وسرود کی محفل میں شریک ہوئے۔ ولی عہد نے اس دعوت کا انتظام ایک بہت بڑے محل کی چھت پر کیا تھا۔ چونکہ چھت پر بہت زیادہ لوگ اکٹھے ہو گئے تھے اس لئے اچانک چھت نیچے آ گری۔ اور بادشاہ اور اس کے رفقاء سب دب کر ہلاک ہو گئے۔ صبح جب بادشاہ کی موت کی خبر آئی۔ تو انہوں نے کہا۔ کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ ہنوز دلی دوراست (مشاہیر اسلام شائع کردہ ادارہ صوفی صفحہ ۱۵، ۱۶ و تذکرۃ الاولیاء حصہ دوم مصنفہ رئیس احمد جعفری صفحہ ۳۴۲)۔

غرض ہمارا خدا بڑی بزرگ شان رکھنے والا ہے اور جو بھی اس کے ساتھ سچا تعلق پیدا کرتا ہے وہ اپنی اپنی روحانیت اور درجہ کے مطابق بزرگی حاصل کر لیتا ہے۔ اور جس طرح خدا تعالیٰ کی شان اور عظمت پر حملہ کرنے والا سزا پاتا ہے اسی طرح وہ لوگ جو خدا تعالیٰ کے مقربین پر حملہ کرتے ہیں وہ بھی اپنے کئے کی سزا پائے بغیر نہیں رہتے۔

دنیا میں ہزارہا انبیاء گذرے ہیں جن میں سے اکثر کے نام بھی ہمیں معلوم نہیں۔ ان کے جسم ہزاروں من مٹی کے نیچے مدفون ہیں اور ان کی اپنی قائم کردہ جماعتیں بھی دنیا میں موجود نہیں۔ مگر چونکہ وہ ایک خدائے بزرگ و برتر کی طرف سے کھڑے ہوئے تھے اس لئے خدا نے انہیں ایسی بزرگی عطا فرمائی کہ آج بھی اگر ان کی کوئی ہتک کرتا ہے تو خدا آسمان سے ان کی مدد کے لئے دوڑا چلا آتا ہے اور ان کی عزت اور شہرت پر لگایا جانے والا ہر داغ مٹا کر رکھ دیتا ہے۔

غرض طٰسٓمّٓ میں اللہ تعالیٰ کی تین صفات لطیف، سمیع اور مجید کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس سورۃ میں خدا تعالیٰ کے عالم اسرار ہونے اس کے محسن عظیم ہونے اور اس کے سمیع الدُّعا ہونے اور اس کے صاحب عظمت و جبروت ہونے پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان صفات کو واقعات کے رنگ میں ثابت کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کے ثبوت میں پہلی بات ہی اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ یہ آیات ایک ایسی کتاب کی ہیں جو ہر ایک حقیقت کو خوب کھول کر بیان کرنے والی ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کتاب کو

نازل کرنے والا خدا انسان کی تمام ضروریات کو جانتا اور اس کی فطرت کے مخفی اسرار تک سے آگاہ ہے۔

قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مبین کا لفظ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی استعمال ہوا ہے (الزخرف: ۳۰ و الدخان: ۱۴)۔ نور کے متعلق بھی استعمال ہوا ہے (النساء: ۱۷۵)۔ فضل کے متعلق بھی استعمال ہوا ہے (النمل: ۱۷)۔ حق کے متعلق بھی استعمال ہوا ہے (النور: ۲۶)۔ اسی طرح اور کئی چیزوں کے متعلق بھی استعمال ہوا ہے۔ مگر کسی الہامی صحیفہ کے متعلق سوائے قرآن کریم کے مبین کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کے متعلق صرف ایک دفعہ یہ مضمون بیان ہوا ہے مگر وہاں مستبین کا لفظ استعمال کیا گیا ہے نہ کہ مبین کا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاٰتَیْنٰھُمَا الْکِتٰبَ الْمُسْتَبِیْنَ (الصّٰفّٰت: ۱۱۸) ہم نے موسیٰؑ اور ہارونؑ دونوں کو ایک کامل کتاب دی جس میں تمام احکام بیان کئے گئے تھے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم دونوں مضمونوں میں فرق کرتا ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ اس کی نسبت بارہ دفعہ استعمال ہوا ہے۔ دس دفعہ کتاب کے ساتھ اور دو دفعہ قرآن کے لفظ کے ساتھ۔ پس ایک جگہ مستبین اور دوسری جگہ مبین کا لفظ استعمال کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک جگہ وضاحت اور دوسری جگہ وضاحت اور ایضاح کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ کیونکہ اِستبان کے معنے واضح ہو جانے کے ہیں اور اَبَانَ کے معنے واضح ہونے کے بھی ہیں اور واضح کر دینے کے بھی ہیں۔ پس قرآن کریم کے متعلق مبین کا لفظ استعمال فرما کر اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ قرآن کریم کو دوسری کتب پر یہ ایک زائد فضیلت حاصل ہے۔ کہ وہ نہ صرف خود اپنے مطالب کے لحاظ سے واضح ہے اور ایسی صداقتیں بیان کرتا ہے جو ایک ثابت شدہ حقیقت ہوتی ہیں بلکہ وہ موضح بھی ہے یعنی وہ دوسری الہامی کتب کی صداقتوں کو بھی واضح کرتا ہے۔ اور یہ ایک ایسی فضیلت قرآن کریم کو حاصل ہے جس میں اس کے ساتھ اور کوئی کتاب شریک نہیں باقی جس قدر الہامی کتب ہیں ان کا صرف اس قدر کام تھا کہ وہ اپنے مطالب کو واضح کر دیتیں اور اپنے مدعا کو ظاہر کر دیتیں۔ کیونکہ وہ صرف ایک ایک قوم کی ہدایت کے لئے نازل ہوئی تھیں ان کو اس سے کوئی تعلق نہیں تھا کہ باقی کتب جھوٹی ثابت ہوتی ہیں یا سچی۔ باقی انبیاء جھوٹے ثابت ہوتے ہیں یا سچے۔ باقی قومیں خدا تعالیٰ کے نور کی وارث ثابت ہوتی ہیں یا محروم ثابت ہوتی ہیں۔ وہ صرف اپنے ذکر کو لے لیتی تھیں یا اپنے حلقہ اور دائرہ تک محدود رہتی تھیں لیکن قرآن کریم چونکہ سب اقوام کو ایک نقطہ مرکزی پر جمع کرنے کے لئے آیا ہے وہ نہ صرف بنی نوع انسان سے تعلق رکھنے والے تمام احکام کو پوری تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے اور ان کے ہر گوشہ کو بے نقاب کرتا ہے بلکہ وہ پہلی کتابوں کی حقیقت کو بھی ظاہر کرتا ہے اور پہلے نبیوں پر عائد شدہ الزاموں کو دور کرتا ہے اور پہلی

کتب کی کوتاہیوں کو دلائل کے ذریعہ اعتراضات سے پاک کرتا ہے۔ مثلاً انسانی فطرت کے ارتقاء کی طرف اشارہ کر کے یا لوگوں کی دست اندازی کی طرف اشارہ کر کے یا لوگوں کے استنباط کو غلط بتا کر۔ غرض وہ پہلے نبیوں پہلی کتب اور پہلی اقوام کی خوبیوں کو بھی واضح کرتا ہے اور ان پر عائد ہونے والے اعتراضات کو بھی ردّ کرتا ہے اس طرح وہ گویا مستبین کے مقام سے نکل کر مبین کے مقام تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کی مثال کے طور پر دیکھ لو بنی اسرائیل جب مصر سے نکل کر کنعان کی طرف آئے تو بائیبل بتاتی ہے کہ بنی اسرائیل کے بیس سال سے زائد عمر کے لڑنے کے قابل مردوں کی تعداد بارھویں قبیلہ کو چھوڑ کر جن کی گنتی نہیں کی گئی چھ لاکھ تین ہزار پانچ سو پچاس تھی (گنتی باب ۲ آیت ۳۲ تا ۴۶)۔ اگر بارھویں قبیلہ کا بھی اندازہ کر لیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ فوجی خدمات سرانجام دینے کے قابل مرد ساڑھے چھ لاکھ تھے۔ اگر عورتوں بچوں اور بوڑھوں کی تعداد معلوم کرنے کے لئے ہم اس تعداد کو دس گنا کر لیں کیونکہ عام طور پر چھ سے دس فیصدی تک ملک کی آبادی جنگی خدمت کے قابل سمجھی جاتی ہے تو یہ تعداد ساٹھ لاکھ تک پہنچ جاتی ہے۔ مگر عقل اس امر کو تسلیم نہیں کر سکتی کہ بنی اسرائیل ساٹھ لاکھ ہوں۔ کیونکہ اول تو اتنے آدمی مصر سے اتنے قلیل عرصہ میں نکل ہی نہیں سکتے تھے جتنے قلیل عرصہ میں وہ نکلے دوسرے یردنؔ پار کی بستی جس میں وہ آکر بسے ہیں اس قدر آبادی کی متحمل ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ اب بھی فلسطین کی آبادی پندرہ لاکھ ہے۔ حالانکہ اب یہودیوں نے امریکہ کی مدد سے اسے آباد کیا ہے۔ پس اس ملک میں جو پہلے سے آباد تھا۔ ساٹھ لاکھ آدمیوں کا آکر بس جانا بالکل خلاف عقل بات ہے۔ پس بائیبل بنی اسرائیل کی جو تعداد بتاتی ہے۔ وہ عقلی لحاظ سے کسی صورت میں بھی قابل قبول نہیں سمجھی جا سکتی مگر قرآن کریم نے آکر بتایا کہ یہ بات غلط ہے۔ وہ لوگ صرف چند ہزار تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ۔ (البقرۃ: ۲۴۴) یعنی کیا تجھے ان لوگوں کا حال معلوم نہیں جو اپنے گھروں سے موت کے ڈر سے نکلے جبکہ وہ چند ہزار تھے۔ پس بائیبل نے تو یہ بتایا کہ بنی اسرائیل لاکھوں کی تعداد میں مصر سے نکلے تھے۔ لیکن قرآن کریم نے اس غلطی کی اصلاح کی اور بتایا کہ وہ لاکھوں نہیں بلکہ ہزاروں تھے۔

اسی طرح حضرت سلیمانؑ خدا تعالیٰ کے ایک مقدس نبی تھے مگر بائیبل نے ان پر شرک کا الزام لگا دیا اور کہا کہ

''جب سلیمان بُڈھا ہو گیا تو اس کی بیویوں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کر لیا اور اس کا دل خداوند اپنے خدا کے ساتھ کامل نہ رہا۔'' (۱۔سلاطین باب ۱۱ آیت ۴)

پھر لکھا ہے۔

''خداوند سلیمان سے ناراض ہوا کیونکہ اُس کا دل خداوند اسرائیل کے خدا سے پھر گیا تھا۔''

پھر یہ شرک سلیمانؑ نے ایسی حالت میں کیا جبکہ خدا تعالیٰ نے ''دو بار دکھائی دے کر اُس کو اس بات کا حکم کیا تھا کہ وہ غیر معبودوں کی پیروی نہ کرے۔ پر اُس نے وہ بات نہ مانی جس کا حکم خداوند نے دیا تھا۔''

(ا۔سلاطین باب ۱۱ آیت ۹،۱۰)

گویا سلیمانؑ نعوذ باللہ اتنا خطرناک کافر تھا کہ دو دفعہ خدا اُس پر ظاہر ہوا اور دو دفعہ اُس نے ظاہر ہو کر کہا۔ کہ دیکھنا غیر معبودوں کی پرستش نہ کرنا۔ مگر پھر بھی وہ اپنی بیویوں کے حسن کو دیکھ کر ایسا فریفتہ ہوا کہ اس نے غیر معبودوں کے لئے مندر بنائے اور ان کے آگے سجدہ کرنے لگ گیا مگر قرآن کریم نے آکر بتایا کہ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا (البقرۃ:۱۰۳) سلیمان نے کفر کی کوئی بات نہیں کی بلکہ اس پر الزام لگانے والے اور اسے کافر اور مشرک قرار دینے والے خود کافر اور بے ایمان تھے چنانچہ تاریخی شہادتیں بھی یہی بتاتی ہیں کہ جو قرآن نے بات کہی ہے وہی ٹھیک ہے اور بائیبل کی بات غلط ہے۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا ببلیکا میں لکھا ہے۔

''یہ بات تو صحیح ہے کہ حضرت سلیمانؑ کی بہت سی بیویاں تھیں کچھ اسرائیلی اور کچھ غیر اسرائیلی۔ لیکن نہ تو انہوں نے ان سب کے لئے قربان گاہیں بنائی تھیں اور نہ انہوں نے اپنی بیویوں کے دیوتاؤں کی عبادت کو کبھی خدا تعالیٰ کی عبادت کے ساتھ ملایا تھا۔ آپ خدا تعالیٰ کی وحدانیت کے انکار کا کبھی تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔'' (زیر لفظ Solomon)

گویا تاریخ نے تسلیم کر لیا کہ بے شک حضرت سلیمان علیہ السلام کی کئی بیویاں تھیں کچھ یہودی اور کچھ غیر یہودی مگر یہ غلط ہے کہ انہوں نے بت خانے بنائے اور پھر یہ بھی جھوٹ ہے کہ انہوں نے کبھی کسی بت کو سجدہ کیا ہو۔ اب دیکھو بائیبل تو کہتی ہے کہ انہوں نے بتوں کو سجدے کئے اور قرآن کہتا ہے کہ نہیں کئے اور آج کا یہودی محقق اور آج کا عیسائی محقق بھی کہتا ہے کہ بائیبل جھوٹ کہتی ہے سچی بات وہی ہے جو قرآن کہہ رہا ہے۔

پھر بائیبل میں حضرت ہارون علیہ السلام کے متعلق کہا گیا ہے کہ انہوں نے بنی اسرائیل کو بچھڑا بنا کر دیا اور انہیں شرک کی راہ پر چلایا۔ چنانچہ بائیبل میں لکھا ہے۔

''اور جب لوگوں نے دیکھا کہ موسیٰ نے پہاڑ سے اترنے میں دیر لگائی تو وہ ہارون کے پاس جمع ہو کر اس سے کہنے لگے کہ اٹھ ہمارے لئے دیوتا بنا دے۔ جو ہمارے آگے آگے چلے کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ اس مرد موسیٰ کو جو ہم کو ملک مصر سے نکال کر لایا کیا ہو گیا ہارون نے ان سے کہا۔ تمہاری

بیویوں اور لڑکوں اور لڑکیوں کے کانوں میں جو سونے کی بالیاں ہیں ان کو اتار کر میرے پاس لے آؤ۔
چنانچہ سب لوگ ان کے کانوں سے سونے کی بالیاں اتار اتار کر ان کو ہارون کے پاس لے آئے اور
اس نے ان کو ان کے ہاتھوں سے لے کر ایک ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا جس کی صورت چھینی سے ٹھیک کی۔
تب وہ کہنے لگے اے اسرائیل یہی تیرا وہ دیوتا ہے جو تجھ کو ملک مصر سے نکال کر لایا‘‘

(خروج باب ۳۲ آیت ۱ تا ۴)

مگر قرآن نے آ کر بتایا کہ یہ بالکل غلط بات ہے۔ حضرت ہارونؑ نے اپنی قوم کو شرک سے بڑی سختی کے ساتھ روکا تھا اور کہا تھا کہ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَ اِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَ اَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ (طٰهٰ:۹۱) یعنی اے میری قوم اس بچھڑے کے ذریعہ تمہارا ایمان خراب کر دیا گیا ہے اور تمہارا رب تو رحمان ہے اور یہ ایک ذلیل اور بیجان بچھڑا ہے۔ پس تم میری فرمانبرداری کرو۔ اور میرے پیچھے چلو سامری کے پیچھے نہ چلو جس نے تمہیں اس شرک کی طرف مائل کیا ہے۔ غرض بائیبل نے خدا تعالیٰ کے ایک مقدس نبی ہارونؑ کو داغدار قرار دیا مگر قرآن کریم جو مبین کے مقام پر ہے اس نے آ کر بتایا کہ یہ بالکل جھوٹ ہے خدا تعالیٰ کا فرستادہ ہارونؑ اپنی قوم کو ہمیشہ توحید کا ہی وعظ کرتا رہا۔ یہ قوم کی بدبختی تھی کہ وہ سامری کے پیچھے چل پڑی اور اُس نے ایک بچھڑے کی پرستش شروع کر دی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بھی یہودیوں اور عیسائیوں نے بعض خطرناک قسم کے الزامات لگائے تھے جن کی قرآن کریم نے بڑے زور سے تردید کی اور بتایا کہ وہ تمام الزامات دشمنوں کا افتراء ہیں۔ مثلاً یہود کہتے تھے کہ آپ کی پیدائش نعوذ باللہ بدکاری کے نتیجہ میں ہوئی تھی۔ یعنی یوسفؔ کے نطفہ سے بغیر شادی کے آپ پیدا ہوئے (انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا جلد ۵ صفحہ ۱۰۲ زیر لفظ Celsus) اسی طرح بعض یہودی یہ الزام لگاتے تھے کہ آپ نعوذ باللہ ایک رومی سپاہی سپنیتھراؔ کے بیٹے تھے جن کا حضرت مریم صدیقہ سے ناجائز تعلق تھا (جیوش انسائیکلوپیڈیا زیر لفظ Jesus) مگر قرآن کریم نے حضرت مریمؑ کو اس الزام سے پاک ٹھہرایا اور یہ اعلان فرما دیا کہ وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (الانبیاء:۹۲) یعنی مریم صدیقہؑ نے جو حضرت مسیحؑ کی والدہ مطہرہ تھیں اپنے تمام سوراخوں کو گناہ سے محفوظ رکھا تھا۔ اور اُن کو جو حمل ہوا وہ ناجائز نہیں تھا بلکہ ایک پاک روح تھی جو اُن کے اندر ہم نے داخل کی اور ہم نے اُس کو اور اُس کے بیٹے عیسیٰؑ کو تمام دُنیا کے لئے ایک نشان بنا دیا۔

اِسی طرح عیسائی آپ پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ آپ نعوذ باللہ صلیب پر لٹک کر لعنتی موت مرے ۔ چنانچہ عہد نامہ جدید میں پولوس کہتا ہے :۔

’’مسیح جو ہمارے لئے لعنتی بنا اُس نے ہمیں مول لے کر شریعت کی لعنت سے چھڑایا کیونکہ لکھا ہے جو کوئی لکڑی پر لٹکایا گیا وہ لعنتی ہے ۔‘‘ (گلتیوں باب ۳ آیت ۱۳)

گویا عیسائیوں نے خدا تعالیٰ کے ایک مقرب کو اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے ملعون قرار دے دیا ۔ مگر قرآن کریم نے اس الزام کو بھی ردّ کیا اور خود حضرت مسیحؑ کی زبان سے ان الفاظ میں تردید کی کہ وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا (مریم : ۳۴) یعنی جو لوگ مجھ پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ میری پیدائش حرامکاری کے نتیجہ میں تھی وہ غلط کہتے ہیں ۔ کیونکہ میری پیدائش پر خدا تعالیٰ کی طرف سے سلامتی نازل ہوئی تھی اور جو لوگ یہ کہیں گے کہ میں لعنتی موت مرا وہ بھی غلط کہیں گے ۔ کیونکہ میری موت بھی خدا تعالیٰ کی حفاظت میں ہوگی اور لعنت کی موت سے میں بچایا جاؤں گا ۔ اور جو لوگ یہ کہیں گے کہ میں دوسروں کے گناہ اُٹھا کر تین دن جہنم میں پڑا رہا ۔ وہ بھی غلط کہیں گے کیونکہ میری دوبارہ حیات بھی خدا تعالیٰ کی سلامتی سے شروع ہوگی ۔

غرض قرآن کریم ان تمام اعتراضات کو ردّ کرتا ہے جو بائیبل میں لوگوں کی دست اندازی کی وجہ سے شامل ہو چکے تھے ۔ اور اپنے فرستادوں کو ایک بے عیب شکل میں دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے ۔ اسی قسم کے الزامات ہندوؤں نے بھی اپنے بعض رشیوں اور اوتاروں پر لگائے ہیں ۔ مثلاً حضرت کرشن کے متعلق لکھا ہے کہ ان کی والدہ نے انہیں کہا کہ

’’بیٹا ! نو لاکھ گائیں میرے یہاں دودھ دینے والی ہیں جتنا دودھ ماکھن چاہیے کھایا اور لٹایا کرو ۔ دوسروں کے گھر ماکھن کھانے اور چُرانے مت جایا کرو ۔‘‘

(مہارشی ویدبیاس شریمد بھاگوت پُران اسکندھ نمبر ۱۰ نمبر ۱۰/۸)

گویا حضرت کرشن نعوذ باللہ مکھن چُرا چُرا کر کھایا کرتے تھے حالانکہ ان کے اپنے گھر میں نو لاکھ گائے تھی ۔

اسی طرح لکھا ہے کہ وہ غیر عورتوں کے ساتھ عیش و عشرت میں مشغول رہا کرتے تھے اور ایک عورت کا خاص طور پر نام لے کر لکھا ہے کہ حضرت کرشن نے رات کے وقت اسے جگا کر کہا کہ

’’اے سندری ! نیند کو چھوڑ کر مجھ کو شرنگار دان (یعنی دادِ عیش) دے ۔‘‘

(برہم دی ورت پران کرشن جنم کھنڈ نمبر ۴ ادھیائے نمبر ۲۷)

مگر قرآن کریم نے حضرت کرشن اور اسی طرح اَور کئی انبیاء کا جن کے نام تک صفحۂ تاریخ میں محفوظ نہیں اجمالی طور پر ذکر کر کے فرمادیا کہ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ (الانعام:۹۱) یعنی یہ سارے کے سارے وہ لوگ تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی۔ یعنی یہ سب کے سب منعم علیہ گروہ میں شامل تھے اور خدا تعالیٰ کے فضلوں اور اس کی تائیدات کے مورد تھے۔ پس اب تمہارا کام یہی ہے کہ تم انہی لوگوں کے راستہ پر چلو اور انہی کی تقلید کرو۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم تمام انبیاء کو معصوم قرار دیتا اور ہر الزام کو رد کرتا ہے جو ان پر لگایا گیا۔ خواہ وہ الزام منافقوں کی طرف سے لگایا گیا ہو یا مخالفوں کی طرف سے۔ وہ ان کے حسین چہرہ پر سے ہر قسم کی گرد و غبار کو دور کرتا اور ان کی نورانیت کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرتا ہے اور یہ قرآن کریم کا اتنا بڑا احسان ہے کہ جس کی نظیر دنیا کی اَور کوئی کتاب پیش نہیں کر سکتی۔

پھر قرآن کریم نے اپنے مبین ہونے کے مقام کو اس طرح بھی ظاہر کیا کہ اس نے دنیا کے ہر نبی کی عزت کو قائم کیا اور ان کی صداقت پر ایمان لانا ضروری قرار دیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دنیا کے جس ملک کے حالات سے بھی واقفیت حاصل کی جائے اس کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے لوگ کسی نہ کسی بزرگ کے ماننے والے ہیں۔ مگر وہ ساری بزرگی صرف اپنے اپنے بزرگوں تک محدود سمجھتے ہیں۔ ہندوستان کے لوگ اگر حضرت کرشن اور حضرت رامچندر جی کو خدا تعالیٰ کا اوتار مانتے ہیں تو ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کے سوا اَور کسی ملک میں کوئی اوتار نہیں ہوا۔ اسی طرح عیسائی اور یہودی وغیرہ بھی یہی کہتے ہیں کہ صرف ہمارے بزرگ سچے تھے باقی سب جھوٹے ہیں۔ لیکن قرآن کریم نے بتایا کہ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطر: ۲۵) دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جس میں خدا تعالیٰ کا کوئی مصلح اور ہادی مبعوث نہ ہوا ہو۔ چنانچہ جب ہم مختلف اقوام پر نظر دوڑاتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب کی سب اس بات کی قائل ہیں کہ ان میں اللہ تعالیٰ کا کوئی نہ کوئی مصلح آیا تھا۔ ہم ہندوؤں پر نگاہ دوڑاتے ہیں تو ہمیں ان میں حضرت کرشن اور حضرت رامچندر جی کا وجود دکھائی دیتا ہے۔ ہم عیسائیوں پر نگاہ دوڑاتے ہیں تو ہمیں ان میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وجود نظر آتا ہے۔ ہم یہودیوں پر نگاہ دوڑاتے ہیں تو ہمیں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دوسرے کئی انبیاء نظر آتے ہیں۔ غرض دنیا کا کوئی خطہ ایسا نہیں جس میں کوئی نبی نہ آیا ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ جیسے عرب کا خدا ہے ویسے ہی وہ ہندوستان اور چین اور شام اور مصر اور ایران وغیرہ کا بھی خدا ہے۔ اس نے ساری دنیا کے لئے سورج اور چاند اور ستارے سب ایک جیسے بنائے ہیں۔ ایک ہی زمین سب کے لئے بنائی ہے۔ پھر جب اس نے سب لوگوں کی جسمانی ضرورتوں کو پورا کیا ہے تو روحانی ضرورتوں کو وہ کس طرح نظر انداز کر سکتا تھا جبکہ روح کی

حفاظت جسم سے بھی زیادہ ضروری ہے کیونکہ جسم فانی ہے اور روح غیر فانی۔ چنانچہ ایک مسلمان جب اس آیت کو پڑھتا ہے تو اس کے دل میں تصدیق کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ وہ ہندوؤں کے پاس جاتا ہے اور ڈرتے ڈرتے ان سے پوچھتا ہے کہ آپ کی قوم میں بھی کوئی نبی آیا تھا۔ وہ کہتے ہیں ہاں حضرت کرشن اور حضرت رامچندر جی اللہ تعالیٰ کا کلام لے کر آئے تھے وہ اپنے وقت کے اوتار تھے۔ یہ سن کر اس کا چہرہ بشاشت سے کھل جاتا ہے اور وہ کہتا ہے الحمدللہ! یہ بات سچی ثابت ہوگئی کہ ہر قوم میں نبی آئے ہیں۔ پھر وہ چین میں جاتا ہے۔ اور وہاں کے لوگوں سے پوچھتا ہے کہ آپ کی قوم میں بھی کوئی نبی آیا ہے تو وہ کنفیوشس کا نام لیتے ہیں۔ اس پر اس کا دل اَور بھی زیادہ مسرور ہو جاتا ہے کہ الحمدللہ! چین میں بھی اللہ تعالیٰ کا نبی آیا ہے۔ پھر وہ ایران میں جاتا ہے اور وہاں کے لوگوں سے پوچھتا ہے کہ آپ کے پاس بھی کوئی نبی آیا ہے تو وہ حضرت زرتشت کا نام لیتے ہیں۔ یہ سن کر وہ خوشی سے اپنے جامہ میں پھولا نہیں سماتا۔ اور کہتا ہے کہ اب تو یہ بات اور بھی پختہ ہوگئی۔ پھر وہ یونان میں جاتا ہے اور وہاں کے لوگوں سے دریافت کرتا ہے کہ تمہارے پاس بھی کوئی اللہ کا پیغام لے کر آیا ہے۔ تو وہ کہتے ہیں۔ ہاں ہمارے ملک میں سقراط اس بات کا دعویدار تھا کہ اللہ تعالیٰ اس سے ہمکلام ہوتا ہے۔ اس پر وہ اور زیادہ مسرور ہوتا ہے اور کہتا ہے الحمدللہ میرا قرآن یہاں بھی سچا ثابت ہوا۔ غرض وہ جس ملک میں بھی جاتا ہے اس کی گردن فخر سے اونچی ہو جاتی ہے۔ اور اس کا دل اس لذت اور سرور سے بھر جاتا ہے کہ میری کتاب میں جو کچھ کہا گیا تھا وہ حرف بحرف درست ثابت ہوا۔ لیکن ایک عیسائی ایک ہندو اور ایک یہودی جس ملک میں بھی جاتا ہے۔ اس کا منہ غم سے کالا ہو جاتا ہے۔ وہ مڈل ایسٹ میں جاتا ہے اور سنتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بڑے نبی ہیں تو اس کا دل جل جاتا ہے۔ برما میں جاتا ہے اور سنتا ہے کہ بدھا نبی ہے تو وہ رونے لگ جاتا ہے۔ ہندوستان میں سنتا ہے کہ کرشن نبی ہے تو اس پر جنون سوار ہو جاتا ہے۔ یونان میں جاتا ہے اور اسے پتہ لگتا ہے کہ اس ملک میں سقراط گذرا ہے تو وہ چیخیں مارنے لگ جاتا ہے۔ غرض وہ جس ملک میں بھی جاتا ہے اس پر مصیبت آجاتی ہے۔ مگر ایک مسلمان جس ملک میں بھی جاتا ہے اسے خوشی پر خوشی نصیب ہوتی ہے اور ہر ملک میں یہ تعلیم اس کی سربلندی اور سُرخروئی کا موجب ہوتی ہے۔ غرض یہ ایک چھوٹی سی آیت ہے۔ لیکن اس چھوٹی سی آیت کو ہی لے کر ساری دنیا میں پھر جاؤ۔ کسی بزرگ کی بڑائی سن کر تمہارے دل میں انقباض پیدا نہیں ہوگا اور تمہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ قرآن کریم نے یہ تعلیم پیش کر کے باقی تمام الہامی کتب پر اپنی فضیلت کو ثابت کر دیا ہے۔ پھر خود انسانی وجود جو اللہ تعالیٰ کی وحی کا مہبط اور اس کے انوار و برکات کا مورد تھا اس کے متعلق بھی بعض مذاہب نے یہ غلط نظریہ پیش کیا کہ وہ طبعاً میلان گناہ رکھتا ہے۔ اور اس کی وجہ

اللہ تعالیٰ کی وہ نافرمانی ہے جو آدم اور حوّا نے کی اور جس کی بنا پر وہ فطرتی طور پر گناہگار پیدا ہوا۔ اسی طرح بعض دوسرے مذاہب نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ انسان اپنی تمام کوششوں کے باوجود کبھی پاک نہیں ہوسکتا۔ اور اس کی روح کو بار بار مختلف قسم کی جُونوں کے چکر میں ڈالا جاتا ہے۔ اول الذکر نظریہ ہمیں عیسائیت کی طرف سے (رومیوں باب ۵ آیت ۱۲) اور ثانی الذکر ہندومذہب کی طرف سے پیش کیا گیا (انوار حقیقت مترجم ستیارتھ پرکاش باب ۹ صفحہ ۲۴۷۔۲۴۸)۔ اور دونوں نے انسانی فطرت کو گندہ اور ناپاک قرار دیا۔ اور اس کا اتنا پروپیگنڈا کیا گیا کہ وہ انسان جو اس لئے پیدا کیا گیا تھا کہ اسے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو اور اپنے اندر اعلیٰ اخلاق اور روحانیت پیدا کر کے اللہ تعالیٰ کے کلام اور اس کے الہام کا مورد ہو اس کا دل مایوسی کا شکار ہو گیا اور اس نے سمجھا کہ جب میرے لئے ترقی کے تمام راستے بند ہیں اور جب مجھے فطری طور پر گندہ اور ناپاک ٹھہرایا گیا ہے تو پاکیزگی اور تقدس کا تصور میرے لئے ناممکن ہے۔ کیونکہ انسان کی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ جو بات متواتر اس کے کان میں ڈالی جائے آہستہ آہستہ وہ اس پر اثر کرنا شروع کر دیتی ہے۔ اگر کسی کو متواتر کہا جائے کہ تم بہت ہی بیوقوف اور جاہل ہو تو وہ رفتہ رفتہ اپنی عقل کو کھو بیٹھتا ہے۔ اگر کسی کو کہا جائے کہ وہ چور کا بیٹا ہے تو آہستہ آہستہ یہ خیال اس کے دل پر ایسا راسخ ہو جائے گا کہ جب کبھی اس کے دل میں لالچ پیدا ہوگا اور کسی کا مال ہتھیانے کا ارادہ کرے گا تو وہ اپنے ارادہ کو روک نہیں سکے گا بلکہ کہے گا کہ دنیا تو پہلے ہی مجھے چور کا بیٹا کہہ رہی ہے اور یہی جذبات نسلاً میرے اندر پائے جاتے ہیں۔ اب میں ان کاموں سے کس طرح رک سکتا ہوں۔ اسی وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کے امور کو سختی سے ناپسند فرمایا اور انہیں قومی ہلاکت اور بربادی کا اصل باعث قرار دیا ہے۔ کیونکہ انسانی ذہنیت اس قسم کی ہے کہ جب اس پر کوئی اثر ڈالا جائے اور اس کے خیالات کسی خاص طرف مائل کئے جائیں تو آہستہ آہستہ وہ ان اثرات کو قبول کر لیتا ہے۔ سائیکالوجی یا علم النفس کی ابتداء درحقیقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم کے ذریعہ ہی ہوئی ہے۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اِذَاقَالَ الرَّجُلُ هَلَكَ النَّاسُ فَهُوَ اَهْلَكَهُمْ (مسلم کتاب البر و الصلة و الآداب باب النهی عن قول هَلَكَ النَّاسُ) یعنی جب کوئی شخص یہ کہتا پھرتا ہے کہ قوم برباد ہوگئی قوم برباد ہوگئی تو درحقیقت اس کی بربادی کا موجب وہی بنتا ہے۔ کیونکہ جب متواتر کسی قوم کے کان میں یہ ڈالا جائے گا کہ وہ ہلاک ہو چکی ہے تو لوگوں میں قوت مقاومت باقی نہیں رہے گی۔ اور اس کا تنزل شروع ہو جائے گا۔ عیسائیت نے دنیا کو یہ تعلیم دی کہ آدمؑ نے گناہ کیا جو ورثہ میں اس کی اولاد کو بھی ملا۔ اب دنیا اگر گناہ سے بچنا بھی چاہے تو نہیں بچ سکتی۔ اس عقیدے کے ہوتے ہوئے ایک عیسائی کے لئے یہ کتنا مشکل ہے کہ وہ گناہ کا خیال

آنے پر اس کا مقابلہ کرے وہ تو کہے گا کہ میں گناہ کا کیا مقابلہ کروں۔ میں تو اس سے بچ ہی نہیں سکتا اور جب وہ گناہ کا مقابلہ کرنے سے گریز کرے گا تو لازماً گناہ میں مبتلا ہو جائے گا۔ مگر قرآن کریم نے بتایا کہ انسان کو فطرت صحیحہ عطا کی گئی ہے۔ اور خواہ وہ کیسی ہی حالت میں ہو اگر وہ کوشش کرے تو وہ ترقی کر کے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرسکتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذاریات: ۵۷) یعنی میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں نے آدمؑ کو اس لئے پیدا کیا تھا کہ وہ میری عبادت کرے بلکہ فرماتا ہے مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ چاہے فرمانبرداری کی طبیعت رکھنے والے انسان ہوں چاہے ناری فطرت رکھنے والے وجود ہوں دونوں کو میں نے عبادت اور اپنے قرب کے لئے پیدا کیا ہے۔ انس ان لوگوں کو کہتے ہیں جو اپنے اندر فرمانبرداری اور اطاعت کا مادہ رکھتے ہیں۔ اور جنّ ان لوگوں کو کہتے ہیں جن پر پردہ پڑا ہوا ہوتا ہے۔ یعنی جن کی فطرت صحیحہ پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ سے دور ہو جاتے ہیں۔ قرآن کریم سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جنّی طبیعت والے نار سے پیدا کئے گئے ہیں۔ گویا ناری طبیعت والا انسان جو گناہ کی طرف مائل ہوتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اسے بھی میں نے عبادت کے لئے پیدا کیا ہے کیونکہ اس کی ناری طبیعت طبیعتِ ثانیہ ہوتی ہے طبیعت اولیٰ نہیں ہوتی۔ درحقیقت طبیعتیں دو قسم کی ہوتی ہیں ایک طبیعت اولیٰ جو فطرت میں رکھ دی گئی ہے اور ایک طبیعتِ ثانیہ جو ماحول کے اثرات کے ماتحت پیدا ہوتی ہے اور طبیعت اولیٰ پر غالب آ جاتی ہے۔ اسی لئے اس قسم کی طبیعت رکھنے والے کو جنّ کہتے ہیں۔ جس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اس کی اصل فطرت پر پردہ پڑا ہوا ہے اور جب ہم اسے جنّ کہتے ہیں تو ہمارے مدّنظر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اس کی فطرت اولیٰ نظر نہیں آتی۔ اور چونکہ اس کی فطرت اولیٰ نظر نہیں آتی اس لئے وہ جنّ کہلاتا ہے۔ پس فرماتا ہے۔ وہ لوگ جو خدا تعالیٰ سے محجوب ہوتے ہیں اور جنّات میں شامل ہوتے ہیں اور وہ لوگ جو اپنی طبیعت میں نیکی رکھتے ہیں دونوں کو ہم نے اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔ جب لوگ ایک لمبے عرصہ تک نیکی کو قائم رکھتے اور اللہ تعالیٰ کے منشاء کے ماتحت اپنی زندگیاں بسر کرتے ہیں تو وہ انس کہلاتے ہیں اور جب وہ نبی کی تعلیم سے غافل ہو جاتے ہیں تو وہ جنّ ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کی فطرت صحیحہ ایسی مخفی ہو جاتی ہے کہ وہ بھول جاتے ہیں اس بات کو کہ ہماری جماعت کا قیام کیوں ہوا تھا۔ اور ہمارے نظام کی غرض کیا تھی یا نبی نے ہمیں کیا تعلیم دی تھی۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ خواہ وہ جنّات ہوں یا انسان یعنی خواہ ایسے لوگ ہوں جن کے دلوں میں محبت الٰہی کی چنگاری سُلگ رہی ہو اور خواہ ایسے لوگ ہوں جن کی فطرت صحیحہ پر پردہ پڑا ہوا ہو فطرت ثانیہ غالب آ چکی ہو اور سمجھا جاتا ہو کہ ان کی طبیعت ثانیہ ہی

اصل فطرت ہے دونوں کو ہم نے عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔ بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص کو ہم کیا سمجھائیں اس میں تو نیکی کا مادہ ہے ہی نہیں۔ بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص بڑا متعصب ہے وہ ہدایت پا ہی نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ تم ایسا مت کہو۔ اس کی طبیعت اولیٰ نیکی کی طرف مائل ہے۔ یہ تمہاری غلطی ہے کہ تم اس کی طبیعت ثانیہ کو دیکھتے ہو اور ایک نتیجہ اخذ کر لیتے ہو۔ ہم نے تو سب کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔ اگر کسی کی فطرت صحیحہ پر پردہ پڑا ہوا ہے تو یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی شخص نیل کے مٹکے میں پڑے تو وہ نیلا ہو جاتا ہے مگر اس کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ وہ آدمی نہیں رہا۔ یا بعض لوگ ریچھ کی کھال پہن لیتے ہیں اور دیکھنے والے ڈرنے اور بھاگنے لگ جاتے ہیں۔ حالانکہ وہ انسان ہوتے ہیں۔ اسی طرح بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی فطرتیں ماحول کی خرابی کی وجہ سے مسخ ہو جاتی ہیں اور ان کی ظاہری شکل جنّات والی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ وہ لوگ بھی جو غیر مرئی جنات کے قائل ہیں اور ہم پر یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ یہ لوگ جنّوں کے قائل نہیں وہ بھی بعض دفعہ ایسے انسانوں کو جن کی فطرت پر پردہ پڑ چکا ہوتا ہے جنّ کہنے لگ جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ شخص جس کے اخلاق بگڑے ہوئے ہوں اسے دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں یہ بھیڑیا ہے جس سے ان کا یہ مطلب نہیں ہوتا۔ کہ وہ حقیقی معنوں میں بھیڑیا ہے بلکہ یہ مطلب ہوتا ہے کہ اس پر بھیڑیے والی خصلت غالب آگئی ہے۔ اسی طرح کسی کے متعلق کہتے ہیں یہ تو سانپ ہے۔ یعنی سانپ کی طرح لوگوں کو ڈستا پھرتا ہے۔ یا بچھو ہے یعنی بچھو کی طرح لوگوں کو ڈنگ مارتا ہے۔ تو بعض دفعہ فطرت ثانیہ فطرت اولیٰ پر غالب آجاتی ہے کہ یہ پہچاننا بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ اس شخص کی انسانیت کہاں ہے۔ لیکن جب اس کی فطرت صحیحہ بول اٹھتی ہے تب پتہ لگتا ہے کہ اس کے اندر نیکی پائی جاتی ہے۔ دیکھو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کتنے کتنے شدید دشمن تھے۔ مگر پھر ان میں کیسی تبدیلی پیدا ہوئی۔ نہ صرف ان کی اصلاح ہوئی بلکہ وہ روحانیت کے ایسے اعلیٰ مقام پر پہنچ گئے کہ ان کا پہچاننا بھی مشکل ہو گیا۔ حضرت عمرؓ جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف لٹھ لئے پھرتے تھے جب انہیں اسلام لانا نصیب ہوا تو ان میں ایسی تبدیلی پیدا ہوئی کہ دنیا کے فائدہ کے لئے اپنی جان جوکھوں میں ڈالنے لگے۔ اور دن رات اسلام کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔ یہی حال عکرمہؓ کا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ فتح کیا۔ تو عکرمہؓ اس بغض کی وجہ سے جو اسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے تھا مکہ چھوڑ کر چلا گیا اور اس نے کہا۔ میں اس ملک میں بھی نہیں رہ سکتا جس میں ایسا شخص موجود ہو۔ اس کے مظالم کی وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ اسے معافی نہیں دی جا سکتی وہ جہاں مل جائے اسے قتل کر دیا جائے۔ آخر اس کی بیوی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی۔

اور اس نے کہا۔ یارسول اللہ! آپؐ بڑے رحیم و کریم ہیں۔ آپ نے کتنے ہی لوگوں کو معاف کر دیا ہے اگر عکرمہؓ کو بھی آپ معاف فرما دیں تو اس میں آپ کا کیا حرج ہے۔ پھر اس نے کہا۔ یارسول اللہ! کیا یہ بہتر ہے کہ عکرمہؓ کسی غیر ملک میں ذلیل ہو کر رہے یا یہ بہتر ہے کہ وہ آپ کے ملک میں آپ کی رعایا بن کر رہے اور آپ کا عفو اس کے سر کو نیچا رکھے۔ آپ کو اس کی یہ بات پسند آئی۔ اور آپؐ نے فرمایا۔ ہم نے عکرمہؓ کو معاف کر دیا۔ یہ سن کر اس کی بیوی اسی وقت اٹھی اور اپنے خاوند کی تلاش میں چل پڑی۔ وہ اس وقت حبشہ جانے کے لئے کشتی میں بیٹھ چکا تھا۔ اس کی بیوی اس کے پاس گئی اور اس نے کہا۔ تم کہاں جا رہے ہو۔ واپس میرے ساتھ چلو۔ میں نے تمہارے متعلق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سفارش کی تھی اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں معاف فرما دیا ہے۔ عکرمہؓ یہ سن کر حیران ہوا۔ اور اس نے کہا۔ مجھے کس طرح معافی مل سکتی ہے میں نے تو بڑے بڑے سخت مظالم کئے ہوئے ہیں۔ اس نے کہا۔ تمہیں ان کے وسعت حوصلہ کا کیا علم؟ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ میں تمہارے لئے معافی کی منظوری لے چکی ہوں۔ تم واپس میرے ساتھ چلو۔ عکرمہؓ کشتی سے اترے اور واپس آ گئے۔ واپسی پر وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میری بیوی میرے پاس آئی تھی اور اس نے کہا تھا کہ میں نے تمہارے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے معافی لے لی ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہاں! بالکل سچ ہے۔ ہم نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم نے تمہیں سچے دل سے معاف کر دیا ہے تو اس نے عرض کیا کہ کیا میں کافر ہونے کی حالت میں مکہ میں رہ سکتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا۔ ہاں تم رہ سکتے ہو۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے اور اس کے باپ ابوجہل کے متواتر اور شدید ترین مظالم کے باوجود اسے معاف فرما دیا اور معافی بھی اس رنگ میں دی کہ خواہ وہ اسلام نہ لائے اسے مکہ میں آزادانہ رنگ میں رہنے کی اجازت ہوگی تو اس کی طبیعت پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ اس نے کہا۔ یارسول اللہ! میں آپ پر ایمان لاتا ہوں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کی معافی سوائے خدا کے راستباز انسان کے اَور کوئی نہیں دے سکتا (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام ذکر الاسباب الموجبۃ المسیر الی المکۃ... و اسد الغابۃ عکرمۃ بن ابی جھل)۔ پھر یا تو اس کے دل میں اتنا بغض تھا کہ وہ اس ملک میں بھی رہنا نہیں چاہتا تھا جس میں رسول کریم صلی اللہ تھے اور یا پھر اس کے دل میں اتنا تغیر پیدا ہوا کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عکرمہؓ ہم نے تمہیں معاف ہی نہیں کیا بلکہ ہم تمہیں انعام بھی دینا چاہتے ہیں مانگو جو کچھ مانگنا چاہتے ہو۔ تو وہ عکرمہؓ جو اتنا دنیادار تھا اس کے اندر فوراً ہی اتنی تبدیلی پیدا ہوگئی کہ اس نے کہا کہ یارسول اللہ! میں سوائے اس کے اَور کچھ نہیں

مانگتا کہ آپ میرے لئے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ میرے پچھلے تمام گناہ معاف فرمادے (کتاب المغازی للواقدی جلد ۲ صفحہ ۸۵۱ تا ۸۵۵)۔اب کُجا یہ کہ وہ مکہ سے بھاگ جاتا ہے اور کجا یہ کہ مسلمان ہوتا ہے اور یکدم اس میں ایسی تبدیلی پیدا ہوتی ہے کہ وہ سب مخالفانہ خیالات کو بھول جاتا ہے۔ پھر یہی عکرمہؓ تھا کہ یا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جان لینے کے لئے لڑائیاں کیا کرتا تھا اور یا پھر اسلام میں اس کی فدائیت یہاں تک پہنچ گئی کہ غزوۂ یرموک میں جب بہت سے صحابہؓ مارے گئے تو عکرمہؓ اور چند اور نوجوانوں نے مل کر حضرت ابوعبیدہؓ سے جو کمانڈر انچیف تھے کہا کہ ہم سے صحابہؓ کی موت نہیں دیکھی جاسکتی۔اگر یہ لوگ مارے گئے تو اسلام کی اشاعت کون کرے گا۔آپ ہمیں اجازت دیں کہ ہم چند نوجوان اپنی جانوں کو قربان کر کے عیسائی کمانڈر پر حملہ کر کے اسے ماردیں اور لڑائی ختم ہوجائے۔ ابوعبیدہؓ نے کہا کہ یہ تو بڑا مشکل ہے۔دس لاکھ لشکر کے مقابلہ میں میں تمہیں کس طرح بھیج سکتا ہوں۔اس میں تو تمہاری یقینی ہلاکت ہے۔مگر آخر دوسرے لوگوں نے کہا کہ جب یہ لوگ قربانی کرنا چاہتے ہیں تو انہیں قربانی کی اجازت دے دیں۔اور چونکہ اس جنگ میں بہت سے صحابہؓ مارے جاچکے تھے ابوعبیدہؓ نے آخر اجازت دے دی۔ چنانچہ عکرمہؓ اور چند دوسرے نوجوانوں نے ملکر قلبِ لشکر پر حملہ کیا اور وہاں تک پہنچ گئے جہاں ان کا کمانڈر ماہان تھا۔ وہ اس قدر گھبرایا کہ تخت سے اتر کر بھاگ پڑا۔اوراس کے بھاگتے ہی فوج میں بھاگڑ مچ گئی اور لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا۔مگر اس جدوجہد میں وہ قریباً سب کے سب شہید ہوگئے۔ اسی جنگ کا واقعہ ہے کہ عکرمہؓ زخموں کی شدت اور پیاس کی وجہ سے تڑپ رہے تھے کہ ان کے پاس سے ایک سپاہی گذرا جس کے پاس پانی کی ایک چھاگل تھی۔ اس نے جب انہیں تڑپتے دیکھا تو وہ قریب آیا۔اوراس نے پوچھا کیا آپ کو پیاس لگی ہے۔انہوں نے کہا۔ہاں۔ اس نے اپنی چھاگل اس کے منہ کے قریب کی تا کہ آپ پانی پی لیں۔مگر ابھی عکرمہؓ نے چھاگل کو منہ نہیں لگایا تھا کہ ان کی نظر فضل بن عباسؓ پر پڑی جوان کے قریب ہی پیاس سے تڑپ رہے تھے انہوں نے کہا۔فضل مجھ سے زیادہ پیاسا معلوم ہوتا ہے تم اسے پانی پلاؤ۔وہ فضل کے پاس پہنچا تو انہوں نے اپنے قریب ایک اور مسلمان کو تڑپتے دیکھا انہوں نے کہا وہ مجھ سے زیادہ پیاسا معلوم ہوتا ہے تم پہلے اسے پانی پلاؤ۔وہ تیسرے کے پاس پہنچا تو اس نے چوتھے کی طرف اشارہ کردیا۔اور چوتھے کے پاس پہنچا تو اس نے پانچویں کی طرف اشارہ کردیا۔تاریخ بتاتی ہے کہ وہ سات آدمی تھے اور ساتوں ہی تڑپ رہے تھے مگر ہر ایک نے یہی کہا کہ مجھے پانی نہ پلاؤ بلکہ میرے ساتھی کو پلاؤ۔جب وہ آخری آدمی کے پاس پہنچا تو وہ مرچکا تھا۔اور جب وہ واپس مڑا تو اس نے دیکھا کہ باقی چھ بھی فوت ہوچکے تھے۔اب دیکھو یہ کتنی بڑی قربانی ہے جو عکرمہؓ نے کی۔حالانکہ وہ اسلام کے شدید ترین دشمن تھے۔پس یہ

کہہ دینا کہ فلاں کو ہدایت نصیب نہیں ہوسکتی بہت بڑی غلطی ہے۔اللہ تعالیٰ جب ہدایت دینا چاہتا ہے تو آناً فاناً دے دیتا ہے ۔یہی مضمون اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے کہ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (الذاریات :۵۷)اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو ہدایت اور اپنے قرب کے لئے پیدا کیا ہے۔پس بڑا ہی مایوس وہ انسان ہے جو اللہ تعالیٰ کی اس رحمت کی ناقدری کرے اور سمجھے کہ انسان تو پیدائشی طور پر گنہگار پیدا کیا گیا ہے اس لئے وہ پاکیزگی اور تقدس اختیار ہی نہیں کرسکتا۔

اسلام بتاتا ہے کہ یہ نظریہ قطعی طور پر غلط ہے انسان فطرتی طور پر پاکیزہ قویٰ لے کر آیا ہے۔اور اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو اپنے قرب کے لئے پیدا کیا ہے اسی طرح وہ ایک دوسرے مقام پر فرماتا ہے ۔وَ نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰىهَا۔ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا۔ وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا۔(الشمس:۸ تا ۱۱)یعنی ہم انسانی نفس کو اس امر پر شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ اسے ہم نے سب عیوب سے منزّہ پیدا کیا ہے اور اس کی فطرت میں نیکی اور بدی کی شناخت کی قوت رکھی ہے۔چنانچہ جو شخص اپنی روح کو بیرونی ملونیوں سے پاک رکھتا ہے وہ کامیاب ہوجاتا ہے اور جو شخص اس جبلّی پاکیزگی کو خراب کردیتا ہے وہ ناکام ہوجاتا ہے۔

غرض اسلام انسان کو اس مایوسی کا شکار نہیں ہونے دیتا جس کا شکار اسے دوسرے مذاہب بناتے ہیں بلکہ وہ اس کی روح میں بلند پروازی کی طاقت پیدا کرتا اور اسے فرش سے اٹھا کر عرش تک لے جاتا ہے۔

پھر قرآن کریم اس لحاظ سے بھی کتاب مبین ہے کہ اس نے ہزاروں ایسی صداقتیں بیان فرمائی ہیں جن کا پہلی الہامی کتب میں کہیں ذکر تک نہیں۔مثلاً قرآن کریم جو موسیٰ ؑ اور فرعون کے قریباً بائیس سو سال کے بعد نازل ہوا ہے اس میں یہ لکھا ہے کہ فرعونیوں کے سمندر میں غرق ہونے کے وقت فرعون تو بے شک ڈوب گیا تھا۔مگر اس کی لاش محفوظ کر لی گئی تھی ۔تاکہ وہ آئندہ آنے والے لوگوں کے لئے عبرت اور نصیحت کا باعث بنے (یونس آیت ۹۳) چنانچہ اب جو پرانی ممیاں نکلی ہیں تو ان میں فرعونِ موسیٰ ؑ کی ممی بھی نکلی ہے۔جو مصر کے عجائب خانہ میں محفوظ ہے جسے میں نے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔اب دیکھو یہ قرآن کریم کے کتاب مبین ہونے پر کتنی زبردست شہادت ہے کہ بائیبل جو اس زمانہ کی کتاب ہے جس زمانہ میں فرعون ڈوبا تھا۔اس میں تو کہیں یہ ذکر نہیں کہ فرعون کی لاش محفوظ کر لی گئی تھی ۔مگر قرآن کریم نے بائیس سو سال بعد نازل ہوکر اس سچائی کو بیان کردیا اور پھر اس سچائی کے بیان کرنے کے چودہ سو سال بعد زمین میں سے فرعون موسیٰ ؑ کی ممی نکل آئی۔اور اس طرح ثابت ہوگیا کہ قرآن حقیقتاً اس خدائے بلند و برتر کا کلام ہے جو تمام اسرار کو جاننے والا اور تمام غیبوں سے آگاہ ہے۔

پھر قرآن کریم اس لحاظ سے بھی کتاب مبین ہے کہ وہ اپنے دعاوی کے ثبوت کے لئے بیرونی دلائل کا محتاج نہیں بلکہ وہ خود ہی اپنے دعاوی کے دلائل بھی مہیا کرتا ہے برخلاف دوسری الہامی کتابوں کے کہ وہ دعویٰ تو کرتی ہیں مگران کے دلائل نہیں دیتیں۔ چنانچہ تورات کو شروع سے لے کر آخر تک پڑھ جاؤ۔ انجیل کو پڑھ جاؤ۔ وید کو پڑھ جاؤ۔ بس یہ معلوم ہوگا کہ فرض کر لیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو سب دنیا مانتی ہے اوراس کی ذات میں شک کی گنجائش نہیں۔ اس کی صفات کے متعلق اس قدر قلیل روشنی ڈالی گئی ہے کہ انسانی نفس اس سے قطعاً تسلی نہیں پا سکتا۔ زیادہ سے زیادہ اگر کچھ بیان ہوا ہے تو معجزات پر انحصار کر لیا گیا ہے اوراس طرح اس اصل الاصول کو جس پر مذہب کی بنیاد ہے بالکل مہمل چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس کے مقابل پر قرآن کریم کو دیکھو۔ وہ نہ صرف اللہ تعالیٰ کے وجود کو پیش کرتا ہے بلکہ اس کا ثبوت بھی دیتا ہے اور نہ صرف اس کا ثبوت دیتا ہے۔ بلکہ اس کی سب صفات کا ثبوت دیتا ہے اوراس طرح وہ ایک نیا اصل دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے جو یہ ہے کہ جس قدر صفات الٰہیہ بندہ کے تعلق رکھنے والی ہیں ان کا الگ ثبوت بھی ضروری ہے۔ ورنہ خدا تعالیٰ کا وجود تو ثابت ہوگا۔ مگر اس کی صفات کا وجود ثابت نہیں ہوگا۔ اس بارہ میں مثال کے طور پر یہ آیت لے لو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ۔ (الانعام: ۱۰۴) یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات ایسی ہے کہ انسانی نظریں اس تک نہیں پہنچ سکتیں ہاں وہ خود اس کی نظروں تک پہنچتا اور اپنی طاقت اور قوت کے اظہار سے اور اپنی صفات کے جلوہ سے اپنا وجود اس پر ظاہر کرتا ہے اور وہ بڑا لطیف اور خبیر ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ اس کا نظر نہ آنا اس کے وجود کے منافی نہیں کیونکہ یہ اس کی صفات میں سے ہے کہ وہ نظر نہیں آتا۔ لیکن وہ خود اپنے نشانات کے ذریعہ سے اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے اور بندوں کی نگہداشت رکھتا ہے اوران کی تمام جسمانی اور روحانی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے اور یہ اس امر کا ثبوت ہوتا ہے کہ وہ ہے لیکن لطیف۔ گویا اللہ تعالیٰ کی بعض صفات جوڑے کی حیثیت رکھتی ہیں اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر اس کے وجود کو ظاہر کرتی ہیں۔ مثلاً خبردار رہنا اور ادنیٰ سے ادنیٰ تغیر کو بھی غائب نہ ہونے دینا۔ یہ کام ایک لطیف ہستی کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ یعنی ایسی ہستی کے بغیر جو موجودات کے ہر ذرہ سے ایک کامل اتصال رکھتی ہو۔ پس خبیر کی صفت لطیف کے لئے بمنزلہ جوڑے کے ہے کہ اس کے ذریعہ سے اس کا بھی ظہور ہوتا ہے یا ان دونوں کا آپس میں روح اور جسم کا تعلق ہے کہ ایک نہ ہو تو دوسری صفت بھی ثابت نہیں ہوتی اور دوسری نہ ہو تو پہلی صفت بھی ثابت نہیں۔ اگر خبیر کی صفت وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ سے ثابت نہ ہوتی تو لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ بھی ثابت نہ ہوتا بلکہ عدم ثابت ہوتا۔ اس کے مقابلہ میں اگر لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ثابت نہ ہوتا یعنی اس کا لطیف ہونا تو خبیر کی صفت بھی نہیں رہ سکتی تھی کیونکہ جو

وجود کامل اتصال نہیں رکھتا وہ خبیر بھی نہیں ہوسکتا۔غرض قرآن کریم اس لحاظ سے بھی مبین ہے کہ اس نے صرف دعویٰ کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ وہ جو کچھ کہتا ہے اس کے دلائل بھی دیتا ہے۔تا کہ بنی نوع انسان ان احکام پر عمل صرف ایک چٹّی اور بوجھ سمجھ کر نہ کریں بلکہ اس بشاشت اور یقین کے ساتھ کریں کہ انہیں جو کچھ کہا گیا ہے ان کے اپنے فائدہ اور ترقی کے لئے کہا گیا ہے۔

پھر قرآن کریم اس لحاظ سے بھی مبین ہے کہ وہ تمام امور جو احکام یا اخلاق یا اعتقادات وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں ان سب کو اس کتاب میں پوری تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔اسی طرح اللہ تعالیٰ کے قرب اور اس کی محبت کے حصول کے لئے جس قدر امور کی ضرورت ہے ان سب کو اس کتاب میں واضح کر دیا گیا ہے۔گویا قرآن کریم ایک جامع کتاب ہے جس میں توحید، نبوت، دعا، قضاوقدر، بعث بعد الموت اور معاد وغیرہ کے متعلق پوری تفصیل موجود ہے جبکہ دوسری کتب نے ان امور ضروریہ سے قریباً خاموشی اختیار کر رکھی ہے اور اگر ان میں کچھ ہے تو اس قدر ناکافی ہے کہ گویا کچھ نہیں کہا۔اسی طرح نبی اور اس کے فرائض اور نبوت اور اس کی حقیقت کے متعلق بائیبل اور وید اور ژند وغیرہ کتب بالکل خاموش ہیں۔قرآن کریم نے وجودِ باری تعالیٰ کے ثبوت اور اس کی صفات پر بھی بحث کی ہے۔انسان کی روحانی طاقتوں پر بھی بحث کی ہے۔ان روحانی امور کو بھی بیان کیا ہے جو انسان کی روحانی طاقتوں کی تکمیل اور امداد کے لئے ضروری ہیں۔اسی طرح اس نے انسانی زندگی کے قال پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اس کے ثبوت پیش کئے ہیں اور پھر اس نے ان تمام امور میں نہ صرف علمی طور پر ایک نئی روشنی بخشی ہے بلکہ عملاً بھی اس نے ایسے انسان پیدا کئے ہیں جنہوں نے قرآن کریم پر عمل کر کے اللہ تعالیٰ کا وصال حاصل کر لیا اور ان کی روحانی طاقتیں اپنی تکمیل کو پہنچ گئیں۔غرض قرآن کریم تمام سابق کتبِ الٰہیہ پر اپنے مبین ہونے کے لحاظ سے ایسی نمایاں فوقیت رکھتا ہے کہ جس پہلو سے بھی دیکھیں قرآنی حسن انسانی آنکھوں کو خیرہ کئے بغیر نہیں رہتا۔

پھر قرآن کریم کو دوسری الہامی کتب پر صرف انہی امور میں فضیلت حاصل نہیں جو اس میں دوسری کتابوں سے زائد پائے جاتے ہیں یا جن میں اس نے دوسرے مذاہب کی خامیوں اور ان کی کوتاہیوں کی اصلاح کی ہے بلکہ جن احکام میں اس کی پہلی کتب سے مشابہت دکھائی دیتی ہے ان میں بھی قرآن کریم نے ان سے بہتر اور جامع تعلیم دنیا کے سامنے پیش کی ہے مثلاً اگر ان کتابوں میں کھانا کھانے کا کوئی طریق بیان کیا گیا ہے تو اس کا بھی قرآن کریم نے ان سے اچھا طریق پیش کیا ہے اور اگر ان میں کپڑا پہننے کا کوئی طریق بتایا گیا ہے۔تو قرآن کریم نے ان سے بھی بہتر اور اعلیٰ طریق کپڑے پہننے کا دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔غرض کوئی معمولی سے معمولی بات بھی ایسی نہیں

جس میں قرآن کریم نے ان کتابوں سے زیادہ جامعیت اور تفصیل کے ساتھ اپنی تعلیم پیش نہ کی ہو اور جس میں اس نے اپنے مبین ہونے کے مقام کو ظاہر نہ کیا ہو۔ مثال کے طور پر میں اس وقت امن عالم کا مسئلہ لے لیتا ہوں۔ امن ایک ایسی چیز ہے جس کے لئے دنیا ہمیشہ سے کوشش کرتی چلی آئی ہے چنانچہ یا تو دنیا بیرونی امن کے لئے جدوجہد کرتی ہے اور یا جب بیرونی امن کے لئے جدوجہد نہیں کر رہی ہوتی یا اس میں کامیاب ہو چکی ہوتی ہے تو اندرونی امن کے لئے جدوجہد کرتی ہے۔ چنانچہ بڑے بڑے دولتمند اور عالم وفاضل جب آپس میں ملتے ہیں تو ان کی گفتگو کا موضوع اکثر یہی ہوتا ہے کہ اَور تو ہمیں سب کچھ میسر ہے مگر دل کا امن نصیب نہیں۔ پس امن صرف بیرونی ہی نہیں ہوتا بلکہ دل کا بھی ہوتا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جب تک دل کا امن نصیب نہ ہو اس وقت تک ظاہری امن بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل دنیا کے تمام لوگ امن کے خواہشمند ہیں۔ لیکن امن ان کو میسر نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں اتنی مختلف الانواع مخلوق ہے کہ جب تک کسی ایک قاعدہ کے ماتحت امن کا حصول نہ ہو۔ اس وقت تک سب لوگ مطمئن نہیں ہو سکتے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں انسانوں میں ہزاروں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کے مفاد مختلف ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کے جذبات مختلف ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کی خواہشات مختلف ہوتی ہیں اور ایک دوسرے کی ضروریات مختلف ہوتی ہیں۔ ان متضاد خواہشوں اور متضاد ضرورتوں کے ہوتے ہوئے دنیا میں امن کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔ اسلام بتاتا ہے کہ ایسے متضاد اور مخالف خیالات کی موجودگی میں تبھی امن قائم ہو سکتا ہے جب ساری دنیا ایک ایسی ہستی کی تابع ہو۔ جو امن دینے کا ارادہ رکھتی ہو۔ اگر یہ بات نہ ہو تو کبھی امن میسر نہیں آسکتا۔ ہم روزانہ دیکھتے ہیں کہ ایک گھر میں ماں باپ ذرا ادھر ادھر ہوتے ہیں تو تھوڑی ہی دیر میں بچے لہولہان ہو جاتے ہیں۔ کسی کے گلے پر زخم ہوتا ہے کسی کے بال نوچے ہوئے ہوتے ہیں کسی کے کپڑے پھٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ کسی کی آنکھ سوجی ہوئی ہوتی ہے۔ مگر جب ماں باپ آتے ہیں تو ان کے سامنے ایسی نرم شکلیں بنا کر بیٹھ جاتے ہیں کہ گویا وہ لڑائی جھگڑے کو جانتے ہی نہیں۔ اس لئے کہ ماں باپ کی نیت یہ ہوتی ہے کہ ان کے بچے امن سے رہیں۔ پس درحقیقت امن اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے۔ جب دنیا پر ایک ایسی بالا ہستی ہو جو امن کی متمنی ہو اور جو دوسروں کو امن دینا چاہتی ہو۔ اور ایسے قوانین نافذ کرنا چاہتی ہو جو امن دینے والے ہوں۔ اور وہی شخص حقیقی امن دینے والا قرار پا سکتا ہے جو اس ہستی کی طرف لوگوں کو بلائے۔ یہ امن دینے والی ہستی کی طرف توجہ دلانے والے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور آپ ہی وہ انسان ہیں جن کے ذریعہ دنیا کو یہ معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ کے ناموں

میں سے ایک نام امن دینے والا بھی ہے۔ چنانچہ سورۂ حشر میں اللہ تعالیٰ کے جو نام گنائے گئے ہیں ان میں سے ایک نام یہ بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ (الحشر: ۲۴) اے محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تُو لوگوں کو توجہ دلا اس خدا کی طرف جو بادشاہ ہے پاک ہے اور اَلسَّلٰمُ یعنی دنیا کو امن دینے والا اور تمام سلامتیوں کا سرچشمہ ہے۔ یعنی جس طرح ماں باپ یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتے کہ ان کے بچے لڑیں جھگڑیں یا فساد کریں۔ بلکہ وہ امن شکن کو سزا دیتے اور امن قائم رکھنے والے بچے سے پیار کرتے ہیں اسی طرح تمہارے اوپر بھی ایک خدا ہے وہ دیکھ رہا ہے کہ تمہارے مفاد مختلف ہیں۔ تمہارے ارادے مختلف ہیں۔ تمہاری ضرورتیں مختلف ہیں۔ تمہاری خواہشیں مختلف ہیں۔ اور تم بعض دفعہ جذبات میں بے قابو ہو کر امن شکن حالات پر تیار ہو جاتے ہو۔ مگر یاد رکھو خدا ایسی باتوں کو پسند نہیں کرتا۔ وہ سلام ہے۔ جب تک کوئی سلامتی اختیار نہ کرے اس وقت تک وہ اس کا محبوب نہیں ہو سکتا۔

ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ خالی امن کی خواہش امن پیدا نہیں کر دیا کرتی۔ کیونکہ بالعموم امن کی خواہش اپنے لئے ہوتی ہے دوسروں کے لئے نہیں ہوتی۔ چنانچہ جب لوگ کہتے ہیں۔ دولت بڑی اچھی چیز ہے تو اس کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ دشمن کی دولت بھی اچھی چیز ہے بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ میرے لئے اور میرے دوستوں کے لئے دولت بڑی اچھی چیز ہے اور جب وہ کہتے ہیں صحت بڑی اچھی چیز ہے تو اس کے معنی بھی یہ نہیں ہوتے کہ میرے دشمن کی صحت اچھی چیز ہے بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ میرے لئے صحت بڑی اچھی چیز ہے ورنہ دشمن کے متعلق تو انسان یہی چاہتا ہے کہ وہ نادار اور کمزور ہو۔ اسی طرح جب لوگ عزت ورتبہ کے متمنی ہوتے ہیں تو ہر شخص کے لئے نہیں بلکہ محض اپنے لئے۔ پس جب دنیا کا یہ حال ہے تو خالی امن کی خواہش بھی فساد کا موجب ہو سکتی ہے کیونکہ جو لوگ بھی امن کے متمنی ہیں وہ اس رنگ میں امن کے متمنی ہیں کہ صرف انہیں اور ان کی قوم کو امن حاصل رہے۔ ورنہ دشمن کے لئے وہ یہی چاہتے ہیں کہ اس کے امن کو مٹا دیں۔ اب اگر اسی اصل کو رائج کر دیا جائے تو دنیا میں جو بھی امن قائم ہوگا وہ چند لوگوں کا امن ہوگا۔ ساری دنیا کا نہیں ہوگا۔ اور جو ساری دنیا کا امن نہ ہو وہ حقیقی امن نہیں کہلا سکتا۔ حقیقی امن تبھی پیدا ہو سکتا ہے جب انسان کو یہ معلوم ہو کہ میرے اوپر ایک بالا ہستی ہے جو میرے لئے ہی امن نہیں چاہتی بلکہ سارے ملکوں کے لئے امن چاہتی ہے اور اگر میں صرف اپنے لئے یا صرف اپنی قوم کے لئے یا صرف اپنے ملک کے لئے امن کا متمنی ہوں تو اس صورت میں مجھے اس کی مدد اس کی نصرت اور اس کی خوشنودی کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ جب یہ عقیدہ دنیا میں رائج ہو جائے تبھی امن قائم ہو سکتا ہے ورنہ نہیں۔ پس اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ

کہہ کر قرآن کریم نے انسانی ارادوں کو پاک وصاف کر دیا۔اور یہ تسلیم شدہ بات ہے کہ جب تک ارادے درست نہ ہوں اس وقت تک کام بھی درست نہیں ہوسکتا۔دنیا میں اس وقت جتنے فساد اور لڑائیاں ہیں سب اسی وجہ سے ہیں کہ انسانوں کے ارادے صاف نہیں۔وہ منہ سے جو باتیں کرتے ہیں ان کے مطابق ان کی خواہشات نہیں اور ان کی خواہشات کے مطابق ان کے اقوال اور افعال نہیں۔آج سب دنیا کہتی ہے کہ لڑائی بُری چیز ہے لیکن اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ اگر ہمارے خلاف کوئی لڑے تو یہ بُری بات ہے لیکن اگر ان کی طرف سے جنگ کی ابتدا ہو تو یہ کوئی بری بات نہیں سمجھی جاتی۔اور یہ نقص اسی وجہ سے ہے کہ لوگوں کی نظر ایک ایسی ہستی پر نہیں جو سلام ہے۔وہ سمجھتے ہیں جہاں تک ہمارا فائدہ ہے ہم ان باتوں پر عمل کریں گے مگر جب ہمارے مفاد کے خلاف کوئی بات آئے گی تو اسے رد کر دیں گے۔مگر قرآن کریم میں جو خدا تعالیٰ کے نام بتائے گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب کا خدا ہے کسی ایک کا نہیں۔اور یہی عقیدہ حقیقی امن کی طرف دنیا کو لا سکتا ہے کہ دنیا کا ایک خدا ہے جو یہ چاہتا ہے کہ سب لوگ امن سے رہیں۔جب ہمارا یہ عقیدہ ہوگا تو اس وقت ہماری خواہشات خودغرضی پر مبنی نہیں ہوں گی۔بلکہ دنیا کو عام نفع پہنچانے والی ہوں گی اس وقت ہم یہ نہیں دیکھیں گے کہ فلاں بات کا ہمیں فائدہ پہنچتا ہے یا نقصان بلکہ ہم یہ دیکھیں گے کہ ساری دنیا پر اس کا کیا اثر ہے۔یوں تو دنیا ہمیشہ اپنے فائدہ کے لئے دوسروں کے امن کو برباد کرتی رہتی ہے۔لیکن اس عقیدہ کے ماتحت ایسا کرنے کی جرأت اس میں نہیں ہوگی کیونکہ وہ سمجھے گی کہ اگر میں نے ایسا کیا تو ایک بالا ہستی مجھے کچل کر رکھ دے گی۔جیسے ایک بچہ دوسرے کا کھلونا چھین لیتا ہے تو وہ اپنے لئے امن حاصل کر لیتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی دوسرے کا امن بھی چھینا جاتا ہے۔اور ایک تو خوش ہو رہا ہوتا ہے اور دوسرا رو رہا ہوتا ہے۔ایسی حالت میں کیا تم سمجھتے ہو کہ ماں باپ یا استاد اگر وہاں موجود ہوں تو وہ اس کھیل کو جاری رہنے دیں گے؟ وہ کبھی اس کو برداشت نہیں کریں گے۔بلکہ جس بچہ نے کھلونا چھینا ہوگا اس کا کھلونا واپس لے کر اس کے اصل مالک کو دے دیں گے۔اور جب وہ ایسا کرتے ہیں تب بچہ سمجھتا ہے کہ وہ امن جو دوسرے کے امن کو برباد کر کے حاصل کیا جاتا ہے وہ کبھی قائم رہنے والا نہیں ہوتا۔حقیقی امن وہی ہوتا ہے جو ایسی صورت میں حاصل ہو جب کہ کسی کے حق کو تلف نہ کیا گیا ہو۔

غرض حقیقی امن اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتا جب تک ایک بالا ہستی تسلیم نہ کی جائے اور یہ عقیدہ کہ اللہ تعالیٰ امن دینے والا ہے صرف اسلام نے ہی پیش کیا ہے اور اس نے کہا ہے کہ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ۔ اس کے بعد وہ پیغام ہے جو اس ہستی کی طرف سے آتا ہے۔کیونکہ جب ایک امن قائم رکھنے کی خواہشمند ہستی

کا پتہ مل گیا۔ تو انسان کے دل میں یہ معلوم کرنے کی بھی خواہش پیدا ہو جاتی ہے کہ آیا اس نے امن قائم کرنے کا کوئی سامان بھی کیا ہے یا نہیں۔ کیونکہ اگر اس نے امن قائم کرنے کا کوئی سامان نہیں کیا تو یہ لازمی بات ہے کہ اگر ہم خود امن قائم کرنے کی کوشش کریں گے تو اس بات کا امکان ہو سکتا ہے کہ بجائے امن کے فساد پیدا کر دیں۔ پس محض امن قائم کرنے کی خواہش انسان کو صحیح راستہ پر قائم نہیں کر سکتی جب تک ایک بالا ہستی کی ایسی ہدایات بھی معلوم نہ ہوں جو امن قائم کرنے میں ممد اور معاون ہوں۔ کیونکہ اگر انسان کو اپنے بالا افسر کی خواہشات کا صحیح علم نہ ہو تو انسان باوجود اس آرزو کے کہ وہ اس کے احکام کی اطاعت کرے اسے پوری طرح خوش نہیں رکھ سکتا۔ پس اگر ہمیں اپنے بالا افسر کی خواہش تو معلوم ہو لیکن اس خواہش کو پورا کرنے کا طریق معلوم نہ ہو۔ تب بھی ہمارا امن قائم نہیں رہ سکتا کیونکہ ممکن ہے ہم کوئی اور طریق اختیار کریں اور اس کا منشاء کوئی اور طریق اختیار کرنا ہو۔ پس ہمارے امن کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ بالا ہستی ہمیں کوئی ایسا ذریعہ بھی بتائے جو امن قائم کرنے والا ہو۔ سو اس غرض کے لئے جب ہم قرآن کریم کو دیکھتے ہیں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ آیا اس نے کوئی ایسا ذریعہ بتایا ہے یا نہیں تو سورۂ بقرہ میں اس کا جواب نظر آتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا (البقرۃ:۱۲۶) یعنی یہ جو آسمان پر سلام خدا کی خواہش ہے کہ دنیا میں امن قائم ہو اس کے لئے ضروری تھا کہ ہم ایک مرکز قائم کرتے جو دنیا کو امن دینے والا ہوتا۔ سو ہم نے بیت اللہ کو مدرسہ بنایا۔ یہاں چاروں طرف سے لوگ جمع ہوں گے اور امن کا سبق سیکھیں گے۔ پس ہمارے خدا نے صرف خواہش ہی نہیں کی۔ صرف یہ نہیں کہا کہ تم امن قائم کرو ورنہ میں تم کو سزا دوں گا۔ بلکہ اس دنیا میں اس نے امن کا ایک مرکز بھی قائم کر دیا اور وہ خانہ کعبہ ہے۔ فرماتا ہے۔ یہاں لوگ آئیں گے اور اس مدرسہ سے لوگ امن کا سبق سیکھیں گے۔

پھر یہ کہ اس مدرسہ کی تعلیم کیا ہوگی۔ اس کے لئے بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا سے خبر پا کر اعلان فرمادیا کہ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ (المائدۃ:۱۶،۱۷) یعنی اے لوگو! تم تاریکی میں پڑے ہوئے تھے۔ تم کو یہ پتہ نہیں تھا کہ تم اپنے خدا کی مرضی کو کس طرح پورا کر سکتے ہو۔ اس لئے دنیا میں ہم نے تمہارے لئے ایک مدرسہ بنا دیا ہے۔ مگر خالی مدرسہ کام نہیں دیتا جب تک کتابیں نہ ہوں۔ پس فرمایا قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ۔ خدا کی طرف سے تمہارے پاس ایک نور آیا ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے اور اس کے ساتھ ایک کتاب مبین ہے۔ ایسی کتاب جو ہر قسم کے مسائل کو بیان کرنے والی ہے۔ پس خدا تعالیٰ نے اسلام کے لئے امن کا مدرسہ بھی قائم کر دیا۔ امن کا کورس بھی مقرر کر دیا

اور مدرّسِ امن بھی بھیج دیا۔ مدرّسِ امن محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہیں اور امن کا کورس وہ کتاب ہے جو يَهْدِىْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ کی مصداق ہے۔ جو شخص خدا کی رضا حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسے چاہیے کہ اس کتاب کو پڑھے اس میں جس قدر سبق ہیں وہ سُبُلَ السَّلٰمِ یعنی سلامتی کے راستے ہیں۔ اور کوئی ایک حکم بھی ایسا نہیں جس پر عمل کر کے انسانی امن برباد ہو سکے۔

ایک بالاہستی کا وجود ہی ہمارے ارادوں کو درست کرتا ہے۔ مدرسہ کا قیام ہماری عملی مشکلات کو حل کرنے میں مدد دیتا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات اس کتاب کی عملی تفسیر ہے۔ جیسا کہ آپ فرماتے ہیں کہ میرے ذریعہ خدا تعالیٰ نے وہ کتاب بھیج دی ہے جس میں وہ تمام تفصیلات موجود ہیں جن سے امن حاصل ہو سکتا ہے۔

اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ یہ امن جو اسلام قائم کرنا چاہتا ہے کس کے لئے ہے؟ اللہ تعالیٰ اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتا ہے۔ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى (النمل:۶۰) یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو کہہ دے الحمد للہ سب تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے دنیا میں امن قائم کر دیا اور انسان کی تڑپ اور فکر کو دور کر دیا اور کہو وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى وہ بندے جو خدا تعالیٰ کے پسندیدہ ہو جائیں اور اپنے آپ کو اس کی راہ میں فدا کر دیں ان کے لئے بھی امن پیدا ہو جائے گا اور وہ بھی با امن زندگی بسر کرنے لگ جائیں گے۔ یہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بتایا کہ تمام لوگ جو آپ کی اتباع کرنے والے اور آپ کے مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے والے ہیں ان کے لئے کامل امن ہے اور وہ اپنی زندگی کے کسی حصہ میں بھی بدامنی نہیں دیکھ سکتے۔

پھر سوال پیدا ہوتا تھا کہ جب خدا سلام ہے تو اس کی طرف سے امن ساروں کے لئے آنا چاہیے۔ نہ کہ بعض کے لئے۔ کیونکہ اگر خالی اپنوں کے لئے امن ہو تو یہ کوئی کامل امن نہیں کہلا سکتا۔ اس کا بھی اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں جواب دیتا ہے۔ فرماتا ہے۔ وَقِيْلِهٖ يٰرَبِّ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ۔ فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلٰمٌ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ (الزخرف:۸۹،۹۰) یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی تعلیم لے کر آئے ہیں جو ساروں کے لئے ہی امن کا موجب ہے اور ہر شخص کے لئے وہ رحمت کا خزانہ اپنے اندر پوشیدہ رکھتی ہے۔ مگر افسوس کہ لوگ اس کو نہیں سمجھتے۔ بلکہ وہ اس تعلیم کے خلاف لڑائیاں اور فساد کرتے ہیں جو ان کے لئے نوید اور خوشخبری ہے یہاں تک کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو بھی یہ کہنا پڑا کہ خدایا میں اپنی قوم کی طرف امن کا پیغام لے کر آیا تھا مگر اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ یہ قوم جس کے لئے میں امن کا پیغام لایا تھا یہ تو مجھے بھی امن نہیں دے رہی اٰمَنَ کے معنے ایمان لانے کے بھی ہوتے ہیں اور اٰمَنَ کے معنے امن دینے کے بھی ہوتے ہیں (اقرب) وَقِيْلِهٖ يٰرَبِّ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ میں اسی امر کا ذکر ہے

کہ ہمارا نبی ہم سے پکار پکار کر کہتا ہے کہ خدایا باوجود یکہ میں اپنی قوم کے لئے امن کا پیغام لایا تھا وہ اس کی قدر کرنے کی بجائے میری مخالفت پر کمر بستہ ہو گئی ہے یہاں تک کہ ان لوگوں نے میرے امن کو بالکل برباد کر دیا۔ مگر فرمایا۔ فَاصْفَحْ عَنْهُمْ ۔ہم نے اپنے نبی سے یہ کہا ہے کہ ابھی ان لوگوں کو تیری تعلیم کی عظمت معلوم نہیں اس لئے وہ غصہ میں آجاتے اور تیری مخالفت پر کمر بستہ رہتے ہیں تو ان سے درگذر کر۔ کیونکہ ہم نے تجھے امن کے قیام کے لئے ہی بھیجا ہے وَ قُلْ سَلٰمٌ ۔اور جب تجھ پر یہ لوگ حملہ کریں اور تجھے ستائیں تو تو یہی کہتا رہ کہ میں تو تمہارے لئے سلامتی لایا ہوں فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ عنقریب دنیا کو معلوم ہو جائے گا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم دنیا کے لئے امن لایا تھا۔ لڑائی نہیں لایا تھا۔ گویا وہ امن جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم لائے وہ صرف مومنوں کے لئے ہی امن نہ رہا۔ بلکہ سب کے لئے امن ہو گیا۔

پھر صرف محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ہی نہیں بلکہ تمام مومنوں کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (الفرقان: ۶۴) وہ جاہل جو اسلام کی غرض و غایت کو نہیں سمجھتے جب مسلمانوں سے لڑنا شروع کر دیتے ہیں ۔تو مومن کہتے ہیں کہ ہم تو تمہاری سلامتی چاہتے ہیں چاہے تم ہمارا بُرا ہی کیوں نہ چاہو۔ جب دشمن کہتا ہے کہ تم کیسے گندے عقائد دنیا میں رائج کر رہے ہو۔ تو وہ کہتے ہیں یہ گندے عقائد اور بیہودہ باتیں نہیں ۔ بلکہ سلامتی کی باتیں ہیں۔ گویا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی لائی ہوئی سلامتی صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لئے ہی نہیں بلکہ مومنوں کے لئے بھی ہے۔ اور صرف مومنوں کے لئے ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے لئے ہے۔

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سلامتی عارضی ہے یا مستقل۔ کیونکہ یہ تو ہم نے مانا کہ السَّلَامُ خدا سے امن لا کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دنیا کو دیا۔ مگر بعض امن عارضی بھی ہوتے ہیں جن کے نیچے بڑی بڑی خرابیاں پوشیدہ ہوتی ہیں جیسے بخار کا مریض جب ٹھنڈا پانی پیتا ہے تو اسے بڑا آرام محسوس ہوتا ہے۔ مگر دو منٹ کے بعد یکدم اس کا بخار تیز ہو جاتا ہے۔ اور کہتا ہے ''آگ لگ گئی'' پھر برف پیتا ہے۔ اور سمجھتا ہے کہ آرام آ گیا مگر یکدم پھر اسے بے چینی شروع ہو جاتی ہے۔ پس سوال ہو سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو امن دے رہے ہیں یہ عارضی ہے یا مستقل؟ اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتا ہے: وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ (یونس: ۲۶) کہ دنیا فسادوں کی طرف لے جاتی ہے مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ذریعہ جو تعلیم دی گئی ہے وہ موجودہ زمانہ ہی کے لئے نہیں۔ بلکہ وہ ایک ایسا امن ہے جو مرنے کے بعد بھی چلتا چلا جاتا ہے اور جو اس دنیا کے بعد ایک ایسے گھر میں انسان کو پناہ

دیتا ہے جہاں سلامتی ہی سلامتی ہے گویا یہ زنجیر ایک مکمل زنجیر ہے۔اس کے ماضی میں ایک سلام ہستی کھڑی ہے اس کے حال میں امن ہے کیونکہ ایک مدرسہ امن جاری ہو گیا ہے اور ایک مدرّسِ امن خدا تعالیٰ نے بھیج کر امن کا کورس بھی مقرر کر دیا۔اور عملی طور پر ایک ایسی جماعت تیار کر دی جو اِذَا خَاطَبَھُمُ الْجٰھِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا کی مصداق ہے۔پس اس کے ماضی میں بھی امن ہے اور اس کے حاضر میں بھی امن ہے۔پھر اس کے مستقبل میں بھی امن ہے۔کیونکہ وَاللّٰہُ یَدْعُوْٓا اِلٰی دَارِ السَّلٰمِ مرنے کے بعد وہ انسان کو ایک ایسے جہان میں لے جائے گا۔جہاں سلامتی ہی سلامتی ہو گی۔پس یہ ساری زنجیر مکمل ہو گئی اور کوئی جزو تشنۂ تکمیل نہ رہا۔

اس کے بعد قیامِ امن کے ذرائع کا سوال آتا ہے۔سو اس کے متعلق بھی قرآن کریم روشنی ڈالتا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ اعلان فرماتا ہے کہ وَ کَیْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَکْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّکُمْ اَشْرَکْتُمْ بِاللّٰہِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِہٖ عَلَیْکُمْ سُلْطٰنًا۔فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ۔اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔(الانعام:۸۲) یعنی میرے دل کا امن ان بتوں کو دیکھ کر کس طرح برباد ہو جائے جن کو تم خدائے واحد کا شریک قرار دے رہے ہو۔وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّکُمْ اَشْرَکْتُمْ بِاللّٰہِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِہٖ عَلَیْکُمْ سُلْطٰنًا حالانکہ تم اپنے دلوں میں جھوٹے طور پر مطمئن ہو۔خطرہ تمہارے ارد گرد ہے۔پس اگر تم عدمِ علم اور جہالت کے باوجود مطمئن ہو اور تمہارا عدمِ علم تم کو امن دے سکتا ہے تو تم کس طرح سمجھ سکتے ہو کہ میرا کامل علم مجھے امن نہیں بخش سکتا۔فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ تم بتاؤ ان دونوں میں سے کس کو امن حاصل ہو گا؟ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔اگر تم حماقت کی باتیں نہ کرو اور عقل و خرد سے کام لو تو تم سمجھ سکتے ہو کہ کون مامون ہے اور کون غیر مامون۔

اس جگہ امن کے قیام کے لئے اللہ تعالیٰ نے دو عظیم الشان گُر بیان کئے ہیں۔اول یہ کہ توحید کامل کے قیام کے بغیر امن قائم نہیں ہو سکتا۔کیونکہ جب تک توحید قائم نہ ہو گی اس وقت تک لڑائیاں جاری رہیں گی۔شرک کا صرف اتنا ہی مفہوم نہیں کہ کوئی ایک کی بجائے تین خداؤں کا قائل ہو۔بلکہ جب باریک در باریک رنگ میں شرک شروع ہوتا ہے تو کئی قسم کا شرک نظر آنے لگ جاتا ہے۔اس کے علاوہ جب مختلف مذاہب کی تعلیمیں مختلف ہیں ان کے خیالات مختلف ہیں تو اس حالت میں امن اس وقت تک قائم ہی نہیں ہو سکتا جب تک لوگوں کے اندر حقیقی مواخات پیدا نہ ہو اور حقیقی مواخات ایک خدا کے بغیر نہیں ہو سکتی۔دنیا میں اس بات پر تو لڑائیاں ہو جاتی ہیں کہ ایک کہتا ہے میرا دادا فلاں عظمت کا مالک تھا اور دوسرا کہتا ہے میرا دادا ایسا تھا۔مگر کبھی تم نے بھائیوں کو اس بات پر لڑتے نہیں دیکھا ہو گا کہ ایک دوسرے کو کہے میں شریف النسب ہوں اور تم نہیں۔اسی طرح جب دنیا میں توحید کامل ہو گی۔تبھی

اس قسم کی لڑائیاں بند ہوں گی پس اخوت و مساوات کا جو سبق توحید سے حاصل ہوتا ہے اَور کسی طرح حاصل نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیم کے متعلق دشمن بھی یہ اقرار کرتا ہے کہ اخوت کا جو سبق آپؐ نے دیا اور کسی نے نہیں دیا (Mohamad and Teachings of Quran pg 114)۔حقیقت یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اخوت کا سبق الگ کر کے نہیں دیا بلکہ آپ نے اصل میں توحید کا سبق دیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں اخوت پیدا ہوگئی۔مثلاً جب مَیں نماز میں کہوں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ سب تعریف اسی اللہ کی ہے جو عیسائیوں کا بھی رب ہے۔ہندوؤں کا بھی رب ہے یہودیوں کا بھی رب ہے۔تو میرے دل میں ان قوموں کی نفرت کس طرح ہوسکتی ہے۔جبکہ میں رَبُّ الْعَالَمِیْنَ کے لفظ کے نیچے تمام قوموں اور تمام نسلوں کو لے آتا ہوں۔میں جب نماز میں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ کہتا ہوں تو تو دوسرے الفاظ میں میں یہ کہتا ہوں کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْمَذَاہِبِ کُلِّھَا۔یعنی میں اس خدا کی تعریف کرتا ہوں جو تمام مذاہب کا رب ہے۔اسی طرح جب میں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ کہتا ہوں تو اس کے معنے یہ بھی ہوتے ہیں کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْاَقْوَامِ کُلِّھَا یعنی میں اس خدا کی تعریف کرتا ہوں جو تمام اقوام کا رب ہے اسی طرح جب مَیں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ کہتا ہوں تو اس کے یہ معنے بھی ہوتے ہیں کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْبِلَادِ کُلِّھَا یعنی میں اس خدا کی تعریف کرتا ہوں جو تمام ملکوں کا رب ہے۔اور جب کہ میں تمام اقوام ۔تمام ملکوں اور تمام لوگوں میں حسن تسلیم کروں گا تو یہ ممکن ہی نہیں کہ میں ان سے عداوت رکھ سکوں۔پس اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ میں بتا دیا گیا ہے کہ اگر حقیقی توحید قائم ہو اور رب العالمین کی حمد سے انسان کی زبان تر ہو تو یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی قوم کا کینہ انسان کے دل میں رہے اور ایک طرف تو وہ ان کی بربادی کی خواہش رکھے اور دوسری طرف ان کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی حمد اور تعریف بھی کرے۔

دوسرا نکتہ اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ یہ نازل فرمایا ہے کہ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِہٖ عَلَیْکُمْ سُلْطٰنًا یعنی دنیا میں امن تبھی برباد ہوتا ہے۔جب انسان فطرتی مذہب کو چھوڑ کر رسم و رواج کے پیچھے چل پڑتا ہے۔ اگر انسان طبعی اور فطرتی باتوں پر قائم رہے تو کبھی لڑائیاں اور جھگڑے نہ ہوں۔یہی وجہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔اسلام دین فطرت ہے اور حقیقت یہی ہے کہ جو دین فطرت ہوگا۔وہی دنیا میں امن قائم کر سکے گا اور وہی مذہب امن پھیلا سکے گا جس کا ایک ٹکڑا انسان کے دماغ میں ہو۔آخر یہ ہو کس طرح سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اس تعلیم کی طرف بلائے جس کا جواب ہماری فطرت میں نہیں اور جس کی قبولیت کا مادہ پہلے سے خدا نے ہمارے دماغ اور ہمارے ذہن میں نہیں رکھا۔پس فرمایا مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِہٖ عَلَیْکُمْ سُلْطٰنًا تم کہہ دو کہ تم ان تعلیموں کے پیچھے چل

رہے ہو جو فطرت کے خلاف ہیں اور میں تم کو ان باتوں کی طرف بلاتا ہوں جو تمہاری فطرت میں داخل ہیں۔اب جوں جوں انسان اپنی فطرت کو پڑھنے کی کوشش کرے گا اس کا دل پکار اُٹھے گا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں جو کتاب ہے وہ بالکل سچی ہے۔کیونکہ اس کا دوسرا نسخہ میرے ذہن میں بھی ہے۔اس طرح آہستہ آہستہ دنیا ایک مرکز پر آجائے گی اور ایک ہی خیال پر متحد ہو جائے گی جس کے نتیجہ میں امن قائم ہو جائے گا۔

اب ایک اور سوال باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ بے شک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدرّسِ امن ہیں۔ بے شک آپؐ نے امن کا مدرسہ دنیا میں جاری کر دیا بے شک امن کا کورس خدا نے مقرر کر دیا۔بیشک اسلام نے تعلیم وہ دی ہے جو فطرت کے عین مطابق ہے اور جسے دیکھ کر انسانی فطرت پکار اٹھتی ہے کہ واقعہ میں یہ صحیح تعلیم ہے۔مگر کیا لڑائی بالکل ہی بُری چیز ہے؟ قرآن کریم اس کا بھی جواب دیتا اور فرماتا ہے کہ امن کے قیام کے لئے بعض دفعہ جنگ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔چنانچہ فرماتا ہے۔وَ لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (البقرة: ۲۵۲) کہ بیشک امن ایک قیمتی چیز ہے۔بے شک اس کی تعلیم خدا نے انسانی دماغ میں رکھی ہے۔مگر کبھی انسان کا دماغ فطرت سے اتنا بعید ہو جاتا ہے اور انسانی عقیدے مرکز سے اتنے پرے ہٹ جاتے ہیں۔کہ وہ امن سے بالکل دور جا پڑتے ہیں۔اور نہ صرف امن سے دور جا پڑتے ہیں بلکہ حرّیتِ ضمیر کو بھی باطل کرنا چاہتے ہیں۔فرماتا ہے ایسی حالت میں امن کے قیام اور اس کو وسعت دینے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ جو شرارتی ہیں ان کا مقابلہ کیا جائے پس وہ جنگ امن ہٹانے کے لئے نہیں بلکہ امن قائم کرنے کے لئے ہوگی۔جیسے اگر انسان کے جسم کا کوئی عضو سڑ گل جائے تو فیس خرچ کر کے بھی انسان ڈاکٹر سے کہتا ہے کہ اس عضو کو کاٹ دو۔اسی طرح کبھی ایسے گروہ دنیا میں پیدا ہو جاتے ہیں جو سرطان اور کینسر کا مادہ اپنے اندر رکھتے ہیں۔اور ضروری ہوتا ہے کہ ان کا اپریشن کیا جائے تا وہ باقی حصہ قوم کو بھی گندہ اور ناپاک نہ کر دیں۔پس فرمایا وَ لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ۔اگر بعض کے ذریعہ اللہ تعالیٰ بعض کی شرارتوں کو دور نہ کرتا تو لَفَسَدَتِ الْاَرْضُ۔ بجائے امن قائم ہونے کے فساد بڑھ جاتا۔جس طرح سپاہیوں کو بعض دفعہ لاٹھی چارج کا حکم دیا جاتا ہے۔اسی طرح فرمایا۔بعض دفعہ ہم بھی اپنے بندوں کو اجازت دیتے اور انہیں کہتے ہیں جاؤ اور لاٹھی چارج کرو اس لئے کہ لَفَسَدَتِ الْاَرْضُ اگر لاٹھی چارج نہ کیا جاتا۔تو ساری دنیا کا امن برباد ہو جاتا۔وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ لیکن اللہ تعالیٰ صرف ایک قوم کو ہی امن نہیں دینا چاہتا بلکہ وہ ساری دنیا کو باامن دیکھنے کا خواہشمند ہے۔اور چونکہ ان لوگوں سے دنیا کا امن برباد ہوتا ہے اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ ان کا مقابلہ کیا جائے۔تا ساری دنیا میں امن قائم ہو۔بیشک اس

کے نتیجہ میں خود ان لوگوں کا امن مٹ جائے گا۔مگر دنیا میں ہمیشہ موازنہ کیا جاتا ہے۔جب ایک بڑا فائدہ چھوٹے فائدہ سے ٹکرا جائے تو اس وقت بڑے فائدے کو لے لیا جاتا اور چھوٹے فائدہ کو قربان کر دیا جاتا ہے۔اسی طرح کثیر حصہء دنیا کے امن کی خاطر ایک قلیل گروہ سے جنگ کی جاتی ہے اور اس وقت تک اسے نہیں چھوڑا جاتا جب تک وہ خلاف امن حرکات سے باز نہ آجائے۔

یہ ایک مختصر ساڈھانچہ اس تعلیم کا ہے جو اسلام نے قیام امن کے سلسلہ میں دی۔اس سے ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ اسلام نے کس جامعیت اور تفصیل کے ساتھ اس مسئلہ کو بیان کیا ہے جبکہ باقی مذاہب اس مسئلہ پر بالکل خاموش ہیں اور انہوں نے نسل انسانی کی کوئی راہنمائی نہیں کی۔صرف یہ کہہ دینا کہ اگر کوئی شخص تمہارے ایک گال پر تھپڑ مارے تو تم اپنا دوسرا گال بھی اس کی طرف پھیر دو۔اگر کوئی شخص تم سے قمیص مانگے تو اسے چوغہ بھی اتار دو۔اگر کوئی شخص تمہیں ایک کوس بیگار میں لے جانا چاہے تو تم دو کوس چلے جاؤ۔(متی باب ۵ آیت ۳۹ تا ۴۱) بین الاقوامی مشکلات کا کوئی حل نہیں کہلا سکتا۔اور نہ عیسائیت اور یہودیت صرف اس تعلیم پر عمل کر کے کبھی دنیا میں امن قائم کرنے میں کامیاب ہوئی ہے۔بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس تعلیم پر عمل امن نہیں بلکہ بدامنی پیدا کرنے کا موجب ہے۔اگر کوئی شخص ایک کوس پر اپنے گھر کا سامان لے جانا چاہتا ہے۔اور ایک مزدور کو وہ زبردستی پکڑ لیتا ہے تو مسیحیت کہتی ہے کہ اے مزدور پکڑا جا اور مقابلہ نہ کر۔مگر جب اس کا گھر آجائے تو وہاں ٹھہر نہیں بلکہ ایک کوس اور آگے چلا جا۔اب بتاؤ اس تعلیم پر عمل کر کے کس کو امن ملا۔دوسرے شخص کو خود اسباب اٹھا کر واپس لانا پڑے گا اور مزدور کو ایک کوس زائد بوجھ اٹھانا پڑے گا۔گویا دونوں کو بدامنی ملی۔امن نہ ملا۔

امن صرف اسی تعلیم پر عمل کر کے قائم ہو سکتا ہے جو اسلام نے پیش کی ہے۔کیونکہ اسلام ایک کتاب مبین پیش کرتا ہے جو اپنے تمام احکام پر بالتفصیل روشنی ڈالنے والی ہے اور جس کا مقابلہ نہ تورات کر سکتی ہے نہ انجیل کر سکتی ہے۔نہ ژندواوستا کر سکتے ہیں اور نہ دنیا کی کوئی اور کتاب یا صحیفہ کر سکتا ہے۔

كِتَابٌ مُّبِيۡن کے ذکر میں اس امر کا بیان کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب مبین کی شناخت کا انحصار صرف ظاہری دلائل اور براہین پر ہی نہیں رکھا بلکہ اس نے کتاب مبین کی سچائی کے لئے ایک اَور کتاب بھی تیار کی ہوئی ہے جسے قرآنی اصطلاح میں كِتَابٌ مَّكۡنُوۡنٌ کہا جاتا ہے۔کتاب مکنون کی مثال اس پانی کی سی ہے جو زمین کے اندر مخفی ہوتا ہے اور کتاب مبین کی مثال نہروں، دریاؤں اور چشموں کے پانی کی سی ہے جو ظاہر ہوتا ہے۔جس طرح نہروں اور دریاؤں یا بادلوں کے پانی کی وجہ سے کنوؤں کا پانی بھی چڑھ آتا

ہے۔اسی طرح کتاب مبین کی آمد پر کتاب مکنون بھی اپنے خزانے اگلنے لگتی ہے۔اور جب کتاب مبین کا پانی برسنا بند ہوجائے تو کتاب مکنون بھی مخفی تر ہوجاتی ہے۔کتاب مکنون سے مراد فطرت صحیحہ اور ضمیر ہے اور کتاب مبین خدا تعالیٰ کا تازہ الہام ہے۔اور کتاب مبین کی سچائی کا ثبوت یہ ہوتا ہے کہ وہ کتاب مکنون کے مطابق ہو گویا اصل میں یہ دونوں ٹکڑے ایک ہی کل کے ہیں جسے کتاب مطلق کہنا چاہیے اور جب کتاب مکنون اور کتاب مبین کا اتحاد ہوجائے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ کتاب مبین اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔گویا کہ اللہ تعالیٰ نے آئندہ لوگوں کو دھوکے سے بچانے کے لئے اپنی کتاب کا ایک ٹکڑا ان کے دلوں اور دماغوں میں بھی رکھ دیا ہے۔تا کہ جو کتاب اس کے مطابق ہو وہ اس کی سمجھی جائے اور جو اس کے مطابق نہ ہو وہ جھوٹی قرار پائے۔اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے ۱۹۲۴ء میں مَیں جب ولایت سے واپس آرہا تھا تو جہاز کا ایک انجینئر مجھے علیحدگی میں لے گیا۔اور کہنے لگا آپ کے ولایت جانے کے لئے تبلیغ تو ایک بہانہ ہے آپ کسی اَور اہم کام کو سرانجام دینے کے لئے گئے ہوں گے۔میں نے کہا۔ہم تو صرف تبلیغ کے لئے ہی گئے تھے اس کے علاوہ اور کوئی کام ہمارے مدنظر نہ تھا۔مگر چونکہ اس کے دل میں یہی جم چکا تھا کہ کسی اور کام کے لئے گئے تھے اور تبلیغ کو آڑ بنالیا تھا وہ کہنے لگا کہ آپ تو انگریزوں کے خلاف کسی قسم کی کوشش کرنے گئے ہوں گے اور آپ کا یہ ظاہر کرنا کہ ہم تبلیغ کے لئے گئے تھے ایک بہانہ ہے۔میں نے پھر اسے وہی جواب دیا کہ تبلیغ کے سوا ہمارا کوئی اور مدعا نہ تھا۔مگر وہ اپنی دھن میں یہی کہتا رہا کہ تبلیغ تو صرف بہانہ ہے۔اس کے بعد وہ کہنے لگا۔میں اپنی خدمات آپ کے پیش کرتا ہوں۔آپ میرے سپرد کوئی کام کریں۔اور اگر آپ نے اپنے نمائندوں کو کسی قسم کی مخفی ہدایات پہنچانی ہوں تو میں اس کام کو بخوبی سرانجام دے سکوں گا اور بڑی حفاظت سے ان تک پہنچا دیا کروں گا۔اس کے بعد اس نے مزید اعتبار جمانے کے لئے ایک وزیٹنگ کارڈ Visiting Card نکالا اور اس کے دو ٹکڑے پھاڑ کر کہا۔جب آپ مجھے اس قسم کی ہدایات پر مشتمل خط بھیجیں تو وزیٹنگ کارڈ کا نصف حصہ اس کے ساتھ مجھے بھیج دیں اور دوسرا نصف حصہ اپنے اس نمائندہ کو جس کو وہ خط پہنچانا ہو بھجوا دیا کریں وہ نمائندہ جب وہ نصف وزیٹنگ کارڈ دکھا کر مجھ سے آپ کے مخفی خط کا مطالبہ کرے گا تو میں اس کے نصف وزیٹنگ کارڈ کو اپنے والے نصف کے ساتھ ملا کر دیکھ لوں گا۔اور اگر وہ دونوں ٹکڑے آپس میں مل گئے تو میں سمجھ جاؤں گا کہ یہ خط اسی کو دینا ہے۔پھر اس نے مثال دی کہ فرض کرو میں آپ کا خط لے کر وینس میں پہنچا اور وہاں دیکھا کہ ایک ہندوستانی شخص میرے انتظار میں کھڑا ہے وہ جب اپنی جیب سے وہ نصف کارڈ نکال کر مجھے دکھائے گا تو میں اپنے وزیٹنگ کارڈ سے ملا کر دیکھوں گا۔اگر مل گیا تو آپ کا خط اس کو پہنچا دوں گا۔یہ مثال تو اس انجینئر نے اپنی اس غلط فہمی کی بنا پر

دی تھی کہ ہم انگریزوں کے خلاف کسی قسم کی سازش کرنے گئے تھے۔لیکن اتنی بات بالکل درست ہے کہ جب کسی کارڈ کے دو حصے آپس میں فٹ آ جائیں تو اس کارڈ کے صحیح ہونے میں کسی قسم کے شبہ کی گنجائش نہیں رہی۔اسی طرح اللہ تعالیٰ نے کتاب مبین کا ایک حصہ انسان کے ضمیر میں رکھ دیا ہے اور جب وہ دونوں آپس میں مل جاتے ہیں تو کتاب مبین کی صداقت بالکل واضح ہوجاتی ہے۔مگر جس طرح بارش نہ ہونے پر کنوؤں کے پانی بھی سوکھنے لگتے ہیں۔اسی طرح کتاب مکنون اس وقت تک کام دیتی ہے جب تک کتاب مبین کا پانی برستا رہے۔جب فترۃ کا زمانہ آجائے تو کتاب مکنون بھی مخفی تر ہوجاتی ہے۔گویا دونوں کی مثال دو دوستوں اور محبّوں کی سی ہے کہ جب ایک قریب آتا ہے تو دوسرا بھی قریب آجاتا ہے اور جب ایک دور چلا جاتا ہے تو دوسرا بھی دور چلا جاتا ہے۔جب کتاب مکنون کسی شخص کی اپنی جلا کی وجہ سے نمایاں ہونے لگتی ہے اور اس کا مالک اپنی ذکاوت کی وجہ سے اس کے مطابق اعمال کر کے اسے اور زیادہ مصفّٰی کر دیتا ہے تو معاً کتاب مبین یعنی الہام الٰہی اس پر نازل ہونے لگتا ہے۔اسی کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے کہ یَکَادُ زَیْتُھَا یُضِیْٓءُ وَ لَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ (النور:۳۶) یعنی فطرت مبارکہ محمدیہ ایسی مصفّٰی اور پاکیزہ تھی کہ قریب تھا کہ خود بخود بغیر آگ کے جل اٹھتی یعنی بغیر اس کے کہ آسمانی آگ اس کو چھوتی وہ آپ ہی آپ دقائق اور معرفت کو پالیتی۔کیونکہ سنت اللہ یہی ہے کہ جب اس اندرونی تیل میں التہاب پیدا ہونے لگے تو آسمانی آگ کو وہ خود بخود جذب کر لیتا ہے۔غرض ان دونوں کتابوں کا عجیب جوڑ ہے کہ ایک کے قریب ہونے سے دوسری بھی قریب ہوجاتی ہے۔فطرت صحیح ہوتی ہے تو وہ الہام کو کھینچ لیتی ہے اور الہام کی روشنی کسی کو نصیب ہوجائے۔تو اس کی فطرت کے صحیح جذبات ابھر آتے ہیں۔اور دونوں میں لازم وملزوم والی لذت پیدا ہوجاتی ہے۔اسی طرح جب کتاب مکنون مٹ جائے تو کتاب مبین بھی نصیب نہیں ہوتی اور جب کتاب مبین سے انسان محروم ہوجائے تو کتاب مکنون بھی مٹ جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ایمان کامل کبھی خالی فطرت کے غور سے حاصل نہیں ہوسکتا۔کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ فطرت کامل ہو تو الہام کامل اس سے جدا ہی نہیں رہ سکتا۔وہ فوراً اس پر اسی طرح آگرتا ہے جس طرح وائرلیس کے صحیح آلہ پر خود بخود خبر گرنے لگتی ہے یا جواز بِجلی پر بجلی۔

غرض الہام اور فطرت صحیحہ ایک جوہر کے دو ٹکڑے ہیں اور ان کو الگ الگ سمجھنا سخت نادانی اور بے وقوفی ہے۔ فطرت صحیحہ اور جذبات متناسب کے نتیجہ میں ہی عشق الٰہی کی آگ بھڑکا کرتی ہے جو کلام کو کھینچ لیتی ہے اور وصال کو آسان کر دیتی ہے۔پس صحیح اور آسمانی کلام وہی ہوسکتا ہے جس کو فطرت صحیحہ اور جذبات سے کامل اتصال ہو اور بجائے جذبات کو مارنے کے وہ ان کو صحیح طور پر ابھارے اور فطرت صحیحہ اس کی تصدیق کرے کہ ہاں یہ کلام میرے

جسم کا دوسرا ٹکڑہ ہے اور فوراً اس کی طرف لپک پڑے۔ اس کے مقابلہ میں جو کلام فطرت صحیحہ کو مارنے کی کوشش کرتا ہے وہ یقیناً کتاب مکنون کے مخالف چلتا ہے اور خواہ منہ اس کی کس قدر ہی تصدیق کریں دل اس پر مطمئن نہیں ہو سکتے اور وہ ضرور اپنے مقصد کے پورا کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ کیونکہ وہ نصف دھڑ کی طرح ہے یا مجرّد نر ہے کہ جو بغیر مادہ کے بچہ نہیں دے سکتا۔ غرض قرآن کریم کو یہ ایک بہت بڑی فضیلت حاصل ہے کہ وہ کتاب مبین بھی ہے اور فطرت صحیحہ انسانیہ میں بھی یہ کتاب موجود ہے۔ یعنی اس کا کوئی حکم انسانی فطرت کے مغائر نہیں۔ لیکن چونکہ بغیر آسمانی مدد کے فطرت صحیحہ کے باریک خزائن کا بھی اظہار نہیں ہو سکتا اس لئے اللہ تعالیٰ کتاب مبین اتارتا ہے تا کہ اس کے ذریعہ سے کتاب مکنون کا ظہور ہو۔ اور کتاب مکنون کے ذریعہ سے کتاب مبین کی لوگوں کو شناخت ہو۔ اسی حقیقت کو صلحاء نے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ یعنی دقائق فطرت کو سمجھنے سے ہی انسان کو خدا ملتا ہے۔ مگر یہ فقرہ ناقص ہے اور شعر کا صرف ایک مصرعہ ہے حق وہی ہے جو قرآن کریم نے بتایا ہے کہ عرفانِ نفس سے خدا ملتا ہے لیکن خدا تعالیٰ کے کلام کے بغیر عرفان نفس بھی حاصل نہیں ہوتا۔ گویا انسان اپنی حقیقت کو سمجھنے کے لئے بھی کتاب مبین کا محتاج ہے اور یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے وابستہ اور پیوستہ ہیں۔

پھر فرماتا ہے لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ اے محمد رسول اللہ! یہ عظیم الشان کلام جو ہم نے تجھ پر نازل کیا ہے اسے لوگوں تک پہنچانے اور انہیں اس لازوال دولت سے متمتع کرنے کے لئے تیرے دل میں بنی نوع انسان کی ہدایت کی اتنی شدید تڑپ پائی جاتی ہے کہ شاید تو اپنی جان کو اسی غم میں ہلاک کر لے گا کہ کیوں یہ لوگ اس کتاب مبین پر ایمان نہیں لاتے جو ان کی دنیوی اور اُخروی بہبود کے لئے نازل کی گئی ہے اور جس میں ان کی تمام روحانی اور جسمانی ترقیات کے راز مضمر ہیں۔ بَخَعَ کے معنے ہوتے ہیں۔ اس طرح چھری پھیری کہ گردن کے پچھلے حصے تک پہنچ گئی۔ گویا ذبح کرنے میں مبالغہ اور سختی سے کام لیا۔ ان معنوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس آیت میں یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بنی نوع انسان سے اتنی شدید محبت تھی کہ وہ ان کے غم میں اپنے آپ کو ہلاک کر رہے تھے۔ اور ان کے ہدایت نہ پانے کو اس طرح محسوس کر رہے تھے جس طرح جوش سے بھرا ہوا انسان آگے سے چھری پھیرنا شروع کرتا ہے تو گردن کے پچھلے حصہ تک کاٹ جاتا ہے۔ دنیا میں اب تک ہزاروں انبیاء گذرے ہیں۔ مگر بنی نوع انسان کی محبت کا یہ مقام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی جہاں ایک طرف عقل وخرد کی بہترین مثال ہے وہاں اس کے ذریعہ جذبات کا بھی نہایت پاکیزہ طور پر ظہور ہوا ہے اور یہ جذباتی تمثال حقیقتاً اس نہایت لطیف شعر کا مصداق

ہے کہ ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

(دیوان حافظ شیرازی فارسی صفحہ ۸)

دنیا میں خالی عقل نے کبھی زندگی نہیں پائی۔ زندگی ہمیشہ عشق نے پائی ہے۔ جذبات نے پائی ہے۔ دنیا میں بڑے بڑے فلاسفر اور عاشق گذرے ہیں لیکن جو حکومت عشاق نے لوگوں کے دلوں پر کی وہ فلاسفروں کو حاصل نہیں ہوئی۔ انبیاء میں حقیقی عشق کی جو مثالیں ہیں انہیں نظر انداز کر دو اور مجازی عشق ہی کو لے لو۔ کتنے آدمی ہیں جو ارسطو یا افلاطون کی باتوں کو جانتے ہیں یا ان کا نام بھی جانتے ہیں۔ مگر کتنے ہیں جو مجنوں اور لیلیٰ کو جانتے ہیں اور کتنے ہیں جو ان کی نقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کوئی شہر یا قصبہ ایسا نہ ہوگا جہاں شاعر نہ ہوں اور یہ شاعر کون ہیں۔ لیلیٰ اور مجنوں کے شاگرد۔ اور ان میں سے ان شاعروں کو الگ کر کے جن کو خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں علیحدہ کر دیا ہے اور جو دین کی خدمت یا خدا تعالیٰ کو یاد کرنے کے لئے شعر لکھتے ہیں۔ باقی تمام وہی ہیں جو لیلیٰ مجنوں کی نقل کرنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ وہ لیلیٰ اور مجنوں نہیں ہوتے لیکن تم جس وقت ان کا کلام سنو گے تو ایسا معلوم ہوگا گویا انہوں نے کبھی کھانا ہی نہیں کھایا۔ کبھی تکیہ سے سر نہیں اٹھایا کہ ساری رات ان کی آنکھیں نہ کھلی رہی ہوں اور ان کی آنکھیں کبھی خشک نہیں ہوئیں۔ جگر اور دل ان کے جسم میں ہے ہی نہیں۔ مدتیں ہوئیں کچھ خون بن کر اور کچھ پانی بن کر بہہ چکا ہے اور وہ جیتا جاگتا وجود جو تمہارے سامنے بیٹھا ہوگا کئی دفعہ مرا اور دفن ہو چکا اور اس کے معشوق نے آکر اس کی قبر کو ٹھکرا دیا۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ وہ لیلیٰ اور مجنوں کو بھی عشق میں پیچھے چھوڑنا چاہتا ہے۔ تو جتنے دلوں پر عشق نے قبضہ کیا ہے عقل نے نہیں کیا۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف عقل کے میدان میں ہی اپنی برتری ثابت نہیں کی بلکہ جذبات کے میدان میں بھی وہ سب عاشقوں سے آگے بڑھ گیا حتّٰی کہ کوئی بھی عاشق عشق میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ خدا تعالیٰ کے عشق کو جانے دو کیونکہ وہ تمام لوگوں کی رسائی سے بالا ہوتا ہے۔ انسانی عشق کو لے لو۔ مجنوں کیا تھا ایک عورت کا عاشق تھا اس کا عشق باغرض تھا وہ اس سے متمتّع ہونا چاہتا تھا۔ اس کے حسن سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا مگر اس کے مقابلہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عشق جو دنیا سے تھا وہ کسی فائدہ کی غرض سے نہ تھا۔ تمتّع کے خیال سے نہ تھا اور پھر وہ ایک دو سے نہیں دوستوں اور پیاروں سے نہیں حسینوں سے نہیں بلکہ سب سے تھا اور بدصورتوں سے اَور بھی زیادہ تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ۔

اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) شاید تو اپنی جان کو ہلاک کر دے گا ان خوبصورتوں کے لئے نہیں جنہوں نے ابوبکرؓ اور عمرؓ کی طرح ایمان لا کر اپنے چہروں کو منور کر لیا تھا بلکہ ان بدصورت اور بھونڈی شکل کے لوگوں کے لئے جنہیں دیکھ کر گھن آتی تھی۔ جنہیں دیکھ کر روحانی شخص کو متلی ہونے لگتی تھی جیسے عتبہ اور شیبہ اور ابوجہل وغیرہ تو ان کے عشق میں مرا جاتا تھا کہ کیوں ان کو فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ مجنوں کا عشق اس کے مقابلہ میں کیا ہے۔ اس نے اس سے محبت کی جس کی شکل اسے پسند تھی۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عشق ان لوگوں سے بھی تھا جن کی روحانی شکل آپ کو ناپسند تھی۔ پھر اس کا عشق کسی ایک سے نہیں ساری دنیا سے وابستہ تھا۔ صرف اس زمانہ کے لوگوں سے ہی نہیں بلکہ آئندہ زمانوں سے بھی جیسا کہ فرمایا۔ وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ (الجمعة: ۴) یعنی محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) صرف اپنے زمانہ کے لوگوں کو ہی فائدہ پہنچانا نہیں چاہتا بلکہ ان لوگوں کے لئے بھی جو ابھی پیدا نہیں ہوئے اپنے دامن فیض کو ممتد کرنا چاہتا ہے۔ پس غور کرو جذباتی دنیا میں اس کا وجود کتنا عظیم الشان ہے۔ اس کے عشق کی انتہا ہی نہیں۔ وہ اپنے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کی آگ سلگاتا ہے۔ پھر اس سے آسمانوں کی طرف پرواز کرتا ہے اور اس کی روح خدا کے آستانہ پر گر جاتی ہے اور اس کی محبت اللہ تعالیٰ کی محبت سے چنگاری لیتی ہے گویا محدود محبت غیر محدود محبت کو کھینچتی ہے اور پھر دنیا میں آتی ہے اور بعینہٖ اسی طرح جس طرح مشرق سے نکل کر آفتاب کی شعاعیں روئے زمین پر پھیلنی شروع ہو جاتی ہیں اس کی محبت بھی پھیلتی ہے۔ مشرق و مغرب۔ گورے اور کالے۔ خوبصورت اور بدصورت سب کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔ پھر وہ مکان کی حد بندیوں کو توڑتی ہوئی نکل جاتی ہے اور صدیوں کے بعد صدیاں گذرتی ہیں مگر وہ محبت ختم نہیں ہوتی اور نہ ہوگی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا کی صف لپیٹ دے۔ اور بنی نوع انسان کو دنیا سے اٹھالے۔

یوں تو ہر نیک بندے پر محبت کے ایام کبھی کبھی آتے ہیں۔ حضرت نظام الدینؒ صاحب اولیاء کے متعلق ذکر آتا ہے کہ ایک دفعہ اپنے شاگردوں کے ساتھ جا رہے تھے کہ راستہ میں ایک خوبصورت لڑکا گذرا۔ آپ نے آگے بڑھ کر اس کا منہ چوم لیا۔ اس پر شاگردوں نے بھی ایسا ہی کرنا شروع کر دیا کہ شاید اس میں جلوۂ الٰہی ہو۔ ایک شاگرد جو آپ کے خاص منظور نظر تھے انہوں نے ایسا نہ کیا۔ باقیوں نے اس پر چہ مگوئیاں شروع کر دیں۔ آگے چلے تو ایک بھٹیاری بھٹی میں آگ جلا رہی تھی اور پتوں کی آگ کے شعلے نکل رہے تھے جو ایک خوبصورت نظارہ پیش کر رہے تھے۔ آپ کھڑے ہو کر اسے دیکھتے رہے پھر جھکے اور شعلے کو بوسہ دیا۔ اس وقت اس شاگرد نے بھی شعلہ کو چوما۔ جس نے لڑکے کو نہیں چوما تھا۔ لیکن باقی شاگرد کھڑے رہے اور کسی کو جرأت نہ ہوئی۔ اس پر انہوں نے کہا کہ تم لوگوں نے

خوبصورت بچے کو چوماتھا کیونکہ چھوٹا بچہ سب کو پیارا لگتا ہے۔ حالانکہ خواجہ صاحب ؒ کو اس میں خدا کا جلوہ نظر آیا تھا۔ اس لئے انہوں نے اسے چوما تھا۔ لیکن مجھے چونکہ نظر نہ آیا۔ اس لئے میں نے نہ چوما۔ اب اس آگ میں مجھے خدا کا جلوہ نظر آیا اور میں نے اسے چوم لیا اور یہاں آپ کی اتباع کی۔ لیکن وہاں میری آنکھیں نہ کھلیں اس لئے نہ کی۔ لیکن تم نے ہوا و ہوس کے ماتحت بچہ کو چوما تھا تو وقتی طور پر ہر بزرگ پر ایسا وقت آتا ہے کہ بنی نوع انسان کی محبت سے وہ لبریز ہو جاتا ہے مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت وقتی نہ تھی اور آپ کی روح اور جسم کا ایک حصہ تھی جس کا پتہ اس سے لگتا ہے کہ جب آپ کی وفات کا وقت آیا تو آپ کی زبان پر یہ الفاظ تھے۔ کہ لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَاءِهِمْ مَسَاجِدَ۔ (مسلم کتاب المساجد باب النھی عن بناء المسجد علی القبور) یعنی خدا یہود اور نصاریٰ پر لعنت کرے کہ انہوں نے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا۔ گویا آپ کے دل میں تڑپ تھی کہ یہود اور نصاریٰ کیوں اپنے لئے جہنم خرید رہے ہیں اور پھر اپنے ماننے والوں کو تنبیہ کی کہ وہ ایسا نہ کریں۔ گویا سکرات موت کے وقت بھی آپؐ کے اندر مسلمانوں اور کفار دونوں کی محبت کا جلوہ تھا۔ ایک طرف یہود اور نصاریٰ کو شرک سے بچانے کا درد تھا۔ دوسری طرف یہ درد تھا کہ یہی غلطی میرے ماننے والے بھی نہ کریں۔ غرض آپ کی ساری زندگی یہ ثابت کرتی ہے کہ آپ بنی نوع انسان کے ہر طبقہ کے لئے ہمدردی رکھتے تھے۔

احادیث میں آتا ہے کہ پہلے زمانوں میں خدا تعالیٰ کا دین قبول کرنے والوں کے سروں پر آرے رکھ کر انہیں چیر دیا جاتا تھا اور وہ اُف تک نہیں کرتے تھے۔ (بخاری کتاب المناقب باب علامات النبوۃ فی الاسلام)۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک سال نہیں دو سال نہیں تین سال نہیں دس سال نہیں متواتر وفات تک آرے چلتے رہے اور آپؐ نے اس قدر دکھ اٹھائے کہ زمین و آسمان کے خدا کو یہ کہنا پڑا کہ تو تو اس غم میں اپنے آپ کو ہلاک کر رہا ہے کہ یہ لوگ کیوں ایمان نہیں لاتے۔ عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح نے ایک دفعہ صلیب پر چڑھ کر سب گنہگاروں کا کفارہ ادا کر دیا تھا (رومیوں باب ۵ آیت ۲ تا ۸)۔ مگر مسیح کو تو ساری عمر میں صرف وہی ایک واقعہ پیش آیا۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی زندگی کے ہر لحہ میں لوگوں کے لئے صلیب پر چڑھے اور آپ نے ان کے لئے ہزاروں نہیں لاکھوں موتیں قبول کیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ الفاظ جو اس جگہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق استعمال کئے گئے ہیں نہ نوحؑ کے متعلق استعمال کئے گئے ہیں۔ نہ ابراہیمؑ کے متعلق استعمال کئے گئے ہیں۔ نہ موسیٰؑ کے متعلق استعمال کئے گئے ہیں۔ نہ داؤدؑ اور سلیمانؑ کے متعلق استعمال کئے گئے ہیں۔ نہ عیسیٰؑ کے متعلق استعمال کئے گئے ہیں۔ صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق استعمال کئے گئے ہیں۔ کیونکہ دنیا کی اصلاح اور ان کی

ہدایت کا جو غم آپ کو تھا وہ دنیا میں اَور کسی نبی کو نہیں تھا۔ چنانچہ جب ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے واقعات کو دیکھتے ہیں تو ہمیں یہ دعویٰ ایک حقیقت بن کر نظر آتا ہے اور ہمیں قدم قدم پر ایسے واقعات دکھائی دیتے ہیں جو آپ کی اس عظیم الشان محبت اور شفقت کا ثبوت ہیں جو آپ کو بنی نوع انسان سے تھی۔ چنانچہ آپ کو خدائے واحد کا پیغام پہنچانے کے لئے سالہا سال تک ایسی تکالیف میں سے گذرنا پڑا کہ جن کی کوئی حد ہی نہیں۔ ایک دفعہ خانہ کعبہ میں کفار نے آپؐ کے گلے میں پٹکا ڈال کر اتنا گھونٹا کہ آپؐ کی آنکھیں سرخ ہو کر باہر نکل پڑیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے سنا تو وہ دوڑے ہوئے آئے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس تکلیف کی حالت میں دیکھ کر آپ کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور آپ نے ان کفار کو ہٹاتے ہوئے کہا خدا کا خوف کرو۔ کیا تم ایک شخص پر اس لئے ظلم کر رہے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ خدا میرا رب ہے (بخاری کتاب المناقب مناقب ابی بکرؓ)۔ ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں ایک چٹان پر بیٹھے کچھ گہری فکر میں تھے کہ اچانک ابوجہل آنکلا۔ اور اس نے آتے ہی آپؐ کو تھپڑ مارا اور پھر گندی سے گندی گالیاں آپ کو دینی شروع کر دیں۔ آپؐ نے تھپڑ بھی کھالیا اور گالیاں بھی سنتے رہے مگر آپ نے زبان سے ایک لفظ تک نہیں کہا۔ جب وہ گالیاں دے کر چلا گیا تو آپ خاموشی سے اٹھے اور اپنے گھر تشریف لے گئے۔ حضرت حمزہؓ کی ایک لونڈی اپنے گھر میں سے دروازہ میں کھڑی یہ سارا نظارہ دیکھ رہی تھی۔ حمزہؓ اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے وہ سپاہی آدمی تھے اور سارا دن شکار میں لگے رہتے تھے اور شام کے وقت اپنے گھر آتے تھے اس روز بھی وہ شام کے وقت سینہ تان کر بڑے زور زور سے پیر مارتے اور ہاتھ میں تیر کمان پکڑے اونچی بنے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ وہ لونڈی گھر کی پرانی خادمہ تھی اور پرانے نوکر بھی رشتہ داروں کی طرح ہوتے ہیں۔ صبح سے وہ اپنا غصہ دبائے بیٹھی تھی جب اس نے حمزہؓ کو دیکھا تو بڑے جوش سے کہنے لگی۔ تمہیں شرم نہیں آتی تیر کمان لئے جانور مارتے پھرتے ہو۔ تمہیں پتہ ہے کہ صبح تمہارے بھتیجے کے ساتھ کیا ہوا؟ حمزہؓ نے کہا۔ کیا ہوا؟ اس نے کہا۔ میں دروازہ میں کھڑی تھی۔ تمہارا بھتیجا سامنے پتھر پر آرام سے بیٹھا تھا اور کچھ سوچ رہا تھا کہ اتنے میں ابوجہل آیا اور اس نے پہلے تو اس کو تھپڑ مارا۔ اور پھر بے تحاشہ گالیاں دینی شروع کر دیں۔ پھر اس نے اپنے زنانہ انداز میں کہا۔ اس نے ابوجہل کو کچھ بھی تو نہیں کہا تھا۔ کوئی بات اس نے نہیں کی تھی جس کی وجہ سے ابوجہل کو غصہ آتا۔ مگر پھر بھی وہ گالیاں دیتا گیا اور دیتا گیا۔ اور تمہارا بھتیجا چپ کر کے سامنے کی طرف دیکھتا رہا۔ اور اس نے ان کا کوئی جواب نہ دیا۔ ایک عورت اور پھر خادمہ کی زبان سے یہ بات سن کر حمزہؓ کی غیرت جوش میں آئی اور خانہ کعبہ کی طرف چل پڑے۔ رؤساء مکہ کا طریق تھا کہ شام کے وقت وہ خانہ کعبہ میں بیٹھ کر اپنی بڑائیاں بیان کرتے اور لوگ

ان کی تعریف کرتے ۔تمام رؤساء بیٹھے ہوئے تھے اور ابوجہل بھی ان میں موجود تھا کہ حمزہؓ گئے اور انہوں نے وہی کمان جوان کے ہاتھ میں تھی ۔ابوجہل کے منہ پر ماری اور کہا میں نے سنا ہے تم نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مارا بھی ہے اور گالیاں بھی دی ہیں اور میں نے سنا ہے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کوئی لفظ تم کو نہیں کہا تھا جس کے بدلہ میں تم گالیاں دیتے ۔پھر حمزہؓ نے کہا تم بہادر بنے پھرتے ہو۔اور جو چپ کر جاتا ہے اس پر ظلم اور تعدّی کرتے ہو۔اب میں نے سارے مکہ کے سامنے تمہیں مارا ہے اگر تم میں ہمت ہے تو مجھے مار کر دیکھو۔مکہ کے نوجوان حمزہؓ کو پکڑنے کے لئے اٹھے ۔مگر ابوجہل پر ان کا ایسا رعب طاری ہوا کہ اس نے کہا جانے دو۔صبح مجھ سے ہی کچھ زیادتی ہو گئی تھی۔ (السیرۃ الحلبیہ باب استخفائہ صلی اللہ علیہ وسلم و اصحابہ فی دار الارقم ......) ایک دفعہ آپ خانہ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے ۔جب آپ سجدہ میں گئے تو بعض شریروں نے آپؐ کی پیٹھ پر اونٹ کی اوجھری لا کر رکھ دی اور چونکہ وہ بڑی بھاری تھی آپ سجدہ سے سر نہ اٹھا سکے ۔حضرت فاطمہؓ کو اس بات کا علم ہوا تو وہ روتی ہوئی آئیں ۔اور انہوں نے آپؐ کی پیٹھ پر سے اوجھری ہٹائی (بخاری کتاب الوضوء باب اذاالقی علی ظهر المصلّی قذرا او جیفة لم تفسد علیه صلوته) ایک دفعہ آپؐ بازار سے گذر رہے تھے کہ مکہ کے اوباشوں کی ایک جماعت آپؐ کے گرد ہو گئی اور رستہ بھر آپ کی گردن پر یہ کہہ کر تھپڑ مارتی چلی گئی ۔کہ لوگو! یہ وہ شخص ہے جو کہتا ہے کہ میں نبی ہوں۔

آپؐ کے گھر میں اردگرد کے گھروں سے متواتر پتھر پھینکے جاتے تھے ۔باورچی خانہ میں گندی چیزیں پھینکی جاتی تھیں ۔جن میں بکریوں اور اونٹوں کی انتڑیاں بھی شامل ہوتی تھیں ۔(السیرۃ الحلبیۃ باب استخفائہ صلی اللہ علیہ وسلم و اصحابہ فی دار الارقم) جب آپ نماز پڑھتے تو آپؐ کے اوپر گرد و غبار ڈالی جاتی ۔حتّٰی کہ مجبور ہو کر آپؐ کو چٹان میں سے نکلے ہوئے ایک پتھر کے نیچے چھپ کر نماز پڑھنی پڑتی۔ (الطبری جلد ۲ صفحہ ۳۴۳) مگر اس کے باوجود آپ خدائے واحد کا نام بلند کرتے چلے گئے اور ان لوگوں کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعائیں بھی کرتے رہے۔

جب مکہ والوں نے دیکھا کہ ہمارے یہ مظالم بھی اس شخص کے پائے استقلال میں کوئی جنبش پیدا نہیں کر سکے تو انہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے تمام ساتھیوں کا کلّی طور پر مقاطعہ کر دیا۔اور انہیں شعب ابی طالب میں محصور کر دیا۔اور فیصلہ کیا کہ کوئی شخص ان کے پاس سودا فروخت نہ کرے اور نہ ان سے لین دین کرے اور برابر تین سال تک انہوں نے آپ کا مقاطعہ جاری رکھا ۔ان ایام میں صحابہؓ کو ایسی تکلیف سے اپنے دن بسر کرنے پڑے کہ بعض دفعہ وہ درختوں کے پتے کھا کر گزارہ کرتے تھے اور بعض دفعہ انہیں کھجور کی گٹھلیاں کھانی پڑیں اور یہ سلسلہ صرف چند دن یا چند ہفتے یا چند مہینے جاری نہیں رہا بلکہ تین سال تک جاری رہا۔تین سال کے بعد مکہ کے چند

شرفاء کے دل میں اس ظلم کے خلاف بغاوت پیدا ہوئی اور انہوں نے اس معاہدہ کو توڑ کر محصورین کو باہر نکال لیا۔مگر ان تین سالہ لمبے مظالم کا یہ نتیجہ نکلا کہ تھوڑے دنوں کے بعد ہی آپ کی وفا شعار بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہو گیا کیونکہ اس لمبے مقاطعہ نے ان کی صحت پر بُرا اثر ڈالا تھا۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ جس مقدس خاتون کے بیسیوں غلام تھے اور جو مکہ کے مالدار اشخاص میں سے تھیں جو بیسیوں گھرانوں کو کھانا کھلا کر خود کھانا کھایا کرتی تھیں۔ بڑھاپے میں جب انہیں کئی کئی فاقے کرنے پڑے اور اگر کچھ کھانے کو ملا بھی تو درختوں کے پتے یا کھجور کی گھٹلیاں تو اس وقت ان کی صحت پر کیا اثر پڑا ہوگا۔ چنانچہ اس تکلیف کی وجہ سے ان کا انتقال ہو گیا اور پھر چند دن اور گذرے کہ حضرت ابو طالب بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے (السیرۃ الحلبیۃ باب اجتماع المشرکین علی منابذۃ بنی ھاشم و باب الھجرۃ الثانیۃ الی الحبشۃ و باب ذکر وفات عمّہ ابی طالب و زوجتہ خدیجۃ ؓ) مگر اتنے لمبے ظلم کے باوجود آپؐ نے شعب ابی طالب سے اپنا قدم باہر رکھتے ہی فیصلہ کیا کہ اگر مکہ کے لوگ خدا تعالیٰ کی آواز سننے کے لئے تیار نہیں تو مکہ سے باہر رہنے والوں کو مجھے خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچانا چاہیے شاید ان میں کوئی سعید روح ہو جو اللہ تعالیٰ کی آواز پر لبیک کہے اور اُسے قبول کر کے اس کی برکات کی وارث ہو۔ چنانچہ آپ طائف تشریف لے گئے جو مکہ سے قریباً ساٹھ میل کے فاصلہ پر ایک مشہور شہر ہے اور لوگوں کو خدائے واحد کی طرف بلایا۔مگر بجائے اس کے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پیغام کو سنتے اور اُسے قبول کرتے انہوں نے لڑکوں کو اکسایا اور انہوں نے پتھروں سے اپنی جھولیاں بھر لیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ آپؐ کے پاؤں پتھروں کی بوچھاڑ سے لہولہان ہو گئے اور حضرت زیدؓ بھی جو آپ کے ساتھ تھے آپؐ کو بچاتے ہوئے سخت زخمی ہوئے۔مگر وہ برابر کئی میل تک آپ کو پتھر مارتے چلے گئے۔آپ واپس بھاگتے ہوئے کسی جگہ دم لینے کے لئے ٹھہرے تو جسمِ اطہر سے خون پونچھتے اور ساتھ ہی فرماتے۔اے میرے رب! یہ لوگ نہیں جانتے کہ میں کون ہوں تُو انہیں معاف فرما۔ راستہ میں مکہ کے ایک سردار کا باغ تھا۔آپ وہاں ذرا سستانے کے لئے ٹھہر گئے۔اُس نے جب آپؐ کے کپڑوں کو خون سے لت پت دیکھا تو اُس کے دل میں درد پیدا ہوا اور اُس نے اپنے ایک غلام کو بلایا اور اُسے انگور کے چند خوشے دیئے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت زیدؓ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ دو آدمی جو درخت کے نیچے بیٹھے ہیں اُن کے پاس جاؤ۔اور انہیں یہ انگور کھلاؤ۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت زخموں سے چُور چُور تھے اور بہت دیر تک دشمن کے آگے بھاگے آئے تھے۔لیکن اِدھر یہ غلام آپ کے پاس پہنچا اور اُدھر آپ نے اس غلام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔تم کہاں کے رہنے والے ہو۔اس نے جواب دیا۔میں نینوا کا رہنے والا ہوں۔آپ نے

فرمایا۔ اچھا! تم میرے بھائی یونسؑ کے وطن کے ہو۔ آپؐ کا یہ فقرہ سن کر اس غلام کے کان کھڑے ہو گئے کہ یہ عرب کا باشندہ ہونے کے باوجود نینوا کے رہنے والے یونسؑ کو اپنا بھائی تصور کرتا ہے۔ اس نے آپ سے پوچھا آپ کا کیا حال ہے اور لوگوں نے آپ سے ایسا سلوک کیوں کیا ہے؟ آپ نے فرمایا۔ تم تو یونسؑ کے ملک کے ہو تم جانتے ہو کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے جو مصلح دنیا میں آتے ہیں ان سے ایسا ہی سلوک کیا جاتا ہے۔ میں نے ان لوگوں کا کچھ نہیں بگاڑا۔ میں نے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ تم ایک خدا کی طرف آؤ اور بتوں کی پرستش نہ کرو۔ اور میں تمہیں بھی یہی بات کہتا ہوں کہ تم خدا تعالیٰ کی باتوں پر عمل کرو۔ وہ غلام عیسائی تھا۔ اسے آپ کی باتیں سن کر یقین ہو گیا کہ یہ شخص خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ چنانچہ جس طرح انجیل میں حضرت مسیحؑ کے متعلق آتا ہے کہ ایک عورت آپ کے پاس آئی اور اس نے آنسوؤں سے آپ کے پاؤں دھونے شروع کر دیئے اور بالوں سے آپ کے پاؤں کی مٹی کو صاف کیا (لوقا باب ۷ آیت ۳۸) اسی طرح وہ غلام بھی آپ کے قدموں میں گر گیا اور اس نے اپنے ہاتھوں سے آپ کے پاؤں کی مٹی اور خون صاف کرنا شروع کر دیا۔ اور محبت سے آپ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ جب وہ واپس گیا تو باغ کے مالک نے اسے ڈانٹا کہ تم نے یہ کیا کیا۔ مگر اس کا دل کھل چکا تھا۔ اور وہ آپؐ پر ایمان لا چکا تھا۔ اور اب کوئی مخالفت اسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی سے علیحدہ نہیں کر سکتی تھی (السیرۃ الحلبیۃ ذکر خروج النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی الطائف)۔

بنی نوع انسان کے لئے یہ کیسی عظیم الشان تڑپ ہے جو آپؐ کے سینہ و دل میں پائی جاتی تھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے پاس ایک عورت آئی اور اس نے کہا۔ اے استاد! مجھے بھی وہ تعلیم سنا جو تو اپنی قوم کو دیتا ہے۔ مگر انہوں نے کہا۔ میرے پاس تیرے لئے کچھ نہیں۔ یہ تعلیم صرف بنی اسرائیل کے لئے ہے جو میرے بیٹے ہیں۔ اور بیٹوں کی روٹی میں کتوں کے آگے کیسے پھینک سکتا ہوں (متی باب ۱۵ آیت ۲۲ تا ۲۶) مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا جو آپ کی قوم کا نہ تھا۔ ایسے وقت میں آیا جب آپ زخموں سے چور چُور تھے اور خون سے لت پت دور تک دشمن کے آگے آگے بھاگے چلے آئے تھے۔ اور ایک ایسی جگہ پر آیا جو آپ کے دشمن کی تھی۔ اور ذرا سی تبلیغ کرنے سے بھی ایک بڑی آفت آسکتی تھی۔ وہ آتا ہے اور خود بھی نہیں کہتا کہ مجھے تبلیغ کرو۔ مگر اسے دیکھتے ہی آپؐ تبلیغ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ کیونکہ آپؐ کے لئے عرب اور غیر عرب برابر تھے۔ آپؐ کے دکھ اور آپؐ کی تکالیف صرف عرب قوم کے لئے ہی نہیں تھیں۔ بلکہ کالے گورے۔ عربی، مصری، ہندوستانی سب کے لئے تھیں اور آپ اپنی ایک ایک حرکت میں اس بات کا احساس رکھتے تھے کہ لوگوں کو ہدایت میسر آجائے اور وہ خدائے واحد

کے آستانہ کی طرف لوٹ آئیں ۔آپ کا یہ سفر جو آپ کی قربانی اور ایثار کا ایک زندہ نمونہ ہے سر ولیم میور کو بھی متاثر کئے بغیر نہ رہ سکا۔اور اسے اپنی کتاب ’’لائف آف محمدؐ‘‘ میں یہ الفاظ لکھنے پر مجبور ہونا پڑا کہ

’’محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے طائف کے سفر میں ایک شاندار شجاعانہ رنگ پایا جاتا ہے۔اکیلا آدمی جس کی اپنی قوم نے اس کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا اور اسے دھتکار دیا خدا کے نام پر بہادری کے ساتھ نینوآ کے یوناہ نبی کی طرح ایک بت پرست شہر کو توبہ کی اور خدائی مشن کی دعوت دینے کے لئے نکلا۔یہ امر اس کے اس ایمان پر کہ وہ اپنے آپ کو کلّی طور پر خدا کی طرف سے سمجھتا تھا ایک بہت بڑی روشنی ڈالتا ہے۔‘‘ (Life of Muhammad pg.117)

سفر طائف سے واپسی پر مکہ والوں نے پھر ایذادہی اور استہزاء کے دروازے کھول دیئے ۔مگر آپ محبت اور پیار سے مکہ والوں کو بت پرستی کے خلاف وعظ کرتے رہے۔لوگ بھاگتے تو آپؐ ان کے پیچھے جاتے۔وہ منہ پھیرتے تو آپ پھر بھی باتیں سناتے۔آخر ان کے متواتر مظالم کی وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا وطن، وہ وطن جس میں تیرہ سال تک آپؐ تبلیغ ہدایت کرتے رہے تھے۔اور جس کے رہنے والوں کو آپ نے سب سے پہلے خطاب کیا تھا رات کے وقت چھوڑنا پڑا اور چھپتے چھپاتے آپ مدینہ پہنچے مگر دشمن نے وہاں بھی آپ کا پیچھا نہ چھوڑا اور متواتر مدینہ پر حملے ہوتے رہے۔ایک سو بیس کے قریب وہ لڑائیاں ہیں جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کو لڑنی پڑیں اور ان میں سینکڑوں صحابہؓ اور آپؐ کے عزیز ترین رشتہ دار مارے گئے۔مگر آپؐ نے خدائے واحد کا نام بلند کرنے کے سلسلہ میں کبھی کسی مصیبت کو ایک پرِ کاہ کے برابر بھی نہیں سمجھا۔آپ صبح بھی اور شام بھی اور دن کے اوقات میں بھی اور رات کی تاریکیوں میں بھی اللہ تعالیٰ کا پیغام لوگوں کو پہنچاتے چلے گئے اور اس بارہ میں نہ آپ نے جانی قربانی سے دریغ کیا۔نہ مالی قربانی سے دریغ کیا نہ جذبات اور احساسات کی قربانی سے دریغ کیا اور نہ عزیزوں اور رشتہ داروں کی قربانی سے دریغ کیا۔آپ کی دو بیٹیاں ابولہب کے دو بیٹوں سے بیاہی ہوئی تھیں اس نے دھمکی دی کہ اگر آپ توحید کی تعلیم ترک نہیں کریں گے تو میں اپنے بیٹوں سے کہہ کر آپؐ کی دونوں بیٹیوں کو طلاق دلوا دوں گا۔مگر آپؐ نے پروا نہ کی اور اس بدبخت نے اپنے بیٹوں سے کہہ کر آپ کی دونوں بیٹیوں کو طلاق دلوا دی۔ (اسد الغابۃ رقیۃ بنت رسول اللہؐ) پھر ہر خطرے کے مقام پر دشمن کا اولین نشانہ صرف آپؐ کا وجود ہوتا تھا۔مگر جب بھی کوئی موقعہ آیا آپ نے اس بہادری سے اس خطرے کی آگ میں اپنے آپ کو پھینکا کہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ آپؐ اپنی جان کی کوئی حقیقت ہی نہیں سمجھتے تھے۔غزوۂ اُحد کے موقعہ پر ایک پتھر آپؐ کے خود پر آلگا اور اس کے کیل آپؐ

کے سر میں گھس گئے اور آپؐ بے ہوش ہو کر ان صحابہؓ کی لاشوں پر جا پڑے جو آپؐ کے ارد گرد لڑتے ہوئے شہید ہو چکے تھے اور اس کے بعد کچھ اور صحابہؓ کی لاشیں آپؐ کے جسم اطہر پر جا گریں اور لوگوں نے یہ سمجھا کہ آپؐ مارے جا چکے ہیں۔ مگر جب آپؐ کو گڑھے سے نکالا گیا۔ اور آپؐ کو ہوش آیا تو آپؐ نے یہ خیال ہی نہ کیا کہ دشمن نے مجھے زخمی کیا ہے۔ میرے دانت توڑ دیئے ہیں اور میرے عزیزوں اور رشتہ داروں اور دوستوں کو شہید کر دیا ہے بلکہ آپ نے ہوش میں آتے ہی دعا کی کہ رَبِّ اغْفِرْ لِقَوْمِيْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (مسلم کتاب الجهاد باب غزوة احد)۔ اے میرے رب! یہ لوگ میرے مقام کو شناخت نہیں کر سکے اس لئے تو ان کو بخش دے اور ان کے گناہوں کو معاف فرما دے۔ اسی طرح طائف میں جب آپ کو پتھروں سے لہولہان کیا گیا اور آپ وہاں سے دوڑتے چلے آ رہے تھے تو احادیث میں لکھا ہے کہ یکدم آپ پر کشفی حالت طاری ہوئی اور پہاڑوں کا فرشتہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اس نے کہا کہ اگر آپ چاہیں تو طائف والوں پر ابھی ان کے پہلو کے دونوں پہاڑ اُلٹا دیئے جائیں۔ مگر آپ نے فرمایا۔ ایسا نہ کرنا۔ ان لوگوں نے جو کچھ کیا ہے جہالت اور لاعلمی کی وجہ سے کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ انہی لوگوں کی نسل میں سے وہ لوگ پیدا کرے گا جو اسلام کے خدمت گذار ہوں گے۔ (بخاری کتاب بدء الخلق باب اذا قال احد کم آمین....) چنانچہ واقعات بتاتے ہیں۔ کہ باوجود اس کے کہ دشمنوں نے آپ کو مجنون بھی کہا۔ کاہن بھی کہا۔ ساحر بھی کہا کذاب بھی کہا اور ہر رنگ میں انہوں نے آپ کے مشن کو مٹانا چاہا۔ مگر آخر انہی میں سے ایسی سعید روحیں نکل آئیں جنہوں نے دلیری سے صداقت کو قبول کر لیا اور اپنی جانوں کو ہتھیلی پر رکھ کر وہ دیوانہ وار اسلام کی اشاعت کے لئے نکل کھڑے ہوئے اور تھوڑے عرصہ میں ہی انہوں نے چہار دانگِ عالم کو اسلامی نور سے منور کر دیا۔

غرض لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بے مثال شفقت اور محبت کا ذکر کیا گیا ہے جو آپ کو بنی نوع انسان سے تھی اور بتایا گیا ہے کہ آپؐ ان کی ہدایت کے لئے رات اور دن اس قدر جدوجہد فرماتے اور اتنی دعائیں کرتے تھے کہ قریب تھا کہ آپ اس غم سے اپنے آپ کو ہلاک کر لیتے آپ کو نہ اپنے کھانے کی پرواہ تھی نہ پینے کی پرواہ تھی۔ نہ نیند اور آرام کی پرواہ تھی۔ آپ لوگوں کو ہلاکت کے گڑھوں سے بچانے اور انہیں نجات اور سلامتی کا راہ دکھانے کے لئے راتوں کو اٹھ اٹھ کر اللہ تعالیٰ کے حضور گریہ وزاری کرتے اور اتنی اتنی دیر کھڑے رہتے کہ آپ کے پاؤں متورم ہو جاتے (بخاری کتاب التهجد باب قیام النبی اللیل)۔ گویا جس طرح جوش کی حالت میں بعض دفعہ انسان بکرے پر چھری چلاتے ہوئے اس چھری کو گردن کے آخری

حصہ تک پہنچا دیتا ہے اور قریب ہوتا ہے کہ اگر ذرا سا بھی اور زور لگ جائے ۔ تو اس کی گردن کٹ کر پرے جا پڑے ۔ اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جان کو ہلاک کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی ۔ اور اگر آپ کی جان بچی تو اس کے یہ معنے نہیں کہ آپ نے کوئی کمی کی تھی بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی غیر معمولی حفاظت فرمائی ورنہ آپؐ نے اپنی جان کو ہلاک کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی ۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ امتیازی خصوصیت جو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمائی ہے اس میں مومنوں کے لئے بھی بڑا بھاری سبق ہے اور انہیں توجہ دلائی گئی ہے کہ اگر تم ترقی کرنا چاہتے ہو تو اپنی قربانیوں کو اس حد تک پہنچاؤ کہ دشمن کی نظر میں تو وہ صریح خودکشی ہو ۔ مگر تم جانتے ہو کہ وہ خودکشی نہیں بلکہ اسی میں تمہاری ابدی حیات کا راز مضمر ہے ۔ قرآن کریم میں جنگ اُحد کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس وقت منافق کہتے تھے کہ اگر ہمیں علم ہوتا کہ لڑائی ہوگی تو ہم ضرور ساتھ دیتے (آل عمران آیت ۱۶۸) اس کے یہ معنے نہیں کہ انہیں علم نہیں تھا کہ لڑائی ہوگی بلکہ بات یہ ہے کہ انہوں نے مشورہ دیا تھا کہ لڑائی کے لئے مدینہ سے باہر نہ نکلیں ۔ اور اس پر دو روز بحث ہوتی رہی ۔ پس منافق باہر نکل کر لڑنے کو خودکشی قرار دیتے تھے اور جب وہ یہ کہتے تھے کہ اگر ہمیں لڑائی کا علم ہوتا تو ہم ضرور جاتے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ ہم تو اسے لڑائی نہیں بلکہ خودکشی سمجھتے تھے ۔ اس لئے شامل نہ ہوئے ۔ تو اللہ تعالیٰ اپنی مومن جماعت کے سپرد ہمیشہ ایسے کام کرتا ہے جنہیں لوگ خودکشی سمجھتے ہیں ۔ ان جماعتوں سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی جانیں اپنے اموال اپنے اوقات اور اپنی عزت و آبرو غرض سب کچھ قربان کر دینے کا مطالبہ کیا جاتا ہے یہاں تک کہ لوگ کہنے لگ جاتے ہیں کہ یہ پاگل ہیں جو اتنی بڑی قربانیاں کر رہے ہیں اور منافق بھی کہتے ہیں کہ یہ بیوقوف لوگ ہیں جو ہمیں بھی بیوقوف بنانا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم بھی اسی طرح قربانی کرو جس طرح ہم کر رہے ہیں ۔ غرض منافق بھی اور مخالف بھی سب اسے ہلاکت سمجھتے ہیں مگر مومن جانتے ہیں کہ یہ ہلاکت نہیں بلکہ زندگی کو قائم رکھنے کا ذریعہ ہے ۔ پس لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ میں صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک بے مثال خصوصیت اور آپ کی شفقت علیٰ خلق اللہ کا ایک بے نظیر نمونہ ہی پیش نہیں کیا گیا بلکہ مومنوں کو یہ نصیحت بھی کی گئی ہے کہ اگر تم خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا چاہتے ہو تو اپنی قربانیوں کو اس حد تک پہنچا دو کہ دوست اور دشمن کی نگاہ میں تمہاری گردن کٹنے کے قریب پہنچ جائے اور ہر شخص یہ سمجھے کہ تم موت کے منہ میں جا رہے ہو ۔ یہی وہ مقام ہے جو روحانی جماعتوں کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کیونکہ اس کے بغیر انہیں ابدی حیات حاصل نہیں ہو سکتی ۔

اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَیْھِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰیَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُھُمْ

اگر ہم چاہیں تو آسمان سے ان پر ایک ایسا نشان اتار دیں کہ اس کے سامنے ان کی گردنیں

لَھَا خٰضِعِیْنَ ۝۵ وَمَا یَاْتِیْھِمْ مِّنْ ذِکْرٍ مِّنَ الرَّحْمٰنِ

جھکی کی جھکی رہ جائیں۔ اور رحمٰن کی طرف سے کبھی کوئی نیا ذکر نہیں آتا کہ جس سے لوگ اعراض نہ کرتے

مُحْدَثٍ اِلَّا کَانُوْا عَنْہُ مُعْرِضِیْنَ ۝۶ فَقَدْ کَذَّبُوْا

ہوں۔ سو (چونکہ) انہوں نے (خدا تعالیٰ کی آیتوں کو) جھٹلایا ہے اس کے نتیجہ میں ان کے استہزاء کی

فَسَیَاْتِیْھِمْ اَنْبٰٓؤُا مَا کَانُوْا بِہٖ یَسْتَھْزِءُوْنَ ۝۷

حقیقت ضرور ان پر کھل جائے گی۔

حلّ لُغات۔ اَعْنَاقٌ اَعْنَاقٌ عُنُقٌ کی جمع ہے اور اَلْعُنُقُ کے معنے گردن کے ہیں۔ اسی طرح اس کے معنے ہیں الرُّؤَسَآءُ سرداران قوم۔ اَلْجَمَاعَةُ مِنَ النَّاسِ لوگوں کی جماعت۔ (اقرب)

خَاضِعِیْنَ خَاضِعِیْنَ خَاضِعٌ کی جمع ہے جو خَضَعَ سے اسم فاعل ہے اور خَضَعَ لَہٗ کے معنے ہیں اِنْقَادَ مطیع ہو گیا۔ پس خَاضِعٌ کے معنے ہوں گے جھکنے والا، مطیع ہونے والا۔ (اقرب)

مُحْدَثٍ مُحْدَثٍ کے معنے ہیں نَقِیْضُ الْقَدِیْمِ یعنی نیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ فرماتا ہے۔ اگر ہم چاہیں تو آسمان سے ہم ان پر ایسا عذاب نازل کریں کہ جس کی وجہ سے مجبور ہو کر ان کی گردنیں جھک جائیں۔ اور یہ لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرنے لگ جائیں۔ لیکن اگر ہم ایسا کریں تو پھر ان کے ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا کیونکہ ایمان اسی حالت میں انسان کے لئے فائدہ بخش ثابت ہو سکتا ہے جب خیر اور شر دونوں مخفی ہوں۔ جو چیز کھلے طور پر نظر آ رہی ہو اس پر ایمان لانے سے کوئی انعام میسر نہیں آیا کرتا۔ جیسے سورج ایک خیر رکھنے والی چیز ہے اور اس کا وجود قطعی طور پر ظاہر ہے۔ لیکن سورج کے وجود کو تسلیم کر لینا انسان کو کسی انعام کا مستحق نہیں ٹھہرا سکتا۔ اور اگر کوئی کہے کہ جب تمہیں محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لانے سے انعام ملے گا تو ہمیں سورج پر ایمان لانے سے کیوں انعام نہیں مل سکتا۔ تو ہم اسے یہی کہیں گے

کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا علم چونکہ جستجو اور جدوجہد اور قربانی کے نتیجہ میں ہوتا ہے۔اس لئے آپ پر ایمان لانا انسان کو اللہ تعالیٰ کے روحانی انعامات کا مستحق بنا دیتا ہے مگر سورج پر ایمان لانے کے لئے چونکہ کسی جدوجہد جستجو اور قربانی کی ضرورت نہیں ہوتی اور اس کی حقیقت کلی طور پر ظاہر ہوتی ہے اس لئے اس پر ایمان لانے سے کوئی انعام نہیں مل سکتا اور اگر اس جواب پر بھی کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تو آپ کے ماننے والوں کو قربانیاں کرنی پڑیں جس کی وجہ سے وہ انعام کے مستحق ہوئے مگر آپؐ کے بعد والوں کو تو کوئی قربانی نہیں کرنی پڑتی اور پھر انہیں انعام کا مستحق کیوں قرار دیا جاتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک نسلی مسلمانوں کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے لئے کوئی قربانی نہیں کرنی پڑتی مگر انہیں اپنے ایمان کو قائم رکھنے کے لئے ہر وقت قربانی سے کام لینا پڑتا ہے۔کیونکہ اسلام کے ہر حکم کے بارہ میں ان کے دلوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم اس پر کیوں عمل کریں اور اس کیوں کے جواب کے لئے انہیں نماز اور روزہ اور حج اور زکوٰۃ کے تمام پہلوؤں پر غور کرنا پڑتا ہے اور پھر ان احکام پر عمل کرنے کے لئے انہیں ہر وقت قربانی اور جدوجہد کے دور میں سے گذرنا پڑتا ہے۔پس قربانیوں سے کوئی مسلمان بھی مستثنیٰ نہیں۔صحابہؓ نے ایمان لانے کے لئے قربانیاں کی تھیں اور بعد میں آنے والے مسلمانوں کو اپنے ایمان کو قائم رکھنے کے لئے قربانیاں کرنی پڑتی ہیں پس چونکہ روحانی انعامات کا حصول قربانیوں کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔اس لئے اللہ تعالیٰ کبھی ایسے نشانات ظاہر نہیں کرتا جو اتنے کھلے اور واضح ہوں کہ شدید سے شدید معاند بھی ان کو دیکھ کر سر جھکا دیں اور ایمان لانے کے لئے دوڑ پڑیں اور ان کے لئے انکار کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔کیونکہ اگر ایسا ہو تو پھر ان کا ایمان لانا ایک قسم کے جبر کا نتیجہ ہوگا اور اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا کہ لوگ کسی جبر کے نتیجہ میں ایمان قبول کریں اور اس طرح اپنے انعامات کو باطل کر دیں۔مگر افسوس ہے کہ اتنی واضح آیت کی موجودگی میں بھی مسلمانوں نے جبر اور قدر کے مسئلہ پر بحثیں شروع کر دیں اور یہ نظریہ قائم کر لیا کہ اللہ تعالیٰ بھی بعض باتوں میں جبر سے کام لیتا ہے۔چنانچہ آج بھی جب کسی مسلمان سے پوچھا جائے کہ تمہاری مشکلات کا کیا باعث ہے تو وہ ایک سرد آہ کھینچ کر کہہ دے گا کہ ''ہماری قسمت'' وہ یہ نہیں کہے گا کہ چونکہ ہمارے اندر بعض کمزوریاں پائی جاتی ہیں اور ہم نے قرآن کریم کی تعلیم پر عمل کرنا اور خدا تعالیٰ کے احکام کی پیروی کرنا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی ہدایات پر چلنا چھوڑ دیا ہے اس لئے ہم پر مصائب آرہے ہیں بلکہ وہ یہ کہہ کر کہ ''ہماری قسمت'' اس کی ساری ذمہ داری خدا تعالیٰ پر ڈال دے گا۔حالانکہ یہ آیت بتاتی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے جبر ہی کرنا ہوتا تو وہ نیکی اور ہدایت پر جبر کرتا اور ایسے نشانات نازل کرتا جن سے بڑے بڑے

کفار کی گردنیں جھک جاتیں اور وہ ایمان لانے پر مجبور ہو جاتے۔ مگر اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کرتا۔ وہ نشانات تو نازل کرتا ہے مگر ان میں ایک قسم کا اخفاء بھی رکھتا ہے تا کہ جو لوگ ایمان لائیں وہ اپنی اپنی کوشش اور جدوجہد کے مطابق اللہ تعالیٰ سے اجر پائیں۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں میں نشانات الٰہیہ کے متعلق ایسی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں کہ ایک دفعہ قادیان میں غیر احمدی مولویوں نے جلسہ کیا۔ اس جلسہ میں ایک غیر احمدی مولوی صاحب نے بڑے جوش کے ساتھ تقریر کی اور کہا۔ مرزا صاحب نبی بنے پھرتے ہیں۔ مرزا صاحب کے معجزے بھی کوئی معجزے ہیں۔ معجزہ تو یہ ہوتا ہے کہ سید عبدالقادر صاحب جیلانیؒ کے پاس کوئی شخص مرغ پکا کر لایا۔ آپ نے کھا کر اس سے کہا۔ تم نے مجھ پر احسان کیا ہے مگر ہم تمہیں بھی احسان کا بدلہ دینا چاہتے ہیں اور یہ کہہ کر انہوں نے مرغ کی ہڈیاں لیں اور ہاتھ میں پکڑ کر انہیں زور سے دبایا تو وہی مرغ کُڑ کُڑ کُڑ کُڑ کر کے اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔ اس قسم کے قصے مسلمانوں میں اس لئے آئے کہ انہوں نے معجزات کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کی سنت کو نظر انداز کر دیا۔ اور یہ نہ سمجھا کہ اگر ایسے معجزات ظاہر ہوں تو پھر کون شخص ہے جو کسی نبی کا انکار کر سکتا ہے اور اگر ایسے معجزات کے ظہور کے بعد کوئی شخص ایمان لاتا ہے تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس نے ایمان لا کر کوئی قربانی کی ہے اور وہ کسی انعام کا مستحق ہے۔ پس اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی ایسے نشانات نازل نہیں کرتا جو ایسے کھلے اور واضح ہوں کہ انہیں دیکھ کر کفار کی بھی گردنیں جھک جائیں اور وہ ایمان لے آئیں۔ کیونکہ اگر ایسا ہو تو یہ ایک قسم کا جبر ہو گیا اور اللہ تعالیٰ قبول ہدایت کے بارہ میں کسی قسم کا جبر روا نہیں رکھتا۔

پھر فرماتا ہے۔ وَمَا يَأْتِيهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ اِلَّا كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِيْنَ جب بھی رحمٰن خدا کی طرف سے کوئی نیا پیغام آیا ہے لوگوں نے ہمیشہ اس کا انکار کیا ہے۔ پھر یہ لوگ کس طرح اس پیغام کو قبول کر سکتے ہیں۔ اس جگہ خدائی پیغام کو ان معنوں میں نیا نہیں کہا گیا کہ ہر نبی کوئی نئی شریعت لاتا ہے بلکہ ان معنوں میں اسے نیا قرار دیا گیا ہے کہ وہ پیغام دنیا کی نگاہوں سے مخفی ہوتا ہے۔ دنیا اس کو بھول چکی ہوتی ہے اور وہ اس سے ایسی غافل اور بیگانہ ہوتی ہے کہ باوجود اس کے کہ وہ اس کی اپنی کھوئی ہوئی چیز ہوتی ہے پھر بھی وہ اسے ایک نئی چیز سمجھنے لگتی ہے اور اس سے ڈر کر دور بھاگنے لگتی ہے۔ انہی معنوں میں اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے مقام پر پہلی کتب الہامیہ کو بھی حدیث قرار دیا ہے اور قرآن کریم کی فضیلت ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے کہ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ (الزمر: ۲۴) یعنی اللہ تعالیٰ نے بڑی شان اور طاقت اور قوت کے ساتھ اس کتاب کو اتارا ہے جو احسن الحدیث ہے یعنی ساری الہامی کتابوں سے افضل ہے۔ پس ہر نبی جو دنیا میں ظاہر ہوا۔ وہ دنیا کے لئے ایک نیا پیغام لایا بعض انبیاء تو ان

معنوں میں نیا پیغام لائے کہ وہ ایک ہدایت جدیدہ لے کر آئے اور کثیر انبیاء ان معنوں میں نیا پیغام لائے کہ انہوں نے وہ پرانی شراب جس کا سرچشمہ الٰہی نور تھا نئے برتنوں میں لوگوں کے سامنے پیش کی۔ مگر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ خدا تعالیٰ کا کوئی پیغامبر آیا ہو اور دنیا نے اس کے پیغام سے اعراض نہ کیا ہو۔ یا اسے مختلف قسم کے مصائب اور آلام کا نشانہ نہ بنایا ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو ایسے رنگ میں چلایا ہے کہ عام طور پر یہ اس کے عام قواعد کے ماتحت کام کرتی رہتی ہے۔ اور بظاہر خدا کا ہاتھ اس کے کاموں میں نظر نہیں آتا۔ جب سے یہ کائنات پیدا ہوئی ہے اللہ تعالیٰ نے زمین کو ایک چکر دے دیا ہے اور یہ زمین سورج کے گرد اور چاند زمین کے گرد چکر کھا رہا ہے۔ اور پھر ساری کائنات شمسی مل کر ایک غیر معلوم جہت کی طرف چلی جا رہی ہے۔ بظاہر دیکھنے والا یہ خیال کرتا ہے کہ یہ اتفاقی حادثہ ہے اور اس دنیا کو پیدا کرنے والا اور چلانے والا کوئی نہیں۔ کیونکہ ایک قانون ہے جو چل رہا ہے۔ مثلاً ایک ایسا شخص جس نے گھڑی نہیں دیکھی اگر وہ ایسے گھر میں آ جائے۔ جہاں کوئی آدمی موجود نہ ہو اور ہفتہ بھر کی کنجی سے چلنے والی گھڑی چل رہی ہو تو وہ گھڑی کو دیکھ کر یہی سمجھے گا کہ یہ آپ ہی آپ چل رہی ہے۔ اسے چلانے والا کوئی نہیں۔ جب تک وہ وقت نہ آ جائے کہ جب گھڑی کو کنجی دی جاتی ہے یا جب تک وہ وقت نہ آ جائے کہ جب وہ گھڑی کھڑی ہو جائے۔ درمیانی عرصہ سے وہ یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ کسی اَور نے اس کو کنجی دی ہے۔ اور وہ چل رہی ہے۔ اسی طرح دنیا کو چلانے والے نے لاکھوں کروڑوں سال پہلے اس کو کنجی دے دی۔ اور یہ چل رہی ہے۔ جس طرح گھڑی کو دیکھ کر انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ آپ ہی آپ چل رہی ہے سوائے اس کے کہ وہ واقف ہو۔ اسی طرح دنیا کو دیکھ کر ایک ناواقف انسان یہ سمجھتا ہے کہ یہ آپ ہی چل رہی ہے۔ لیکن اس قانون کے علاوہ کبھی کبھی خدا تعالیٰ اپنی خدائی ثابت کرنے کے لئے بعض خاص باتیں بھی ظاہر کیا کرتا ہے جن سے پتہ لگ جاتا ہے کہ اس دنیا کا ایک خالق اور مالک ہے۔ جیسے گھڑی چل رہی ہو تو ایک ناواقف آدمی تو یہ سمجھے گا کہ یہ آپ ہی چل رہی ہے کسی اَور کا اس پر تصرف نہیں۔ لیکن مالک آتا ہے۔ اسے چابی دیتا ہے اور پھر اسے رکھ دیتا ہے۔ تو اس کو دیکھ کر وہ سمجھ لیتا ہے کہ یہ گھڑی کسی اَور کے ذریعہ چل رہی ہے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کبھی کبھی اپنی خاص صفات کے ذریعہ اپنے وجود کو ظاہر کرتا ہے۔ اور اس کی صفات کا یہ ظہور اس کے رسولوں اور مصلحین کے ذریعہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ صاف بات ہے کہ جب خدا اس دنیا میں دخل دے گا۔ تو اس کی کوئی وجہ ہو گی اور وہ وجہ یہی ہوتی ہے کہ لوگ خدا تعالیٰ سے دور چلے جاتے ہیں۔ وہ اس کو بھلا بیٹھتے ہیں۔ اور اس کے احکام پر ہنسی اڑاتے ہیں اس وقت خدا تعالیٰ ان کو یاد دلانے کے لئے اپنا کوئی مامور اور مرسل بھیجتا ہے۔ جب وہ مامور اور مرسل دنیا میں آتا ہے تو وہ زمانہ وہی ہوتا ہے۔

جب لوگ خدا تعالیٰ کو بھول چکے ہوتے ہیں۔ اور جو شخص کسی چیز کو بھول چکا ہو اس کو اس کی طرف توجہ دلانا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس نے بھول کر کوئی اور راستہ اختیار کیا ہوا ہوتا ہے اور یہ آنے والا اس کے روزمرہ اور معمول کے راستہ سے ہٹا کر اسے دوسری طرف لے جانا چاہتا ہے۔ اور جو شخص کسی چیز کا عادی ہو چکا ہو اس سے ہٹانے والا دوست نہیں بلکہ دشمن سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً ہمارے ملک میں بعض عادتیں راسخ ہو چکی ہیں۔ ہندوستان کی عورتیں پان کھاتی ہیں۔ اب پان کا زندگی کے کسی شعبہ سے تعلق نہیں۔ پان کے ذریعہ علم حاصل نہیں ہوتا۔ پان کے ذریعہ روپیہ حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن باوجود اس کے اگر کوئی کہے کہ پان چھوڑ دو تو وہ اسے ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں گی اور اصرار کریں گی کہ ہم پان کو نہیں چھوڑ سکتیں۔ بلکہ پان تو الگ رہا چھوٹی سے چھوٹی رسم کو بھی اگر چھڑانے کی کوشش کی جائے تو لوگ مخالفت کرتے ہیں۔ مثلاً گاؤں کی عورتیں اپنے سر کو گھی لگاتی ہیں شہر کی عورتیں سر میں تیل لگاتی ہیں۔ یورپ کی عورتیں تیل بھی پسند نہیں کرتیں وہ ایک قسم کا لوشن استعمال کرتی ہیں۔ اب سر کو گھی لگانا زندگی کا کوئی جزو نہیں۔ اگر زندگی کا جزو ہوتا تو تیل سے کس طرح گذارہ ہو جاتا۔ اگر تیل زندگی کا جزو ہوتا تو خالی لوشن سے کس طرح گذارہ ہو جاتا۔ دنیا کے ایک حصے کا تیل چھوڑ دینا اور دوسرے حصہ کا گھی چھوڑ دینا اور تیسرے حصہ کا تیل اور گھی دونوں کو چھوڑ دینا بتاتا ہے کہ ان چیزوں کو انسان چھوڑ سکتا ہے۔ لیکن باوجود غیر ضروری چیزیں ہونے کے اگر تم گاؤں کی عورتوں سے گھی چھڑوانا چاہو تو تمہیں سالہا سال لگ جائیں گے۔ وہ کہیں گی کہ اگر ہم گھی لگانا چھوڑ دیں تو ہمیں سر درد ہو جاتا ہے۔ زکام ہو جاتا ہے اور وہ تمہاری مخالفت کریں گی اور سمجھیں گی کہ تم ان کے راستہ میں روک بن رہے ہو۔ غرض چھوٹی سے چھوٹی عادت کا چھڑانا بھی آسان کام نہیں ہوتا۔ لیکن خدا تعالیٰ کی طرف سے آنے والا مصلح تو ساری دنیا کو پلٹ دینے کے لئے آتا ہے۔ وہ ان کے طور طریق سے انہیں باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر اس کی کس طرح مخالفت نہ ہو۔ چنانچہ جب بھی کوئی مصلح آتا ہے لوگ اس کی باتوں پر ہنسی اڑاتے ہیں۔ مذاق کرتے ہیں۔ اسے مارتے پیٹتے ہیں۔ اس کے ساتھیوں کو مارتے پیٹتے ہیں۔ اور یہ چیز برابر اور متواتر چلتی چلی جاتی ہے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو مکہ والے اس وقت کئی کئی معبود مانتے تھے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہنا شروع کیا کہ اللہ ایک ہے تو قرآن کریم میں لکھا ہے کہ مکہ والوں کو یہ عجیب بات معلوم ہوئی اور انہوں نے اس پر ہنسی اڑانی شروع کر دی۔ وہ ایک دوسرے سے ملتے تو کہتے۔ بتاؤ لات خدا ہے یا نہیں۔ وہ کہتا۔ کیوں نہیں۔ پھر وہ کہتا۔ اچھا مناۃ خدا ہے یا نہیں۔ وہ کہتا۔ یقیناً ہے۔ پھر وہ کہتا۔ اچھا عزّٰی خدا ہے یا نہیں۔ وہ کہتا۔ ضرور ہے۔ اس پر وہ ایک عجیب انداز میں قہقہہ مار کر کہتا کہ تم نے سنا یہ شخص کیا کہتا ہے۔ اس نے اتنے خداؤں کو ایک

خدا بنا دیا ہے۔ وہ یہ خیال کرتے تھے کہ جس طرح عورتیں چٹنی بناتی ہیں۔ تو کچھ نمک لیتی ہیں۔ کچھ مرچیں لیتی ہیں۔ کچھ پودینہ لیتی ہیں اوران سب کو پیس کر چٹنی بنا لیتی ہیں۔ اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لات، مناۃ، عزّیٰ وغیرہ کو کوٹ پیس کر ایک خدا بنا دیا ہے۔ قرآن کریم میں لکھا ہے کہ وہ تعجب سے یہ کہا کرتے تھے کہ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا (ص:۶) یعنی ہمارے بہت سے جو خدا تھے ان کو توڑ مروڑ کر اس نے ایک خدا بنا دیا ہے۔ یہ خیال کہ یہ خدا ہیں ہی نہیں ان کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔ جب ان کے سامنے کوئی شخص کہتا کہ ایک خدا ہے تو وہ سمجھتے تھے کہ ایک خدا کے معنے یہ ہیں کہ اس نے سارے خداؤں کو کوٹ کر ایک چٹنی سی بنا دی ہے اور جب وہ اس بات کو پیش کرتے تو سارے لوگ ہنس پڑتے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پاگل سمجھتے۔ لیکن اب اگر یہی بات کسی مسلمان کے سامنے بیان کرو تو وہ بھی ہنس پڑے گا کیونکہ اب اسے ایک خدا پر یقین پیدا ہو چکا ہے۔ اور اس کا یہ خیال پختہ ہو گیا ہے۔ تو جس جس زمانہ میں بھی اللہ تعالیٰ کے انبیاء کی طرف سے کوئی بات پیش کی جاتی ہے چونکہ لوگ اس کے عادی نہیں ہوتے اس لئے وہ اس کی مخالفت کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام آئے تو آپ کے خلاف دھوکا اور فریب سے کام لیا گیا۔ اور آخر آپ کو انہوں نے اس مقام سے نکلنے پر مجبور کر دیا جو ان کا مولد و مسکن تھا اور جس میں وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کی ہدایت کے لئے مبعوث کئے گئے تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام آئے تو انہیں بھی مختلف رنگ میں اذیتیں پہنچائی گئیں۔ اور انہیں بھی اپنے ملک سے ہجرت کرنی پڑی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام آئے۔ تو آپ کو آگ میں ڈالا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام آئے تو آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو ایک لمبے عرصہ تک فرعون کے مظالم کا تختۂ مشق بننا پڑا۔ اور جیسا کہ حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل میں سے بعض کے سروں پر آرے رکھ کر ان کو چیر دیا گیا۔ حضرت مسیح علیہ السلام آئے تو دشمنوں نے آپ کو صلیب پر لٹکا دیا اور آپ کے خلفاء اور حواریوں میں سے بھی بعض کو قتل کیا اور بعض کو صلیب پر لٹکایا۔ پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ آیا تو آپ کو بھی شدید سے شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کئی صحابہؓ قتل کئے گئے۔ بعض کا مثلہ کیا گیا بعض کو اس طرح شہید کیا گیا کہ دو اونٹوں سے ان کی دو ٹانگیں باندھ کر ان اونٹوں کو مختلف جہات میں دوڑایا گیا۔ اور اس طرح ان کو چیر کر دو ٹکڑے کر دیا گیا۔ بعض صحابہؓ کو تپتی ریت پر لٹایا گیا۔ بعض کو سخت پتھروں والی زمین پر گھسیٹا گیا۔ بعض کے سینوں پر جوتیوں سمیت ناچا گیا۔ عورتوں کی شرمگاہوں میں نیزے مار مار کر ان کو مارا گیا۔ (بخاری کتاب التفسیر باب قوله تعالى اطلع الغيب ، اسد الغابة : حمزة و خباب بن الارت ، اسد الغابة تحت بلال بن رباح وعمار بن یاسر و خباب بن الارت ، السيرة النبوية لابن هشام ذكر عدوان

المشرکین علی المستضعفین ،الکامل فی التاریخ لابن اثیر ذکر تعذیب المسلمین) غرض وہ تمام قسم کی مصیبتیں اوراذیتیں جومختلف انبیاء کے زمانہ میں ان کے دشمنوں نے ان کو دیں وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جمع ہوگئیں۔اورآپ کے پیغام کوقبول کرنے سے اعراض اختیار کرلیا گیا۔یہی حال حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت پر بھی ہوا۔اورآپ کو ہررنگ میں کچلنے اورنابود کرنے کی کوشش کی گئی ۔کیونکہ آپ دنیا کی طرف جو پیغام لائے وہ ان کےفرسودہ خیالات کے منافی تھا۔اوران کے اندرایک نیا تغیر پیدا کرنے والا تھا۔بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے جب دعویٰ کیا تواس وقت لوگوں میں یہ احساس تھا کہ مسیح ناصریؑ دوبارہ دنیا میں آئیں گےاوروہ غیر مسلموں کے سب اموال لوٹ کر مسلمانوں کے حوالے کردیں گے۔لیکن حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے آتے ہی اعلان فرمادیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہوگئے ہیں۔اب بظاہر یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ہرشخص جو دنیا میں پیدا ہوتا ہے وہ ایک دن مرتا ہے۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اسی طرح آئے اورفوت ہوگئے۔لیکن مسلمانوں نے اپنے دلوں میں مسیحؑ کی آمد ثانی کے متعلق جوتصورات قائم کررکھے تھے ان کواس تعلیم سے شدید صدمہ پہنچا۔اورانہوں نے کہا۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ عیسائیوں کوکوئی نہیں مارے گا۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہندوؤں کو کوئی نہیں مارے گا۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ سکھوں کوکوئی نہیں مارے گا۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسلمان ویسے ہی کمزور رہیں گے جیسے پہلے تھے۔سوائے اس کے کہ وہ اپنے زور سے آگے نکلنے کی کوشش کریں۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ یورپ اورامریکہ کی دولت مسلمانوں میں تقسیم نہیں ہوگی۔غرض اس تعلیم سے حضرت مسیحؑ پر ہی موت نہ آئی بلکہ خود مسلمان بھی زندہ درگور ہوگئے۔وہ لوگ جو پہلے گھروں میں بیٹھے دولتوں کے منتظر تھے سمجھتے تھے کہ امریکہ کے پریزیڈنٹ کا سارا مال فلاں کومل جائے گا اورراک فیلر کا مال فلاں کومل جائے گا ان کی توساری امیدیں ختم ہوگئیں اوروہ گویا جیتے جی مرگئے۔ اب بظاہر یہ ایک چھوٹی سے چیز نظر آتی ہے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نے قوم کے خیالات کواتنا دھکا دیا کہ جس کا صدمہ مسلمانوں سے برداشت نہ ہوسکا اوروہ مخالفت کے لئے کھڑے ہوگئے۔پہلے جب مسلمانوں سے کہا جاتا تھا کہ کام کروتووہ کہتے تھے ہم نے کام کرکے کیا لینا ہے۔مسیح جب آئے گا تووہ کافروں کا مال لوٹ کر ہمارے گھروں میں ڈال دے گا۔حضرت مرزا صاحبؑ کے آنے سے ان کی سب امیدوں پر پانی پھر گیا کیونکہ حضرت مرزا صاحبؑ نے آکر ان سے یہ کہا کہ جوکچھ کرنا ہےتم نے کرنا ہے۔تم نے ہی لڑنا ہے۔تم نے ہی مرنا ہےاورتم نے ہی اپنی ترقی کے لئے آپ جدوجہد کرنی ہے۔گویا جوچیز انہیں پہلے بیٹھے بٹھائے حاصل ہونے کی توقع تھی اس کے متعلق انہیں محنت اورقربانی اورجدوجہد کا راستہ دکھایا گیا اورانہیں بتایا گیا کہ تم غلط خیالات میں مبتلا ہوکراپنی قیمتی زندگی کوضائع

کررہے ہو۔اس پر ان کا غصہ میں مبتلا ہونا اوران کا حضرت مرزا صاحبؑ کی مخالفت کے لئے کھڑا ہوجانا ایک بالکل طبعی بات تھی ۔ یہ ایسی ہی بات تھی جیسے کوئی شخص کسی دوسرے کو کہہ دے کہ آج تمہارے گھر کے تمام افراد کا کھانا ہمارے ہاں ہے لیکن جب کھانے کا وقت آئے تو اسے پتہ لگے کہ اسے دھوکا دیا گیا ہے کھانا وغیرہ کسی نے تیار نہیں کیا اب ایسے موقعہ پر اگر وہ غصہ میں نہ آئے تو کیا کرے کیونکہ اسے بھوک لگی ہوئی ہوگی ۔ بچے رو رہے ہوں گے اور ادھر یہ حالت ہوگی کہ ابھی گھر میں آٹا گوندھا جا رہا ہوگا ۔ آگ جلائی جارہی ہوگی ۔ اور سب کہہ رہے ہوں گے کہ یہ کیا مصیبت آگئی ۔ اب کھانا کب تیار ہوگا ۔ اور کب کھائیں گے ۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے آنے سے درحقیقت ایسا ہی ہوا ۔ مسلمانوں کو کہا گیا تھا کہ تمہاری خدا تعالیٰ کی طرف سے دعوت ہے ۔ تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ۔ آسمان سے مسیحؑ آئے گا اور وہ دنیا کی دولتیں لوٹ کر تمہارے گھروں میں بھر دے گا اور وہ اطمینان اور آرام کے ساتھ بیٹھے تھے ۔ سمجھتے تھے کہ نہ ہمیں لکھنے پڑھنے کی ضرورت ہے ۔ نہ روپیہ کمانے کی ضرورت ہے نہ کسی جدوجہد اور قربانی کی ضرورت ہے ۔ مسیح آئے گا اور ہم اس کے آتے ہی بامِ عروج پر جا پہنچیں گے ۔ اس عقیدہ کے نتیجہ میں جب وہ علم سے محروم ہوگئے ۔ ترقیات سے محروم ہوگئے ۔ عزت سے محروم ہوگئے ۔ شہرت سے محروم ہوگئے ۔ پستی اور ذلت اور نکبت ان پر پوری طرح چھا گئی تو حضرت مرزا صاحبؑ نے آکر کہا کہ جو کچھ بنے گا اپنے کام سے بنے گا ۔ کسی دوسرے پر امید رکھنا بالکل غلط ہے ۔ تم کو ایک وقت کی روٹی نہ ملنے سے جتنا صدمہ پہنچتا ہے اس سے کتنا زیادہ صدمہ ان لوگوں کو ہوا ہوگا ۔ تم تصور تو کرو کہ اگر کوئی تم سے مذاق کرے کہ رات کو تمہارا ہمارے ہاں کھانا ہوگا اور عین وقت پر جب تمہارے بچے بھوک سے بلبلا رہے ہوں ۔ تمہیں معلوم ہو کہ تمہارے ساتھ مذاق کیا گیا ہے اور اس وقت تمہیں کھانا پکانے کی فکر ہو تو جتنا غصہ تمہارے دل میں اس وقت پیدا ہوسکتا ہے اس سے لاکھوں گنا زیادہ غصہ مسلمانوں کو پیدا ہوا کیونکہ ان کا اور ان کی نسلوں کا انحصار ہی اس لوٹ پر تھا جو مسیح نے کرنی تھی ۔ پھر ایک چیز نہیں بیسیوں چیزیں ہیں جو مسلمانوں میں جھگڑے کا باعث بنی ہوئی تھیں ۔ کہیں رفع یدین پر جھگڑا تھا ۔ کہیں آمین بالجہر کہنے پر جھگڑا تھا ۔ کہیں تشہد میں انگلی اٹھانے یا نہ اٹھانے پر جھگڑا تھا ۔ کہیں نماز میں ہاتھ سینے پر باندھنے یا ناف کے نیچے باندھنے پر جھگڑا تھا ۔ حضرت مرزا صاحبؑ نے ان تمام جھگڑوں کو ختم کردیا اور کہا کہ ان باتوں پر لڑنا جھگڑنا فضول ہے ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی قوم کو جوش دلانے کے لئے آمین اونچی بھی کہی ہے اور کبھی نیچی بھی کہی ہے ۔ کبھی فوجی روح قائم کرنے کے لئے آپؐ نے اپنے ہاتھ سینہ پر باندھے اور کبھی انکسار اور تذلل کی حالت میں آپؐ نے ناف کے نیچے بھی باندھ لئے ۔ کبھی تشہد کے وقت آپ نے انگلی اٹھائی اور کبھی نہیں اٹھائی ۔ تشہد میں انگلی

اٹھانے کے یہ معنے ہیں کہ انسان اپنے ہاتھ سے بھی اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ خدا ایک ہے۔ مگر یہ دونوں طرح جائز ہے۔ خواہ کوئی انگلی اٹھائے یا نہ اٹھائے اس کی نماز میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بعض عربوں کو دیکھ کر کہ ابھی ان میں پوری طرح توحید نہیں آئی تشہد میں انگلی اٹھانے کا حکم دے دیا۔ مگر بعض دفعہ آپؐ نے انگلی نہیں بھی اٹھائی۔ جو شخص توحید کے عقیدہ پر پختگی کے ساتھ قائم ہو گیا ہے اگر وہ انگلی نہ اٹھائے تب بھی کوئی حرج نہیں۔ مگر اس مسئلہ پر اتنا زور دیا گیا کہ بعض لوگوں کی محض اس وجہ سے انگلیاں توڑ دی گئیں کہ انہوں نے تشہد میں انگلی کیوں اٹھائی ہے۔ پھر قرآن کے متعلق مسلمانوں میں یہ غلط خیال قائم تھا کہ اس کی کئی آیات منسوخ ہیں۔ لیکن حضرت مرزا صاحبؑ نے آکر کہہ دیا کہ قرآن کریم کی ایک آیت بھی منسوخ نہیں۔ بِسۡمِ اللّٰہِ سے لے کر وَالنَّاسِ کے س تک ایک ایک حرف اور ایک ایک زبر اور ایک ایک زیر قابلِ عمل ہے۔ اب بجائے اس کے کہ مسلمان شکر گذار ہوتے کہ آپؑ نے ایک اعلیٰ درجہ کی تعلیم ہمارے سامنے پیش کی ہے جو قرآنی حسن کو نمایاں کرنے والی ہے۔ چونکہ یہ تعلیم ان کے خیالات کے خلاف تھی انہوں نے آپ کی مخالفت شروع کر دی اور علماء نے ہندوستان کے ایک سرے سے لیکر اس کے دوسرے سرے تک آپؑ کے خلاف ایک طوفان بے تمیزی برپا کر دیا اور آپ کو کافر اور مرتد اور زندیق اور واجب القتل قرار دیا گیا۔

(اشاعۃ السنۃ جلد ۱۴ نمبر ۱ صفحہ ۵، جلد ۱۴ نمبر ۱۰ صفحہ ۲۹۸ و جلد ۱۵ نمبر ۷ صفحہ ۱۴۱)

غرض تاریخ کا ہر دور وَ مَا یَاۡتِیۡہِمۡ مِّنۡ ذِکۡرٍ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ مُحۡدَثٍ اِلَّا کَانُوۡا عَنۡہُ مُعۡرِضِیۡنَ کی سچائی پر شہادت دے رہا ہے۔ جب کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی پیغامبر قوم کی زندگی کا پیغام لے کر آیا ہمیشہ اس پر ہنسی اڑائی گئی۔ اسے تباہ کرنے کی کوشش کی گئی اور اس کے پیغام سے اعراض کیا گیا۔ اس جگہ بھی اللہ تعالیٰ اسی اعراض کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے فَقَدۡ کَذَّبُوۡا فَسَیَاۡتِیۡہِمۡ اَنۡۢبٰٓؤُا مَا کَانُوۡا بِہٖ یَسۡتَہۡزِءُوۡنَ چونکہ یہ لوگ صداقت کو جھٹلا چکے ہیں اس لئے اب عنقریب ان کے پاس ان امور کے متعلق جن پر یہ ہنسی اڑایا کرتے تھے ہماری عظیم الشان خبریں پوری ہو کر آجائیں گی۔ اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیسی خطرناک چیز ہے۔ اس جگہ سزاؤں کو خبریں اس لئے کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ فرقان کے آخر میں کفار کو تنبیہ کی تھی کہ اگر تم خدا تعالیٰ کے حضور دعا اور گریہ وزاری سے کام نہیں لو گے تو خدا تعالیٰ تمہاری کوئی پرواہ نہیں کرے گا جس کے معنے یہ تھے کہ اگر وہ توبہ نہیں کریں گے تو ان پر عذاب نازل ہوگا اور وہ تباہ کر دیئے جائیں گے۔ پس چونکہ سورۂ فرقان کے آخر میں انہیں عذاب کی خبر دی گئی تھی جس پر کفار نے ہنسی اڑائی اور انہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام سے اعراض

کیا۔اس لئے اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ جن امور پر یہ لوگ ہنسی اڑاتے رہے ہیں ان کے متعلق اب ہماری خبریں ان کے سامنے پوری ہوکر آجائیں گی۔اور انہیں معلوم ہوجائے گا کہ ہمارے رسول نے جو کچھ کہا تھا۔سچ کہا تھا۔نَبَأٌ کے متعلق علامہ ابوالبقاء نے اپنی کتاب کلیات میں لکھا ہے کہ یہ لفظ قرآن کریم میں ہمیشہ ایسے امور کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو بہت بڑی عظمت اور شان رکھنے والے ہوں (کلیات ابی البقاء فصل النون)۔اور چونکہ اسلام کے غلبہ سے بڑی اور عظیم الشان خبر اور کوئی نہیں ہوسکتی۔اس لئے اس جگہ انباء میں انہی خبروں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو کفر کی تباہی اور اسلام کے غلبہ کے متعلق قرآن کریم میں دی گئی تھیں۔اور جن پر کفار نے اپنی طاقت اور قوت کے گھمنڈ میں ہنسی اڑائی۔مگر تھوڑے دنوں کے بعد ہی انہوں نے دیکھا کہ وہی غلام جن کو وہ گلیوں میں گھسیٹا کرتے تھے اور جن کے سینوں پر بڑے بڑے پتھر رکھ کر انہیں لات اور مناۃ کی پرستش کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا گھوڑے دوڑاتے اور فتح وظفر کا پرچم لہراتے ہوئے مکہ میں داخل ہوئے۔اور مکہ کے بڑے بڑے صنادید کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہ رہا۔کہ وہ اپنے گھروں میں چھپ کر بیٹھ رہیں یا مکہ کو چھوڑ کر بھاگ جائیں۔غرض وہ خبریں جو ان کی تباہی کے متعلق دی گئی تھیں پوری ہوئیں۔اور اسلام عرب کے کونہ کونہ میں پھیل گیا۔اور اب خدا کے فضل سے وہ دنیا کے کونہ کونہ میں پھیل چکا ہے۔اور ابھی آئندہ زمانہ میں اور بھی پھیلے گا۔

اَوَ لَمْ يَرَوْا اِلَى الْاَرْضِ كَمْ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ

کیا وہ زمین کو نہیں دیکھتے کہ ہم نے اس میں قسم قسم کے عمدہ جوڑے بنائے ہیں

كَرِيْمٍ ﴿۸﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ

اس میں ایک بڑا نشان ہے مگر ان میں سے اکثر ایمان نہیں لاتے۔اور تیرا رب ہی

مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰﴾ ع

یقیناً غالب (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔

حلّ لُغَات۔زَوْجٌ زَوْجٌ کے معنے ہیں كُلُّ وَاحِدٍ مَعَهٗ اٰخَرُ مِنْ جِنْسِهٖ۔ہر وہ چیز جس کے ساتھ اس کی جنس میں سے ایک اَور وجود بھی ہو۔اَلصِّنْفُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ۔ہر چیز کی ایک ایک قسم۔(اقرب)

تفسیر ۔فرماتا ہے۔کیا انہوں نے کبھی غور نہیں کیا۔کہ زمین میں ہم نے کس طرح قسم قسم کی اعلیٰ ترکاریاں اور پھل وغیرہ پیدا کئے ہیں اگر وہ اس پر غور کرتے تو ان کو معلوم ہوجاتا کہ دین کے معاملہ میں بھی خدا ایسا ہی کرے گا۔اور اعلیٰ روحانی نعمتیں بھیجے گا جو روح کی غذا بنیں گی۔اور اعلیٰ قسم کے انسان پیدا کرے گا جو ایک دوسرے کے ہمدرد اور خیر خواہ ہوں گے۔اور گو یہ لوگ ابھی خدا تعالیٰ کی آواز پر لبیک نہیں کہہ رہے مگر تیرا رب بڑا غالب اور رحم کرنے والا ہے وہ ضرور ایسی تدبیر کرے گا جس سے دنیا پر اس کی بادشاہت قائم ہوجائے گی۔اور اس کے رحم کا لمبا سلسلہ انسانوں کے لئے جاری ہوجائے گا۔

مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ میں اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ تمام نباتات نر و مادہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔یعنی ان میں کچھ نر پودے ہوتے ہیں اور کچھ مادہ۔اور جب وہ دونوں آپس میں ملتے ہیں تب فصل پیدا ہوتی ہے اسی لئے ماہرین زراعت کہا کرتے ہیں کہ باغوں میں شہد کی مکھّیاں رکھنی چاہئیں کیونکہ وہ نر درخت پر بیٹھ کر اُس سے نر کا نطفہ لیتی ہیں۔اور مادہ درخت پر جاکر رکھ دیتی ہیں جس کی وجہ سے اُسے خوب پھل آتا ہے۔عرب لوگ کھجور کے متعلق اس حقیقت کو جانتے تھے اور وہ نر اور مادہ درختوں کو آپس میں ملایا کرتے تھے۔مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم نہیں تھا۔ایک دفعہ آپ نے دیکھا کہ کچھ لوگ کھجور کے نر درختوں کو مادہ کھجوروں سے ملا رہے ہیں۔آپ نے فرمایا کیا کرتے ہو۔انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم تو نر کو مادہ پر ڈالتے ہیں تا کہ فصل اچھی ہو۔آپ نے فرمایا۔اس کا کیا فائدہ جو پھل پیدا ہونا ہے وہ تو ہونا ہی ہے۔انہوں نے یہ سن کر چھوڑ دیا مگر نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی فصل ماری گئی۔وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! ہماری تو فصل اچھی نہیں ہوئی۔آپؐ نے فرمایا۔کیوں۔انہوں نے کہا۔آپؐ نے جو فرمایا تھا کہ نر کا مادہ مادینہ کھجور پر نہ ڈالو۔آپؐ نے فرمایا۔میں تو تمہاری طرح کا ایک انسان ہوں یہ علم تو تم جانتے ہو۔مجھے معلوم نہیں۔ اس لئے تم وہی کچھ کرو جسے علمی لحاظ سے تم صحیح سمجھتے ہو۔(مسلم کتاب الفضائل باب وجوب امتثال ما قاله شرعًا) غرض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بارہ میں ذاتی طور پر کوئی علم نہیں تھا۔مگر اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ تمام نباتات آپس میں جوڑا جوڑا ہیں۔بلکہ سورۃ ذاریات میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (الذاریات:۵۰) یعنی نر و مادہ صرف انسانوں میں ہی نہیں بلکہ ہر چیز میں ہیں۔جمادات میں بھی ہیں۔نباتات میں بھی ہیں۔حیوانات میں بھی ہیں۔اور اب تو بعض سائنسدان اس تحقیق میں اتنے بڑھ گئے ہیں کہ وہ دھاتوں میں بھی نر و مادہ کے قائل ہوگئے ہیں۔ایک سائنسدان کی کتاب میں میں نے پڑھا کہ ٹین بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ایک

ٹین نر ہوتا ہے اور ایک مادہ ہوتا ہے اور وہ بھی ایک دوسرے کے اثر کو قبول کر کے ایک نئی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ مگر خدا تعالیٰ اس سے بھی اوپر جاتا ہے اور فرماتا ہے کہ ہم نے ہر چیز کا جوڑا بنایا ہے اور چیز کے لفظ میں نباتات بھی آجاتی ہے۔ حیوانات بھی آجاتے ہیں۔ جمادات بھی آجاتے ہیں۔ بلکہ اس سے بڑھ کر ذرّات عالم اور مجموعۂ ذرات عالم بھی آجاتے ہیں اور جب خدا تعالیٰ نے یہ کہا کہ ہم نے ہر چیز کو جوڑا بنایا ہے تو اس کے معنے یہ ہوئے کہ خدا تعالیٰ کے سوا باقی ہر چیز کا جوڑا ہے اور کوئی چیز اپنے جوڑے کے بغیر صحیح نتیجہ پیدا نہیں کرسکتی۔ جس طرح مادی دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا جوڑا بنایا ہے۔ اسی طرح روحانی دنیا میں انسانی روح خدا تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت کا جوڑا ہے اور جب تک الٰہی فضل انسانی روح سے آکر نہ ملے اس وقت تک روحانی نسل کا سلسلہ قائم نہیں ہوسکتا۔ مجھے یاد ہے۔ میں ابھی بچہ ہی تھا کہ میں نے ایک دفعہ رؤیا میں دیکھا کہ میں امرتسر میں ہوں وہاں ملکہ کا ایک بت تھا جو سنگ مرمر کا بنا ہوا تھا اور اس کے اردگرد ایک چبوترہ تھا اور وہ بھی سنگ مرمر کا بنا ہوا تھا۔ اور چبوترے پر چڑھنے کے لئے سنگ مرمر کی ہی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ میں نے رؤیا میں دیکھا کہ ان سیڑھیوں پر تین چار سال کا ایک بچہ کھڑا ہے جو نہایت حسین اور صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس ہے اور آسمان کی طرف دیکھ رہا ہے۔ رؤیا میں میں سمجھتا ہوں کہ یہ مسیحؑ ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد آسمان پھٹا اور اس میں سے ایک چیز زمین کی طرف اڑتی ہوئی نظر آئی۔ وہ خوبصورت رنگوں والے لباس میں لپٹی ہوئی تھی۔ اور اس کے پَر تھے جن سے وہ اڑتی ہوئی آرہی تھی۔ میں رؤیا میں سمجھتا ہوں کہ یہ حضرت مریمؑ ہیں نیچے آکر جیسے مرغی اپنے پَر پھیلا کر بچوں کو اپنے پَروں کے نیچے لے لیتی ہے۔ اسی طرح اس نے بچہ پر اپنے پَر رکھ دیئے۔ اور جب اس نے ایسا کیا تو میری زبان پر یہ الفاظ جاری ہوئے۔

Love creates love

یعنی محبت محبت پیدا کرتی ہے۔ (الفضل ۱۵؍مارچ ۱۹۳۰ صفحہ ۹) جب میری آنکھ کھلی تو میں نے سمجھا کہ مریم جو رؤیا میں مجھے بطور ماں دکھائی گئی ہے اس سے مراد خدا تعالیٰ کی محبت ہے اور بچہ جو مسیح کی شکل میں دکھایا گیا وہ روح کی خدا تعالیٰ کی طرف انابت اور جھکنے کا تمثّل تھا۔ جب انسانی روح خدا تعالیٰ کی طرف جھکتی ہے تو اس کے نتیجہ میں ایک روحانی وجود پیدا ہوتا ہے جو خدا تعالیٰ کو ایسا ہی پیارا ہوتا ہے جیسے ماں کو اس کا بچہ۔ کیونکہ خدا تعالیٰ جسم کے ساتھ پیار نہیں کرتا۔ وہ وجود جس کے ساتھ خدا تعالیٰ پیار کرتا ہے۔ وہ خدا تعالیٰ کی رحمت کے ساتھ مل کر پیدا ہوتا ہے۔ اور اس کے لئے خدا بمنزلہ ماں بن جاتا ہے۔

یہی سبق اللہ تعالیٰ نے کفار کو دیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ کیا وہ زمین کی طرف نہیں دیکھتے کہ ہم نے اس میں کیسے

کیسے خوبصورت جوڑے پیدا کر دیئے ہیں پھر کیا وہ اس نظارہ کو دیکھتے ہوئے نہیں سمجھ سکتے کہ جس طرح مادی دنیا میں ہم نے ہر چیز کا جوڑا بنایا ہے اسی طرح ان کی روح بھی اپنی طاقتوں کے اظہار کے لئے ایک جوڑے کی محتاج ہے اور یہ جوڑا خدا تعالیٰ کی رحمت سے مل کر مکمل ہوتا ہے۔ پس اگر وہ اپنی روحانی نسل کو جاری کرنا چاہتے ہیں تو انہیں اس خدائی رحمت کے ہاتھ کو تھام لینا چاہیے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں اس کی طرف سے بلند ہوا ہے ورنہ جس طرح ایک بانجھ عورت اولاد سے محروم رہتی ہے۔ اسی طرح وہ ان روحانی نعماء سے محروم رہیں گے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ لٹائے جا رہے ہیں۔

وَ اِذْ نَادٰی رَبُّكَ مُوْسٰۤى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۙ۝۱۱

اور (یاد کر) جب تیرے رب نے موسیٰ کو پکارا تھا (اور کہا تھا) کہ ظالم قوم یعنی فرعون کی قوم کے پاس جا۔

قَوْمَ فِرْعَوْنَ ؕ اَلَا يَتَّقُوْنَ ۝۱۲ قَالَ رَبِّ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ

(اور ان سے کہہ کہ) کیا وہ تقویٰ نہیں کرتے؟ اس نے (جواب میں) کہا۔ اے میرے رب

يُّكَذِّبُوْنِ ؕ۝۱۳ وَ يَضِيْقُ صَدْرِيْ وَ لَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ

میں ڈرتا ہوں کہ وہ میری تکذیب نہ کریں۔ اور میرا سینہ تنگی محسوس کرتا ہے اور میری زبان

فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ ۝۱۴ وَ لَهُمْ عَلَيَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ

(اچھی طرح) چلتی نہیں پس (میرے ساتھ) ہارونؑ کو بھی مبعوث کر۔ اور (یہ بات بھی ہے کہ) ان

يَّقْتُلُوْنِ ۚ۝۱۵ قَالَ كَلَّا ۚ فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَاۤ اِنَّا مَعَكُمْ

(لوگوں) کا میرے خلاف ایک الزام بھی ہے اور میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل نہ کر دیں۔ فرمایا۔ ہرگز نہیں۔

مُّسْتَمِعُوْنَ ۝۱۶ فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَاۤ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ

پس (ہمارا حکم سن کر) تم دونوں ہماری آیتیں لیکر (چلے) جاؤ۔ ہم (تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے) ساتھ ہوں

الْعٰلَمِيْنَ ۙ﴿۱۷﴾ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ؕ﴿۱۸﴾

گے اور (تمہاری دعاؤں کو) سنتے رہیں گے۔ پس فرعون کے پاس جاؤ اور اسے کہو کہ ہم رب العالمین (خدا) کے بھیجے ہوئے ہیں۔ (اس حکم کے ساتھ) کہ ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دے۔

حل لغات۔ ذَنْبٌ ذَنْبٌ يُسْتَعْمَلُ فِيْ كُلِّ فِعْلٍ يَسْتَوْخَمُ عُقْبَاهُ (مفردات) یعنی ہر وہ فعل جس کا نتیجہ خراب ہو ذنب کہلاتا ہے۔

تفسیر۔ فرماتا ہے۔ اس وقت کو یاد کرو جب تمہارے رب نے موسیٰ ؑ کو پکارا اور اسے کہا کہ تُو ظالم قوم یعنی فرعونیوں کی قوم کے پاس جا اور اُسے کہہ کہ کیا وہ تقویٰ اختیار نہیں کریں گے؟ اس پر موسیٰ نے کہا۔ اے میرے رب! میرے جانے کا کیا فائدہ وہ تو مجھے جھٹلا دیں گے۔ علاوہ ازیں میرا سینہ ان کے آنے والے سلوک کا تصور کر کے تنگی محسوس کرتا ہے اور میری زبان اس ڈر سے بند ہوتی چلی جاتی ہے کہ وہ انکار سے کام لیں گے۔ پس تو اپنا پیغام ہارون کی طرف بھیج۔ نیز وہ مجھ پر گناہ کا الزام بھی عائد کرتے ہیں۔ سو میں ڈرتا ہوں کہ کہیں وہ میری بات سنے بغیر ہی مجھے قتل نہ کر دیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ان کی مجال نہیں کہ وہ ایسا کر سکیں۔ لیکن چونکہ تو نے ایک خواہش کا اظہار کیا ہے ہم ہارون ؑ کو بھی مبعوث کرتے ہیں۔ سو تم دونوں ہمارے نشان لے کر جاؤ۔ بڑا نشان تو یہی ہے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور تمہاری دعائیں سنتے رہیں گے اور فرعون اور اس کے ساتھی تمہارا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکیں گے۔ سو تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اور اسے کہو کہ ہم رب العالمین خدا کی طرف سے تمہاری طرف رسول بن کر آئے ہیں تم ہمارے پیغام کو قبول کرو۔ اور بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دے کر ہمارے ساتھ روانہ کر دو۔ یہ واقعہ بیان فرما کر اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جس خدا نے فرعون کی قوم کے لئے ہدایت کا سامان مہیا کیا تھا۔ وہ مکہ والوں کے لئے کیوں ہدایت کا سامان مہیا نہ کرتا۔ فرعون کی قوم کے لئے تو کسی پہلے نبی کی دعا موجود نہیں تھی لیکن مکہ والوں کے لئے تو ابراہیمؑ کی یہ دعا موجود تھی۔ کہ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (البقرۃ: ۱۳۰) یعنی اے ہمارے رب! تو ان لوگوں میں اپنا ایک رسول مبعوث فرما جو ان پر تیری آیات کی تلاوت کرے انہیں کتاب اور حکمت سکھائے اور ان کا تزکیۂ نفوس کرے۔ تو بڑا غالب اور حکمت والا ہے۔ پس اگر بغیر کسی دعا کے اللہ تعالیٰ نے فرعونیوں کی ہدایت کے لئے موسیٰ کو مبعوث فرما دیا تو اتنی بڑی دعا کی موجودگی میں جبکہ اللہ تعالیٰ کا بھی یہ وعدہ تھا کہ وہ اپنے انعامات کی بارش نسل اسمٰعیلؑ

پر برسائے گا اور اسے بھی ایک بڑی قوم بنائے گا۔ (پیدائش باب ۱۷ آیت ۲۰) کیوں ان کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ اپنا برگزیدہ کھڑا نہ کرتا پس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آنا لوگوں کے لئے کسی حیرت کا موجب نہیں بننا چاہیے۔ حیرت تب ہوتی جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کی ہدایت کا کوئی سامان پیدا نہ ہوتا اور ابراہیمی دعا رائیگاں چلی جاتی۔

پھر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ ؑ کا ذکر فرما کر یہود کو بھی اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ تم موسیٰ ؑ کی کتاب پر ایمان رکھتے ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ تورات میں یہ پیشگوئی موجود ہے کہ

''میں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا۔ اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو جنہیں وہ میرا نام لے کے کہے گا نہ سنے گا تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا۔'' (استثنا باب ۱۸ آیت ۱۸، ۱۹)

کیا اس پیشگوئی کے مطابق یہ ضروری نہیں تھا کہ موسیٰ ؑ کے بعد بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسمٰعیل میں سے ایک ایسا نبی آتا جو موسیٰ ؑ کا مثیل ہوتا۔ یعنی جس طرح وہ صاحب شریعت نبی تھا اسی طرح آنے والا رسول بھی صاحب شریعت ہوتا۔

پھر تورات میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ وہ جب بھی خدا کا کلام سنائے گا تو کہے گا کہ میں خدا کا نام لے کر تمہیں یہ کلام سناتا ہوں چنانچہ قرآن کریم کی کوئی سورۃ نہیں جو اللہ تعالیٰ کے نام کے بغیر شروع ہوتی ہو۔ ہر سورۃ سے پہلے بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ لکھا ہوا ہوتا ہے جو ہر یہودی اور عیسائی کو اس امر کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ تم کیوں اس نبی کو نہیں مانتے جو موسیٰ ؑ کی پیشگوئی کے مطابق جب خدا تعالیٰ کا کلام سناتا ہے تو اس سے پہلے یہ الفاظ بھی کہہ دیتا ہے کہ میں اللہ کا نام لے کر یہ کلام سناتا ہوں اور پھر بھی اس کو کوئی سزا نہیں ملتی۔

غرض موسیٰ ؑ کا ذکر مکہ والوں کو دعائے ابراہیمی کی طرف اور یہودیوں اور عیسائیوں کو تورات کی پیشگوئی کی طرف توجہ دلانے کے لئے کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ وہ اس دعا اور پیشگوئی کی عظمت کو سمجھیں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کر کے اللہ تعالیٰ کے غضب کا اسی طرح نشانہ نہ بنیں جس طرح فرعون موسیٰ ؑ کا انکار کر کے نشانہ بنا۔

اَنِ ائۡتِ الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِيۡنَ۔ قَوۡمَ فِرۡعَوۡنَ میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب فرعون کی طرف بھجوایا گیا تو آپ کا بڑا کام یہی تھا کہ بنی اسرائیل کو اس کی غلامی سے نجات دلائیں۔ اور فرعون کو سمجھائیں کہ وہ اس الٰہی منشاء میں روک نہ بنے۔ اور بنی اسرائیل کو ان کے ساتھ جانے کی اجازت دے دے۔ چنانچہ جب بنی اسرائیل مصر سے چلے گئے تو پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مصریوں سے کوئی واسطہ نہ رہا بلکہ ان کی تمام تر توجہ بنی اسرائیل کی

طرف ہی مبذول رہی جن کی ہدایت اور ترقی کے لئے وہ مبعوث کئے گئے تھے۔ مگر چونکہ بنی اسرائیل اہل مصر سے مل جل کر رہتے تھے اور بنی اسرائیل کو الگ مخاطب کرنے اور ان کے اندر ایک نئی مذہبی روح پیدا کرنے کی اس وقت کوئی صورت نہیں تھی اس لئے ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کو بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت میں شریک کرلیا۔ اور آپ نے فرعون اور اس کی قوم کو بڑی بھاری تبلیغ کی اور متواتر کئی نشانات کے ذریعہ ان پر حجت تمام کی۔ مگر بنی اسرائیل کے مصر سے چلے جانے کے بعد آپ کا مصریوں کے ساتھ کوئی واسطہ نہ رہا۔ کیونکہ آپ اصولی طور پر صرف بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے ہی مبعوث ہوئے تھے لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ہجرت کی اور آپؐ مدینہ تشریف لے گئے تو مکہ والوں سے آپ کا تعلق منقطع نہیں ہوا بلکہ آپ برابر ان کی ہدایت کے لئے کوشش فرماتے رہے۔ جو آپؐ کے درجہ اور مقام کی بلندی کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے۔

اَلَا یَتَّقُوْنَ میں بتایا گیا ہے کہ انبیاء کی بعثت کی اہم غرض تقویٰ کا قیام ہوتی ہے۔ مگر بالعموم لوگ غلطی سے نیکی اور تقویٰ کو ایک ہی چیز سمجھ لیتے ہیں حالانکہ نیکی تو وہ نیک کام ہوتا ہے جو ہم کر چکے ہیں یا کر رہے ہیں۔ اور تقویٰ یہ ہے کہ انسان ایسے مقام پر کھڑا ہو جائے کہ اس کے دل میں آئندہ جو جذبات بھی پیدا ہوں وہ نیک اور پاک ہوں۔ کیونکہ جذبات کا اصل مقام دل ہے گو ان کا ظہور دماغ کے اعصاب کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔

سائنسدان اس امر پر بحثیں کرتے چلے آئے ہیں کہ انسانی روح کا منبع دماغ ہے دل نہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ روح کی حقیقت کو نہیں پا سکے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ انسانی روح کا جیسا کہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیموں اور رؤیا و کشوف سے پتہ چلتا ہے دل سے تعلق ہے ہاں دماغ چونکہ منبت اعصاب ہے اس لئے قلبی علوم کو محسوس کرنا اور دل کے علوم مخفیّہ سے مستفیض ہونا اس کا کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حیاۃ کا مقام دل کو قرار دیا ہے دماغ کو نہیں۔ اور روح کا سب سے گہرا تعلق اس عضو سے ہو سکتا ہے جو انسانی جسم میں سب سے اہم حیثیت رکھتا ہو اور جس کا کام سب سے نمایاں ہو۔ اور وہ اہم کام دل کا ہی ہے۔ دماغ کا نہیں۔ دل کی ایک سیکنڈ کی حرکت بند ہونے سے کلّی طور پر انسان پر موت وارد ہو جاتی ہے۔ لیکن دماغ میں اگر فتور پیدا ہو جائے تو گو اس وجہ سے کہ دماغ کا کام علوم قلبیہ کو محسوس کرنا ہے علوم پردہ میں آجاتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ انسان پر موت بھی وارد ہو جائے۔ غرض دماغ خادم ہے اور دل وہ اصل مرکز ہے جہاں اللہ تعالیٰ اپنے انوار نازل کرتا ہے۔ لیکن خواہ فلسفیوں کے تتبّع میں کوئی شخص تدبر اور تفکر اور اخلاق فاضلہ کا تمام مدار دماغ پر رکھے یا یہ کہے کہ انسانی عقل اور معرفت کا سرچشمہ دل ہے۔ اور دماغ کو علوم اور معارف سے کچھ تعلق نہیں پھر خواہ وہ دل اور دماغ کی بجائے جذبات اور افکار کا لفظ استعمال کرے۔

بہر حال کوئی بھی صورت ہو انسان کے لئے دو چیزوں کی صفائی نہایت ضروری ہے، ان میں سے ایک فکر ہے اور دوسری جذبات لطیفہ ہیں۔ افکار کی صفائی جسے عربی میں تنویر کہتے ہیں دماغ کی صفائی سے حاصل ہوتی ہے۔ تنویر اس بات کو کہتے ہیں کہ انسان کے اندر ایسا نور پیدا ہو جائے جس کی وجہ سے ہمیشہ صحیح خیالات پیدا ہوتے رہیں۔ جس طرح ایک تندرستی تو یہ ہوتی ہے کہ انسان کہے میں اس وقت تندرست ہوں۔ اور ایک تندرستی یہ ہوتی ہے کہ انسان آئندہ بھی تندرست رہے۔ اسی طرح تنویر فکر کی وہ درستی ہوتی ہے جس کے نتیجہ میں آئندہ جو خیالات بھی پیدا ہوں درست ہی ہوں۔ اور تنویر کے جو معنے دماغ کی نسبت سے ہیں وہی تقویٰ کے معنے دل کی نسبت سے ہیں۔ یعنی جس طرح فعلاً صحیح خیال کا پیدا ہونا تنویر نہیں بلکہ ایسے ملکہ کا پیدا ہو جانا کہ ہمیشہ صحیح خیالات ہی پیدا ہوتے رہیں تنویر ہے۔ اسی طرح تقویٰ صرف ایک یا چند نیکیوں کا نام نہیں بلکہ انسان کا ایسے مقام پر کھڑا ہو جانا تقویٰ کہلاتا ہے کہ اس کے اندر جو جذبات بھی پیدا ہوں وہ ہمیشہ نیک اور پاک ہوں۔ اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میرا شیطان مسلمان ہو گیا ہے (مسلم كتاب صفات المنافقين باب تحريش الشيطان)۔ یعنی میرے دل میں جو خیال بھی پیدا ہوتا ہے نیک ہی ہوتا ہے برا نہیں ہوتا۔ غرض افکار کے لئے تنویر اور جذبات کے لئے تقویٰ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور انسان بدی کے حملہ سے اسی وقت محفوظ ہوتا ہے جب کسی انسان کو تنویر افکار بھی حاصل ہو اور تقویٰ قلب بھی حاصل ہو۔ پس اَلَا يَتَّقُوْنَ میں بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام قومِ فرعون کی طرف تقویٰ اللہ کا پیغام لے کر گئے تھے۔ اور آپ کی بعثت کا بڑا مقصد یہ تھا کہ آپ اپنی دعاؤں اور تبلیغ اور نصائح کے نتیجہ میں ان کی ایسی اصلاح کر دیں کہ نہ صرف ان کے افکار اور ان کے جذبات میں درستی پیدا ہو جائے بلکہ ان کے اندر ایسا ملکہ پیدا ہو جائے کہ آئندہ جب بھی ان کے دماغ میں کوئی خیال پیدا ہو وہ صحیح ہو۔ اور جب بھی ان کے دلوں میں کوئی جذبات پیدا ہوں وہ پاکیزہ ہوں۔ یہی چیز ہے جس پر تمام انبیاء زور دیتے چلے آئے ہیں۔ اور اسلام نے بھی اس کی طرف بار بار توجہ دلائی ہے۔ کیونکہ روحانی علوم اللہ تعالیٰ کی طرف سے دل پر نازل ہوتے ہیں۔ اگر کسی شخص کا دل پاک نہ ہو تو وہ الٰہی فیضان سے محروم رہتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ نے فرعون کی طرف جانے کا حکم دیا تو انہوں نے عرض کیا کہ رَبِّ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ۔ اے میرے رب! میں ڈرتا ہوں کہ وہ میری تکذیب نہ کریں۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس سنت قدیم کا علم نہیں تھا کہ جب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی مامور مبعوث ہوتا ہے تو دنیا اس کا انکار کیا کرتی ہے بلکہ ان کا خوف اس وجہ سے تھا کہ وہ جانتے تھے کہ تمام قومیں اپنے اپنے زمانہ میں انبیاء کا

انکار کرنے کی وجہ سے ہلاک ہو چکی ہیں۔ پس ان کے دل میں ڈر پیدا ہوا کہ اگر ان لوگوں نے بھی انکار کیا تو یہ بھی خدائی گرفت میں آ جائیں گے۔ اور یہ چیز ایسی ہے جو انبیاء کے لئے سخت دکھ کا موجب ہوتی ہے پس انہوں نے فرعون کی طاقت اور اس کے مظالم پر نظر دوڑاتے ہوئے اس امکانی خطرہ کا اظہار کیا کہ وہ اپنے تکبر اور سرکشی کی وجہ سے تکذیب پر کمر بستہ ہو جائے گا اور اپنے اس تلخ انجام کو اپنے قریب کرلے گا جو ہمیشہ سے منکرین انبیاء کا ہوتا چلا آیا ہے۔ چنانچہ آیت کا اگلا ٹکڑا ان معنوں کی تائید کرتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ۔ اے میرے رب! میرا سینہ تنگی محسوس کرتا ہے۔ یعنی ان کے ہدایت کو ردّ کر دینے کے خیال سے میری یہ کیفیت ہے کہ میرا سینہ تنگ ہو رہا ہے اور میرا دم گھٹ رہا ہے۔ ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس محبت کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو انہیں اپنی قوم سے تھی اور بتایا ہے کہ ان کا سینہ اپنی قوم کے کفر اور فسق کا تصور کر کے تنگی محسوس کرتا تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی قوم الٰہی پیغام کا انکار کر کے اس کے عذاب کی مستحق ہو۔ مگر اس بارہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایک بہت بڑی فضیلت حاصل ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تو یہ کہا ہے کہ رَبِّ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ اے میرے رب! میں ڈرتا ہوں کہ وہ کہیں میری تکذیب نہ کر دیں۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (الانعام: ۳۴) یعنی ہم جانتے ہیں کہ جو کچھ یہ مخالف لوگ کہتے ہیں۔ اس سے تجھے بڑا سخت غم پہنچتا ہے کیونکہ یہ تجھ کو نہیں جھٹلاتے بلکہ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتے ہیں۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو یہ فکر نہیں تھا کہ قوم ان کی تکذیب کر رہی ہے بلکہ آپ اگر غمزدہ تھے تو اس لئے کہ قوم خدا تعالیٰ کی آیات کا انکار کر رہی ہے۔ گویا آپ کا غم اپنی ذات کے لئے نہیں تھا۔ بلکہ آپ کا غم محض اس وجہ سے تھا کہ قوم خدا تعالیٰ کو ردّ کر رہی ہے اور ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان دونوں نظریوں میں کتنا بڑا فرق ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تو یہ ڈر تھا کہ قوم میری تکذیب کرے گی اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا غم تھا کہ قوم خدا کا انکار کر رہی ہے۔

پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تو اپنی قوم سے صرف اتنی محبت تھی کہ اپنی قوم کے کفر کو دیکھ کر ان کا سینہ تنگی محسوس کرتا تھا مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قوم کے کفر کا اتنا درد تھا کہ صدمہ کے مارے آپؐ کی جان نکلی جا رہی تھی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (الشعراء: ۴) یعنی ان لوگوں کے ایمان نہ لانے اور کافر رہنے کا ہمارے رسول کو اس قدر صدمہ ہے کہ گویا اس کی گردن پر تلوار رکھ کر کسی نے ایک سرے سے

لے کر دوسرے سرے تک اسے کاٹ دیا ہے۔ جب لوگوں کے ایمان نہ لانے کا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر افسوس تھا تو ان کا کفر کی حالت میں مر جانا آپؐ پر کس قدر گراں گذرتا ہوگا؟ جو شخص صرف اس بات سے ہی صدمہ محسوس کرتا ہو کہ ایک شخص خدا تعالیٰ پر ایمان نہیں لایا اس کے دل پر اس وقت کیا گذرتی ہوگی جب اسے یہ معلوم ہوتا ہوگا کہ اب کفر پر اس کا خاتمہ بھی ہو گیا ہے۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ دنیا میں ہمیشہ بڑی چیزوں پر چھوٹی چیزوں کو قربان کیا جاتا ہے مگر اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کمزور انسانیت پر اپنے پیدا کئے ہوئے قیمتی سے قیمتی جوہروں کو قربان کیا۔ آدمؑ اپنے زمانہ کا سب سے قیمتی جوہر تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کمزور لوگوں کے لئے جنہوں نے شیطان کا ساتھ دیا آدمؑ کی سی قیمتی جان کو قربان کرا دیا۔ حضرت نوح علیہ السلام اپنے زمانہ میں سب سے قیمتی وجود تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان ازلی شقیوں اور ان بدبخت وجودوں کے لئے جو ہدایت سے محرومی اختیار کر چکے تھے حضرت نوح علیہ السلام کی جان کو قربان کرا دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے زمانہ کے سب سے قیمتی وجود تھے مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جان کو کمزور اور ناقص انسانوں کے بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے کرب و بلا میں مبتلا کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے زمانہ کے قیمتی سے قیمتی وجود تھے مگر وہ بنی اسرائیل جو خدا کے لئے صرف اس قربانی کے مالک تھے کہ انہوں نے کہہ دیا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (المائدة: ۲۵) اے موسیٰ! تو اور تیرا رب دونوں جاؤ اور ان سے جنگ کرو۔ ہم تو بہرحال اسی جگہ بیٹھے رہیں گے۔ اس بزدل اور نشانات سے آنکھیں بند کر لینے والی قوم کے لئے خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سی قیمتی جان کو قربان کرا دیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے زمانہ کے قیمتی ترین وجودوں میں سے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لئے جن کے متعلق حضرت مسیح علیہ السلام خود کہتے ہیں کہ وہ سانپ اور سانپوں کے بچے ہیں (متی باب ۲۳ آیت ۳۳) ان کی زندگی کو بھینٹ چڑھا دیا۔ پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ پاک اور اعلیٰ وجود اس دنیا میں کون آیا کہ جس کے متعلق ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا کہ لَوْ لَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ (فوائدالمجموعه مصنفه علّامه شوکانی کتاب الفضائل باب فضائل النبیؐ) اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر تجھے پیدا نہ کرنا ہوتا تو میں زمین و آسمان کو بھی پیدا نہ کرتا مگر وہ وجود جس کی خاطر بنی نوع انسان پیدا کئے گئے۔ ابوجہل، عتبہ اور شیبہ کی ہدایت اور بھلائی کے لئے اس کو ایک ایسی صلیب پر لٹکا دیا جو لوگوں کو تو نظر نہیں آئی مگر خدا تعالیٰ جس کی نظر میں ہر عیب بھی ظاہر ہے وہ اس صلیب کے متعلق فرماتا ہے لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ اے محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) شاید کہ غم کی چھری تجھ کو ذبح کرتے کرتے

تیری گردن کے آخری تسموں کو بھی کاٹ دے گی اس وجہ سے کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے۔

غرض جہاں تک قربانی اور محبت کا سوال ہے دنیا کے ہر نبی نے اپنی قوم کے لئے قربانیاں کیں۔ اور ہر نبی اپنی قوم کے کفر اور نفاق کو دیکھ دیکھ کر پریشان حال رہا۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور پہلے انبیاء میں یہ فرق ہے کہ پہلے انبیاء کے سینہ میں تو اپنی قوم کا کفر دیکھ کر صرف تنگی محسوس ہوتی تھی مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا کفر دیکھ کر ایسا غم ہوتا تھا کہ قریب تھا کہ آپ اس غم کی وجہ سے اپنے آپ کو ہلاک کر لیتے۔

پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تو یہ کہا کہ رَبِّ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّکَذِّبُوْنِ۔ مگر جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ملا کہ جا اور دنیا کو خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچا تو آپؐ نے فوراً اپنی بیوی کو خبر دی اور پھر بعد میں اپنی ساری قوم کو خبر دی اور یہ نہیں کہا کہ قوم میری تکذیب کرے گی بلکہ آپؐ نے دلیری سے خدا تعالیٰ کے حکم پر لبیک کہا اور کسی ڈر اور خوف کا اظہار نہیں کیا۔ یہ امر بتاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ بہت بلند تھا۔

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک اور بات کی اور فرمایا لَا یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ اے میرے رب! میری تو زبان ہی نہیں چلتی۔ مگر خدا تعالیٰ کی شان دیکھو کہ وہی موسیٰؑ جنہیں یہ خوف تھا کہ میں فرعون کے دربار میں کس طرح بات کرسکوں گا اور جنہوں نے حضرت ہارون علیہ السلام کی یہ خوبی بیان کی تھی کہ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا (القصص: ۳۵) وہ بات کرنے میں مجھ سے بہت زیادہ فصیح ہیں جب فرعون کے سامنے جاتے ہیں تو حضرت ہارونؑ کو ایک فقرہ بھی بولنے نہیں دیتے۔ اور خود ہی اس کے تمام سوالات کے جواب دیتے چلے جاتے ہیں۔ اَفْصَحُ مِنِّیْ مِنِّیْ لِسَانًا کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام یقیناً فصیح البیان تھے اور ان کی زبان میں جیسا کہ پرانے مفسرین خیال کرتے ہیں کوئی خلقی نقص نہیں تھا (تفسیر کبیر لامام رازی زیر آیت ربّ اشرح لی صدری) صرف اتنی بات ضرور ہے کہ وہ اپنے آپ کو فصاحت بیان میں حضرت ہارون علیہ السلام سے کم درجہ پر سمجھتے تھے۔ مگر جب اللہ تعالیٰ نے رسالت کا کام آپ کے سپرد کیا اور فرعون کے دربار میں آپ تشریف لے گئے۔ تو وہاں آپ کی فصاحت اور آپ کے دلائل کی مضبوطی کی ایسی دھاک بیٹھی کہ فرعون جھنجلا اٹھا اور اس نے سمجھا کہ اب مقابلہ کے لئے کوئی اجتماعی پروگرام مرتب کرنا چاہیے ورنہ یہ لوگوں کو برگشتہ کر دے گا۔

ہم نے اپنی جماعت میں بھی دیکھا ہے کہ جب کوئی شخص اخلاص کے ساتھ احمدی ہوتا ہے تو باوجود اس کے کہ وہ ان پڑھ اور جاہل ہوتا ہے احمدی ہوتے ہی اس کی زبان اس طرح کھل جاتی ہے کہ بڑے بڑے مولوی اس کے ساتھ بات کرنے سے گھبرانے اور کترانے لگ جاتے ہیں۔ اس کی عقل پہلے سے تیز ہو جاتی ہے اور اس کی بحث

کرنے کی قابلیت غیر معمولی طور پر بڑھ جاتی ہے جس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ ان کا علم اپنا نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کا عطا کیا ہوا ہوتا ہے جو ہر موقعہ پر ان کی تائید کرتا اور انہیں وقت پر ایسی ایسی باتیں سمجھا دیتا ہے کہ حیرت آتی ہے۔ قادیان میں ایک شخص ''پیرا'' ہوا کرتا تھا جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا خادم تھا وہ اتنی موٹی عقل کا آدمی تھا کہ یہ سمجھ ہی نہیں سکتا تھا کہ احمدیت کیا ہے۔ لیکن اسے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ ایک ذاتی لگاؤ تھا۔ کہیں اس کو گنٹھیا کی بیماری ہوگئی۔ وہ پہاڑی آدمی تھا اس کے رشتہ داروں کو بعض لوگوں نے کہا کہ یہاں اس کا علاج نہیں ہو سکے گا اسے کہیں میدانوں میں لے جاؤ۔ چنانچہ وہ اسے گورداسپور لے آئے۔ مگر چونکہ وہ سب غریب آدمی تھے اور ایسے لوگوں کو روٹی بھی کھلانی پڑتی ہے اور دوائی بھی دینی پڑتی ہے اس لئے کوئی شخص علاج کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا تھا۔ آخر کسی نے ان کو بتایا کہ قادیان میں ایک مرزا صاحب ہیں جو بڑے خدا پرست ہیں۔ وہ معالج اور حکیم بھی ہیں ان کے پاس لے جاؤ وہ اس کی خبر گیری بھی کریں گے اور دوا بھی دیں گے۔ چنانچہ اس کے رشتہ دار اسے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے پاس لے آئے اور اسے وہاں چھوڑ کر کھسک گئے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اس کا علاج کیا اور آہستہ آہستہ اسے آرام آنا شروع ہوگیا۔ جب اس کے رشتہ داروں کو معلوم ہوا کہ اب وہ اچھا ہوگیا ہے اور کام کاج کر سکتا ہے۔ تو دوسری سردیوں میں پھر اس کے رشتہ دار آئے اور انہوں نے کوشش کی کہ وہ ان کے ساتھ چل پڑے۔ مگر معلوم ہوتا ہے اس کے قلب میں نیکی تھی۔ جب انہوں نے اسے کہا کہ ہم تجھے لینے کے لئے آئے ہیں تو کہنے لگا۔ تم بے شک میرے رشتہ دار ہو مگر تم مجھے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اس لئے اب تو جس نے میرا علاج کیا اور جس کی وجہ سے میں اچھا ہوا۔ میرا رشتہ دار وہی ہے میں اسے چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ وہ ڈیوڑھی پر پڑا رہتا تھا اور جو مہمان آتا تھا اس کی خدمت کرتا تھا۔ اسی طرح گھر کا معمولی کام کاج بھی کر دیا کرتا تھا۔ اس کی عقل کا یہ حال تھا کہ حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ اسے بڑا مجبور کیا کرتے تھے کہ وہ نماز پڑھے مگر وہ یہی جواب دیتا تھا کہ مجھے نماز نہیں آتی۔ حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کو بھی بڑا جوش تھا کہ یہ حضرت مسیح موعودؑ کے دروازے پر بیٹھا رہتا ہے اور نمازیں نہیں پڑھتا لوگ اسے دیکھیں گے تو اعتراض کریں گے اس لئے آپ اسے بار بار نماز پڑھنے کی نصیحت کرتے تھے مگر وہ جواب دیتا مجھے نماز یاد ہی نہیں ہوتی۔ آخر حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ نے تنگ آکر اسے فرمایا کہ نماز نہیں آتی تو سبحان اللہ سبحان اللہ ہی کہہ لیا کرو۔ چنانچہ اس کے بعد وہ کبھی ساتویں آٹھویں دن نماز میں شامل ہو جاتا تھا۔ اور سبحان اللہ سبحان اللہ کہتا رہتا تھا۔ حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ نے ایک دن اس خیال سے کہ شاید انعام کے لالچ سے اسے نماز پڑھنے کی عادت ہو جائے۔ اسے فرمایا۔ پیرے اگر تم ایک

دن پانچوں نمازیں وقت پر پڑھو اور ایک نماز کا بھی ناغہ نہ کرو۔ تو میں تمہیں دو روپے انعام دوں گا دو روپے اس زمانہ میں اس کے لئے بڑا بھاری انعام تھا۔ وہ کہنے لگا۔ آج ضرور میں پانچوں نمازیں پڑھوں گا۔ شاید عشاء کا وقت تھا جب اس نے نماز شروع کی صبح ہوئی تو پھر بھی اس نے ہمت کر کے نماز پڑھ لی۔ ظہر اور عصر میں بھی کسی نہ کسی طرح شامل ہو گیا۔ صرف مغرب کی نماز رہتی تھی۔ ان دنوں چونکہ مہمان تھوڑے ہوا کرتے تھے اس لئے ان کا کھانا ہمارے گھر تیار ہوا کرتا تھا۔ اور مغرب کے وقت ان کا کھانا گھر سے جایا کرتا تھا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اس دن مغرب کی نماز نسبتاً دیر سے ہوئی۔ اور کھانا لے جانے کا وقت ہو گیا۔ جو عورت اندر سے کھانا لایا کرتی تھی اس نے پیرے کو آواز دی کہ پیرے کھانا تیار ہے۔ مہمانوں کے لئے لے جاؤ۔ مگر پیرا مسجد میں تھا۔ اور اس وقت نماز ہو رہی تھی۔ لیکن بلانے والی عورت کو اس کا علم نہ تھا۔ اس نے دو چار آوازیں دیں مگر پیرا وہاں ہوتا تو جواب دیتا۔ آخر اس نے زور سے آواز دی کہ پیر یا کھانا لے جا نہیں تو میں تیری شکایت کروں گی۔ یہ آواز چونکہ اس نے زور سے دی تھی۔ اس لئے پیرے نے بھی سن لی۔ جس پر اس نے نماز میں ہی جواب دیا کہ ’’ ٹھہر جا! التحیات پڑھ لواں تے آنداں۔‘‘ یعنی ٹھہر جاؤ۔ ابھی تشہّد پڑھ کر آتا ہوں۔ گویا عین آخری تشہد میں وہ بول پڑا اور اس طرح اس نے اپنے دو روپے کھو دیئے۔ تو وہ بہت ہی موٹی عقل کا آدمی تھا۔ اتنی موٹی عقل کا کہ وہ اپنی بیوقوفی کی وجہ سے مہمانوں کو خوش کرنے کے لئے دال میں مٹی کا تیل ڈال کر کھالیا کرتا تھا اور جب لوگ کہتے کہ تم مٹی کا تیل کیوں ڈالتے ہو۔ تو کہتا۔ اس میں کیا حرج ہے۔ سرسوں کا تیل نہ ڈالا تو مٹی کا تیل ڈال لیا۔ اس وقت قادیان میں نہ تار گھر تھا۔ اور نہ ریل آیا کرتی تھی۔ اس لئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو کبھی تار دینے کی ضرورت پیش آتی یا کوئی ریلوے پارسل منگوانا ہوتا تو آپؑ بٹالے کسی آدمی کو بھجوا دیا کرتے تھے اور کبھی کبھی پیرے کو بھی اس غرض کے لئے بھیج دیتے تھے۔ ان دنوں مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی جو سلسلہ احمدیہ کے اشد ترین مخالفوں میں سے تھے اسٹیشن پر جایا کرتے تھے اور جب کسی نو وارد مسلمان کو اترتے دیکھتے تو اسے پوچھتے کہ وہ کہاں جانا چاہتا ہے اور جب کسی کے متعلق معلوم ہوتا کہ وہ قادیان جانا چاہتا ہے تو اسے ورغلانے کی کوشش کرتے اور کہتے کہ یہیں سے واپس چلے جاؤ۔ قادیان میں جا کر تمہارا ایمان خراب ہو جائے گا۔ ایک دن انہیں اور کوئی شکار نہ ملا تو انہوں نے پیرے کو ہی پکڑ لیا۔ وہ اس دن کوئی تار دینے یا کوئی بلٹی لینے کے لئے بٹالے گیا ہوا تھا۔ مولوی محمد حسین صاحب اسے کہنے لگے۔ پیرے تیرا تو ایمان خراب ہو گیا ہے۔ مرزا صاحب کافر اور دجال ہیں تو اپنی عاقبت ان کے پیچھے لگ کر کیوں خراب کرتا ہے۔ پیرا ان کی باتیں سنتا رہا۔ جب وہ اپنا جوش نکال چکے تو انہوں نے اپنی باتوں کی پیرے سے بھی تصدیق کروانی چاہی اور انہوں

نے اس سے پوچھا کہ بتاؤ میری باتیں کیسی ہیں۔ پیرا کہنے لگا۔ مولوی صاحب۔ میں تو ان پڑھ اور جاہل ہوں۔ مجھے نہ کوئی علم ہے اور نہ میں مسئلے سمجھ سکتا ہوں۔ لیکن ایک بات ہے جو میں بھی سمجھ سکتا ہوں اور وہ یہ کہ میں سالہا سال سے بلٹیاں لینے اور تاریں دینے کے لئے یہاں آتا ہوں اور میں دیکھتا ہوں کہ آپ ہمیشہ اسٹیشن پر آ آ کر لوگوں کو قادیان جانے سے منع کرتے ہیں۔ آپ کی اب تک شاید اس کوشش میں کتنی ہی جوتیاں گھس گئی ہوں گی۔ مگر پھر بھی آپ کی کوئی نہیں سنتا۔ اور مرزا صاحب قادیان میں بیٹھے ہیں پھر بھی لوگ ان کی طرف کھچے چلے جاتے ہیں۔ آخر کوئی بات تو ہے جس کی وجہ سے یہ فرق ہے۔ اب دیکھو! یہ کیسا لطیف اور صحیح جواب ہے۔ وہ فی الحقیقت دینی مسائل کو نہیں سمجھ سکتا تھا اور وہ نہیں جانتا تھا کہ دلائل کیا ہوتے ہیں۔ مگر فطرت کے لگاؤ اور محبت کی وجہ سے اس نے فوراً سمجھ لیا کہ یہ شخص بہرحال جھوٹ بول رہا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو بعض دفعہ ایسی باتیں سمجھا دیتا ہے کہ انسان کی عقل دنگ ہو جاتی ہے کیونکہ اس کے پاس سارے سامان ہیں۔ اور جس چیز کی کمی ہو وہ اس کے پاس موجود ہوتی ہے۔ عقل کی کمی ہو تو وہ اس کے پاس موجود ہے جرأت کی کمی ہو تو وہ اس کے پاس موجود ہے سخاوت کی کمی ہو تو وہ اس کے پاس موجود ہے۔ صحت کی کمی ہو تو وہ اس کے پاس موجود ہے۔ عزت کی کمی ہو تو اس کے پاس موجود ہے۔ مال کی کمی ہو تو وہ اس کے پاس موجود ہے۔ غرض ہر چیز کے خزانے اس کے پاس موجود ہیں۔ اور وہ اپنے بندوں کو ان خزانوں میں سے ایسے رنگ میں حصہ دیتا ہے کہ انسان حیران ہو جاتے ہیں۔

حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ آتھم کے مباحثہ میں ہم نے جو نظارہ دیکھا اس سے پہلے تو ہماری عقلیں دنگ ہو گئیں اور پھر ہمارے ایمان آسمان پر پہنچ گئے۔ فرماتے تھے کہ جب عیسائی مباحثہ سے تنگ آ گئے اور انہوں نے دیکھا کہ ہمارا کوئی داؤ نہیں چلا تو چند مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا کر انہوں نے ہنسی اڑانے کے لئے یہ شرارت کی کہ کچھ اندھے، کچھ بہرے کچھ لولے اور کچھ لنگڑے بلا لئے اور انہیں مباحثہ سے پہلے ایک طرف چھپا کر بٹھا لیا۔ جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے تو جھٹ انہوں نے ان اندھوں بہروں اور لولوں لنگڑوں کو نکال کر آپؑ کے سامنے پیش کر دیا۔ اور کہا زبانی باتوں سے جھگڑے طے نہیں ہوتے آپ کہتے ہیں میں مسیح ناصری کا مثیل ہوں اور مسیح ناصری اندھوں کو آنکھیں دیا کرتے تھے بہروں کو کان بخشا کرتے تھے اور لولوں لنگڑوں کے ہاتھ پاؤں درست کر دیا کرتے تھے۔ ہم نے آپ کو تکلیف سے بچانے کے لئے اس وقت چند اندھے، بہرے اور لولے لنگڑے اکٹھے کر دیئے ہیں۔ اگر آپ فی الواقعہ مثیل مسیح ہیں تو ان کو اچھا کر کے دکھا دیجئے۔ حضرت خلیفہ اولؓ فرماتے تھے کہ ہم لوگوں کے دل ان کی اس بات کو سن کر بیٹھ گئے اور گو ہم سمجھتے تھے کہ یہ بات یوں ہی ہے

مگر اس خیال سے گھبرا گئے کہ آج لوگوں کو ہنسی اور ٹھٹھے کا موقعہ مل جائے گا۔ مگر جب ہم نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے چہرہ کو دیکھا تو آپ کے چہرہ پر ناپسندیدگی یا گھبراہٹ کے کوئی آثار نہ تھے۔ جب وہ بات ختم کر چکے تو آپ نے فرمایا دیکھئے پادری صاحب میں جس مسیح کے مثیل ہونے کا دعویٰ کرتا ہوں اسلامی تعلیم کے مطابق وہ اس قسم کے اندھوں، بہروں اور لولوں لنگڑوں کو اچھا نہیں کیا کرتا تھا مگر آپ کا یہ عقیدہ ہے کہ مسیح جسمانی اندھوں جسمانی بہروں، جسمانی لولوں اور جسمانی لنگڑوں کو اچھا کیا کرتا تھا اور آپ کی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ اگر تم میں ایک رائی برابر بھی ایمان ہو اور تم کسی پہاڑ سے کہو کہ یہاں سے وہاں چلا جائے تو وہ چلا جائے گا (متی باب ۱۷ آیت ۲۰ ولوقا باب ۱۷ آیت ۶)۔ اور اگر تم بیماروں پر ہاتھ رکھو گے تو وہ اچھے ہو جائیں گے (مرقس باب ۱۶ آیت ۱۸)۔ پس یہ سوال مجھ سے نہیں ہوسکتا میں تو وہ معجزے دکھا سکتا ہوں جو میرے آقا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے دکھائے آپ ان معجزوں کا مطالبہ کریں تو میں دکھانے کے لئے تیار ہوں۔ باقی رہے اس قسم کے معجزے سو آپ کی کتاب نے بتا دیا ہے کہ ہر وہ عیسائی جس کے اندر ایک رائی کے برابر بھی ایمان ہو ویسے ہی معجزے دکھا سکتا ہے جیسے حضرت مسیح ناصری نے دکھائے۔ سو آپ نے بڑی اچھی بات کی جو ہمیں تکلیف سے بچا لیا اور ان اندھوں، بہروں، لولوں اور لنگڑوں کو اکٹھا کر دیا اب یہ اندھے بہرے لولے اور لنگڑے موجود ہیں اگر آپ میں ایک رائی کے برابر بھی ایمان موجود ہے تو ان کو اچھا کر کے دکھا دیجئے۔ آپ فرماتے تھے اس جواب سے پادریوں کو ایسی حیرت ہوئی کہ بڑے بڑے پادری ان لولوں لنگڑوں کو کھینچ کھینچ کر الگ کرنے لگ گئے۔ تو اللہ تعالیٰ اپنے مقربین کو ہر موقعہ پر عزت بخشتا ہے۔ اور ان کو ایسے ایسے جواب سمجھاتا ہے جن کے نتیجہ میں دشمن بالکل ہکا بکا رہ جاتا ہے۔

قادیان میں ایک دفعہ پادری زویمر آیا جو دنیا کا مشہور ترین پادری اور امریکہ کا رہنے والا تھا۔ وہ وہاں کے ایک بہت بڑے تبلیغی رسالہ کا ایڈیٹر بھی تھا۔ اور یوں بھی ساری دنیا کی عیسائی تبلیغی سوسائیٹیوں میں ایک نمایاں مقام رکھتا تھا۔ اس نے قادیان کا بھی ذکر سنا ہوا تھا۔ جب وہ ہندوستان میں آیا تو اور مقامات کو دیکھنے کے بعد وہ قادیان آیا اس کے ساتھ ایک اور پادری گارڈن نامی بھی تھا۔ ڈاکٹر خلیفہ رشید الدین صاحب مرحوم اس وقت زندہ تھے۔ انہوں نے اسے قادیان کے تمام مقامات دکھائے۔ مگر پادری آخر پادری ہوتا ہے نیش زنی سے باز نہیں رہ سکتا۔ ان دنوں قادیان میں ابھی ٹاؤن کمیٹی نہیں بنی تھی۔ اور گلیوں میں بہت گند پڑا رہتا تھا۔ پادری زویمر باتوں باتوں میں ہنس کر کہنے لگا ہم نے قادیان بھی دیکھ لیا اور نئے مسیح کے گاؤں کی صفائی بھی دیکھ لی۔ ڈاکٹر خلیفہ رشید الدین صاحب اسے ہنس کر کہنے لگے۔ پادری صاحب ابھی پہلے مسیح کی ہی ہندوستان پر حکومت ہے اور یہ اس کی صفائی کا نمونہ ہے۔

نئے مسیح کی حکومت ابھی قائم نہیں ہوئی۔اس پر وہ بہت ہی شرمندہ اور ذلیل ہوگیا۔پھر اس نے مجھے کہلا بھیجا کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں میری طبیعت کچھ خراب تھی۔ میں نے جواب دیا کہ پادری صاحب بتائیں کہ وہ مجھے کیوں ملنا چاہتے ہیں۔انہوں نے کہا چند باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔مگر پہلے نہیں بتا سکتا۔خیر میں نے ان کو بلالیا۔وہ بھی آ گئے اور پادری گارڈن صاحب بھی آ گئے۔ایک دو دوست اور بھی موجود تھے۔پادری زویمر صاحب کہنے لگے میں ایک دو سوال کرنا چاہتا ہوں۔میں نے کہا فرمایئے۔کہنے لگے اسلام کا عقیدہ تناسخ کے متعلق کیا ہے؟ آیا وہ اس مسئلہ کو مانتا ہے یا انکار کرتا ہے۔جونہی اس نے یہ سوال کیا معاً اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں ڈال دیا کہ اس کا اس سوال سے منشاء یہ ہے کہ تم جو مسیح موعود کو مسیح ناصری کا بروز اور ان کا مثیل کہتے ہو۔تو آیا اس سے یہ مطلب ہے کہ مسیح ناصری کی روح ان میں آ گئی ہے۔اگر یہی مطلب ہے تو یہ تناسخ ہوا۔اور تناسخ کا عقیدہ قرآن کریم کے خلاف ہے چنانچہ میں نے انہیں ہنس کر کہا۔پادری صاحب آپ کو غلطی لگ گئی ہے ہم یہ نہیں سمجھتے کہ مرزا صاحب میں مسیح ناصری کی روح آ گئی ہے بلکہ ہم ان معنوں میں آپ کو مسیح ناصری کا مثیل کہتے ہیں کہ آپ مسیح ناصری کے اخلاق اور روحانیت کے رنگ میں رنگین ہو کر آئے ہیں۔میں نے جب یہ جواب دیا تو اس کا رنگ فق ہوگیا اور کہنے لگا آپ کو کس نے بتایا کہ میں نے یہ سوال کرنا تھا۔میں نے کہا آپ یہ بتائیں کہ آیا آپ کا اس سوال سے یہی منشاء تھا یا نہیں؟ کہنے لگا۔ہاں میرا منشاء تو یہی دریافت کرنا تھا۔میں حیران تھا کہ جب قرآن تناسخ کے خلاف ہے تو احمدی مرزا صاحب کو مسیح موعود کس طرح کہہ سکتے ہیں۔پھر میں نے کہا اچھا آپ دوسرا سوال پیش کریں۔کہنے لگا۔میرا دوسرا سوال یہ ہے کہ نبی کی بعثت کیسے مقام پر ہونی چاہیے یعنے اس کو اپنا کام سرانجام دینے کے لئے کس قسم کا مقام چاہیے۔جونہی اس نے یہ دوسرا سوال کیا۔معاً دوبارہ خدا نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی کہ اس سوال سے اس کا منشاء یہ ہے کہ قادیان ایک چھوٹا سا گاؤں ہے یہ دنیا کا مرکز کیسے بن سکتا ہے۔اور اس چھوٹے سے مقام سے ساری دنیا میں تبلیغ کس طرح کی جا سکتی ہے۔اگر حضرت مرزا صاحب کی بعثت کا مقصد ساری دنیا میں اسلام کی تبلیغ پہنچانا ہے تو آپ کو ایسی جگہ بھیجنا چاہیے تھا جہاں ساری دنیا میں آواز پہنچ سکتی ہو۔نہ یہ کہ قادیان جو ایک چھوٹا سا گاؤں ہے اس میں آپ کو بھیج دیا جاتا۔غرض اللہ تعالیٰ نے اس کے سوال کے معاً بعد یہ بات میرے دل میں ڈال دی اور میں نے پھر اسے مسکرا کر کہا۔پادری صاحب ناصرہ یا ناصرہ سے بڑا کوئی شہر ہو وہاں نبی آ سکتا ہے۔حضرت مسیح ناصری جس گاؤں میں ظاہر ہوئے تھے اس کا نام ناصرہ تھا اور ناصرہ کی آبادی بمشکل دس بارہ گھروں پر مشتمل تھی۔میرے اس جواب پر پھر اس کا رنگ فق ہوگیا۔اور وہ حیران ہوا کہ میں نے اس کی اسی بات کا جواب دے دیا

جو درحقیقت اس کے سوال کے پس پردہ تھی ۔اس کے بعد اس نے تیسرا سوال کیا جو اس وقت مجھے یاد نہیں رہا۔ بہر حال اس نے تین سوال کئے اور تینوں سوالات کے متعلق قبل از وقت اللہ تعالیٰ نے القاء کر کے مجھے بتا دیا کہ اس کا ان سوالات سے اصل منشاء کیا ہے اور باوجود اس کے کہ وہ چکر دے کر پہلے اور سوال کرتا تھا پھر بھی اللہ تعالیٰ اس کا اصل منشاء مجھ پر ظاہر کر دیتا۔اور وہ بالکل لاجواب ہو گیا۔تو اللہ تعالیٰ قلوب پر عجیب رنگ میں تصرف کرتا اور اس تصرف کے ماتحت اپنے بندوں کی مدد کیا کرتا ہے۔اور یہ تصرف صرف خدا تعالیٰ کے اختیار میں ہوتا ہے بندوں کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ایک دفعہ ایک کج بحث ملا مسجد میں مجھے ملا۔اور کہنے لگا مجھے مرزا صاحب کی صداقت کا ثبوت دیجئے۔میں نے کہا قرآن موجود ہے سارا قرآن مرزا صاحب کی صداقت کا ثبوت ہے۔کہنے لگا کون سی آیت۔میں نے کہا قرآن کی ہر آیت مرزا صاحب کی صداقت کا ثبوت ہے۔اب یہ تو صحیح ہے کہ قرآن کی ہر آیت ہی کسی نہ کسی رنگ میں نبی پر چسپاں ہو سکتی ہے۔مگر بعض آیات ایسی ہیں کہ ان کا سمجھانا اور یہ بتانا کہ کس رنگ میں اس سے نبی کی صداقت کا ثبوت نکلتا ہے بہت مشکل ہوتا ہے۔فرض کرو کسی آیت میں لڑائی کا واقعہ بیان ہو تو اب گو اس سے بھی نبی کی صداقت ثابت کی جاسکتی ہے مگر وہ ایسا رنگ ہوتا ہے جو عام طبائع کی سمجھ سے بالا ہوتا ہے۔مگر مجھے اس وقت یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ تصرف فرما کر اس کی زبان سے وہی آیت نکلوائے گا جس سے نہایت وضاحت کے ساتھ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی صداقت ثابت ہو جائے گی۔خیر وہ اصرار کرتا رہا کہ آپ کوئی آیت بتائیں۔مگر میں یہ کہوں کہ آپ کوئی آیت پڑھ دیں۔اسی سے میں حضرت مرزا صاحبؑ کی صداقت ثابت کر دوں گا۔آخر اس نے یہ آیت پڑھی کہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (البقرة: ۹) میں نے سمجھ لیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا ہی تصرف ہے کہ اس نے اس کی زبان سے یہ آیت نکلوائی ہے چنانچہ میں نے اس سے کہا۔یہ آیت کن لوگوں کے متعلق ہے۔مسلمانوں کے متعلق ہے یا غیر مسلمانوں کے متعلق۔اس کا اصل سوال یہ تھا کہ جب مسلمان نمازیں پڑھتے ہیں اور روزے رکھتے ہیں حج کرتے ہیں اور خدا اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں تو ان کے لئے کسی نبی کی کیا ضرورت ہے۔جب اس نے یہ آیت پڑھی تو میں نے اس سے پوچھا کہ یہ آیت کن لوگوں کے متعلق ہے۔اس نے کہا۔مسلمانوں کے متعلق۔میں نے کہا تو پھر یہ آیت بتاتی ہے کہ مسلمانوں میں سے بھی بعض لوگ خراب ہو جاتے ہیں۔وہ منہ سے تو کہتے ہیں ہم مومن ہیں مگر درحقیقت وہ مومن نہیں ہوتے۔اور قرآن یہ بتاتا ہے کہ خالی اپنے آپ کو مومن کہہ دینا کافی نہیں جب تک انسان اپنے عمل سے بھی ایمان کا ثبوت نہ دے۔اب آپ ہی بتائیں کہ جب مسلمان بھی بگڑ سکتے ہیں تو کیا خدا تعالیٰ ان کی اصلاح کے لئے کسی نبی کو بھیجے گا یا نہیں بھیجے گا؟ دلوں

کو تسلی دینا تو خدا کا کام ہے مگر اس کی زبان بند ہو گئی اور وہ اس کا کوئی جواب نہ دے سکا اور اس بات کا میرے دل میں پہلے ہی یقین تھا کہ جو آیت اس کے منہ سے نکلے گی وہ وہی ہو گی جس سے اس کی زبان بند ہو جائے گی تو علم بھی خدا کے اختیار میں ہے۔ جرأت بھی خدا کے اختیار میں ہے۔ عزت بھی خدا کے اختیار میں ہے اور طاقت بھی خدا کے اختیار میں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ خیال کیا کہ میں فرعون کے دربار میں کہاں بول سکوں گا۔ مگر جب وقت آیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی ایسی تائید فرمائی کہ فرعون دنگ رہ گیا اور اسے دلائل کے میدان میں موسیٰ علیہ السلام کے سامنے اپنے ہتھیار ڈال دینے پڑے۔

اس موقعہ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو یہ فرمایا کہ فَاَرْسِلْ اِلٰی هٰرُوْنَ تُو اپنا پیغام ہارونؑ کی طرف بھیج۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ تو مجھے مبعوث نہ کر بلکہ جیسا کہ سورۂ طٰہٰ سے معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے یہ دعا کی تھی کہ وَ اجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ۔ هٰرُوْنَ اَخِی۔ اشْدُدْ بِهٖۤ اَزْرِیْ۔ وَ اَشْرِكْهُ فِیْۤ اَمْرِیْ (طٰہٰ: ۳۰ تا ۳۳) یعنی اے میرے خدا! میرے اہل میں سے ہارون کو جو میرا بھائی ہے میرا نائب تجویز کر اور اس کے ذریعہ سے میری طاقت کو مضبوط فرما اور اسے میرے کام میں شریک کر۔ پس اَرْسِلْ اِلٰی هٰرُوْنَ کے یہ معنے ہیں کہ میرے علاوہ اس کی طرف بھی کلام بھیج اور اسے بھی میرے ساتھ مبعوث فرما۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب کسی مقدس انسان کو نبوت کا مقام عطا کیا جاتا ہے تو وہ انکسار کی وجہ سے گھبراتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ ایسا نہ ہو میں اس عظیم الشان ذمہ واری کو پوری طرح ادا نہ کر سکوں۔ اور اس میں میری طرف سے کوئی خامی اور نقص رہ جائے۔ یہی طریق تمام انبیاء کا ہے اور اسی طریق سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی کام لیا اور کہہ دیا کہ ہارون کو بھی میرے ساتھ شامل کر دیجئے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی احادیث سے ثابت ہے کہ آپؐ نے ابتداء میں انکسار سے کام لیا اور جب فرشتے نے کہا اِقْرَاْ یعنی پڑھ۔ تو آپؐ نے یہی فرمایا کہ مَآ اَنَا بِقَارِئٍ۔ (بخاری کتاب بدء الوحی باب کیف کان بدء الوحی) میں تو پڑھے لکھے آدمیوں میں سے نہیں ہوں۔ اس وجہ سے میں نے کیا کام کرنا ہے۔ اور اسی بناء پر ابتدائی ایام میں آپ کو شدید گھبراہٹ رہی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی متواتر تائیدات نے آپ کو ایسے مقام پر کھڑا کر دیا کہ آپؐ نے سمجھ لیا اب میرا فرض ہے کہ میں آگے کی طرف بڑھتا چلا جاؤں اور کسی مشکل کی پروا نہ کروں مگر آپ کا عرفان چونکہ موسوی عرفان سے بہت زیادہ تھا اس لئے آپ نے یہ نہیں کہا کہ مجھے کوئی مددگار دیا جائے۔ بلکہ آپؐ اکیلے ہی اس بوجھ کو اٹھانے کے لئے تیار ہو گئے۔ حالانکہ آپؐ کے سپرد جو کام تھا وہ موسیٰؑ کے کام سے بہت بڑا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک ایسی قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے جو متمدن تھی اور متمدن لوگوں کو دینی علوم

سکھانا۔ ان میں نظام قائم کرنا اور ان کے اندر جماعتی روح پیدا کرنا نسبتاً آسان ہوتا ہے مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی قوم کی طرف آئے تھے جو تمدن اور تہذیب سے بالکل نا آشنا تھی۔ یہاں تک کہ اطاعت جو دنیا میں مہذب قوموں کا شعار سمجھا جاتا ہے وہ ان کے نزدیک سخت ذلت کی بات تھی چنانچہ عرب کی ادب کی کتب میں لکھا ہے کہ عرب میں ایک بادشاہ عمرو ابن ہند تھا۔ اس نے ایک علاقہ پر جو شام اور عراق کی طرف تھا اپنی حکومت قائم کی۔ اور عرب کے لحاظ سے اس قدر شوکت حاصل کر لی کہ اسے یہ خیال پیدا ہوا کہ سارا عرب میری بات مانتا ہے۔ ایک دن درباریوں سے اس نے باتیں کرتے ہوئے کہا کہ کیا عرب میں کوئی ایسا شخص بھی ہے جو میری بات ماننے سے انکار کر سکے۔ وہ اس بات کو خوب سمجھتا تھا کہ عرب کے لوگ اطاعت کرنا نہیں جانتے۔ مگر اس نے خیال کیا کہ مجھے ایسا رعب حاصل ہو گیا ہے کہ اب عرب کا کوئی شخص کم از کم میری بات ماننے سے انکار نہیں کر سکتا۔ انہوں نے کہا۔ ایک شخص عمرو ابن کلثوم ہے۔ جو اپنے قبیلہ کا سردار ہے۔ ہمارے خیال میں وہ ایسا شخص ہے جو آپ کی اطاعت نہیں کرے گا۔ اس نے کہا۔ بہت اچھا میں اس کی تصدیق کرنے کے لئے اسے بلواتا ہوں۔ چنانچہ بادشاہ نے عمرو ابن کلثوم کو دعوت دی اور اسے خط لکھا کہ آپ یہاں تشریف لائیں آپ سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے قبیلہ کے کچھ لوگوں کو لے کر آ گیا۔ جیسے عرب کا دستور تھا بادشاہ اس وقت کسی جگہ خیموں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ وہیں اس نے آ کر اپنے خیمے لگا دیئے۔ اس نے عمرو ابن کلثوم کو یہ بھی لکھا تھا کہ اپنی والدہ اور دوسرے عزیزوں کو بھی لیتے آنا۔ چنانچہ وہ اس کے مطابق اپنی والدہ کو بھی لے آیا۔ عمرو ابن ہند نے اپنی والدہ سے کہا کہ کام کرتے کرتے عمرو ابن کلثوم کی ماں سے کوئی چھوٹا سا کام لے کر دیکھنا تا پتہ لگ سکے کہ ان لوگوں کی کیا حالت ہے۔ چنانچہ جب وہ کھانا کھانے بیٹھے تو عرب کے دستور کے مطابق گو وہ بادشاہ کہلاتا تھا مگر اس کی ماں خود کھانا تقسیم کرنے بیٹھ گئی۔ اپنے بیٹے کے لئے بھی اور عمرو ابن کلثوم کے لئے بھی۔ گویا عمرو ابن ہند کی والدہ اس وقت عملاً عمرو ابن کلثوم اور اس کے دوسرے عزیزوں کا کام کر رہی تھی پس ایسے وقت میں عمرو ابن کلثوم کی ماں کا کسی کام میں ہاتھ بٹانا ہرگز اس کی ہتک کا موجب نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ جب بادشاہ کی ماں خود ایک کام کر رہی تھی تو اس کام میں عمرو ابن کلثوم کی ماں کا ہاتھ بٹانا کوئی ایسی بات نہیں تھی جو اس کی شان اور عزت کے منافی ہوتی۔ مگر واقعہ کیا ہوتا ہے۔ کھانا تقسیم کرتے وقت ایک تھال کچھ فاصلے پر پڑا تھا۔ عمرو ابن ہند کی والدہ کھانا تقسیم کرتے کرتے اسے کہنے لگی۔ بی بی ذرا وہ تھال تو سرکا کر ادھر کر دینا۔ اسے بھی یہ جرأت نہیں ہوئی کہ اس سے زیادہ اسے کوئی کام کرنے کے لئے کہے۔ مگر تاریخوں میں لکھا ہے کہ جونہی اس نے عمرو ابن کلثوم کی والدہ سے یہ بات کہی۔ وہ کھڑی ہو گئی اور اس نے زور سے پکارنا شروع کر دیا کہ

''او ابن کلثوم! تیری ماں کی ہتک ہوگئی ہے'' عمرو ابن کلثوم اس وقت بادشاہ کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا اور شاہی اعزاز کی وجہ سے وہ اپنے ہتھیار خیمہ میں ہی چھوڑ آیا تھا۔ مگر جونہی اس نے اپنی ماں کی اس آواز کو سنا۔ اس نے اپنی ماں سے جا کر یہ نہیں پوچھا کہ تمہاری کیا ہتک ہوئی ہے۔ گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور ادھر اُدھر دیکھنے لگ گیا۔ خیمہ میں بادشاہ کی تلوار لٹک رہی تھی۔ اس نے اُچک کر تلوار کو میان سے نکالا اور بادشاہ کو قتل کر دیا۔ پھر باہر نکل کر اس نے اپنے قبیلہ والوں سے کہا۔ بادشاہ کا سب مال و متاع لوٹ لو۔ چنانچہ اس کا سب مال و متاع لوٹ کر وہ اپنے وطن کی طرف واپس چلا گیا۔ (تاریخ الادب العربی للزّیات، عمرو بن کلثوم صفحہ ۶۴ و الشعر و الشعراء عمرو بن کلثوم)۔

ایسی اُجڈ اور وحشی قوم کی طرف جو بالکل بے راہ رَو تھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث فرمائے گئے۔ اور پھر موسیٰ ؑ کی طرح آپؐ کا دائرہ ہدایت صرف بنی اسرائیل تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ آپؐ کے سپرد تمام دنیا کو دین واحد پر جمع کرنے اور انہیں خدا تعالیٰ کے آستانہ پر لا ڈالنے کا کام کیا گیا۔ مگر اتنا عظیم الشان کام سپرد ہونے کے باوجود آپؐ نے یہ نہیں کہا کہ اے اللہ! میرے رشتہ داروں یا دوستوں میں سے کوئی ساتھی میرے ساتھ کر دے۔ بلکہ آپ حکم ملتے ہی کھڑے ہو گئے اور کہا کہ بہت اچھا اور کام شروع کر دیا۔ گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تو اپنی انفرادیت پر پورا بھروسہ نہ کرتے ہوئے ایک ساتھی کا مطالبہ کیا۔ اور اگرچہ ایک ساتھی مل جانے سے اجتماعیت نہیں ہو جاتی لیکن تاہم اتنی ڈھارس ضرور ہو جاتی ہے کہ میں اکیلا نہیں بلکہ میرے ساتھ ایک اور ساتھی بھی ہے۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انفرادیت کے کمال کا مظاہرہ کیا اور اس بات کی کوئی پروا نہ کی کہ دنیا آپؐ سے کیا سلوک کرتی ہے۔ بہر حال موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی ہارونؑ کو اپنا مددگار مقرر کرنے کی درخواست کی جو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالی۔ مگر وہی موسیٰ ؑ جنہوں نے خدا تعالیٰ کے سامنے یہ عذر کیا تھا کہ میری تو زبان نہیں چلتی جب فرعون کے دربار میں گئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسی قوت بیانیہ عطا فرمائی کہ آپ خود ہی فرعون کے تمام سوالات کے جوابات دیتے چلے گئے اور حضرت ہارون علیہ السلام کو بولنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے۔ جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفات پر جب انصار اور مہاجرین میں خلافت کے متعلق اختلاف پیدا ہوا۔ اور حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ وغیرہ ثقیفہ بنی ساعدہ میں پہنچے تو حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے اس موقعہ پر تقریر کرنے کے لئے اپنے ذہن میں ایک بہت بڑا مضمون تیار کیا ہوا تھا۔ اور میرا ارادہ تھا کہ میں جاتے ہی ایسی تقریر کروں گا کہ تمام انصار میرے دلائل کے قائل ہو جائیں گے اور وہ اس بات پر مجبور ہو جائیں گے کہ انصار کی بجائے مہاجرین میں سے کسی کو خلیفہ منتخب کریں۔ مگر جب ہم وہاں پہنچے تو حضرت ابو بکرؓ نے تقریر شروع کر دی۔ میں

نے اپنے دل میں کہا کہ انہوں نے بھلا کیا بیان کرنا ہے مگر خدا کی قسم جتنی باتیں میں نے سوچی ہوئی تھیں وہ سب انہوں نے بیان کردیں بلکہ ان کے علاوہ انہوں نے اپنے پاس سے بھی بہت سے دلائل دیئے۔ تب میں نے سمجھا کہ میں ابوبکرؓ کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔(صحیح بخاری کتاب الحدود باب رجم الحبلٰی فی الزنی اذا احصنت و مسند احمد حدیث الثقیفة و البدایة و النھایة فصل فی ذکر امور مھمة وقعت بعد وفاتہ و قبل دفنہ صلی اللہ علیہ وسلم قصة ثقیفة بنی ساعدة)۔اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ سمجھتے تھے کہ مجھ سے فرعون کے دربار میں کہاں بولا جائے گا۔ مگر جب وہاں پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی ایسی تائید فرمائی کہ حضرت ہارون علیہ السلام کو ایک لفظ تک نہ بولنا پڑا اور اس طرح خدا تعالیٰ نے اپنے انتخاب کی عظمت کو ظاہر کردیا۔اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک اور عذر کیا اور کہا۔کہ وَ لَهُمْ عَلَيَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ وہ لوگ مجھ پر ایک گناہ کا الزام لگاتے ہیں۔سو میں ڈرتا ہوں کہ وہ کہیں مجھے قتل ہی نہ کردیں۔اس کے یہ معنے نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنی جان دینے سے ڈرتے تھے بلکہ انہیں اس بات کا خوف تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ فرعون مجھے جاتے ہی گرفتار کرلے اور اس وجہ سے کہ میرے ہاتھ سے ایک قبطی مارا جاچکا ہے میرے قتل کے احکام صادر کردے اور خدا تعالیٰ کا پیغام اسے نہ پہنچ سکے۔گویا انہیں اپنی موت کا غم نہیں تھا بلکہ انہیں اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں انہیں اپنے فرائض کی بجا آوری سے پہلے ہی قتل نہ کردیا جائے اور اس طرح اس مشن کو نقصان نہ پہنچے جو خدا تعالیٰ نے ان کے سپرد کیا تھا۔ ورنہ انبیاء خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنی جان دینے سے نہیں ڈرتے۔ بیشک جہاں تک نبیوں کا وجود ان کی امت کے مقابلہ میں ہوتا ہے وہ بہت بڑی حیثیت رکھتے ہیں۔اتنی بڑی حیثیت کہ اگر ساری دنیا کی جانیں بھی ایک نبی کی جان بچانے کے لئے قربان کرنی پڑیں تو وہ قربان کی جاسکتی ہیں۔مگر جہاں تک صداقت کا سوال ہے نبی بھی اسی طرح صداقت کا خادم ہوتا ہے جس طرح اس کا عام پیرو صداقت کا خادم ہوتا ہے اگر کسی سلسلہء روحانیہ کے پہلے اور آخری نبی کے علاوہ کہ جن پر سلسلہ کا انحصار ہوتا ہے کوئی اور نبی مارا جاتا ہے یا جلاوطن کردیا جاتا ہے لیکن اس کی پیش کردہ صداقت دنیا سے نہیں مٹتی تو اس کا مارا جانا یا وطن سے بے وطن ہوجانا ہرگز قابل اعتراض نہیں سمجھا جاسکتا کیونکہ نبی کے مقابلہ میں صداقت حاکم ہوتی ہے اور نبی خادم۔جس طرح نبی کے مقابلہ میں امت خادم ہوتی ہے اور نبی حاکم۔جس طرح نبی کے مقابلہ میں اگر ساری دنیا بھی تباہ کردی جائے تو کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔اسی طرح اگر خدا تعالیٰ کا پیغام دنیا تک پہنچ جائے تو پھر بے شک نبی شہید ہوجائے۔اس میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔کیونکہ وہ اس غرض کے لئے آیا تھا کہ صداقت دنیا میں پھیلائے۔پس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس خدشہ کا اظہار اپنی موت کے خوف سے نہیں کیا

بلکہ اس لئے کیا کہ کہیں صداقت دنیا سے مٹ نہ جائے ۔اور خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچانے سے پہلے ہی وہ اس کے ظلم و استبداد کا شکار نہ ہو جائیں۔

وَ لَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ کے الفاظ بتارہے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جو یہ فعل سرزد ہوا تھا محض ایک اتفاقی حادثہ تھا۔ جو خدا تعالیٰ کی نگاہ میں آپ کو مجرم بنانے والا نہیں تھا۔ کیونکہ ذَنْبٌ ہر ایسے فعل کو کہتے ہیں جس کا نتیجہ خراب نکلے خواہ شرعی نقطہ نگاہ سے وہ انسان کو مجرم بنانے والا نہ ہو (مفردات) مگر اس سے بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقام کا فرق ظاہر ہو جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ان کی بعثت سے پہلے ایک الزام لگایا گیا خواہ وہ جھوٹا ہی تھا۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی بعثت سے پہلے بھی تمام لوگ امین اور صدوق کہتے اور آپ کی نیکی اور انصاف اور دیانتداری کے قائل تھے۔ بہر حال یہ حادثہ چونکہ ایسا تھا جس میں فرعونی قوم کا ایک آدمی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے مارا گیا تھا اور فرعون کے وزراء نے آپ کو قتلِ عمد کا مرتکب قرار دے کر چاہا تھا کہ آپ کو قتل کر دیا جائے جس کے نتیجہ میں آپ کو مصر سے بھاگ کر مدین میں پناہ گزین رہنا پڑا اس لئے آپ نے اس فعل کو ذنب قرار دیا۔ اور اس خدشہ کا اظہار فرمایا کہ ایسا نہ ہو کہ وہ میرے اس فعل کی بنا پر مجھے جاتے ہی گرفتار کر لیں اور مجھے قتل کر دیں۔ یہ واقعہ قرآن کریم میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک دفعہ رات کے وقت شہر میں پھر رہے تھے کہ انہوں نے دو آدمیوں کو آپس میں لڑتے اور دست و گریبان ہوتے دیکھا۔ ان میں سے ایک ان کی قوم کا فرد تھا اور ایک ان کی دشمن یعنی فرعونی قوم کا فرد تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ کر ان کی قوم کے آدمی نے انہیں آواز دی اور اپنی مدد کے لئے بلایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام آگے بڑھے اور انہوں نے مخالف شخص کو ایک مکّا مارا۔ مکّا یا تو اسے زیادہ زور سے مارا گیا یا اس شخص کا دل اور جگر کمزور تھا اور مکا اس کے دل اور جگر پر لگا۔ بہر حال اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ گر گیا اور اس کی جان نکل گئی دوسرے دن وہ صبح کے وقت پھر شہر کی گشت کے لئے نکلے۔ تو اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ وہی شخص جو کل ان سے مدد مانگ رہا تھا آج پھر کسی اور سے لڑ رہا ہے اور موسیٰؑ کو اپنی مدد کے لئے بلا رہا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب دیکھا کہ کل بھی یہی شخص لڑ رہا تھا اور آج بھی یہی لڑ رہا ہے تو سمجھا کہ یہ کوئی جوشیلا آدمی معلوم ہوتا ہے ورنہ وجہ کیا ہے کہ ہر شخص اسی کو مارنے کے لئے اٹھ کھڑا ہو۔ چنانچہ آپ نے اسے کہا کہ دوسرے شخص کا قصور تو ہوگا۔ مگر تم بھی بہت جوشیلے معلوم ہوتے ہو۔ اس کے بعد انہوں نے چاہا کہ آگے بڑھ کر دوسرے شخص کا مقابلہ کریں۔ مگر اس نے سمجھا کہ چونکہ ابھی انہوں نے مجھے ڈانٹا ہے اس لئے شاید یہ مجھے ہی مارنے کے لئے آگے بڑھے ہیں۔ چنانچہ اس نے بے سوچے سمجھے

چلّا چلّا کر کہنا شروع کر دیا کہ اے موسیٰ! کیا تو یہ چاہتا ہے کہ جس طرح کل تو نے ایک شخص کو مارا تھا اسی طرح مجھے بھی مار دے۔ اس کے اس شور سے ارد گرد کے لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ کل جو آدمی مارا گیا ہے وہ موسیٰؑ نے ہی مارا تھا۔ اور چونکہ مقتول فرعونی قوم کا آدمی تھا۔ اس لئے یہ خبر شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور تمام قوم میں ایک جوش پیدا ہو گیا۔ یہاں تک کہ یہ خبر ذمہ دار افسروں تک پہنچ گئی اور انہوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ موسیٰؑ کو قتل کر دیا جائے۔ اس پر انہی سرداران قوم میں سے ایک شخص جو در پردہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مخلصانہ تعلقات رکھتا تھا دوڑا ہوا آیا اور اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ سرداران قوم تیرے قتل کا مشورہ کر رہے ہیں اس لئے میری نصیحت یہ ہے کہ فوراً اس شہر سے نکل جاؤ۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام شہر سے نکلے اور کئی منزلیں طے کرنے کے بعد مدین میں جا نکلے۔ پس وَ لَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسی واقعہ کی طرف اشارہ فرمایا اور اس خدشہ کا اظہار کیا کہ وہ لوگ اس واقعہ کی بنا پر مجھے قتل نہ کر دیں۔ اس سے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت ظاہر ہے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تو اللہ تعالیٰ سے اپنی حفاظت کا وعدہ لیا۔ لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بغیر کچھ بولے کھڑے ہو گئے اور آپؐ نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں کسی قسم کی تکلیف کی پروا نہ کی۔ بہر حال حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اس خدشہ کا اظہار کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ تم دونوں ہمارے نشانات کے ساتھ فرعون کے پاس جاؤ اور یاد رکھو کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور ہمیشہ تمہاری دعاؤں کو سنتے رہیں گے۔ جب بھی تمہیں کوئی مشکل پیش آئے تم میرے حضور جھکو اور دعائیں کرو۔ میں اسی وقت تمہاری مدد کے لئے دوڑا چلا آؤں گا تمہارا کام یہ ہے کہ تم فرعون کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ ہم رب العالمین خدا کے رسول ہیں۔ اور ہم اس لئے آئے ہیں کہ تو بنی اسرائیل کو اپنی غلامی سے آزاد کر کے ہمارے ساتھ روانہ کر دے۔

اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ پر بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہاں موسیٰؑ اور ہارونؑ دو کا ذکر ہے مگر آگے یہ فرمایا گیا ہے کہ ہم دونوں رب العالمین کی طرف سے رسول ہیں۔ حالانکہ دو آدمیوں کے لئے رَسُوْلَانِ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے رسول کا لفظ استعمال نہیں کیا جاتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عرب لوگ کبھی کبھی یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ هٰذَانِ رَسُوْلِیْ وَوَکِیْلِیْ وَهٰؤُلَاءِ رَسُوْلِیْ وَوَکِیْلِیْ یعنی یہ دو یا سب کے سب میرے رسول اور وکیل ہیں (فتح البیان زیر آیت فاتیا فرعون فقولا۔۔۔) اسی طرح قرآن کریم میں بھی دوسری جگہ یہ محاورہ استعمال کیا گیا ہے چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْۤ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ (الشعراء:۷۸) یعنی یہ سب کے سب رب العالمین کے سوا میرے دشمن ہیں حالانکہ عام عربی قواعد کے لحاظ سے یہ

کہنا چاہیے تھا کہ یہ سب میرے اعداء ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے یہاں اَعْدَاءٌ کا لفظ نہیں بلکہ عَدُوٌّ کا لفظ رکھا ہے جو مفرد ہے۔ پس اس آیت پر نہ عربی زبان کے لحاظ سے کوئی اعتراض ہوسکتا ہے اور نہ محاورۂ قرآن کے لحاظ سے کوئی اعتراض ہوسکتا ہے۔

اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ میں اَنْ تفسیری بھی ہوسکتا ہے اور اَنْ مصدری بھی ہوسکتا ہے۔ مصدری ہونے کی صورت میں اس کے یہ معنے ہوں گے کہ نَحْنُ مُرْسَلُوْنَ لِنُرْسِلَ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ہم خدا تعالیٰ کی طرف سے بنی اسرائیل کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ اس موقعہ پر قرآن کریم اور بائیبل کے ایک اختلاف کا ذکر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ بائیبل میں لکھا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کہا کہ

''تُو اسرائیلی بزرگوں کو ساتھ لے کر مصر کے بادشاہ کے پاس جانا اور اس سے کہنا کہ خداوند عبرانیوں کے خدا کی ہم سے ملاقات ہوئی اب تُو ہم کو تین دن کی منزل تک بیابان میں جانے دے تا کہ ہم خداوند اپنے خدا کے لئے قربانی کریں۔'' (خروج باب ۳ آیت ۱۸)

گویا نعوذ باللہ خدا تعالیٰ نے ایک رنگ میں حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ کو دھوکا کی تعلیم دی۔ اور کہا کہ فرعون کو اگر صاف طور پر کہہ دیا گیا کہ ہم بنی اسرائیل کو اس ملک سے نکال کر لے جانا چاہتے ہیں تو وہ اس کی اجازت نہیں دے گا۔ اس دھوکا اور فریب سے اس سے اجازت حاصل کی جائے کہ ہم اپنے خدا کے لئے قربانی کرنا چاہتے ہیں اس لئے ہمیں مصر سے نکلنے کی اجازت دی جائے۔ جب وہ اس کی اجازت دے دے تو اس بہانہ سے تمام بنی اسرائیل کو اپنے ساتھ لے کر مصر سے نکل آنا۔ لیکن قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ بات غلط ہے۔ ہم نے موسیٰؑ اور ہاورنؑ کو صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ فرعون سے جاتے ہی یہ مطالبہ کرنا کہ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دیا جائے کیونکہ اب ان پر مظالم کی انتہا ہوچکی ہے۔ کسی دھوکا اور فریب کی ہم نے انہیں تعلیم نہیں دی تھی۔

اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ کے الفاظ یہ بھی بتاتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک مختص القوم نبی تھے جو صرف بنی اسرائیل کو غلامی کی ان زنجیروں سے آزاد کرانے کے لئے آئے تھے جن میں وہ سینکڑوں سال سے جکڑے چلے آتے تھے۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے یہ فضیلت عطا فرمائی کہ آپ کسی ایک قوم کی طرف نہیں بلکہ تمام دنیا کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا (السبا: ۲۹) یعنی اے محمدؐ رسول اللہ! ہم نے تجھے تمام بنی نوع انسان کے لئے بشیر

اور نذیر بنا کر بھیجا ہے۔اس میں عربی اور غیر عربی یا مشرقی اور مغربی کا کوئی امتیاز نہیں۔دنیا کے ہر شخص کا خواہ وہ کسی ملک کا رہنے والا ہو اور خواہ وہ کوئی زبان بولنے والا ہو۔فرض ہے کہ وہ تیرے پیغام کو قبول کرے اور تیری ہدایات کے تابع چلے۔محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے ملک میں پیدا ہوئے تھے جو تمام دنیا سے منقطع تھا۔وہ ملک تمدن کے لحاظ سے بھی کمزور تھا۔علمی لحاظ سے بھی کمزور تھا اور سیاسی لحاظ سے بھی کمزور تھا۔اس کمزور ترین ملک میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک کمزور ترین انسان تھے۔لیکن خدا تعالیٰ نے آپ سے کہا کہ ہم نے تجھے تمام دنیا کی طرف رسول بنا کر مبعوث کیا ہے۔

اگر ہم اس فقرہ کی صحیح ترجمانی کریں تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ خدا تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے کہا۔اے میرے رسول! تو کہہ دے کہ میں کینیڈا کی ہدایت کے لئے آیا ہوں جس کو تم جانتے بھی نہیں۔میں یونائیٹڈ اسٹیٹس امریکہ کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا ہوں جو ابھی آباد بھی نہیں ہوئیں۔مجھے خدا تعالیٰ نے برازیل، کیوبا، بولیویا، چلّی، کولمبیا اور میکسیکو کی ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا ہے جنہیں ابھی کوئی جانتا بھی نہیں اور بالکل ویران پڑے ہیں اور کسی آئندہ زمانہ میں آباد ہوں گے۔میں جاپان اور فلپائن کی اصلاح کے لئے بھیجا گیا ہوں جن کو کوئی نہیں جانتا بلکہ میں ان ملکوں کی ہدایت کے لئے بھی مامور کیا گیا ہوں جو ابھی دریافت بھی نہیں ہوئے۔غرض اس آیت کو پھیلا کر دیکھا جائے تو انسان محوِ حیرت ہو جاتا ہے۔آخر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس دعویٰ کو پورا کرنے کے کون سے سامان تھے۔آپ کے پاس کون سے ہوائی جہاز تھے کہ جن کے ذریعہ آپؐ امریکہ جاتے۔کینیڈا جاتے۔برازیل، کولمبیا اور بولیویا جاتے۔پھر آپ کے پاس وہ کون سے ذرائع تھے کہ جن سے آپ اپنی تعلیم کو اپنی وفات کے بعد بھی ممتد کئے جاتے جب تک وہ ملک دریافت نہ ہوتے آپؐ وہاں جا ہی کیسے سکتے تھے۔لوگ بات کرتے ہیں تو ان کے بیٹے بھول جاتے ہیں اور اگر بیٹے یاد رکھتے ہیں تو پوتے بھول جاتے ہیں۔اگر پوتے یاد رکھتے ہیں تو پڑپوتے بھول جاتے ہیں۔مگر یہ ملک تو اس وقت دریافت بھی نہیں ہوئے تھے۔آپؐ کی وفات کے نوسو سال بعد امریکہ دریافت ہوا۔لیکن فرض کرو۔اس وقت امریکہ دریافت بھی ہوا ہوتا تو آپؐ کے پاس کون سی گارنٹی تھی کہ آپ کا دعویٰ پورا ہو جائے گا۔ہمیں تو یہی نظر آتا ہے کہ لوگ اپنے بچے قربان کرتے ہیں اپنے بھائی قربان کرتے ہیں اپنا عیش اور آرام قربان کرتے ہیں۔بعض ناجائز باتوں کے لئے قربانیاں کرتے ہیں۔بعض جائز اور اچھی باتوں کے لئے قربانیاں کرتے ہیں لیکن ان کے نتائج بہت محدود ہوتے ہیں اور ان محدود نتائج کا بھی کوئی ذمہ وار نہیں ہوتا۔مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جس طرح دعویٰ تمام دنیا سے نرالا تھا۔اسی طرح آپؐ کا بدلہ بھی

نرالا تھا چنانچہ باوجود اس کے کہ آپؐ کے پاس کوئی ایسے سامان نہیں تھے جن سے آپ اپنا پیغام دنیا کے تمام ممالک تک پہنچا سکتے۔ پھر بھی خدا تعالیٰ نے آپ کو ابیض و اسود اور احمر و اصفر سب میں قبولیت بخشی اور آپ کا دین مختلف قوموں اور ملکوں میں پھیلنا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ وہ دنیا کے کناروں تک پھیل گیا۔ چنانچہ آج چین میں کروڑوں مسلمان ہیں۔ انڈونیشیا میں نوے فیصدی مسلمان ہیں۔ انڈین یونین میں پچیس تیس فیصدی مسلمان ہیں۔ پھر افغانستان، ایران، برما، شام، فلسطین، ایبے سینیا، وسطی افریقہ، شمالی وجنوبی افریقہ، مغربی ومشرقی افریقہ، امریکہ، ایشیا اور یورپ کے بہت سے علاقوں میں لاکھوں کروڑوں مسلمان پائے جاتے ہیں۔ غرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ نمایاں امتیاز حاصل ہے کہ آپ تمام دنیا کی طرف مبعوث کئے گئے جبکہ موسیٰؑ صرف بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے مبعوث کئے گئے۔

چونکہ بنی اسرائیل کی غلامی کا اصل باعث فرعون کا پنجہء استبداد تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کی طرف موسیٰ کو بھجوایا اور اسے توجہ دلائی کہ بنی اسرائیل کی مظلومیت کی پکار ہمارے عرش تک پہنچ چکی ہے اب تمہارے لئے سوائے اس کے اور کوئی راستہ نہیں کہ تم اپنے فولادی پنجہ کی گرفت کو ڈھیلا کر دو اور بنی اسرائیل کو آزاد کر دو ورنہ خدا تعالیٰ کے فرشتے آسمان سے تلواریں لے کر اتریں گے اور وہ تمہیں اس جرم کی عبرتناک سزا دیں گے۔

قَالَ اَلَمۡ نُرَبِّكَ فِيۡنَا وَلِيۡدًا وَّ لَبِثۡتَ فِيۡنَا مِنۡ عُمُرِكَ

اس (فرعون) نے کہا (اے موسیٰ) کیا ہم نے تجھ کو اس وقت نہیں پالا جبکہ تو ابھی بچہ تھا۔ اور تو نے ہم میں

سِنِيۡنَ ۙ﴿۱۹﴾ وَ فَعَلۡتَ فَعۡلَتَكَ الَّتِىۡ فَعَلۡتَ وَ اَنۡتَ مِنَ

اپنی عمر کے بہت سے سال گذارے ہیں۔ اور تو نے وہ کام بھی کیا ہے جو تو کر چکا ہے۔ اور تُو (ہمارے احسانوں

الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۲۰﴾ قَالَ فَعَلۡتُهَاۤ اِذًا وَّ اَنَا مِنَ الضَّآلِّيۡنَ ﴿۲۱﴾ؕ

کا) ناشکر گذار ہے۔ (موسیٰ نے) کہا وہ کام (جس کا تو نے اشارہ کیا ہے) میں نے اس وقت کیا تھا جبکہ میں

فَفَرَرۡتُ مِنۡكُمۡ لَمَّا خِفۡتُكُمۡ فَوَهَبَ لِىۡ رَبِّىۡ حُكۡمًا وَّ

اپنی قوم کی محبت میں سرشار تھا۔ پس جب مجھے تم سے ڈر محسوس ہوا تو میں تم سے بھاگ کر چلا گیا۔ اس پر میرے

جَعَلَنِیۡ مِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۲۲﴾ وَ تِلۡکَ نِعۡمَۃٌ تَمُنُّہَا عَلَیَّ اَنۡ

رب نے مجھے حکم (یعنی عہدۂ نبوت) عطا فرمایا اور مجھے رسولوں میں سے (ایک رسول) بنا دیا۔ اور یہ (بچپن میں

عَبَّدۡتَّ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ﴿۲۳﴾ؕ

مجھے پالنے کی) نعمت جس کا تم احسان جتاتے ہو کیا یہ اس بات کے مقابل میں پیش کی جاتی ہے کہ تم نے بنی اسرائیل کی ساری قوم کو غلام بنا چھوڑا ہے۔

تفسیر ۔فرماتا ہے۔ جب فرعون نے موسیٰؑ اور ہارونؑ کا یہ پیغام سنا۔ تو نہایت ڈھٹائی سے کہنے لگا۔ اے موسیٰ! وہ دن بھول گئے جب ہم تجھے پالا کرتے تھے۔ اور جب کہ تو نے اپنی عمر کے کئی سال ہم میں گذارے۔ اب تجھے بھی باتیں کرنی آ گئی ہیں اور تو جو ہمارے ٹکڑوں پر پلا ہے۔ اب ہمیں ہی نصیحت کرنے کے لئے آ گیا ہے۔ یہ الفاظ اس نے موسیٰؑ کی تحقیر کے لئے اسی طرح کہے جس طرح فقیہوں اور فریسیوں نے جب مسیحؑ کو کوچوں اور بازاروں میں تبلیغ کرتے اور خدائے واحد کا نام بلند کرتے دیکھا تو انہوں نے کہا:

''کیا یہ بڑھئی کا بیٹا نہیں۔ اور اُس کی ماں کا نام مریم اور اس کے بھائی یعقوب اور یوسف اور شمعون اور یہودہ نہیں۔ اور کیا اس کی سب بہنیں ہمارے ہاں نہیں۔ پھر یہ سب کچھ اس میں کہاں سے آیا۔ اور انہوں نے اس کے سبب سے ٹھوکر کھائی۔'' (متی باب ۱۳ آیت ۵۵ تا ۵۷)

جس طرح فریسیوں کے لئے یہ بات حیرت کا موجب تھی کہ یہ شخص جو ایک بڑھئی کا بیٹا ہے اور جس کی تمام بہنیں ہمارے ہاں بیاہی ہوئی ہیں ہمیں وعظ اور نصیحت کرنے کے لئے آ گیا ہے۔ اسی طرح فرعون کے لئے بھی یہ بات حیرت کا موجب ہوئی کہ موسیٰ جسے اس کی ماں نے ہم سے ڈرتے ہوئے سمندر کی طوفانی موجوں میں پھینک دیا تھا اور جسے بچا کر ہم نے اپنے گھروں میں رکھا اور اس کی پرورش کی وہی ہمارے ٹکڑے کھانے کے بعد آج نعوذ باللہ ایسا طوطا چشم نکلا ہے کہ میری طاقت اور عظمت کا اس نے ذرا بھی پاس نہیں کیا اور اس نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ میں اس کی غلامی اختیار کروں۔ فرعون اس وقت موسیٰؑ کی ابتدائی حالت اور اپنے موجودہ عروج کو دیکھ رہا تھا۔ مگر وہ اس بات کو بھول گیا کہ بعض دفعہ ایک چھوٹا سا بیج بویا جاتا ہے لیکن بعد میں وہ نشوونما پاتے پاتے اتنا ترقی کر جاتا ہے کہ دنیا حیران ہو جاتی ہے۔ اور بعض دفعہ ایک چیز ابتداء میں نہایت اہم نظر آتی ہے لیکن اس کا انجام اتنا چھوٹا ہوتا

ہے کہ انسان حیران ہوجاتا ہے کہ ایک چھوٹی سی بات کو اتنی اہمیت اور عظمت کیوں دے دی گئی تھی ۔ مثلاً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوجہل قریباً ہم عمر تھے ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش ایسی حالت میں ہوئی کہ آپؐ کے والد آپ کی پیدائش سے پہلے ہی فوت ہو چکے تھے ۔ اگر وہ زندہ بھی ہوتے تو پھر بھی وہ کوئی مالدار آدمی نہیں تھے ۔ آپؐ کے دادا حضرت عبدالمطلب بھی امیر لوگوں میں سے نہ تھے اور گو آپ آسودہ حال ضرور تھے لیکن چونکہ آپ ایک سخی آدمی تھے ۔ اس لئے آخری عمر میں آپ کی دولت بہت کم ہوگئی تھی ۔ پس اول تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان کوئی امیر خاندان نہیں تھا دوسرے آپ خصوصیت سے غریبانہ حالت میں پیدا ہوئے ۔ آپؐ کے والد آپؐ کی پیدائش سے پہلے ہی فوت ہو چکے تھے ۔ پس آپ کی پیدائش پر آپ کی والدہ نے کیا خوشی کی ہوگی ۔ آپ کی والدہ کے پاس کچھ تھا ہی نہیں ۔ لوگ تو دنیا کو دیکھتے ہیں ۔ مال اور دولت کو دیکھتے ہیں ۔ جہاں روپیہ ہوتا ہے وہاں جمع ہو جاتے ہیں مگر آپ کی والدہ کے پاس روپیہ نہیں تھا ۔ شاید آپ کے قریبی رشتہ دار مبارکباد دینے کے لئے آ گئے ہوں ۔ مگر دوسرے لوگوں نے آپ کی پیدائش کو کوئی اہمیت نہیں دی ۔ لیکن ابوجہل کا باپ مالدار تھا ۔ جب وہ پیدا ہوا ہوگا اس کے ماں باپ نے کتنی خوشیاں منائی ہوں گی ۔ ابوجہل کا نام ابوالحکم تھا یعنی حکمتوں کا باپ ۔ عقلمند دانا اور مدبّر ۔ لیکن بعد میں اس نے جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شدید مخالفت کی اور حماقت کا اظہار کیا تو مسلمانوں نے اس کا نام ابوجہل رکھ دیا ۔ ابوجہل کے ماں باپ چونکہ مالدار تھے ۔ اس لئے جب وہ پیدا ہوا ہوگا ۔ تو ہر شخص جس کی ضروریات ان سے وابستہ ہوں گی ان کے گھر پہنچا ہوگا اور اس کی پیدائش پر مبارکباد دی ہوگی اور کہا ہوگا ہمارا ملک کتنا ہی خوش قسمت ہے جس میں اس جیسا بچہ پیدا ہوا ۔ اس کے چہرہ سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اقبال کا ستارہ کتنا بلند ہے ۔ غرض اس کی تعریف میں لوگوں نے ہزاروں مبالغے کئے ہوں گے معلوم نہیں اس کی پیدائش پر کتنے اونٹ ذبح کر کے دعوتیں کی گئی ہوں گی ۔ خوشی میں دفیں بجائی گئی ہوں گی ۔ عورتوں نے گیت گائے ہوں گے ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش پر آپ کے گھر کے پاس سے گذرنے والے یہ خیال کرتے ہوں گے کہ ایک غریب کے ہاں بچہ پیدا ہوا ہے جو خود بخود ختم ہو جائے گا ۔ لیکن ابوجہل کی پیدائش پر اس کے گھر کے پاس سے گذرنے والے یہ سمجھتے ہوں گے کہ آج ایک رئیس پیدا ہوا ہے ۔ نہ معلوم بڑا ہو کر یہ کیا کچھ کرے گا ۔ غرض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتداء بظاہر ایک ادنیٰ رنگ میں ہوئی لیکن انتہا کیا ہوئی ؟ وہی بچہ جس کو دائیاں لینے کے لئے تیار نہیں تھیں ۔ جس کی پیدائش پر مکہ والوں نے کوئی نوٹس نہیں لیا تھا جب فوت ہوا تو عرب کی تاریخ میں ہی نہیں ساری دنیا کی تاریخ میں ایک غیر معمولی حیثیت رکھتا تھا ۔ گویا آپ پر یہ الٰہی نوشتہ اپنی پوری شان کے ساتھ صادق آیا کہ

”وہ پتھر جسے معماروں نے ناپسند کیا وہی کونے کا سرا ہوا۔“

(مرقس باب ۱۲ آیت ۱۰ ولوقا باب ۲۰ آیت ۱۷)

سارے عرب قبائل آپ کے زیر سایہ تھے جو آپ سے پہلے کسی بادشاہ کے مطیع نہیں ہوئے تھے۔ پھر بادشاہوں کو جو ظاہری عظمت حاصل ہوتی ہے اس کی وجہ سے ڈر کے مارے لوگ ان کی بڑائیاں بیان کرتے ہیں لیکن دل میں انہیں ہزاروں ہزار گالیاں دیتے ہیں۔ بادشاہ جب مرجاتے ہیں تو بے شک ان کی موت سے ملک کو صدمہ بھی ہوتا ہے لیکن لوگ یہی کہتے ہیں کہ ایک بادشاہ اگر مر گیا ہے تو کوئی دوسرا شخص بادشاہ بن جائے گا اور وہ وہی کام شروع کر دے گا جو پہلا بادشاہ کرتا تھا۔ انگریزی میں ایک مثل ہے King never dies یعنی بادشاہ کبھی نہیں مرتے۔ (3000 Proverbs by Sam Philips pg.87 under the word King) ایک بادشاہ مرجاتا ہے تو دوسرا کھڑا ہو جاتا ہے اور پہلے بادشاہ اور دوسرے بادشاہ میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہوتا۔ اگر قوم بیدار ہوتی ہے تو دوسرے بادشاہ کے وقت میں بھی وہ ترقی کرتی چلی جاتی ہے۔ لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا۔ آپ کی وفات کو تمام عرب نے جو اس وقت آپؐ کی خوبیوں، اہمیت اور عظمت کا قائل ہو چکا تھا ایک انسان کی موت خیال نہیں کیا۔ ملک کی موت خیال نہیں کیا۔ بلکہ دنیا کی موت خیال کیا۔ چنانچہ حسان بن ثابتؓ نے آپ کی وفات پر جو شعر کہے وہ یہ ہیں کہ ؎

كُنْتَ السَّوَادَ لِنَاظِرِيْ فَعَمِيَ عَلَيَّ النَّاظِرُ
مَنْ شَاءَ بَعْدَكَ فَلْيَمُتْ فَعَلَيْكَ كُنْتُ أُحَاذِرُ

(دیوان حسان بن ثابت صفحہ ۳۰۸)

یعنی اے محمدؐ رسول اللہ! آپ تو میری آنکھوں کی پتلی تھے آپ کی وفات نہیں ہوئی بلکہ میری آنکھیں اندھی ہوگئی ہیں۔ اب کوئی شخص مرتا پھرے مجھے اس سے کیا۔ میں تو آپؐ کے متعلق ہی ڈرتا تھا۔ یہ وہ جذبۂ عقیدت تھا جو آپ کے متعلق صحابہؓ میں پایا جاتا تھا۔ حسان بن ثابتؓ نے ایک شاعرانہ کلام ہی نہیں کہا بلکہ تاریخ شاہد ہے کہ تمام عرب نے حسان بن ثابتؓ کے ان شعروں کو اپنے ہی جذبات کا اظہار خیال کیا۔ گویا عرب کی آواز حسان بن ثابتؓ کی زبان پر جاری ہوگئی۔ تاریخ کہتی ہے کہ ہفتوں تک مدینہ، مکہ اور دوسرے مسلمان شہروں والے اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے ہوئے بازاروں میں چلتے ہوئے اور اپنے کاروبار کرتے ہوئے یہی شعر پڑھتے تھے کہ

كُنْتَ السَّوَادَ لِنَاظِرِیْ فَعَمِیَ عَلَيَّ النَّاظِرُ
مَنْ شَاءَ بَعْدَكَ فَلْيَمُتْ فَعَلَيْكَ كُنْتُ أُحَاذِرُ

لیکن ابوجہل جس کی پیدائش پر ہفتوں اونٹ ذبح کر کے لوگوں میں گوشت تقسیم کیا گیا تھا جس کی پیدائش پر دفوں کی آواز سے مکہ کی فضا گونج اٹھی تھی۔ بدر کی لڑائی میں جب مارا جاتا ہے تو پندرہ پندرہ سال کے دو انصاری چھوکرے تھے جنہوں نے اسے زخمی کیا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ جنگ کے بعد جب لوگ واپس جا رہے تھے۔ تو میں میدان میں زخمیوں کو دیکھنے کے لئے چلا گیا۔ آپ بھی مکہ ہی کے تھے اس لئے ابوجہل آپ کو اچھی طرح جانتا تھا۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں میدان جنگ میں پھر ہی رہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ ابوجہل زخمی پڑا کراہ رہا ہے۔ جب میں اس کے پاس پہنچا تو اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میں اب بچتا نظر نہیں آتا تکلیف زیادہ بڑھ گئی ہے۔ تم بھی مکہ والے ہو میں یہ خواہش کرتا ہوں کہ تم مجھے مار دو تا میری تکلیف دور ہو جائے لیکن تم جانتے ہو کہ میں عرب کا سردار ہوں اور عرب میں یہ رواج ہے کہ سرداروں کی گردنیں لمبی کر کے کاٹی جاتی ہیں اور یہ مقتول کی سرداری کی علامت ہوتی ہے۔ میری یہ خواہش ہے کہ تم میری گردن لمبی کر کے کاٹنا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اس کی گردن ٹھوڑی سے کاٹ دی اور کہا کہ تیری یہ آخری حسرت بھی پوری نہیں کی جائے گی (بخاری کتاب المغازی باب قتل ابی جھل، السیرۃ الحلبیۃ ذکر مغازیہ باب غزوۃ بدر الکبری)۔ اب انجام کے لحاظ سے دیکھو تو ابوجہل کی موت کتنی ذلت کی موت تھی۔ جس کی گردن اپنی زندگی میں ہمیشہ اونچی رہا کرتی تھی۔ وفات کے وقت اس کی گردن ٹھوڑی سے کاٹی گئی اور اس کی یہ آخری حسرت بھی پوری نہ ہوئی۔ پھر چونکہ کفار رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ میں گڑھے کھودا کرتے تھے اور مسلمانوں کو پتھروں پر گھسیٹتے تھے اور آپؐ کی یہ پیشگوئی تھی کہ ایک دن ان کفار کو بھی بالوں سے پکڑ پکڑ کر گھسیٹا جائے گا (العلق: ۱۶، ۱۷) اس لئے بدر کی جنگ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو حکم دیا کہ کفار کی لاشوں کو ایک اندھے کنوئیں میں گرا دیا جائے۔ آپؐ کے اس حکم کے مطابق صحابہؓ نے کفار کی لاشوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر ایک اندھے کنوئیں میں پھینک دیا (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام ذکر رؤیا عاتکۃ بنت عبد المطلب)۔ غرض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوجہل دونوں کی پیدائش اور وفات کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ پیدائش کے وقت جو ناقابل التفات نظر آتا تھا وفات کے وقت وہ سید عرب بنا۔ لیکن جو سید عرب نظر آتا تھا وفات کے وقت وہ نہایت ہی ذلیل وجود ثابت ہوا۔ غرض بعض دفعہ ایک چیز کی ابتداء اور ہوتی ہے اور انتہا اور۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی جب پیدا ہوئے تو آپ کے ماں باپ نے آپ کی پیدائش پر خوشی کی ہوگی۔ مگر جب آپ کی عمر بڑی ہوگئی اور آپ کے اندر دنیا سے بے رغبتی پیدا ہوگئی تو آپ کے والد آپ کی اس حالت کو دیکھ کر آہیں بھرا کرتے تھے کہ ہمارا یہ بیٹا کسی کام کے قابل نہیں۔ مجھے ایک سکھ نے بتایا کہ ہم دو بھائی تھے ہمارے والد صاحب بڑے مرزا صاحب (یعنی مرزا غلام مرتضیٰ صاحب) کے پاس آیا کرتے تھے۔ اور ہم بھی بسااوقات ان کے ساتھ آجایا کرتے تھے ایک دفعہ مرزا صاحب نے ہمارے والد صاحب سے کہا کہ تمہارے لڑکے غلام احمد (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے پاس آتے جاتے ہیں تم ان سے کہو کہ اسے جا کر سمجھائیں۔ ہم دونوں جب آپ کے پاس جانے کے لئے تیار ہوگئے تو مرزا صاحب نے کہا کہ غلام احمد (علیہ السلام) کو باہر جا کر کہنا کہ تمہارے والد کو اس خیال سے بہت دکھ ہوتا ہے کہ اس کا چھوٹا لڑکا اپنے بڑے بھائی کی روٹیوں پر پلے گا۔ اسے کہو کہ میری زندگی میں ہی کوئی کام کرلے۔ میں کوشش کررہا ہوں کہ اسے کوئی اچھی نوکری مل جائے میں مرگیا تو پھر سارے ذرائع بند ہوجائیں گے۔ اس سکھ نے بتایا کہ ہم مرزا غلام احمد صاحب (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے پاس گئے اور کہا کہ آپ کے والد صاحب آپ کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ انہیں یہ دیکھ کر کہ آپ کچھ کام نہیں کرتے بہت دکھ ہوتا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ اگر میں مرگیا تو غلام احمد کا کیا بنے گا۔ آپ اپنے والد صاحب کی بات کیوں نہیں مان لیتے۔ آپ کے والد صاحب اس وقت کپورتھلہ میں کوشش کررہے تھے اور کپورتھلہ کی ریاست نے آپ کو ریاست کا افسر تعلیم مقرر کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ وہ سکھ کہنے لگا کہ جب ہم نے یہ بات کہی کہ آپ اپنے والد صاحب کی بات کیوں نہیں مان لیتے آپ کچھ کام کرلیں تو آپ نے فرمایا والد صاحب تو یونہی غم کرتے رہتے ہیں انہیں میرے مستقبل کا کیوں فکر ہے میں نے تو جس کی نوکری کرنی تھی کرلی ہے۔ ہم واپس آگئے اور مرزا غلام مرتضیٰ صاحب سے آکر ساری بات کہہ دی۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ اگر اس نے یہ بات کہی ہے تو ٹھیک کہا ہے وہ جھوٹ نہیں بولا کرتا۔

یہ آپؑ کی ابتداء تھی اور پھر ابھی تو انتہا نہیں ہوئی لیکن جو عارضی انتہا نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ کی وفات کے وقت ہزاروں ہزار آدمی آپ پر قربان ہونے والا موجود تھا۔ آپ خود فرماتے ہیں ؎

لُفَاظَاتُ الْمَوَائِدِ کَانَ اُکُلِیْ
وَصِرْتُ الْیَوْمَ مِطْعَامَ الْاَھَالِیْ

(آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۵۹۶)

ایک وہ زمانہ تھا جب بچے ہوئے ٹکڑے مجھے دیئے جاتے تھے اورآج میرا یہ حال ہے کہ میں سینکڑوں خاندانوں کو پال رہا ہوں۔آپ کی ابتداء کتنی چھوٹی تھی مگرآپ کی انتہا ایسی ہوئی کہ علاوہ ان لوگوں کے جو خدمت کرتے تھے لنگر میں روزانہ دواڑھائی سوآدمی کھانا کھاتے تھے۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ اپنے والد کی جائیداد میں اپنے بھائی کے برابر کے شریک تھے۔لیکن زمینداروں میں یہ عام دستور ہے کہ جو کام کرے وہ تو جائیداد میں شریک سمجھا جاتا ہے اور جو کام نہیں کرتا وہ جائیداد میں شریک نہیں سمجھا جاتا اور یہ دستور ابھی تک چلا آتا ہے۔لوگ عموماً کہہ دیتے ہیں کہ جو کام نہیں کرتا اس کا جائیداد میں کیا حصہ ہوسکتا ہے۔آپ کے پاس جب کوئی ملاقاتی آتا اورآپ اپنی بھاوجہ کو کھانے کے لئے کہلا بھیجتے تو وہ آگے سے کہہ دیتیں کہ وہ یونہی کھاپی رہا ہے۔کام کاج تو کوئی کرتا نہیں۔اس پرآپ اپنا کھانا اس مہمان کو کھلا دیتے اور خود فاقہ کرلیتے یا چنے چبا کر گذارہ کرلیتے۔خدا کی قدرت ہے کہ وہی بھاوجہ جو اس وقت آپ کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتی تھیں بعد میں میرے ہاتھ پر احمدیت میں داخل ہوئیں۔غرض اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب کوئی کام شروع کیا جاتا ہے تو اس کی ابتداء بڑی نظر نہیں آیا کرتی لیکن اس کی انتہا پر دنیا حیران ہوجاتی ہے۔

فرعون نے بھی موسیٰؑ کو ان کی ابتدائی کسمپرسی کا حوالہ دیا اور کہا کہ تم مجھے نصیحت کیا کرسکتے ہو۔تمہاری تو خود ہمارے خاندان نے پرورش کی ہے۔حالانکہ دنیا میں کبھی کسی چیز کی ابتداء کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ اس کی انتہا پر نظر ڈالی جاتی ہے۔بڑ کے بیج کو دیکھ کر اگر کوئی شخص اسے بے حقیقت خیال کرتا ہے تو وہ نادان ہے لیکن اس سے بھی بڑھ کر وہ نادان ہے جو اپنی آنکھوں سے بڑ کے درخت کا اس قدر پھیلاؤ دیکھے کہ سینکڑوں آدمی اس کے سایہ تلے آرام کررہے ہوں اور پھر بھی وہ اس کے سایہ میں بیٹھنے سے انکار کردے محض اس لئے کہ اس کا بیج کسی زمانہ میں ایسا حقیر تھا کہ ہوا کا ایک معمولی جھونکا بھی اسے پرے پھینک دیتا ہے۔بہرحال فرعون نے ایسی ہی حماقت کی اور موسیٰؑ کو اس بات کا طعنہ دیا کہ تُو ہمارے گھروں میں پلتا رہا ہے۔وہ اس بات کو بھول گیا کہ اللہ تعالیٰ کی قدیم سے یہ سنت چلی آرہی ہے کہ وہ اپنے نبیوں کو دشمنوں کے زیر سایہ ہی ترقی عطا کیا کرتا ہے۔حضرت مسیح ناصریؑ نے روما کی حکومت کے سایہ تلے پرورش پائی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بچپن میں ثقیف قوم میں پرورش پائی جس نے ابرہہ کو خانہ کعبہ گرانے کے لئے راہنما دیئے تھے (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام امر الفیل وقصّۃ النسأۃ)۔گویا وہی قوم جس نے خانہ کعبہ کو گرانے کے لئے اپنی خدمات پیش کی تھیں اللہ تعالیٰ نے اسی قوم کے زیر سایہ اس مقدس انسان کو جگہ دی جو دعائے ابراہیمی کا مصداق اور خانہ کعبہ کا مقصود تھا۔اسی طرح خدا نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کو

حبشہ کی عیسائی حکومت کے سایہ تلے پناہ دی حالانکہ اسی حکومت کے ایک گورنر ابرہہ نے بیت اللہ پر حملہ کیا تھا۔ موجودہ زمانہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے پھر اسی تدبیر سے کام لیا اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو انگریزوں کے زیر سایہ رکھا حالانکہ آپ عیسائیت کی بیخ کنی کے لئے مبعوث فرمائے گئے تھے۔ نادان لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ مگر وہ نہیں دیکھتے کہ کیا خدا نے موسیٰؑ کو فرعون کے زیر سایہ نہیں رکھا۔ کیا خدا نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کو ایک عیسائی حکومت کے زیر سایہ نہیں رکھا۔ کیا خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے ثقیف قوم کے زیر سایہ نہیں رکھا۔ پھر اگر ان کا وہاں پرورش پانا قابل اعتراض امر نہیں تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا انگریزوں کے زیر سایہ ترقی کرنا کس طرح قابل اعتراض ہو گیا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا نشان ہے کہ وہ اپنے انبیاء کو خود ان کے دشمنوں کے زیر سایہ رکھ کر ترقی عطا فرماتا ہے اور اس طرح دنیا پر ثابت کر دیتا ہے کہ اس کے ارادوں کو کوئی شخص روک نہیں سکتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ پر ہی غور کر کے دیکھ لو کجا یہ کہ فرعون نے حکم دے دیا تھا کہ بنی اسرائیل کا کوئی بچہ زندہ نہ رہے اور کجا یہ کہ تصرف الٰہی کے ماتحت اس نے خود اپنے گھر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پرورش کی۔ گویا وہی جس کی خاطر بچے مارے جاتے تھے اس کی چھاتیوں پر چڑھ کر موسیٰؑ بڑھا اور پھولا اور پھلا اور آخر اسی موسیٰؑ کی مخالفت نے فرعون کو تباہ و برباد کر دیا کیونکہ حضرت موسیٰؑ کی والدہ نے خدا تعالیٰ کی بات پر اعتبار کر کے اپنے بچے کو دریا میں ڈال دیا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے کئی قسم کی احتیاطوں کے ساتھ ان کو دریا میں ڈالا مگر کون ہے جو اس سے سو گنا زیادہ احتیاط کر کے بھی اپنے بچہ کو دریا میں پھینکنے کے لئے تیار ہو سکتا ہے۔ انہوں نے خدا کا حکم پورا کرنے کے لئے اس موت کو قبول کر لیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خدا نے موسیٰؑ کو ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا اور وہ جس کے متعلق خطرہ تھا کہ دریا کی لہروں میں وہ کہیں غرق نہ ہو جائے خدا اسے بچا کر فرعون کے گھر میں لے گیا۔ اور اس کی روٹیاں کھا کھا کر اور اس کے گھر کا دودھ پی پی کر اور اسی کے کندھوں پر چڑھ چڑھ کر اس نے تربیت حاصل کی۔ اور آخر ایک دن وہ تمام بنی اسرائیل کو فرعون کے پنجہ سے بچا کر لے آیا۔ اور فرعون اپنے لاؤ لشکر سمیت غرق ہو گیا۔ اسی پرورش کا اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طعنہ دیا اور پھر کہا کہ وَ فَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَ اَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ۔ اس دوران میں تجھ سے وہ فعل بھی سرزد ہوا جس کا تجھے خوب علم ہے یعنی قبطی قوم کا ایک آدمی تیرے ہاتھ سے مارا گیا اور تو یقیناً ناشکروں میں سے ہے۔

اس جگہ اَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ سے مراد یہ نہیں کہ تو کافروں میں سے ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تو سخت ناشکرا نکلا کہ تو نے ایک محسن قوم کا آدمی مار ڈالا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ پہلے تمام حالات پر غور کرو اور پھر

الزام لگاؤ بے شک یہ فعل مجھ سے سرزد ہوا ہے مگر فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّ اَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ مجھ سے یہ فعل ایسی حالت میں سرزد ہوا تھا جبکہ میں اپنی قوم کی محبت میں سرشار تھا یعنی جب میں نے دیکھا کہ ایک دشمن قوم کا فرد میری قوم کے ایک آدمی کو بلاوجہ مار رہا ہے تو مجھے اپنی مظلوم قوم کے ایک فرد کی حمایت میں جوش آ گیا اور میں نے ظالم کا مقابلہ کیا جس کے نتیجہ میں وہ نادانستہ طور پر ہلاک ہو گیا۔

یہ واقعہ جس کی طرف فرعون نے اشارہ کیا وہی ہے جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک رات ایک قبطی کو دیکھا کہ وہ ایک اسرائیلی سے لڑ رہا ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس سے گذرے تو اسرائیلی نے حضرت موسیٰؑ کو دیکھ کر انہیں اپنی مدد کے لئے پکارا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی سمجھا کہ اگر میں نے اسرائیلی کی مدد نہ کی تو وہ مارا جائے گا چنانچہ انہوں نے آگے بڑھ کر قبطی کو ایک گھونسا مارا۔ اب یا تو جوش کی حالت میں وہ گھونسا زیادہ زور سے مار بیٹھے یا اس کا دل کمزور تھا گھونسا کے لگتے ہی وہ مر گیا۔ اس واقعہ کا فرعون انہیں طعنہ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم نے تو تجھے بچوں کی طرح پالا اور تو نے ہمارے ہی آدمی کو مار دیا۔ اور ناشکری کا نمونہ دکھایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اسے جواب دیتے ہیں کہ پہلے سب حالات پر غور کرو اور پھر الزام لگاؤ۔ یہ تو درست ہے کہ میرے ہاتھ سے ایک آدمی مارا گیا لیکن سوال یہ نہیں کہ آدمی مارا گیا یا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ آیا میرا اسے مارنے کا ارادہ تھا یا نہیں۔ اگر حالات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ایسا تھا جس میں فوری مدد کی ضرورت تھی۔ تو ایسی حالت میں اگر میں نے اپنی قوم کے ایک مظلوم فرد کی مدد کی تو گو اتفاقی طور پر ایک آدمی مر بھی گیا۔ لیکن پھر بھی میں قصوروار کس طرح ہوا۔ میرا قصور تو تب ہوتا جب میں جانتے بوجھتے ہوئے محض قتل کرنے کی نیت سے اس پر حملہ کرتا۔ مگر جبکہ میرا ارادہ اسے قتل کرنے کا تھا ہی نہیں تو اگر نادانستہ طور پر ایک آدمی مر گیا تو یہ بات مجھے مجرم بنانے والی کس طرح ہو گئی۔ مگر بہرحال چونکہ میں نے ایک مظلوم قوم کے فرد کی حمایت کی تھی۔ اور حاکم قوم کا ایک فرد مارا گیا تھا اس لئے مجھے ڈر پیدا ہوا کہ میرے معاملہ میں انصاف سے کام نہیں لیا جائے گا اور مجھے سزا دینے کی کوشش کی جائے گی۔ چنانچہ میں تمہارے ملک کو چھوڑ کر بھاگ گیا مگر میرے رب نے جو میرے دلی خیالات کو جانتا تھا۔ مجھے بری قرار دیا اور مجھے شریعت عطا فرمائی اور مجھے اپنا رسول بنا کر کھڑا کر دیا۔ باقی رہا وہ احسان جو تو جتا رہا ہے کہ ہم نے تجھے پالا۔ سو کیا یہ احسان اس جرم کے مقابلہ میں کچھ بھی حقیقت رکھتا ہے کہ تم نے اپنے باپ رعمسیس ثانی کے زمانہ سے سارے بنی اسرائیل کو اپنی غلامی میں جکڑ رکھا ہے اور تم انہیں بیگار میں پکڑ کر ان سے بڑے بڑے مشقت طلب کام لیتے ہو۔ اور ان پر ایسے ایسے مظالم ڈھاتے ہو جو نہایت شرمناک ہیں اگر اتنے لمبے عرصہ تک ایک قوم کے مردوں

اور عورتوں اور بچوں سے ظالمانہ خدمت لینے کے بعد اس قوم کا ایک بچہ تم نے پال دیا تو کیا غضب کیا۔

یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جس فرعون نے پالا تھا اُس کا نام رَعمسیس ؔ تھا (خروج باب ا آیت ۸ تا ۱۷)۔ مگر دعویٰ نبوت کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جس فرعون کے پاس جانا پڑا وہ اُس کا بیٹا منفتاحؔ تھا (Jewish Encyclopedia زیر لفظ Merneptah)۔ چونکہ وہ بچپن سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے گھروں میں پرورش پاتے دیکھتا رہا تھا اور جانتا تھا کہ اس کے باپ نے کس محبت کے ساتھ موسیٰؑ کی پرورش کی اس لئے اس نے اپنے باپ کے اس سلوک کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا کیا ہم نے تجھے اپنے گھروں میں نہیں پالا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے جواب میں اُسی رَعمسیس ؔ کے ان مظالم کا ذکر شروع کر دیا جو وہ اپنی زندگی میں بنی اسرائیل پر ڈھاتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے حکم دے دیا تھا کہ بنی اسرائیل کے ہاں جو بھی لڑکا پیدا ہو اُسے مار ڈالا جائے۔ اور لڑکیوں کو زندہ رکھا جائے۔ رَعمسیس ؔ کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا منفتاحؔ تخت نشین ہوا اور اُس نے بھی اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے بنی اسرائیل پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ آخر جب ان کی دردناک چیخ و پکار نے عرشِ الٰہی کو ہلا دیا تو اس نے ان اسیروں کی رستگاری کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرمایا اور انہیں حکم دیا کہ وہ فرعون کے پاس جائیں اور انہیں کہیں کہ وہ بنی اسرائیل کو آزاد کر دے۔ مگر بجائے اس کے کہ فرعون اس ظلم سے باز آتا اور بنی اسرائیل کی غلامی کی زنجیروں کو کاٹ دیتا اُس نے موسیٰؑ پر طعنہ زنی شروع کر دی کہ تُو تو ہمارے ٹکڑوں پر پلتا رہا ہے۔ اور اب تو ہی ہمیں وعظ و نصیحت کرنے کے لئے آ گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا یہ سب کچھ درست ہے۔ مگر کیا یہ اس ظلم کے جواز کی کوئی دلیل ہے جو بنی اسرائیل پر کیا جا رہا ہے اگر مجھے پالا تو کیا اس کے نتیجہ میں تمہارے لئے یہ جائز ہو گیا کہ تم ساری قوم کو اپنی غلامی میں جکڑے رکھو۔ اور خدا تعالیٰ کے ان بندوں کو جو تمہاری طرح اس دنیا میں آئے ذلّت اور بیچارگی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرو۔

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۴﴾ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ

اس پر فرعون نے (شرمندہ ہو کر اور بات پھیرنے کے لئے) کہا۔ یہ رب العالمین کون ہے؟ (جس کی طرف

الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ﴿۲۵﴾ قَالَ لِمَنْ

سے آنا تم بیان کرتے ہو۔) (موسیٰ نے) کہا آسمان اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے ان کا ربّ۔

حَوْلَهٗۤ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ﴿۲۶﴾ قَالَ رَبُّكُمْ وَ رَبُّ اٰبَآىِٕكُمُ

اگر تم میں یقین کرنے کی خواہش ہے۔اس پر اس (فرعون) نے اپنے ارد گرد کے لوگوں سے کہا۔کیا تم سنتے نہیں

الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۷﴾ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْۤ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ

(کہ موسیٰ کیا کہتا ہے)(موسیٰ ؑ نے اپنے پہلے بیان کی تشریح کرتے ہوئے) جواب دیا۔وہی جو تمہارا بھی رب ہے

لَمَجْنُوْنٌ ﴿۲۸﴾

،اور تمہارے پہلے باپ دادوں کا بھی رب تھا۔(اس پر فرعون) بولا۔(اے لوگو!) تمہارا وہ رسول جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے ضرور پاگل ہے۔

تفسیر ۔حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب فرعون کو یہ جواب دیا تو اس نے کھسیانے ہو کر کلام کا موضوع ہی بدل دیا۔اور کہنے لگا۔اچھا ان باتوں کو جانے دو۔تم یہ بتاؤ کہ تم جو کہہ رہے ہو کہ میں رب العالمین خدا کی طرف سے رسول بن کر آیا ہوں تو یہ رب العالمین خدا کون ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔رب العالمین وہ خدا ہے جو آسمان اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے اُن کا ربّ ہے اگر تم یقین لانے والوں میں سے بنو۔تو یہ دلیل تمہارے لئے بڑی کافی ہے۔فرعون اپنے گردو پیش کے لوگوں سے کہنے لگا۔سُنتے ہو یہ کیسی بیوقوفی کی باتیں کرتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔اگر آسمان اور زمین کے بنانے والے کو تم نہیں سمجھ سکتے تو پھر یہی دلیل سمجھ لو کہ تمہاری اور تمہارے گذشتہ باپ دادوں کی بھی تو کسی نے پرورش کی تھی۔وہ رب العالمین خدا ہے۔فرعون اس دلیل کی طاقت سے جھنجھلا اٹھا اور گالیوں پر اُتر آیا۔اور اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا۔یہ شخص جو تمہاری طرف رسول ہو کر آنے کا دعویٰ کرتا ہے یقیناً پاگل ہے۔اس کا مطلب جیسا کہ سورۂ نازعات سے ظاہر ہے یہ تھا کہ اے فرعونیو! تمہارا رب تو میں ہوں۔یہ موسیٰؑ رب العالمین خدا کہاں سے لے آیا ہے اور چونکہ میں اس کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کر چکا ہوں اور اس کے باوجود یہ اپنے عقیدے پر قائم رہا ہے اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دماغ میں کچھ نقص ہے جو اپنے دعویٰ پر اس قدر اصرار کر رہا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ آج تک دنیا میں خدا تعالیٰ کا کوئی بھی نبی نہیں آیا جسے اس کے مخالفوں نے پاگل نہ کہا ہو کیونکہ جس طرح مجنون انسان اپنی انتہائی طاقت استعمال کر دیتا ہے اور اُسے اپنے انجام کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی اسی طرح اللہ تعالیٰ کے انبیاء بھی ہر قسم کے ڈر اور خوف اور لالچ سے بے نیاز ہو کر

اس طاقت کو پہنچانا شروع کر دیتے ہیں جو خدا تعالیٰ نے ان کے سپرد کی ہوتی ہے اور انہیں اپنے انجام کا کوئی خوف نہیں ہوتا۔ نادان انسان جو ان کی پشت پر اللہ تعالیٰ کا ہاتھ دیکھنے سے قاصر ہوتا ہے وہ انہیں جب اپنے مقصد کے لئے ایسے جوش سے کام کرتا دیکھتا ہے جو بظاہر عقل کے خلاف ہوتا ہے تو انہیں پاگل کہنا شروع کر دیتا ہے۔

علم النفس کے ماہرین نے بھی جنون کی مختلف کیفیات پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب جنون پیدا ہوتا ہے تو انسان اپنے گردوپیش کے تمام حالات کو بھلا دیتا ہے اور اپنے کام کے متعلق اس میں اس قدر انہماک پیدا ہوجاتا ہے کہ وہ کسی دوسری چیز کی پرواہ ہی نہیں کرتا۔ مجھے یاد ہے حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک عورت جو اُستانی تھی پاگل ہوگئی۔ درمیان میں کبھی کبھی اس کی حالت درست بھی ہوجایا کرتی تھی۔ ایک دفعہ عورتوں میں درس ہورہا تھا اور وہ بھی درس میں شامل تھی کہ یکدم اس عورت کو جنون کا دورہ ہوا اور کھڑکی میں سے کود کر نیچے گرنے لگی۔ حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ نے اُٹھ کر اسے پکڑ لیا۔ یہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وفات کے دو چار ماہ بعد کا واقعہ ہے جبکہ ابھی حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ گھوڑے سے نہیں گرے تھے۔ اور آپ میں اتنی طاقت تھی کہ بعض دفعہ آپ اپنا ہاتھ بڑھا کر فرمایا کرتے تھے کہ کوئی اسے ٹیڑھا کر کے دکھا دے۔ آپ نے اٹھ کر اس عورت کو پکڑ لیا۔ لیکن باوجود سارا زور لگانے کے وہ دُبلی پتلی عورت آپ کے ہاتھوں سے نکلی جاتی تھی۔ اس پر آپ نے عورتوں کو آواز دی کہ یہ تو گرنے لگی ہے میری مدد کیلئے آؤ۔ پھر پانچ سات عورتوں نے آپ کے ساتھ مل کر اسے باندھا حالانکہ عقل اور ہوش کے زمانہ میں اس کو سترہ اٹھارہ سال کا بچہ بھی پکڑ سکتا تھا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ عقلمند انسان سمجھتا ہے کہ اگر ایک خاص حد سے زیادہ اُس نے اپنی طاقتوں کو استعمال کیا تو اُسے نقصان پہنچے گا لیکن پاگل کا دماغ اُسے حد سے زیادہ طاقت خرچ کرنے سے نہیں روکتا۔ یہی وجہ ہے کہ پاگلوں میں بہت زیادہ طاقت آجاتی ہے اور ایک ایک پاگل کو آٹھ آٹھ دس دس آدمی مل کر پکڑتے ہیں۔ تب وہ قابو میں رہتا ہے پس چونکہ پاگلوں میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ وہ بسا اوقات ایسے جوش سے کام کرتے ہیں جو عقل کے خلاف ہوتا ہے۔ اس لئے جب لوگ اللہ تعالیٰ کے نبیوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ زمانہ کی رو کے بالکل خلاف آواز اٹھا رہے ہیں اور اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لئے انہیں کسی قسم کی ہلاکت اور تباہی کی پروا نہیں تو وہ سمجھتے ہیں یہ لوگ پاگل ہیں اگر عقلمند ہوتے تو رائے عامہ کے خلاف اپنی آواز کیوں بلند کرتے۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مبعوث ہوئے اور آپؐ نے مکہ والوں کے سامنے یہ بات پیش کی کہ ایک خدا کی پرستش کرو تو عرب کے لوگ جو لاتؔ اور مناۃؔ اور عزّیٰؔ کے پرستار تھے ان کے لئے یہ بات حیرت کا موجب ہوئی اور انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ شخص تو پاگل ہے جو اتنے خداؤں کو ایک

خدا قرار دے رہا ہے۔ خدا تو کئی ہیں مگر یہ شخص کہتا ہے کہ صرف ایک ہی خدا ہے۔ پس ان کی نگاہ میں آپ کی یہ بات نعوذ باللہ ایک پاگلانہ بڑ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔

پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا اس لئے بھی پاگل کہتی کہ آپؐ فرماتے تھے۔ شراب نہ پیو۔ جُوا نہ کھیلو۔ اور دوسروں کے مال نہ لوٹو۔ عرب کے لوگ کہتے تھے۔ یہ کیسا آدمی ہے جو شراب سے منع کرتا ہے جو زندگی کا سرور ہے اور جُوا کھیلنے اور مال لوٹنے سے منع کرتا ہے جو ایک فائدہ مند کام ہے۔ اس کی یہ باتیں تو پاگلوں والی باتیں ہیں۔ اسی طرح وہ کہا کرتے کہ محمد رسول اللہ کو کیا ہوگیا ہے کہ ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ تم اپنی زندگیوں کو بنی نوع انسان کی خدمت میں لگا دو۔ اپنے مالوں کو خدا کی راہ میں خرچ کرو تو تمہیں ثواب ملے گا۔ یہ تو پاگلوں والی بات ہے۔

حضرت شعیبؑ جب لوگوں سے کہتے کہ تم دوسروں کا مال نہ لوٹو۔ اپنے مال کو ناجائز کاموں میں صرف نہ کرو۔ تو آپ کی باتوں سے آپ کی قوم حیران ہوتی تھی اور کہتی تھی کہ شعیب پاگل ہوگیا ہے۔ اور دیوانوں کی سی باتیں کرتا ہے۔

اس زمانہ میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو لوگوں نے پاگل کہا۔ جب آپ نے وفات مسیحؑ کا مسئلہ دنیا کے سامنے پیش کیا تو مسلمان سمجھ ہی نہ سکے کہ جب ۱۳۰۰ سال سے یہ مسئلہ امت محمدیہ کے اکابر پیش کرتے چلے آرہے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ ہیں تو وہ فوت کس طرح ہوگئے۔ لوگوں کو اس مسئلہ کے متعلق جس قدر یقین اور وثوق تھا وہ اس واقعہ سے اچھی طرح معلوم ہوسکتا ہے کہ پنجاب کے ایک مشہور طبیب جن کی طبی عظمت کے حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ جیسے طبیب بھی قائل تھے۔ اور جن کا نام حکیم اللہ دین تھا اور بھیرہ کے رہنے والے تھے ایک دفعہ ان کے پاس مولوی فضل دین صاحب بھیروی جو حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کے گہرے دوست اور نہایت مخلص احمدی تھے گئے۔ اور انہیں کچھ تبلیغ کی۔ وہ باتیں سن کر کہنے لگے۔ میاں تم مجھے کیا تبلیغ کرتے ہو تم بھلا جانتے ہی کیا ہو اور مجھے تم نے کیا سمجھانا ہے مرزا صاحب کے متعلق تو جو مجھے عقیدت ہے اس کا دسواں بلکہ بیسواں حصہ بھی تمہیں ان سے عقیدت نہیں ہوگی۔ مولوی فضل دین صاحب یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور انہوں نے سمجھا کہ شاید یہ دل میں احمدی ہیں۔ اس لئے انہوں نے کہا۔ اس بات کو سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے کہ آپ کو حضرت مرزا صاحب سے عقیدت ہے اور میں خوش ہوں گا اگر آپ کے خیالات سلسلہ کے متعلق کچھ اَور بھی سنوں۔ وہ کہنے لگے۔ آجکل کے جاہل نوجوان بات کی تہ تک نہیں پہنچتے اور یونہی تبلیغ کرنے کے لئے دوڑ پڑتے ہیں۔ اب تم آگئے ہو مجھے وفات مسیح کا مسئلہ سمجھانے۔ حالانکہ تمہیں معلوم ہی کیا ہے کہ مرزا صاحب کی اس

مسئلہ کو پیش کرنے میں حکمت کیا ہے؟ وہ کہنے لگے۔آپ ہی فرمائیے۔انہوں نے کہا سنو!اصل بات یہ ہے کہ مرزا صاحب نے براہین احمدیہ کتاب لکھی۔تیرہ سو سال میں بھلا کوئی مسلمان کا بچہ تھا جس نے ایسی کتاب لکھی ہو۔ مرزا صاحب نے اس میں ایسے ایسے علوم بھر دیئے کہ کسی مسلمان کی کوئی کتاب اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی وہ اسلام کے لئے ایک دیوار تھی جس نے اسے دوسرے مذاہب کے حملوں سے بچالیا۔لیکن مولوی ایسے احمق اور بے وقوف نکلے کہ بجائے اس کے کہ وہ آپ کا شکریہ ادا کرتے اور زانوئے ادب تہ کر کے آپ سے کہتے کہ آئندہ ہم آپ کے بتائے ہوئے دلائل ہی استعمال کیا کریں گے انہوں نے اُلٹا آپ پر کفر کا فتویٰ لگا دیا اور اسلام کی اتنی عظیم الشان خدمت دیکھنے کے باوجود جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تیرہ سو سال میں اَور کسی نے نہ کی آپ کے خلاف کفر کے فتوے دینے لگے اور اپنی علمیّت جتانے لگ گئے۔اور سمجھنے لگے کہ ہم بڑے آدمی ہیں۔اس پر مرزا صاحب کو غصہ آنا چاہیے تھا اور آیا۔چنانچہ انہوں نے مولویوں سے کہا۔اچھا تم بڑے عالم بنے پھرتے ہو اگر تمہیں اپنی علمیت پر ایسا ہی گھمنڈ ہے تو دیکھ لو کہ حیات مسیح کا عقیدہ قرآن سے اتنا ثابت ہے اتنا ثابت ہے کہ اس کے خلاف حضرت مسیح کی وفات ثابت کرنا ناممکن نظر آتا ہے۔لیکن میں قرآن سے ہی حضرت مسیح کی وفات ثابت کر کے دکھاتا ہوں۔اگر تم میں ہمت ہے تو اس کا ردّ کرو۔چنانچہ انہوں نے مولویوں کو ان کی بیوقوفی جتانے کے لئے وفات مسیح کا مسئلہ پیش کردیا اور قرآن سے اس کے متعلق ثبوت دینے لگ گئے۔اب مولوی چاہے سارا زور لگالیں۔چاہے ان کی زبانیں گھِس جائیں اور قلمیں ٹوٹ جائیں۔سارے ہندوستان کے مولوی مل کر بھی مرزا صاحب کے دلائل کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔مرزا صاحب نے انہیں ایسا پکڑا ہے کہ ان میں سر اٹھانے کی تاب نہیں رہی۔اب اس کا ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ کہ سارے مولوی مل کر ایک وفد کی صورت میں حضرت مرزا صاحب کے پاس جائیں اور ان سے کہیں کہ ہم سے آپ پر کفر کا فتویٰ لگانے میں بے ادبی ہوگئی ہے۔ہمیں معاف کیا جائے۔پھر دیکھ لیں مرزا صاحب قرآن سے ہی حیات مسیح ثابت کر کے دکھاتے ہیں یا نہیں؟

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس وقت حیات مسیح کا عقیدہ کتنا یقینی سمجھا جاتا تھا۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اعتبار اور اعتماد رکھتے ہوئے آپ کو اسلام کا سب سے بڑا خادم سمجھتے ہوئے پھر بھی ان کا ذہن اس طرف نہیں جاتا تھا کہ حضرت مسیح فوت ہوگئے ہیں بلکہ وہ کہتے تھے کہ یہ محض مولویوں کو شرمندہ کرنے کیلئے کہتے ہیں ورنہ حیاتِ مسیح کا مسئلہ تو ایک ثابت شدہ حقیقت ہے۔جب آپ پر اعتماد رکھنے اور آپ کو اسلام کا سب سے بڑا خادم سمجھنے والوں کی یہ کیفیت تھی تو دوسرے لوگ جو آپ کو اسلام کا دشمن قرار دیتے تھے وہ اس مسئلہ کی وجہ سے اگر

آپ کو پاگل نہ کہتے تو کیا کہتے۔ اسی طرح جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دنیا کے سامنے یہ نظریہ پیش کیا کہ اب جہاد کی شکل بدل گئی ہے اب لٹریچر اور تبلیغ کے ذریعہ اسلام پھیلانے کا زمانہ ہے تو مسلمان حیران ہوئے کہ کیا اس طرح اسلام دنیا پر غالب آ سکتا ہے۔ اُن کے نزدیک تو ترقی کا صرف یہی ایک ذریعہ تھا کہ غیر مسلموں کو قتل کر دیا جائے۔ پس جب انہوں نے سنا کہ ایک شخص یہ کہہ رہا ہے کہ اسلام کی ترقی غیر مسلموں کو قتل کرنے سے نہیں بلکہ اپنی جانوں کو اسلام کی راہ میں قربان کرنے سے وابستہ ہے تو انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ مرزا صاحب پاگل ہیں جو ایسے خلاف عقل مسائل دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں یہی حربہ فرعون نے بھی استعمال کیا۔ اور جب اس نے دیکھا کہ وہ دلائل کے میدان میں پورا نہیں اتر رہا تو اُس نے کہا یہ تو پاگل ہے جو ایسی احمقانہ باتیں کر رہا ہے۔

قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ مَا بَيْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ

(موسیٰ نے سمجھ لیا کہ وہ بات ٹلانا چاہتا ہے اور) کہا (رب العالمین) وہی ہے جو مشرق کا بھی رب ہے اور

تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۹﴾ قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ

مغرب کا بھی (رب ہے) اور جو کچھ ان کے درمیان ہے (ان کا بھی رب ہے) بشرطیکہ تم عقل سے کام لو۔

مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ﴿۳۰﴾ قَالَ اَوَ لَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۱﴾ ج

(اس پر فرعون نے طیش میں آ کر) کہا اگر میرے سوا تو نے کوئی اور معبود بنایا تو میں تجھے قید کر دوں گا۔ اُس

قَالَ فَاْتِ بِهٖۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۳۲﴾ فَاَلْقٰى عَصَاهُ

(یعنی موسیٰ) نے کہا۔ کیا اُس صورت میں بھی کہ میں کوئی (حقیقتِ حال کو) کھول دینے والی چیز تیرے پاس

فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴿۳۳﴾ ۚ وَّ نَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ

لے آؤں (یعنی معجزہ) اس پر اُس (یعنی فرعون) نے کہا۔ اگر تو سچا ہے تو لے بھی آ۔ پس اُس (یعنی موسیٰ) نے اپنا

لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿٣٤﴾ ع

عصا زمین پر دھر دیا تو اچانک (اہلِ فرعون نے دیکھا کہ) وہ ایک صاف صاف نظر آنے والا اژدہا ہے اور اُس نے اپنا ہاتھ (اپنی بغل سے) نکالا تو سب دیکھنے والوں نے اچانک دیکھا کہ وہ بالکل سفید ہے۔

حلّ لُغَات ۔ثُعْبَانٌ ثُعْبَانٌ: ضَرْبٌ مِّنَ الْحَيَّاتِ طِوَالٌ ۔یعنی ثُعْبَانٌ سانپوں کی اقسام میں سے ایک قسم کا سانپ ہوتا ہے جو خاصا لمبا ہوتا ہے۔ (اقرب)

نَزَعَ نَزَعَ يَدَهٗ کے معنے ہیں اَخْرَجَهَا مِنْ جَيْبِهٖ ہاتھ کو اپنے گریبان سے نکالا۔ (اقرب)

تفسیر ۔فرعون نے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مجنون کہا تو آپ سمجھ گئے کہ اب یہ مجھے اصل موضوع سے دوسری طرف پھیرنا چاہتا ہے اور اس کی خواہش ہے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کی ربوبیّت عالمین پر جو گفتگو شروع ہے وہ ذاتیات میں الجھ کر رہ جائے اور میں اس مضمون کو ترک کر کے اس امر پر بحث شروع کر دوں کہ مجھے مجنون کیوں کہا گیا ہے۔ میرے اندر تو کوئی جنون والی بات نہیں پائی جاتی۔ پس آپ نے مناسب سمجھا کہ اُس کی اس گالی کا اُسے کوئی جواب نہ دیں اور اصل موضوع کو جاری رکھیں۔ چنانچہ آپ نے فرمایا۔ رب العالمین خدا وہ ہے جو مشرق کا بھی رب ہے اور مغرب کا بھی رب ہے اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے ان کا بھی رب ہے۔ یعنی تُو تو صرف مصریوں کا رب ہونے کا دعویدار ہے حالانکہ مصر کی دنیا کے مقابلہ میں حیثیت ہی کیا ہے۔ مشرق و مغرب میں سینکڑوں ملک مصر سے کئی کئی گنا بڑے موجود ہیں اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ فرعون مصر والوں کو پال رہا ہے تو وہ لوگ جو مشرق اور مغرب اور ان کے درمیان رہتے ہیں ان کو کون پالتا ہے بہر حال جو ساری دنیا کو پالتا ہے وہی رب العالمین ہے۔ فرعون رب العالمین نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ وہ خود اپنے آپ کو مصریوں اور قبطیوں کا خدا کہتا ہے۔ اس پر فرعون کے غصہ کا پارہ بہت ہی چڑھ گیا اور موسیٰ ؑ سے کہنے لگا کہ یا تو سیدھی طرح مجھے خدا اقرار دو ورنہ میں تجھے قید کر دوں گا۔ اور پھر تجھے پتا لگے گا کہ تیری اس گستاخی کی کیا سزا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی شان دیکھو کہ وہی جو موسیٰ ؑ کو آہنی سلاخوں کے پیچھے قید کرنا چاہتا تھا خدا تعالیٰ نے اسے بحیرۂ قلزم کی طوفانی موجوں میں ایسا قید کیا کہ وہ اپنے تمام لاؤ لشکر اور مددگاروں کے باوجود اس قید سے رہا نہ ہوسکا۔ جب اُس نے قید کرنے کی دھمکی دی۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ کیا اگر میں کوئی ایسی دلیل لاؤں جو میری بات کو بالکل واضح کر دے تو کیا پھر بھی تم قید کرو گے؟ فرعون نے اپنے دل میں سوچا کہ چلو اس وقت تو بحث سے جان چھوٹی آئندہ دیکھا جائے گا اور کہنے لگا کہ اگر تم سچے ہو تو ایسی

دلیل پیش کرو۔ اس پر موسیٰؑ نے اپنا سونٹا زمین پر ڈال دیا تو لوگوں کو اچانک یہ نظر آنے لگا کہ وہ ایک اژدھا ہے جو صاف صاف نظر آ رہا ہے۔ اس کے بعد موسیٰؑ نے اپنے پہلو سے اپنا ہاتھ نکالا۔ تو وہ دیکھنے والوں کو چمکتا ہوا نظر آنے لگا۔

اس جگہ یاد رکھنا چاہیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سونٹے کا سانپ بن جانا اور آپ کے ہاتھ کا لوگوں کو چمکتا ہوا نظر آنا درحقیقت ایک کشفی نظارہ تھا جو اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کے ساتھیوں کو بھی دکھا دیا۔ اور رؤیا و کشوف کے متعلق یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے جس کی انبیاء اور اولیاء کی تاریخ میں کثرت سے مثالیں پائی جاتی ہیں کہ بعض دفعہ کشفی نظارے ایسے وسیع کر دیئے جاتے ہیں کہ وہ دوسروں کو بھی نظر آنے لگ جاتے ہیں۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں انشقاقِ قمر کا جو معجزہ ظاہر ہوا وہ بھی ایک کشفی نظارہ تھا جو وسیع کر دیا گیا۔ اور نہ صرف مکہ کے کچھ لوگوں کو نظر آیا (بخاری کتاب التفسیر باب قولہ وانشق القمر) بلکہ جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہے ہندوستان کے ایک راجہ کو بھی نظر آ گیا اور وہ مسلمان ہو گیا۔ (تاریخ فرشتہ اُردو جلد ۲ صفحہ ۴۹۱ مقالہ ۱۱)

مفسرین نے چونکہ اس حقیقت کو نہیں سمجھا اس لئے ان کا ذہن اس طرف چلا گیا کہ چاند واقعہ میں جسمانی طور پر پھٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا تھا حالانکہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سونٹا تھا تو سونٹا ہی مگر فرعون اور اس کے درباریوں کو وہ ایک اژدہا کی شکل میں دکھایا گیا۔ اسی طرح چاند تو اپنی جگہ پر ہی رہا تھا مگر کشف میں یہ دکھایا گیا کہ وہ پھٹ گیا ہے۔ اور جس طرح ہر خواب اور کشف تعبیر طلب ہوتا ہے اسی طرح اس کشف کی بھی یہ تعبیر تھی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو تغیر رونما ہونے والا ہے اُس کا وقت اب آ چکا ہے اور کفار کی حکومت عرب سے مٹ جائے گی۔ چنانچہ اسی کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ (القمر: ۲) یعنی عرب کی تباہی قریب آ گئی ہے اور اُس کا ثبوت یہ ہے کہ چاند پھٹ گیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ساعت کے قریب آنے اور چاند کے پھٹنے میں تعلق تھا۔ مگر ظاہری طور پر چاند کے پھٹنے کا ساعت سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ اگر ساعت سے اس کا تعلق ہوتا تو چاہیے تھا کہ قیامت بھی آ جاتی مگر چاند کے پھٹنے پر تو تیرہ سو سال کا عرصہ گذر چکا ہے اور قیامت ابھی تک آئی نہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ساعت قریب آ گئی ہے اور اس کی علامت یہ ہے کہ چاند پھٹ گیا ہے پس معلوم ہوا کہ شق کے جو معنے عام طور پر کئے جاتے ہیں وہ بھی غلط ہیں اور ساعت کے جو معنے لئے جاتے ہیں وہ بھی درست نہیں۔ دراصل قرآن کریم میں انبیاء کی بعثت اور ان کی ترقی اور غلبہ کے زمانہ اور ان کے مخالفین کی تباہی کے زمانہ کو ساعت کہا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ محمد رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو ساعت آنی تھی اور آپ کے ذریعہ جو تغیر رونما ہونا تھا اس کا وقت اب آ گیا ہے اور اس کی علامت یہ ہے کہ چاند پھٹ گیا ہے۔ یہ علامت اس لئے بتائی گئی کہ عربوں میں قمر سے مراد عرب کی حکومت ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ حضرت صفیہؓ جو ایک یہودی سردار کی بیٹی تھیں اور بعد میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات میں داخل ہوئیں۔ انہوں نے ایک دفعہ خواب میں دیکھا کہ ان کی گود میں چاند آ گرا ہے۔ وہ کہتی ہیں جب میں نے اپنے باپ کو یہ خواب سنائی تو اُس نے میرے منہ پر زور سے تھپڑ مارا اور کہا کہ کیا تو عرب کے بادشاہ سے شادی کرنا چاہتی ہے (الاصابۃ، کتاب النساء، حرف الصاد، صفیۃ)۔ اس لئے پتہ لگتا ہے کہ عرب کے لوگ قمر سے مراد عرب کی حکومت لیتے تھے۔

پس جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کشفی طور پر یہ نظارہ دکھایا گیا کہ چاند پھٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ تھا کہ اب کفارِ عرب کی تباہی کا وقت آ پہنچا ہے چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ پر ایک لمبے عرصے سے مظالم ڈھائے جا رہے تھے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو بشارت دی کہ اب اسلام کی ترقی کا زمانہ آ گیا ہے۔ اور یہ نظارہ نہ صرف آپؐ کو دکھایا گیا بلکہ کفار کو بھی اس نظارہ میں شامل کر لیا گیا۔ تا کہ وہ بھی اس بات کو سمجھ لیں کہ اب کفر کے مٹنے کے دن آ گئے ہیں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واقعہ میں خدا تعالیٰ کے سچے رسول ہیں۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی کتاب ''سُرمہ چشم آریہ'' میں اس معجزہ پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے رؤیا و کشوف کے دائرہ کی اس وسعت کو تسلیم کیا ہے اور تحریر فرمایا ہے کہ

''یہ بھی ممکن ہے کہ نبی کی قوت قدسیہ کے اثر سے دیکھنے والوں کو کشفی آنکھیں عطا کی گئی ہوں۔ اور جو انشقاق قربِ قیامت میں پیش آنے والا ہے اُس کی صورت ان کی آنکھوں کے سامنے لائی گئی ہو۔ کیونکہ یہ بات محقق ہے کہ مقربین کی کشفی قوتیں اپنی شدت حدت کی وجہ سے دوسروں پر بھی اثر ڈال دیتی ہیں۔ اس کے نمونے اربابِ مکاشفات کے قصوں میں بہت پائے جاتے ہیں بعض اکابر نے اپنے وجود کو ایک وقت اور ایک آن میں مختلف ملکوں اور مکانوں میں دکھلا دیا ہے۔ باذن اللہ تعالیٰ''

(سُرمہ چشم آریہ، روحانی خزائن جلد ۲ صفحہ ۲۷۷۔۲۷۸)

اسی طرح فرماتے ہیں کہ:

''صاحبِ کشف پر ایسے ایسے اسرار ظاہر ہوتے ہیں کہ ان کی کنہ کو سمجھنے میں بکلی عقل عاجز رہ جاتی ہے۔ بعض اوقات صاحبِ کشف صدہا کوسوں کے فاصلہ سے باوجود حائل ہونے بیشمار حجابوں

کے ایک چیز کو صاف صاف دیکھ لیتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات عین بیداری میں باذنہٖ تعالیٰ اس کی آواز بھی سن لیتا ہے اور اس سے زیادہ تر تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض اوقات وہ شخص بھی اس کی آواز سن لیتا ہے جس کی صورت اس پر منکشف ہوتی ہے۔ بعض اوقات صاحب کشف اپنے عالم کشف میں جو بیداری سے نہایت مشابہ ہے ارواح گذشتہ سے ملاقات کرتا ہے اور عام طور پر ہر یک نیک بخت روح یا بد بخت روح کے ساتھ کشفِ قبور کے طور پر ہو سکتی ہے۔ چنانچہ خود اس میں مولّف رسالہ ہٰذا صاحبِ تجربہ ہے اور یہ امر ہندوؤں کے مسئلہ تناسخ کی بیخ کنی کرنے والا ہے اور سب سے تعجب کا یہ مقام ہے کہ بعض اوقات صاحبِ کشف اپنی توجہ اور قوت تاثر سے ایک دوسرے شخص پر باوجود صدہا کوسوں کے فاصلہ کے باذنہٖ تعالیٰ عالم بیداری میں ظاہر ہو جاتا ہے حالانکہ اس کا وجود عنصری اپنے مقام سے جنبش نہیں کرتا۔ اور عقل کے زور سے ایک چیز کا دو جگہ ہونا محال ہے۔ سو وہ محال اس عالمِ ثالث میں ممکن الوقوع ہو جاتا ہے۔'' (حاشیہ سُرمہ چشم آریہ، روحانی خزائن جلد ۲ صفحہ ۱۷۸)

اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض اور بھی ایسے کشوف ہوئے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے دوسروں کو بھی شریک کر لیا۔ مثلاً حدیثوں میں آتا ہے کہ ایک دفعہ محمد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مجلس میں تشریف رکھتے تھے کہ ایک اجنبی شخص جس پر سفر کے کوئی آثار معلوم نہیں ہوتے تھے آیا۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔ اور پھر اُس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یارسول اللہ ایمان کی کیا تعریف ہے؟ اسلام کے کون کون سے ارکان ہیں؟ احسان کس مقام کا نام ہے؟ قیامت کی کیا کیا نشانیاں ہیں؟ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ہر سوال کا جواب دیتے رہے۔ جب وہ چلا گیا تو آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ یہ جبریل تھا جو تمہیں دینی مسائل سکھانے کیلئے آیا تھا۔ (ترمذی ابواب الایمان باب ما جاء فی وصف جبریل للنبی صلی اللہ علیہ وسلم الایمان و اسلام) اب یہ بھی ایک کشف تھا جس کے دائرہ کو اتنا وسیع کر دیا گیا کہ صحابہؓ نے بھی جبریل کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے باتیں کرتے دیکھ لیا۔

اِسی طرح جنگِ بدر کے موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی تائید کے لئے جو ملائکہ نازل فرمائے۔ وہ کشفی حالت میں جہاں بعض صحابہؓ کو دکھائی دیئے وہاں کفار نے بھی اُن کو دیکھا اور پھر انہوں نے اپنی مجالس میں بھی اس کا حیرت کے ساتھ ذکر کیا۔ (تفسیر ابن جریر زیر آیت اذ تقول للمؤمنین۔۔۔ و تفسیر فتح البیان زیر آیت اذ تقول للمؤمنین)

اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب بچپن میں اپنی دائی حلیمہ کے ہاں پرورش پا رہے تھے تو روایات

میں ذکر آتا ہے کہ آپ کا ایک رضائی بھائی ایک دن دوڑتا ہوا اپنے والدین کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ ہمارے بھائی (یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) پر کسی نے حملہ کر دیا ہے۔ حلیمہ جلدی سے باہر گئیں تو انہوں نے دیکھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے ہوئے ہیں۔ حلیمہ نے دریافت کیا کہ کیا ہوا تھا؟ آپؐ نے فرمایا۔ ابھی تین آدمی آئے تھے۔ جنہوں نے میرا سینہ چیرا اور میرے دل کو دھو کر اندر رکھ دیا اور پھر چلے گئے (السیرة النبویة لابن هشام ولادة رسول الله و رضاعته) اب یہ بھی ایک کشفی نظارہ تھا۔ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دیکھا۔ اور حلیمہ کے بیٹے نے بھی اس نظارے کو دیکھ لیا ورنہ خدا تعالیٰ کے ملائکہ کسی کے دل کی صفائی کے لئے ظاہری چیر پھاڑ کے محتاج نہیں ہوتے۔ اسی طرح حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک رات مدینہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں سو رہے تھے۔ جب آپؐ تہجد کے لئے اٹھے اور وضو فرمانے لگے تو مجھے آواز آئی کہ آپؐ فرما رہے ہیں لَبَّیْكَ۔ لَبَّیْكَ۔ لَبَّیْكَ۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا۔ نُصِرْتَ۔ نُصِرْتَ۔ نُصِرْتَ۔ وہ کہتی ہیں۔ جب آپ میرے پاس تشریف لائے تو میں نے کہا۔ یا رسول اللہ! کیا کوئی آدمی آیا تھا اور آپ اس سے باتیں کر رہے تھے؟ آپ نے فرمایا۔ ہاں میرے سامنے کشفی طور پر خزاعہؔ کا ایک وفد پیش ہوا اور میں نے دیکھا کہ وہ شور مچاتے چلے آرہے ہیں کہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اُس کے خدا کی قسم دے کر کہتے ہیں کہ تیرے ساتھ اور تیرے باپ دادوں کے ساتھ ہم نے معاہدے کئے تھے اور ہم تیری مدد کرتے چلے آئے ہیں۔ مگر قریش نے ہمارے ساتھ بدعہدی کی۔ اور رات کے وقت ہم پر حملہ کر کے جبکہ ہم میں سے کوئی سجدہ میں تھا اور کوئی رکوع میں ہم کو قتل کر دیا۔ اب ہم تیری مدد حاصل کرنے کے لئے آئے ہیں جب کشفی طور پر مجھے وہ وفد نظر آیا تو میں نے لَبَّیْكَ۔ لَبَّیْكَ۔ لَبَّیْكَ۔ میں تمہاری مدد کے لئے حاضر ہوں۔ میں تمہاری مدد کے لئے حاضر ہوں۔ میں تمہاری مدد کے لئے حاضر ہوں۔ پھر میں نے کہا۔ نُصِرْتَ۔ نُصِرْتَ۔ نُصِرْتَ۔ تجھے مدد دی جائے گی۔ تجھے مدد دی جائے گی۔ تجھے مدد دی جائے گی (السیرة الحلبیة فتح مكة شرفها الله)۔ اب دیکھو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک کشفی نظارہ دیکھ رہے ہیں اور کشفی حالت میں ہی آپ لَبَّیْكَ۔ لَبَّیْكَ۔ لَبَّیْكَ کہتے ہیں اور پھر تین دفعہ نُصِرْتَ۔ نُصِرْتَ۔ نُصِرْتَ کہتے ہیں۔ اور یہ آواز حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا بھی سن لیتی ہیں۔ اور وہ آپ سے دریافت فرماتی ہیں کہ کیا کوئی آدمی تھا جس سے آپ باتیں کر رہے تھے۔ اور آپؐ فرماتے ہیں۔ یہ ایک کشفی نظارہ تھا۔ یہ واقعہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ کشفی حالت میں بعض دفعہ دوسرے لوگ بھی شریک کر لئے جاتے ہیں۔ اب گو حضرت میمونہؓ نے وہ وفد نہیں دیکھا۔ مگر انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ جواب سن لیا جو آپؐ نے کشفی حالت میں خزاعہؔ کے وفد کو دیا تھا۔ اور پھر چند دن بعد ایسا ہی

وقوع پذیر ہو گیا۔

پھر یہ واقعات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی نہیں ہوئے بلکہ بعد میں بھی اللہ تعالیٰ ایسے نشانات ظاہر کرتا رہا ہے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک دفعہ خطبہ پڑھا رہے تھے کہ خطبہ پڑھاتے پڑھاتے آپ نے بلند آواز سے فرمایا۔ یَا سَارِیَۃُ الْجَبَلَ۔ اے ساریہ پہاڑ کے دامن میں پناہ لو۔ اور یہ فقرہ آپ نے دو تین مرتبہ دہرایا وہ لوگ جو خطبہ سن رہے تھے۔ سخت حیران ہوئے کہ حضرت عمرؓ نے یہ کیا کہہ دیا ہے بلکہ بعض منافقوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ عمرؓ پاگل ہو گیا ہے کہ اُس نے خطبہ پڑھتے پڑھتے یہ بے جوڑ بات کہہ دی کہ یَا سَارِیَۃُ الْجَبَلَ اے ساریہ تو پہاڑ کے دامن میں چلا جا۔ جب لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونی شروع ہوئیں تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے عرض کیا کہ لوگ آپ کے متعلق مختلف قسم کی باتیں کر رہے ہیں اور وہ حیران ہیں کہ آپ نے آج خطبہ میں یہ کیا کہہ دیا کہ یَا سَارِیَۃُ الْجَبَلَ۔ آپ نے فرمایا۔ میں خطبہ پڑھ رہا تھا کہ کہ اچانک مجھ پر کشفی حالت طاری ہوئی اور عراق کی سرزمین میرے سامنے آ گئی اور میں نے دیکھا کہ ساریہ جو اسلامی جرنیل ہے وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ دشمن فوج سے برسرِ پیکار ہے مگر دشمن فوج کا پلّہ بھاری ہے اور قریب ہے کہ اسلامی فوج شکست کھا جائے۔ میں نے جب یہ نظارہ دیکھا تو چونکہ اُس وقت میدانِ جنگ کا سب نقشہ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ میں نے بلند آواز سے ساریہؓ سے کہا کہ اے ساریہ! پہاڑ کی طرف ہو جاؤ تا کہ تم دشمن کے حملہ سے بچ سکو۔ چند دن کے بعد میدانِ جنگ سے حضرت عمرؓ کو ساریہؓ کا خط پہنچا۔ تو اس میں لکھا تھا کہ جمعہ کے دن صبح کی نماز کے وقت ہماری دشمن سے مڈبھیڑ ہوئی۔ اور ہم اُن سے لڑتے چلے گئے یہاں تک کہ جمعہ کی نماز کا وقت آ گیا۔ اُس وقت اچانک ہمارے کانوں میں آپ کی یہ آواز آئی کہ یَا سَارِیَۃُ الْجَبَلَ یَا سَارِیَۃُ الْجَبَلَ اور ہم فوراً میدان چھوڑ کر پہاڑ کی طرف آ گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں فتح دی اور دشمن شکست کھا گیا۔

(تاریخ الخمیس کرامۃ عمر رضی اللہ عنہ)

اب دیکھو اسلامی افواج مدینہ سے سینکڑوں میل دور ہیں۔ اور حضرت عمرؓ مدینہ میں بیٹھے ہیں۔ مگر جب آپ پر کشفی حالت طاری ہوئی تو نہ صرف آپ کی آواز کو اُن لوگوں نے سنا جو اُس وقت خطبہ میں شریک تھے بلکہ سینکڑوں میل دور عراق کی سرزمین میں ساریہ اور اُس کے سپاہیوں نے بھی سن لی اور انہوں نے فوراً اس کی تعمیل کی جس کے نتیجہ میں اسلامی فوج تباہی سے بچ گئی اور دشمن شکست کھا گیا۔

یہ مثال اس حقیقت کو نہایت وضاحت سے ثابت کرتی ہے کہ بعض دفعہ کشوف کے دائرہ کو ایسا وسیع کر دیا جاتا ہے

کہ سینکڑوں میل دور رہنے والے بھی اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح امت محمدیہ میں جو اولیاء گذرے ہیں ان میں سے ایک بزرگ کے متعلق لکھا کہ وہ ہر روز تہجد کے وقت اللہ تعالیٰ سے دعائیں کیا کرتے تھے ایک رات جب کہ وہ دعا مانگ رہے تھے ان کا ایک مرید بھی ان کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ دعا کرنے کے بعد ان کو ایک الہام ہوا جو اس مرید نے بھی سن لیا مگر ادب کی وجہ سے وہ خاموش رہا دوسرے دن وہ پھر تہجد کے لئے اٹھے اور انہوں نے دعائیں کیں تو پھر ان پر وہی الہام نازل ہوا جو پہلے دن نازل ہوا تھا اور یہ الہام بھی ان کے مرید نے سن لیا مگر پھر بھی وہ خاموش رہا تیسرے دن وہ دعا کے لئے اٹھے اور نماز سے فارغ ہوئے تو پھر انہیں وہی الہام ہوا جو ان کے مرید نے بھی سن لیا اور وہ کہنے لگا حضور میں برابر تین دن سے یہ دیکھ رہا ہوں کہ ہر روز آپ پر یہ الہام نازل ہوتا ہے کہ میں تمہاری دعا قبول نہیں کروں گا مگر آپ برابر دعا کئے جاتے ہیں آپ کو تو چاہیے کہ اب دعائیں کرنا چھوڑ دیں جب خدا تعالیٰ قبول کرنا نہیں چاہتا تو اتنا زور دینے کا کیا فائدہ؟ انہوں نے کہا تو تو صرف تین دن یہ الہام سن کر گھبرا گیا ہے مجھے تو تیس سال سے برابر یہ الہام ہو رہا ہے مگر میں اللہ تعالیٰ سے مایوس نہیں ہوا کیوں کہ بندے کا کام دعا مانگتے چلے جانا ہے مایوس ہونا مومن کا کام نہیں لکھا ہے کہ دوسرے ہی دن اللہ تعالیٰ نے ان پر الہام نازل کیا کہ تم نے تیس سال کے عرصہ میں جس قدر بھی دعائیں کی تھیں وہ سب میں نے قبول کر لی ہیں انہوں نے اپنے اس مرید کو بلایا اور کہا۔ دیکھو اگر میں تمہاری بات مان کر دعائیں کرنا ترک کر دیتا تو میں اللہ تعالیٰ کے کتنے بڑے فضلوں سے محروم ہو جاتا۔ اور اس وقت محروم ہوتا جب کہ میں کامیابی کے دروازے پر پہنچ چکا تھا۔ اب دیکھو ایک بزرگ کو الہام ہوتا ہے مگر اللہ تعالیٰ اس کے دائرہ کو اتنا وسیع کر دیتا ہے کہ ان کا ایک مرید بھی الہام کی آواز سن لیتا ہے اور برابر تین دن تک سنتا رہتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو سرخی کے چھینٹوں والا کشف دکھایا گیا۔ تو سرخی کے چھینٹے نہ صرف آپ کی قمیص پر پائے گئے بلکہ ایک قطرہ میاں عبداللہ صاحب سنوریؓ کی ٹوپی پر بھی آگرا۔ اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس نشان میں ان کو بھی شریک کر لیا (چشمۂ معرفت روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۴۳۲، ۴۳۳)۔ اسی طرح ایک دفعہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ میں مجھے بتایا گیا کہ آج رات حضرت مسیح موعود علیہ السلام پر یہ الہام نازل ہوا ہے کہ اِنِّیْ مَعَ الْاَفْوَاجِ اٰتِیْکَ بَغْتَةً۔ صبح حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اشاعت کے لئے اپنے الہامات لکھ کر دیئے تو اتفاقاً آپ کو یہ الہام لکھنا یاد نہ رہا۔ میں نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے کہا کہ مجھے تو آج رات ایک فرشتہ نے بتایا تھا کہ آپ کو یہ الہام ہوا ہے کہ اِنِّیْ مَعَ الْاَفْوَاجِ اٰتِیْکَ بَغْتَةً مگر

آپ نے جو الہامات لکھے ہیں ان میں اس کا کہیں ذکر نہیں۔آپ نے فرمایا۔ٹھیک ہے مجھے یہ الہام ہوا تھا۔مگر لکھنا یاد نہیں رہا پھر آپ اندر سے اپنے الہامات کی کاپی اٹھا لائے اور مجھے فرمایا کہ دیکھو اس میں میں نے یہ الہام درج کیا ہوا ہے۔اس کے بعد آپ نے اس الہام کو بھی اخبار میں شائع کروا دیا۔اب دیکھو ادھر ایک الہام حضرت مسیح موعود علیہ السلام پر نازل ہوتا ہے اور اُدھر اللہ تعالیٰ مجھے بھی بتا دیتا ہے کہ ان الفاظ میں آپ پر الہام نازل ہوا ہے اور صبح معلوم ہوتا ہے کہ بات بالکل درست تھی۔

غرض رؤیا و کشوف میں بعض دفعہ ساتھ رہنے والے بھی شریک کر لیئے جاتے ہیں۔اور یہ چیز ایسی قطعی اور یقینی ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ملکہ وکٹوریہ کو تبلیغ اسلام کرتے ہوئے لکھا کہ

''اگر کوئی طالب حق نیت کی صفائی سے ایک مدت تک میرے پاس رہے اور وہ حضرت مسیحؑ کو کشفی حالت میں دیکھنا چاہے تو میری توجہ اور دعا کی برکت سے وہ ان کو دیکھ سکتا ہے۔ان سے باتیں بھی کر سکتا ہے اور ان کی نسبت اُن سے گواہی بھی لے سکتا ہے۔کیونکہ میں وہ شخص ہوں جس کی روح میں بروز کے طور پر یسوع مسیح کی روح سکونت رکھتی ہے۔''

(تحفہ قیصریہ، روحانی خزائن جلد ۱۲ صفحہ ۲۷۳)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سونٹے کا سانپ بن کر نظر آنا بھی ایسے ہی کشوف میں سے تھا جس کا دائرہ وسیع کر دیا گیا اور فرعون اور اس کے ساتھیوں نے موسیٰؑ کا عصا ایک بہت بڑے اژدہا کی صورت میں دیکھا جسے دیکھ کر وہ ڈرے اور ان کے دلوں پر لرزہ طاری ہو گیا۔

یہ نظارہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے حدیثوں میں آتا ہے کہ ایک غریب شخص جس کا ابوجہل کے ذمہ کچھ قرض تھا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ ابوجہل نے میرا اتنا روپیہ دینا ہے مگر بار بار تقاضوں کے باوجود وہ میرا روپیہ مجھے نہیں دیتا۔آپؐ اس بارہ میں میری مدد کریں۔اور مجھے اس سے روپیہ دلوا دیں۔چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بعثت سے پہلے ایک ایسی مجلس میں شریک رہ چکے تھے جس کا ہر ممبر یہ حلف اٹھاتا تھا کہ میں مظلوموں کی مدد کروں گا۔اور حقدار کو اس کا حق دلانے کی کوشش کروں گا۔اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فوراً اس کے ساتھ ابوجہل کے مکان کی طرف چل پڑے حالانکہ اس زمانہ میں مکہ میں آپؐ کی شدید مخالفت تھی اور گلی کوچوں میں آپؐ کا اکیلے پھرنا خطرہ سے خالی نہیں تھا مگر آپؐ اپنی جان کی کوئی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس کے ساتھ چل پڑے اور ابوجہل کا دروازہ کھٹکھٹایا۔وہ باہر آیا۔تو آپ نے فرمایا۔تم نے اس شخص کا کوئی روپیہ دینا ہے۔اس نے کہا۔

ہاں! آپؐ نے فرمایا۔ پھر اِسے لادو۔ وہ چپکے سے اندر گیا اور اس نے روپیہ لا کر دے دیا۔ جب یہ خبر مکہ کے لوگوں نے سنی تو انہوں نے ابوجہل کو طعنے دینے شروع کر دیئے کہ تم ہمیں تو کہتے ہو کہ محمدؐ رسول اللہ کی کوئی بات نہ مانو مگر خود اتنا ڈر گئے کہ اس کے کہنے پر تم چپکے سے اندر گئے اور روپیہ لا کر اس کے حوالے کر دیا۔ وہ کہنے لگا۔ تمہیں کیا معلوم کہ میرے ساتھ کیا واقعہ ہوا جب میں نے دروازہ کھولا اور مجھے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نظر آئے۔ تو میں نے دیکھا کہ آپ کے دائیں اور بائیں دو مست اونٹ کھڑے ہیں اور وہ ایسے جوش میں ہیں کہ میں نے سمجھا اگر اس وقت میں نے ذرا بھی انکار کیا تو یہ دونوں اونٹ مجھے نوچ کر کھا جائیں گے۔ چنانچہ میں نے اپنی سلامتی اسی میں دیکھی کہ فوراً روپیہ لا کر پیش کر دوں۔ یہ بھی ایک کشفی نظارہ تھا جو ابوجہل کو دکھائی دیا۔ ورنہ ظاہر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں بائیں کوئی دیوانے اونٹ نہیں تھے (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام امر الاراشی الذی باع اباجھل ابلہ)۔

اِسی طرح ایک دفعہ ایک ہندو جو لاہور کے کسی دفتر میں اکاؤنٹنٹ تھا اور علمِ توجہ کا بڑا ماہر تھا کسی برات کے ساتھ اس نیت اور ارادہ سے قادیان آیا کہ میں مرزا صاحب پر مسمریزم کروں گا۔ تو وہ مجلس میں بیٹھے ناچنے لگ جائیں گے۔ اور لوگوں میں ان کی بڑی سبکی ہوگی۔ یہ واقعہ اس ہندو نے خود لاہور کے ایک احمدی دوست میاں عبدالعزیز صاحب مغل کو سنایا تھا جس کی تقریب اس طرح پیدا ہوئی کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے میاں عبدالعزیز صاحب کو اپنی ایک کتاب دی اور فرمایا کہ یہ فلاں ہندو کو دے دینا۔ انہوں نے اُسے کتاب پہنچا کر پوچھا کہ حضرت صاحب نے آپ کو یہ کتاب کیوں بھجوائی ہے اور آپ کا ان کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ اس پر اس ہندو نے یہ سارا واقعہ سنایا اور کہا کہ مجھے مسمریزم کے علم میں اتنی مہارت حاصل ہے کہ اگر میں تانگہ میں بیٹھے ہوئے کسی شخص پر توجہ ڈالوں تو وہ فوراً تانگے کے پیچھے پیچھے بھاگا آئے گا۔ حالانکہ نہ وہ میرا واقف ہوگا اور نہ میں اسے جانتا ہوں گا۔ پھر اس نے کہا۔ کہ میں نے آریوں اور ہندوؤں سے حضرت مرزا صاحب کے خلاف بہت سی باتیں سنی ہوئی تھیں جن کی بناء پر میں نے ارادہ کیا کہ میں مرزا صاحب پر مسمریزم کے ذریعہ اثر ڈالوں گا۔ اور اُن کے مریدوں کے سامنے ان کی سبکی کروں گا۔ چنانچہ میں ایک شادی کے سلسلہ میں قادیان گیا اور مرزا صاحب کی مجلس میں بھی چلا گیا مرزا صاحب اُس وقت کچھ وعظ و نصیحت کی باتیں کر رہے تھے۔ میں نے دروازے میں بیٹھ کر اُن پر توجہ ڈالنی شروع کی۔ مگر اُن پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ میں نے سمجھا کہ اِن کی قوتِ ارادی زیادہ قوی ہے۔ چنانچہ میں نے پہلے سے زیادہ توجہ ڈالنی شروع کی۔ مگر پھر بھی ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اور وہ اُسی طرح باتوں میں مشغول رہے۔ تب میں نے سمجھا کہ ان کی قوتِ ارادی بہت زیادہ مضبوط ہے اور میں نے اپنی ساری توجہ اُن پر صرف کر دی۔ میں ابھی توجہ

کر رہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ میرے سامنے کچھ فاصلہ پر ایک شیر بیٹھا ہے میں اُسے دیکھ کر کانپ گیا۔لیکن میں نے اپنے دل کو ملامت کی کہ تو کیسے وہم میں مبتلا ہو گیا ہے۔ یہاں بھلا شیر کا کیا کام ہے اور میں نے پھر توجہ کرنی شروع کر دی۔ اس پر میں نے دیکھا کہ وہ شیر میرے قریب آ گیا ہے اُسے دیکھ کر میرا جسم پھر کانپ اٹھا۔مگر میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور پھر توجہ ڈالنی شروع کر دی جب میں نے اپنا پورا زور لگا دیا تو اچانک میں نے کیا دیکھا کہ وہی شیر کود کر مجھ پر حملہ آور ہوا ہے اور ڈر کے مارے زور سے میری چیخ نکل گئی اور میں جلدی سے اپنی جوتی لے کر نیچے بھاگا۔ میری آواز سن کر حضرت مرزا صاحب نے اپنے مریدوں سے کہا کہ دیکھنا یہ کون شخص بھاگا ہے اور اسے کیا ہوا ہے۔ چنانچہ ایک شخص میرے پیچھے آیا اور اُس نے مسجد کے ساتھ والے چوک میں مجھے آ پکڑا میں چونکہ اس وقت سخت حواس باختہ تھا۔ اِس لئے میں نے اس سے کہا کہ تم مجھے جانے دو۔ میرے حواس اس وقت درست نہیں ہیں۔ چنانچہ مجھے چھوڑ دیا گیا۔ بعد میں اس نے یہ تمام واقعہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو لکھا اور کہا کہ مجھ سے گستاخی ہو گئی ہے۔ میں آپ کے مرتبہ کو پہچان نہ سکا۔ آپ بڑے خدا رسیدہ اور بزرگ انسان ہیں۔ آپ میری اس غلطی کو معاف فرماویں۔ میاں عبدالعزیز صاحب مغل سنایا کرتے تھے کہ میں نے اس ہندو سے پوچھا کہ تم نے یہ کیوں نہ سمجھا کہ مرزا صاحب مسمریزم جانتے ہیں اور اس علم میں وہ تم سے بڑھ کر ہیں۔ وہ کہنے لگا۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مسمریزم کے لئے توجہ کا ہونا ضروری ہے اور یہ عمل کامل سکون اور خاموشی چاہتا ہے مگر مرزا صاحب تو اس وقت باتوں میں مشغول تھے اس لئے میں نے سمجھ لیا کہ ان کی قوتِ ارادی زمینی نہیں بلکہ آسمانی ہے اور وہ خدا رسیدہ انسان ہیں۔ (سیرۃ المہدی صفحہ ۵۵، ۵۶ جدید ایڈیشن) چنانچہ یہ ہندو جب تک زندہ رہا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بڑا معتقد رہا اور ہمیشہ آپ سے خط و کتابت رکھتا تھا۔

اسی طرح ۱۸۹۳ء میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب عبداللہ آتھم کے متعلق پیشگوئی فرمائی کہ وہ پندرہ ماہ تک ہاویہ میں گرایا جائے گا اور اُس کو سخت ذلّت پہنچے گی۔ بشرطیکہ حق کی طرف رجوع نہ کرے۔ تو عبداللہ آتھم کے دل پر اس پیشگوئی کی ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ اُسے قسم قسم کے خوفناک نظارے نظر آنے شروع ہو گئے۔ ایک دفعہ امرتسر میں اسے ایک خطرناک سانپ دکھائی دیا۔ جس کی اس کے دل پر ایسی دہشت طاری ہوئی کہ وہ بیوی بچوں کو چھوڑ کر لدھیانہ اپنے داماد کے پاس بھاگ گیا۔ مگر وہاں پہنچ کر بھی اسے سکون نہ ملا۔ بلکہ اُس نے دیکھا کہ بعض آدمی جنہوں نے اپنے ہاتھوں میں نیزے پکڑے ہوئے ہیں اُس کو قتل کرنے کے لئے مستعد کھڑے ہیں اور کوٹھی کے احاطہ کے اندر آ پہنچے ہیں۔ اس پر وہ پھر گھبرایا اور دوڑ کر اپنے دوسرے داماد کے پاس فیروز پور چلا گیا۔ مگر وہاں

بھی اُسے ایسے ہی حملہ آور دکھائی دیئے جو بندوقوں اور تلواروں سے مسلح تھے غرض پندرہ ماہ اس نے سخت بے چینی اور اضطراب میں بسر کئے اور گھبرا کر ادھر اُدھر دوڑتا رہا۔ یہ نظارے جو آتھم کو دکھائے گئے درحقیقت کشفی رنگ ہی رکھتے تھے۔ ورنہ اگر کوئی جسمانی سانپ ہوتا تو عبداللہ آتھم اُسے آسانی کے ساتھ مار سکتا تھا۔ اِسی طرح اگر انسان حملہ آور ہوتے تو وہ آسانی سے گرفتار کئے جاسکتے تھے۔ مگر یہ چیز تو ایسی تھی جو صرف آتھم کو دکھائی دی۔ اور اُس نے خود ان واقعات کو بیان کیا (انجام آتھم، روحانی خزائن جلد ۱۱ صفحہ ۸، ۹)۔

غرض جس طرح ابوجہل کو دو مست اونٹ دکھائی دیئے اور لاہور کے ہندو دوست کو ایک شیر حملہ کرتا ہوا دکھائی دیا۔ اور عبداللہ آتھم کو سانپ اور تلواروں اور نیزوں وغیرہ سے مسلّح افراد دکھائی دیئے۔ اسی طرح فرعون مصر کو موسیٰ ؑ کا عصا ایک اژدہا کی صورت میں نظر آیا جسے دیکھ کر وہ کانپ گیا اور گو اس نے اسے ایک جسمانی سانپ ہی سمجھا مگر درحقیقت اس کی تعبیر یہ تھی کہ موسیٰ کی جماعت ایک دن فرعون اور اس کے تمام لاؤ لشکر کو اژدہا بن کر کھا جائے گی اور وہی بنی اسرائیل جن کو وہ موسیٰ ؑ کے ساتھ بھیجنے کے لئے تیار نہیں ایک دن اس کی تباہی اور بربادی کا باعث بن جائیں گے اور موسیٰ ؑ کو غلبہ حاصل ہو جائے گا۔ تعطیر الانام میں بھی لکھا ہے کہ مَنْ رَاٰی اَنَّہٗ مَلِكَ ثُعْبَانًا فَاِنَّہٗ یُصِیْبُ سُلْطَانًا عَظِیْمًا یعنی اگر کوئی شخص یہ دیکھے کہ کوئی بڑا اژدہا اس کے قبضے میں آ گیا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہوگی کہ اسے بہت بڑا غلبہ حاصل ہوگا۔ پس یہ کشف موسیٰ ؑ اور اس کی جماعت کے غلبہ اور فرعون اور اس کی قوم کی تباہی کی خبر اپنے اندر رکھتا تھا۔ اسی طرح اس کشف میں فرعون کو اس طرف بھی توجہ دلائی گئی تھی کہ بنی اسرائیل کا موسیٰ ؑ کے ہاتھ میں ہی رہنا ضروری ہے ورنہ اگر یہ تمہارے پاس رہی تو تمہارے اخلاق و اطوار ہی ان پر اثر انداز ہوں گے مگر پھر یہ انسان نہیں رہیں گے بلکہ سانپ بن جائیں گے۔ اور جس طرح سانپ سفلی زمین کی مٹی کھاتا ہے۔ اسی طرح وہ بھی زمین کے کیڑے بن جائیں گے ایک مضبوط اور مستعد جماعت کی شکل اختیار نہیں کر سکیں گے۔ مگر فرعون نے اس کشفی نظارہ کی حقیقت کو نہ سمجھا اور یہ خیال کر لیا کہ موسیٰ ؑ کوئی بڑا جادوگر ہے۔ جس نے اپنے جادو کے زور سے سونٹے کو سانپ کی شکل میں تبدیل کر دیا ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ عصائے موسیٰ ؑ کے سانپ بن جانے کے متعلق قرآن کریم نے تین الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اوّل ثعبان۔ دوم حیّۃ۔ سوم جانّ۔ ثعبان کا لفظ تو سورۃ اعراف ع ۱۳ اور سورۃ شعراء کی زیر تفسیر آیت میں استعمال ہوا ہے۔ حیّۃ کا لفظ سورۃ طٰہٰ کے پہلے رکوع میں استعمال ہوا ہے۔ اور جانّ کا لفظ سورۃ نمل ع ۱ اور سورۃ قصص ع ۴ میں استعمال ہوا ہے۔ دشمنان اسلام اپنی نادانی سے یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ ایک ہی امر کے متعلق

قرآن کریم نے اتنے مختلف الفاظ کیوں استعمال کئے ہیں۔اس سے تو معلوم ہوا کہ قرآن کریم میں اختلاف پایا جاتا ہے۔مگر یہ اعتراض قلّتِ تدبر کا نتیجہ ہے۔اگر وہ غور کرتے تو انہیں اس میں کوئی اختلاف نظر نہ آتا۔حقیقت یہ ہے کہ فرعون کے دربار میں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا پھینکا اور وہ اژدہا بن کر نظر آنے لگا۔تو اس واقعہ کے متعلق قرآن کریم نے ہر مقام پر صرف ثُعۡبَان کا لفظ استعمال کیا ہے کوئی اور لفظ استعمال نہیں کیا۔پس اس بارہ میں اختلاف کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

باقی رہا حَیَّۃٌ اور جَآنٌّ کے الفاظ کا استعمال سو یہ دونوں الفاظ اس موقعہ پر استعمال کئے گئے ہیں جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کو اپنے کلام سے نوازا اور انہیں فرعون کی طرف جانے کی ہدایت فرمائی۔اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے موسیٰؑ اپنا سونٹا پھینک۔انہوں نے سونٹا پھینکا تو قرآن کریم میں لکھا ہے کہ فَاِذَا ھِیَ حَیَّۃٌ تَسۡعٰی (طٰہٰ:۲۱) موسیٰ نے کیا دیکھا کہ وہ ایک سانپ ہے جو دوڑ رہا ہے حَیَّۃ کا لفظ چھوٹے اور بڑے دونوں قسم کے سانپوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔لیکن سورۂ نمل اور قصص میں یہی مضمون ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ فَلَمَّا رَاٰھَا تَھۡتَزُّ کَاَنَّھَا جَآنٌّ وَّلّٰی مُدۡبِرًا وَّ لَمۡ یُعَقِّبۡ (النمل:۱۱) جب موسیٰؑ نے دیکھا کہ وہ لاٹھی ہل رہی ہے گویا کہ وہ ایک چھوٹا سانپ ہے تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگا اور اس نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔سورۂ قصص رکوع ۴ میں بھی یہی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں پس اگر اعتراض ہوسکتا ہے تو صرف اس پر کہ ایک ہی واقعہ کے متعلق ایک جگہ حیّۃ اور دوسری جگہ جانّ کا لفظ کیوں استعمال کیا گیا ہے۔ثُعۡبَانٌ کا لفظ جیسا کہ بتایا جاچکا ہے الگ موقعہ پر استعمال ہوا ہے اس لئے ثُعۡبَانٌ کے بارہ میں کوئی سوال پیدا نہیں ہوسکتا۔سوال صرف یہ ہوسکتا ہے کہ حَیَّۃٌ کو دوسرے مقام پر جَآنٌّ کیوں کہا گیا ہے سو یاد رکھنا چاہیے کہ سورۂ نمل اور قصص دونوں مقامات پر قرآن کریم نے یہ نہیں کہا کہ وہ جَآنٌّ تھا بلکہ یہ کہا ہے کہ تَھۡتَزُّ کَاَنَّھَا جَآنٌّ وہ اس طرح ہلتا تھا جس طرح چھوٹا سانپ ہلتا تھا۔گویا تھا وہ بڑا سانپ ہی مگر وہ ہلتا اس طرح تیزی سے تھا جیسے چھوٹا سانپ ہلا کرتا ہے۔پس قرآن کریم نے جو الفاظ استعمال کئے ہیں اُن کا آپس میں کوئی تضاد نہیں۔جہاں قرآن کریم نے جانّ کا لفظ استعمال کیا ہے وہاں اس سانپ کی صرف تیزی کا ذکر ہے اور یہ بتانا مقصود ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سونٹا پھینکا تو وہ چھوٹے سانپ کی طرح تیزی سے دوڑنے لگ پڑا وہاں اس کی شکل کا کوئی ذکر نہیں کہ وہ چھوٹا تھا یا بڑا بلکہ یہ بتانا مدّنظر ہے کہ چھوٹے سانپ کی طرح اُس میں تیزی پائی جاتی تھی۔لیکن جہاں ثُعۡبَانٌ کا لفظ آیا ہے وہ آیات دیکھی جائیں تو صاف معلوم ہوگا کہ وہ واقعہ فرعون کے سامنے ہوا ہے اور فرعون کو چونکہ ڈرانا مقصود تھا۔اِس لئے اُسے ثُعۡبَانٌ کی شکل میں سونٹا دکھائی دیا۔پس قرآنی آیات

میں جو تضاد سمجھا جاتا ہے۔ وہ حقیقتاً کوئی تضاد نہیں محض قلّتِ تدبّر یا لغتِ عرب سے ناواقفیت کی وجہ سے ایسے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

دوسرا نشان جو اللہ تعالیٰ نے اس موقعہ پر ظاہر کیا وہ یہ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہلو سے اپنا ہاتھ نکالا تو وہ انہیں بالکل سفید اور چمکتا ہوا دکھائی دیا۔ یہ بھی ایک کشفی نظارہ تھا جو فرعونیوں کو دکھایا گیا۔ اور جس میں ایک تو اس طرف اشارہ تھا کہ اے فرعونیو! تم مسمریزم جانتے ہو اور تمہیں معلوم ہے کہ سفید رنگ نیکی اور پاکیزگی اور طہارتِ قلب کی علامت ہوا کرتا ہے پس موسیٰؑ کے ہاتھ کا سفید نظر آنا بتا رہا ہے کہ یہ شخص پاک اور بے عیب ہے اور یہ جو کچھ کہہ رہا ہے اس میں کسی جھوٹ اور افتراء کی آمیزش نہیں۔ اگر اس کا ہاتھ سیاہ دکھائی دیتا تو یہ اُس کی سیاہیٔ قلب اور باطنی تاریکی کا ثبوت ہوتا۔ مگر تم دیکھ رہے ہو کہ اس کا ہاتھ سورج کی طرح روشن ہے اور اس کی شعاعیں تمہاری آنکھوں کو خیرہ کر رہی ہیں۔ پس تم اپنے علم کی بناء پر بھی سمجھ سکتے ہو کہ یہ شخص پاکباز ہے اور تمہارا فرض ہے کہ یہ جو کچھ کہے تم اسے تسلیم کرو۔

اسی طرح موسیٰ کا روشن ہاتھ اس تغیر کا بھی حامل تھا کہ اس شخص کے ہاتھ پر بڑے بھاری تغیرات مقدر ہیں مگر وہ تغیرات کسی ظلم اور تشدّد کے نتیجہ میں نہیں ہوں گے۔ نہ مکر اور فریب اور جھوٹ اور جعلسازی اُن میں کام کر رہی ہوگی بلکہ اللہ تعالیٰ کی تائید اور اُس کی معجزانہ نصرت اس کا باعث ہوگی جس کو موسیٰؑ کی دعائیں جذب کریں گی اور وہ روحانی سلسلہ جس کی اس کے ہاتھ سے بنیاد رکھی جا رہی ہے ایک دن دنیا کو اپنے انوار سے روشن کر دے گا۔ گویا جس طرح سورج اور چاند کے طلوع سے تاریکی غائب ہو جاتی ہے۔ اسی طرح موسیٰؑ کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ کے جو نشانات ظاہر ہوں گے۔ اُن سے وہ ظلمت اور تاریکی دُور ہو جائے گی جو لوگوں کے قلوب کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور شیطان کی جگہ رحمٰن کی حکومت قائم ہو جائے گی۔

پھر موسیٰؑ کے اس کشف میں آپؑ کی قوم کی پاکیزگی اور طہارت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا تھا کیونکہ ہاتھ کی تعبیر میں جہاں بھائی بیٹے اور رشتہ دار وغیرہ مراد ہوتے ہیں (تعطیر الانام) وہاں یَدٌ سے قوم بھی مراد ہوتی ہے کیونکہ قوم کے افراد بھی ایک دوسرے کی تقویت اور سہارے کا موجب ہوتے ہیں اور مشکلات میں وہ دوسروں کے کام آتے ہیں۔ پس کشفی طور پر آپ کے ہاتھ کا روشن اور بے عیب دکھایا جانا اس تعبیر کا بھی حامل تھا کہ آج تو بنی اسرائیل میں کئی قسم کے عیوب دکھائی دے رہے ہیں لیکن جب یہ قوم میرے ہاتھ پر جمع ہوگی تو اللہ تعالیٰ اس کے اندر ایسا نور پیدا کر دے گا کہ یہ بھولے بھٹکوں کی راہنما بن جائے گی اور اخلاق اور روحانیت میں اعلیٰ درجہ کا کمال حاصل کر لے گی۔

یہ خیال کہ کسی انسان کے جسم سے ایسی شعاعیں کس طرح نکل سکتی ہیں جو دوسروں کو بھی نظر آ جائیں صرف اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ لوگ اس نشان کو ظاہر پر محمول کر لیتے ہیں۔ اگر وہ سمجھتے کہ یہ ایک کشفی واقعہ ہے تو اس قسم کے وساوس بھی ان کے دل میں پیدا نہ ہوتے موسیٰؑ کا زمانہ تو بہت دور کی بات ہے ہم تو دیکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے بعض ایسے نشانات دکھائے ہیں جن میں کشفی نگاہ رکھنے والوں نے اللہ تعالیٰ کے انوار کو ظاہری شکل میں بھی متمثل دیکھا اور اُس کے روحانی کیف سے لذت اندوز ہوئے۔ چنانچہ ۱۹۰۴ء میں جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام لاہور تشریف لے گئے تو وہاں ایک جلسہ میں آپؑ نے تقریر فرمائی۔ ایک غیر احمدی دوست شیخ رحمت اللہ صاحب وکیل بھی اُس تقریر میں موجود تھے۔ وہ کہتے ہیں۔ دورانِ تقریر میں مَیں نے دیکھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے سر سے نُور کا ایک ستون نکل کر آسمان کی طرف جا رہا تھا۔ اُس وقت میرے ساتھ ایک اور دوست بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں کہا۔ دیکھو وہ کیا چیز ہے۔ انہوں نے دیکھا۔ تو فوراً کہا کہ یہ تو نور کا ستون ہے جو حضرت مرزا صاحب کے سر سے نکل کر آسمان تک پہنچا ہوا ہے۔ اس نظارہ کا شیخ رحمت اللہ صاحب پر ایسا اثر ہوا کہ انہوں نے اسی دن حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بیعت کر لی۔ (الفضل ۱۵ ستمبر ۱۹۴۴ء صفحہ ۲ کالم ۲)

اسی طرح حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت چھ ماہ متواتر روزے رکھے تو آپ نے اُن روزوں کے روحانی اثرات کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

''اس قسم کے روزہ کے عجائبات میں سے جو میرے تجربہ میں آئے وہ لطیف مکاشفات ہیں جو اس زمانہ میں میرے پر کھلے۔ چنانچہ بعض گذشتہ نبیوں کی ملاقاتیں ہوئیں اور جو اعلیٰ طبقہ کے اولیاء اس اُمت میں گذر چکے ہیں اُن سے ملاقات ہوئی۔ اور علاوہ اس کے انوارِ روحانی تمثیلی طور پر برنگ ستون سبز و سُرخ ایسے دلکش اور دلستان طور پر نظر آتے تھے جن کا بیان کرنا بالکل طاقتِ تحریر سے باہر ہے۔ وہ نورانی ستون جو سیدھے آسمان کی طرف گئے ہوئے تھے جن میں سے بعض چمکدار سفید اور بعض سبز اور بعض سُرخ تھے۔ اُن کو دل سے ایسا تعلق تھا کہ اُن کو دیکھ کر دل کو نہایت سرور پہنچتا تھا اور دنیا میں کوئی بھی ایسی لذت نہیں ہوگی۔ جیسا کہ اُن کو دیکھ کر دل اور رُوح کو لذّت آتی تھی۔ میرے خیال میں ہے کہ وہ ستون خدا اور بندہ کی محبت کی ترکیب سے ایک تمثیلی صورت میں ظاہر کئے گئے تھے۔

یعنی وہ ایک نور تھا جو دل سے نکلا اور دوسرا وہ نور تھا جو اوپر سے نازل ہوا۔ اور دونوں کے ملنے سے ایک ستون کی صورت پیدا ہوگئی۔ یہ روحانی امور ہیں کہ دنیا اُن کو نہیں پہچان سکتی۔ کیونکہ وہ دنیا کی

آنکھوں سے بہت دور ہیں۔ لیکن دنیا میں ایسے بھی ہیں جن کو اِن امور سے خبر ملتی ہے۔''

(کتاب البریّہ حاشیہ، روحانی خزائن جلد ۱۳ صفحہ ۱۹۸، ۱۹۹)

اسی طرح آپؑ نے ایک دفعہ فرمایا کہ:

''میں دیکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے فیوض عجیب نوری شکل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جاتے ہیں اور پھر وہاں جا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ میں جذب ہو جاتے ہیں۔ اور وہاں سے نکل کر ان کی لا انتہاء نالیاں ہوتی ہیں اور بقدر حصّہ رسدی ہر حقدار کو پہنچتی ہیں''۔

(الحکم مؤرخہ ۲۸ رفروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۷)

اسی طرح ایک دفعہ آپؑ کو رؤیا میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی۔ اور آپؑ نے دیکھا کہ جیسے آفتاب کی کرنیں چھوٹتی ہیں۔ اِسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی مبارک سورج کی طرح چمک رہی ہے۔

(براہین احمدیہ حصہ چہارم روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۷۴ تا ۲۷۶)

پھر جلسہ اعظم مذاہب لاہور میں ابھی آپؑ کا مضمون نہیں پڑھا گیا تھا کہ آپؑ نے رؤیا میں دیکھا کہ

''میرے محل پر غیب سے ایک ہاتھ مارا گیا اور اس ہاتھ کے چھونے سے اس محل میں سے ایک نورِ ساطعہ نکلا جو ارد گرد پھیل گیا۔ اور میرے ہاتھ پر بھی اس کی روشنی پڑی۔''

(مجموعہ اشتہارات جلد ا صفحہ ۶۱۵)

غرض اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو اصلاحِ خلق کے لئے مبعوث فرماتا ہے وہ انہیں اپنے انوار اور تجلیات کا جلوہ گاہ بناتا ہے اور یہ نور بعض دفعہ ظاہری طور پر متمثل ہو کر دوسرے لوگوں کو بھی نظر آجاتا ہے تاکہ سعید الفطرت انسان اس سے فائدہ اٹھائیں اور وہ اپنے قلوب میں تغیر پیدا کریں۔

خود مجھے بھی اللہ تعالیٰ کا نور بعض دفعہ تمثل طور پر دکھائی دیا ہے چنانچہ ۱۹۱۰ء یا ۱۹۱۱ء کا واقعہ ہے کہ مجھے بخار ہو گیا اور ساتھ ہی مجھے اپنی ران میں شدید درد ہونے لگا۔ چونکہ اُن دنوں طاعون سے بعض اموات ہو رہی تھیں مجھے وہم ہوا کہ کہیں یہ طاعون ہی نہ ہو۔ چنانچہ میں نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا اور سوچنے لگا کہ یہ کیا ہونے لگا ہے۔ اسی اثنا میں جب کہ میری آنکھیں کھلی تھیں میں درو دیوار کو دیکھ رہا تھا اور مجھے اپنے کمرہ کی تمام چیزیں نظر آرہی تھیں۔ میں نے کشفی طور پر دیکھا کہ ایک سفید اور نہایت چمکتا ہوا نور ہے جو میرے کمرے کے نیچے سے نکل رہا ہے اور آسمان کی طرف چھت پھاڑ کر جا رہا ہے۔ نہ اس کی کوئی ابتداء معلوم ہوتی ہے اور نہ انتہا۔ اس کے بعد میں نے

دیکھا کہ اس نور میں سے ایک ہاتھ نکلا ہے جس میں ایک سفید چینی کا پیالہ ہے اور اس پیالہ میں دودھ بھرا ہوا ہے۔ اس ہاتھ نے وہ پیالہ مجھے پکڑا دیا اور میں نے وہ دودھ پی لیا۔ جب میں وہ دودھ پی چکا تو میں نے دیکھا کہ نہ تو کوئی درد ہے اور نہ بخار بلکہ میں اچھا بھلا ہوں۔ اور مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔

اسی طرح بعض دفعہ دوسروں کے جسم سے ایسی شعاعیں نکلتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں جن سے اُن کے اندرونی خیالات بے نقاب ہو جاتے ہیں اور پتہ لگ جاتا ہے کہ وہ سچے مومن ہیں یا نہیں۔ میں نے کئی دفعہ دیکھا ہے کہ ایک شخص میرے ساتھ بات کرتا ہے اور میری روح اس کی روح سے ٹکرا کر معلوم کر لیتی ہے کہ یہ منافق کی روح ہے۔ اسی طرح کئی ایسے ہوتے ہیں جو ظاہر میں بڑے اخلاص کا اظہار کرتے ہیں۔ ہاتھ چومتے ہیں۔ مگر اُن کے ہاتھ چومنے پر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا انہوں نے ہاتھ کو نجاست لگا دی ہے اور ان کی باتیں ایسی معلوم ہوتی ہیں کہ گویا وہ گالیاں دے رہے ہیں۔ کیونکہ قلوب کے اسرار بعض دفعہ تو اللہ تعالیٰ اس طرح ظاہر کر دیتا ہے کہ خود انسان کے منہ سے ایسی باتیں نکل جاتی ہیں جو اس کی قلبی کیفیت کا آئینہ دار ہوتی ہیں اور کبھی اس کے اندر سے باریک شعاعیں نکل کر دوسروں کے قلوب پر پڑتی ہیں۔ اور وہ چیز جسے وہ مخفی سمجھ رہا ہوتا ہے دوسرے پر ظاہر ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ خدا کے بندوں میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جن کی نظر باوجود انسانی ہونے کے لوگوں کے دلوں تک پہنچ جاتی ہے اور وہ چیز جو دنیا کے لئے پوشیدہ ہوتی ہے ان کے لئے ظاہر ہو جاتی ہے مگر چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی ستاری کی چادر اوڑھے ہوئے ہوتے ہیں اس لئے وہ ان کے عیب کو چھپا لیتے ہیں۔ وہ ایسا اس لئے نہیں کرتے کہ اُن کے دل کا خیال اُن پر ظاہر نہیں ہوتا بلکہ اس لئے کرتے ہیں کہ خدا نہیں چاہتا کہ اُس کی ستاری کی چادر کو اُٹھا دیا جائے۔

مجھے یاد ہے قادیان میں ایک دفعہ ایک بہائی عورت آئی اور مختلف مسائل پر مجھ سے گفتگو کرتی رہی۔ مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ ایک دن اس سے باتیں کرتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے جسم سے کوئی چیز نکل کر اس کے ساتھ ٹکرا جاتی ہے لیکن آگے نہیں گذرتی۔ آخر میں نے دعا کی تو میں نے دیکھا کہ وہ چیز جو اس کے ساتھ ٹکراتی تھی آگے نکلنے لگی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یا تو وہ بڑے جوش سے باتیں کر رہی تھی اور یا پھر یکدم گھبرا گئی اور اس نے بحث بند کر دی اور کہنے لگی کہ میرا بچہ بیمار ہے اس لئے میں جاتی ہوں حالانکہ وہ اچھّا بھلا تھا۔

غرض انبیاء اور اولیاء کے جسم سے مختلف قسم کی شعائیں نکلتی رہتی ہیں جو ان کے روحانی درجہ اور مقام کے مطابق مختلف رنگ کی ہوتی ہیں مگر یہ شعائیں مادی آنکھ سے دکھائی نہیں دیتیں بلکہ ان کے دیکھنے کے لئے کشفی نگاہ کی ضرورت ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہی میسر آ سکتی ہے۔ یہی نور تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے

نکلا۔اور الٰہی تصرف کے ماتحت فرعون اور اس کے درباریوں نے بھی دیکھ لیا۔مگر چونکہ وہ روحانی علوم سے بے بہرہ تھے انہوں نے اتنے بڑے نشان کو دیکھ کر بھی موسیٰ ؑ کی عظمت اور اس کے تقدس کو نہ پہچانا اور یہ خیال کر لیا کہ موسیٰ ؑ نے اپنے جادو کے زور سے ایسا کر لیا ہے بہرحال موسیٰ ؑ کے ہاتھ پر خدا تعالیٰ نے اپنے جلال اور جمال کا اظہار کیا اور سانپ کی شکل میں اسے انذاری اور ید بیضاء کی شکل میں تبشیری نشان دکھایا۔مگر بائیبل نے عصا کا سانپ بن جانا تو تسلیم کیا ہے اگرچہ وہ اس نشان کو موسیٰ ؑ کی طرف نہیں بلکہ ہارونؑ کی طرف منسوب کرتی ہے مگر موسیٰ ؑ کے دربار میں ید بیضاء والے معجزہ کے دکھائے جانے کا اس نے ذکر تک نہیں کیا اور یہ اس کی ایک بہت بڑی فروگذاشت تھی جس کا قرآن کریم نے ازالہ کیا۔ بلکہ خود بائیبل کی ایک اندرونی شہادت سے بھی ثابت ہے کہ فرعون کے دربار میں ید بیضاء والا نشان بھی ضرور دکھایا گیا تھا۔اور وہ شہادت یہ ہے کہ جب موسیٰ ؑ کو خدا تعالیٰ نے فرعون کی طرف جانے کا حکم دیا تو اس وقت بائیبل بھی تسلیم کرتی ہے کہ

’’خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے۔اُس نے کہا۔لاٹھی! پھر اُس نے کہا کہ اِسے زمین پر ڈال دے اُس نے اسے زمین پر ڈالا تو وہ سانپ بن گئی اور موسیٰ اُس کے سامنے سے بھاگا۔‘‘ (خروج باب ۴ آیت ۲,۳)

اِسی طرح لکھا کہ

’’پھر خداوند نے اُسے یہ بھی کہا کہ تو اپنا ہاتھ اپنے سینہ پر رکھ کر ڈھانک لے۔اُس نے اپنا ہاتھ اپنے سینہ پر رکھ کر اُسے ڈھانک لیا اور جب اُس نے اسے نکال کر دیکھا۔تو اُس کا ہاتھ کوڑھ سے برف کی مانند سفید تھا۔ (خروج باب ۴ آیت ۶)

اس حوالہ میں اوّل تو حضرت موسیٰ ؑ کے ہاتھ کی سفیدی کوڑھ کی طرف منسوب کی گئی ہے جو ایک نہایت ہی شرمناک بات ہے موسیٰؑ خدا تعالیٰ کا ایک مقدس نبی تھا۔اور وہ مقام جہاں اس وقت موسیٰ ؑ خدا تعالیٰ سے ہمکلام ہوا تجلیاتِ الٰہیہ کا مرکز تھا۔ایسے مقدس مقام پر موسیٰ ؑ جیسے مقدس نبی سے خدا تعالیٰ کا ہمکلام ہونا تو ایک بہت بڑا انعام تھا اور وہ الٰہی برکات اور اس کے فیوض کا وقت تھا۔ایسے بابرکت وقت میں خدا تعالیٰ کا یہ عذاب کیسے نازل ہوسکتا تھا کہ موسیٰ ؑ کے ہاتھ کو کوڑھ ہو جاتا۔یقیناً موسیٰ ؑ کے ہاتھ کو کوڑھ نہیں ہوا۔ بلکہ کسی بدبخت یہودی کا دل روحانی کوڑھ کے مرض میں مبتلا ہوا اور اس نے یہ عیب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کر دیا۔یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اس کا ذکر کرتے ہوئے مِنۡ غَیۡرِ سُوۡٓءٍ (طٰہٰ:۲۳) کے الفاظ بیان فرمائے ہیں کہ ہاتھ کی سفیدی کسی بیماری کا

نتیجہ نہیں تھی بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نشان کے طور پر عطا کی گئی تھی۔

بہر حال ان دونوں معجزات کا ذکر کرنے کے بعد بائیبل میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

’’اور یوں ہوگا کہ اگر وہ تیرا یقین نہ کریں اور پہلے معجزہ (یعنی لاٹھی کے سانپ بن جانے) کے معجزہ کو بھی نہ مانے تو وہ دوسرے معجزہ (یعنی ہاتھ کی سفیدی اور چمک) کے سبب سے یقین کریں گے۔‘‘

(خروج باب ۴ آیت ۸)

اب اگر لاٹھی کو سانپ کی شکل میں دیکھ کر فرعون ایمان لے آتا تو ہم تسلیم کر سکتے تھے کہ اسے دوسرا معجزہ دکھانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن جب وہ ایمان ہی نہ لایا تو بائیبل کے خود اپنے بیان کے مطابق ضروری تھا کہ موسیٰ ؑ اُسے یدِ بیضاء والا معجزہ بھی دکھاتے۔ اور اگر وہ پھر بھی ایمان نہ لاتا تو اور معجزات دکھاتے جن کا بائیبل میں بھی ذکر آتا ہے اور قرآن کریم نے بھی ان کو بیان کیا ہے۔ پس بائیبل کا ایک طرف یہ کہنا کہ اگر فرعون پہلے معجزہ کو دیکھ کر ایمان نہ لایا تو پھر دوسرا معجزہ اُسے دکھایا جائے بتاتا ہے کہ فرعون کے سامنے یہ دونوں معجزے دکھائے گئے تھے۔ مگر بائیبل چونکہ انسانی دست بُرد کا شکار رہی ہے اس لئے اس نے اس معجزہ کا ذکر تو کر دیا اور دوسرے معجزہ کے دکھائے جانے کا کوئی ذکر نہ کیا۔ لیکن خود اس کی اندرونی شہادت بتا رہی ہے کہ فرعون کے دربار میں یہ دونوں معجزات دکھانے کا اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرمایا تھا۔ پس صحیح بات وہی ہے جو قرآن کریم نے کہی ہے اور بائیبل نے جو کچھ کہا ہے وہ خود بائیبل کی اپنی شہادت سے ہی غلط ثابت ہوتا ہے۔ باقی رہا بائیبل کا یہ کہنا کہ فرعون کے دربار میں موسیٰ ؑ نے نہیں بلکہ ہارونؑ نے عصا پھینکا تھا۔ (خروج باب ۷ آیت ۱۰)

یہ بھی بائیبل کی غلط بیانی ہے کیونکہ خود بائیبل خروج باب ۴ میں تسلیم کرتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے ہارونؑ سے نہیں بلکہ موسیٰ ؑ نے کہا تھا کہ

’’یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے۔ اُس نے کہا لاٹھی! پھر اُس نے کہا کہ اِسے زمین پر ڈال دے۔ اُس نے اُسے زمین پر ڈالا اور وہ سانپ بن گئی۔ اور موسیٰ اس کے سامنے سے بھاگا۔ تب خداوند نے موسیٰ سے کہا ہاتھ بڑھا کر اس کی دم پکڑ لے۔ اُس نے ہاتھ بڑھایا اور اُسے پکڑ لیا۔ وہ اس کے ہاتھ میں لاٹھی بن گیا۔‘‘ (خروج باب ۴ آیت ۲، ۴)

پھر یہ بات بھی خدا تعالیٰ نے موسیٰ سے ہی کہی تھی کہ اگر وہ پہلے معجزہ کو نہ مانیں تو ’’وہ دوسرے معجزہ کے سبب سے یقین کریں گے۔‘‘ (خروج باب ۴ آیت ۸)

پس جب کہ تمام گفتگو موسیٰؑ سے ہی ہوتی رہی اور موسیٰؑ کی لاٹھی ہی سانپ بنی اور موسیٰؑ کو ہی یہ کہا گیا کہ اگر فرعون اور اس کے درباری پہلے معجزہ کو دیکھ کر ایمان نہ لائے تو دوسرے معجزہ کو دیکھ کر ایمان لے آئیں گے تو یہ کس طرح ہوسکتا تھا کہ فرعون کے دربار میں موسیٰؑ کی بجائے ہارون اپنا عصا پھینک دیتے۔ پس یہ بات بھی بائیبل کی اندرونی شہادت سے باطل قرار پاتی ہے اور صحیح بات وہی ثابت ہوتی ہے جو قرآن کریم نے کہی۔

بہرحال یہ دو بڑے بھاری نشانات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ کے ہاتھ پر ظاہر کئے۔ مگر اس امر کو تسلیم کرنے کے باوجود کہ حقیقتاً یہ ایک بہت بڑا نشان تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سونٹا پھینکا اور وہ سانپ بن گیا یا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سونٹا مارا اور دریا پھٹ گیا یا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سونٹا مارا اور چٹان سے پانی بہہ نکلا پھر بھی اس صداقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ موسیٰؑ کے عصا کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو عصا عطا فرمایا وہ اتنا عظیم الشان ہے کہ موسیٰ کے عصا سے بحیرہ قلزم کا پھٹنا یا اُن کے عصا سے پتھر کی چٹانوں سے پانی بہہ نکلنا یا خود اُن کے عصا کا سانپ بن کر لوگوں کو دکھائی دینا اس کے مقابلہ میں کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتا۔ موسیٰؑ کا عصا بیشک بڑے بھاری نشانات کا حامل تھا مگر آج دنیا میں کہیں موسوی عصا کا نشان نہیں۔ وہ عصا موسیٰؑ کے ہاتھ میں رہا اور موسیٰؑ کی وفات کے ساتھ ہی اس کی نشان نمائی کا معجزہ ختم ہوگیا مگر محمد رسول اللہ صلی علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے وہ عصا عطا فرمایا جس پر انسانوں کی موت اور زمانہ کی گردشیں کوئی اثر نہیں کرسکتیں۔ جسے دنیا کی بڑی سے بڑی حکومتیں بھی توڑنے کی طاقت نہیں رکھتیں۔ اس عصا کو نہ کوئی زمینی کیڑا کھانے کی طاقت رکھتا ہے اور نہ کوئی آسمانی صاعقہ اسے صفحہ ہستی سے معدوم کرسکتا ہے۔ وہ عصا جو آج بھی کفر کے سر کو پاش پاش کررہا ہے اور قیامت تک شیطان کے پھیلائے ہوئے جالوں اور اس کی رسیوں کو نگلتا چلا جائے گا۔ قرآن کریم ہے جو محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا گیا۔ اور مسلمانوں سے کہا گیا کہ جَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا (الفرقان: ۵۳) اے مسلمانو تم قرآن کریم کو اپنے ہاتھ میں لو اور اس کے ذریعہ کفّار سے جہاد کبیر کرو۔ گویا قرآن کریم ایک کتاب ہی نہیں بلکہ وہ ایک کامیاب ہتھیار بھی ہے جس سے کفر وشیطنت کی پھیلائی ہوئی ظلمتوں کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے اور یہ کہہ کر بتایا کہ یہ قرآن بنی نوع انسان کا مقصد بھی ہے اور ایصال مقصد کا ذریعہ بھی ہے۔ یعنی روحانی دلائل و براہین کے لئے یہ کسی دوسرے کی وکالت کا محتاج نہیں بلکہ خود ہی اپنے دعاوی کے دلائل بھی دیتا ہے اور اس طرح بنی نوع انسان کے عقلی اور فکری معیار کو بھی بلند کرتا چلا جاتا ہے۔ غرض قرآن وہ عظمت وشوکت اپنے اندر رکھتا ہے کہ اس کے ذریعہ توپ وتفنگ کے بغیر بھی دنیا کو فتح کیا جاسکتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اب دوسرے مسلمانوں میں بھی بیداری اور قربانی کی روح

پیدا ہو رہی ہے لیکن قربانی کی وہ روح انہیں توپ وتفنگ کی طرف لے جاتی ہے۔ بے شک موجودہ دور کا مسلمان آج سے سو یا پچاس سال قبل کے مسلمانوں کی نسبت زیادہ بیدار ہے لیکن وہ توپوں اور تلواروں کی طرف بھاگ رہا ہے۔ وہ حسرت سے ایٹم بم بنانے والوں کی طرف دیکھ رہا ہے اور اس امید میں ہے کہ وہ اسے بھی صدقہ کے طور پر کچھ ہتھیار دے دیں لیکن حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ خدا تعالیٰ نے ہمیں بتایا کہ تمہاری توپ قرآن ہے۔ تمہاری رائفل قرآن ہے۔ تمہاری بندوق قرآن ہے تمہارا پستول قرآن ہے قرآن وہ ہتھیار ہے جس سے تم نے دنیا کا سر کچلنا ہے پس تم فتح کے لئے اس امر کے محتاج نہیں ہو کہ انگلستان تمہیں توپیں دے۔ تم فتح کے لئے اس امر کے محتاج نہیں ہو کہ امریکہ تم پر مہربان ہو اور ایک دو ایٹم بم دے دے۔ یا فرانس اور جرمن تمہیں کیمیاوی چیزیں پیدا کر کے دے بلکہ تمہارا کام یہ ہے کہ تم قرآن کریم لو اور دنیا کو فتح کر لو۔

قرآن وہ کتاب ہے جو انسان کے دل میں خدا تعالیٰ کی خشیت پیدا کر کے اس کو خدا کی طرف لے جاتی ہے اور انسان کی جتنی طبعی اور روحانی ضرورتیں ہیں ان سب کو پورا کرتی ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ (بنی اسرائیل: ۹۰) ہم نے اس قرآن میں پھیر پھیر کر اور چکر دے دے کر اور نئے نئے اسلوب سے اور نئی نئی طرز سے تمام قسم کی فطرتوں کے لئے مضامین بیان کر دیئے ہیں۔

دنیا میں دو ہی چیزیں ہوتی ہیں جو کسی تعلیم کی برتری کو ثابت کرتی ہیں۔ ایک یہ کہ ہر قسم کے مضامین اس میں بیان ہوں۔ اور دوسرے یہ کہ مختلف طبقات میں سے ہر طبقہ کے لئے اس میں مضامین بیان ہوں اور یہ دونوں خصوصیتیں قرآن کریم میں پائی جاتی ہیں گویا کوئی انسان نہیں رہا جو قرآن کریم کا مخاطب نہ ہو اور کوئی بات نہیں رہی جو قرآن نے بیان نہ کی ہو۔ جب ہر بات اس میں بیان کر دی گئی ہے اور ہر قسم کے لوگوں کی فطرت کو ملحوظ رکھ کر اس میں تعلیم نازل کر دی گئی ہے۔ تو پھر بنی نوع انسان کو اپنے خدا کی محبت اور اس کا پیار کیوں حاصل نہ ہو۔ بیشک پرانے زمانہ میں موسیٰ ؑ اور عیسیٰ ؑ اور دوسرے نبیوں کو خدا ملا اور ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن ہمارا دل اس سے تسلی نہیں پاتا۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں بھی خدا تعالیٰ کی محبت حاصل ہو۔ اور زندہ کتاب وہی کہلا سکتی ہے جو زندہ خدا سے ہمارا تعلق پیدا کر دے۔ اگر وہ ہمیں خدا سے نہیں ملاتی تو اس کتاب کا وجود اور عدم ہمارے لئے برابر ہو جاتا ہے اور قرآن کہتا ہے کہ ہم نے ہر انسان کی روحانی ضرورتوں کے پورا کرنے کے سامان اس کتاب میں رکھ دیئے ہیں پس جو بھی سچے دل سے اس پر عمل کرے گا وہ اپنے خدا کو پالے گا۔ اسی طرح فرماتا ہے وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ (الانعام: ۲۰) اے محمد رسول اللہ تو لوگوں سے کہہ دے کہ یہ قرآن میری طرف اس لئے وحی کیا گیا ہے

کہ میں اس کے ذریعہ سے تمہیں بھی فائدہ پہنچاؤں اور وہ تمام لوگ جن کے کانوں تک اس کی آواز پہنچے ان کو بھی فائدہ پہنچاؤں۔ایک طرف قرآن کریم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس میں ہر قسم کے مضامین بیان کئے گئے ہیں اور ہر قسم کے لوگوں کو مخاطب کیا گیا ہے اور دوسری طرف اس نے یہ کہا ہے کہ جس کے ہاتھ میں بھی یہ قرآن ہے اس کو فائدہ پہنچے گا کیونکہ یہ اسی لئے نازل کیا گیا ہے کہ وہ سب لوگ جن کے کانوں تک اس کی آواز پہنچے اُن کو فائدہ پہنچائے۔

پس قرآن کریم ایک بہت بڑا ہتھیار ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا گیا۔موسیٰؑ کا عصا تو صرف تھوڑی دیر کے لئے فرعونیوں کو سانپ کی شکل میں نظر آیا تھا جس سے کچھ دیر کے لئے ان کے جسموں پر لرزہ بھی طاری ہوا مگر قرآن وہ کتاب ہے جو آج تک انذار کا کام کر رہی ہے اور پھر اس کا انذار کسی ایک قوم یا ایک ملک سے مخصوص نہیں بلکہ دنیا کی تمام اقوام اور دنیا کے تمام ممالک اس کے دائرہ انذار میں شامل ہیں اور پھر اس کے انذار کی وسعت زمانوں کی قیود سے بھی بالا ہے۔قیامت تک کوئی زمانہ ایسا نہیں آسکتا جس میں قرآن دشمنانِ اسلام کے لئے ایک نذیر مبین کا کام نہ کر رہا ہو یا اس کے انذاری نشانات ان کی شان وشوکت کو مٹا کر اسلام کو غلبہ دینے کی طاقت نہ رکھتے ہوں۔پھر موسیٰؑ کا عصا صرف موسیٰؑ کے ہاتھ میں ہی نشان دکھا سکتا تھا مگر قرآن جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک زندہ کتاب تھی اسی طرح آج سچے اور مخلص مومن کے لئے بھی وہ ایک زندہ کتاب ہے۔اور جس طرح وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے حقائق ومعارف کی کان میں سے لاتعداد ہیرے اور جواہر پیش کرتی تھی اسی طرح وہ امت محمدیہ کے ہر مخلص فرد کو اس کے ایمان اور اخلاص کے مطابق اپنے معارف سے حصہ دیتی اور اپنے علوم سے بہرہ ور کرتی ہے۔کیونکہ اس کا نزول اس ہستی کی طرف سے ہے جسے غیب کا علم ہے اور جو انسان کے خیالات اور جذبات اور افکار کو جانتی ہے۔دنیا میں کوئی انسان خواہ اس کا تجربہ کتنا ہی وسیع کیوں نہ ہو تمام افراد کے تمام افکار تمام جذبات اور تمام خیالات کا واقف نہیں ہوسکتا تمام انسانوں کے جذبات افکار اور ان کے خیالات کو وہی ذات سمجھ سکتی ہے جس نے انہیں پیدا کیا ہے اور وہ قرآن کریم میں بولتی ہے اور ہر شخص اپنی ضرورت کی چیز اس میں سے لے جاتا ہے۔دنیا میں کسی کو کھدر کی ضرورت ہوتی ہے کسی کو لٹھے کی ضرورت ہوتی ہے۔کسی کو زربفت وکمخواب کی ضرورت ہوتی ہے۔کسی کو سرد یا گرم سوٹ یا ریشمی کپڑوں کی مختلف اقسام کی ضرورت ہوتی ہے۔جب کوئی شخص اپنی اپنی ضرورت کے مطابق کپڑے خرید کر دکان سے باہر نکلتا ہے تو اس کی گٹھڑی میں سے ہر قسم کے کپڑے نہیں مل سکتے ہر قسم کے کپڑے صرف دکان سے ہی مل سکتے ہیں جو شہر یا گاؤں کے لوگوں کی ضروریات کے لئے قائم ہوتی ہے۔ایک عالم کی مثال ایسی ہی ہوتی ہے جیسے ایک کپڑا خریدنے والا۔اور ایک بہت بڑے عالم کی مثال ایسی ہوتی ہے

جیسے ایک بہت بڑا امیر جو اپنے خاندان کی ضرورت کے مطابق دکان سے مختلف قسم کے کپڑے ایک بڑی مقدار میں خریدتا ہے۔ تم اس امیر شخص کی گٹھڑی میں کپڑے کی بہت سی اقسام دیکھو گے تم اس میں لٹھّے کے تھان دیکھو گے۔ تم زربفت و کمخواب دیکھو گے۔ تم کوٹوں کے کپڑے دیکھو گے۔ لیکن پھر بھی کپڑے کی بیسیوں اقسام ایسی رہ جائیں گی جو تمہیں اس گٹھڑی میں نظر نہیں آئیں گی حالانکہ وہ ہزاروں روپے کا کپڑا خرید کر لایا ہوگا۔ اسی طرح جو شخص قرآن کریم کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس کا علم خواہ کتنا تھوڑا ہو وہ اگر قرآن کریم کے ساتھ موانست رکھتا ہے تو اس کا دماغ اپنی ضرورت کے مطابق قرآن کریم سے چیزیں لے لیتا ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کی مثال دنیا کی سی ہے جس کے جنگلوں میں تم جاتے ہو اور اپنی ضرورت کے مطابق کوئی نہ کوئی درخت کاٹ لاتے ہو۔ لیکن اس کے اندر پائی جانے والی دھاتوں کی اصلیت تمہیں معلوم نہیں ہوتی۔ اسی طرح قرآنی علوم کو سمجھنے والے افراد قرآن کے سمجھنے میں دوسروں کے ممد تو ہو سکتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم کے قائم مقام نہیں ہو سکتے۔ قرآن کریم کا قائم مقام قرآن کریم ہی ہے۔ بڑے سے بڑا مفسر بلکہ ایک نبی بھی اس کا مؤید، معین اور ناصر تو ہے اس کا قائم مقام نہیں۔ حتیٰ کہ وہ وجود جو خود قرآن تھا یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ بھی اس کا قائم مقام نہیں ہو سکتا۔ وہ زمین جس میں یورینیم پائی جاتی ہے جس سے ایٹم بنتا ہے وہ ساری چیزوں کو نہیں جانتی۔ وہ ماں بھی بچے کو پوری طرح نہیں جانتی جس نے نو ماہ تک بچے کو پیٹ میں رکھا ہو۔ قرآن قرآن ہی ہے۔ اور انسان انسان ہی ہے۔ ہر موقعہ۔ ہر ضرورت، ہر جذبہ اور ہر فکر کی تبدیلی پر قرآن اپنے پڑھنے والے کے لئے ایک نیا روپ بدلتا ہے۔ وہ ہر متلاشی کے لئے نیا روپ بدلتا ہے۔ وہ ہر شخص کے لئے نیا دروازہ کھولتا ہے جو اسے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ پس قرآن کریم کے ساتھ محبت اور پیار کرو اور اس پر غور اور فکر کی عادت ڈالو۔ اس کے بغیر نہ خدا تعالیٰ کی محبت پیدا ہو سکتی ہے اور نہ صحیح اسلامی روح پیدا ہو سکتی ہے۔ بانی سلسلہ احمدیہؑ نے قرآن کریم کی اسی فضیلت کا اپنے ایک شعر میں اس طرح ذکر فرمایا ہے کہ ؎

پہلے سمجھے تھے کہ موسیٰؑ کا عصا ہے فرقاں
پھر جو سوچا تو ہر اک لفظ مسیحا نکلا

(براہین احمدیہ حصہ اول، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۳۰۵)

یعنی پہلے ہم نے یہ سمجھا کہ جس طرح موسیٰؑ کا عصا ساحروں کے سانپ نگل گیا تھا۔ اسی طرح قرآن کریم بھی اپنے دلائل و براہین اور معجزات و نشانات کے ذریعہ سے دشمنانِ اسلام کے پھیلائے ہوئے جالوں کو تار تار کر دیتا ہے اور اس لحاظ سے اسے موسیٰؑ کے عصا کے ساتھ مشابہت ہے لیکن جب ہم نے زیادہ غور کیا اور قرآن کریم کے

مطالب پر گہری نگاہ ڈالی تو ہمیں نظر آیا کہ قرآن کریم موسیٰ ؑ کے عصا سے لاکھوں گُنا بڑھ کر ہے کیونکہ موسیٰ ؑ کے عصا سے تو صرف ساحروں کا بھانڈا پھوٹا اور اُن کے سانپ فنا ہوئے مگر قرآن کریم نہ صرف دشمنانِ اسلام کی سرکوبی کے لئے ہر وقت ایک چوکس اور ہوشیار جرنیل کی طرح اپنے فرائض سرانجام دیتا ہے بلکہ اُس کا ایک ایک لفظ مُردوں کو زندہ کرنے والا اور اُن کے اندر زندگی کی تازہ روح پھونکنے والا ہے گویا موسوی عصا نے صرف اتنا کام کیا کہ دشمن کا سر پاش پاش کر دیا۔ اور اُسے روحانی لحاظ سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا قرآن صرف دشمنوں کو ہلاک ہی نہیں کرتا بلکہ اُن کو از سرِ نو زندہ کر کے خدا تعالیٰ کا مقرب بھی بنا دیتا ہے۔ اور وہ صرف دفع شر کی ہی خاصیت اپنے اندر نہیں رکھتا بلکہ ایصالِ خیر کا پہلو بھی اس میں بدرجہ کمال پایا جاتا ہے اور وہ مُردوں کو زندہ کرنے کی اپنے اندر طاقت رکھتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ اسی خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (الانفال:۲۵) یعنی اے مومنو! جب خدا اور اس کا رسول تمہیں زندہ کرنے کے لئے آواز دے تو تم اُس کی آواز پر فوراً لبیک کہا کرو۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ قرآن کریم مُردوں کو زندہ کرنے کے لئے آیا ہے بے شک اُس کی تعلیم پر عمل کر کے اندھے آنکھیں پا سکتے ہیں۔ بہرے شنوا ہو سکتے ہیں۔ لنگڑے لولے چل پھر سکتے ہیں۔ مگر اس سے بھی بڑھ کر قرآن کریم میں یہ خوبی ہے کہ اس کی تعلیم پر عمل کر کے مُردے بھی زندہ ہو سکتے ہیں اور اُن میں بھی ایک نئی روحانی حیات پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی روح تھی جس نے عرب کی سرزمین میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ اور وہ لوگ جو اصنام و اجماد کے آگے سربسجود رہا کرتے تھے اور ہر قسم کے فواحش کے ارتکاب میں ایک لذت اور سرور محسوس کیا کرتے تھے خدائے واحد کے ایسے پرستار ہوئے کہ انہوں نے بھیڑ بکریوں کی طرح اُس کی راہ میں اپنے سر کٹوا دیئے اور خدا تعالیٰ کے قرب میں بڑھتے چلے گئے۔ پس موسیٰ ؑ کا عصا اس عظیم الشان انعام کے مقابلہ میں کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتا۔ جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا گیا۔ اور جو آج بھی دشمنانِ دین کے لئے ایک برہانِ قاطع کی حیثیت رکھتا ہے۔

دوسرا نشان جو فرعون کے دربار میں دکھایا گیا وہ یہ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہاتھ انہیں بالکل نورانی اور سفید دکھائی دیا یہ نشان بھی بے شک بہت بڑا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تقدس اور ان کی اعلیٰ شان کو ظاہر کرتا ہے۔ اور ان برکات پر روشنی ڈالتا ہے جن کا ان کے ہاتھ پر ظہور مقدر تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پہلو میں بھی ایک نمایاں فضیلت عطا فرمائی۔ چنانچہ موسیٰ ؑ کا تو صرف ہاتھ سفید دکھائی دیا مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے سرتاپا ایک نورِ مجسم قرار دیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو خوشخبری دیتے

ہوئے فرمایا کہ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا (النساء:۱۷۵) یعنی اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک کھلی دلیل آ چکی ہے اور ہم نے تمہاری طرف ایک نہایت روشن نور نازل کیا ہے۔ اسی طرح فرمایا کہ قَدْ جَآءَ كُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتَابٌ مُّبِيْنٌ۔ (المائدة:۱۶) تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نور اور روشن کتاب آ چکی ہے۔ پس موسیٰ کے تو صرف ایک ہاتھ سے نورانی شعاعیں نکلتی دکھائی دی تھیں مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے سرتاپا نور کا ایک پیکر بنایا۔ اور یہ فرق اس لئے تھا کہ موسیٰ ؑ نے صرف بنی اسرائیل کی اصلاح کا کام سرانجام دینا تھا مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے تمام دنیا کی اصلاح کے لئے بھیجا تھا۔ اس لئے موسیٰ ؑ کا تو صرف ایک ہاتھ نور کی شکل میں دکھائی دیا۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ نے سر سے پیر تک نور ہی نور قرار دے دیا۔

پھر موسیٰ ؑ کا ہاتھ بیشک نورانی دکھائی دیا مگر بہرحال وہ موسیٰ ؑ کا ہی ہاتھ تھا مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ کو خدا تعالیٰ نے اپنا ہاتھ قرار دیا اور فرمایا کہ اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ (الفتح:۱۱) یعنی وہ لوگ جو تیری بیعت کرتے ہیں وہ تیری بیعت نہیں کرتے بلکہ اللہ تعالیٰ کی بیعت کرتے ہیں اور ان کے ہاتھ پر تیرا ہاتھ نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بظاہر انہیں وہ ہاتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دکھائی دیتا ہے مگر حقیقتاً وہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہوتا ہے اسی طرح غزوہ بدر میں جب آپؐ نے کفار کی طرف کنکروں کی مُٹھی پھینکی اور اس کے ساتھ ایک طوفانِ باد اٹھا جس نے کفار کی آنکھوں کو اندھا کر دیا۔ تو اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (الانفال:۱۸) اے محمد رسول اللہ! جب تو نے کفار کی طرف کنکر پھینکے تھے تو تو نے نہیں بلکہ خود اللہ تعالیٰ نے پھینکے تھے۔ پس موسیٰ ؑ کا ہاتھ خواہ کس قدر نورانی نظر آیا۔ بہرحال وہ موسیٰ ؑ کا ہی ہاتھ تھا مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ کو خدا تعالیٰ نے اپنا ہاتھ قرار دے دیا۔

پھر اگر ہاتھ کی سفیدی سے یہ اشارہ سمجھا جائے کہ اللہ تعالیٰ ان کی قوم کو روحانی لحاظ سے بڑی پاکیزگی عطا فرمائے گا۔ اور وہ دین کے لئے بڑی قربانیاں کرنے والے ہوں گے تو اس پہلو کے لحاظ سے بھی اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نمایاں فضیلت عطا فرمائی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ کیا تھا کہ اُسے کنعان کا ملک بنا دیا جائے گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو ساتھ لے کر مصر سے چل پڑے اور جب وہ ملک سامنے آ گیا تو آپ نے اپنی قوم سے کہا کہ جاؤ اور لڑائی کر کے اس ملک پر قبضہ کر لو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے غلطی سے یہ خیال کر لیا کہ خدا تعالیٰ نے یہ ملک ہمیں دینے کا وعدہ

کیا ہوا ہے۔اس لئے وہ خود ہی اس وعدہ کو پورا کرے گا اور یہ ملک ہمارے قبضہ میں دے دے گا۔ اگر ہم نے ہی اس ملک کو فتح کرنا تھا تو پھر وعدے کا کیا فائدہ۔ چنانچہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہہ دیا کہ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (المائدۃ:۲۵) کہ اے موسیٰ! تو اور تیرا رب دونوں جاؤ اور دشمنوں سے لڑو۔ ہم تو یہیں بیٹھیں گے جب تم ملک فتح کر کے ہمیں دے دو گے تو ہم اس میں داخل ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کو اس قوم کی یہ بات سخت ناگوار گذری اور اس نے کہا کہ اب چالیس سال تک تم اس ملک میں داخل نہیں ہو سکتے چالیس سال تک تم جنگلوں میں بھٹکتے پھرو۔ پھر اللہ تعالیٰ تمہاری نئی نسل کو اس امر کی توفیق دے گا کہ وہ اپنی جانیں قربان کر کے اس ملک میں داخل ہوں۔ اور خدا تعالیٰ کے انعامات کے مورد ہوں۔ غرض موسیٰؑ کو وہ قوم ملی جس نے خدا تعالیٰ کا اتنا بڑا نشان دیکھنے کے باوجود کہ اسے فرعون کی غلامی سے آزادی ملی اسے اور اس کی آئندہ نسلوں کو فرعونیوں کے لئے اینٹیں بنانے اور لکڑیاں کاٹنے اور ہر ذلیل سے ذلیل کام کرنے سے نجات ملی پھر بھی موسیٰؑ کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ اور جب انہیں کہا گیا کہ اٹھو اور اس عظیم الشان ملک پر قبضہ کر لو جس پر عاد قوم حکمران ہے تو انہوں نے کہہ دیا کہ ہم سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔ تو اور تیرا رب دونوں جاؤ اور دشمنوں سے لڑتے پھرو۔ جب دشمن مر گیا اور ہمیں اطمینان ہو گیا کہ اب ہماری جانوں کو کوئی خطرہ پیش نہیں آئے گا تو ہم اس ملک کی حکومت سنبھال لیں گے لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے وہ صحابہؓ عطا فرمائے جنہوں نے موسیٰ کے ساتھیوں کی طرح کسی ایک مقام پر بھی یہ نہیں کہا کہ ہم اپنی جانیں قربان کرنے کے لئے تیار نہیں بلکہ وہ آپؐ کے دائیں بھی لڑے اور بائیں بھی لڑے۔ اور آگے بھی لڑے اور پیچھے بھی لڑے۔ اور انہوں نے ہر نازک سے نازک مقام پر اپنی فدائیت اور جاں نثاری کو ثابت کر دیا۔ تاریخوں میں لکھا ہے کہ ہجرت مدینہ کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی کہ ابو سفیان ایک تجارتی قافلہ کے ساتھ شام کی طرف سے آرہا ہے اور راستہ میں تمام قبائل کو مسلمانوں کے خلاف اکساتا چلا آتا ہے۔ قافلہ کا راستہ بھی مدینہ کے پاس سے گذرتا تھا اور گو ایسا قریب تو نہیں تھا مگر مکہ کی نسبت مدینہ سے زیادہ قریب تھا۔ تمام قبائل جو مدینہ کے گرد رہتے تھے وہ شام سے آنے والے قافلہ سے ملتے اور تجارتی چیزوں کا آپس میں تبادلہ کرتے تھے۔ اس لئے شام سے جو قافلہ آتا اس کے تعلقات مدینہ کے تمام قبائل سے ہو جاتے تھے اور چونکہ اس قافلہ میں ایسے لوگ موجود تھے جو مسلمانوں کے خلاف لوگوں کو اکساتے اور اشتعال دلاتے تھے اس لئے جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو یہ علم ہوا کہ ابو سفیان قافلہ کو لے کر مدینہ کے پاس سے گذر رہا ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مکہ والے بھی اس خیال سے کہ قافلہ پر مدینہ والے حملہ نہ کریں کچھ لشکر لے کر نکلے ہیں تو آپؐ نے اپنے دوستوں سے

مشورہ لیا کہ اگر ہم مدینہ میں بیٹھے رہے تو دشمن دلیر ہو جائے گا۔ ہمیں آگے چلنا چاہیے تا کہ دشمن یہ نہ سمجھے کہ ہم اس سے ڈرتے ہیں۔ چنانچہ آپ صحابہؓ کی ایک جماعت کو لے کر مدینہ سے باہر تشریف لے گئے اور بدر کے مقام پر پہنچے۔ الٰہی اشارات سے آپ کو معلوم ہو چکا تھا کہ مکہ سے ایک لشکر آ رہا ہے جس کے ساتھ مسلمانوں کا مقابلہ ہوگا۔ لیکن آپ کو یہ اجازت نہیں تھی کہ آپ اس خبر کو ظاہر کریں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مدینہ سے بہت کم لوگ آپ کے ساتھ گئے۔ کیونکہ وہ اسے لڑائی نہیں سمجھتے تھے بلکہ صرف جرأت کے اظہار کا ایک موقعہ سمجھتے تھے۔ بدر کے مقام کے قریب جا کر آپؐ نے مناسب سمجھا کہ اب یہ بات ظاہر کر دی جائے چنانچہ آپؐ نے لوگوں کو جمع کیا۔ اور فرمایا۔ اے لوگو! مجھے خدا نے کہا ہے کہ دشمن کا لشکر قریب آ گیا ہے اور بجائے اس کے کہ قافلہ سے لڑائی ہو شاید اسی سے لڑائی ہو جائے۔ تمہاری اس بارہ میں کیا رائے ہے؟ مہاجرین یکے بعد دیگرے کھڑے ہونے شروع ہوئے اور انہوں نے کہا۔ یا رسول اللہ! ہم لڑنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن انصار خاموش رہے۔ وہ اس لئے خاموش رہے کہ جو فوج آ رہی تھی اس میں مہاجرین کے بھائی بہنوئی۔ سالے۔ چچے اور تائے وغیرہ اور اسی طرح اور قریبی رشتہ دار تھے۔ انہوں نے خیال کیا کہ اگر ہم نے کہا۔ ہم لڑنے کے لئے تیار ہیں تو مہاجرین سمجھیں گے کہ ہمیں ان کے رشتہ داروں سے لڑنے کا شوق ہے پس ان کی دلجوئی اور مہمانوں کی عزت کی وجہ سے سب انصار خاموش رہے۔ مہاجرین یکے بعد دیگرے اٹھتے اور اٹھ اٹھ کر قربانی کی رغبت ایثار اور فدائیت کے جوش کا اظہار کرتے لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر صحابیؓ کی تقریر کے بعد فرماتے۔ کہ اے لوگو! مجھے مشورہ دو۔ جب متواتر آپؐ نے یہ بات دہرائی تو ایک انصاری اٹھے اور انہوں نے کہا۔ یا رسول اللہ! آپ کو مشورہ تو دیا جا رہا ہے۔ لیکن باوجود مشورہ پیش کئے جانے کے آپؐ یہی فرماتے ہیں کہ اے لوگو مشورہ دو۔ شاید آپؐ کی مراد لوگوں سے ہم انصار ہیں کہ ہم بھی مشورہ دیں۔ ورنہ مشورہ تو آپؐ کو مل ہی رہا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا۔ ٹھیک ہے۔ میری یہی مراد تھی اس صحابی نے کہا۔ یا رسول اللہ! ہم نے آپؐ سے مکہ میں ایک معاہدہ کیا تھا اور اقرار کیا تھا کہ اگر دشمن مدینہ پر حملہ آور ہوا تو ہم ہر طرح اس کا مقابلہ کریں گے لیکن مدینہ سے باہر اگر لڑائی ہوئی تو ہم اس معاہدہ کے پابند نہیں ہوں گے۔ کیونکہ ہمارے اندر اتنی طاقت نہیں کہ سارے عرب سے لڑ سکیں۔ شاید آپؐ جو بار بار ہم سے مشورہ چاہتے ہیں تو آپؐ کا اشارہ اس معاہدہ کی طرف ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ ٹھیک ہے اس انصاری نے یہ بات سن کر بڑے جوش سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ! جب آپؐ سے ہم نے مکہ میں وہ معاہدہ کیا تھا اس وقت تک آپؐ کا مقام ہم پر پوری طرح روشن نہیں ہوا تھا۔ صرف ایک محدود روشنی ہمیں ملی تھی اور ہم شرطیں باندھنے میں کوئی

حرج نہیں سمجھتے تھے لیکن یا رسول اللہ! اس کے بعد حقیقت اسلام ہم پر پوری طرح کھل چکی ہے اور آپ کی صداقت کو ہم نے پوری طرح پرکھ لیا ہے۔ اس صداقت کے روشن ہو جانے اور پرکھنے کے بعد کیا اب بھی کوئی شرط باقی رہ سکتی ہے۔ اب تو شرطوں کا سوال ہی نہیں یا رسول اللہ! اگر آپ ہمیں حکم دیں کہ تم اپنے گھوڑوں اور سواریوں کو سمندر میں ڈال دو تو ہم بغیر کسی ہچکچاہٹ کے سمندر میں اپنے گھوڑے ڈال دیں گے اور یا رسول اللہ! اگر یہاں جنگ ہوئی تو دشمن گو طاقت ور ہے اور تعداد میں بہت زیادہ ہے۔ مگر ہم آپؐ کے دائیں بھی لڑیں گے اور بائیں بھی لڑیں گے۔ آگے بھی لڑیں گے اور پیچھے بھی لڑیں گے۔ اور خدا کی قسم! دشمن آپؐ تک نہیں پہنچ سکتا جب تک وہ ہماری لاشوں کو روندتا ہوا نہ گزرے۔ (بخاری کتاب المغازی باب قول اللہ تعالیٰ اذ تستغیثون ربکم۔۔۔)

یہ وہ نمونہ ہے جو صحابہؓ نے دکھایا اور پھر منہ کی باتوں تک ہی انہوں نے اپنے جذبہ اخلاص کو محدود نہیں رکھا بلکہ عملی رنگ میں بھی وہ رات اور دن اسلام کے لئے قربانیاں کرتے رہے اور انہوں نے ایسی جاں نثاری کا نمونہ دکھایا کہ سر ولیم میور ''لائف آف محمد'' میں غزوۂ احزاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس جنگ میں کفار کا اتنا بڑا لشکر جمع ہوا تھا کہ اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کا شکست کھا جانا بالکل یقینی امر تھا۔ مگر اتنے بڑے لشکر کے باوجود کفار کو جو کامیابی حاصل نہ ہوئی تو اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ کفار سے ایک سیاسی غلطی ہوئی۔ اور وہ یہ کہ جب وہ خندق پار کر کے آگے آجاتے تو وہ اپنی بیوقوفی سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خیمہ کی طرف بڑھنا شروع کر دیتے تھے مگر محمد رسول اللہ کے صحابہؓ آپ پر اتنے فدا تھے کہ جب وہ دیکھتے کہ ان لوگوں کا منشاء یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کریں تو مرد عورتیں اور بچے پاگلوں کی طرح دشمن کے لشکر کے سامنے آجاتے تھے اور وہ شکست کھانے پر مجبور ہو جاتا تھا اگر وہ یہ بیوقوفی نہ کرتے کہ محمدؐ رسول اللہ کے خیمہ کی طرف رجوع کرتے تو ممکن ہے ان کو احزاب میں فتح ہو جاتی۔ غرض صحابہ نے اپنے عشق کا جو نمونہ دکھایا موسیٰؑ کی جماعت کا نمونہ اس کے مقابلہ میں کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتا۔ پس محمدؐ رسول اللہ کا ید بیضاء موسیٰؑ کے ید بیضاء سے افضل ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عصا قرآنی موسیٰؑ کے عصا پر ہر لحاظ سے فضیلت رکھتا ہے۔

قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗۤ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ۙ﴿۳۵﴾ يُّرِيْدُ اَنْ

اِس پر فرعون نے اپنے اردگرد کے سرداروں سے کہا یہ تو کوئی بڑا واقف کار جادوگر ہے یہ چاہتا ہے کہ

يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ ۖ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۳۶﴾ قَالُوْۤا

اپنے جادو کے ذریعہ سے تم کو تمہارے ملک سے نکال دے۔ پس بتاؤ تم کیا مشورہ دیتے ہو۔ انہوں نے کہا۔

اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَابْعَثْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ۙ﴿۳۷﴾ يَاْتُوْكَ

اس کو اور اس کے بھائی کو (کچھ دن) ڈھیل دے۔ اور مختلف شہروں کی طرف آدمی بھجوا جو (قابل آدمیوں کو)

بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيْمٍ ﴿۳۸﴾ فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ

جمع کر سکیں۔ (اور) ہر بڑے جادوگر اور بڑے جاننے والے کو تیرے پاس لے آئیں۔ اس پر سب جادوگر ایک

مَّعْلُوْمٍ ۙ﴿۳۹﴾ وَّقِيْلَ لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ ۙ﴿۴۰﴾

معلوم دن پر جمع کئے گئے۔ اور لوگوں سے کہا گیا۔ کیا تم سب (ایک مقصد پر) اکٹھے ہونے کے لئے تیار ہو

لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۱﴾

(کہ نہیں)۔ تا کہ اگر جادوگر غالب ہو جائیں تو ہم اُن کے کہنے پر چلیں۔

حلّ لُغات۔ اَرْجِهْ اَرْجَهَ الْاَمْرَ کے معنے ہیں اَخَّرَهٗ عَنْ وَقْتِهٖ کسی معاملہ کو اس کے وقت سے پیچھے ہٹا دیا۔ (اقرب) اَرْجِهْ امر کا صیغہ ہے اس لئے اس کے معنے ہوں گے۔ پیچھے ہٹا دے۔ یعنی ڈھیل دے دے۔

میقات میقات مطلق وقت کو بھی کہتے ہیں۔ اور اس وقت کو بھی کہتے ہیں جو کسی چیز کے لئے مقرر کیا جائے نیز اس کے معنے ہیں اَلْمَوْعِدُ الَّذِیْ جُعِلَ لَهٗ وَقْتٌ وہ وعدہ جس کے لئے کوئی وقت مقرر کیا جائے۔ وَقَدْ یُسْتَعَارُ لِلْمَوْضِعِ الَّذِیْ جُعِلَ وَقْتًا لِلشَّیْءِ اور کبھی اس جگہ کو بھی میقات کہہ دیتے ہیں جو کسی کام کے سرانجام دینے کے لئے مقرر کی جائے۔ (اقرب)

تفسیر۔ جب فرعون نے موسوی عصا اور ید بیضاء کا نشان دیکھا تو چونکہ وہ دینی علوم سے بے بہرہ تھا اُس

نے یہ نہ سمجھا کہ یہ ایک کشف ہے جس میں اردگرد کے لوگوں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے بلکہ سمجھا کہ شاید یہ کوئی جادوگر ہے جو اپنے فن میں بڑا مشّاق ہے اور چونکہ جادوگر روحانی آدمی نہیں ہوتا اس لئے خیال کر لیا کہ ضرور اس جادو کے پیچھے کوئی غرض ہو گی اور وہ غرض اُس نے یہ نکالی کہ یہ ہم کو اپنے ملک سے نکالنا چاہتا ہے اس بیوقوف نے یہ نہ سوچا کہ تھوڑی ہی دیر پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام اُس سے کہہ چکے تھے کہ میں تیرے پاس اس لئے آیا ہوں کہ تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے تو جو شخص بنی اسرائیل کو مصر سے نکالنے کی خواہش کرتا ہے وہ قبطیوں کو جو اس کی مخالف قوم تھے مصر سے نکالنے کا کس طرح ارادہ کر سکتا ہے؟ یہ دونوں باتیں تو متضاد ہیں۔ اگر بنی اسرائیل نکل جاتے تو قبطیوں کے پاؤں اور بھی مضبوط ہو جاتے۔ بنی اسرائیل کے نکالنے کی خواہش سے قبطیوں کے نکالنے کا ذکر کہاں سے نکلا؟ مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس کے درباریوں کے ہوش کچھ ٹھکانے تھے انہوں نے سمجھ لیا کہ بادشاہ بے تکی باتیں کر رہا ہے موسیٰ ؑ کی باتوں سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی قوم کو نکالنا چاہتا ہے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ قبطیوں یعنی قوم فرعون کو نکالنا چاہتا ہے اس لئے انہوں نے کہا اس کو اور اس کے بھائی کو ابھی ڈھیل دیجیئے۔ اور اردگرد آدمی بھیجئے کہ وہ تمام بڑے بڑے ساحروں کو جمع کر لیں۔ اگر یہ واقعہ میں ساحر ہے نبی نہیں تو یہ اُن سے ہار جائے گا۔ اور اس کا دعویٰ باطل ثابت ہو جائے گا چنانچہ لوگوں کو اعلان کر کے جمع کیا گیا اور انہیں کہہ دیا گیا کہ اگر ساحر غالب رہے تو ہم اُن کے پیچھے چل پڑیں گے۔ یہ فقرہ بتا رہا ہے کہ کفار کی ذہنیت کیسی پست ہوتی ہے۔ چونکہ ان کے دل خدا تعالیٰ کی خشیت سے بالکل خالی ہوتے ہیں اس لئے وہ نبی کو ماننے کے لئے تو کسی صورت میں بھی تیار نہیں ہوتے۔ لیکن ان کا مخالف تھوڑی سی بھی کامیابی حاصل کر لے تو اُس کے پیچھے چلنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں قومِ فرعون کی اسی افسوسناک ذہنیت کا قرآن کریم نے ایک اور مقام پر ان الفاظ میں ذکر فرمایا ہے کہ وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ۔ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَاۡئِهٖ فَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَ مَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ۔ (ھود: ۹۷، ۹۸) یعنی ہم نے موسیٰ ؑ کو ہر قسم کے نشانات اور روشن دلائل دے کر فرعون اور اس کی قوم کے بڑے بڑے عمائد کی طرف بھیجا لیکن بجائے اس کے کہ لوگ موسیٰ ؑ کی پیروی کرتے انہوں نے فرعون کی پیروی کی۔ حالانکہ فرعون کی جو تعلیم تھی وہ صحیح راستہ دکھانے والی نہ تھی۔ لیکن پھر بھی جو گمراہی کی طرف لے جانے والا تھا اس کی بات تو انہوں نے مان لی اور جو ہدایت کی طرف لے جانے والا تھا اس کی بات نہ مانی۔

بدقسمتی سے یہی طریق ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر ہوئے تو آپ نے جو تعلیم دی وہ بنی نوع انسان کو فلاح اور کامیابی کے مقام تک پہنچانے والی تھی مگر آپؐ کے وطن کے لوگوں نے اس کا

انکار کر دیا اور پہلے تو ابوجہل کے پیچھے چلے جو فرعون کا ایک روحانی قائم مقام تھا اور اس کی ہر گندی اور فساد پھیلانے والی تعلیم کو انہوں نے قبول کر لیا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم کو رد کر دیا آپ کے بعد بھی یہی ہوا۔ حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے تو صحابہؓ آپ پر ایمان لے آئے مگر سارے عرب نے بغاوت کر دی اور انہوں نے وہی طریق اختیار کیا جو ابوجہل اور اس کے ساتھیوں نے اختیار کیا تھا اور اس وقت کے فراعنہ کے پیچھے چل پڑے۔ اس وقت کے فرعون مسیلمہ کذاب۔ اسود عنسی اور سجاحؔ وغیرہ تھے جنہوں نے جھوٹے طور پر نبوت کا دعویٰ کر دیا اور لوگ ان کے متبع ہو گئے۔ مگر جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سچا جانشین تھا اور لوگوں کے اندر اسلامی روح پیدا کرنے والا تھا اس کو چھوڑ دیا (البدایة و النهایة کتاب تاریخ الاسلام الاول من الحوادث .... سنة احدی عشرة من الهجرة)۔ پھر آپؐ کے بعد حضرت عمرؓ کو خدا تعالیٰ نے خلیفہ بنایا۔ تب بھی یہی ہوا۔ حضرت عمرؓ اپنی وفات کے قریب حج کے لئے گئے تو بعض لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ عمرؓ مر جائیں گے تو ہم فلاں کو خلیفہ بنائیں گے۔ اور کسی کی بیعت نہیں کریں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی مشیئت کے ماتحت حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو ان کے زمانہ میں بھی عبداللہ بن سبا جیسے لوگوں نے فتنا کھڑا کر دیا۔ یہ شخص بھی مصری تھا جیسا کہ فرعون مصری تھا اور لوگوں نے اس کی بات ماننی شروع کر دی (تاریخ الطبری سنة خمس و ثلاثین ذکر مسیر من سار الی ذی خشب...)۔ ان کے بعد حضرت علیؓ خلیفہ ہوئے۔ تب بھی لوگوں نے یہی طریق اختیار کیا پہلے تو حضرت علیؓ کو خلیفہ بننے پر مجبور کیا گیا اور پھر ایک چھوٹا سا عذر کر کے کہ معاویہؓ سے صلح کیوں کی انہیں لوگوں نے جنہوں نے آپ کو خلافت کے لئے کھڑا کیا تھا بغاوت کر دی اور خوارج کے نام سے الگ ہو گئے۔ اور انہوں نے دو صدیوں تک اسلام میں وہ تہلکہ مچایا کہ لوگوں کا امن بالکل برباد ہو گیا۔ اسی طرح جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پر ایک لمبا عرصہ گذر گیا اور امت محمدیہ میں مختلف اولیاء پیدا ہوئے۔ تب بھی یہی ہوا کہ لوگوں نے ان کی نہ سنی بلکہ ان کے دشمنوں کی سنی جو اپنے وقت کے فرعون تھے اور ان کے پیچھے چل پڑے۔ چنانچہ حضرت معین الدین صاحب چشتیؒ، حضرت قطب الدین صاحب بختیار کاکیؒ، حضرت نظام الدین صاحب اولیاءؒ اور حضرت خواجہ فرید الدین صاحب گنج شکرؒ وغیرہ کی بھی مخالفت ہوئی۔ حضرت سید احمد صاحب سرہندیؒ آئے تو لوگوں نے جہانگیر کے کان بھرنے شروع کر دیئے کہ یہ شخص حکومت کا باغی ہے اسے جلدی سنبھالیں ورنہ سخت فتنہ پیدا ہو جائے گا۔ چنانچہ جہانگیر نے انہیں گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیا۔ مگر پھر بعض لوگوں نے انہیں سمجھایا کہ یہ بزرگ انسان ہے اسے رہا کر دو۔ چنانچہ اس نے دانائی سے کام لے کر انہیں رہا کر دیا۔

غرض جب سے اللہ تعالیٰ کے انبیاء اور خلفاء کا سلسلہ جاری ہے صداقت کی ہمیشہ مخالفت ہوتی چلی آئی ہے۔

یہی مخالفت کا جذبہ فرعون اور اس کی قوم کے اکابر کے دل ودماغ پر بھی حاوی تھا۔ چنانچہ انہوں نے لوگوں کو جمع کیا۔ مگر انہیں یہ کہنے کی توفیق نہ ملی کہ اگر اس مقابلہ کے نتیجہ میں موسیٰؑ غالب آ گیا تو ہم موسیٰؑ کے پیچھے چل پڑیں گے اور اس کی بات مان لیں گے۔ بلکہ انہوں نے اگر لوگوں کے کان میں کوئی بات ڈالی تو صرف یہی کہ اگر جادوگر غالب آ گئے تو ہم ان کے پیچھے چل پڑیں گے۔ حالانکہ مقابلہ میں اس بات کا بھی امکان تھا کہ موسیٰؑ جیت جاتے اور جادوگر ہار جاتے مگر باوجود اس کے کہ دونوں پہلوان کے سامنے موجود تھے اور وہ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ اگر جادوگر غالب آ گئے تو ہم جادوگروں کی بات مان لیں گے اور اگر موسیٰؑ غالب آیا تو ہم موسیٰؑ کی بات مان لیں گے۔ انہوں نے صرف اتنا کہا کہ اگر جادوگر غالب آئے تو ہم ان کے پیچھے چل پڑیں گے اور اس طرح انہوں نے اپنے دلوں کے بغض اور عناد کا اظہار کر دیا۔ اور بتا دیا کہ انہیں صداقت سے کوئی غرض نہیں۔ وہ صرف فرعون کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اسی غرض کے لئے وہ اس مقابلہ کا انتظار کر رہے ہیں۔

حضرت موسیٰؑ جیسے عظیم الشان نبی کے مقابلہ میں ان کا ساحروں کو بلانا یہ بھی بتاتا ہے کہ انبیاء کی ابتدائی حالت کتنی کمزور ہوتی ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نبی تھے اور آپ فرعون کو تبلیغ کرنے کے لئے گئے تھے مگر وہ انہیں اتنا حقیر سمجھتا تھا کہ ان کے مقابلہ کے لئے اس نے مداریوں کو بلا کر کھڑا کر دیا۔ مگر کجا وہ حالت اور کجا یہ کہ آج حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت کو دنیا میں اتنی طاقت حاصل ہے کہ بڑی بڑی سلطنتیں اس کی ناراضگی سے ڈرتی ہیں۔ آج امریکہ جیسی طاقت ان کی پیٹھ پر ہے اور فلسطین میں ان کی حکومت قائم ہے لیکن اس وقت اتنی کمزوری کی حالت تھی کہ فرعون مداریوں کو بلا کر آپ کے مقابلہ پر کھڑا کر دیتا ہے۔ آج اگر ہندو یا عیسائی کسی مسلمان عالم کے مقابل پر بھی مداری کھڑا کر دیں تو تمام لوگ شور مچانا شروع کر دیں گے کہ ان کی ہتک کی گئی ہے۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس خیال سے کہ شاید اللہ تعالیٰ ان کو اسی راہ سے ہدایت دے دے مقابلہ سے انکار نہ کیا۔ اور مداریوں کے مقابلہ میں بھی کھڑے ہونے کے لئے تیار ہو گئے۔ لیکن اب اگر وہی فرعون دوبارہ زندہ کیا جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں اپنے آپ کو ایک بندر سے بھی زیادہ ذلیل سمجھے اور یہ دیکھ کر حیران ہو کہ اس کی نسل کا تو دنیا میں کہیں نشان بھی نظر نہیں آتا اور موسیٰؑ کی قوم فلسطین پر حکومت کر رہی ہے۔

فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالُوْا لِفِرْعَوْنَ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا

پس جب جادوگر آ گئے تو انہوں نے فرعون سے کہا کہ اگر ہم غالب ہوئے تو کیا ہمیں کوئی انعام بھی ملے گا؟

نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۲﴾ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۳﴾

(فرعون نے) کہا۔ ہاں، بلکہ اس صورت میں تم دربار میں مقربین میں جگہ پاؤ گے۔

تفسیر ۔جب جادوگر آ گئے تو انہوں نے فرعون سے کہا کہ اگر ہم غالب آئے تو کیا ہمیں کوئی انعام بھی ملے گا؟ اس آیت سے نبی اور غیر نبی کی طبیعت کا فرق معلوم ہو جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی باتیں جو اوپر گذر چکی ہیں ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنا اور ساری دنیا کو پالنے والا صرف خدا تعالیٰ کو قرار دیتے تھے کسی بندے پر اپنی نگاہ نہیں رکھتے تھے۔ لیکن جو مداری فرعون نے ان کے مقابلہ کے لئے جمع کئے تھے ان کی نظریں اتنی نیچی اور ان کے حوصلے اتنے پست تھے کہ بادشاہ کے دربار میں آتے ہی بول پڑے کہ حضور اگر ہم جیت گئے تو کیا کوئی انعام بھی ملے گا یا نہیں۔ یہی مضمون سورۂ اعراف میں بھی بیان کیا گیا ہے لیکن وہاں طرز کلام بدل دی گئی ہے۔ وہاں یہ الفاظ آتے ہیں کہ اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ (الاعراف: ۱۱۴) اگر ہم غالب آئے تو ہم کو ضرور اجر ملے گا۔ مگر یہاں یہ کہا گیا ہے کہ اگر ہم غالب آئے تو کیا ہمیں کوئی انعام بھی ملے گا یا نہیں۔ گویا بظاہر دونوں میں اختلاف دکھائی دیتا ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو ان دونوں آیتوں میں کوئی حقیقی اختلاف نہیں۔ بے شک یہاں سوالیہ فقرہ استعمال کیا گیا ہے۔ مگر اس سوالیہ فقرہ کے یہ معنے نہیں کہ ان کو اجر ملنے کے متعلق کوئی شبہ تھا بلکہ بعض دفعہ سوالیہ فقرہ توقع کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ یعنی مطلب تو یہ ہوتا ہے کہ ضرور ملے گا مگر کہنے والا کہتا یہ ہے کہ کیا کچھ ملے گا بھی؟ پس سورۂ اعراف اور سورۂ شعراء کی آیتوں میں کوئی تضاد نہیں۔ مداریوں کے انعام کی خواہش ظاہر کرنے پر فرعون نے کہا۔ ہاں ہاں انعام تو ملے گا اور اس کے علاوہ تم میرے مقرب بھی ہو جاؤ گے۔

قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰۤى اَلْقُوْا مَاۤ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَاَلْقَوْا

اس پر موسیٰ نے ان سے کہا کہ جو تدبیر تم نے کرنی ہے کرلو۔ اس پر انہوں نے

حِبَالَهُمْ وَ عِصِیَّهُمْ وَ قَالُوْا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ

نے اپنی رسیّاں اور اپنے سونٹے (میدان میں نکال کر) رکھ دیئے اور کہا۔ فرعون کے اقبال کی قسم

الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۵﴾

ہم ضرور غالب آئیں گے۔

تفسیر ۔ جب فرعون اور آنے والے ساحروں میں بات چیت ہو چکی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تم نے جو کچھ میرے مقابلہ میں پھینکنا ہے پھینکو۔

اس جگہ بھی سورۂ اعراف سے ایک اختلاف دکھائی دیتا ہے جس کا ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ سورۂ اعراف میں یہ لکھا ہے کہ مداریوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اِمَّاۤ اَنْ تُلْقِیَ وَ اِمَّاۤ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِیْنَ (الاعراف:۱۱۶) یعنی پہلے آپ پھینکیں گے یا ہم پھینکیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا پہلے تم پھینکو۔ لیکن اس آیت میں مداریوں کے سوال کا کوئی ذکر ہی نہیں۔ صرف حضرت موسیٰؑ کا قول درج ہے کہ تم نے جو کچھ پھینکنا ہے پھینک لو۔ لیکن یہ بھی کوئی اختلاف نہیں بلکہ اس موقعہ کے مناسب یہی کلام تھا۔ درحقیقت سورۂ اعراف میں مداریوں کا یہ یقین ظاہر کیا گیا ہے کہ ہم کو ضرور اجر ملے گا۔ اس یقین کے مطابق انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ پہلے آپ پھینکیں گے یا پہلے ہم پھینکیں۔ لیکن سورۂ شعراء میں وہ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جن میں توقع کا پہلو غالب ہے یقین کا پہلو اتنا نمایاں نہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے کلام کی مناسبت کے لحاظ سے مداریوں کا سوال حذف کر دیا اور صرف حضرت موسیٰؑ کا قول نقل کر دیا۔ کہ میری نسبت پھر دیکھا جائے گا پہلے تم اپنی امید پوری کرلو۔ اور جو کچھ پھینکنا ہے پھینک لو۔ چنانچہ مداریوں نے اپنی رسیّاں اور سونٹے پھینک دیئے اور فرعون کو خوش کرنے کے لئے کہا کہ فرعون کے اقبال سے ہم ہی غالب رہیں گے۔ یہ الفاظ جو مداریوں کی زبان سے قرآن کریم میں استعمال کئے گئے ہیں قرآن کریم کی سچائی اور اس کے منجانب اللہ ہونے پر زبردست شاہد ہیں۔ عیسائی پادری ہمیشہ کہا کرتے ہیں کہ قرآن کریم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بنائی ہوئی کتاب ہے۔ ہم تو ان کے اس اعتراض کو غلط سمجھتے ہیں اور یقین

رکھتے ہیں۔ کہ یہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ کلام ہے جو گذشتہ اور موجودہ اور آئندہ آنے والے زمانوں کے تمام حالات کو خوب جانتا ہے لیکن اگر دشمن کے قول کے مطابق قرآن کریم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہی کلام قرار دیا جائے تب بھی ماننا پڑے گا کہ آپ کا ادبی کمال انتہا کو پہنچا ہوا تھا اور آپ کے معلومات کی وسعت کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا کیونکہ قرآن کریم کہتا ہے کہ جب فرعون نے مصر کے جادوگروں کو موسیٰ ؑ کے مقابلہ کے لئے بلایا تو اُس وقت انہوں نے کرتب دکھاتے وقت یہ الفاظ کہے کہ بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ۔ فرعون کے اقبال کی قسم ہم ضرور غالب آئیں گے۔ اور یہ فقرات ایسے ہیں جو عربوں کے ذہن کے کسی گوشہ میں بھی نہیں آسکتے تھے۔ کیونکہ عرب میں کوئی مداری نہیں تھے جن سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ فقرہ سن کر سمجھ لیتے کہ مداری کرتب دکھاتے وقت ہمیشہ اس قسم کے الفاظ کہا کرتے ہیں۔ پس وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ قرآن کریم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بنایا ہوا ہے انہیں سوچنا چاہیے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو ایک ایسے ملک میں پیدا ہوئے تھے جہاں مداریوں اور ہتھکنڈے کرنے والوں کا نام ونشان تک نہ تھا۔ پھر یہ فقرہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کس نے بتایا۔ میں نے عرب کی تاریخ کا بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اس کی تاریخ سے یہی پتا چلتا ہے کہ عرب لوگ شعروشاعری کے بڑے دلدادہ تھے اور گلہ بانی کرنا ان کا پیشہ تھا لیکن مداریوں اور ہتھکنڈے کرنے والوں کا ان کی تاریخ میں کہیں ذکر نہیں آتا۔ وہ مصر اور ہندوستان وغیرہ میں پائے جاتے تھے مگر ان ممالک میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی گئے ہی نہیں۔ پھر آپ کو یہ کس طرح معلوم ہو گیا کہ مداری جب کھیل دکھاتے ہیں تو وہ یہ فقرہ کہتے ہیں۔ میں نے خود بعض مداریوں کو دیکھا ہے کہ جب وہ کھیل شروع کرتے ہیں تو دیکھنے والوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ آپ کے اقبال سے ایسا ہو جائے گا۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے مداریوں نے کہا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ۔ فرعون کے اقبال کی قسم۔ لیکن عرب کی تاریخ میں کوئی محاورہ میں نے آج تک ایسا نہیں دیکھا۔ جس میں یہ کہا گیا ہو کہ ہم یہ کام فلاں کے اقبال سے شروع کرتے ہیں۔ پس یہ فقرہ صاف بتاتا ہے کہ قرآن کریم خدا تعالیٰ کا نازل کردہ کلام ہے۔ لیکن اگر یہ فقرہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے نہیں بتایا بلکہ نعوذ باللہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بنا لیا تھا تب بھی یہ آپ ؐ کا اتنا بڑا کمال ہے کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔ کیونکہ یہ بعینہٖ اسی رنگ کا فقرہ ہے جو مداری اب بھی کہتے ہیں۔ مگر یہ کتنی ہنسی کی بات ہے کہ ایک طرف تو وہ خدا تعالیٰ کے نبی پر غالب آنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہم یقیناً غالب آجائیں گے اور دوسری طرف جس کی خاطر تماشا دکھا رہے ہیں اُس کی تعریف کرتے چلے جاتے ہیں کہ آپ کے اقبال سے ایسا ہو جائے گا تا کہ کچھ زیادہ پیسے مل جائیں۔

فَاَلْقٰى مُوْسٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ﴿۴۶﴾

تب موسیٰ نے بھی اپنا عصا دے مارا۔تو اچانک وہ ان کے جھوٹوں کو ملیا میٹ کرنے لگا۔تب جادوگر (خدا کے

فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۴۷﴾ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۸﴾

سامنے) سجدہ میں گرادیئے گئے۔(اور) انہوں نے کہا ہم رب العالمین پر جو موسیٰ اور ہارون کا رب ہے

رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۴۹﴾ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ

ایمان لاتے ہیں۔اس پر وہ (یعنی فرعون جھنجھلا کر) بولا کہ کیا میرے حکم دینے سے پہلے تم ایمان لے آئے ہو۔

لَكُمْ ج اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ج فَلَسَوْفَ

یہ (شخص) یقیناً تمہارا کوئی سردار ہے جس نے تم کو جادو سکھایا ہے۔پس عنقریب تم (اپنا انجام)

تَعْلَمُوْنَ ط لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّ

معلوم کرلو گے میں تمہارے ہاتھوں اور پیروں کو (اپنی) خلاف ورزی کی وجہ سے کاٹ دوں گا اور تم

لَاُوصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۰﴾ قَالُوْا لَا ضَيْرَ ز اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا

سب کو صلیب پر لٹکا دوں گا۔انہوں نے کہا (اس میں) کوئی حرج نہیں۔آخر کار ہم اپنے ربّ کی طرف ہی

مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۵۱﴾ ج اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَآ اَنْ

لوٹ کر جانے والے ہیں۔ہم امید رکھتے ہیں کہ ہمارا ربّ ہمارے گناہ اس وجہ سے معاف کردے گا

كُنَّآ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۲﴾ ع

ع ۱۳ ۷

کہ ہم سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں سے بن گئے۔

حلّ لُغات۔ تَلْقَفُ تَلْقَفُ لَقِفَ سے مضارع واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے اور لَقِفَ الشَّیْءَ کے معنے ہوتے ہیں تَنَاوَلَهٗ بِسُرْعَةٍ اس کو جلدی سے پکڑ لیا (اقرب) پس تَلْقَفُ کے معنے ہوں گے جو کام جادوگر کر

رہے تھے اُس کو جلدی جلدی ملیا میٹ کرنے لگا۔

خِلَافٍ خِلَافٌ کے معنے مخالفت کے بھی ہیں۔ اور اس کے معنے یہ بھی ہیں کہ دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں یا بایاں ہاتھ اور دایاں پاؤں۔(اقرب)

ضَیْرَ اَلضَّیْرُ کے معنے اَلْمَضَرَّۃُ کے ہیں یعنی نقصان۔(مفردات)

تفسیر۔جب مداریوں نے اپنی رسیّاں اور سونٹے پھینک دیئے تو موسیٰ ؑ نے بھی اپنا عصا اُٹھا کر دے مارا۔ اور چونکہ ان رسیّوں اور سونٹوں میں انہوں نے پارہ بھر رکھا تھا جس سے وہ ہلتی تھیں۔ اس لئے جب موسیٰ ؑ کا سونٹا اُن کو زور سے لگا تو اُن میں سوراخ ہو گئے اور ان کا سارا فریب کھل گیا۔ گویا تمثیلی زبان میں موسیٰ ؑ کا سونٹا اُن کے فریب کو کھا گیا۔ جس پر مداری جو اپنی حقیقت کو خوب جانتے تھے۔ سجدے میں گر گئے اور چلا اٹھے کہ ہم رب العالمین خدا پر جو موسیٰ ؑ اور ہارون ؑ کا خدا ہے ایمان لاتے ہیں ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ موسیٰ ؑ نبی ہے اور ہم محض مداری ہیں۔

اس جگہ اُلْقِیَ السَّحَرَۃُ سٰجِدِیْنَ کے الفاظ فرما کر اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جادوگروں کی یہ شکست ایسی نمایاں تھی کہ انہیں یوں محسوس ہوا کہ گویا کسی خفیہ طاقت نے ان کے پاؤں تلے سے زمین نکال لی ہے اور وہ خدا کے سامنے سجدہ میں گرا دیئے گئے اور انہوں نے بلند آواز سے اس امر کا اقرار کیا کہ ہم خدائے واحد پر ایمان لاتے ہیں اور موسیٰ ؑ اور ہارون ؑ کی اتباع کرتے ہیں۔

اس پر فرعون غصہ میں آ گیا اور اس نے کہا کہ کیا تم میری اجازت سے پہلے اس پر ایمان لے آئے ہو۔ معلوم ہوتا ہے یہ تمہارا سردار ہے جس نے تم کو مداریوں کا فن سکھایا ہے۔ پس تم جلدی ہی اپنے اس فعل کا نتیجہ دیکھ لوگے۔ گویا اتنی جلدی وہ بھول گیا کہ ابھی تو میں ان کو خدا کے ایک نبی کے مقابلہ میں کھڑا کر رہا تھا اور ان کو اپنا مقرب بنانے کی پیش کش کر رہا تھا اور ابھی ان کو اتنا ذلیل قرار دے رہا ہوں کہ جو چاہوں ان کو سزا دے لوں۔ چنانچہ بولا کہ چونکہ تم میرے مخالف چل پڑے ہو۔ اس لئے اس جرم کی وجہ سے میں تمہارے ہاتھ اور پیر کاٹ دوں گا اور پھر تم سب کو صلیب پر لٹکا دوں گا۔ تا کہ دوسروں کو عبرت حاصل ہو۔ مگر وہ پیسے لے کر تماشا دکھانے والے مداری اب مومن بن چکے تھے۔ وہ فرعون جیسے لوگوں کی دھمکیوں سے کب مرعوب ہو سکتے تھے انہوں نے جھٹ کہا۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہم نے ایک دن اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہی ہے اگر تمہارے ہاتھ سے مارے گئے تو کون سی بڑی بات ہے اگر تم نے ہم کو مارا تو ہمارا فائدہ ہی ہے۔ دین کی خاطر دکھ اٹھانے کی وجہ سے ہمارا رب ہمارے گناہ معاف

کر دے گا کیونکہ ہم ایسے برے ماحول میں سب سے پہلے خدا تعالیٰ کے نبی پر ایمان لائے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک کسی انسان کو خدا نظر نہیں آتا دنیا کی مصیبتیں اسے پہاڑ اور اس کے ابتلاء اسے بے کنار سمندر نظر آتے ہیں۔ مگر جب خدا نظر آجاتا ہے تو اس کی نگاہ میں ساری چیزیں ہیچ ہو جاتی ہیں۔ تب ایک ہی چیز اس کے سامنے ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ کا قول پورا ہو اور خدا کے قول کے مقابلہ میں نہ حکومتیں کوئی حقیقت رکھتی ہیں نہ بادشاہتیں کوئی حقیقت رکھتی ہیں اور نہ جائیدادیں کوئی حقیقت رکھتی ہیں۔ وہ ہنستا ہوا جاتا اور اپنی قربانی پیش کر کے خدا تعالیٰ کے حضور حاضر ہو جاتا ہے۔ ہماری جماعت کے صاحبزادہ عبداللطیف صاحبؓ ہمارے جیسے ہی ایک انسان تھے۔ مگر جب بادشاہ نے ان کو بلا کر کہا کہ دیکھیں مولوی صاحب میرے دل میں آپ کا بڑا ادب ہے اور میں آپ کو رہا کرنا چاہتا ہوں لیکن اگر یوں ہی چھوڑ دوں تو مولوی میرے مخالف ہو جائیں گے۔ آپ صرف اتنا کریں کہ جب آپ سے پوچھا جائے کہ کیا آپ قادیانی ہیں تو آپ خواہ دل میں کچھ عقائد رکھیں زبان سے کہہ دیں کہ میں قادیانی نہیں ہوں اس طرح میں آپ کو آسانی سے چھوڑ سکوں گا۔ حضرت صاحبزادہ عبداللطیفؓ صاحب نے کہا۔ بادشاہ تمہیں جان کی قیمت معلوم ہوتی ہوگی۔ مجھے تو اس کی کوئی قیمت معلوم نہیں ہوتی اور میں تو یہ قربانی پیش کرنے کے لئے ہی تمہارے پاس آیا ہوں۔ مجھے تو پہلے ہی کہا گیا تھا کہ میں احمدیت کا اظہار نہ کروں مگر میں نے انکار کر دیا۔ دراصل وہ گورنر جس کے سامنے وہ پہلی دفعہ پیش ہوئے۔ وہ بھی ان کے شاگردوں میں سے تھا۔ جب آپ اس سے ملے تو اس نے بھی کہا۔ کہ آپ یہاں سے بھاگ جائیں۔ ورنہ آپ کی جان خطرہ میں پڑ جائے گی۔ صاحبزادہ صاحبؓ نے کہا۔ تمہاری ہتھکڑیاں کہاں ہیں لاؤ اور میرے ہاتھوں میں پہناؤ۔ مجھے تو آج رات خدا نے بتایا ہے کہ مجھے سونے کے کنگن ڈالے جائیں گے۔ پس میں اپنی موت سے نہیں ڈرتا۔ میں تو قوم کی نجات کے لئے اپنی جان پیش کرنا چاہتا ہوں۔ پھر جب انہیں پتھراؤ کیا گیا۔ تو اس وقت بھی ان کے دل میں اپنی قوم کا کوئی کینہ اور بغض نہیں تھا۔ بلکہ سنگسار کرنے سے پہلے جب انہیں گاڑنے لگے۔ اور گاڑتے اس لئے ہیں کہ پتھروں کے ڈر سے انسان بھاگ نہ جائے تو صاحبزادہ صاحبؓ نے کہا کہ میں بھاگتا تو نہیں۔ مجھے گاڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ پھر جب اُن پر پتھر پڑنے لگے تو دیکھنے والوں کی گواہی ہے کہ صاحبزادہ صاحبؓ بلند آواز سے یہ دعا کرتے جاتے تھے کہ اے میرے رب! میری قوم پر رحم کر۔ کیونکہ وہ جہالت سے ایسا کر رہی ہے (تذکرۃ الشہادتین روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۴۹ تا ۶۰)۔ یہ وہ شاندار نمونے ہیں جو قوموں کو زندہ کیا کرتے ہیں۔ بیشک اُن میں کچھ کمزور بھی ہوتے ہیں مگر نوجوان جب اس قسم کے نمونہ کو دیکھتے ہیں تو ان کے دلوں میں جوش پیدا ہو جاتا ہے اور وہ کہتے ہیں کیسا اچھا انجام تھا آؤ ہم بھی ایسی ہی قربانی

کریں اور وہ بھی آگ اور خون کے دریا میں چھلانگیں لگا دیتے ہیں ۔ یہی حکمت ہے جس کی بناء پر انجیل میں روحانی بادشاہت کو انگور کے باغ سے تشبیہ دی گئی ہے (لوقا باب ۲۰ آیت ۹ تا ۱۸)۔ کیونکہ انگور کی بیل ہی ایک ایسی بیل ہوتی ہے جس کو سرسبز و شاداب کرنے کے لئے خون کی کھاد ڈالی جاتی ہے پس اس مثال میں اسی طرف اشارہ تھا کہ خدا تعالیٰ کے دین کو تازہ کرنے کے لئے ہمیشہ انسانی قربانیوں کی ضرورت ہوگی اور انسانوں کے خون اس باغ کی جڑوں میں گرا کر اسے پھر زندہ اور سرسبز و شاداب کیا جائے گا ۔ چنانچہ روحانی سلسلوں کی ایک لمبی تاریخ اس صداقت کو واضح کرتی ہے ۔ آج تک کوئی نبی بھی ایسا نہیں گزرا جس کی جماعت شدید ترین مصائب میں سے نہ گزری ہو۔ ان کو گرفتار کیا گیا۔ اُن کو قتل کیا گیا۔ اُن کو پھانسی پر لٹکایا گیا اُن کو تلواروں سے شہید کیا گیا۔ مگر ان تمام تکالیف کے باوجود صداقت دنیا پر ہمیشہ غالب آئی ۔ حضرت داؤدؑ کے بعد بخت نصر نے بیت المقدس کی ساری عمارتیں تہہ و بالا کر دی تھیں اور مسجد اقصیٰ کا نشان تک بھی اُس نے نہ چھوڑا تھا (انسائیکلو پیڈیا ببلیکا زیر لفظ Nebuchadnezzar)۔ مگر ان باتوں سے کیا ہوا۔ بات تو وہ تھی جو موسیٰؑ لایا۔ مگر موسیٰؑ کی لائی ہوئی بات آج تک دنیا نہیں مٹا سکی ۔ ان کی عزت آج بھی دنیا میں قائم ہے اور آج بھی ان کے ناموں پر اپنی جانیں قربان کرنے والے لوگ دنیا میں موجود ہیں ۔ آج ایک زندہ اور باجبروت اور قاہر اور خبردار اور منتظم بادشاہ کو گالی دے کر ایک انسان سزا سے بچ سکتا ہے۔ اس کی گرفت سے بھاگ سکتا ہے لیکن یہ لوگ جو انسانوں جیسے انسان تھے اوّل تو فقیری میں انہوں نے عمر گزار دی اور اگر بعض بادشاہ بھی ہوئے تو اُن کی بادشاہتیں اپنی دنیوی عظمت کے لحاظ سے بہت سے دنیوی بادشاہوں سے کم تھیں ۔ لیکن آج جب کہ وہ منوں مٹی کے نیچے دفن ہیں اور بعض کی نسلوں کا بھی کوئی پتہ نہیں چلتا۔ اور بعض کی اُمتیں بھی مٹ چکی ہیں کوئی زبردست سے زبردست بادشاہ بھی بے ادبی سے اُن کا نام لے تو وہ ذلّت و رسوائی سے بچ نہیں سکتا کیونکہ انہوں نے خدا تعالیٰ کی محبت کی چھری کو خوشی سے اپنی گردنوں پر پھروالیا اور وہ خدا کے برّے قرار پائے گویا جس طرح ایک بکری کا گوشت اُس کے ذبح ہو جانے کے بعد انسان کی غذا بن کر انسان ہو جاتا ہے اسی طرح جو لوگ خدا کے برے بن کر قربان ہو جاتے ہیں وہ بھی خدا میں شامل ہو جاتے ہیں ۔ اور ابدی بادشاہت اُن کو عطا کی جاتی ہے ۔ موسیٰؑ پر ایمان لانے والے ساحروں نے بھی قربانی کا یہی شاندار نمونہ دکھایا۔ اور انہوں نے فرعون سے کہہ دیا کہ ہمارے دل اب نُورِ ایمان سے منور ہو چکے ہیں اب تیری کوئی بھی تکلیف ہمیں جادۂ حق سے منحرف نہیں کر سکتی ۔ یہی ایمان ہے جو انسان کی نجات کا باعث بنتا ہے اور یہی قربانی کی رُوح ہے جو قوموں کو دنیا پر غالب کیا کرتی ہے ۔

وَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی مُوۡسٰۤی اَنۡ اَسۡرِ بِعِبَادِیۡۤ اِنَّکُمۡ

اور ہم نے موسیٰؑ کی طرف وحی کی کہ میرے بندوں کو راتوں رات لے جا۔ تمہارا پیچھا کیا جائے گا۔ اس

مُّتَّبَعُوۡنَ ﴿۵۳﴾ فَاَرۡسَلَ فِرۡعَوۡنُ فِی الۡمَدَآئِنِ حٰشِرِیۡنَ ﴿۵۴﴾

پر فرعون نے شہروں کی طرف جمع کرنے والے آدمی بھجوائے۔ (یہ کہتے ہوئے کہ) یہ لوگ (یعنی بنی اسرائیل)

اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ لَشِرۡذِمَۃٌ قَلِیۡلُوۡنَ ﴿۵۵﴾ وَ اِنَّهُمۡ لَنَا

تو ایک تھوڑی سی جماعت ہیں۔ باوجود اس کے وہ ہم کو غصہ دلا رہے ہیں۔ اور ہم ایک (بڑی) جماعت ہیں

لَغَآئِظُوۡنَ ﴿۵۶﴾ وَ اِنَّا لَجَمِیۡعٌ حٰذِرُوۡنَ ﴿۵۷﴾

جو بہت محتاط ہیں (پس ہمیں ان کا مقابلہ کرنا چاہیے)۔

حلّ لُغَات۔ اَسۡرِ اَسۡرِ اَسۡرٰی سے امر کا صیغہ ہے۔ اور اَسۡرٰی سَرٰی سے باب افعال کا ماضی کا صیغہ ہے۔ سَرَی الرَّجُلُ کے معنے ہوتے ہیں سَارَ عَامَّۃَ اللَّیۡلِ۔ یعنی وہ رات کے اکثر حصہ میں چلتا رہا۔ اور اَسۡرٰی کے معنے سَرٰی کی طرح ہی ہیں۔ لیکن بعض ائمہ لُغت نے کہا ہے کہ اَسۡرٰی لِاَوَّلِ اللَّیۡلِ وَسَرٰی لِاٰخِرِ اللَّیۡلِ۔ رات کے ابتدائی حصہ میں چلنے کے لئے اَسۡرٰی کا فعل استعمال کیا جاتا ہے اور رات کے آخری حصہ میں چلنے کے لئے سَرٰی کا (اقرب) پس اَسۡرِ بِعِبَادِیۡ کے معنے ہوں گے (۱) رات کے وقت میرے بندوں کو لے کر چل۔ (۲) یا رات کے ابتدائی حصہ میں لے کر چل۔

شِرۡذِمَۃٌ اَلشِّرۡذِمَۃُ: اَلۡجَمَاعَۃُ الۡقَلِیۡلَۃُ مِنَ النَّاسِ۔ لوگوں کی تھوڑی سی جماعت۔ (اقرب)

حٰذِرُوۡنَ حٰذِرُوۡنَ حَاذِرٌ سے جمع کا صیغہ ہے اور حَاذِرٌ کے معنے ہوتے ہیں اَلۡمُتَأَهِّبُ۔ اَلۡمُسۡتَعِدُّ چوکس اور تیار۔ (اقرب)

تفسیر۔ اِس آیت میں اَسۡرِ کا لفظ آتا ہے جو سَرٰی سے نکلا ہے اور سَرَی الرَّجُلُ کے معنے ہوتے ہیں سَارَ عَامَّۃَ اللَّیۡلِ فلاں شخص رات کا اکثر حصہ چلتا رہا۔ اور جب اَسۡرَی الرَّجُلُ اِسۡرَاءً کہیں تو اس کے معنے بھی سَرٰی کی طرح ہی رات کو چلنے کے ہوتے ہیں۔ لیکن بعض لغویوں نے کہا ہے کہ اَسۡرٰی کے معنے ہوتے ہیں رات

کے پہلے حصہ میں چلا۔ اور سَرٰی کے معنے ہوتے ہیں رات کے پچھلے حصہ میں چلا۔

اس آیت کا یہ مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اب فرعون کافی ڈر گیا ہے۔ اُس سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ اب خدا کا نام لے کر رات کے وقت اپنی قوم کو نکال کر لے جاؤ۔ ہاں ہوشیار رہنا کیونکہ فرعون اور اس کے ساتھی تمہارا پیچھا کریں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ فرعون نے سب شہروں میں ڈھنڈورچی بھیج دیئے اور یہ اعلان کرا دیا کہ بنی اسرائیل ایک چھوٹی سی جماعت ہے جو ہمیں غصہ دلا رہی ہے حالانکہ ہم سب ایک بڑی جماعت ہیں جو ہر قسم کا ساز و سامان بھی اپنے پاس رکھتے ہیں۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ہم اکثریت میں ہوتے ہوئے اقلیت سے ڈر جائیں اور اُسے کچلنے کے لئے تیار نہ ہو جائیں۔

یہی وہ عیب ہے جو ہر نبی کے زمانہ میں اُس کے دشمنوں میں دکھائی دیتا ہے کہ وہ اکثریت کے گھمنڈ میں بجائے دوسروں کے احساسات کا خیال رکھنے کے یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ اگر تم نے ہماری بات نہ مانی تو ہم تمہیں ڈنڈے سے سیدھا کریں گے۔ مثل مشہور ہے کہ کوئی بھیڑیا ندی کے کنارے پانی پی رہا تھا کہ ایک بکری کا بچہ آیا اور اُس نے بھی پانی پینا شروع کر دیا۔ بکری کا بچہ دیکھ کر بھیڑیے کے منہ میں پانی بھر آیا اور اُس نے چاہا کہ اُسے کھا لے۔ انسانوں اور حیوانوں کے حالات ایک سے نہیں ہوتے۔ انسان دلیل دیتا ہے۔ لیکن ایک حیوان دلیل نہیں دیتا۔ مثال میں چونکہ دلیل دی گئی ہے اِس لئے یہاں بھیڑیے سے مراد وہ آدمی ہے جو بھیڑیے کے سے خصائل رکھتا ہو اور بکری کے بچہ سے مراد وہ آدمی ہے جو اس کے خصائل رکھتا ہو بہر حال بھیڑیے کو یہ لالچ پیدا ہوا۔ کہ کسی نہ کسی طرح بکری کے بچہ کو کھا لے۔ چنانچہ وہ بکری کے بچہ کو دیکھ کر کہنے لگا۔ تجھے شرم نہیں آتی کہ تو میرا پانی گدلا کر رہا ہے بکری کے بچہ نے کہا۔ سرکار یہ کون سی بات ہے آپ نے سوچا نہیں کہ آپ اوپر ہیں اور میں نیچے ہوں۔ آپ کا پیا ہوا پانی میری طرف آ رہا ہے نہ کہ میرا پیا ہوا پانی آپ کی طرف جا رہا ہے۔ بھڑیے نے آگے بڑھ کر بکری کے بچہ کو تھپّڑ مارا اور اُسے مار دیا اور کہا نالائق آگے سے جواب دیتا ہے۔ یہی حالت حق کے مخالفوں کی ہوتی ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ سچائی کیا چیز ہے۔ وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ اکثریت ہماری طرف ہے اور ہم اکثریت کے بل بوتے پر جو کچھ چاہیں کر سکتے ہیں۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ مولوی ثناء اللہ صاحب قادیان آئے اور ایک بڑے جلسہ میں نعرہ ہائے تکبیر میں انہوں نے کہا۔ میں ایک نکتہ بیان کرتا ہوں۔ مرزا صاحب اور میرے درمیان آسان طریقِ فیصلہ یہ ہے کہ مرزا صاحب میرے ساتھ کلکتہ تک ٹرین میں چلیں۔ کلکتہ تک بیسیوں اسٹیشن ہیں۔ ہم دیکھیں گے کہ راستہ میں انہیں پتھر پڑتے ہیں یا مجھے اور پھول مجھ پر برسائے جاتے ہیں یا ان پر۔ کلکتہ تک جاتے ہوئے اس بات کا فیصلہ

ہو جائے گا کہ مسلمان کس کی تائید میں ہیں۔ جماعت کے دوست گھبرائے ہوئے میرے پاس آئے۔ اور انہوں نے کہا۔ لوگوں پر بہت برا اثر ہوا ہے اور وہ اِس وقت سخت جوش میں ہیں۔ شام کو میری تقریر تھی۔ میں نے کہا۔ مولوی ثناء اللہ صاحب نے خود فیصلہ کر دیا ہے کہ سچا کون ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ انہوں نے نتیجہ از خود نکال لیا ہے ورنہ اگر نتیجہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے نکلا ہوا ہے تو پھر ہمارے لئے اچھا ہے۔ میں نے کہا۔ مولوی ثناء اللہ صاحب نے کہا ہے کہ مرزا محمود احمد میرے ساتھ کلکتہ تک چلیں ہم دیکھیں گے کہ راستہ میں پھول کس پر برستے ہیں اور پتھر کس پر پھینکے جاتے ہیں اور اس سے مولوی صاحب نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جس پر پھُول پڑیں گے وہ سچا ہوگا۔ حالانکہ نتیجہ نکالنا ان کا کام نہیں تھا ہم سے پہلے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوجہل گزر چکے ہیں۔ مولوی صاحب خود بتا دیں کہ مکہ میں پتھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑا کرتے تھے یا ابوجہل کو۔ اور پھول ابوجہل کو پڑا کرتے تھے یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ اور اگر پتھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو پڑا کرتے تھے اور پھول ابوجہل پر برسائے جاتے تھے تو نتیجہ ظاہر ہے کہ جس پر پتھر پڑیں گے وہ سچا ہوگا اور جس پر پھول برسائے جائیں گے وہ جھوٹا ہوگا۔

غرض کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اکثریت ان لوگوں کی ہوتی ہے جو دین سے بے بہرہ ہوتے ہیں اور اس وجہ سے وہ ہر قسم کے مظالم پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن جس طرح کثرت دماغ میں غرور پیدا کر کے عقل ماردیتی ہے اسی طرح عشق بھی ایک عاشقِ صادق کے اندر کبریائی پیدا کر دیتا ہے۔ مگر وہ کبریائی کے نشہ میں آ کر مارتا نہیں بلکہ مرتا ہے۔ چنانچہ دیکھ لو کثرت والوں نے ہمیشہ تھوڑی تعداد والوں کو اپنے غرور میں آ کر مارا ہے لیکن عاشقوں نے ہمیشہ اپنے معشوقوں کے لئے جانیں دی ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اسی حقیقت کی طرف اپنے اس شعر میں اشارہ فرماتے ہیں کہ ؎

در کوئے تو اگر سرِ عُشاق را زنند
اوّل کسے کہ لافِ تعشق زند منم

(آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۶۵۸)

یعنی اگر تیرے کوچہ میں جانے والوں کے متعلق یہ حکم ہو جائے کہ ہر شخص جو عاشقی کا دعویٰ کرے گا اُسے قتل کر دیا جائے گا تو گو عشق کا دل کے ساتھ تعلق ہوتا ہے اور کوئی شخص دعویٰ کرے یا نہ کرے عاشق عاشق ہی ہوتا ہے۔ لیکن اگر یہ اعلان ہو جائے کہ جو بھی عشق کا دعویٰ کرے گا اس کا سر قلم کر دیا جائے گا تو سب سے پہلا شخص جو عشق کا

دعویٰ کرے گا اور کہے گا کہ میں عاشق ہوں وہ میں ہوں گا۔

حقیقت یہ ہے کہ عاشق اور مسلمان دو متضاد چیزیں نہیں بلکہ ایک ہی چیز کے یہ دو نام ہیں مگر عاشق سے میری مراد ہوس پرست عاشق نہیں بلکہ ایک سچا اور کامل مسلمان مراد ہے۔ وہ مصائب کو صرف برداشت ہی نہیں کرتا بلکہ اگر اس پر مصائب نہ آئیں تو وہ اپنے اندر ایک بے کلی سی محسوس کرتا ہے اور ڈرتا ہے کہ کہیں میرا محبوب مجھ سے خفا تو نہیں ہو گیا۔ مصائب سے بھاگنا ایک منافق کا کام ہے اور مصائب کو برداشت کرنا صرف مسلمان کا خاصہ نہیں بلکہ ایک کافر بھی اس میں شریک ہو سکتا ہے۔ لیکن سچا مسلمان وہ ہے جو نہ صرف مصائب کو برداشت کرتا ہے بلکہ مشکلات کے دور کو اپنی روحانی ترقی کا ایک ذریعہ سمجھتا ہے۔ اور اگر اس دور میں التواء واقعہ ہو جائے۔ تو وہ گھبراتا ہے کہ کہیں میرے ایمان میں تو کوئی نقص نہیں آ گیا کہ میرا رب میرے ایمان کو دنیا پر ظاہر کرنے کی کوئی تدبیر نہیں کر رہا۔

پس بیشک اکثریت اپنی طاقت کے گھمنڈ میں مومنوں پر ظلم کرتی رہے وہ اسے برداشت کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ مجرموں کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے۔ اور اکثریت کے بل بوتے پر ظلم کرنے والے اپنے جرائم کی پاداش میں کیفر کردار کو پہنچ جاتے ہیں چنانچہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ فتح کر کے آئے تو آپؐ نے اُن کفار سے جو رات دن آپؐ پر اور آپؐ کے صحابہؓ پر شدید ترین مظالم کرتے رہتے تھے پوچھا کہ اے مکہ والو! بتاؤ اب میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں؟ آپ کا مطلب یہی تھا کہ تم جو ننانوے فیصدی ہونے کے گھمنڈ میں یہ کہا کرتے تھے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا حیثیت ہے۔ اس کی کیا طاقت ہے کہ وہ ہمارے مقابلہ میں بول سکے۔ اب اُس کے سامنے تم اکثریت کے دعوے دار پیش ہو رہے ہو۔ مگر اس دن وہ ایسے سٹپٹائے کہ انہوں نے کہا۔ ہم آپؐ سے اُسی سلوک کی امید رکھتے ہیں جو یوسفؑ نے اپنے بھائیوں کے ساتھ کیا تھا۔ چنانچہ آپؐ نے اُن سب کو معاف فرما دیا۔ (زاد المعاد فی ھدی خیر العباد، دخول النبی و المسلمین مکۃ)۔ یہی اکثریت کا گھمنڈ فرعون کے دماغ میں بھی جاگزین تھا۔ بلکہ اگر غور سے کام لیا جائے تو جب سے دنیا کا آغاز ہوا ہے ہمیشہ دو قسم کی حکومتیں پائی جاتی رہی ہیں۔ ایک عقل اور سمجھ سے کام لینے والی اور دوسری زور اور طاقت سے کام لینے والی۔ ہر زمانہ کے محاورے الگ الگ ہوتے ہیں۔ آج کل جو حکومت عقل اور سمجھ سے کام لے اس کو جمہوریت کہتے ہیں۔ اور جو حکومت زور اور تشدد اور طاقت سے کام لے اس کو ڈکٹیٹر شپ کہتے ہیں۔ یا بعض دفعہ ہٹلر ازم بھی کہہ دیتے ہیں۔ مگر نام خواہ کچھ ہی ہو جب سے دنیا بنی ہے یہ دونوں طاقتیں کام کر رہی ہیں حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ سے یہ کام شروع ہوا اور اب تک جاری ہے۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹے تھے۔ ایک کی اللہ تعالیٰ نے

قربانی قبول کر لی اور دوسرے کی ردّ کر دی۔ ایک کے پیچھے اخلاص اور تقویٰ تھا اس لئے اس کی قربانی قبول ہوئی اور دوسرے کی قربانی کے پیچھے چونکہ اخلاص اور تقویٰ نہیں تھا اس لئے وہ رد ہوئی۔ اب دانائی تو یہ تھی کہ دوسرا شخص جس کی قربانی قبول نہیں ہوئی تھی وہ اپنے اندر تقویٰ۔ عجز اور انکسار پیدا کرتا اور سمجھتا کہ اس کی قربانی خدا تعالیٰ نے رد کی ہے اس کے بھائی کی وجہ سے ردّ نہیں ہوئی مگر وہ لٹھ لے کر اپنے بھائی کے پاس پہنچا اور اسے کہا کہ میں تجھے قتل کر دوں گا۔ مگر اس کے بھائی نے دلیل والا طریق اختیار کیا اور کہا کہ قربانی قبول کرنا خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اگر تجھے اس بات پر غصہ آیا ہے کہ خدا تعالیٰ نے تیری قربانی قبول کیوں نہیں کی تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں تو اپنے آپ کو ایک عاجز بندہ سمجھتا ہوں۔ یہ فطرت پرانے زمانہ کی تھی اس وقت نہ ڈکٹیٹر شپ کے الفاظ تھے نہ جمہوریت کے مگر وہ روح موجود تھی جس سے یہ دونوں چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ روح جب سے حضرت آدم علیہ السلام پیدا ہوئے ہیں یا دنیا پیدا ہوئی ہے متوازی چلی آرہی ہے۔ دنیا میں ایک طبقہ ایسا چلا آیا ہے جو ہمیشہ حق و انصاف کا قائل ہوتا ہے اور دوسرا اپنے زور اور طاقت پر فخر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ بہر حال ہم نے اپنی مرضی پوری کرنی ہے۔ اگر لوگ ہماری مرضی کے مطابق نہیں چلیں گے تو ہم حکومت جتھہ اور طاقت سے دوسروں کو سیدھا کر دیں گے اور اپنی مرضی چلائیں گے۔ انبیاء کی جماعتیں چونکہ ابتداء میں ہمیشہ چھوٹی ہوتی ہیں اور بعض دفعہ تو ان کی تعداد اتنی قلیل ہوتی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ بعض انبیاء کو صرف ایک ایک شخص نے مانا۔ (بخاری کتاب الطب باب مَنْ لَمْ یَرْقِ)۔ اس لئے ہر شخص ان پر مذاق اڑاتا ہے اور ان کے دعووں کو ایک مجنونانہ بڑ سے زیادہ حقیقت نہیں دیتا۔ فرعون نے بھی اسی گھمنڈ میں شہر بشہر اپنے ڈھنڈورچی بھیجے اور ان سے کہا کہ جاؤ اور لوگوں کو یہ کہہ کر اشتعال دلاؤ کہ بنی اسرائیل جو ایک حقیر سی جماعت ہیں ہمیں اشتعال دلا رہے ہیں حالانکہ ہم ایک بڑی زبردست اکثریت ہیں اور پھر بڑے محتاط اور دور اندیش اور ہر قسم کے ساز و سامان اور اسلحہ سے لیس ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اُن لوگوں کو سختی سے کچل دیں اور ان پر ترقی کے تمام دروازے بند کر دیں۔

فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍ ﴿۵۸﴾ وَّ كُنُوْزٍ وَّ مَقَامٍ

تب ہم نے اُن (یعنی فرعون اور اُس کی جماعت) کو باغوں اور چشموں اور خزانوں اور عزت والے ملک سے

كَرِیْمٍ ﴿۵۹﴾ كَذٰلِكَ ؕ وَ اَوْرَثْنٰهَا بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ﴿۶۰﴾

نکال دیا (یعنی محروم کر دیا) ایسا ہی ہوا۔ اور ہم نے اُن (چیزوں) کا وارث بنی اسرائیل کو کر دیا۔ پھر صبح

فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ﴿۶۱﴾ فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ

کے وقت وہ (یعنی فرعون اور اُس کی قوم کے لوگ بنی اسرائیل کو روکنے کے لئے) اُن کے پیچھے چل پڑے۔

مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ﴿۶۲﴾ قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ

پھر جب دونوں گروہ ایک دوسرے کے سامنے ہوئے تو موسیٰؑ کے ساتھیوں نے کہا۔ ہم تو پکڑے گئے۔

سَيَهْدِيْنِ ﴿۶۳﴾

(موسیٰ نے) جواب دیا۔ ہرگز ایسا نہیں ہوگا۔ میرا رب میرے ساتھ ہے اور وہ مجھے کامیابی کا راستہ دکھائے گا۔

حلّ لُغَات۔ كُنُوْزٌ كُنُوْزٌ كَنْزٌ کی جمع ہے اور اَلْكَنْزُ کے معنے ہیں وہ مال جو کسی جگہ میں محفوظ ہو۔ اِسی طرح اس کے معنے ہیں الذَّهَبُ سونا۔ اَلْفِضَّةُ ۔ چاندی۔ مَا يُحْرَزُ فِيْهِ الْمَالُ كَالْمَخْزَنِ وَالصَّنْدُوْقِ۔ وہ صندوق یا الماری جس میں مال محفوظ کیا جائے اُس کو بھی كَنْزٌ کہتے ہیں۔ (اقرب)

مُشْرِقِيْنَ مُشْرِقِيْنَ مُشْرِقٌ سے جمع کا صیغہ ہے جو اَشْرَقَ سے اسم فاعل ہے اور اَشْرَقَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں دَخَلَ فِيْ شُرُوْقِ الشَّمْسِ۔ کسی جگہ اُس وقت داخل ہوا جب کہ سورج نکل رہا تھا (اقرب) پس مُشْرِقٌ کے معنے ہیں کسی جگہ صبح کے وقت داخل ہونے والا۔

تفسیر۔ فرعون کو چونکہ اپنی کثرتِ تعداد اور طاقت پر غرور تھا اور وہ بنی اسرائیل کو بالکل حقیر سمجھتا تھا۔ اس لئے جب موسیٰؑ بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر نکلے تو فرعون کو بھی پتا لگ گیا۔ اور وہ اپنا لاؤ لشکر جمع کر کے موسیٰؑ کے پیچھے چلا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب اس نے ایسا کیا تو ہم نے بھی فرعون اور اس کی جماعت کو باغوں اور چشموں اور خزانوں اور عزت والے ملک میں سے نکال دیا اور ہم نے بنی اسرائیل کو ان چیزوں کا وارث کر دیا۔ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کے ساتھیوں کے متعلق یہ نہیں فرمایا کہ وہ خود وہاں سے نکلے بلکہ یہ فرمایا ہے کہ ہم نے اُن کو نکالا۔ حالانکہ بظاہر واقعہ یہ تھا کہ وہ خود وہاں سے نکلے تھے۔ درحقیقت اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ وہ موسیٰؑ کے آنے اور اُن کے نکلنے کی وجہ سے باہر نکلا تھا اور موسیٰؑ کو بھیجنا اور بنی اسرائیل کو نکالنے کا حکم دینا خدا تعالیٰ کا کام تھا اس لئے بالواسطہ طور پر خدا تعالیٰ ہی فرعون اور اس لشکر کو نکالنے کا موجب بنا اور خدا تعالیٰ نے اس فعل کو اپنی طرف منسوب کیا اور بتایا کہ گو وہ خود نکلا تھا مگر چونکہ یہ تحریک ہماری طرف سے تھی اور ہم نے ہی موسیٰؑ کو بنی اسرائیل کے نکالنے کا حکم

دیا تھا اس لئے ہم ہی فرعون اور اس کے لشکر کو نکالنے والے بن گئے۔ اور آخر ان نعمتوں کا ہم نے بنی اسرائیل کو وارث بنادیا۔

اَوۡرَثۡنٰهَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ سے یہ مراد نہیں کہ انہی باغوں اور انہی چشموں اور انہی خزانوں کا وارث بنادیا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ انہیں اسی قسم کے باغوں اور چشموں اور خزانوں کا فلسطین میں وارث بنادیا۔ یہ ایک غلط خیال ہے جو بعض لوگوں میں پایا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل کو مصر پر غلبہ حاصل ہو گیا تھا۔ اس خیال کی نہ قرآنِ کریم سے تصدیق ہوتی ہے اور نہ بائیبل سے۔ قرآنِ کریم اور بائیبل دونوں سے ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل مصر سے نکلنے کے بعد اپنی نافرمانیوں کی وجہ سے ایک لمبے عرصہ تک بیابانوں میں پھرتے رہے اور آخر چالیس سال کے بعد انہیں کنعان پر قبضہ ملا۔ پس اَوۡرَثۡنٰهَا سے ملک مصر مراد نہیں بلکہ وہ جگہ مراد ہے جہاں انہیں سب چیزیں میسر آگئیں۔ یعنی فلسطین کا ملک۔ جو اپنے باغات اور چشموں میں مصر کے بالکل مشابہ ہے۔

فَاَتۡبَعُوۡهُمۡ مُّشۡرِقِیۡنَ سے ظاہر ہے کہ سورج نکلتے وقت فرعون کا لشکر اُن کے پیچھے چلا تھا۔ کیونکہ فرعون نے بھی اپنا لشکر جمع کرنا تھا۔ اور موسیٰؑ پہلے سے تیار تھے۔ پس موسیٰؑ پہلے نکل گئے اور فرعون پیچھے نکلا مگر جاتے جاتے جب لشکر فرعون اور موسیٰؑ کے ساتھیوں کا آمنا سامنا ہوا تو موسیٰؑ کے ساتھی جو صدیوں سے فرعون کے غلام چلے آرہے تھے ڈر گئے اور شور مچانے لگے کہ اے موسیٰؑ! ہم تو مارے گئے اور پکڑے گئے۔ اس پر موسیٰؑ نے کہا کہ ایسا گمان مت کرو۔ اُس لشکر کے ساتھ فرعون ہے اور میرے لشکر کے ساتھ خدا ہے اور خدا تعالیٰ یقیناً ہمیں پار لے جائے گا۔ خدا تعالیٰ پر توکل کا یہ ایک نہایت ہی شاندار نمونہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دکھایا مگر اس صداقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انتہائی خطرات میں چاروں طرف سے گھرے ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ پر جس کامل یقین اور ایمان کا مظاہرہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہمیں دکھائی دیتا ہے وہ اس واقعہ سے کہیں زیادہ شاندار اور ایمان افزا ہے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہجرت کا حکم ملا تو آپؐ حضرت ابوبکرؓ کو اپنے ساتھ لے کر جبلِ ثور کی طرف تشریف لے گئے جو مکہ سے کوئی چھ سات میل کے فاصلہ پر ہے اور اس پہاڑ کی چوٹی پر ایک غار میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ صبح جب کفار نے دیکھا کہ آپؐ اپنے گھر میں موجود نہیں اور ہر قسم کے پہرہ کے باوجود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کامیابی کے ساتھ نکل گئے ہیں تو وہ فوراً آپ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے اور انہوں نے مکہ کے چند بہترین کھوجی جو پاؤں کے نشانات پہچاننے میں بڑی بھاری دسترس رکھتے تھے اپنے ساتھ لئے جو انہیں جبلِ ثور تک لے آئے اور انہوں نے کہا کہ بس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر ہیں تو یہیں ہیں۔ اس

سے آگے اور کہیں نشان نہیں ملتا اُس وقت یہ کیفیت تھی کہ دشمن غار کے عین سر پر کھڑا تھا۔ اور غار کا منہ تنگ نہیں تھا۔ جس کے اندر جھانکنا مشکل ہو مگر وہ ایک فراخ منہ کی کھلی غار ہے جس کے اندر جھانک کر بڑی آسانی سے معلوم کیا جا سکتا تھا کہ کوئی شخص اندر بیٹھا ہے یا نہیں مگر ایسی حالت میں بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی خوف طاری نہیں ہوتا بلکہ آپؐ کی قوتِ قدسیہ کی برکت سے حضرت ابوبکرؓ کا دل بھی مضبوط رہتا ہے اور وہ موسیٰؑ کے ساتھیوں کی طرح یہ نہیں کہتے کہ ہم پکڑے گئے بلکہ انہوں نے اگر کچھ کہا تھا تو یہ کہ یا رسول اللہ دشمن اتنا قریب پہنچ چکا ہے کہ وہ اگر ذرا بھی نظر نیچی کرے تو ہمیں دیکھ سکتا ہے مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اُسْکُتْ یَا اَبَا بَکْرٍ اِثْنَانِ اللّٰہُ ثَالِثُھُمَا ابوبکرؓ خاموش رہو ہم اِس وقت دو نہیں بلکہ ہمارے ساتھ ایک تیسرا خدا بھی ہے پھر وہ کیونکر ہمیں دیکھ سکتے ہیں (بخاری کتاب مناقب الانصار باب ھجرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم و اصحابہ الی المدینۃ و مسلم کتاب فضائل الصحابۃ باب من فضائل ابی بکر و السیرۃ الحلبیۃ باب الھجرۃ الی المدینۃ)۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ باوجود اس کے کہ دشمن غار کے سر تک پہنچ چکا تھا پھر بھی اُسے یہ توفیق نہ ملی کہ وہ آگے بڑھ کر جھانک سکتا اور وہ وہیں سے بڑبڑاتے واہی تباہی باتیں کرتے ہوئے واپس چلا گیا۔ غرض اس واقعہ کا ایک پہلو یہ ہے کہ موسیٰؑ کے ساتھیوں نے گھبرا کر یہ کہا کہ اے موسیٰؑ! ہم پکڑے گئے۔ گویا انہوں نے اپنے ساتھ موسیٰؑ کو بھی لپیٹ لیا۔ اور خیال کیا کہ اب ہم سب فرعون کی گرفت میں آنے والے ہیں مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے توکّل نے آپؐ کے ساتھی پر بھی ایسا اثر ڈالا کہ اس کی زبان سے بھی یہ الفاظ نہ نکلے کہ ہم پکڑے گئے بلکہ اُس نے کہا تو صرف یہ کہ دشمن اتنا قریب آ چکا ہے کہ اگر وہ ہمیں دیکھنا چاہے تو دیکھ سکتا ہے مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واہمہ کو بھی برداشت نہ کیا اور فرمایا کہ ایسا خیال بھی مت کرو ہم اس وقت دو نہیں بلکہ ہمارے ساتھ ایک اور بھی ہستی ہے اور وہ ہمارا خدا ہے۔

پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مصر سے نکلے تو وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے جسے بائیبل نے اپنی شاعرانہ زبان میں لاکھوں بنا دیا ہے (خروج باب ۱۲ آیت ۳۷، ۳۸) مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف ایک آدمی تھا۔ اور گو وہ ایک آدمی بھی اپنے ایمان کے لحاظ سے سوا لاکھ پر بھاری تھا مگر بہر حال وہ فردِ واحد ہی تھا کوئی بڑی بھاری جمعیت اُس کے ساتھ نہیں تھی۔ پھر موسیٰؑ اور اُس کے ساتھیوں کے سامنے بھاگنے کے لئے ایک کھلا راستہ تھا مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس جگہ محصور ہوئے اس میں سے نکلنے کا اور کوئی راستہ نہ تھا مگر باوجود اس کے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف ایک آدمی تھا اور باوجود اس کے کہ دشمن سے بھاگنے کا آپؐ کے سامنے کوئی راستہ نہیں تھا اور پھر آپؐ بالکل نہتے تھے آپؐ نے اللہ تعالیٰ پر کامل یقین رکھا اور فرمایا۔ ابوبکرؓ! غم مت کرو۔

اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (التوبة:۴۰) یقیناً ہمارا خدا ہمارے ساتھ ہے۔

پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تو صرف یہ کہا کہ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ۔ میرا رب میرے ساتھ ہے۔ وہ یقیناً مجھے کامیابی کا راستہ دکھائے گا۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا فرما کر حضرت ابوبکرؓ کو بھی اپنے وجود میں مدغم کر لیا اور فرمایا کہ جس طرح مجھے خدا تعالیٰ کی معیت حاصل ہے اِسی طرح تمہیں بھی خدا تعالیٰ کی معیت حاصل ہے۔ اس لئے گھبراہٹ اور تشویش کی ضرورت نہیں۔ پھر کیا یہ عجیب بات نہیں کہ فرعون نے جب موسیٰؑ کا تعاقب کیا تو اُس نے موسیٰؑ اور اس کے ساتھیوں کو دیکھ لیا۔ لیکن جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعاقب میں مکّہ والے نکلے تو خدا نے اُن کی آنکھوں کو اندھا کر دیا اور نہ صرف وہ رسول کریم اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پکڑنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ بلکہ انہیں اپنی آنکھوں سے بھی دیکھنے کی خدا تعالیٰ نے ان کو طاقت نہ دی۔ اور اس طرح کلّی طور پر خدا تعالیٰ نے اُن کو خائب و خاسر کیا۔ اور اگر کسی شخص نے آپؐ کو دیکھ بھی لیا جیسا کہ سراقہؓ نے آپؐ کو مدینہ جاتے وقت دیکھ لیا تھا تو خدا تعالیٰ نے اُسے اُس وقت تک واپس نہیں آنے دیا جب تک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور آپؐ کی صداقت کا نشان اُس نے نہیں دیکھ لیا۔ گویا دشمن صرف ایک مقام پر آپؐ کو دیکھنے میں کامیاب ہوا مگر اُس مقام پر بھی وہ دشمن کی کامیابی نہیں تھی بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی تھی کیونکہ دشمن نے آپؐ کو گھائل نہیں کیا بلکہ آپؐ نے دشمن کو گھائل کیا اور پیشتر اس کے کہ وہ واپس لوٹتا وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور آپؐ کی عظمت کا قائل ہو چکا تھا گو اسلام میں وہ فتح مکّہ کے موقعہ پر داخل ہوا۔ (الاصابة حرف سین، سراقة بن مالک)

فَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ؕ

تب ہم نے موسیٰؑ کی طرف وحی کی کہ اپنے سونٹے کو سمندر پر مار۔ جس پر (سمندر) پھٹ گیا۔

فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ۚ﴿۶۴﴾ وَ اَزْلَفْنَا

اور اُس کا ہر ٹکڑا ایک بڑے ٹیلے کی طرح نظر آنے لگا۔ اور اُس وقت ہم دوسرے گروہ

ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ ۚ﴿۶۵﴾ وَ اَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَ مَنْ مَّعَهٗۤ

(یعنی فرعون کے گروہ) کو قریب لے آئے۔ اور موسیٰؑ اور اُس کے ساتھیوں کو نجات دی۔

اَجْمَعِيْنَ ﴿۶۶﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۶۷﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ

اور دوسرے گروہ کو ہم نے غرق کردیا۔ اس (واقعہ) میں ایک بڑا نشان ہے۔ لیکن

لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۶۸﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ

اِن (منکروں) میں سے اکثر مانتے نہیں۔ اور تیرا رب یقیناً

الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۶۹﴾ ع

غالب (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔

ع ۱۷/۸

حلّ لُغات ۔ اِنْفَلَقَ اِنْفَلَقَ کے معنے ہیں اِنْشَقَّ ۔ پھٹ گیا۔ (اقرب)

فِرْقٌ اَلْفِرْقُ کے معنے ہیں اَلطَّائِفَةُ مِنَ الشَّيْءِ الْمُتَفَرِّقِ ۔ یعنی فِرْقٌ متفرق چیز کے ایک حصہ کو کہتے ہیں۔ (لسان)

اَلطَّوْدُ الطَّوْدُ اَلْجَبَلُ الْعَظِيْمُ ۔ یعنی طود عربی میں بڑے پہاڑ کو کہتے ہیں۔ نیز اس کے معنے ہیں اَلْمُشْرِفُ مِنَ الرَّمَلِ ۔ ریت کا ٹیلہ۔ اَلْهَضْبَةُ چھوٹی سی پہاڑی جو زمین پر پھیلی ہوئی ہو۔ (اقرب)

اَزْلَفْنَا أَزْلَفْنَا اَزْلَفَ سے جمع متکلم کا صیغہ ہے اور اَزْلَفَهٗ کے معنے ہیں قَرَّبَهٗ ۔ اُس کو قریب کیا جَمَّعَهٗ : اُس کو جمع کیا (اقرب) پس اَزْلَفْنَا کے معنے ہوں گے ہم نے قریب کیا یا جمع کیا۔

تفسیر ۔ فرماتا ہے ہم نے موسیٰؑ کو وحی کی کہ اپنا سونٹا سمندر پر مار۔ جب اس نے سونٹا مارا تو سمندر پھٹ گیا۔ اور ہر ٹکڑا یعنی سمندر کی طرف کا پانی بھی اور خشکی کی طرف کا پانی بھی جو جھیلوں کی شکل میں تھا ایک اونچے ٹیلے کے طور پر نظر آنے لگ گیا۔ اس وقت ہم نے لشکرِ فرعون کو قریب کردیا۔ تب موسیٰؑ اور اس کے ساتھی تو سمندر اور جھیلوں کے درمیان کی ریت پر سے آرام کے ساتھ گذر گئے مگر فرعون کے لشکر میں گھبراہٹ پیدا ہوئی اور ان کی گاڑیوں کے پہیے ریت میں پھنسنے لگ گئے نتیجہ یہ ہوا کہ گاڑیاں نکالتے ہوئے مدّ کا وقت آگیا اور وہ سب کے سب غرق ہوگئے۔

بائیبل میں اس معجزہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے

’’پھر موسیٰ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا اور خداوند نے رات بھر تند پوربی آندھی چلا کر

اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک زمین بنا دیا اور پانی دو حصے ہو گیا اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے اور ان کے داہنے اور بائیں ہاتھ پانی دیوار کی طرح تھا۔ اور مصریوں نے تعاقب کیا اور فرعون کے سب گھوڑے اور رتھ اور سوار ان کے پیچھے پیچھے سمندر کے بیچ میں چلے گئے۔ اور رات کے پچھلے پہر خداوند نے آگ اور بادل کے ستون میں سے مصریوں کے لشکر پر نظر کی اور ان کے لشکر کو گھبرا دیا اور اس نے ان کے رتھوں کے پہیوں کو نکال ڈالا۔ سو ان کا چلانا مشکل ہو گیا۔ تب مصری کہنے لگے آؤ ہم اسرائیلیوں کے سامنے سے بھاگیں کیونکہ خداوند اُن کی طرف سے مصریوں کے ساتھ جنگ کرتا ہے۔ اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھا تاکہ پانی مصریوں اور اُن کے رتھوں اور سواروں پر پھر بہنے لگے۔ اور موسیٰ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا اور صبح ہوتے ہوتے سمندر پھر اپنی اصلی قوت پر آ گیا اور مصری اُلٹے بھاگنے لگے اور خداوند نے سمندر کے بیچ ہی میں مصریوں کو تہہ و بالا کر دیا اور پانی پلٹ کر آیا اور اُس نے رتھوں اور سواروں اور فرعون کے سارے لشکر کو جو اسرائیلیوں کا پیچھا کرتا ہوا سمندر میں گیا تھا غرق کر دیا اور ایک بھی اُن میں سے باقی نہ چھوڑا۔ پر بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے اور پانی ان کے داہنے اور بائیں ہاتھ دیوار کی طرح رہا۔ سو خداوند نے اس دن اسرائیلیوں کو مصریوں کے ہاتھ سے اِس طرح بچایا اور اسرائیلیوں نے مصریوں کو سمندر کے کنارے مرے ہوئے پڑے دیکھا اور اسرائیلیوں نے وہ بڑی قدرت جو خداوند نے مصریوں پر ظاہر کی دیکھی اور وہ لوگ خداوند سے ڈرے اور خداوند پر اور اُس کے بندے موسیٰ پر ایمان لائے۔‘‘

(خروج باب ۱۴ آیت ۲۱ تا ۳۱)

پرانے مفسرین نے اس موقع پر بعض عجیب و غریب قصے بیان کئے ہیں۔ چنانچہ وہ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب سونٹا مارا تو سمندر بارہ جگہ سے پھٹ گیا۔ تاکہ بنی اسرائیل کے بارہ قبائل اس میں سے علیحدہ علیحدہ گزر جائیں۔ (تفسیر فتح البیان زیر آیت ھذا) پھر بعض نے اور زیادہ مبالغہ سے کام لیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ چونکہ ہر فریق کے درمیان پانی کی ایک دیوار حائل تھی اور بنی اسرائیل ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے تھے اس لئے انہوں نے کہا کہ جب تک ہم ایک دوسرے کو نہیں دیکھیں گے اُس وقت تک ہم ایک قدم بھی آگے نہیں چلیں گے۔ اس پر موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔

اور انہیں حکم ملا کہ پانی کی جو دیواریں کھڑی ہیں ان میں اپنا سونٹا داخل کرو۔ چنانچہ انہوں نے اسی طرح کیا۔ اور تمام دیواروں میں چوڑے چوڑے سوراخ ہو گئے اور وہ سب کے سب ایک دوسرے کو دیکھنے لگ گئے بلکہ ایک دوسرے کی باتیں بھی سننے لگے اور ہنسی خوشی سمندر میں سے گزر گئے۔ (کشاف زیر آیات وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ)

مفسرین نے یہ قصہ اپنی عجوبہ پسند طبیعت کی تسکین کے لئے تو بیان کر دیا مگر انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سونٹا کس قدر لمبا تھا کہ وہ بارہ راستے جن پر سے یہود نے گزرنا تھا ان کی دیواروں میں اس سونٹے نے اپنے ایک ہی وار سے سوراخ کر دیئے۔ اور پھر انہوں نے اس سوال پر بھی کوئی روشنی نہیں ڈالی کہ جن بنی اسرائیل میں باہم اِس قدر محبت پائی جاتی تھی کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھے بغیر سمندر میں سے گزرنے کے لئے بھی تیار نہیں تھے وہ ایک ہی راستہ سے کیوں نہ گزر گئے۔ اور اُن کے لئے الگ الگ راستے کیوں تجویز کئے گئے۔ ایک طرف اُن کا ایسے پُرخطر وقت میں بھی جب کہ فرعون ان کے تعاقب میں تھا الگ الگ راستوں سے جانا اور دوسری طرف اُن میں اس قدر محبت کا پایا جانا کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھے بغیر ایک قدم بھی اٹھانا گوارہ نہ کریں بالکل متضاد بیانات ہیں جو اس قصہ کے بنانے والے کے افتراء کو ظاہر کر رہے ہیں۔ حقیقت صرف اتنی ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ایسے وقت میں سمندر کے سامنے پہنچایا جبکہ جزر کا وقت تھا۔ چنانچہ اِدھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سمندر پر سونٹا مارا اُدھر اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت پانی گھٹنا شروع ہو گیا لیکن جب فرعون کا لشکر پہنچا تو اُس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام سمندر کے اس خشک ٹکڑے کا اکثر حصّہ طے کر چکے تھے۔ فرعون نے اُن کو پار ہوتے دیکھ کر جلدی سے اپنی رتھیں سمندر میں ڈال دیں۔ مگر سمندر کی ریت اُس کے لئے جان لیوا ثابت ہوئی اُس کی رتھوں کے پہیئے ریت میں پھنسنے لگے۔ جن کو نکالتے نکالتے اِس قدر دیر ہو گئی کہ مدّ کا وقت آ گیا۔ اور فرعون اپنے تمام لشکر کے ساتھ وہیں غرق ہو گیا۔ فَانْفَلَقَ کا لفظ بھی اِسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کیونکہ اِنْفَلَقَ کے معنے جُدا ہو جانے کے ہیں اور سمندر کے جدا ہونے کا یہی مفہوم ہے کہ وہ کنارہ سے ہٹ گیا تھا اور اُس کی وجہ سے جو خشکی نکل آئی تھی اس میں سے بنی اسرائیل گزر گئے۔ اُس وقت بنی اسرائیل کے ایک طرف سمندر تھا اور دوسری طرف وہ چھوٹی چھوٹی جھیلیں تھیں جو سمندر کے کنارے واقعہ تھیں اور وہ درمیان میں سے گزرنے والوں کو ریت کے اونچے ٹیلے کی طرح اُٹھی ہوئی نظر آتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ اس عظیم الشان معجزہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۔ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۔ اس واقعہ میں خدا تعالیٰ کی طاقت اور اس کی عظمت کا ایک بہت بڑا نشان مخفی ہے مگر افسوس ہے کہ اتنے بڑے نشانات کو دیکھنے کے باوجود لوگوں کی آنکھیں بند رہتی ہیں اور وہ

خدا تعالیٰ کے انبیاء پر ایمان لا کر اللہ تعالیٰ کی رضا اور اُس کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ جب بھی اللہ تعالیٰ کا کوئی نبی آتا ہے اکثریت اس کا انکار کر دیتی ہے اور بہت تھوڑے لوگ اس پر ایمان لانے کی سعادت حاصل کرتے ہیں حالانکہ چاہیے یہ تھا کہ اتنے بڑے نشانات کے بعد اکثریت ہمیشہ خدا تعالیٰ کی آواز پر لبیک کہتی اور صرف شاذ و نادر کے طور پر ہی چند ایسے لوگ رہ جاتے جو اس کی آواز پر لبیک نہ کہتے مگر یہ کتنے تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ اتنے بڑے نشانات بھی لوگوں کی آنکھیں کھولنے کا موجب نہیں بنتے اور وہ مخالفت اور انکار پر ہی کمر بستہ رہتے ہیں۔ مگر اُن کے انکار کے باوجود اس میں کوئی شک نہیں کہ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ تیرا رب بڑا غالب اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔ یعنی وہ اپنے نبیوں کو غالب کر کے اپنے عزیز ہونے کا ثبوت دیتا ہے اور لوگوں کے استہزاء اور انکار کے باوجود دنیا میں نئی خرابیاں پیدا ہونے پر پھر اپنے رسول بھیج کر اپنے رحیم ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ عربی زبان کے قواعد کے مطابق رحیم کے وزن پر جو الفاظ آتے ہیں اُن کے معانی میں لمبائی اور تواتر پایا جاتا ہے۔ پس صفت رحیم کا ذکر فرما کر اللہ تعالیٰ نے اپنی اسی سنّت کا ذکر فرمایا ہے جو ہمیشہ سے چلی آرہی ہے کہ جب بھی دنیا میں خرابی پیدا ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اس کی اصلاح کے لئے اپنا کوئی مامور مبعوث فرما دیتا ہے جو پھر بھولے بھٹکے بندوں کا خدا تعالیٰ سے تعلق قائم کر دیتا ہے چنانچہ دیکھ لو آج تک دنیا میں کوئی نبی بھی ایسا نہیں آیا جو اپنے دشمنوں پر غالب نہ آیا ہو۔ اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ دنیا میں خرابی پیدا ہوئی ہو اور خدا تعالیٰ نے اُس کی اصلاح کا سامان نہ کیا ہو۔ آدمؑ آیا تو لوگوں نے اُس کی مخالفت کی۔ مگر آدمؑ کی مخالفت کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ اب میں اپنا کوئی نبی نہیں بھیجوں گا بلکہ اُس نے نوحؑ کو لوگوں کی ہدایت کے لئے بھجوا دیا۔ نوحؑ کی بھی لوگوں نے شدید مخالفت کی۔ مگر اس مخالفت کو دیکھتے ہوئے جب پھر اُس کے بندے گمراہ ہوئے تو خدا تعالیٰ نے ابراہیمؑ کو لوگوں کی ہدایت کے لئے کھڑا کر دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بھی شدید مخالفت ہوئی۔ یہاں تک کہ لوگوں نے آپ کو آگ میں ڈال دیا مگر اتنی مخالفت کے باوجود خدا تعالیٰ جو رحیم تھا اُس نے پھر موسیٰؑ کو لوگوں کی ہدایت کے لئے کھڑا کر دیا اور پھر اُن کی اُمت میں سینکڑوں انبیاء مبعوث کئے جن میں سے بعض قتل بھی کئے گئے۔ مگر لوگوں کی اتنی عداوت کے باوجود جب پھر تمام دنیا میں گمراہی پھیل گئی تو اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کی ہدایت کے لئے مبعوث فرما دیا۔

غرض اللہ تعالیٰ کے عزیز اور رحیم ہونے کا ہمیں ہر زمانہ میں ثبوت ملتا ہے۔ ہر زمانہ میں خدا اور اس کا رسول غالب رہے۔ جیسا کہ وہ قرآن کریم میں ایک دوسرے مقام پر فرماتا ہے کہ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِیْ (المجادلة: ۲۲) یعنی خدا تعالیٰ نے یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ میں اور میرے رسول ہمیشہ غالب رہیں گے۔ اور پھر ہر زمانہ میں اس کے رحیم

ہونے کا بھی ثبوت ملتا رہا یعنی باوجود اس کے کہ لوگوں نے اس کے پیاروں کی شدید مخالفت کی پھر بھی وہ بار بار لوگوں کی ہدایت کا سامان کرتا رہا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بیان فرما کر اللہ تعالیٰ نے اپنے عزیزؔ اور رحیمؔ ہونے کی صفات کا اس لئے ذکر کیا ہے کہ اس واقعہ نے ایک طرف تو خدا تعالیٰ کے عزیز ہونے کو ظاہر کر دیا اور باوجود اس کے کہ موسیٰ ؑ کی فرعون کے لاؤلشکر کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں تھی پھر بھی موسیٰ ؑ غالب آیا اور فرعون تباہ ہو گیا اور دوسری طرف اس واقعہ نے خدا تعالیٰ کے رحیم ہونے کو بھی ثابت کر دیا۔ کیونکہ باوجود اس کے کہ موسیٰ ؑ کی اتنی شدید مخالفت ہوئی پھر بھی خدا تعالیٰ نے اپنے رسولوں کا سلسلہ منقطع نہ کیا۔ بلکہ جب پھر اس کے بندے روحانی بھوک اور افلاس کا شکار ہوئے تو اُس نے اُن کی اصلاح کے لئے اپنے رسولوں کو کھڑا کر دیا۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ ﴿۷۰﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا

اور ان کو ابراہیم ؑ کا واقعہ پڑھ کر سُنا۔ جب کہ اُس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا تم کس چیز کی عبادت

تَعْبُدُوْنَ ﴿۷۱﴾ قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ ﴿۷۲﴾

کرتے ہو؟ انہوں نے کہا ہم بتوں کی پرستش کرتے ہیں۔ اور اُن کے آگے بیٹھے رہتے ہیں۔ اِس پر اُس (یعنی

قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ﴿۷۳﴾ اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ

ابراہیمؑ) نے کہا کہ کیا جب تم ان کو بلاتے ہو تو وہ تمہاری (اس) پکار کو سُنتے ہیں؟ یا تمہیں کوئی نفع پہنچاتے یا

يَضُرُّوْنَ ﴿۷۴﴾ قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَا اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۵﴾

ضرر دیتے ہیں؟ انہوں نے کہا۔ ایسا تو نہیں لیکن ہم اپنے بڑوں کو ایسا ہی کرتے دیکھتے آئے ہیں۔

حلّ لُغات۔ أَصْنَامٌ أَصْنَامٌ صَنَمٌ کی جمع ہے۔ اور صَنَمٌ کے معنے ہیں صُوْرَةٌ اَوْتِمْثَالُ اِنْسَانٍ اَوْحَيَوَانٍ يُتَّخَذُ لِلْعِبَادَةِ۔ انسان یا حیوان کا وہ مجسمہ جو عبادت کیلئے بنایا جاتا ہے۔ اَوْ كُلُّ مَا عُبِدَ مِنْ دُوْنِ اللهِ۔ یا اللہ تعالیٰ کے سوا جس کی عبادت کی جائے اس کو بھی صنم کہتے ہیں۔ (اقرب)

مفردات میں ہے۔ بَلْ كُلُّ مَا يَشْغِلُ عَنِ اللهِ تَعَالٰى يُقَالُ لَهٗ صَنَمٌ۔ ہر وہ بات جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے اور اس کے احکام کی تعمیل میں روک بنے وہ صنم کہلاتا ہے۔

عَاكِفِيْنَ عَاكِفِيْنَ عَكَفَ سے اسم فاعل مذکر کا صیغہ عَاكِفٌ آتا ہے۔ اور عَاكِفُوْنَ اور عَاكِفِيْنَ سے اسم جمع کا صیغہ ہے۔ عَكَفَ کے معنے ہیں۔ کسی کی عظمتِ شان کی وجہ سے اُس کی طرف متوجہ ہونا اور اس کے ساتھ رہنا (مفردات) پس عَاكِفٌ کے معنے ہوں گے۔ کسی کی عظمتِ شان کی وجہ سے اُس کے پاس بیٹھنے والا اور اُس کے پاس رہنے والا۔

تفسیر ۔فرماتا ہے۔ اب تو خدا تعالیٰ کے عزیزؔ اور رحیمؔ ہونے کے ثبوت میں ان کو ابراہیمؑ کا واقعہ سنا جس نے اپنی قوم کو توحید کی تعلیم دی اور بتوں کی پرستش سے اُسے روکا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک بُت پرست بلکہ بُت ساز گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اور چلڈیا کے ایک شہر اُور کسدیم کے رہنے والے تھے۔ ان کے خاندان کے لوگوں کا گزارہ ہی بتوں کے چڑھاووں اور بت فروشی پر تھا۔ والد بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ اور چچا کی آغوش میں انہوں نے پرورش پائی تھی جس نے اُن کے ہوش سنبھالتے ہی اپنے بیٹوں کے ساتھ آپ کو بھی بت فروشی کے کام پر لگا دیا حقیقت سے نا آشنا چچا کو یہ معلوم نہ تھا کہ جس دل کو خالق کون و مکاں چُن چکا ہے اُس میں بتوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوسکتی۔ پہلے ہی دن ایک امیر گاہک جو اپنی عمر کی انتہائی منزلیں طے کر رہا تھا اور تھا بھی مالدار بت خریدنے کے لئے آیا۔ بت فروش چچا کے بیٹے خوش ہوئے کہ آج اچھی قیمت پر سودا ہوگا۔ بوڑھے امیر نے ایک اچھا سا بت چُنا اور قیمت دینے ہی لگا تھا کہ اُس بچہ کی توجہ اس گاہک کی طرف ہوئی۔ اور اُس نے سوال کیا۔ میاں بوڑھے۔ تم قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہو۔ تم اِس چیز کو کیا کرو گے؟ اُس نے جواب دیا کہ گھر لے جاؤں گا اور ایک صاف اور مطہر جگہ میں رکھ کر اُس کی عبادت کروں گا۔ یہ سعید بچہ اس خیال پر اپنے جذبات کو نہ روک سکا۔ اور پوچھا۔ تمہاری عمر کیا ہوگی۔ اُس نے اپنی عمر بتائی اور اس بچہ نے نہایت حقارت آمیز ہنسی ہنس کر کہا کہ تم اتنے بڑے ہو اور یہ بت تو ابھی چند دن ہوئے میرے چچا نے بنوایا ہے کیا تمہیں اس کے سامنے سجدہ کرتے ہوئے شرم نہ آئے گی۔ نہ معلوم اس بوڑھے کے دل پر توحید کی کوئی چنگاری گری یا نہ گری لیکن اُس وقت اُس بت کا خریدنا اُس کے لئے مشکل ہو گیا۔ اور وہ بت وہیں پھینک کر واپس چلا گیا۔ اس طرح ایک اچھے گاہک کو ہاتھ سے جاتا دیکھ کر بھائی سخت ناراض ہوئے اور انہوں نے اپنے باپ تارہؔ کو اطلاع دی جس نے اس بچہ کی خوب خبر لی (Jewish Encyclopedia زیر لفظ Abraham)۔ یہ پہلی تکلیف تھی جو اس پاکباز ہستی نے توحید کے لئے اٹھائی مگر باوجود چھوٹی عمر اور کم سنی کے زمانہ کے یہ سزا جوشِ توحید کو سرد کرنے کی بجائے اُسے اور بھی بھڑکانے کا موجب ہوئی۔ سزا نے فکر کا دروازہ کھولا اور فکر نے عرفان کی کھڑکیاں کھول دیں۔ یہاں تک کہ بچپن کی

طبعی سعادت جوانی کا پختہ عقیدہ بن گئی ۔اور آخر اللہ تعالیٰ کا نور ذہنی نور پر گر کر الہام کی روشنی پیدا کرنے کا موجب ہوگیا۔اور خدا تعالیٰ نے آپ کو دنیا کی اصلاح کے لئے نبوت کے مقام پر سرفراز فرما دیا۔

چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تمام خاندان کا گزارہ ہی بتوں کی فروخت پر تھا اور تارؔہ خود بت پرست تھا جیسا کہ بائیبل کی کتاب یشوعؔ باب ۲۴ آیت ۲ سے ثابت ہوتا ہے اس لئے اُن کے چچا اور چچازاد بھائیوں نے ان کو مشورہ دیا کہ ہم پروہت ہیں اور ہمارا گزارہ ہی اس پر ہے ۔ اگر تم نے بتوں کی پرستش نہ کی تو ہمارا رزق بند ہوجائے گا۔مگر آپ نے نہایت دلیری سے جواب دیا کہ جن بتوں کو انسان اپنے ہاتھ سے گھڑتا ہے ان کو میں ہرگز سجدہ نہیں کرسکتا۔اس جواب کی اہمیت کا اندازہ ہر شخص نہیں کرسکتا صرف وہی کرسکتا ہے جسے قربانی کرنے کا موقع ملا ہو۔آج جب کہ منظم حکومتیں دنیا میں موجود ہیں اس پر امن زمانہ میں بھی میں نے دیکھا ہے کہ بعض لوگوں پر جب صداقت کھل جاتی ہے تو وہ مجھے لکھتے ہیں کہ اگر ہم احمدی ہوجائیں تو ہمارے گذارہ کی کیا صورت ہوگی ؟ ہمارے ساتھ ہمدردی کی کیا صورت ہوگی ؟ آج جب احمدیت کو قبول کرنے میں کوئی خاص تکالیف نہیں ہیں سوائے معمولی تکالیف کے ۔اچھے اچھے تعلیم یافتہ بڑی عمر کے اور بیوی بچوں والے یہ سوال کرتے ہیں کہ ہمارے ساتھ ہمدردی کی کیا صورت ہوگی گذارہ کا کیا انتظام ہوگا ؟ لیکن حضرت ابراہیمؑ جو یتیم ہونے کی وجہ سے پہلے ہی شکستہ دل تھے اور جن کا پہلے ہی کوئی ٹھکانہ نہ تھا اپنے چچا کے ہاں اور اس کی مہربانی سے پرورش پا رہے تھے وہ اپنے دل سے یہ سوال نہیں کرتے کہ اب گذارہ کی کیا صورت ہوگی ؟ بلکہ بلا سوچے بہادرانہ طور پر یہ جواب دیتے ہیں کہ جن بتوں کو انسان خود گھڑتے ہیں ان کو میں سجدہ نہیں کرسکتا۔ بعینہٖ اسی قسم کا واقعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی پیش آیا۔ جب ایک لمبے عرصہ تک آپؐ نے شرک کے خلاف تعلیم دی اور ایک لمبی کوشش کے بعد اہل مکہ آپؐ کو اور آپ کے صحابہؓ کو دوبارہ اپنے دین میں شامل کرلینے سے مایوس ہوگئے تو مکہ کے رؤساء آپؐ کے چچا ابو طالب کے پاس گئے اور کہا کہ آپ کی خاطر ہم اب تک آپ کے بھتیجے سے نرمی کرتے رہے ہیں مگر ہمارے سایہ کے نیچے رہتے ہوئے اس نوجوان نے ہمارے معبودوں کو بہت بری طرح ذلیل کیا ہے ہم اس پر سختی کرسکتے تھے مگر ہمیں آپ کا لحاظ تھا۔اس لئے ہم نے اس سے وہ سلوک نہ کیا جس کا وہ مستحق تھا۔مگر اب یہ بات ہمارے لئے ناقابل برداشت ہوگئی ہے اور ہم یہ آخری پیغام لے کر آپ کے پاس آئے ہیں کہ آپ اسے سمجھائیں ۔ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ اپنی تعلیم پیش نہ کرے بلکہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے معبودوں پر سختی سے حملہ نہ کرے اور تبلیغ میں نرمی کا پہلو رکھے اور اگر وہ آپ کے کہنے سے اتنا بھی کرنے کے لئے تیار نہ ہو تو آپ اس سے قطع تعلق کرلیں اور ہم پر اس کا معاملہ چھوڑ دیں ۔اور اگر آپ اس کے لئے

بھی تیار نہیں ہیں تو گو ہمارے دلوں میں آپ کا بہت ادب ہے اور آپ کے خاندان کو فضیلت حاصل ہے لیکن اب معاملہ اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ ہم صبر نہیں کر سکتے اور آپ سے بھی ہمیں مجبوراً قطع تعلّق کرنا پڑے گا۔ ابوطالب مومن نہ تھے اور ایمان کے بعد جو بہادری انسانی قلب میں پیدا ہو جاتی ہے اس سے محروم تھے۔ وہ رئیس تھے اور ان کے نزدیک سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ریاست سے ہاتھ دھو بیٹھنے کا خطرہ ان کے سامنے تھا۔ سارا مکّہ ان کو سلام کرتا تھا مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ساتھ نہ چھوڑنے کا یہ نتیجہ ہو سکتا تھا۔ کہ کوئی ان کو منہ بھی نہ لگاتا۔ اور یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اس قسم کی عزتوں کے لئے لوگ بڑی بڑی قربانیاں بھی کر دیتے ہیں اور ایک ایک سلام کے لئے مرا کرتے ہیں۔ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ سنایا کرتے تھے کہ جب آپ تعلیم سے فارغ ہو کر نئے نئے بھیرہ میں آئے تو بعض مولویوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ یہ وہابی ہیں اور بعض نے آپ کے خلاف کفر کے فتوے کی تحریک شروع کر دی۔ اس وقت اس علاقہ میں ایک معزز پیر صاحب تھے جن کا بھیرہ اور اس کے نواح میں بہت اثر تھا۔ فتویٰ کفر شائع کرنے والے ان کے پاس بھی گئے کہ دستخط کر دیں۔ باقی مولویوں سے تو حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کے دوست نہ ڈرتے تھے مگر ان پیر صاحب کے متعلق انہیں ضرور خیال تھا کہ اگر یہ بھی مولویوں کے ساتھ مل گئے تو فساد بڑھ جائے گا اس لئے آپ کے دوستوں میں سے ایک زیرک دوست پیر صاحب کے پاس پہنچے اور کہا۔ سنا ہے مولوی لوگ آپ سے فتویٰ لینے آئے تھے۔ پیر صاحب نے کہا کہ ہاں آئے تھے اور جو باتیں وہ کہتے تھے ٹھیک ہیں اور میرا ارادہ ہے کہ فتویٰ دے دوں۔ اس پر اس دوست نے کہا کہ آپ تو پیر ہیں اور سب نے آپ کو سلام کرنا ہے۔ نورالدین خواہ کچھ ہو۔ آپ کو سلام تو ضرور کرتا ہے اور اگر آپ نے فتویٰ دے دیا تو وہ اور ان کے دوست آئندہ آپ کو سلام نہیں کریں گے۔ اس پر پیر صاحب گھبرا گئے اور کہنے لگے۔ بھلا ہم پیروں کا فتووں سے کیا تعلق۔ آپ مولوی صاحب سے کہہ دیں کہ سلام نہ چھوڑیں۔ اس دوست نے آکر حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ سے کہا کہ میں اس طرح کر آیا ہوں اور اب پیر صاحب چاہیں گے کہ آپ ان کو سلام کریں۔ آپ نے فرمایا ہمارا کیا حرج ہے کر دیں گے۔ چنانچہ وہ دوست پھر پیر صاحب کے پاس گئے۔ اور پیر صاحب سے کہا کہ مولوی صاحب کہتے ہیں کہ پیر صاحب بڑے آدمی ہیں ہم ان کو سلام کیوں نہ کریں گے۔ اس پر پیر صاحب بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ اچھا ہم فلاں روز اس طرف سے گذریں گے۔ مولوی صاحب سے کہنا کہ ضرور سلام کریں۔ چنانچہ پیر صاحب مولوی صاحبؓ کے مطب کے سامنے سے گذرے اور حضرت مولوی صاحبؓ نے اپنے دوستوں سمیت باہر نکل کر ان کو سلام کیا۔ پیر صاحب نے گھوڑا کھڑا کر لیا اور حضرت مولوی صاحب سے باتیں کرنے

لگے کہ دیکھو ہمارے پاس مولوی لوگ فتویٰ کے لئے آئے تھے مگر ہم نے انکار کر دیا کہ ہم کو ان باتوں سے کیا تعلق ہے۔ ہمیں سب نے سلام کرنا ہوا۔ یہ واقعہ شہر میں پھیل گیا اور پیر صاحب کے مرید اس تحریک سے الگ ہو گئے اور مخالفت کا زور ٹوٹ گیا۔ غرض ابوطالب کے لئے یہ بڑا امتحان تھا۔ وہ سارے شہر میں مکرّم سمجھے جاتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب ان کی عزّت جاتی رہے گی۔ انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کو بلوایا اور کہا کہ اے میرے بھتیجے میں سمجھتا ہوں کہ تو جو کچھ کرتا ہے سچ سمجھ کر کرتا ہے اور میں نے بھی ہمیشہ تیری مدد کی ہے اور تجھے دشمنوں سے بچایا ہے مگر اب میری قوم کے لوگ میرے پاس آئے ہیں اور انہوں نے کہا ہے کہ یا تو اپنے بھتیجے سے کہو کہ تبلیغ میں نرمی کرے اور یا پھر اس سے قطع تعلق کر لو اور اگر میں ایسا نہ کروں تو قوم میرے ساتھ قطع تعلق کر لے گی اور تُو جانتا ہے کہ قوم کا مقابلہ مشکل ہوتا ہے۔ اب تو بتا تیری کیا رائے ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے جس وقت یہ بات سنی۔ آپؐ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور آپؐ نے فرمایا۔ اے میرے چچا۔ میرے دل میں آپ کا بڑا ادب ہے۔ مگر سچائی کے مقابلہ میں میں آپ کی بات ماننے کو تیار نہیں ہوں۔ اگر دشمن میرے دائیں طرف سورج اور بائیں طرف چاند لا کر کھڑا کر دیں تب بھی میں تبلیغ میں نرمی نہیں کروں گا۔ اور توحید کی اشاعت سے باز نہیں رہوں گا۔ میں آپ کے لئے ہر قربانی کرنے کو تیار ہوں لیکن یہ بات آپ کی نہیں مان سکتا۔ آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں اور اپنی قوم سے صلح کر لیں۔ میرے لئے اللہ تعالیٰ کافی ہے۔ اس پر باوجود اس کے کہ ابوطالب کے لئے قوم کا چھوڑنا مشکل تھا اس دلیرانہ جواب کو سن کر ان پر ایسا اثر ہوا کہ انہوں نے کہا کہ اگر قوم مجھے چھوڑتی ہے تو بیشک چھوڑ دے میں تجھے نہیں چھوڑوں گا (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام مباداۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قومہ وما کان منھم)۔ ابوطالب کے اس جواب کی اہمیت کا پورا اندازہ وہ لوگ نہیں لگا سکتے جو تاریخ سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ایک اور واقعہ کو نہیں جانتے جس سے ابوطالب کی قلبی کیفیت کا پتہ چلتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنی قوم سے کتنی محبت تھی۔ جب ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ان سے بہت ہی محبت تھی۔ ان کی قربانیوں اور حسن سلوک کی وجہ سے آپؐ کو اس بات سے سخت دکھ ہوا کہ آپ مسلمان ہوئے بغیر مر رہے ہیں۔ آپ کبھی ان کے دائیں جاتے اور کبھی بائیں اور کہتے کہ اے چچا اب موت کا وقت قریب ہے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کہہ دیجئے مگر ابوطالب خاموش رہے اور کچھ جواب نہ دیا۔ آخر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے بہت اصرار کیا۔ آپؐ پر رقّت طاری تھی۔ اور آپؐ بار بار کہتے تھے کہ اے چچا ایک دفعہ کلمہ پڑھ لیں تا کہ میں خدا کے حضور کہہ سکوں کہ آپ نے اسلام قبول کر لیا تھا لیکن ابوطالب نے آخر میں یہی جواب دیا کہ میں اپنی قوم کے

دین کونہیں چھوڑ سکتا (السیرة الحلبیة ذکر وفاة عمه ابی طالب و زوجته صلی اللہ علیه وسلم خدیجة)۔ گویا ان کو اپنی قوم سے اتنی محبت تھی کہ وہ اس کے بغیر جنت میں بھی جانا نہ چاہتے تھے۔ مگر اپنی قوم سے اس قدر محبت رکھنے والے شخص پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے بہادرانہ جواب کا یہ اثر ہوا کہ اس نے کہہ دیا کہ اچھا اگر قوم مجھے چھوڑتی ہے تو چھوڑ دے میں تم کونہیں چھوڑوں گا۔

جوزیفس مشہور یہودی مؤرخ پُرانی کتب سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ابراہیمؑ پہلے آدمی تھے جنہوں نے دلیری سے خدا کے خالق ہونے اور ایک ہونے کا اعلان کیا۔ اور کہا کہ سب ستارے خدا کے قبضہ میں ہیں اور اُسی کے حکم کے ماتحت حرکت کرتے ہیں۔ چونکہ اُن کی قوم ستارہ پرست تھی اُن کی ستارہ پرستی کی مخالفت نے چلڈ نیز کا غصہ بھڑکا دیا اور اُن کو اپنا ملک چھوڑ کر کنعان جانا پڑا۔ کہتے ہیں کہ جب آپ چودہ برس کے تھے تو ستاروں اور بتوں کی پرستش سے بچنے کے لئے آپ نے اپنے باپ کو چھوڑ دیا اور خدا سے دُعا کی کہ وہ اُن کو انسانوں کی غلطیوں سے بچائے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے زراعت کے بعض عمدہ طریق ایجاد کئے اور انہوں نے اپنے باپ تارہ کو توحید کی تعلیم دی مگر وہ لوگوں سے ڈرتا تھا اور اُس نے ان کو خاموش رہنے کو کہا۔ جب حضرت ابراہیمؑ کے بھائی بھی اُن کے مخالف ہو گئے تو انہوں نے بت خانہ کو آگ لگا دی اور اُن کے بچانے کی کوشش میں اُن کا بھائی ہاران جل مرا (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لکڑی کے بت تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے تلوار سے اُن کو کاٹ دیا تھا) لکھا ہے کہ نئے سال کے چاند کو ایک دفعہ دیکھ رہے تھے تا کہ آئندہ سال کی فراخی کو معلوم کریں کہ ان کو الہام ہوا کہ خدا کی مرضی کے مقابلہ میں ستاروں کا اثر کیا حقیقت رکھتا ہے۔ آخر بہت دُعاؤں کے بعد آپ نے اپنی قوم کو چھوڑ دیا۔ تا کہ اعلیٰ صداقتوں کو دنیا میں قائم کریں۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ تین سال کی عمر میں ان کو سچا علم ملا۔ بعض میں دس اور بعض میں چالیس لکھا ہے۔ فلسطینی ربّیوں کے لٹریچر میں آپ کے متعلق بہت سی تفاصیل دی گئی ہیں اور آپ کے زمانہ کے بادشاہ کا نام نمرودؔ بتایا گیا ہے اور چاند ستاروں کا واقعہ یوں لکھا ہے کہ تارہؔ نے نمرودؔ سے ڈر کر جو اُن کے بیٹے کو مارنا چاہتا تھا (کیونکہ نجومیوں نے اُسے بتایا تھا کہ ایک بچہ پیدا ہوا ہے جو تیری حکومت کو تباہ کر دے گا) تین سال تک حضرت ابراہیمؑ کو چھپائے رکھا۔ جب وہ بھورے سے باہر نکلے تو سورج کو دیکھ کر انہوں نے خدا سمجھا۔ جب سورج ڈوبا تو چاند کو خدا اور ستاروں کو اس کا نوکر سمجھا۔ جب صبح ہوئی تو دونوں سے انکار کر کے کہا کہ خدا کوئی اور ہوگا۔ اس پر ابراہیمؑ نے باپ سے پوچھا۔ آسمان وزمین کس نے پیدا کئے ہیں۔ اُس نے جواب میں کہا کہ یہ بت جو سامنے ہے یہ ہمارا

خدا ہے۔ ابراہیمؑ نے کہا کہ میں اسے نذر چڑھاؤں گا۔ اور عمدہ کھانا پکوا کر اس کو دیا اُس نے نہ کھایا تو اور اچھا کھانا پکوا کر سامنے رکھا جب پھر بھی اس نے نہ کھایا اور نہ کوئی جواب دیا تو آگ سے اس کو اور دوسرے بتوں کو جلا دیا جب تارؔہ واپس آیا تو اُس نے پوچھا۔ ان کو کس نے جلایا ہے۔ انہوں نے کہا۔ بڑا چھوٹوں پر ناراض ہو گیا۔ اور غصہ میں اُس نے ان کو جلا دیا۔ باپ نے کہا۔ بیوقوف جو نہ سنے نہ دیکھے نہ چل سکے۔ وہ یہ کام کس طرح کر سکتا تھا۔ انہوں نے کہا۔ پھر تم زندہ خدا کو چھوڑ کر اِن کے پیچھے کیوں چل پڑے ہو۔ ایک دن ایک عورت کھانے کی کوئی چیز نذر لائی۔ ابراہیمؑ نے کہا۔ اِن کے منہ ہیں پر بولتے نہیں۔ آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں۔ کان ہیں مگر سنتے نہیں۔ ہاتھ ہیں مگر پکڑ نہیں سکتے۔ اِن کے بنانے والوں اور ان پر اعتبار کرنے والوں کا بھی یہی حال ہو۔ یہ کہہ کر آپ نے بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اور پھر انہیں جلا دیا۔ اِس پر آپ نمرودؔ کے سامنے پیش کئے گئے۔ اُس نے ان کو کہا کہ کیا تو نہیں جانتا کہ میں خدا اور دنیا کا حاکم ہوں۔ آپ نے جواب دیا۔ اگر تو خدا اور دنیا کا حاکم ہے تو کیوں سورج کو مغرب سے نکال کر مشرق کی طرف نہیں چڑھاتا۔ اگر تو خدا اور دنیا کا حاکم ہے تو بتا میرے دل میں اس وقت کیا ہے اور میرا آئندہ کیا حال ہوگا؟ نمرود کی زبان بند ہو گئی اور وہ حیران رہ گیا۔ اور ابراہیمؑ نے اپنی بات کو جاری رکھا اور کہا کہ تُو کونسؔ کا بیٹا ہے اور اُسی کی طرح ایک فانی وجود ہے تو اپنے باپ کو موت سے نہیں بچا سکا۔ اور نہ تُو خود اس سے بچ سکتا ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ نمرودؔ نے کہا۔ آگ کو پوج۔ ابراہیمؑ نے کہا۔ پانی کو کیوں نہیں وہ تو اُسے بجھا دیتا ہے۔ اُس نے کہا۔ بہتر اُسی کو سہی۔ انہوں نے کہا۔ بادلوں کو کیوں نہیں جو پانی سے پُر ہوتے ہیں۔ اُس نے کہا۔ اُنہی کو سہی۔ انہوں نے کہا۔ ہوا ان کو بھی اڑا دیتی ہے اُس نے کہا اُس کو پوج۔ انہوں نے کہا۔ انسان اس کے صدمہ سے بھی بچ جاتا ہے اور مکانوں کے پیچھے چھپ جاتا ہے۔ اس نے کہا پھر میں انسانوں کا بادشاہ ہوں۔ مجھے پوج۔ انہوں نے کہا۔ اگر تو خدا ہے تو پھر سورج کو مغرب کی طرف سے نکال کر دکھا۔ اس پر نمرودؔ نے ابراہیمؑ کے جلانے کا حکم دے دیا۔ ایک لکڑیوں کا انبار پانچ گز مربع جمع کیا گیا اور اُس کو آگ لگائی گئی اور ابراہیمؑ کو اُس میں ڈالا گیا۔ اِسی کی طرف پیدائش باب ۱۵ آیت ۷ میں اشارہ ہے۔ بعض نسخوں میں اس جگہ لکھا ہے کہ ’’تجھے کسدیوں کی آگ سے نکال لایا۔‘‘

(جیوش انسائیکلو پیڈیا زیر لفظ Abraham)

چیلڈ نیز میں سورج کی پرستش خاص طور پر کی جاتی تھی (نیلسن انسائیکلو پیڈیا بابلونیا) چیلڈ نیز کا خدا Menodack نامی تھا جو سورج کی شعاع یا دن کی روشنی سمجھا جاتا تھا۔ اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ بنی نوع انسان کو نفع پہنچاتا ہے۔ اس کا نام بعل یعنی آقا بھی تھا۔ اِس کے علاوہ اُن کا ایک بت شمسؔ تھا یعنی سورج دیوتا۔ ایک سینؔ تھا یعنی چاند دیوتا۔

ایک نبو یعنی نبی دیوتا یا معلم تھا۔ (نیلسنز انسائیکلو پیڈیا ببلونیا کے ماتحت)

اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے انہی واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے کہ اگر موسیٰؑ اور فرعون کے واقعات سے بھی یہ لوگ کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے تو پھر تو ان کے سامنے ابراہیمؑ کے واقعات بیان کر کیونکہ ابراہیمؑ وہ نبی ہے جس کی عزت مکہ والوں کے قلوب میں جاگزیں ہے۔ اور خصوصیت کے ساتھ ان کے سامنے وہ واقعہ بیان کر جبکہ اُس نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے کہا کہ تم کس چیز کی عبادت کرتے ہو؟ چونکہ ان کی قوم نے سورج اور چاند اور ستاروں کے نام پر کئی قسم کے بت بنائے ہوئے تھے جن کی وہ پرستش کرتے تھے۔ اس لئے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ سوال کیا تو انہوں نے کہا کہ ہم تو بت پوجتے ہیں۔ اور سارا دن اُن کے سامنے بیٹھے رہتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا۔ اچھا جب تم ان کو پکارتے ہو تو کیا اُن کی طرف سے کوئی جواب بھی ملتا ہے جس سے پتہ لگے کہ انہوں نے تمہاری دعائیں سن لی ہیں یا نفع اور ضرر کی شکل میں کوئی نتیجہ بھی نکلتا ہے؟ یعنی اگر وہ واقعہ میں اپنے اندر خدائی طاقتیں رکھتے ہیں تو جس طرح خدا تعالیٰ لوگوں کی دعائیں سنتا ہے اسی طرح ان بتوں کو بھی تمہاری دعائیں سننی چاہئیں۔ اور جس طرح خدا اپنے بندوں کو ہر قسم کی تکالیف سے بچاتا اور اُن کے لئے رحمت اور برکت کے سامان پیدا کرتا ہے اسی طرح ان بتوں کے اندر بھی یہ طاقت ہونی چاہیے کہ وہ اپنے ماننے والوں کو فائدہ پہنچائیں اور جو لوگ ان کا انکار کریں انہیں تباہ کر دیں۔ مگر کیا یہ بت ایسا کر سکتے ہیں؟ کیا یہ تمہاری باتوں کا جواب دیتے ہیں؟ یا کیا ان میں طاقت ہے کہ وہ تمہاری کسی تکلیف کو دور کر سکیں یا تمہیں کوئی نفع پہنچا سکیں۔ اگر ان میں کوئی بات بھی نہیں پائی جاتی تو پھر تم ایسے بتوں کی پرستش کر رہے ہو جو نہ سنتے ہیں نہ بولتے ہیں اور نہ نفع اور ضرر کی اپنے اندر کوئی طاقت رکھتے ہیں۔ یہ دلیل ایسی زبردست ہے کہ ایک صحابیؓ کہتے ہیں۔ مجھے اسلام قبول کرنے کی تحریک صرف اس لئے ہوئی کہ میں ایک دفعہ سفر پر گیا تو عرب کے دستور کے مطابق میں نے پتھر کا ایک چھوٹا سا بت اپنے ساتھ رکھ لیا تا کہ وہ ضرورت کے وقت کام آئے۔ ایک دفعہ جب کہ میں ایک جنگل میں سے گزر رہا تھا مجھے کوئی ضروری کام پیش آ گیا۔ میں نے اپنا اسباب وہیں رکھا اور بت کو پاس بٹھا کر کہا کہ حضور میں تھوڑی دیر کے لئے باہر جا رہا ہوں آپ مہربانی فرما کر میرے سامان کی حفاظت کریں۔ جب میں واپس آیا تو ایک گیدڑ ٹانگ اٹھا کر اُس بت پر پیشاب کر رہا تھا یہ دیکھ کر میرے دل میں ایک آگ لگ گئی اور میں نے کہا کہ جو بت گیدڑ کے پیشاب سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکا اُس نے میرے اسباب کی کیا حفاظت کرنی ہے چنانچہ میں نے اُس بت کو وہیں پھینکا اور واپس آ کر مسلمان ہو گیا۔

اِسی طرح ایک اور صحابیؓ کہتے ہیں کہ مجھے توحید کی اس طرح سمجھ آئی کہ میں ایک دفعہ سفر پر گیا تو میں نے اپنے ساتھ آٹے کا ایک بت بنا کر رکھ لیا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ راستہ میں ہمارا آٹا ختم ہو گیا اور بھوک نے ہمیں بے قرار کر دیا۔ ہم نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح کوئی اور چیز مل جائے تو ہم گذارہ کر سکیں مگر ہمیں کوئی چیز نہ ملی جب بھوک نے ہمیں سخت تنگ کیا تو ہم نے اسی بت کو کوٹ کاٹ کر آٹا گوندھ لیا اور روٹی پکا کر کھا گئے۔ جب ہم خوب سیر ہو چکے تو مجھے اپنے آپ پر ہنسی آئی کہ میں بھی کیسا احمق ہوں کہ جس وجود کو میں کوٹ کاٹ کر ہضم بھی کر گیا اس کو میں اپنا خدا اور حاجت روا سمجھتا رہا ہوں۔ چنانچہ اس کا ردّ عمل یہ ہوا کہ سفر سے واپس آتے ہی میں مسلمان ہو گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بتوں کے اسی عجز اور بے چارگی کی طرف توجہ دلائی اور ان سے پوچھا کہ بتاؤ۔ کیا یہ تمہیں کوئی نفع دیتے ہیں یا تمہارے دشمنوں کو ضرر پہنچا سکتے ہیں؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم نے شرمندہ ہو کر کہا کہ نتیجہ تو کچھ نہیں نکلتا۔ لیکن ہم نے اپنے باپ دادوں کو دیکھا ہے کہ وہ ایسا ہی کرتے تھے۔ اس لئے ہم نے بھی بتوں کی پرستش شروع کر دی۔ ان کا یہ جواب بالکل ایسا ہی تھا جیسے حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ ایک لطیفہ سنایا کرتے تھے کہ ایک بادشاہ کے دربار میں صفائی کرنے کے لئے ایک خاکروبہ اور ایک خاکروب آیا کرتا تھا۔ اس خاکروب اور خاکروبہ نے سؤر پال رکھے تھے۔ اتفاقاً سؤر کا ایک بچہ مر گیا۔ پالے ہوئے جانور سے بھی انسان کو محبت ہو جاتی ہے چاہے وہ سؤر ہی ہو یا کوئی اور جانور۔ ان کے لئے سؤر کا بچہ ایسا ہی تھا جیسے ہمارے لئے گھوڑا یا کوئی اور جانور۔ دربار کی صفائی کرتے ہوئے خاکروبہ کو اس سؤر کے بچے کا خیال آ گیا اور وہ دربار کی ایک دیوار کے ساتھ اپنا سر رکھ کر رونے لگ گئی۔ اتنے میں دربار کا ایک چپڑاسی آیا اور اس نے خاکروبہ کو روتے دیکھ کر یہ خیال کیا کہ خدانخواستہ اندر کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔ مجھے پتہ نہیں لگا۔ اگر کسی نے مجھے دیکھ لیا کہ میں رو نہیں رہا تو مجھ پر بے وفائی کا شبہ کر لیا جائے گا اس لئے وہ بھی رونے لگ گیا۔ پھر ایک چوبدار آیا۔ اُس نے جو دیکھا کہ یہ دونوں رو رہے ہیں تو سمجھا کہ ضرور کوئی واقعہ ہوا ہے جس کا مجھے پتا نہیں لگا۔ اگر کوئی شخص آ گیا اور اس نے دیکھ لیا کہ میں رو نہیں رہا تو وہ خیال کرے گا کہ مجھے بادشاہ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ خیال کر کے وہ بھی مصنوعی طور پر رونے لگ گیا پھر کلرک آئے انہوں نے بھی ان لوگوں کو دیکھ کر رونا شروع کر دیا۔ پھر چھوٹے افسر آئے۔ درباری آئے۔ وزراء آئے۔ انہوں نے خیال کیا کہ ہمارا تو کام تھا کہ ہم ہر وقت خبر رکھیں لیکن ہمیں اس حادثہ کا کوئی علم نہیں ہوا۔ ضرور کوئی بات ہوئی ہے جس کی وجہ سے یہ لوگ رو رہے ہیں۔ اگر ہم نہ روئے تو ہم پر بے وفائی کا شبہ کر لیا جائے گا۔ یہ خیال کر کے وہ بھی رونے لگ پڑے۔ اور بڑے آدمیوں نے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے آنکھوں پر رومال رکھ کر رونا شروع کر دیا۔ اتنے میں ایک بڑا وزیر آیا وہ کچھ عقلمند

تھا وہ رویا نہیں۔ اُس نے پاس والے وزیر سے دریافت کیا کہ کیا بات ہوئی ہے۔ اُس نے کہا مجھے تو معلوم نہیں میرے پاس والے وزیر رورہے تھے اس لئے میں بھی رونے لگ گیا۔ اُس نے کہا۔ اُس سے پوچھو کیا بات ہے۔ جب اُس سے پوچھا گیا۔ تو اُس نے کہا۔ مجھے تو علم نہیں۔ میرے ساتھ والا وزیر رورہا تھا آخر بات خاکروبہ تک پہنچی۔ اس سے دریافت کیا گیا تو اُس نے بتایا کہ میرا سؤر کا بچہ مرگیا تھا۔ مجھے وہ یاد آ گیا تو میں نے رونا شروع کردیا۔ جس طرح ایک خاکروبہ کو روتے دیکھ کر سارا دربار رونے لگ گیا تھا حالانکہ بات کچھ بھی نہیں تھی اِسی طرح انہوں نے کہا کہ ہم نے تو اپنے باپ دادا کو دیکھا تھا کہ وہ اِن بتوں کی پرستش کرتے ہیں۔ جب ہم نے دیکھا کہ وہ اِن بتوں کے آگے ہاتھ جوڑتے اور سجدے کرتے ہیں تو ہم بھی ہاتھ جوڑنے اور سجدہ کرنے لگ گئے۔

قَالَ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ۙ﴿۷۶﴾ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ

اُس نے کہا کہ کیا تم کو معلوم ہے کہ جن کی تم عبادت کرتے چلے آئے ہو۔ تم بھی اور تمہارے

الْاَقْدَمُوْنَ ﴿۷۷﴾ؗ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ﴿۷۸﴾

پُرانے باپ دادے بھی۔ وہ سب کے سب ربّ العالمین کے سوا میری تباہی چاہتے ہیں۔ جس (ربّ العالمین)

الَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ ۙ﴿۷۹﴾ وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَ

نے مجھے پیدا کیا ہے اور (اس کے نتیجہ میں) وہ مجھے ہدایت بھی دے گا۔ اور جس کی صفت یہ ہے کہ

يَسْقِيْنِ ۙ﴿۸۰﴾ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ﴿۸۱﴾ؕ وَالَّذِيْ يُمِيْتُنِيْ

وہی مجھے کھانا کھلاتا اور وہی مجھے پانی پلاتا ہے۔ اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہ شفا دیتا ہے۔

ثُمَّ يُحْيِيْنِ ۙ﴿۸۲﴾ وَالَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓـَٔتِيْ

اور جو مجھے مارے گا اور پھر زندہ کرے گا۔ اور وہ ایسا ہے کہ میں اُمید کرتا ہوں کہ وہ میرے گناہ

یَوۡمَ الدِّیۡنِ ﴿۸۳﴾ؕ

جزا سزا کے وقت مجھے معاف کر دے گا۔

حلّ لُغَات۔اَلدِّیۡنُ اَلدِّیۡنُ کے معنے ہیں اَلْجَزَاءُ وَالْمُکَافَأَۃُ۔ بدلہ۔ اَلْحِسَابُ۔ محاسبہ۔ اَلْقَضَاءُ۔ فیصلہ۔ (اقرب)

تفسیر ۔حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں جواب دیا کہ تم مجھے اِن معبودوں کی حالت تو بتاؤ جن کی تم پرستش کرتے چلے آئے ہو۔ یعنی تم بھی اور تمہارے پہلے باپ دادا بھی۔ تمہارے یہ سب معبود میرے دشمن ہیں سوائے ربّ العالمین خدا کے جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ اگر یہ بُت اپنے اندر کوئی طاقت رکھتے۔ تو کیا یہ سب مل کر مجھ اکیلے پر غالب نہ آ جاتے اور مجھے تباہ و برباد نہ کر دیتے؟ اس جگہ عَدُوٌّ مفرد استعمال ہوا ہے جو ھُمۡ کی خبر کے طور پر آیا ہے۔ حالانکہ چاہیے تھا کہ اَعۡدَاءٌ کا لفظ استعمال کیا جاتا جو جمع ہے۔ سو اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیے کہ یہ عربی زبان کا محاورہ ہے کہ کبھی مبتداء کو جمع اور خبر کو مفرد لے آتے ہیں۔ چنانچہ اس سورۃ کے شروع میں ہی آتا ہے کہ فَقُوۡلَاۤ اِنَّا رَسُوۡلُ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۔یعنی اے موسیٰؑ اور ہارونؑ! فرعون سے کہنا کہ ہم دونوں اپنے ربّ کے رسول ہیں حالانکہ موسیٰؑ اور ہارونؑ دو نبی تھے۔ اور بظاہر اِنَّا رَسُوۡلُ رَبِّکَ کی بجائے اِنَّا رَسُوۡلَا رَبِّکَ کہنا چاہیے تھا۔ مگر وہاں رَسُوۡلَا رَبِّکَ کی بجائے اِنَّا رَسُوۡلُ رَبِّکَ اسی لئے کہا گیا ہے کہ عربی زبان میں یہ طریقِ کلام رائج ہے۔ چنانچہ عربی میں کہتے ہیں۔ ھٰذَانِ رَسُوۡلِیۡ وَوَکِیۡلِیۡ وَھٰؤُلَآءِ رَسُوۡلِیۡ وَوَکِیۡلِیۡ (فتح البیان زیر آیت فَأْتِیَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَا.....) یعنی یہ دونوں میرے رسول اور وکیل ہیں اور یہ سب میرے رسول اور وکیل ہیں حالانکہ ھٰذَانِ کے بعد رَسُوۡلَایَ آنا چاہیے تھا یعنی یہ دونوں میرے رسول ہیں اور ھٰؤُلَآءِ کے بعد رُسُلِیۡ آنا چاہیے تھا۔ کہ یہ سب میرے رسول ہیں۔ مگر تثنیہ کی خبر میں بھی واحد کا صیغہ استعمال کیا گیا اور جمع کی خبر میں بھی واحد کا صیغہ استعمال کیا گیا۔ پس یہ ایک مروّجہ عربی کا طریق ہے جس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔

فَاِنَّھُمۡ عَدُوٌّ لِّیۡۤ اِلَّا رَبَّ الۡعٰلَمِیۡنَ کے متعلق بعض لوگ سوال کیا کرتے ہیں کہ یہاں پتھر کے بے جان بُتوں کو دشمن کیوں کہا گیا ہے۔ مفسرین نے اس سوال کا یہ جواب دیا ہے کہ یہاں قلب نسبت سے کام لیا گیا ہے۔ یعنی جس طرح ہماری زبان میں یہ کہا جاتا ہے کہ پرنالہ چلتا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ پرنالہ نہیں چلتا بلکہ پانی چلتا ہے اسی طرح یہاں کہا تو یہ گیا ہے کہ وہ میرے دشمن ہیں لیکن مراد یہ ہے کہ میں اِن کا دشمن ہوں۔ چنانچہ فرّاء نے

یہی معنے کئے ہیں اوران الفاظ کومقلوب قرار دیا ہے۔لیکن میرے نزدیک اس جگہ مخالفوں کے عقیدہ پر تعریض کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ تم توسمجھتے ہو کہ وہ معبود ہیں مگر میں ان کی عبادت نہیں کرتا اِس لئے لازماً وہ میرے دشمن ہوں گے سوائے ربّ العالمین خدا کے جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ پس اب ہم دیکھ لیں گے کہ ربّ العالمین خدا میری مدد کر کے مجھے بچاتا ہے یا تمہارے معبود میری دشمنی کر کے مجھے ہلاک کرتے ہیں۔ اگر ان بتوں میں بھی کوئی طاقت ہے تو چاہیے کہ یہ مجھے ہلاک کردیں۔لیکن وہ ایسا کبھی نہیں کر سکتے۔ جواس بات کا ثبوت ہے کہ یہ بالکل بے بس ہیں اوران میں کوئی طاقت نہیں۔ چنانچہ نتیجہ نے بتادیا کہ ربّ العالمین خدا نے ابراہیمؑ کو بچالیا اوراُس کی قوم کے معبود اُس کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکے۔ اِسی طرح اس پیشگوئی کا یہ نتیجہ نکلا کہ یہودی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ماننے والے تھے وہ کامیاب ہوگئے اوراُن کے دشمن تباہ ہوگئے۔

پھر ربّ العالمین کے الفاظ استعمال فرما کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ میں جس خدا پر ایمان رکھتا ہوں وہ ایک زندہ اور طاقتور خدا ہے مگر تمہارے معبودوں میں تو جان ہی نہیں انہوں نے کسی کی مدد کیا کرنی ہے؟ بے شک ربّ العالمین کے معنوں میں یہ بھی داخل ہے کہ ہمارا خدا انسانوں کا بھی خدا ہے اور جانوروں کا بھی خدا ہے اور کیڑوں مکوڑوں کا بھی خدا ہے اسی طرح وہ عربوں کا بھی خدا ہے اور ایرانیوں کا بھی خدا ہے اور ہندوستانیوں کا بھی خدا ہے۔لیکن ربّ العالمین میں جن جہانوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ زمانہ کے لحاظ سے بھی ہو سکتے ہیں۔ پس اس کے ایک معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ میں جس خدا کو پیش کرتا ہوں وہ ایک زندہ خدا ہے۔ وہ آدمؑ کے زمانہ کے لوگوں کا بھی خدا تھا۔ وہ نوحؑ کے زمانہ کے لوگوں کا بھی خدا تھا اور وہ میرے زمانہ کے لوگوں کا بھی خدا ہے اور بعد میں آنے والوں کا بھی خدا ہوگا۔ اور جو خدا آدم علیہ السلام کے زمانہ کے لوگوں کا بھی خدا تھا اور نوح علیہ السلام کے زمانہ کے لوگوں کا بھی خدا تھا اور ہمارے زمانہ کے لوگوں کا بھی خدا ہے اور بعد میں آنے والے لوگوں کا بھی خدا ہوگا۔صاف ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک زندہ خدا ہے اگر وہ زندہ خدا نہ ہوتا تو ہر زمانہ کے لوگوں کا کس طرح خدا ہوسکتا۔ پس رب العالمین کہہ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس طرف بھی توجہ دلائی کہ میرا خدا ایک زندہ خدا ہے جس سے ہر زمانہ کے لوگ ویسا ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں جیسے پہلے لوگ فائدہ اٹھاتے رہے ہیں مگر تمہارے بت نہ پہلے لوگوں کو کوئی فائدہ پہنچا سکے اور نہ تمہیں کوئی فائدہ پہنچا رہے ہیں۔تم اپنے سارے معبودوں کو میری تباہی کے لئے اکٹھا کرلو اوران کے آگے رو رو کر دعائیں کرو۔ پھر دیکھو کہ میرا رب العالمین خدا جیتتا ہے یا تمہارے بت فتح حاصل کرتے ہیں۔ گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بتایا کہ جس طرح ایک چھوٹا بچہ جب اکیلا گلی میں سے گزر رہا ہوتا ہے اور گلی

کے اوباش اور شریر لڑکے اُس کو دق کرنے کے لئے اُس پر حملہ کرتے ہیں تو اُن کی آواز سن کر اُس لڑکے کی ماں بیتاب ہو کر اپنے گھر سے باہر نکل آتی ہے اسی طرح میرا رب العالمین خدا میرے ساتھ ہے۔تم میری کتنی بھی مخالفت کرو اور مجھے کچلنے کے لئے خواہ انتہائی طاقت صرف کردو یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ میرا خدا مجھے چھوڑ دے اور تمہارے بت خدائے واحد پر غالب آجائیں۔ دنیا کے بڑے سے بڑے بادشاہ۔ دنیا کے بڑے سے بڑے مدبّر۔ دنیا کے بڑے سے بڑے لیڈر انسانی امداد پر بھروسہ کرتے ہیں۔اُن کی تکلیفوں کے وقت کچھ انسان آگے آتے ہیں جو بعض دفعہ کامیاب ہوتے ہیں اور بعض دفعہ ناکام۔مگر جب کسی مومن کو تکلیف دی جاتی ہے تو خدائے واحد خود آسمان سے اتر آتا ہے اور وہ لڑنے والوں کے سامنے سینہ سپر ہوجاتا ہے۔اور یہ ایک بہترین انعام ہے جو کسی قوم یا فرد کو حاصل ہوسکتا ہے یہی انعام ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی جماعت کو حاصل ہوا۔یہی انعام ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کی جماعت کو حاصل ہوا۔یہی انعام ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی جماعت کو حاصل ہوا۔اور یہی انعام ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کی جماعت کو حاصل ہوا کہ ایک زندہ خدا اور طاقتور خدا ان کے ساتھ تھا۔اور جب بھی دشمن حملہ آور ہوتا تھا خدا آسمان سے اتر کر اُن کے ساتھ کھڑا ہوجاتا تھا اور وہ ان کے لئے بڑے بڑے نشانات ظاہر کرتا تھا اور اس کا یہ پیار اتنی قیمتی چیز تھا کہ اگر جائز ہوتا تو انسان تمنا کرتا کہ لوگ میری اور بھی دشمنی کریں تاکہ میرے خدا کی محبت میرے لئے اور زیادہ جوش مارے مگر اسلام نے ایسی خواہش سے منع کردیا ہے چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لَا تَتَمَنَّوْا لِقَآءَ الْعَدُوِّ (بخاری کتاب التمنی باب کراھیة تمنی لقاء العدو) اے مومنو! تم کبھی دشمن کے حملہ کی تمنا نہ کرو۔آخر ہمیں سوچنا چاہیے کہ اس فقرہ کے معنے کیا ہیں؟ کون ہے جو دشمن کے حملہ کی تمنا کیا کرتا ہے۔ظاہر ہے کہ جہاں تک لڑائی کا تعلق ہے۔ جہاں تک مرنے کا تعلق ہے جہاں تک تکالیف کا تعلق ہے کوئی شخص بھی دشمن کے حملہ کی تمنا نہیں کرسکتا۔مگر مسلمان ایسی حالت میں تھے کہ ان کے دل اسی نکتہ کے ماتحت جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے بعض دفعہ خواہش کرسکتے تھے کہ کاش ہمارا دشمن ہم پر حملہ کرے تاکہ ہمارا خدا پھر ہماری مدد کے لئے ہمارے پاس آجائے۔پس صرف یہی وجہ تھی جس کو مدنظر رکھتے ہوئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے مسلمانو! جب دشمن تم پر حملہ کرتا ہے تو خدا تمہارے ساتھ کھڑا ہوجاتا ہے اور یہ بات تمہیں اتنی لذیذ معلوم ہوتی ہے اور تمہیں اس میں اتنا مزا آتا ہے کہ جب دشمن حملہ چھوڑ دیتا ہے تو تم کہتے ہو۔کاش ہمارا دشمن ہم پر پھر حملہ کرے۔تا ہمارا خدا پھر ہمارے پاس آجائے۔مگر یہ خواہش جہاں تک عشق کا سوال ہے وہاں تک تو درست ہے لیکن الٰہی حکمتوں اور منشاء کے خلاف ہے اس لئے خدا تعالیٰ کے ادب کے لحاظ سے

ایسی خواہشات مت کیا کرو ہاں جب دشمن تم پر خود بخود حملہ کر دے گا اور تمہارا خدا تعالیٰ سے سچا تعلق ہوگا تو یہ ممکن ہی نہیں کہ خدا تعالیٰ تمہیں چھوڑ دے کیونکہ خدا تعالیٰ کی یہ دائمی سنت ہے کہ وہ اپنے رسولوں کی بھی مدد کرتا ہے اور ان لوگوں کی تائید کے لئے بھی اپنے نشانات دکھاتا ہے جو اُن رسولوں پر ایمان لاتے ہیں۔ پس فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی اسی سنت قدیم کی طرف اشارہ کیا ہے اور فرمایا ہے کہ تمہارے یہ سب بت جن کے سامنے تم اپنی ناکیں رگڑتے ہو میرے دشمن ہیں اگر ان میں کوئی طاقت ہے تو میرے رب العالمین خدا کے مقابلہ میں جو ایک زندہ اور طاقتور خدا ہے مجھے نقصان پہنچا کر دکھائیں۔ یقیناً تمہارے بت ناکام رہیں گے اور میرا رب العالمین خدا ہمیشہ میرا ساتھ دے گا۔

اسی طرح رب العالمین کے الفاظ میں یہ پیشگوئی بھی مخفی تھی کہ یہ دین آخر ایک عالمگیر صورت اختیار کر لے گا۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا نبی مبعوث ہوگا جو ساری دنیا کی طرف ہوگا اور جس کی فیض رسانی کے دائرہ سے کوئی متنفس بھی باہر نہیں رہے گا۔

پھر فرماتے ہیں۔ اَلَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ رب العالمین خدا وہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور اُس کے نتیجہ میں لازماً وہ تمام خطرات اور حوادث سے بچاتے ہوئے مجھے منزل مقصود پر پہنچائے گا۔ اور مجھے اپنے مقصد میں کامیاب کرے گا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ مجھے پیدا کرے اور ایک مقصدِ عظیم کے لئے کھڑا کرے اور پھر اپنی محبت کا ہاتھ پیچھے ہٹا لے اور مجھے حوادث کا شکار ہونے دے۔ اس کی صفت خلق اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ کامیابی بھی اسی کی طرف سے آئے کیونکہ جو ہستی اپنے معرضِ وجود میں آنے کے لئے دوسرے کی محتاج ہے وہ ترقی کے وسائل اور ذرائع بھی خود بخود مہیا نہیں کر سکتی بلکہ اس کے لئے بھی وہ اپنے خالق کی ہی محتاج ہوگی۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے۔ جیسے میں اگر کوئی مکان بناؤں تو جب تک میں اس میں دروازے نہ لگاؤں۔ جب تک میں اس میں کھڑکیاں نہ رکھوں۔ جب تک میں اس میں طاقچے اور رروشندان نہ بناؤں اُس وقت تک اس مکان میں نہ دروازہ لگ سکتا ہے نہ کھڑکی لگ سکتی ہے نہ طاقچہ اور روشندان بن سکتا ہے۔ کیونکہ وہ میرا مکان ہے اور میں نے ہی اُسے بنایا ہے۔ اسی طرح جب انسان کو رب العالمین خدا نے پیدا کیا ہے تو رب العالمین خدا ہی جب تک اس کی مادی اور روحانی ترقی کے سامان مہیا نہ کرے اُس وقت تک وہ جسمانی اور روحانی طور پر کیسے ترقی کر سکتا ہے۔ ان الفاظ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جہاں اپنی قوم کو اپنے غلبہ اور ترقی کی خبر دی ہے اور اپنے اس یقین محکم کا اظہار کیا ہے کہ میرا خدا مجھے کبھی نہیں چھوڑے گا۔ بیشک میرا چچا مجھے چھوڑ دے میرے بھائی مجھے چھوڑ دیں میرے دوست مجھ سے الگ

ہو جائیں میری قوم مجھ سے کنارہ کر لے پھر بھی رب العالمین خدا جس کے کنارِ عاطفت میں میں نے اپنی زندگی بسر کی ہے اور جس کی گود میں میں نے پرورش پائی ہے مجھے کبھی نہیں چھوڑے گا۔ اور ہمیشہ مجھے عزت اور کامیابی اور غلبہ بخشے گا۔ وہاں آپ نے اپنی قوم کو اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ تمہیں اپنی پیدائش کے مقصد پر غور کرنا چاہیے اور اپنی زندگی کو رائیگاں نہیں کھونا چاہیے۔ آخر اتنی بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ اُسے کسی اور ہستی نے پیدا کیا ہے مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس بات پر غور کرتے ہیں کہ انہیں کیوں پیدا کیا گیا ہے۔ وہ دنیا کی رعنائیوں اور دلچسپیوں میں کچھ ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ اُن کے دلوں میں اور اور سوالات تو پیدا ہوتے رہتے ہیں مگر اُن کے دلوں میں اگر سوال پیدا نہیں ہوتا تو صرف یہی کہ وہ کیوں پیدا کئے گئے ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے بہت سے لوگ سوال کرتے ہیں کہ ایسے جنگلوں میں جہاں کوئی آبادی نہیں ہوتی اور ایسے پہاڑوں میں جہاں انسان کا پہنچنا بہت مشکل ہوتا ہے اور شاذ و نادر ہی کوئی انسان وہاں پہنچ سکتا ہے نہایت دلکش اور خوبصورت پھول کیوں پیدا کئے گئے ہیں۔ پھر ہزاروں قسم کے کیڑے برسات کے موسم میں نکلتے ہیں اُن کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اِسی طرح سمندروں میں جھینگر اور دوسرے بعض بدشکل سمندری جانور پیدا کرنے سے کیا فائدہ ہے۔ پھر قسم قسم کی جڑی بوٹیوں کو اتنی کثرت سے کیوں اگایا گیا ہے۔ اور زمین پر رینگنے والے کیڑے سانپ اور کنکھجورا وغیرہ کیوں پیدا کئے گئے ہیں۔ غرض سمندر اور زمین پر اور ہوا میں ہزار ہا ایسی چیزیں ہیں جن کے متعلق انسان سوال کرتا ہے کہ وہ کیوں پیدا کی گئی ہیں۔ دشوار گزار پہاڑوں میں جہاں انسان بڑی مشکل سے پہنچتا ہے بعض اوقات نہایت خوبصورت پھولوں کا نظارہ انسان دیکھتا ہے تو اس کے دل میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے مقام پر اس قسم کے خوبصورت پھول پیدا کرنے کی کیا غرض تھی۔ غرض اس قسم کے ہزاروں سوالات لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں اور ہر شخص اپنی اپنی عقل کے مطابق ان سوالات کے جواب دینے کی کوشش کرتا ہے۔ مثلاً کہتا ہے کہ زہریلے کیڑوں یعنی سانپ وغیرہ کے زہروں سے اب بہت سی دوائیں تیار ہو رہی ہیں جو نہایت سریع الاثر ثابت ہوئی ہیں۔ یا یہ کہ دشوار گزار مقامات پر یہ خوش کن نظارے اس لئے بنائے گئے ہیں کہ جو لوگ تکلیف۔ مشقت اور محنت برداشت کر سکیں وہی ان نظاروں کو دیکھیں۔ ان سوالات اور جوابات سے پتہ لگتا ہے کہ انسان اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ دُنیا میں ہر چیز کے پیدا ہونے کی کوئی وجہ اور غرض ہونی چاہیے مگر انسان کو کبھی یہ بھی خیال آیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے کیوں پیدا کیا ہے۔ اور میرے پیدا کرنے کی غرض وغایت کیا ہے۔ وہ اور چیزوں کے پیدا کرنے کی غرض وغایت معلوم کرنے کا بہت شوق رکھتا ہے لیکن اس کے دل میں یہ کبھی خیال نہیں آتا کہ میں کیوں پیدا کیا گیا اور میں اس غرض کو پورا بھی کر رہا ہوں یا نہیں۔ اور اگر میں پیدا نہ کیا

جاتا اور اگر میرا وجود نہ ہوتا تو دنیا کو کیا نقصان ہوتا۔ دنیا میں اکثر لوگ ایسے ہیں جن کی زندگی ہوئی نہ ہوئی برابر ہوتی ہے کیونکہ انہیں نہ اپنی زندگی کی غرض و غایت کا علم ہوتا ہے اور نہ وہ اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر تمام لوگ اس سوال پر غور کریں تو اُن میں سستی اور غفلت اور کام کو ادھورا چھوڑنے کی عادت نہ رہے اور وہ ہر قسم کی قربانیوں سے کام لے کر اپنی روحانی ترقی کے لئے کوشش کریں۔ آخر غور کرو۔ دنیا میں کتنے لوگ ہٹلر۔ نپولین اور تیمور بن سکتے ہیں نہ ساری دنیا ہٹلر بن سکتی ہے اور نہ ساری دنیا نپولین بن سکتی ہے اور نہ ساری دنیا تیمور بن سکتی ہے۔ کیونکہ دنیوی ترقی کا میدان بہت تنگ ہے۔ لیکن ایک میدان ایسا بھی ہے جہاں ہر انسان اپنے آپ کو نمایاں کر سکتا ہے اور جتنا جی چاہے ترقی کر سکتا ہے اور کسی کو نقصان پہنچائے بغیر اور کسی کا راستہ روکے بغیر ترقی کر سکتا ہے اور وہ خدا رسیدہ بننے کا میدان ہے۔ اس میں کسی کے بڑھنے سے کسی دوسرے کا نقصان نہیں اور پھر ہر پیشہ اور ہر درجہ کا انسان خدا رسیدہ بن سکتا ہے۔ ایک بادشاہ اور اس کا بیٹا بھی خدا رسیدہ انسان بن سکتا ہے اور ایک فقیر بےنوا بھی خدا رسیدہ انسان بن سکتا ہے اور ایک نائی اور دھوبی بھی خدا رسیدہ انسان بن سکتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایک اقلیم میں دو بادشاہ نہیں ہو سکتے۔ مگر اولیاء اللہ کا مقام وہ ہے کہ اقلیم تو کیا ایک گھر میں بلکہ ایک گھر تو کیا ایک کمرہ میں بھی دس اولیاء اللہ رہ سکتے ہیں۔ اور اس میں کسی کا نقصان نہیں بلکہ خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے کے راستے اتنے وسیع ہیں کہ ان میں کبھی تنگی پیدا نہیں ہو سکتی۔ جس طرح سمندر میں سے چڑیا چونچ بھر کر پانی لے جائے تو اس سے سمندر کے پانی میں کوئی کمی نہیں آتی اسی طرح اللہ تعالیٰ سے تعلق کا حال ہے یہ اتنا وسیع خزانہ ہے کہ جس میں کمی کا کوئی امکان نہیں۔ دیکھو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ کی اتنی محبت حاصل ہوئی کہ جس کی مثال باقی انبیاء میں نہیں ملتی مگر اس کے باوجود خدا تعالیٰ کے پاس ابوبکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ اور علیؓ اور طلحہؓ اور زبیرؓ کو دینے کے لئے بھی محبت موجود تھی اور تمام صحابہؓ نے بھی اپنے اپنے ظرف کے مطابق اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کی۔ پس ہمیشہ اس بات پر غور کرتے رہنا چاہیے کہ ہماری پیدائش کی غرض کیا ہے۔ پیدائش کی اصل غرض جیسا کہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کا پیارا بن جائے۔ جب وہ یہ مقام حاصل کر لیتا ہے تو دنیا بے شک مٹ جائے خدا تعالیٰ کے رجسٹر سے اس کا نام کبھی نہیں مٹ سکتا۔ وہ گدڑی میں پڑا ہوا بھی خدا تعالیٰ کا مقرب بن سکتا ہے اور اتنا بڑا بن سکتا ہے کہ دنیا کی بڑائیاں اس کے مقابلہ میں بالکل ہیچ ہو جائیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو اسی بنیادی نکتہ کی طرف توجہ دلائی ہے اور انہیں نصیحت کی ہے کہ تم اپنی پیدائش کے مقصد پر غور کرو اور اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہدایت کا جو سامان کیا ہے اس سے فائدہ اٹھاؤ ورنہ تمہاری زندگی بیکار چلی جائے گی اور تم اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھودنے والے قرار پاؤ گے۔

پھر فرماتے ہیں وَ الَّذِیۡ ھُوَ یُطۡعِمُنِیۡ وَ یَسۡقِیۡنِ رب العالمین خدا ہی ہے جو مجھے کھانا کھلاتا اور پانی پلاتا ہے ورنہ نہ گندم میری پیدا کی ہوئی ہے۔ نہ پانی میرا بنایا ہوا ہے۔ نہ نمک میرا بنایا ہوا ہے۔ نہ مرچ میری پیدا کی ہوئی ہے۔ نہ گوشت میرا پیدا کیا ہوا ہے۔ نہ ترکاریاں میں نے پیدا کی ہیں۔ یہ سب چیزیں میرے باپ دادا کی پیدائش سے بھی پہلے کی ہیں۔ بڑے سے بڑے خاندان کا ذکر بھی سو پشتوں سے آگے نہیں جاتا۔ لیکن گندم۔ پانی۔ ترکاری۔ گوشت۔ نمک۔ مرچ اور مونگ وغیرہ ہزاروں پشتوں سے بھی پہلے کی ہیں۔ پھر یہ انسان کی کس طرح ہوگئیں ہم اگر کھاتے ہیں تو اس لئے کہ خدا نے ہمیں ان چیزوں کے کھانے کی اجازت دی ہے۔ ورنہ ہم میں طاقت نہیں تھی کہ یہ چیزیں خود مہیا کر سکتے۔ اسی طرح جب ہم پانی پیتے ہیں اور اس بات پر غور کرتے ہیں کہ یہ پانی ہمیں کس طرح ملا تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ پانی خدا تعالیٰ نے ہی زمین کی تہوں میں رکھا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں بار بار فرماتا ہے کہ اگر ہم اس پانی کو کھینچ لیں تو تم پانی کہاں سے لاؤ۔ اور یہ بالکل سچی بات ہے کہ ہم میں کوئی طاقت نہیں کہ ہم پانی مہیا کر سکیں۔ یہ سب خدا تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے یہ تمام ضروری اشیاء ہمیں مہیا کر دی ہیں۔ اگر تھوڑی دیر ہی ہمیں پانی نہ ملے تو ہمیں سخت دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ جن علاقوں میں پانی کی کمی ہے وہاں لوگ ایسی ایسی چیزیں پیتے ہیں جن کو ہمارے علاقے میں پانی نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً سندھ اور بلوچستان کے بعض علاقے ایسے ہیں۔ جہاں لوگ کیچڑ پیتے ہیں۔ لیکن ہمارے ملک والے ایسا نہیں کر سکتے۔ یہ الگ بات ہے کہ انہیں کوئی مشکل پیش آجائے۔ تو وہ بھی اس قسم کا پانی پی لیں۔ ورنہ عام حالات میں ہمارے ہاں اسے پانی نہیں سمجھا جاتا۔ غرض کھانے اور پینے کی کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے مہیا نہ کی ہو۔ لیکن چونکہ خدا تعالیٰ کا وجود مخفی ہے اور وہ پس پردہ احسان کرتا ہے اس لئے باوجود اس کے کہ اُس کے احسانات بہت زیادہ ہیں لوگ انہیں محسوس نہیں کرتے۔ ماں اپنی چھاتیوں سے دودھ پلاتی ہے۔ اور بچہ اپنی عقل کے مطابق سمجھتا ہے کہ ماں اس پر احسان کرتی ہے اور اپنا خون اُسے چوساتی ہے حالانکہ یہ قربانی کا جذبہ ماں نے خود پیدا نہیں کیا۔ یہ جذبہ اس کی پیدائش سے بھی پہلے اُس کے اندر رکھا گیا تھا۔ چنانچہ دیکھ لو چھوٹی چھوٹی لڑکیاں گُڑیاں بناتی ہیں اور ان سے کھیلتی ہیں۔ یہ وہی بچہ پالنے کا جذبہ ہوتا ہے جو ان کے اندر پایا جاتا ہے۔ ان کے اندر یہ حس خدا تعالیٰ نے ہی پیدا کی ہے خواہ وہ عقل کے ماتحت ایسا کرتی ہیں یا بے عقلی کے ماتحت ایسا کرتی ہیں۔ بہرحال عورت کے اندر خدا تعالیٰ نے اولاد سے محبت کرنے کا مادہ رکھا ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے جو ماں نے خود اپنے اندر پیدا نہیں کی بلکہ اس کی پیدائش سے بھی پہلے اُس کے اندر رکھ دی گئی تھی۔ اور جب یہ مادہ ماں کی پیدائش سے پہلے کا اس کے اندر پایا جاتا ہے تو پھر یہ اس کا پیدا کیا ہوا نہ ہوا۔ اب یہ

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ مادہ ماں کا پیدا کیا ہوا نہیں تو آخر یہ مادہ ماں کے اندر کس نے پیدا کیا ہے۔ بہرحال وہ کوئی اور ہستی ہے۔ اور ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ ہستی جس نے سب مخلوقات کو پیدا کیا ہے اسی نے یہ مادہ ماں کے اندر رکھا ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بچہ ماں سے محبت کرتا ہے خدا تعالیٰ سے محبت نہیں کرتا اس لئے کہ خدا تعالیٰ اسے نظر نہیں آتا۔ جب اس کی ماں اپنی ماں کے پیٹ میں تھی اور خدا تعالیٰ کے فرشتے اس کے دل میں اولاد کی خواہش اور محبت پیدا کر رہے تھے تو اس نے اس نظارہ کو دیکھا نہیں تھا۔ اس نے صرف اتنا ہی دیکھا کہ ماں اسے اپنی چھاتیوں سے دودھ پلا رہی ہے خواہ وہ فاقہ ہی کر رہی ہو اور بھوک کی وجہ سے نڈھال ہو رہی ہو۔ وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہو۔ اُس کا گوشت گھل گیا ہو اور ہڈیاں نکل آئی ہوں۔ لیکن ادھر بچہ روَیا اُدھر ماں نے اپنے سوکھے ہوئے پستان اس کے منہ میں دے دیئے۔ خواہ پستانوں میں دودھ کا کوئی قطرہ ہو یا نہ ہو۔ ماں کے اندر یہ جذبہ کس ہستی نے پیدا کیا ہے وہ بچہ کو نظر نہیں آتی۔ اس لئے وہ اس سے محبت نہیں کرتا۔ ماں اپنی چھاتیوں سے دودھ پلاتی ہوئی اسے نظر آتی ہے اس لئے وہ اس سے محبت کرنے لگ جاتا ہے۔ انسان کھانا کھاتا ہے جس شخص نے اسے گندم دی اور اس نے اس سے روٹی بنائی وہ اس کا شکریہ ادا کرتا ہے یا جس کی نوکری کر کے اس نے پیسے کمائے اور ان سے اس نے گندم خریدی وہ اس کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ جس ماں اور بیوی نے اسے روٹی پکا کر کھلائی وہ ان کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ لیکن جس نے گندم بنائی۔ جس نے نمک بنایا جس نے پانی بنایا وہ اس کا شکریہ ادا نہیں کرتا اس لئے کہ گندم مہیا کرنے والا یا ملازمت دینے والا اسے نظر آتا تھا۔ ماں اسے نظر آتی تھی کہ وہ گرمی کے دنوں میں آگ کے آگے بیٹھی روٹی پکا رہی ہے یا سردی میں جب وہ خود لحاف سے باہر نہیں نکلتا وہ صحن میں بیٹھی اس کے لئے ناشتہ تیار کر رہی ہے چونکہ وہ اسے نظر آتی ہے اس لئے اس کے اندر احساسِ شکریہ پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن چونکہ اسے اس احسان کا اصلی بانی نظر نہیں آتا اس لئے اسے یہ خیال نہیں آتا کہ دراصل یہ احسان کسی اور ذات نے کیا ہے۔

ہمارے ملک میں لطیفہ مشہور ہے۔ واللہ اعلم وہ سچا ہے یا عام حالات میں وہ خود بنا لیا گیا ہے۔ جب ہمارے ملک پر انگریز حاکم تھے۔ لوگوں میں انہیں خوش کرنے کے لئے ڈالیاں پیش کرنے کا رواج تھا۔ بعد میں اگرچہ یہ قانون بنا دیا گیا تھا کہ افسروں کو ڈالیاں پیش نہ کی جائیں لیکن حکام اور روسائے شہر کو جب موقعہ ملتا اور وہ انگریز افسروں کو ملنے کے لئے جاتے تو ان میں سے بعض ہوشیار لوگ ڈالیاں بھی لے جاتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک انگریز افسر کو ایک ای۔ اے۔ سی اور ایک تحصیلدار ملنے کے لئے گئے ای۔ اے۔ سی ڈالی بھی ساتھ لے گیا۔ یہ تو سارے جانتے ہیں کہ ای۔ اے۔ سی بڑا ہوتا ہے اور تحصیلدار چھوٹا ہوتا ہے۔ کئی علاقوں کا چارج ہی ای۔ اے۔ سی کے پاس

ہوتا ہے۔ اور تحصیلدار اس کے ماتحت ہوتا ہے۔ پس جب وہ دونوں ملاقات کے لئے گئے تو اتفاقاً انگریز افسر کے پاس ملاقات کا وقت تھوڑا تھا اس لئے بجائے اس کے کہ وہ دونوں کو الگ الگ بلاتا۔ اس نے کہلا بھیجا کہ دونوں آجاؤ۔ جب ای۔ اے۔ سی ڈالی کو اٹھانے لگا تو تحصیلدار نے آگے بڑھ کر ڈالی اٹھالی۔ اور کہا حضور ہمارے ہوتے ہوئے آپ یہ تکلیف کیوں کریں۔ چنانچہ تحصیلدار نے ڈالی اٹھائی اور بڑے آرام سے اندر جا کر انگریز افسر کے سامنے رکھ دی اور یہ نہ کہا کہ یہ ڈالی ای۔ اے۔ سی نے پیش کی ہے۔ وہ انگریز افسر اسی اثر کے ماتحت کہ ڈالی تحصیلدار نے پیش کی ہے ای۔ اے۔ سی کی طرف پیٹھ کر کے اور تحصیلدار کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا اور اس سے حالات پوچھنے لگا۔ ای۔ اے۔ سی دل ہی دل میں کُڑھ رہا تھا۔ لیکن وہ کیا کر سکتا تھا۔ برابر دو گھنٹے تک انگریز افسر تحصیلدار سے باتیں کرتا رہا۔ اور اس نے ای۔ اے۔ سی کو پوچھا تک نہیں۔ ملاقات سے فارغ ہو کر جب باہر آئے تو ای۔ اے۔ سی نے غصہ نکالنا شروع کیا کہ تم نے کیوں یہ حرکت کی۔ تحصیلدار نے کہا۔ حضور یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ آپ میرے سامنے بوجھ اٹھاتے۔ اب ڈالی تو ای۔ اے۔ سی لایا تھا۔ لیکن چونکہ وہ ڈالی تحصیلدار نے انگریز افسر کے آگے رکھی تھی اس لئے وہ اس پر مہربان ہو گیا۔ یہی حال انسان کا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے ڈالی آتی ہے۔ لیکن ماں باپ۔ بیوی بچے۔ بہن یا بھائی وہ ڈالی اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دیتے ہیں اور وہ سمجھتا ہے کہ اصل ڈالی پیش کرنے والے وہی ہیں حالانکہ ان کے پیچھے خدا تعالیٰ کا ہاتھ ہوتا ہے۔

اسلام نے انسان کو یہ یاد دلانے کے لئے کہ حقیقی محسن خدا تعالیٰ ہی ہے یہ ترکیب رکھ دی کہ جب تم کھانا کھاؤ۔ یا پانی پیو تو اس کے شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ پڑھ لیا کرو۔ اور کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھنے کے یہ معنے ہیں کہ یہ کھانا تمہارے سامنے رکھا تو ماں نے ہے لیکن بھیجا خدا تعالیٰ نے ہے۔ یا کھانا تمہارے سامنے رکھا تو بیوی نے ہے لیکن بھیجا خدا تعالیٰ نے ہے یا کھانا تمہارے سامنے رکھا تو تمہارے بھائی نے ہے لیکن بھیجا خدا تعالیٰ نے ہے۔ اور جب انسان کو پتہ لگ جاتا ہے اور بار بار یہ مضمون اس کے سامنے دہرایا جاتا ہے کہ درحقیقت یہ تمام نعمتیں عطا کرنے والا خدا تعالیٰ ہی ہے۔ وہی ہمیں کھانا دیتا ہے وہی ہمیں پانی دیتا ہے۔ وہی ہمیں پہننے کو کپڑا مہیا کرتا ہے تو آہستہ آہستہ اس کی طرف دل مائل ہو جاتا ہے اور خدا تعالیٰ کی محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَ يَسْقِيْنِ میں یہی نکتہ بیان فرمایا ہے کہ اصل احسان خدا تعالیٰ کا ہے۔ جس نے ہمیں کھانے پینے کو دیا۔ اور جب وہی محسنِ حقیقی ہے۔ تو انسان کی یہ کتنی بڑی نادانی ہے کہ وہ محسنِ حقیقی کو تو چھوڑ دیتا ہے اور ان لوگوں کے آگے جھکنا شروع کر دیتا ہے جن کو اس نے صرف ایک درمیانی واسطہ بنایا ہے۔ گویا وہ شاخ پر تو ہاتھ مارتا ہے اور تنے کو نظر انداز کر دیتا

ہے ایسا انسان یقیناً اپنی روحانی ترقی کا راستہ اپنے ہاتھ سے بند کرتا اور خدا تعالیٰ کی ناراضگی کا مورد بنتا ہے۔

پھر فرماتے ہیں وَ اِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ جب میں بیمار ہوتا ہوں تو خدا تعالیٰ مجھے شفا بخشتا ہے آپ نے اس جگہ مَرِضْتُ میں مرض کو اپنی طرف منسوب کیا ہے اور شفا کو خدا تعالیٰ کی طرف۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جتنی چیزیں پیدا کی ہیں وہ سب کی سب انسان کے فائدہ کے لئے پیدا کی ہیں۔ جب انسان ان کو غلط استعمال کرتا ہے تو اس وقت وہ بیمار ہوجاتا ہے یا نقصان اٹھاتا ہے اور جب انسان پھر اس کا کسی رنگ میں ازالہ کردیتا ہے اور علاج کرتا ہے تو شفا پاجاتا ہے۔ اس لئے مرض تو انسان کی طرف منسوب ہوتی ہے اور شفا خدا تعالیٰ کی طرف۔ دنیا میں جتنی مصیبتیں اور بلائیں انسان پر وارد ہوتی ہیں ان پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ ساری کی ساری خدا تعالیٰ کی نعمتوں کے غلط استعمال کی وجہ سے آتی ہیں۔ اگر خدا تعالیٰ کی نعمتوں کا صحیح استعمال کیا جائے تو انسان ان مصائب اور بلاؤں سے بچ سکتا ہے۔ مثلاً بیماری ہے۔ یہ کیوں پیدا ہوتی ہے؟ یہ اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ لوگ ایسی چیزیں کھاتے ہیں جن سے ان کے اعضائے انہضام بگڑتے ہیں یا وہ ایسی چیزیں کھاتے ہیں جو اپنے وجود میں تو نقصان دہ نہیں ہوتیں۔ مگر اعتدال سے زیادہ استعمال کرلینے کی وجہ سے یا غلط استعمال کرنے کی وجہ سے وہ بیمار ہوجاتے ہیں۔ مثلاً خربوزہ ہے۔ جہاں تک خربوزے کا سوال ہے یہ اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے۔ لیکن اسی نعمت کو اگر اعتدال سے زیادہ استعمال کیا جائے تو مصیبت بن جاتی ہے اور بیماری پیدا ہوتی ہے۔ یا آم ہے۔ یہ بھی خدا تعالیٰ کی نعمت ہے۔ لیکن حد سے زیادہ کھالینے سے نقصان ہوتا ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ کی جتنی بھی نعمتیں ہیں ان کو ایک حد کے اندر استعمال کیا جائے تو فائدہ مند ہیں اور جب حد سے تجاوز کیا جائے تو بیماری پیدا ہوجاتی ہے۔ مثلاً بینگن اور کریلے گرم ہوتے ہیں۔ اگر یہ حد کے اندر کھائے جائیں تو نعمت ہیں لیکن حد سے زیادہ کھائے جائیں تو بینگن سے بواسیر اور کریلوں سے پیچش وغیرہ ہوجاتی ہے۔ اسی طرح گنّا ہے۔ اگر اس کا استعمال حد کے اندر کیا جائے تو نہایت فائدہ مند ہے۔ لیکن اگر زیادہ استعمال کیا جائے تو پیشاب کی بعض امراض لاحق ہوجاتی ہیں۔ اب جہاں تک گنّے کا سوال ہے وہ بیماری پیدا نہیں کرتا۔ بیماری پیدا کرنے والی چیز گنّے کا حد سے زیادہ استعمال ہے۔ ورنہ شوگر انسانی جسم کے لئے نہایت ضروری چیز ہے۔ گلوکوز کو ہی دیکھ لو یہ شوگر ہی ہے۔ لیکن ڈاکٹر جب مریضوں کو گلوکوز کا انجیکشن کرتے ہیں تو ان کی چھوٹی ہوئی نبضیں بھی چل پڑتی ہیں۔ پہلے زمانہ میں لوگ ناواقفیت سے ذیابیطس کا علاج کرتے ہوئے شکر کو بالکل ختم کردیتے تھے حالانکہ ان کا باقی رہنا ضروری ہوتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ کئی لوگ جن کی شوگر بالکل ختم کردی جاتی تھی ان کا ہارٹ فیل ہوجاتا تھا۔ آج کل بھی انسولین کا ٹیکہ کرتے وقت ڈاکٹروں کو یہ ہدایت ہوتی ہے کہ اگر مریض کے قلب پر اس کا اثر ہو تو فوراً

اسے گلوکوز کا ٹیکہ کردو۔اور جب ایسا کیا جاتا ہے تو مریض سنبھل جاتا ہے۔پس جتنی بیماریاں انسان کے اندر پیدا ہوتی ہیں وہ خدا تعالیٰ کی نعمتوں کے غلط استعمال کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔اگر ان نعمتوں کا صحیح استعمال کیا جائے تو کبھی بیماری پیدا نہ ہو۔خدا تعالیٰ نے انسان کے فائدہ کے لئے لوہا پیدا کیا ہے۔جب تک اس کا صحیح استعمال کیا جائے یہ نہایت فائدہ مند چیز ہے اور ہر قسم کی مشینریاں اس سے تیار ہوتی ہیں جو انسان کو فائدہ پہنچاتی ہیں۔لیکن جب اس کا غلط استعمال کیا جائے تو یہی چیز نقصان دہ ہو جاتی ہے۔مجھے اپنا بچپن کا ایک واقعہ یاد ہے کہ ہمارے مکانوں کی تعمیر کیلئے سیالکوٹ سے ترکھان آئے ہوئے تھے۔میں ان کو کام کرتے دیکھتا۔اور جب وہ تیشہ چلاتے تو میرے دل میں بھی شوق پیدا ہوتا کہ میں اس کو چلا کر دیکھوں۔وہ تو روزی کمانے کے لئے کام کرتے تھے مگر میں سمجھتا تھا کہ ان کو اس فعل میں مزا آتا ہے اور میں اپنے دل میں کہتا تھا کہ میں کیوں نہ یہ مزا اٹھاؤں۔میں نے بہت دفعہ کوشش کی کہ تیشہ چلا کر دیکھوں لیکن وہ مجھے ہاتھ نہ لگانے دیتے تھے اور کہتے تھے۔زخمی ہو جاؤ گے۔مگر میں ان کے منع کرنے سے سمجھتا تھا کہ وہ مجھے اس مزے سے محروم رکھنا چاہتے ہیں۔آخر ایک دن میرا داؤ چل گیا وہ لوگ نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں گئے ہوئے تھے اور ان کے ہتھیار وہیں پڑے تھے۔میں نے تیشہ اٹھایا اور چلانا شروع کر دیا۔مگر پہلی ہی چوٹ لگائی تھی کہ تیشہ میرے ہاتھ پر آلگا اور میں زخمی ہو گیا۔چنانچہ اس زخم کا نشان اب تک موجود ہے۔اب دیکھو خدا تعالیٰ نے تیشہ اس لئے نہیں بنایا تھا کہ انسان زخمی ہو مگر اس کے غلط استعمال نے میرے ہاتھ کو زخمی کر دیا۔اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جتنی چیزیں پیدا کی ہیں وہ سب کی سب انسان کے فائدہ کے لئے ہیں۔لیکن ان کے غلط استعمال سے اسے نقصان ہوتا ہے۔مثلاً لڑائی میں دوسرے پر تلوار یا خنجر سے حملہ کیا جاتا ہے جس سے وہ ہلاک ہو جاتا ہے مگر سوال یہ ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے لوہا اس لئے بنایا تھا کہ دوسرے کے سر پر مارا جائے۔اگر اسی لوہے کو بجائے انسانوں پر استعمال کرنے کے اس سے چاقو اور چھریاں بنائی جائیں اور ان سے ترکاریاں وغیرہ کاٹنے کا کام لیا جائے یا اس کی کلہاڑیاں بنائی جائیں جن سے درخت کاٹے جائیں یا اس سے ہل چلانے والے اوزار بنائے جائیں اور اس کی مشینریاں تیار کی جائیں تو یہ ایک نہایت ہی مفید چیز ہے۔لیکن اگر اسی لوہے کو دوسرے کے سر پر مارا جائے تو اس کا سر پھٹ جائے گا۔پس دنیا میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس کا اچھا استعمال کیا جائے تو وہ نقصان پہنچائے۔نقصان پہنچانے والی چیز ان نعمتوں کا برا استعمال ہوتا ہے نہ کہ خود وہ نعمتیں۔مثلاً سانپ اور بچھو کا زہر نہایت خطرناک چیز ہے۔مگر ہومیو پیتھک والوں نے کئی قسم کے امراض کے علاج میں اسے استعمال کرنا شروع کر دیا ہے اور اسے نہایت مفید پایا ہے۔جن مریضوں کے ناخن پھٹ جاتے ہیں ان کو سانپ کا زہر

ہومیو پیتھک دوا کی صورت میں دے دو تو فوراً آرام آجائے گا۔ اسی طرح سنکھیا ہے۔ اس کے کھانے سے لوگ مرتے بھی ہیں لیکن دیکھنا تو یہ چاہیے کہ اس کے کھانے سے کتنے لوگ مرتے ہیں اور کتنے زندہ ہوتے ہیں۔ اگر اندازہ لگایا جائے تو سال میں ہزار دو ہزار آدمی سنکھیا کھانے سے مرتے ہیں۔ لیکن جو لوگ اس سے شفا پاتے ہیں ان کی تعداد لاکھوں تک ہے۔ پرانے ملیریا کے مریض پر جب کوئی دوا اثر نہیں کرتی تو وہ سنکھیا کی قلیل مقدار سے ٹھیک ہوجاتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی قسم کے امراض کے لئے یہ مفید ہے۔ اسی طرح کچلہ ہے۔ یہ بھی زہر ہے اس کے کھانے سے کئی لوگ مرجاتے ہیں۔ لیکن لاکھوں لاکھ انسان اس سے بچتے بھی ہیں۔ اسی طرح بہت بڑی تباہی والی چیز افیون ہے۔ لیکن اس کی تباہی کے مقابلہ میں اس کے فوائد بہت زیادہ ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمایا کرتے تھے کہ اطباء کا قول ہے کہ طب کی آدھی دوائیں ایسی ہیں جن میں افیون استعمال ہوتی ہے اور اس کا اتنا فائدہ ہے کہ اندازہ لگانا مشکل ہے (اخبار الفضل قادیان ۱۹/ جولائی ۱۹۲۹ء صفحہ ۲)۔ جب انسان کو بے چینی اور بے کلی ہوتی ہے۔ جب انسان کی نیند اڑ جاتی ہے۔ جب انسان درد سے نڈھال ہوکر خودکشی کرنے پر آمادہ ہوجاتا ہے تو اس کو مارفیا کا ٹیکہ لگاتے ہیں۔ جس سے اسے فوراً آرام ہوجاتا ہے پس دنیا میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو اپنی ذات میں نقصان دینے والی ہو۔ نقصان دینے والی چیز صرف غلط استعمال ہے جو انسان کی اپنی کوتاہیوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مرض کو اپنی طرف اور شفا کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کیا ہے مگر ہمارے ملک میں ایک مسلمان خدا تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہوئے جب کسی کام میں ناکام ہوتا ہے تو وہ کہتا ہے۔ میں نے تو پورا زور لگا دیا تھا لیکن خدا تعالیٰ نے مجھے ناکام کردیا۔ گویا وہ خوبی کو اپنی طرف اور برائی کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرتا ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کی بڑی بھاری ہتک ہے جو ہمارے ملک میں کی جاتی ہے حالانکہ سچے مومن کا یہ طریق ہوتا ہے کہ جب اس کے کام کا اچھا نتیجہ نکل آتا ہے تو وہ کہتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ خدا تعالیٰ نے مجھے کامیاب کردیا۔ اور اگر خراب نتیجہ نکلتا ہے تو وہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن پڑھتا ہے۔ اور کہتا ہے میں اپنی کوتاہیوں کی وجہ سے ناکام رہا ہوں۔ ورنہ خدا تعالیٰ نے تو میرے لئے برکت اور رحمت ہی کے سامان کئے تھے۔ اور خدا تعالیٰ کی طرف سے برکت اسی کو ملتی ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح عیب اپنی طرف اور خوبی خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ کہتا ہے۔ میرے اس بندہ نے چونکہ عیب اپنی طرف اور خوبی میری طرف منسوب کی ہے۔ اس لئے اب میرا فرض ہے کہ میں اسے پوری طرح کامیاب کروں تاکہ تمام خوبیاں میری طرف ہی منسوب ہوں۔ لیکن جب وہ ایسا نہیں کرتا اور خدا تعالیٰ کو تمام خرابیوں کا ذمہ وار قرار دیتا ہے تو خدا تعالیٰ بھی اس کی مدد سے اپنا ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔

پھر فرماتے ہیں وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ میرا خدا وہ ہے جو مجھے مارے گا اور پھر مجھے زندہ کرے گا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی دو صفات مُحْیٖ اور مُمِیْت کا ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی وہ زندہ بھی کرتا ہے اور مارتا بھی ہے۔ اس کے زندہ کرنے کا ثبوت تو وہ ہزاروں لاکھوں بچے ہیں جو روزانہ دنیا میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور ایسے حالات میں پیدا ہوتے ہیں جو انسان کے اختیار سے باہر ہوتے ہیں اور ایسے حالات میں سے گزر کر بڑھتے ہیں کہ اگر کسی بالا ہستی کا تصرف نہ ہو تو ان کے بڑھنے کی کوئی صورت ہی نہیں ہوسکتی۔ ایک جانور کا بچہ صرف چند دن میں ہی اپنی ضرورتوں کو خود بخود پورا کرنے کے قابل ہو جاتا ہے چڑیوں کے بچے ایک یا ڈیڑھ ہفتہ میں اڑنے لگ جاتے ہیں۔ مرغیوں کے بچے تین چار ہفتہ میں اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے لگ جاتے ہیں۔ چوپایوں کے بچے پیدا ہوتے ہی تھوڑی دیر میں اچھلنے کودنے لگ جاتے ہیں مگر انسان کا بچہ چھ سات مہینے بلکہ بعض دفعہ نو نو ماہ تک گودی میں اٹھائے رکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات تو سات آٹھ بلکہ نو مہینہ تک وہ گھٹنوں کے بل چلنے کے بھی قابل نہیں ہوتا۔ پھر اس کی غذا جس سے وہ پرورش پاسکتا ہے اُس کی ماں کی چھاتیوں میں ہوتی ہے۔ کہیں دو تین سال میں جا کر وہ دانت نکالتا ہے۔ بیشک ایسے بچے بھی ہوتے ہیں جو چھ یا سات مہینہ میں ہی اپنے دانت نکال لیتے ہیں یا نکالنے شروع کر دیتے ہیں مگر بالعموم ایسے دانت جن سے بچہ کسی قدر غذا حاصل کرسکتا ہے وہ ڈیڑھ دو بلکہ اڑھائی سال کے بعد مکمل ہوتے ہیں اتنے لمبے عرصہ تک اپنی جان کو جوکھوں میں ڈال کر ایک عورت جو اپنے بچہ کی خدمت کرتی ہے یہ بغیر اس کے کبھی ممکن ہی نہیں تھا جب تک خدا تعالیٰ کی طرف سے اس کے دل میں پرورش کا خیال اور بچہ کی محبت پیدا نہ کر دی جاتی۔ یہ مت خیال کرو کہ صرف ماں ہونا ہی اس محبت کا موجب ہوسکتا ہے۔ کیونکہ ماں کے جذبات اس کے اپنے اختیار کی چیز نہیں اور اختیاری چیز ہی کسی انسان کی طرف منسوب کی جاسکتی ہے جو چیز کسی انسان کے اختیار کی نہیں وہ اُس کی طرف منسوب کس طرح کی جاسکتی ہے وہ تو لازماً کسی اور ہستی کی طرف منسوب کرنی پڑے گی۔ اور وہ ہستی اللہ تعالیٰ کی ہی ہے جس نے ماں کے دل میں اپنے بچوں کی محبت پیدا کی اور اسے پیدائش اور پرورش کی تکالیف برداشت کرنے کی طاقت دی چنانچہ سالہا سال تک وہ اپنے بچوں کو پالتی رہتی ہے پہلے نو ماہ تو وہ اپنے بچہ کو پیٹ میں اٹھاتی ہے۔ پھر دو سال اسے گود میں اٹھاتی ہے۔ گویا اوسطاً اڑھائی سال تک ماں اپنے بچہ کی ہی ہو رہتی ہے تب کہیں وہ پرورش پاتا ہے۔ مگر اس کے بعد وہ فارغ نہیں ہو جاتی بلکہ بالعموم اسی وقت ایک دوسرے بچہ کی آمد شروع ہو جاتی ہے اور اس طرح اپنی زندگی کا بہترین حصہ عورت اپنے بچوں کی پرورش میں لگا دیتی ہے۔ پس یہ جذبہ محبت جو ہر عورت کے دل میں اپنے بچوں کے متعلق پایا جاتا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی پیدا کیا گیا ہے۔ ورنہ اتنی

محنت کی برداشت انسانی عقل کے ماتحت نہیں ہوسکتی تھی۔ اگر خدا تعالیٰ یہ جذبات ماں کے دل میں پیدا نہ کرتا تو آہستہ آہستہ فلسفہ اور عقل کے ماتحت یا تو انسان اولاد پیدا کرنا ہی بند کردیتے اور یا پھر ان کی پرورش کی طرف سے اپنی توجہ کلیتہً ہٹا لیتے۔

پھر خدا تعالیٰ کے مُمِیت ہونے کا نظارہ بھی روزانہ نظر آتا ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں سینکڑوں آدمی روزانہ مرتے ہیں۔ چنانچہ کسی سڑک پر چلے جاؤ۔ تمہیں جنازے گزرتے دکھائی دیں گے۔ چھوٹے قصبات میں بھی پانچویں دسویں کوئی نہ کوئی موت ہوتی رہتی ہے چھوٹے گاؤں میں بھی سال میں دوتین موتیں ہوجاتی ہیں۔ پس موت کا یہ نظارہ بھی ہمیں کثرت سے دنیا میں نظر آتا ہے۔ غرض خدا تعالیٰ کی یہ دونوں صفات کہ وہ محیٖ بھی ہے اور ممیت بھی ہے اس رنگ میں لوگوں کے سامنے آتی رہتی ہیں کہ کوئی ان کا انکار نہیں کرسکتا۔ حیات انسان کے لئے خوشی کا موجب ہوتی ہے اور موت لوگوں کے لئے رنج کا موجب ہوتی ہے۔ دشمن کی بھی لاش پڑی ہوئی ہو تو سوائے کسی شقی القلب انسان کے دوسرے انسانوں کے دلوں میں رحم کا مادہ پیدا ہوجاتا ہے۔ بیس بیس تیس تیس سال کی دشمنیاں اس وقت دلوں سے نکل جاتی ہیں اور دشمن کی لاش دیکھ کر انسان کے دل میں سے اس وقت دعا ہی نکلتی ہے۔ یا اس کے رشتہ داروں اور عزیزوں کے لئے دل میں رحم اور ہمدردی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہر انسان جانتا ہے کہ جو دن اس پر آیا ہے وہ مجھ پر بھی آنے والا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک جو عالم الغیب ہے یہ دونوں مواقع نہ کلی طور پر خوشی کا موجب ہوتے ہیں اور نہ کلی طور پر غم کا موجب ہوتے ہیں۔ جب کوئی بچہ کسی کے گھر میں پیدا ہوتا ہے تو اس کے ماں باپ اور عزیز سمجھتے ہیں کہ ایک نیا چاند دنیا میں نکلا ہے ایک رحمت کا نیا دروازہ ہمارے لئے کھلا ہے حالانکہ بسا اوقات پیدا ہونے والی روح دنیا کے لئے کئی قسم کے مصائب اور دکھوں کا موجب ہوتی ہے۔ اس کے رشتہ دار تو اس کی پیدائش پر تو خوش ہو رہے ہوتے ہیں لیکن آسمان پر خدا کے فرشتے اس کی پیدائش سے غمگین ہو رہے ہوتے ہیں۔

غرض پیدائش دنیا کے نزدیک ایک ہی نکتہ رکھتی ہے یعنی خوشی کا۔ کسی کی پیدائش پر تھوڑے لوگ خوش ہوتے ہیں اور کسی کی پیدائش پر زیادہ۔ لیکن آسمان کے فرشتے کسی کی پیدائش پر اگر ان کے لئے رونا ممکن ہو تو آنسو بہاتے یا دوسرے الفاظ میں اپنے رنج کا اظہار کرتے ہیں۔ اور کسی کی پیدائش پر خواہ دنیا کے لوگ خوشی نہ منائیں فرشتے بڑی خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ یہی حال موت کا ہے۔ موت کے وقت بھی دنیا کے ہر انسان کے رشتہ دار اور دوست تھوڑے ہوں یا بہت رنج محسوس کرتے ہیں۔ ایک ڈاکو مرتا ہے تو اس کے بیوی بچے خوش نہیں ہوتے کہ ہمارا باپ

ڈاکو تھا۔ قاتل تھا۔ فتنہ وفساد پھیلاتا تھا۔ اچھا ہوا کہ وہ مر گیا بلکہ ان کی اسی طرح چیخیں نکل جاتی ہیں جس طرح بڑے سے بڑے محسن اور نیک باپ کے بچوں کی اس کی وفات پر نکل جاتی ہیں اور وہ دنیا کے لئے اس کی موت کو ایسا ہی خطرناک سمجھتے ہیں جیسے کسی بڑے سے بڑے مصلح کی وفات کو بلکہ شائد اس سے زیادہ۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک لطیفہ سنایا کرتے تھے کہ جب مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات ہوئی تو چونکہ ان کے دورِ حکومت میں امن قائم ہوا تھا۔ اور وہ طوائف الملوکی جو پہلے پھیلی ہوئی تھی جاتی رہی تھی اس لئے سکھوں کے علاوہ جو ان کے ہم مذہب اور ہم قوم تھے ہندو اور مسلمان بھی عام طور پر یہ سمجھتے تھے کہ اب ان کی وفات کے بعد پھر فتنے پیدا ہونے شروع ہو جائیں گے۔ اس لئے لوگوں میں ایک کہرام مچا ہوا تھا اور ہر شخص کے آنسو رواں تھے۔ جن کے زیادہ گہرے تعلقات تھے وہ چیخیں مار رہے تھے۔ فرماتے تھے کہ کوئی چوہڑا لاہور کے قریب سے گزرا اور اس نے جب دیکھا کہ ہر شخص ماتم کر رہا ہے تو اس نے کسی سے پوچھا کہ آج لاہور والوں کو کیا ہو گیا ہے کہ جس کو دیکھو رو رہا ہے۔ جس کو دیکھو رو رہا ہے اس نے کہا۔ تمہیں پتہ نہیں۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ فوت ہو گئے ہیں۔ وہ بڑی حیرت کا اظہار کر کے کہنے لگا۔ اچھا! رنجیت سنگھ مر گیا ہے اور اس پر لوگ رو رہے ہیں۔ پھر کہنے لگا۔ ’’باپو ہوراں جیہے مر گئے تے رنجیت سنگھ بچارا کس شمار وچ‘‘۔ یعنی جب میرے باپ جیسا آدمی مر گیا تو رنجیت سنگھ بھلا کس شمار میں تھا۔ اب مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ذریعہ بے شک امن قائم ہوا تھا۔ مگر چونکہ اس چوہڑے کا جو تعلق اپنے باپ سے تھا وہ مہاراجہ رنجیت سنگھ سے نہیں تھا۔ اور سیاسی فوائد کو وہ سمجھنے کے قابل نہیں تھا اس لئے اس کے نزدیک سب سے بڑی رنج کی بات اپنے باپ کی تھی۔ اسی طرح کئی بادشاہ بڑے ظالم ہوئے ہیں۔ مثلاً ہلاکو خاں بڑا ظالم مشہور ہے۔ مگر جب ہلاکو خاں مرا ہو گا تو کیا تم سمجھتے ہو کہ اس کی بیوی اور بچوں کو دوسروں کی بیویوں اور بچوں سے کم صدمہ ہوا ہو گا۔ یقیناً انہیں ہلاکو خاں کی وفات پر ویسا ہی صدمہ ہوا ہو گا۔ جیسے نوشیروان عادل کی وفات پر اس کے بیوی بچوں کو ہوا تھا۔ حالانکہ نوشیرواں عدل کی وجہ سے مشہور ہے اور ہلاکو خان ظلم کی وجہ سے مگر دونوں کے بیوی بچوں کو یکساں صدمہ ہوا ہو گا۔ بلکہ ممکن ہے ہلاکو خاں کے بیوی بچوں کو احساسات کے زیادہ تیز ہونے کی وجہ سے نوشیرواں کے بیوی بچوں سے بھی زیادہ صدمہ ہوا ہو۔ مگر آسمان پر یہ بات نہیں جس طرح پیدائش پر دنیا میں سارے بندے خوش ہوتے ہیں گو کسی کی پیدائش پر تھوڑے لوگ خوش ہوتے ہیں اور کسی کی پیدائش پر زیادہ لوگ خوش ہوتے ہیں مگر آسمان پر یہ بات نہیں۔ وہاں کسی کی پیدائش پر خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے اور کسی کی پیدائش پر رنج کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح موت کا حال ہے۔ موت پر سب لوگ رنج کا اظہار کرتے ہیں گو کسی کی موت پر تھوڑے لوگ رنج کا اظہار کرتے ہیں اور کسی کی موت پر زیادہ لوگ رنج کا اظہار کرتے ہیں مگر

آسمان پر یہ بات نہیں۔ وہاں کسی کی موت پر رنج کا اظہار کیا جاتا اور کسی کی موت پر خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ پھر یہ جذبہ بھی اموات کے لحاظ سے نسبتی طور پر تقسیم ہو جاتا ہے اور فرشتوں کا رنج اور ان کی خوشی بعض دفعہ مرکب ہو جاتی ہے۔ یعنی فرشتے صرف رنج یا صرف خوشی کا اظہار نہیں کرتے بلکہ ان کی خوشی اور ان کا رنج ملا جلا ہوتا ہے۔ مثلاً جب کوئی بدقسمت اور گنہگار انسان مرتا ہے یا ایسا ظالم انسان مرتا ہے جس نے دنیا کے امن کو برباد کیا ہوا ہوتا ہے تو خدا تعالیٰ کے ملائکہ خوش بھی ہوتے ہیں کہ بندوں کو اس ظالم انسان سے نجات ملی۔ اور وہ رنج بھی کرتے ہیں کہ اپنے مولا کو راضی کرنے سے پہلے وہ شخص مر گیا۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کے بزرگ اور نیک لوگ فوت ہوتے ہیں اور دنیا میں ان کی وفات کی وجہ سے کہرام مچا ہوا ہوتا ہے تو خدا تعالیٰ کے فرشتے ان کی صحبت کے خیال سے خوشی منا رہے ہوتے ہیں۔ موت کیا ہے؟ موت اس دنیا سے اگلے جہان میں جانے کا ایک دروازہ ہے۔ جس طرح کوئی مصلح یا محسن انسان کسی شہر میں داخل ہوتا ہے تو وہاں کے رہنے والے خوشی مناتے ہیں۔ لیکن جب وہاں سے نکلتا ہے تو وہ رنج کا اظہار کرتے ہیں مگر آگے جب کسی دوسرے شہر میں داخل ہوتا ہے تو وہاں کے رہنے والے خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اسی طرح جب خدا تعالیٰ کے برگزیدہ اور چنیدہ لوگ جو اپنی نیکی اور تقویٰ اور مقامِ قرب میں ملائکہ سے بڑھ کر بلکہ ملائکہ کو سبق دینے والے ہوتے ہیں (جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ سے ظاہر ہے) وفات پا جاتے ہیں تو دنیا کے لوگ تو ان کی وفات پر رنج کا اظہار کرتے ہیں اور اس بات پر غمگین ہوتے ہیں کہ وہ اپنا دور ختم کر کے اگلے جہان چلے گئے۔ مگر فرشتے اس بات سے خوش ہوتے ہیں کہ اب وہ ہمارے ملک میں آ گئے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر جب مدینہ میں کہرام پڑا ہوا تھا۔ جنت کے لوگوں میں کتنی خوشی منائی جا رہی ہوگی۔

لوگ خدا اور اس کے فرشتوں کی زبان سے سنتے ہوں گے کہ خدا تعالیٰ کا ایک برگزیدہ دنیا میں پیدا ہو چکا ہے اور وہ بہت بلند روحانی مقامات رکھتا ہے۔ ان باتوں کو سن سن کر جنتیوں کے دلوں میں کتنی خواہش پیدا ہوتی ہوگی اور وہ کس طرح اس بات کے تصور سے خوش ہوتے ہوں گے کہ کبھی یہ مبارک انسان ہم میں بھی آئے گا۔ پس جب فرشتوں نے آپ کی روح قبض کی ہوگی اور جب جنتیوں کو پتہ لگا ہوگا کہ اب ان کی سالہا سال کی امیدیں بر آنے لگی ہیں تو انہوں نے کیسی خوشی ظاہر کی ہوگی۔ مگر بہرحال یہ آسمانی بات ہے زمین پر یہی ہوتا ہے کہ موت پر رنج کا اظہار کیا جاتا ہے جس طرح خدا تعالیٰ کی یہ دو صفات ہمیں دنیا میں کام کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اسی طرح کئی انسان ایسے ہوتے ہیں جو دنیا کے لئے ولادت کا موجب بنتے ہیں یا اس کی حیات کا موجب ہوتے رہتے ہیں مثلاً ماں باپ ہی ہیں وہ نئی نسلیں دنیا میں لاتے ہیں۔ ڈاکٹر اور اطباء ہیں وہ مریضوں کا علاج کرتے ہیں۔ اسی طرح قومی خدمات

کرنے والے لوگ ہیں۔ جو ڈوبتے ہوئے لوگوں کو بچاتے ہیں۔ کہیں آگ لگ جائے تو بجھاتے ہیں۔ اسی طرح اور کئی واقعات اور حادثات جو رونما ہوتے رہتے ہیں ان میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ یہ لوگ خدا کی صفت محیؔ کے مورد ہوتے ہیں۔ اور اس کا ایک نمونہ ہوتے ہیں۔ لیکن کئی لوگ دنیا میں ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا کام ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ تباہیاں اور بربادیاں اور ہلاکتیں لاتے رہیں۔ کہیں ان کی وجہ سے قتل ہو رہے ہوتے ہیں۔ کہیں فساد ہو رہے ہوتے ہیں۔ کہیں غارت گری کے واقعات رونما ہو رہے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ خدا تعالیٰ کی صفت ممیتؔ کو ظاہر کرنے والے ہوتے ہیں۔ مگر خدا تعالیٰ کی ہر صفت کی نقل کرنے والا انسان ضروری نہیں کہ خدا تعالیٰ کا مقبول ہو۔ خدا بیشک مُمِیتؔ ہے مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک قاتل کسی کو بلا وجہ قتل کر دے تو وہ یہ کہے کہ میں نے چونکہ فلاں شخص کو قتل کر کے خدا تعالیٰ کی صفت ممیتؔ کا اپنے آپ کو مظہر ثابت کیا ہے اس لئے میں بڑا مقرب ہوں۔ اگر وہ ایسا کہے گا تو اس کا دعویٰ بالکل غلط ہوگا کیونکہ بندے کو جن حالات میں ممیتؔ بننے کا حق حاصل ہے ان حالات میں اگر وہ ممیتؔ بنتا ہے تب تو وہ بے شک خدا تعالیٰ کا مقرب بن سکتا ہے۔ لیکن اگر ان حالات میں ممیتؔ نہیں بنتا تو وہ مقرب نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح ولادت خدا تعالیٰ کی احیاء کی صفت ہے مگر ناجائز ولادت کا موجب خدا تعالیٰ کی صفتِ محیؔ سے نسبت دے کر اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کا مقرب نہیں کہہ سکتا۔ صرف وہی شخص خدا تعالیٰ کی صفت محیؔ یا ممیتؔ کو پورا کرنے والا قرار پاسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے قوانین کے ماتحت ان صفات کا مظہر بنتا ہے۔ اگر وہ خدا تعالیٰ کے بنائے ہوئے قانون کے ماتحت محی بنتا ہے تو بے شک وہ خدا تعالیٰ کا اس صفت میں مظہر بن سکتا ہے۔ اسی طرح اگر وہ خدا تعالیٰ کی صفت ممیت کا مظہر اس رنگ میں بنتا ہے جو خدا تعالیٰ کے بنائے ہوئے قواعد کے مطابق ہو۔ تو خدا تعالیٰ کا مقرب ہوسکتا ہے ورنہ نہیں۔ چنانچہ دیکھ لو جس وقت جہاد ہوتا ہے۔ دونوں فریق ایک سا کام کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ بھی تلوار چلا رہا ہوتا ہے اور یہ بھی تلوار چلا رہا ہوتا ہے۔ کافر مومن کو مارتا ہے اور مومن کافر کو مارتا ہے۔ پس بظاہر ان دونوں کا فعل یکساں ہوتا ہے مگر جب کافر کی تلوار سے ایک مومن گرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا عرش کانپ جاتا ہے اور فرشتے اس کافر پر لعنتیں ڈالتیں ہیں۔ لیکن جب کسی مومن کی تلوار سے ایک کافر گرتا ہے تو فرشتے خوش ہوتے ہیں اور مومن پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں نازل کرتے ہیں۔ حالانکہ فعل ایک ہوتا ہے مقام ایک ہوتا ہے اور ذریعہ قتل ایک ہوتا ہے۔ مگر ایک کے فعل پر تو برکتیں اور رحمتیں نازل ہوتی ہیں اور دوسرے کے فعل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے لعنتیں اور ملامتیں نازل ہوتی ہیں۔ پس اپنی ذات میں ممیتؔ ہونا یا محیؔ ہونا کوئی اچھی یا بری بات نہیں۔ اگر محیؔ ہونا خدا تعالیٰ کے قانون کے ماتحت ہو تو اچھا ہوتا ہے۔ اگر ممیتؔ ہونا خدا تعالیٰ کے قانون کے ماتحت ہو تو اچھا ہوتا ہے لیکن اگر ممیتؔ یا محیؔ ہونا

خدا تعالیٰ کے مقرر کردہ قانون کے خلاف ہو تو یہی بات بری بن جاتی ہے۔

پس اسلام یہ سکھاتا ہے کہ اپنے کاموں کو ہمیشہ خدا تعالیٰ کی رضا کے ماتحت رکھنے کی کوشش کرو۔ اور اس بات سے عبرت حاصل کرو کہ دنیا میں لوگ محی ہو کر بھی ظالم ہوتے ہیں اور ممیت ہو کر بھی ظالم ہوتے ہیں۔ کئی ایسے ہیں جو احیاءؔ کے سامان کر رہے ہیں مگر پھر بھی وہ ظالم ہیں اور کئی ایسے ہیں جو اماتت کے سامان کر رہے ہیں مگر پھر بھی وہ ظالم ہیں۔ لیکن مومن کی یہ حالت نہیں ہوتی وہ محی بنتا ہے تب بھی اس پر رحم کیا جاتا ہے اور ممیت بنتا ہے تب بھی اس پر رحم کیا جاتا ہے۔ وہ قتل کرتا ہے تب بھی اسے ثواب ملتا ہے اور پیدائش کا موجب بنتا ہے تب بھی اسے ثواب حاصل ہوتا ہے۔ پس ایسے انسان بننے کی کوشش کرو تا کہ تم سے کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہو جس کے نتیجہ میں تمہیں خدا تعالیٰ کی رضا حاصل نہ ہو۔

ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں ایٹم بم کی ایجاد کی وجہ سے بڑی بڑی حکومتیں پریشان ہیں اور وہ چاہتی ہیں کہ اس کا کوئی توڑ پیدا ہو تا کہ دنیا اس کے تباہ کن نتائج سے محفوظ ہو سکے۔ لیکن دوسری طرف اگر ہم غور کریں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ خدا تعالیٰ بھی ہمیشہ ایٹم بم گراتا رہتا ہے اور ہر سال دنیا میں پچاس ساٹھ لاکھ انسان مر جاتے ہیں۔ بلکہ جب کبھی وبائیں پڑتی ہیں تو اس سے بھی زیادہ انسان مر جاتے ہیں۔ اور کروڑ ڈیڑھ کروڑ تک یہ تعداد جا پہنچتی ہے مگر ساتھ ہی ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے اس فعل سے دنیا میں کبھی گھبراہٹ پیدا نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ خدا تعالیٰ جہاں اپنے ایٹم بم (یعنی طبعی موت) سے لاکھوں کروڑوں انسانوں کو مارتا ہے وہاں اتنی ہی تعداد کو پیدا بھی کر دیتا ہے۔ اور اس کے پاس اگر مارنے کی طاقت ہے تو زندہ کرنے کی طاقت بھی موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کے سالانہ مرنے کے لوگوں میں گھبراہٹ کے آثار پیدا نہیں ہوتے۔ وہ جانتے ہیں کہ ہمارا خدا مُحْیِی بھی ہے اور ممیت بھی ہے۔ وہ مارنا بھی جانتا ہے اور پیدا کرنا بھی جانتا ہے۔ مگر اب ایٹم بم یا اسی قسم کی اور ایجادات کے ذریعہ موت ایسے لوگوں کے قبضہ میں آئی ہے جو صرف مارنا ہی جانتے ہیں جلانا نہیں جانتے۔ اسی لئے لوگ ایسی چیزوں سے گھبرا اٹھتے ہیں۔ ورنہ دنیا میں لوگ یوں بھی تو مرتے رہتے ہیں لیکن کسی کو گھبراہٹ نہیں ہوتی۔ کسی عزیز رشتہ دار کے مرنے پر اس کے لواحقین دو چار روز تک رو دھو کر چپ ہو جاتے ہیں اور تھوڑا عرصہ ہی گذرتا ہے کہ اسی گھر میں جہاں سے تھوڑا عرصہ پہلے ماتم اور چیخ و پکار کی آوازیں آتی تھیں ڈھول اور باجے بج رہے ہوتے ہیں اور کسی خوشی کی تقریب کا انتظام ہو رہا ہوتا ہے۔ غرض عزیز سے عزیز وجود کے مرنے پر بھی اس کے متعلقین میں جو گھبراہٹ پیدا ہوتی ہے وہ عارضی ہوتی ہے جو تھوڑے دنوں تک بالکل مفقود ہو جاتی ہے۔ مگر

دیکھ لو ایٹم بم سے دنیا کتنی گھبرائی ہوئی ہے اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ اس کے ساتھ موت تو واقع ہوسکتی ہے مگر پیدائش کا کوئی انتظام نہیں۔ اگر اس کیساتھ پیدائش کا بھی انتظام ہوتا تو اتنی گھبراہٹ کبھی نہ ہوسکتی۔ ہندوؤں میں ایک فرقہ ہے جس میں شامل ہونے والے لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ برہماؔ جی پیدا کرتے ہیں اور شِو جیؔ مارتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں برہما جیؔ کے مندر نہیں ہیں اور شِو جیؔ کے بہت سے مندر ہیں۔ برہما جیؔ کا سارے ہندوستان میں صرف ایک مندر ہے۔ کہتے ہیں اس فرقہ سے تعلق رکھنے والے ایک راجہ کے ہاں اولاد نہیں ہوتی تھی۔ اس راجہ نے اپنے وزراء سے مشورہ کیا کہ میرے ہاں اولاد نہیں ہوتی کیا کرنا چاہیئے۔ وزراء نے مشورہ دیا کہ آپ برہما کی پرستش کریں لڑکا پیدا ہوگا۔ راجہ نے پرستش شروع کردی اور ساتھ ہی نذر نیاز بھی مانی اور کہا اے برہما! اگر میرے گھر میں بیٹا ہوا تو میں اپنے راج میں سب لوگوں سے صرف تیری ہی پرستش کرواؤں گا اور شِو جیؔ کی پرستش چھڑا دوں گا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد اس کے گھر میں بیٹا پیدا ہوا۔ اور اس نے شِو جیؔ کی پرستش سے تمام رعایا کو منع کردیا اور برہماؔ جی کی پرستش شروع کرادی۔ کوئی عقلمند راجہ اسے آکر ملا اور اس نے کہا کہ تمہارا جتنا کام برہماؔ جی کے ساتھ تھا وہ تو پورا ہوگیا اور بیٹا پیدا ہوگیا۔ اس لئے بہتر ہے کہ اب شو جیؔ مہاراج کی پوجا کی جائے تا کہ وہ غصہ میں آکر لڑکے کی جان نہ نکال لے۔ راجہ نے اس بات کو سمجھ لیا اور کہا اچھا آئندہ شو جیؔ کی پرستش کی جایا کرے تا کہ میرا لڑکا زندہ رہے۔ چنانچہ شو جیؔ کی پوجا شروع ہوگئی اور برہماؔ جی کو بھلا دیا گیا۔ لڑکا جب بڑا ہوا تو اس نے کسی کی زبانی یہ سارا واقعہ سنا کہ مجھے برہما جیؔ مہاراج نے پیدا کیا تھا اور اب میرے والد نے برہما جیؔ کو چھوڑ کر شو جیؔ کی پوجا شروع کردی ہے۔ اس لڑکے کے اندر اخلاقی جرأت تھی۔ اس نے سوچا کہ احسان کرنے والے کے احسان کی قدر ہونی چاہیئے تھی۔ اس لئے اس نے فیصلہ کیا کہ میں تو برہما جیؔ کی ہی پوجا کروں گا۔ جب راجہ نے اپنے بیٹے کا یہ رویہ دیکھا تو اس کو فکر ہوا کہ اگر میرے لڑکے نے برہما جی کی پوجا کی تو شو جی ناراض ہوجائیں گے اور اس کی جان نکال لیں گے۔ چنانچہ راجہ نے اپنے بیٹے کو ڈانٹا کہ برہما جیؔ کی پوجا چھوڑ دو۔ لڑکے نے کہا۔ میں برہما جیؔ کا احسان فراموش نہیں ہوسکتا۔ کچھ مدت باپ بیٹے کا اسی طرح جھگڑا چلتا رہا۔ جب کسی کے دل میں ضد پیدا ہوجاتی ہے تو وہ روکنے سے اور بھی بڑھتی ہے۔ بیٹے کے دل میں بھی ضد بڑھتی گئی اور باپ کے دل میں بھی بڑھتی گئی۔ آخر باپ نے ناراض ہوکر کہا۔ اے شو جی! اس کی جان نکال لے۔ شو جیؔ نے لڑکے کی جان نکال لی۔ اس پر برہما جیؔ شو جیؔ پر سخت ناراض ہوئے اور کہا اس کی جان کیوں نکالی گئی ہے۔ اور انہوں نے پھر اس کو زندہ کردیا مگر شو جی نے دوبارہ اس کی جان نکال لی اور برہما جی نے پھر اس کو زندہ کردیا۔ اس طرح دیوتاؤں میں لڑائی شروع ہوگئی۔ یہ تو ہندوؤں کا عقیدہ ہے۔

مگر درحقیقت بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے اندر دو طاقتیں ہیں۔ ایک طاقت مارتی ہے اور دوسری پیدا کرتی ہے۔ اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو مارنے کی طاقت تو دے دی ہے مگر پیدا کرنے کی طاقت نہیں دی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا گھبرا اٹھی ہے اور جن ممالک کے پاس ایٹم بم نہیں ہیں وہ ہر وقت سہمے ہوئے اور خوفزدہ رہتے ہیں اور دنیا کے کونے کونے سے آوازیں آتی رہتی ہیں کہ ایٹم بم کو لڑائی میں استعمال نہ کیا جائے مگر میں سمجھتا ہوں کہ ایٹم بم دنیا کو توجہ دلاتا ہے کہ انسانوں کے ہاتھ میں آئی ہوئی طاقت کس قدر تباہ کن اور ہلاکت خیز ثابت ہوتی ہے اور انسان اس طاقت کو کس طرح بے موقع اور بے محل استعمال کر کے ہزاروں اور لاکھوں انسانوں کو تباہ و برباد کر دیتا ہے اور پھر اسی پر بس نہیں کرتا بلکہ وہ یہ بھی کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح اس کو اور بھی زیادہ مہلک بناؤں تا کہ وہ پہلے سے بھی بڑھ کر تباہی مچا سکے اور زیادہ سے زیادہ انسانوں کو تھوڑے سے تھوڑے وقت میں موت کے گھاٹ اتارا جا سکے۔ حالانکہ یہی چیز اگر جائز طریق سے برمحل اور باموقعہ استعمال کی جائے تو بنی نوع انسان کے لئے حد درجہ مفید ہو سکتی ہے۔ بہرحال اس گھبراہٹ کا علاج صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ اس خدا کی طرف رجوع کیا جائے جو مارنا بھی جانتا ہے اور جلانا بھی جانتا ہے۔ اس کے پاس یہ دونوں طاقتیں موجود ہیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہی فرمایا ہے کہ ہمارا خدا محیی بھی ہے اور ممیت بھی ہے۔ پس اسی کے ساتھ تعلق رکھنا چاہیے جو لاکھوں کو مارتا ہے مگر کسی کے دل میں گھبراہٹ پیدا نہیں ہوتی۔ کسی گھر میں ایک آدمی مر جاتا ہے تو اس کے لواحقین دو چار دن تک اس پر رو دھو کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ مگر تھوڑے دن نہیں گذرتے کہ اسی گھر میں کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو مبارک مبارک کے الفاظ کہے جا رہے ہوتے ہیں اور یہ سب کچھ خدا کے اختیار میں ہے۔ اس لئے ہمیں بھی خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ اور اسی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔ انسان کی طاقتیں صرف سطحی ہوتی ہیں۔ جب تک خدا تعالیٰ کا منشاء اس دنیا کو قائم رکھنے کا ہے۔ اس وقت تک ایٹم بم کچھ نہیں کر سکتا۔ بلکہ خدا ان سب مارنے والوں کو بھی مار سکتا ہے اور ایسے سامان بھی پیدا کر سکتا ہے جن سے یہ ایٹم بم سب بے کار ہو کر رہ جائیں۔ پس انسان کو ان تمام باتوں سے بے نیاز ہو کر روحانیت کی طرف متوجہ ہونا چاہیے اور صرف خدا تعالیٰ کی پرستش کرنی چاہیے۔ جو ممیت تو ہے مگر ساتھ ہی محیی بھی ہے یعنی گو وہ مارتا بھی ہے مگر پھر وہ زندہ بھی کرے گا۔ اور اس طرح موت کے بعد بھی اس کی طرف سے خیر ہی خیر آئے گی۔ موت کا ایک عارضی زمانہ ہوگا اور آخر میں انسان کے لئے صرف حیات ہی حیات رہ جائے گی۔

پھر فرماتے ہیں وَالَّذِیۡۤ اَطۡمَعُ اَنۡ یَّغۡفِرَ لِیۡ خَطِیۡٓـَٔتِیۡ یَوۡمَ الدِّیۡنِ میرا رب وہ ہے جس کے متعلق مجھے امید ہے کہ وہ نتائج کے ظہور کے وقت میری کمزوریوں پر پردہ ڈالتے ہوئے اپنا فضل میرے شاملِ حال رکھے گا اور مجھے

کامیابی اور کامرانی عطا فرمائے گا۔

اس آیت میں جو غفر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس کے معنے صرف گناہوں کی معافی کے نہیں بلکہ کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کے بھی ہیں۔ چنانچہ عربی زبان میں جب غَفَرَ الشَّيْءَ غَفْرًا کہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں۔ سَتَرَہٗ کسی چیز کو ڈھانپ دیا۔ اور جب غَفَرَ الْمَتَاعَ فِي الْوِعَاءِ کہا جائے تو اس کے معنے ہوتے ہیں اَدْخَلَہٗ وَسَتَرَہٗ سامان کو کسی ٹرنک یا تھیلے میں بند کر کے محفوظ کر دیا۔ اور جب کسی کے متعلق غَفَرَ اللّٰہُ ذَنْبَہٗ کے الفاظ استعمال کئے جائیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں غَطّٰی عَلَیْہِ وَعَفَا عَنْہ۔ خدا تعالیٰ نے اس کے قصور کو ڈھانپ دیا اور اس کی کمزوریوں پر پردہ ڈال دیا (اقرب) اسی طرح خَطِیْئَۃٌ کا لفظ إِثْمٌ کے مقابلہ میں اپنے اندر عمومیت رکھتا ہے یعنی إِثْمٌ کا لفظ تو صرف ایسے قصور کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جو عمداً اور ارادۃً کیا جائے لیکن خطیئۃ کا لفظ ان بشری کمزوریوں کے لئے بھی استعمال کر لیا جاتا ہے جن میں ارادہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اسی طرح یَوْمٌ کا لفظ صرف دن کے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ وقت اور زمانہ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں بعض جگہ یومٌ کا لفظ ایک ہزار سال (سورۃ السجدۃ ع ۱) کے لئے اور بعض جگہ پچاس ہزار سال (سورۃ المعارج ع ۱) کے لئے استعمال کیا گیا ہے محاورۂ عرب میں بھی یَوْمٌ زمانہ اور وقت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے ؎

یَوْمَاہُ یَوْمُ نَدًی وَیَوْمُ طِعَانٖ

(لسان العرب و تاج العروس)

یعنی اس شخص کے دو ہی یوم ہیں۔ ایک سخاوت کرنے کا یوم اور ایک نیزہ مارنے کا یوم۔ اس جگہ یوم وقت کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے اور شاعر اپنے ممدوح کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس کی زندگی کے کام صرف دو حصوں میں تقسیم ہیں۔ اس کا کچھ وقت تو سخاوت کے کاموں میں خرچ ہوتا ہے اور کچھ وقت لڑائی میں بسر ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک حدیث میں آتا ہے کہ تِلْكَ اَيَّامُ الْهَرْجِ (ابو داؤد کتاب الفتن و الملاحم باب النھی عن السعی فی الفتنۃ) یہ فتنہ کے ایام ہیں اور مراد یہ ہے کہ یہ فتنہ کے اوقات ہیں۔ اس جگہ بھی یوم وقت اور زمانہ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ باقی رہا دین کا لفظ سو اس کے بھی عربی زبان میں کئی معانی ہیں۔ دین کا لفظ اطاعت کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جزاء اور مطابق عمل نتیجہ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ قضا اور فیصلہ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ملّت کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ حساب کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

غلبہ اور تفوق کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔حکومت اور بادشاہت کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ تدبیر کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔عادت کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔طریق عبادت کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔پرہیزگاری کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔حال کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔بلند شان کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔سیرۃ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔(اقرب و لسان) پس یَوْمُ الدِّیْنِ کے معنی صرف قیامت کے نہیں کہ اس دعا کو آخری جزاءسزا کے دن کے لئے مخصوص سمجھا جائے بلکہ جیسا کہ اوپر بتایا جاچکا ہے دین کے ایک معنے جزاء اور مطابق عمل نتیجہ کے بھی ہوتے ہیں۔پس حضرت ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں کہ مجھے اپنے رب پر امید ہے کہ جب میرے اعمال کا نتیجہ نکلے گا تو وہ میری کمزوریوں پر پردہ ڈالتے ہوئے اپنی رحمت میرے شامل حال رکھے گا۔اور مجھے اپنے مقصد میں کامیابی عطا فرمائے گا۔

وہ لوگ جو روحانیت سے بے بہرہ ہوتے ہیں یہ خیال کر لیتے ہیں کہ انسان اسی صورت میں مغفرت کا طلبگار ہوتا ہے جب کہ وہ گناہ آلود زندگی بسر کر رہا ہو۔مگر یہ خیال ان کی عربی زبان سے کلی ناواقفیت اور روحانی کوچہ سے قطعی طور پر ناآشنا ہونے کا ثبوت ہے حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان اس بات کا محتاج ہے کہ خدا اسے اپنے نور سے حصہ عطا فرمائے۔اسے اپنی طاقت سے طاقت بخشے اور اپنے علم سے علم عطا کرے جس طرح انسانی آنکھ سورج کی روشنی کے بغیر بیکار ہے اور انسانی کان ہوا کے توسط کے بغیر دوسرے کی آواز سننے کی طاقت نہیں رکھتے۔اسی طرح ہر انسان خواہ وہ خدا تعالیٰ کا نبی اور رسول ہی کیوں نہ ہو خدائی طاقت اور اس کی مدد کا محتاج ہوتا ہے۔اسی لئے اسلام نے سکھایا ہے کہ ہر انسان پانچ وقت نماز کی ہر رکعت میں خدا تعالیٰ سے یہ کہے کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ یعنی اے خدا! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں مگر یہ کام ایسا ہے جس میں صرف ہماری کوشش اور ارادہ ہمیں کامیاب نہیں کرسکتا بلکہ اس میں کامیابی صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب ہماری کوشش کے ساتھ تیری مدد بھی شامل ہوجائے۔جب یہ دونوں چیزیں مل جائیں گی۔تب کوئی نتیجہ پیدا ہوگا ورنہ محض ہماری کوشش کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرسکتی۔انہی معنوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں اپنی طاقت کے مطابق تو خدا تعالیٰ کی توحید پھیلانے کے لئے رات اور دن جدوجہد کررہا ہوں مگر میری یہ جدوجہد اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی نصرت کے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتی اس لئے میں اسی سے مدد کا طلبگار رہوں۔اور میں امید رکھتا ہوں کہ جب ان کوششوں کے نتائج کا ظہور ہوگا تو اس وقت اللہ تعالیٰ میری حقیر کوششوں میں برکت پیدا فرمائے گا اور اگر کوئی خامی بشریت کی وجہ سے میرے کاموں میں رہ بھی گئی تو اس کمی کو اللہ تعالیٰ کا فضل پورا فرمادے گا اور مجھے اپنے مقصد میں کامیابی عطا فرمائے گا۔

پھر جیسا کہ اوپر بتایا جاچکا ہے دین کے ایک معنے غلبہ کے بھی ہوتے ہیں۔اس لحاظ سے وَالَّذِیۡۤ اَطۡمَعُ اَنۡ یَّغۡفِرَ لِیۡ خَطِیۡٓئَتِیۡ یَوۡمَ الدِّیۡنِ کے یہ معنے ہوں گے کہ میں امید رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس سلسلہ روحانیہ کی ترقی کے زمانہ میں بھی جس کی ترویج میرے ہاتھ سے ہو رہی ہے میری بشری کمزوریوں کو نظرانداز کرتے ہوئے ایسے سامان پیدا فرمائے گا کہ جن کے نتیجہ میں تبلیغ اور تربیت کا سلسلہ جاری رہے گا اور اس کے دین کی کشتی ہر قسم کے حوادث کے تھپیڑوں سے بچتی ہوئی ساحلِ مراد پر کامیابی سے پہنچ جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہبی جماعتوں کا غلبہ جہاں اپنے اندر بڑی بھاری بشارت رکھتا ہے۔وہاں یہ غلبہ اپنے اندر ایک انذار کا پہلو بھی لئے ہوئے ہوتا ہے کیونکہ اس وقت ہزاروں ہزار لوگ سلسلہ روحانیہ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اور چونکہ انہوں نے خدا تعالیٰ کے دین کے لئے کسی قسم کی تکلیف برداشت نہیں کی ہوتی اور پھر وہ مذہبی تعلیم سے بھی بہت حد تک ناواقف ہوتے ہیں اس لئے ان کے اندر کئی قسم کے بگاڑ پیدا ہو جاتے ہیں۔وہ منہ سے تو بے شک ہر قسم کے عقائد کا اظہار کرتے ہیں مگر ان کا عمل اپنے دعویٰ کے مطابق نہیں ہوتا اور وہ دین میں داخل ہوتے ہوئے بھی دین کی عائد کردہ پابندیوں سے اپنے آپ کو آزاد سمجھتے ہیں۔ اور اس طرح قومی تنزل کا بیج پرورش پانے لگتا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اپنی معرفت کی آنکھ سے اس بیج کو دیکھا اور انہوں نے اس کے ازالہ کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرنی شروع کر دیں اور ساتھ ہی اس امید کا بھی اظہار کیا کہ میرا رب میرا ساتھ دے گا۔اور وہ میری اس بشری کمزوری کو نظرانداز کرتے ہوئے کہ کوئی ایک انسان ہزاروں لوگوں کی تربیت نہیں کر سکتا اپنے فضل سے خود ہی ایسے سامان پیدا فرما دے گا کہ جن کے نتیجہ میں آنے والوں کی تربیت ہوتی رہے اور وہ اخلاص اور فدائیت کی روح کے ساتھ اس کے دین کے جھنڈے کو ہمیشہ بلند رکھیں۔

رَبِّ هَبۡ لِیۡ حُكۡمًا وَّ اَلۡحِقۡنِیۡ بِالصّٰلِحِیۡنَ ﴿۸۴﴾ وَ اجۡعَلۡ

اے میرے رب! مجھے صحیح تعلیم عطا کر۔اور نیکوں میں شامل کر۔اور بعد میں آنے والے

لِّیۡ لِسَانَ صِدۡقٍ فِی الۡاٰخِرِیۡنَ ﴿۸۵﴾ وَ اجۡعَلۡنِیۡ مِنۡ وَّرَثَةِ

لوگوں میں ایک ہمیشہ قائم رہنے والی تعریف مجھے بخش۔اور مجھے نعمتوں والی جنت کے وارثوں میں سے بنا۔

جَنَّةِ النَّعِيمِ ﴿۸۶﴾ وَاغْفِرْ لِأَبِيْٓ إِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۸۷﴾

اور میرے باپ کو معاف کردے وہ بھٹک جانے والوں میں سے تھا۔اور جس دن لوگ زندہ

وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۸۸﴾ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا

کر کے اٹھائے جائیں مجھے اس دن رسوانہ کیجیو۔جس دن کہ نہ مال نفع دے گا نہ بیٹے (نفع دیں گے)۔ہاں

بَنُوْنَ ﴿۸۹﴾ إِلَّا مَنْ أَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿۹۰﴾

(وہی نفع پائے گا) جو اللہ (تعالیٰ) کے پاس ایک تندرست دل لے کر آئے گا۔

حلّ لُغَات۔ اَلْحُكْمُ اَلْحُكْمُ بِالشَّيْءِ کے معنے ہیں اَنْ تَقْضِيَ بِأَنَّهٗ كَذَا اَوْلَيْسَ بِكَذَا سَوَاءٌ اَلْزَمْتَ ذٰلِكَ غَيْرَكَ اَوْلَمْ تُلْزِمْهُ یعنی کسی امر کے متعلق یہ فیصلہ کرنا کہ اس کی صحیح صورت کیا ہے۔خواہ وہ بات دوسروں پر واجب کی جائے یا نہ کی جائے۔وَالْحُكْمُ اَعَمُّ مِنَ الْحِكْمَةِ فَكُلُّ حِكْمَةٍ حُكْمٌ۔یعنی عربی زبان میں دو لفظ استعمال ہوتے ہیں ایک حُکْم ہے اور دوسرا اَلْحِكْمَةُ ہے اور حُكْمٌ کا لفظ عام ہے اس لئے اس کے ماتحت حکمت کے سارے معنے آجاتے ہیں۔(مفردات)

اَلْحِكْمَةُ کے معنے ہیں اِصَابَةُ الْحَقِّ بِالْعِلْمِ وَ الْعَقْلِ یعنی درست بات کو علم اور عقل سے معلوم کر لینا اور پالینا (مفردات)

اقرب الموارد میں ہے۔اَلْحِكْمَةُ۔ اَلْعَدْلُ وَ الْعِلْمُ وَالْحِلْمُ وَالنُّبُوَّةُ۔یعنی حکمت کے معنے انصاف۔علم۔بردباری اور نبوت کے ہیں۔اسی طرح اس کے معنے ہیں مَا يَمْنَعُ مِنَ الْجَهْلِ ہر وہ بات جو جہالت سے روکے۔وَقِيْلَ كُلُّ كَلَامٍ مُوَافِقٍ الْحَقِّ ہر وہ بات جو حق کے مطابق ہو اس کو بھی حکمت کہتے ہیں۔وَقِيْلَ وَضْعُ الشَّيْءِ فِيْ مَوْضِعِهٖ وَصَوَابُ الْاَمْرِ وَسِدَادُهٗ۔اور بعض ماہرین لغت کہتے ہیں کہ کسی چیز کا برمحل استعمال حکمت کہلاتا ہے۔(اقرب)

لِسَانَ صِدْقٍ لِسَانَ صِدْقٍ مفردات میں ہے کہ يُعَبَّرُعَنْ كُلِّ فِعْلٍ فَاضِلٍ ظَاهِرًا وَبَاطِنًا بِالصِّدْقِ ہر وہ امر جو ظاہری اور باطنی لحاظ سے اعلیٰ درجہ کا ہو اس کے ساتھ صدق کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔اور یہ جو حضرت ابراہیمؑ کی دعا آتی ہے کہ وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ اس سے یہ مراد ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ ایسا بنائے کہ آنے

والی نسلیں جو ہمارا ذکر خیر کریں تو وہ درست ہو اور خلاف واقعہ نہ ہو (مفردات) اقرب الموارد میں ہے کہ لِسَانُ الصِّدْقِ اچھے ذکر کو کہتے ہیں۔

سَلِیْمٌ سَلِیْمٌ السَّلَامَۃُ کے معنی ہیں اَلتَّعَرِّیْ مِنَ الْاٰفَاتِ الظَّاھِرَۃِ وَالْبَاطِنَۃِ۔ظاہری اور باطنی ہر قسم کی خرابیوں سے پاک ہونا (مفردات) پس قلبِ سلیم کے معنے ہوں گے۔ایسا دل جو ہر قسم کی خرابیوں سے پاک ہو۔

تفسیر ۔حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چونکہ اللہ تعالیٰ پر ایک بہت بڑی امید کا اظہار کیا تھا۔اس لئے آپ نے سمجھا کہ اب میرا فرض ہے کہ میں خود بھی اس کے آستانہ پر جھک جاؤں اور اس سے دعا کروں کہ وہ میری اس خواہش کی تکمیل کے سامان پیدا فرمائے اور مجھے ایسی توفیق بخشے کہ میں اس کے پیغام کو احسن طریق پر لوگوں کو پہنچاتا چلا جاؤں ۔چنانچہ آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی کہ اے میرے رب ! مجھے حکم عطا فرما اور مجھے نیک اور پاک لوگوں میں شامل کردے۔

حُکم کے اصل معنے جیسا کہ امام راغبؒ نے اپنی مشہور کتاب مفردات میں لکھا ہے اصلاح کی خاطر کسی کام سے روکنے کے ہوتے ہیں۔اسی وجہ سے جانور کی لگام کو حَکَمَۃٌ کہتے ہیں کیونکہ اس کے ذریعہ جانور کو روکا جاتا ہے۔ اور اَلْحُکْمُ بِالشَّیْءِ کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ کسی امر کے متعلق یہ فیصلہ کرنا کہ اسے کس طرح سرانجام دیا جائے خواہ وہ بات دوسروں پر واجب کی جائے یا نہ کی جائے۔لیکن اس کے ساتھ ہی حکم کا لفظ صرف کسی فیصلہ پر دلالت نہیں کرتا بلکہ اس بات پر بھی دلالت کیا کرتا ہے کہ اس کے پیچھے کوئی معقول وجہ کام کر رہی ہے۔چنانچہ اسی سے حکمت کا لفظ نکلا ہے جس کے معنے فلسفہ کے ہیں۔پس حکم کا لفظ صرف زور اور طاقت کے ساتھ کوئی بات منوانے کے لئے نہیں آتا بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ اس کے پیچھے کوئی اہم مقصد کام کر رہا ہے اور اس پر عمل کرنے میں خود انسان کا اپنا فائدہ ہے بلا سوچے سمجھے محض اپنی حکومت جتانے کے لئے کوئی حکم نہیں دیا گیا۔چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بعثت کا اہم مقصد خدا تعالیٰ کی وحید پھیلانا ہے۔اور اس مقصد کے حصول میں اسی صورت میں کامیابی ہوسکتی تھی۔جبکہ آپ کی ہر بات حکمت کے ساتھ تعلق رکھتی ہو اور وہ دلوں کی گہرائیوں میں اتر جانے والی ہو۔اس لئے آپ نے خدا تعالیٰ سے دعا کی کہ اے الٰہی ! تو مجھے ایسی تعلیم عطا فرما جس کی کوئی بات حکمت کے خلاف نہ ہوتا کہ لوگ اس کو بشاشت قلب کے ساتھ قبول کریں اور اشاعت ہدایت کے راستے کھلتے چلے جائیں۔

مفسرین میں سے بعض نے اس جگہ حکم سے نبوت اور رسالت مراد لی ہے۔بعض نے کہا ہے کہ اس جگہ حکم سے علم و فہم مراد ہے بعض نے کہا ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے احکام کی معرفت مراد ہے اور بعض نے کہا

ہے کہ اس جگہ حکم سے مراد لوگوں کے درمیان سچائی کے ساتھ فیصلہ کرنے کی طاقت ہے۔ یہ تمام توجیہات صرف اس وجہ سے کی گئی ہیں کہ مفسرین نے سیاق کلام کو مدنظر نہیں رکھا اور جو کچھ کسی کے ذہن میں آیا وہ اس نے معنے کر دیئے۔ اصل بات یہ ہے کہ قرآن کریم میں حکم کا لفظ مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔ بعض جگہ حکم کا لفظ حکومت اور غلبہ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْکِتٰبَ وَ الْحُکْمَ وَ النُّبُوَّۃَ (الجاثیۃ:۱۷) ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکومت اور نبوت بخشی تھی۔ اسی طرح فرماتا ہے۔ مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَہُ اللّٰہُ الْکِتٰبَ وَ الْحُکْمَ وَ النُّبُوَّۃَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ کُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ (آل عمران:۸۰)۔ کسی انسان کے یہ شایان شان نہیں کہ اللہ تعالیٰ تو اسے کتاب اور حکومت اور نبوت دے اور وہ یہ کہنے لگ جائے کہ تم خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ۔

بعض جگہ حکم کا لفظ فیصلہ کرنے کی فراست کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ۔ وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّہٗٓ اٰتَیْنٰہُ حُکْمًا وَّ عِلْمًا (یوسف:۲۳)۔ جب وہ اپنی قوت اور مضبوطی کی عمر کو پہنچا تو ہم نے اسے فیصلہ کرنے کی فراست بخشی اور اپنے پاس سے علم عطا فرمایا۔

بعض جگہ حکم کا لفظ صرف فیصلہ کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَفَحُکْمَ الْجَاہِلِیَّۃِ یَبْغُوْنَ (مائدۃ:۵۱) کیا یہ لوگ کلام الٰہی کے نازل ہونے سے پہلے کے فیصلہ کو پسند کرتے ہیں؟ یا فرماتا ہے اَلَا لَہُ الْحُکْمُ وَ ھُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِیْنَ (انعام:۶۳) اچھی طرح سن لو کہ فیصلہ اسی کے اختیار میں ہے اور وہ حساب لینے والوں میں سے سب سے جلدی حساب لینے والا ہے۔

بعض جگہ حکم کا لفظ احکام الٰہیہ اور تعلیم مذہبی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ کَیْفَ یُحَکِّمُوْنَکَ وَ عِنْدَھُمُ التَّوْرٰىۃُ فِیْھَا حُکْمُ اللّٰہِ (مائدۃ:۴۴) وہ لوگ تجھے کس طرح حکم بنا سکتے ہیں جبکہ ان کے پاس تورات موجود ہے جو خود ان کے نزدیک احکام الٰہی اور مذہبی تعلیم پر مشتمل ہے۔

بعض جگہ حکم کا لفظ عہدہ نبوت کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ فَوَھَبَ لِیْ رَبِّیْ حُکْمًا وَّ جَعَلَنِیْ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ (شعراء:۲۲) اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم یعنی عہدہ نبوت عطا فرمایا۔ اور مجھے رسولوں میں سے ایک رسول بنا دیا۔

غرض حکم کا لفظ قرآن کریم میں مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔ اس جگہ سیاق کلام بتا رہا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل اور دماغ پر یہ بات حاوی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے جس مقصد کے لئے مبعوث فرمایا ہے وہ

بخیر وخوبی پایہ تکمیل تک پہنچے اور کوئی ایسی خرابی نہ پیدا ہو جو اس روحانی عمارت کو متزلزل کرنے والی ہو جس کی بنیادوں کو استوار کرنے لئے مجھے کھڑا کیا گیا ہے۔ اور چونکہ یہ کام الٰہی مدد کے بغیر سرانجام نہیں دیا جا سکتا تھا اس لئے آپ نے اللہ تعالیٰ سے یہی دعا کی کہ الٰہی تو خود مجھے غلبہ عطا فرما۔ تو خود مجھے دینی معاملات میں صحیح فیصلہ کرنے کی فراست عطا فرما اور خود مجھے ان احکام کے نفاذ کی طاقت بخش جن کو قبول کرنے کے لئے فطرت صحیحہ خود بخود دوڑتی چلی آئے۔ گویا تیرے احکام کو لوگ قبول تو کریں مگر ڈنڈے کے زور سے نہیں بلکہ اس لئے کہ خود ان کی عقل اور ان کی فطرت ان احکام کی عظمت اور برتری کو تسلیم کرتی ہو۔ وَ اَلۡحِقۡنِیۡ بِالصّٰلِحِیۡنَ اور اے میرے رب! مجھے نیک اور پاک لوگوں میں شامل فرما۔ اس دعا میں یہ بات غور کے قابل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک برگزیدہ نبی کے منہ سے جس کی نجات اور جس کا قرب یقینی ہے یہ دعا جاری ہوئی ہے اگر تو کسی ایسے شخص کی زبان پر یہ دعا جاری ہوتی جس کی نجات اور جس کا قرب غیر یقینی ہوتا تو کہا جا سکتا تھا کہ اس نے یہ دعا اپنی نجات اور اپنے قرب کے لئے مانگی ہے کیونکہ اس کی نجات یا قرب یقینی نہیں تھا مگر انبیاء کے متعلق یہ خیال بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی نجات غیر یقینی ہے۔ اگر انبیاء کی نجات یقینی نہ ہو اور اگر انبیاء کا قرب یقینی نہ ہو تو پھر دنیا میں کسی کی نجات اور کسی کا قرب بھی یقینی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے مامور اور اس کے مرسل تو وہ لوگ ہیں جو اپنے دعویٰ سے پہلے ہی نجات یافتہ ہوتے ہیں۔ اگر وہ نجات یافتہ نہ ہوں تو دوسروں کو نجات دلانے کے لئے وہ کس طرح کھڑے ہو سکتے ہیں۔ ان کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کی نجات کے لئے کھڑا ہونا بتاتا ہے کہ وہ پہلے ہی نجات یافتہ ہوتے ہیں۔ اور جب انبیاء کی یہ حالت ہوتی ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی خدا تعالیٰ کے ایک نبی تھے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ شخص جو دنیا کا راہنما بنا کر بھیجا گیا جس کے متعلق لوگوں کو یہ کہا گیا کہ اگر تم نجات حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس کی اقتداء کرو۔ اس نے یہ دعا کیوں کی کہ اَلۡحِقۡنِیۡ بِالصّٰلِحِیۡنَ مجھے صالحین کے ساتھ شامل کیجیو۔ کیا اس دعا کے یہ معنے ہیں کہ وہ نعوذ باللہ صالحین میں سے نہیں تھے یا اس کا کوئی اور مفہوم ہے سو یاد رکھنا چاہیے کہ بعض دفعہ لفظ تو ایک ہی ہوتا ہے مگر مواقع اور حالات کے اختلاف کی وجہ سے دوسری جگہ اس کا مفہوم بالکل بدل جاتا ہے اس کی موٹی مثال یوں سمجھ لو کہ عام طور پر جس قد و قامت کو میانہ قرار دیا جاتا ہے بعض ممالک میں اس کو چھوٹا یا لمبا سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً ناروے کے لوگ انگلستان اور دوسرے کئی ممالک کے باشندوں سے بہت لمبے ہوتے ہیں۔ ایک دفعہ ناروے کی دو پادری عورتیں سیر و سیاحت کی غرض سے ہندوستان میں آئیں تو وہ دونوں اتنی لمبی تھیں کہ عام آدمیوں سے وہ ڈیڑھ ڈیڑھ بالشت اونچی تھیں۔ اب یہ تو نہیں تھا کہ ناروے والوں نے سارے ملک میں سے چھانٹ کر انہی دو عورتوں کو بھیجا تھا تا کہ ان کی قد کی لمبائی کا دوسروں پر اثر

ہو۔ بلکہ ناروے کی ساری آبادی ہی لمبے قد والی ہے پس لمبائی کا معیار ناروے میں جا کر بالکل بدل جائے گا۔ مثلاً ایک شخص جس کا قد پانچ فٹ چھ انچ ہو وہ ہمارے ہاں میانہ قد والا کہلائے گا لیکن نیپال کے علاقہ میں وہ لمبا کہلائے گا اور ناروے میں جا کر وہ ٹھگنا کہلائے گا۔ اسی طرح رنگ کو لے لو۔ ہمارے ہاں جس آدمی کا رنگ ذرا سا بھی اجلا ہو اس کو گورا کہنے لگ جاتے ہیں مگر انگلستان والے اس کو کالا کہیں گے۔ اور پھر وہی شخص جب حبشیوں میں جائے گا تو اس کو سفید کہا جائے گا۔ بلکہ حبشیوں میں تو جس شخص کو ہم سانولے رنگ والا کہتے ہیں اسے بھی سفید رنگ والا کہا جاتا ہے۔ ہمارے سابق مبلغ افریقہ مولوی عبدالرحیم صاحب نیر کا رنگ سفید نہیں تھا بلکہ گندم گوں تھا۔ مگر جب وہ افریقہ گئے تو وہاں ان کو حبشی لوگ سفید رنگ والا کہتے تھے اور وہ کہا کرتے تھے کہ ہمارے ہاں بزرگوں کی یہ پیشگوئیاں موجود ہیں کہ جب ہمارے ملک میں سفید رنگ والا مبلغ آئے گا تو بہت زیادہ ترقی ہوگی۔ پس جس طرح رنگ اور قد کے معنے مختلف علاقوں میں بدلتے رہتے ہیں اسی طرح صالح کے معنے بھی مختلف حالات میں بدل جاتے ہیں۔ چنانچہ دیکھ لو ایک طرف تو اللہ تعالیٰ نے وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓىِٕكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ١ۚ وَ حَسُنَ اُولٰٓىِٕكَ رَفِيْقًا (النساء:۷۰) میں صالحیت کو سب سے ادنیٰ مقام قرار دیا ہے اور دوسری طرف حضرت نوح اور حضرت لوط کی بیویوں کے متعلق فرماتا ہے کہ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ (تحریم:۱۱) وہ دونوں ہمارے صالح بندوں کے نکاح میں تھیں۔ حالانکہ نوحؑ اور لوطؑ دونوں نبی تھے۔ اسی طرح حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ کے متعلق فرماتا ہے وَ كُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ (انبیاء:۷۳) ہم نے ان سب کو صالح بنایا۔ حالانکہ حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ بھی نبی تھے۔ پھر حضرت یحییٰ علیہ السلام کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ نے بشارت دیتے ہوئے فرمایا کہ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (آل عمران:۴۰) وہ صالحین میں سے نبوت کا مقام حاصل کرے گا۔ اسی طرح حضرت مسیح کے متعلق آتا ہے کہ يُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَ كَهْلًا وَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ (آل عمران:۴۷) وہ چھوٹی عمر میں بھی لوگوں سے کلام کرے گا اور بڑی عمر میں بھی اور صالحین میں سے ہوگا۔ حالانکہ حضرت مسیح ناصریؑ خدا تعالیٰ کے نبی تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صالح کے لفظ کا استعمال مختلف معانی رکھتا ہے جب ایک عام فرد یہ دعا کرے گا کہ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ اے خدا مجھے صالحیت کا مقام رکھنے والوں میں شامل فرما۔ اور جب ایک صالح شخص یہ دعا مانگے گا کہ تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ وہ شہداء کی معیت کا خواہش مند ہے اور جب ایک شہید یہ دعا مانگے گا تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ وہ صدیقوں میں شامل ہونے کی خواہش رکھتا ہے۔ اور جب ایک صدیق یہ دعا مانگے گا تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ وہ اپنے سے بالا درجہ

کے صدیقوں یا نبیوں کی معیت کا خواہشمند ہے۔اور جب ایک نبی یہ دعا مانگے گا تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ وہ اپنے مقام سے بالا مقام رکھنے والے انبیاء کی معیت کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا گو ہے گویا ہر جگہ اس کے معنے بدلتے چلے جائیں گے۔جب صالح کا لفظ ایک عام فرد کے لئے استعمال ہوگا تو اس کے اور معنے ہوں گے۔اور جب صالح کا لفظ شہید اور صدیق کے لئے استعمال ہوگا تو اس کے اور معنے ہوں گے۔اور جب ایک نبی کے لئے استعمال ہوگا تو اس کے اور معنے ہوں گے۔اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے قرآن کریم میں ایک طرف تو اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو فرماتا ہے کہ تم مت کہو ہم ایمان لے آئے ہیں۔تم صرف اتنا کہو کہ اَسْلَمْنَا (الحجرات:۱۵) ہم نے اسلام قبول کر لیا ہے لیکن دوسری طرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق فرماتا ہے کہ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (البقرۃ:۱۳۲) جب اس کے رب نے اسے کہا کہ ہماری فرمانبرداری اختیار کر تو اس نے جواب میں کہا کہ میں تو پہلے ہی رب العالمین کی فرمانبرداری اختیار کر چکا ہوں۔گویا ایک جگہ تو اللہ تعالیٰ نے اسلام کو ایمان کا ابتدائی قدم قرار دیا ہے اور دوسری جگہ اسلام کو ایمان اور معرفت کا انتہائی قدم قرار دیا ہے اسی طرح ایک لحاظ سے تو سارے انسان ہی خدا تعالیٰ کے عبد ہیں مگر دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی عبداللہ کا لفظ قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے (سورۃ جن آیت ۲۰) اور صوفیاء کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام ناموں میں سے سب سے بڑا نام آپؐ کا عبداللہ ہی ہے۔اب یوں تو سب انسانوں کو خواہ وہ مومن ہوں یا کافر عبداللہ کہا جائے گا۔کیونکہ انہیں اللہ تعالیٰ نے ہی پیدا کیا ہے لیکن جب یہ لفظ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے استعمال ہوگا تو اس کے معنے عام معنوں سے مختلف ہوں گے اور اس سے مراد یہ ہوگی کہ صرف آپؐ ہی ایک ایسے وجود ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی عبودیت کو اپنے انتہائی کمال تک پہنچا دیا ہے۔اسی طرح ایک صالحیت کا مقام تو وہ ہے جو صدیقیت اور شہادت سے بھی نیچے ہے۔اور ایک صالحیت کا مقام وہ ہے جس کے لئے انبیاء بھی دعائیں کرتے ہیں۔کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے قرب کے غیر متناہی مدارج ہیں اور انسان کسی مقام پر بھی کھڑے ہو کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے تمام مدارج کو طے کر لیا ہے۔پس وہ دعائیں کرتے رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اور زیادہ ترقی دے اور انہیں ان لوگوں کی معیت عطا کرے جنہیں ان سے بھی زیادہ اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کا قرب حاصل ہے۔آخر معراج کی رات جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف انبیاء سے ملاقات کی تو وہ تمام انبیاء ایک ہی آسمان پر تو نہیں تھے بلکہ ان میں کوئی پہلے آسمان پر تھا کوئی دوسرے آسمان پر تھا۔کوئی تیسرے آسمان پر تھا کوئی چوتھے آسمان پر تھا۔کوئی پانچویں آسمان پر تھا کوئی چھٹے آسمان پر تھا اور کوئی ساتویں آسمان پر تھا۔پس چونکہ انبیاء میں

بھی مدارج کا بڑا بھاری فرق ہے اس لئے جب ایک نبی یہ دعا کرے گا کہ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ تو اس کے یہ معنے نہیں ہوں گے کہ وہ اس صالحیت کے مقام کے لئے دعا کر رہا ہے جو شہادت سے بھی نیچے ہے۔ بلکہ اس کے معنے یہ ہوں گے کہ وہ ان لوگوں کی معیت کے لئے دعا کر رہا ہے جو اس سے بالا مقام رکھنے والے ہیں۔ اور چونکہ اللہ تعالیٰ کے قرب کے غیر محدود مراتب ہیں اور جب کسی شخص کو ایک مقام حاصل ہو جائے گا تو اس سے اگلے مقام کے حصول کی خواہش اس کے دل میں پیدا ہو جائے گی۔ اور جب وہ بھی اسے حاصل ہو جائے گا تو پھر اس سے اگلے مقام کی تڑپ اس کے دل میں پیدا ہو جائے گی اس لئے اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ کی دعا بھی ہمیشہ جاری رہے گی۔ اور کبھی کوئی ایسا وقت نہیں آئے گا جب وہ اس دعا سے مستغنی ہو سکے۔

درحقیقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا مانگ کر دنیا کو ایک بہت بڑا سبق سکھایا ہے۔ آپ نے بتایا ہے کہ کسی شخص کو خواہ کتنا بلند مقام حاصل ہو چکا ہو یہ کبھی نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس نے ترقی کے تمام مدارج کو طے کر لیا ہے کیونکہ جب بھی یہ خیال اس کے دل میں پیدا ہو گا وہ تنزل کی طرف گرنا شروع ہو جائے گا۔ قوموں کی تباہی اور ان کے ادبار کی بڑی وجہ یہی ہوا کرتی ہے کہ بعض دفعہ افراد یہ خیال کر لیتے ہیں کہ انہوں نے ترقی کے تمام مدارج طے کر لئے ہیں جب یہ وسوسہ ان کے دلوں میں جاگزیں ہو جاتا ہے تو وہ تنزل کا شکار ہو جاتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے اس دنیا کو ایسا متحرک بنایا ہے کہ کوئی ذرہ ایسا نہیں جو حرکت نہ کر رہا ہو۔ کسی کی حرکت دائرہ کی صورت میں ہوتی ہے اور کسی کی حرکت آگے کی طرف ہوتی ہے۔ بہر حال کوئی ذرہ ایسا نہیں جو متحرک نہ ہو۔ خدا تعالیٰ نے انسانی زندگی کا مرکز قلب بنایا ہے۔ اور وہ بھی ہر وقت حرکت کرتا رہتا ہے۔ اگر اس کی حرکت سکون سے بدل جائے تو اسی وقت انسانی زندگی ختم ہو جائے یہی حالت ایمان کی ہے۔ اور اسی وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایمان کی ترقی یا اس کے تنزل کا ذکر کرتے ہوئے قلب انسانی کی مثال دی ہے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا کہ انسانی جسم میں گوشت کا ایک مضغہ ہے اگر وہ درست رہے تو سارا جسم درست رہتا ہے اور اگر وہ خراب ہو جائے تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے (بخاری کتاب الایمان باب فضل من استبراء لدینہ) جسمانیات میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اگر کسی کے قلب میں خرابی پیدا ہو جائے تو وہ تمام خرابیوں سے زیادہ پریشان کن ہوتی ہے۔ نہ اسے کھانا اچھا لگتا ہے نہ پینا اچھا لگتا ہے۔ ہر وقت گھبراہٹ اور اداسی اور غم اس پر چھایا رہتا ہے۔ اور گو وہ زندہ ہوتا ہے مگر اس کی حالت مردوں سے بدتر ہوتی ہے۔ اسی طرح جب روحانی لحاظ سے کسی کے قلب میں فتور واقع ہو جائے تو اس کی وہ قوت ممیزہ جو نیکی اور بدی میں فرق کرنے والی ہوتی ہے ماری جاتی ہے۔ اور اس کی حالت گرتے گرتے یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ حیوانوں سے

بھی بدتر ہو جاتا ہے پس ضروری ہے کہ انسان اپنی کسی حالت پر بھی قانع اور مطمئن نہ ہو بلکہ وہ ہمیشہ ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے مقام کی طرف ترقی کرنے کی کوشش کرتا رہے۔

غرض یہ دعا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے قرآن کریم میں بیان کی گئی ہے اس لئے نہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنی نجات میں کوئی شبہ تھا۔ بلکہ اس لئے بیان کی گئی ہے کہ مومنوں کو روحانی مدارج کے طے کرتے وقت یہ امر ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہیے کہ وہ کسی مقام کو انتہائی مقام نہ سمجھ لیں اور کسی مقام پر پہنچ کر وہ یہ خیال نہ کر لیں کہ اب ہمیں گرنے کا کوئی خطرہ نہیں۔ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ دعا نہ مانگتے تو لوگ یہ خیال کر لیتے کہ ہمیں بھی کسی ایسی دعا کی ضرورت نہیں اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کے انبیاء اس مقام پر پہنچے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان کا ہر وقت عبادت الٰہی میں بسر ہوتا ہے وہ رات اور دن سوتے اور جاگتے اٹھتے اور بیٹھتے اللہ تعالیٰ کے عشق اور اس کی محبت میں مخمور رہتے ہیں اس کا ذکر ان کی زبانوں پر جاری رہتا ہے اور اس کے نام کو بلند کرنے کے لئے ان کی زندگی کا ہر لمحہ اور ان کے جسم کا ہر ذرہ مصروف ہوتا ہے لیکن باوجود اس حالت کے ان کو بھی حکم ہوتا ہے کہ جاؤ اور نمازیں پڑھو۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اگر وہ نمازیں نہ پڑھیں تو وہ لوگ جو انبیاء کے نمونہ کو دیکھ کر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ بھی نمازوں کو چھوڑ دیں اسی لئے کوئی نبی ایسا نہیں ہوا جسے عبادات سے فارغ کیا گیا ہو۔ ہر نبی کو عبادت کرنی پڑتی ہے ویسی ہی عبادت جیسی اور لوگ کرتے ہیں حالانکہ ان کا ہر لمحہ عبادت میں گزر رہا ہوتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہی دیکھ لو۔ آپؐ صرف پانچ نمازیں ہی نہیں پڑھا کرتے تھے بلکہ آپ کی زندگی کی ہر گھڑی عبادت الٰہی میں گذرتی تھی۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ آپؐ کے متعلق فرماتا ہے کہ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (الانعام: ۱۶۳) یعنی اے محمدؐ رسول اللہ! لوگوں سے کہہ دے کہ تم یہ نہ سمجھو کہ میں صرف پانچ وقت کی نمازیں پڑھتا ہوں بلکہ میری عبادت بھی اور میری قربانیاں بھی اور میری زندگی کی حرکات بھی اور میری موت بھی سب خدا کے لئے ہے میرا کوئی وقت ایسا نہیں جو خدا تعالیٰ کی یاد اور اس کی محبت اور اس کے ذکر میں نہ گزرتا ہو بلکہ میری موت بھی خدا کی عبادت ہے۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب وفات پانے لگے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں اس وقت بھی آپ کی زبان پر یہ کلمات جاری تھے اَللّٰھُمَّ الرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی (بخاری کتاب المغازی باب اخر ما تکلم به النبی صلی اللہ علیہ وسلم) میرا وہ رفیق جو عرش بیٹھا ہے میں اب اس کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ پس آپؐ کا پانچ نمازیں پڑھنا درحقیقت ہماری ہدایت اور راہنمائی کے لئے ہی تھا۔ ورنہ اگر آپؐ نمازیں نہ پڑھتے تو جیسے جھوٹے صوفیاء کی عادت ہوتی ہے کئی لوگ کہہ دیتے ہیں کہ ہم بھی

ایسے مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ ہمیں نماز روزہ کی ضرورت نہیں۔

میں ایک دفعہ جمعہ کی نماز پڑھا کر فارغ ہوا تو ایک صوفی منش آدمی آگے بڑھا اور کہنے لگا میں ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا فرمایئے؟ کہنے لگا۔ اگر کوئی شخص دریا میں سفر کرتے کرتے کنارہ پر پہنچ جائے تو اس کے بعد وہ کشتی میں ہی بیٹھا رہے یا نیچے اتر جائے۔ جب اس نے یہ سوال کیا معاً اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کے سوال کا مقصد سمجھا دیا۔ دراصل یہ صوفیاء کا ایک دھوکہ ہے جس میں وہ عام طور پر مبتلا پائے جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ نماز اور روزہ اور حج اور زکوٰۃ وغیرہ کی حیثیت سواریوں کی سی ہے۔ یہ سواریاں ہمیں اپنے محبوب کے دروازہ تک پہنچانے کے لئے ہیں۔ اگر کوئی شخص اپنے محبوب کے دروازہ تک پہنچ کر سواریوں پر بیٹھا رہے اور نیچے نہ اترے تو وہ اول درجہ کا گستاخ سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی شخص خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کر لے تو اسے نماز روزہ کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ وہ خدا کے دروازہ تک پہنچ گیا۔ غرض جب اس نے یہ سوال کیا معاً اللہ تعالیٰ نے یہ تمام بات مجھ پر کھول دی اور میں نے اسے کہا اگر تو وہ دریا ایسا ہے جو کنارے والا ہے تو بے شک جب کنارہ آئے وہ کشتی سے اتر جائے لیکن اگر وہ دریا غیر محدود ہے اور اس کا کوئی کنارہ ہی نہیں تو وہ یاد رکھے کہ جس جگہ وہ نیچے اترے گا۔ اسی جگہ وہ ڈوب جائے گا۔ اب آپ بتائیں کہ جس دریا کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ محدود ہے یا غیر محدود۔ کہنے لگا ہے تو غیر محدود میں نے کہا تو پھر غیر محدود دریا میں انسان جس جگہ بھی نیچے اترے گا اسی جگہ ڈوب جائے گا۔ اس کی سلامتی اسی میں ہے کہ وہ کشتی پر سوار رہے۔ غرض ہم اس خدا کی طرف جا رہے ہیں جو غیر محدود ہے۔ یہ دنیا تو چند سالوں کی ہے مگر ہمیں یہ وعدہ دیا گیا ہے کہ اس دنیا کے بعد پھر ایک زندگی ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگی اور اسی وجہ سے ہم اس بات کے قائل ہیں کہ جنتیوں کو وہ نعمتیں ملیں گی جو غیر منقطع ہوں گی۔ پس جبکہ ہم ایک غیر محدود دریا کے شناور ہیں اور ہمارا مقصد اس خدا کے قرب میں بڑھنا ہے جو ازلی ابدی ہے تو اس کے بعد ہمارا کسی حالت پر مطمئن ہو کر کھڑا ہو جانا کس طرح درست ہو سکتا ہے اگر ہم کھڑے ہو جائیں تو یقیناً تباہ ہو جائیں۔ مگر بجائے اس کے کہ لوگ اس نکتہ کو مدنظر رکھتے ہوئے قرب الٰہی کی منازل کے حصول کے لئے اپنے قدموں کو تیز تر کر دیں اور اپنی قربانیوں اور ایثار اور خدمت خلق اور اعلیٰ اخلاق اور نیک نمونہ اور غرباء پروری اور خدمت قرآن اور اشاعت اسلام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی رضا کو حاصل کرنے کی کوشش کریں وہ اس قسم کی سطحی بحثوں میں پڑ جاتے ہیں کہ ایک نبی نے یہ کیوں دعا کی کہ الٰہی مجھے صالحین میں شامل کر۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ سارے صلحاء آخر ایک جگہ پر تو نہیں ہیں جہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پہنچے وہاں حضرت ابوہریرہؓ نہیں پہنچے۔ اور جہاں ابو ہریرہؓ پہنچے وہاں آج کل کے مسلمان نہیں پہنچے۔ پس اَلْحِقْنِیْ

بِالصّٰلِحِيْنَ میں اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ تمہیں ہر وقت یہ دعا مانگنی چاہیے کہ تمہیں سارے صالحین کی مصاحبت حاصل ہو۔ پہلے ایک صالح کی مصاحبت حاصل ہو تو تمہارے دل میں دوسرے صالح سے ملنے کی خواہش پیدا ہو جائے دوسرے صالح سے ملو تو تیسرے صالح کے مقام تک پہنچنے کی خواہش پیدا ہو جائے۔ تیسرے صالح کے مقام تک پہنچو تو چوتھے صالح کے مقام تک پہنچنے کی خواہش پیدا ہو جائے اور یہ خواہش اسی طرح بڑھتی چلی جائے یہاں تک کہ تم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں تک پہنچ جاؤ۔ جو تمام صالحین میں سے سب سے بلند اور سب سے بالا اور سب سے ارفع مقام پر فائز ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کو ہم دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کے اندر بھی یہی رنگ پایا جاتا تھا اور آپؐ بھی خدا تعالیٰ کے قرب کے غیر متناہی مراتب کے حصول کے لئے ہمیشہ اپنے قدم کو تیز رکھتے تھے آج کل بعض نادان ایسے ہیں کہ دو چار دن کی نمازوں کے بعد ہی یہ خیال کرنے لگ جاتے ہیں کہ انہوں نے قرب کے انتہائی مقامات کو طے کر لیا ہے۔ وہ خدا کو ایک چھوٹی سی چیز سمجھ لیتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ انہوں نے اس کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ حالانکہ خدا تعالیٰ کی ہستی ایسی عظیم الشان ہے کہ بڑے سے بڑے انبیاء بھی اس کے قرب میں جس قدر بڑھ جائیں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے قرب کے سب مقامات کو طے کر لیا ہے۔ بلکہ وہ جتنا زیادہ اس کے قرب میں بڑھتے ہیں اتنا ہی وہ خدا تعالیٰ کے فضلوں میں اور اس کی طاقتوں میں اور اس کی قدرتوں میں وسعت پاتے ہیں اور وہ یہی سمجھتے ہیں کہ ان کے لئے قرب کا ابھی ایک غیر متناہی میدان پڑا ہے جس کو انہوں نے طے کرنا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے متعلق احادیث میں آتا ہے کہ آپؐ بڑھاپے کی حالت میں اللہ تعالیٰ کے حضور اس قدر گریہ وزاری کرتے اس قدر گڑگڑاتے اور اس قدر تضرع اور عاجزی سے دعائیں کرتے کہ بعض دفعہ اللہ تعالیٰ کے حضور عبادت میں کھڑے کھڑے آپؐ کے پاؤں سوج جاتے۔ یہ دیکھ کر آپؐ کی بیویوں کے دلوں میں رحم پیدا ہوتا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر مشقت کیوں برداشت کرتے ہیں۔ آخر ایک دن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ بات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہہ ہی دی کہ یا رسول اللہ! جب آپؐ کے اگلے پچھلے سب گناہ اللہ تعالیٰ معاف کر چکا ہے تو آپ اس قدر عبادت کیوں کرتے ہیں اور کیوں اتنی مشقت برداشت کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا اَفَلَا اَكُوْنَ عَبْدًا شَكُوْرًا (تفسیر در منثور زیر آیت انا فتحنا لک فتحا مبینا و بخاری کتاب التہجد باب قیام النبی حتی ترم قدماہ) تم کہتی ہو کہ خدا نے مجھ پر یہ فضل کیا کہ میرے اگلے پچھلے سب گناہوں کو معاف کر دیا اور جب حالت یہ ہے تو کیا میرا فرض نہیں کہ میں خدا تعالیٰ کے اس فضل کا شکریہ ادا کروں۔ اور اس وجہ سے کہ اس نے

مجھ پر یہ انعام کیا ہے میں اس کی دوسروں سے بھی زیادہ عبادت بجالاؤں۔ جب اس نے مجھ پر اتنے بڑے فضل کئے ہیں تو مجھے دوسروں سے زیادہ شکر یہ بھی تو ادا کرنا چاہیے پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی خدا تعالیٰ کے قرب کے حصول کے لئے ہمیشہ زیادہ سے زیادہ جدوجہد کرتے رہے۔اور یہی سبق ہے جو دعا کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں دیا ہے۔اگر لوگ اس سبق کو یاد رکھیں تو ان کی روحانیت کبھی مردہ نہ ہو اور شیطان ان پر کبھی تسلط اور غلبہ نہ پائے۔

پھر فرماتے ہیں وَ اجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ اے خدا! بعد میں آنے والے لوگوں میں تو مجھے ایک قائم رہنے والی اور ظاہر و باطن طور پر اچھی تعریف مجھے بخش۔عربی زبان میں جب صدق کی طرف کوئی لفظ مضاف ہو تو اس کے مفہوم میں دوام اور ظاہر و باطن کی خوبی کے معنے پیدا ہو جاتے ہیں ۔ چنانچہ مفردات امام راغبؒ میں لکھا ہے۔اَلصِّدْقُ يُعَبَّرُ عَنْ كُلِّ فِعْلٍ فَاضِلٍ ظَاهِرًا وَ بَاطِنًا بِالصِّدْقِ فَيُضَافُ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْفِعْلُ الَّذِيْ يُوْصَفُ بِهٖ یعنی صدق سے مراد ہر وہ فعل ہوتا ہے جو ظاہر و باطن میں خوبی رکھتا ہو اور جس فعل کی صدق کو صفت بنانا ہو اس کو صدق کی طرف مضاف کر دیتے ہیں۔پس اس دعا کے معنے یہ ہیں کہ اے میرے خدا! تو آخری زمانہ کے لوگوں کے دلوں میں میرے لئے دعا کی تحریک پیدا کر دے لیکن وہ دعا عارضی نہ ہو۔ بلکہ ہمیشہ ہمیش کے لئے ہو اور پھر وہ تعریف صرف لوگوں کی زبانوں پر ہی نہ ہو بلکہ واقعہ میں میرے نیک کام دنیا میں قائم رہیں اور اس طرح مجھے ظاہری اور باطنی طور پر اچھی تعریف حاصل ہو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کو دنیا کے تمام مذاہب میں سے صرف مسلمانوں نے پورا کیا ہے۔ممکن ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنے بیٹے اور پوتے آپ کے لئے دعا کرتے ہوں لیکن بہت سی نسلیں گزر جانے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی روحانی اور جسمانی اولاد ان کو بھول گئی لیکن مسلمان ہیں جو تیرہ سو سال سے برابر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے دعا کرتے چلے آرہے ہیں اور قیامت تک دعا کرتے چلے جائیں گے چنانچہ ہر نمازی ہر تشہد کے آخر میں یہ کہتا ہے کہ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَ عَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَ عَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ یعنی اے اللہ! تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اسی طرح فضل نازل فرما جس طرح تو نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر فضل نازل فرمایا گویا ہم خدا تعالیٰ کی اس محبت پر انتہاء درجہ کا اعتماد رکھتے ہیں جو اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ کی اور ہم یقین رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے انتہاء درجہ کا پیار کیا تھا۔لیکن بعض لوگ جو حقائق سے ناآشنا ہوتے ہیں وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت ابراہیم علیہ السلام

کے ساتھ نسبت دینے میں آپ کی ہتک خیال کرتے ہیں۔اور یہ سوال کیا کرتے ہیں کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء سے افضل تھے تو اللہ تعالیٰ نے درود میں اپنی برکات اور انعامات کے نزول کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کیوں مثال دی سواس بارہ میں ایک نکتہ یادرکھنا چاہیے جس سے یہ سوال بالکل حل ہوجاتا ہے دنیا میں اگر ایک شخص سنگترے کا درخت لگائے تو سنگترہ اپنی ذات میں کچھ خاصیتیں رکھتا ہے۔مثلاً یہ کہ وہ ایک خاص حد تک اونچا ہوسکتا ہے، ایک خاص حد تک پھیل سکتا ہے اور ایک خاص حد تک پھل دے سکتا ہے۔اعلیٰ درجہ کا سنگترہ پندرہ بیس فٹ تک اونچا ہوتا ہے۔پس اگر وہ سنگترہ بیس فٹ تک اونچا ہوجائے تو سارے لوگ کہیں گے کہ سنگترہ اپنے کمال کو پہنچ گیا۔اگر ایک سنگترہ پچیس فٹ کے گھیر میں پھیل سکتا ہے اور وہ اتنا پھیل جاتا ہے تو لوگ کہیں گے کہ اس سنگترے نے کمال کر دیا اگر ایک سنگترہ زیادہ سے زیادہ ایک ہزار پھل دے سکتا ہے اور وہ ایک ہزار پھل دے دیتا ہے تو ہم کہیں گے اس سنگترے نے کمال کر دیا لیکن اس کے مقابل میں بڑ کا درخت لے لو۔بڑ کا درخت دوسوفٹ تک اور اونچا ہوجاتا ہے اور عام درخت اسی نوے فٹ کے ہوتے ہیں۔اب اگر کوئی شخص بڑ لگائے اور وہ پچیس فٹ کا ہوجائے۔یا اگر اس کا پھیلاؤ ڈیڑھ دوسوفٹ ہوسکتا ہے اور اس کا پھیلاؤ بیس پچیس فٹ ہوجائے اور کوئی کہہ دے کہ اس نے کمال کر دیا تو ہم اس کو بیوقوف کہیں گے۔یا فرض کرو کسی نے بیر کا درخت لگایا بیر کا درخت ایک ہزار نہیں بلکہ بیس ہزار کے قریب پھل دیتا ہے۔اب اگر بڑ کا درخت پچیس فٹ اونچا ہوجائے اور پچیس فٹ اس کا گھیر ہو جائے۔اور بیر کا درخت ایک ہزار بیر دے اور کوئی کہے کہ چونکہ بڑ کا پھیلاؤ سنگترے جتنا اور بیر کو پھل بھی سنگترے جتنا لگا ہے اس لئے انہوں نے تو کمال کر دیا ہے تو ہم کہیں گے یہ احمقانہ بات ہے یہ چیز ان درختوں کے کمال کا ثبوت نہیں بلکہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ درخت ناقص ہیں۔پس ہر کمال نسبت کے لحاظ سے ہوتا ہے مثلاً ہم نے سنگترہ لگایا اور خدا تعالیٰ نے ایسا فضل کیا کہ سنگترہ جتنا اونچے سے اونچا ہوسکتا تھا ہوگیا۔جتنا زیادہ سے زیادہ پھیل سکتا تھا پھیل گیا اور جتنا زیادہ سے زیادہ پھل دے سکتا تھا اتنا پھل اس نے دے دیا۔پھر ہم نے آم کا درخت لگایا۔اب اگر آم کا درخت لگاتے ہوئے ہم کہیں گے کہ اے خدا! تو اس میں ایسی ہی برکت دے جیسے سنگترے میں دی تھی۔تو کوئی شخص اس کے یہ معنے نہیں کرے گا کہ اے خدا! اس کو بیس فٹ اونچا کر دے۔اسی طرح کوئی اس کے یہ معنے نہیں کرے گا کہ خدا تعالیٰ اس کا گھیر پچیس فٹ کر دے اور کوئی شخص اس کے یہ معنے نہیں کرے گا کہ خدا تعالیٰ اس کو ایک ہزار پھل لگا دے بلکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اے خدا! جتنا زیادہ سے زیادہ آم کا درخت پھیل سکتا ہے تو اسے پھیلا دے اور جتنا زیادہ سے زیادہ آم کا درخت اونچا ہوسکتا ہے اتنا ہی اسے اونچا کر دے اور جتنا زیادہ سے زیادہ آم

کا درخت پھل دے سکتا ہے اتنا اسے پھل لگا دے۔ تا کہ جس طرح وہ سنگترہ اپنی جنس میں کمال کو پہنچ گیا تھا اسی طرح یہ بھی اپنی جنس میں کمال کو پہنچ جائے۔ تو اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَ عَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ کے یہ معنے ہیں کہ جس طرح قومی نبیوں میں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی ذات میں کمال کو پہنچ گئے تھے اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو جمیع عالم کی طرف نبی ہیں اور ایک الگ جنس ہیں اس میں وہ اپنے کمال کو پہنچ جائیں۔ جیسے سنگترہ اور ہے اور بڑیا آم اور۔ جب ہم کہیں گے کہ سنگترہ کی طرح آم اپنے کمال کو پہنچ جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ وہ ایک ہزار پھل دے بلکہ مطلب یہ ہوگا کہ آم آٹھ دس ہزار پھل دے۔ اسی طرح جب ہم یہ کہیں گے کہ سنگترے کی طرح بڑ اپنے کمال کو پہنچ جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ وہ بیس پچیس فٹ اونچا ہو جائے بلکہ یہ مطلب ہوگا کہ وہ دو سو فٹ اونچا ہو جائے۔ تو درحقیقت درود کے معنے یہ ہیں کہ جس طرح ابراہیمؑ اپنی جنس میں کمال درجہ کا وجود تھا۔ اسی طرح اے خدا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی جو جمیع عالم کی طرف نبی ہیں ان کی جنس کے لحاظ سے جو سب سے بڑا درجہ ہے انہیں عطا کر یعنی اس کو جتنا بڑا ہونا چاہیے اتنے بڑے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہو جائیں اور اس کا جتنا پھیلاؤ ہونا چاہیے اتنا پھیلاؤ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ہو جائے۔ اور جتنا اسے پھل لگنا چاہیے اتنا پھل ان کو لگ جائے۔ گویا درود میں ہم یہ دعا کرتے ہیں کہ اے خدا جس طرح ابراہیمؑ اپنی محدود جنس میں کمال کو پہنچا ہے اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ساری دنیا میں اپنے کمال کو پہنچ جائیں۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے کسی نے ایک بکری لی۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس میں ایسی برکت ڈالی کہ اس نے ڈیڑھ سیر دودھ دینا شروع کر دیا اور دو بچے ششماہی دینے شروع کر دیئے اس کے بعد جب کوئی شخص گائے لے گا۔ تو وہ کہے گا اے خدا جس طرح تو نے فلاں کی بکری میں برکت ڈالی تھی اسی طرح میری گائے میں بھی برکت ڈال دے۔ اب کیا اس کا یہ مطلب ہوگا کہ یہ گائے ڈیڑھ سیر دودھ دینے لگ جائے۔ اور ہر چھٹے مہینے دو بچے دے دے۔ کبھی کسی گائے نے ایسا نہیں کیا۔ اچھی گائے کبھی بھی ڈیڑھ سیر دودھ نہیں دیتی اور نہ ہی کوئی گائے چھ ماہ میں دو بچے دیتی ہے۔ بلکہ اس کی دعا کا مفہوم یہ ہوگا کہ جس طرح فلاں بکری بکریوں میں اچھی ثابت ہوئی ہے اسی طرح یہ گائے گائیوں میں اچھی ثابت ہو تو اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَ عَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ کے یہی معنی ہیں کہ جس طرح ابراہیمؑ اپنی قسم کے لوگوں میں سے انتہائی درجہ کے کمال کو پہنچ گئے اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کام کے لحاظ سے کمال کو پہنچ جائیں۔ ابراہیمؑ بنی اسرائیل کے لئے تھے جس طرح انہوں نے بنی اسرائیل میں اپنا کمال دکھایا۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

ساری دنیا میں کمال دکھائیں تو اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَ عَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ کے معنے ہم یہ کریں گے کہ اے خدا جس طرح تو نے ابراہیمؑ کو بنی اسرائیل کے لئے برکت دی جو دنیا کا ہزارواں حصہ ہے اسی طرح تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو جو ساری دنیا کے لئے مبعوث ہوئے ہیں اور جو بنی اسرائیل سے ایک ہزار گنا بڑی ہے ابراہیمؑ سے ہزار گنا زیادہ برکت دے۔ کَمَا کا لفظ بعض اوقات نسبتی معنوں میں بھی بول لیا جاتا ہے جیسے میں نے مثال دی ہے اگر کسی شخص کے پاس بکری ہو جو اپنے کمال کو پہنچی ہوئی ہو تو جب کوئی زمیندار گائے خریدے گا تو وہ کہے گا اے خدا جس طرح تو نے فلاں کی بکری میں برکت دی تھی اسی طرح تو میری گائے میں بھی برکت دے۔ اب اس کے یہ معنے نہیں ہوں گے کہ گائے چھ ماہ میں دو بچے دے یا ڈیڑھ سیر دودھ دے گائے اگر اچھی ہو گی تو سات آٹھ سیر دودھ دے گی۔ اور اگر بھینس لے گا اور وہ دعا کرے گا کہ جس طرح فلاں بکری میں برکت ڈالی تھی اسی طرح اس میں بھی برکت ڈال تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مجھے ایسی بھینس دے جو چودہ پندرہ سیر دودھ دینے والی ہو۔ غرض الفاظ تو ویسے ہی بولے جائیں گے لیکن چونکہ جنس علیحدہ علیحدہ ہو گی اس لئے معنے بھی الگ الگ ہو جائیں گے حضرت ابراہیمؑ کی جنس الگ تھی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی الگ۔ آپ کی قوم دو چار لاکھ تھی دنیا میں یہودی اس وقت ڈیڑھ دو کروڑ کی تعداد میں ہیں لیکن ساری دنیا کی آبادی دو ارب سے بھی زیادہ ہے۔ گویا یہودی دنیا کی آبادی کا سوواں حصہ ہے اس لحاظ سے اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَ عَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ کے معنے یہ ہوں گے کہ اے اللہ! جس طرح تو نے ابراہیمؑ کو یہودی قوم کے لئے برکت دی اسی طرح تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ابراہیمؑ سے سو گنا زیادہ برکت دے۔ اگر دس ارب روپیہ یہود کو دیا تو اسی نسبت سے امت محمدیہ کو سو گنا زیادہ مال دے۔ پس یہاں کَمَا کے معنے زیادتی کے ہیں برابری کے نہیں کیونکہ جنس الگ ہے۔ اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم صرف عرب کے لئے مبعوث ہوتے تو پھر ویسے ہی معنے لئے جاتے کیونکہ بکری کی بکری سے نسبت ہوتی ہے اور گائے کی گائے سے نسبت ہوتی ہے۔

غرض کَمَا کا مفہوم برابری کا نہیں بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ جس طرح ابراہیمؑ اپنی جنس میں کامل وجود بنا اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جنس میں کامل وجود بنیں۔ آخر ساری دنیا کی طرف آنے والے نبی کو جو درجہ ملنا تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام تو وہاں پہنچ ہی نہیں سکتے تھے۔ جس طرح ایک جمعدار اگر اپنے ماتحتوں پر جو کہ پندرہ بیس ہوتے ہیں اچھی طرح کنٹرول رکھتا ہے اور ایک کمانڈر دو تین لاکھ فوج کی کمان کرتا ہے تو وہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔

اگر ہم کہیں کہ جس طرح اس جمعدار نے پندرہ آدمیوں پر کنٹرول کر رکھا ہے ویسے ہی یہ کمانڈر بھی کنٹرول رکھتا ہے تو اس ''ویسے'' کا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ وہ پندرہ آدمیوں پر کنٹرول رکھنے والا دو تین لاکھ پر کنٹرول کر سکتا ہے۔ بہرحال کوئی عقلمند اس فقرہ کے سوائے اس کے اور کوئی معنے نہیں لے گا کہ جس طرح اس جمعدار نے اپنی جنس میں کمال پیدا کیا ہے اسی طرح کمانڈر اپنی جنس میں کمال پیدا کرے ویسے تو پندرہ آدمیوں پر کمان کرنے والے اور دو لاکھ آدمیوں پر کمان کرنے والے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پندرہ آدمیوں پر کنٹرول کرنے والے کو اگر سو آدمی بھی دے دیئے جائیں تو وہ فیل ہو جائے گا لیکن تین لاکھ آدمیوں پر کنٹرول کرنے والا ایک وقت میں ہزار ہا جمعداروں پر کنٹرول کر لے گا۔ تو جب ہم یہ دعا کرتے ہیں تو اس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ جس طرح تو نے ابراہیمؑ کو اپنی جنس میں کمال عطا فرمایا اسی طرح تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی جنس میں کمال عطا فرما۔ اور اس سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی ہتک نہیں ہوئی۔ بہرحال ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی جنس میں بڑا کمال بخشا۔ اور ایسا بخشا کہ اس جنس میں سے کسی اور کو نصیب نہیں ہوا۔ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ حکومتیں اپنی ملکی ترقی کے لئے دو قسم کی پالیسیاں اختیار کیا کرتی ہیں ایک پالیسی ''شارٹ ٹرم پالیسی'' کہلاتی ہے اور ایک ''لانگ ٹرن پالیسی'' کہلاتی ہے یعنی ایک تو اس ملک کی موجودہ مشکلات کو دور کرنے کے لئے عارضی انتظام ہوتا ہے اور ایک اس ملک کے لئے لمبا پروگرام ہوتا ہے جس کا مقصد اس ملک کی حالت کو بہتر بنانا ہوتا ہے۔ دنیا میں کوئی گورنمنٹ اپنے ملک کو ایک دن میں اعلیٰ ترقی نہیں دے سکتی بلکہ اس کے لئے تیس پنتیس سال کی کوشش اور جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے لیکن تیس پنتیس سال کی کوشش کے یہ معنے نہیں کہ اگر کسی حصہ ملک میں قحط پڑ جائے تو حکومت کہے کہ ہم نے پروگرام بنایا ہوا ہے کہ تیس سال کے بعد ایسے حالات پیدا نہیں ہوں گے اب چونکہ ہم اس طرف لگے ہوئے ہیں اس لئے ہم قحط زدہ لوگوں کی مدد نہیں کر سکتے۔ اگر وہ مرتے ہیں تو مریں ایسے مواقع پر شارٹ ٹرن پالیسی کو اختیار کیا جاتا ہے تا اچانک پیدا ہونے والی باتیں اصل پروگرام میں مخل نہ ہوں۔ ''لانگ ٹرم پالیسی'' یعنی ایسی پالیسی جس سے آئندہ آنے والے لوگوں کے لئے پچھلی تکالیف کا ازالہ کیا جائے اس کے لئے لوگ بڑی بڑی قربانیاں کرتے ہیں مگر ان میں سے کوئی قربانی بھی ابراہیمؑ کی قربانی سے بڑھ کر نہیں یعنی جو ''لانگ ٹرم پالیسی'' حضرت ابراہیمؑ نے اختیار کی کسی اور نے نہیں کی شارٹ ٹرن پالیسی یہ ہے کہ اگر کسی کو کوئی ایسا آدمی نظر آئے جو بھوک سے مر رہا ہو اور وہ اس کے سامنے روٹی رکھ دے اور کہے کہ کھالو تو ہم اسے اچھا اور نیک آدمی کہیں گے اسی طرح اگر کوئی پیاسا ہو اور کوئی اس کے سامنے خالی پانی ہی نہیں بلکہ شربت رکھے اور کہے کہ پی لو تو ہم اسے اچھا اور نیک آدمی کہیں گے اگر وہ ایسا نہ کرتا تو ہم اسے

ظالم کہتے ایسے کاموں کو ہم شارٹ ٹرن پالیسی کہتے ہیں اوراس قسم کی نیکیاں عام طور پر پائی جاتی ہیں مگر ایک نیکی وہ ہوتی ہے جو سارے لوگوں کے لئے ہوتی ہے اور جس سے ساری دنیا فائدہ اٹھاتی ہے۔ جیسے مشہور ہے کہ ایک بادشاہ کہیں سے گذر رہا تھا کہ اس نے ایک بوڑھے کو ایک درخت لگاتے دیکھا جو اسی نوے سال کے بعد پھل لاتا تھا اور بہت آہستہ آہستہ اس کی ترقی ہوتی تھی۔ یہ حالت دیکھ کر وہ کسان کے پاس آیا اور کہنے لگا کیا تیری عقل ماری ہوئی ہے کہ تو ایسا درخت لگا رہا ہے جو اسّی سال کے بعد تجھے کوئی فائدہ پہنچائے گا کیا تو سمجھتا ہے کہ تو اسّی سال تک زندہ رہ سکے گا تیری تو موت قریب ہے اگر تو زیادہ سے زیادہ بھی زندہ رہا تو آٹھ دس سال تک زندہ رہ سکے گا۔ پھر جب تجھے اس چیز سے کوئی فائدہ نہیں تو تو اسے کیوں لگا رہا ہے۔ کسان نے کہا آپ تو بادشاہ ہیں اور اس مرتبہ کے لحاظ سے آپ کو بڑا تجربہ کار ہونا چاہیے تھا آپ کو معلوم ہے کہ آدمی اٹھارہ بیس سال کا ہو کر کھیتی باڑی کا کام اچھی طرح سنبھال سکتا ہے اگر وہ اس وقت اس درخت کو لگائے اور اسّی سال تک یعنی جب اس کی عمر سو سال کی ہو جائے انتظار کرتا رہے تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس وقت تک وہ زندہ رہے گا۔ ان میں سے تو اکثر اس پھل کے آنے سے پہلے ہی مر چکے ہوں گے اور بہت ہی کم تعداد ایسی ہوگی جو اس سے فائدہ اٹھا سکے گی اگر ہمارے باپ دادا بھی اسی خیال سے درخت نہ لگاتے تو پھر یہ درخت دنیا میں ہوتا ہی نہ۔ ہر شخص کہتا کہ میں کیوں اس درخت کو لگاؤں جبکہ میں نے اس کا پھل کھانا ہی نہیں لیکن یہ جاننے کے باوجود کہ انہوں نے پھل نہیں کھانا انہوں نے درخت لگائے اور ہم نے ان کا پھل کھایا۔ اب ہم لگائیں گے تو ہماری اولادیں کھائیں گی۔ بادشاہ کو یہ بات بہت پسند آئی اور اس نے کہا ''زہ''۔ زہ کے معنے ہیں واہ واہ۔ بادشاہ نے اپنے وزیر کو جو سفر میں ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا تھا ہدایت کی ہوئی تھی کہ جب میں کسی سے خوش ہو کر ''زہ'' کہا کروں تو تم اس شخص کو تین ہزار درہم یعنی ساڑھے سات سو روپیہ انعام دے دیا کرو۔ جس وقت بادشاہ نے کہا ''زہ'' تو وزیر نے اسی وقت تین ہزار درہم کی تھیلی کسان کو پکڑا دی۔ جب کسان کو تھیلی ملی تو اس نے پوچھا کہ یہ تھیلی مجھے کس لئے دی گئی ہے وزیر نے کہا کہ جب بادشاہ کسی بات پر خوش ہو کر ''زہ'' کہتا ہے تو اس وقت یہ تین ہزار درہم کی تھیلی اس شخص کو دے دی جاتی ہے۔ جس کی بات پر بادشاہ سلامت خوش ہو کر زہ کہتے ہیں۔ کسان نے بادشاہ سے مخاطب ہو کر کہا بادشاہ سلامت آپ فرما رہے تھے کہ تم ایسا درخت لگا رہے ہو جس کا پھل تم نے نہیں کھانا۔ بادشاہ سلامت لوگ یہ درخت لگاتے ہیں تو اسّی سال کے بعد اس کا پھل کھاتے ہیں گندم بوتے ہیں تو چھ ماہ بعد کاٹتے ہیں لیکن میں نے تو اپنا پھل دم نقد وصول کر لیا ہے اس پر بادشاہ نے پھر کہا ''زہ''۔ یعنی اس نے کیا ہی اچھی بات کہی ہے۔ وزیر نے جھٹ تین ہزار درہم کی دوسری تھیلی کسان کو دے دی۔ کسان دونوں تھیلیوں کو ہاتھ میں

پکڑ کر کہنے لگا بادشاہ سلامت پھلدار درخت سال میں ایک دفعہ پھل دیتے ہیں بعض درخت ایسے بھی ہوتے ہیں جو سال میں دو دفعہ پھل دیتے ہیں پھر بعض ایسی فصلیں بھی ہوتی ہیں جو مہینہ دو مہینہ کے بعد کاٹی جاتی ہیں غرض کوئی فصل ایسی نہیں کہ جس دن اسے اگایا جائے اسی دن وہ پھل دے دے یا کسی قسم کا اس سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ لیکن میں نے ایک منٹ میں دو دفعہ پھل کھا لیا ہے۔ بادشاہ نے کہا ''زہ''۔ اس پر وزیر نے جھٹ تیسری تھیلی کسان کو دے دی۔ اس کے بعد بادشاہ کہنے لگا کہ اس بوڑھے نے تو ہمیں لوٹ لینا ہے آگے چلو۔

اب دیکھو بوڑھے نے پھل کا درخت لگایا تا کہ آئندہ نسلیں کھائیں یہ ''لانگ ٹرم پالیسی'' کہلاتی ہے لانگ ٹرم پالیسی میں لوگ بڑی بڑی قربانیاں کرتے ہیں وہ زمینیں خریدتے ہیں اس غرض سے کہ ہمارے بیٹوں کے کام آئیں اور وہ مشکلات میں نہ پھنسیں لیکن میں نے کسی زمیندار کو نہیں دیکھا کہ اس نے اپنے پوتوں کے لئے زمینوں کا انتظام کیا ہو۔ اگرچہ یہ بھی ایک لانگ ٹرم پالیسی ہے کہ بیٹوں کے مفاد کے لئے زمین خریدی جائے۔ لیکن بڑے بڑے زمیندار بھی اپنے پوتوں کے لئے زمینیں نہیں خریدتے صرف بیٹوں کا خیال رکھتے ہیں۔ ہماری جماعت خدا تعالیٰ کے فضل سے لاکھوں کی ہے اور اس کا اکثر حصہ زمینداروں کا ہے اور ان میں بڑے بڑے امیر زمیندار ہیں لیکن میں نے ان میں سے کسی کو نہیں دیکھا کہ اس نے اس غرض سے زمین خریدی ہو کہ پوتوں کے کام آئے پھر ہزاروں غیر احمدی ہندو اور عیسائی ہیں جو مجھ سے ملتے ہیں مشورہ کرتے ہیں اور دعاؤں کے لئے کہتے رہتے ہیں اور میں ان کی حالت جانتا ہوں لیکن میں نے ان میں سے بھی کسی کو نہیں دیکھا کہ وہ اس غرض سے زمین بڑھا رہا ہو یا مال جمع کر رہا ہو کہ اس کے پوتوں کے کام آ سکے۔ ہر ایک اس لئے بڑھاتا ہے کہ اس کے بیٹے کے کام آ سکے۔ پوتے کا کسی کو خیال ہی نہیں آتا۔ لیکن اس کے مقابل پر ابراہیم کی لانگ ٹرم پالیسی دیکھو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹے تھے آپ نے ایک بیٹے حضرت اسحاقؑ کو کہا کہ آباد ملک میں جا کر تبلیغ کرو۔ اور دوسرے بیٹے کو مکہ میں جو کہ وادی غیر ذی زرع تھی چھوڑ آئے۔ اس غرض سے کہ ڈیڑھ ہزار سال بعد جو قوم یہاں آباد ہو چکی ہوگی اس کو ایک رہبر کی ضرورت ہوگی اور اس وقت میری یہ نسل خدا تعالیٰ کا نام بلند کرے گی۔ اب دیکھو یہ کتنی بڑی لانگ ٹرم پالیسی ہے کہا جاتا ہے کہ دو دن کے بعد قبیلہ جرہم کے لوگ وہاں آ کر آباد ہو گئے تھے لیکن وہ بھی کتنے ہوں گے زیادہ سے زیادہ پچاس ساٹھ ہوں گے اس سے زیادہ نہیں ہو سکتے۔ اور گو یہ لوگ وہاں آ کر آباد بھی ہو گئے لیکن پھر بھی مکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے زمانہ میں تو نہیں بنا بلکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد ڈیڑھ ہزار سال اس کو آباد ہوتے لگے۔ غرض حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو وادی غیر ذی زرع میں اس لئے بٹھایا تا ڈیڑھ ہزار

سال بعد جب یہ جنگل آباد ہو تو اس وقت یہ نسل ان کو تبلیغ کرے۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے اشوک کے زمانہ میں یا بکر ماجیت کے زمانہ میں کوئی پنتھ یا وِدوان یا سناتنی یا جینی اپنی اولاد کو سرگودھا بار یا منٹگمری بار میں اس لئے بسا تا کہ کبھی نہ کبھی یہ علاقہ آباد ہوگا اور جب یہ علاقہ آباد ہوگا تو اس وقت یہ خدا کا نام لیں گے۔ یہ کتنی لانگ ٹرم پالیسی ہے دو ہی بیٹے ہیں ایک کو تو آباد علاقہ میں بھیج دیا تا کہ وہ وہاں تبلیغ کرے اور دوسرے کو وادی غیر ذی زرع میں بٹھا دیا تا کہ جب وہ آباد ہو تو اس کی نسل وہاں تبلیغ کرے۔ اتنی لانگ ٹرم پالیسی میرے نزدیک نہ سیاسی لحاظ سے نہ تجارتی لحاظ سے نہ سائینس کے لحاظ سے نہ کسی قوم نے نہ کسی قبیلہ نے نہ کسی خاندان نے نہ کسی علمی گروہ نے اور نہ کسی فلسفی جماعت نے اختیار کی ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تبلیغ کے لئے اختیار کی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے چند دنوں کا سوال نہ تھا۔ بلکہ سینکڑوں اور ہزاروں سالوں کا سوال تھا کسی کو علم نہیں تھا کہ عرب کب آباد ہوگا اور کتنی دیر تک ان کی اولاد کو تکالیف کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس تمام واقعہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ارادہ کے ساتھ الہام الٰہی بھی شامل تھا لیکن اللہ تعالیٰ بھی اپنے بندے کی قلبی کیفیت کو دیکھتے ہوئے ہی اس کے مطابق الہام نازل فرماتا ہے اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل کی کیفیت ایسی نہ ہوتی اور ان کے جذبات ایسے نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ ان کو کبھی اپنے بچے کو قربان کرنے کا حکم نہ دیتا۔ اگر ان کے دل میں یہ تڑپ نہ ہوتی کہ ان کا بچہ خدا کی راہ میں قربان ہو تو اللہ تعالیٰ ان کے لئے یہ کبھی سامان پیدا نہ کرتا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ سامان پیدا کرنا بتاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں یہ تڑپ موجود تھی اور اسی تڑپ کی وجہ سے ہم کہتے ہیں اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰٓى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰٓى اِبْرَاهِيْمَ وَ عَلٰٓى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ جب ہم درود پڑھتے ہیں تو ہمیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ جذبہ یاد آ جاتا ہے اور ہمارے دلوں میں بھی یہ خواہش موجزن ہوتی ہے کہ تمام دنیا میں اللہ تعالیٰ کا نام بلند ہو اور کیا آبادیاں اور کیا ویرانے ہر جگہ اللہ اکبر کی آواز بلند ہو۔

ڈلہوزی سے قریباً بارہ میل کے فاصلہ پر ایک جگہ ہے جس کو کھجیار کہتے ہیں اس میں ایک تالاب ہے اور اس تالاب میں ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جو تیرتا پھرتا ہے۔ معلوم نہیں کہ کس طرح خدا تعالیٰ کی قدرت سے وہ حصہ زمین سے علیحدہ ہو گیا۔ اس جزیرہ میں گھاس اور مٹی کے سوا کچھ نہیں۔ وہ تالاب جس میں وہ جزیرہ تیرتا ہے قریباً دو سو فٹ لمبا اور اتنا ہی چوڑا ہے اور وہ جزیرہ تیس پینتیس فٹ کے قریب لمبا چوڑا ہے اور ہوا کے چلنے سے ہلتا اور ایک طرف سے دوسری طرف چلا جاتا ہے۔ ہندوؤں کا یہ اعتقاد ہے کہ یہ خدا تعالیٰ کا کوئی خاص کرشمہ ہے وہاں ایک مندر ہے جو ایک سادھو کی یادگار کے طور پر بنایا گیا ہے اس سادھو کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اس تالاب کی تہہ کا پتہ لگانے کے

لئے اسی سال تک رسی بٹ بٹ کر اس میں ڈالتا رہا۔لیکن باوجود اسّی سال تک رسی بٹنے کے وہ رسی پانی کی تہہ تک نہ پہنچی آخر اس سادھو نے ’’تو ہی پرمیشور ہے‘‘ کہہ کر تالاب میں چھلانگ لگا دی اور ڈوب گیا۔ایک دفعہ ہم کھجیار گئے تو میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اس جزیرہ پر چڑھنا چاہیے چنانچہ میں نے ایک دوست سے کہا کہ ہمت کرو اور یہ جو تختے اور گیلیاں ارد گرد پڑی ہیں اٹھالاؤ تا کہ ان کے ذریعہ ہم جزیرہ کے زیادہ قریب ہو جائیں۔اس وقت کوئی ہندو یا سرکاری افسر وہاں نہیں تھا جو ہمیں جزیرہ پر چڑھنے سے روکتا۔ایک گیلی ہم نے تالاب میں ڈالی اور اس سے کہا کہ تم اس کے ساتھ چمٹ جاؤ ہم گیلی کو دھکا دیں گے اور تم جزیرے تک پہنچ جاؤ گے اور ساتھ چپو بھی دے دیا کہ اگر ضرورت ہو تو اس سے کام لے لینا۔چنانچہ ہم نے گیلی کو دھکا دیا اور وہ دوست جزیرے تک پہنچ گئے اور اس کو آہستہ آہستہ ہمارے پاس لے آئے جب جزیرہ ہمارے پاس آ گیا تو میں نے کہا یہ موقعہ ہے اس پر اللہ تعالیٰ کا نام بلند کرو۔اس سے پہلے کسی نے اس پر اللہ کا نام بلند نہیں کیا چنانچہ ہم اس جزیرہ پر چڑھ گئے اور خوب اذانیں دیں۔ اس بات کا علم ہونے کے بعد گورنمنٹ نے یہ قانون بنا دیا کہ کسی شخص کو اس جزیرہ کو کھینچنے یا اس پر چڑھنے کی اجازت نہیں۔اب بے شک یہ قانون بن جائے لیکن ہم نے تو اس پر اذانیں دے دیں اور اللہ تعالیٰ کا نام اس پر بلند کر دیا۔ جب ہم اذانیں دے رہے تھے تو مندر کا ایک پجاری آ گیا چونکہ ہمیں روکنے کی اس میں جرأت نہ تھی اس لئے وہ ہمیں ڈرانے کے لئے کہنے لگا کہ اس جزیرہ پر ایک بہت بڑا سانپ رہتا ہے خطرہ ہے کہ آپ میں سے کسی کو کاٹ نہ کھائے۔میں نے کہا سانپ کاٹتا ہے تو کاٹنے دو۔مگر ہم اس پر اذانیں ضرور دیں گے کیونکہ مومن کے دل میں یہ تڑپ ہوتی ہے کہ میں وہاں اللہ کا نام بلند کروں جہاں کسی نے بھی نہیں کیا پس اپنے اندر ابراہیمی جذبہ پیدا کرو۔اور جو ملک آباد ہیں ان میں تبلیغ کے لئے نکل جاؤ اور جو ملک غیر آباد ہیں وہاں اپنے بچوں کو بسا دو جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد عرب میں بسا دی تا کہ جب بھی عرب آباد ہو تو ان کی اولاد ان میں اللہ تعالیٰ کا نام بلند کرنے والی ہو۔یہ گوبی ڈیزرٹ یا دوسرے غیر آباد علاقے جو آج بیابان اور ویران نظر آتے ہیں تم ایسے علاقوں کو آباد کرو ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بجلی سے چلنے والی مشین یا کلیں ایسی نکال دے جن کے ذریعہ یہ علاقے بھی آباد ہو جائیں اور یہ کوئی بعید از قیاس بات نہیں کیونکہ باقی غیر آباد علاقے بھی تو پہلے اسی طرح ویران تھے پس جہاں امریکہ افریقہ انگلستان جرمن اٹلی اور دوسرے آباد ممالک میں ہمارے مبلغ جائیں وہاں ساتھ ہی ہمیں یہ بھی مدنظر رکھنا چاہیے کہ گوبی جیسے ریگستانوں اور ہندوستان کے ریتلے علاقوں یا عرب کے غیر آباد علاقوں میں بھی ہم احمدیوں کو بسا دیں تا کہ جب بھی وہ علاقے آباد ہوں وہاں احمدیوں کی نسل موجود ہو جو ان میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کا نام بلند

کرے۔ ابراہیمی طریق تو یہی ہے کہ جو ملک غیر آباد ہیں ان میں اپنے مبلغ بھیجو۔ اور جو ملک غیر آباد ہیں وہاں اپنی نسلیں بسادو۔ یہ ایسا جذبہ ہے کہ اس کے ماتحت جو قدم بھی تم اٹھاؤ گے اللہ تعالیٰ اس میں برکت دے گا اور تمہارے ساتھ وہی سلوک کرے گا جو اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے کیا ہم دن رات کہتے ہیں اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَ عَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ۔

كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَ عَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ ہم اسی لئے کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں یہ جذبہ تھا کہ اس کا ایک حصہ آبادیوں میں تبلیغ کرنے لگ گیا اور دوسرا حصہ ویرانوں میں جا بسا۔ اب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی اولاد بھی تبھی ان برکات کی وارث ہو سکتی ہے جب اس کا ایک حصہ آبادیوں میں تبلیغ کرے اور سیدھی راہ سے برگشتہ لوگوں کو صراط مستقیم کی طرف لائے اور دوسرا حصہ غیر آباد علاقوں میں جا کر رہائش اختیار کرے تا کہ جب وہ علاقے آباد ہوں تو کلمہ پڑھنے والے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی جانیں قربان کرنے والے لوگ وہاں موجود ہوں اور دنیا کی تمام آبادیاں اور ویرانے سب اللہ اکبر کی آوازوں سے گونج رہے ہوں۔

پھر فرماتے ہیں وَاغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ اے خدا! تو میرے باپ کو بھی معاف کر دے کیونکہ وہ ہدایت اور راستی کے طریق سے منحرف ہو جانے والے لوگوں میں سے تھا۔ اس جگہ اب کا لفظ استعمال کیا گیا ہے مگر اس سے مراد ان کا چچا ہے جو بت پرست تھا کیونکہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بچپن میں ہی یتیم ہو گئے تھے اور انہیں ان کے چچا نے پالا تھا (جیوش انسائیکلو پیڈیا زیر لفظ Abraham) جس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش بھی آپؐ کے والدین کی وفات کی وجہ سے آپ کے چچا حضرت ابو طالب نے کی تھی جو بت پرست تھے۔ اور اب کے لفظ کا چچا کے معنوں میں استعمال قرآنی محاورہ سے ثابت ہوتا ہے چنانچہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی وفات کے وقت جب اپنے بیٹوں سے پوچھا کہ بتاؤ تم میرے مرنے کے بعد کس کی عبادت کرو گے تو انہوں نے جواب دیا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا (البقرۃ: ۱۳۴) ہم اسی خدائے واحد کی پرستش کریں گے جس کی آپ بھی عبادت کرتے رہے ہیں اور آپ کے آباء حضرت ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ بھی عبادت کرتے رہے ہیں اس جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی جو حضرت یعقوبؑ کے دادا تھے اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو بھی جو آپ کے چچا تھے اب قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح اس آیت میں گو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ الفاظ استعمال فرمائے ہیں کہ وَاغْفِرْ لِاَبِيْ مگر مراد ان کا چچا ہی ہے جو بت پرستی پر قائم رہا تھا۔ یہ دعا جیسا کہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس لئے کی تھی کہ

جب ان کے چچا نے انہیں دھمکی دی کہ لَئِنۡ لَّمۡ تَنۡتَہِ لَاَرۡجُمَنَّکَ وَ اهۡجُرۡنِیۡ مَلِیًّا (مریم:۴۷) اے ابراہیم اگر تو بتوں کی مذمت سے باز نہیں آئے گا تو میں تجھے سنگسار کردوں گا۔ اگر تو اپنی جان بچانا چاہتا ہے تو کچھ دیر کے لئے میری نظروں سے اوجھل ہوجا تاکہ میں غصہ میں کچھ کر نہ بیٹھوں۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ سَلٰمٌ عَلَیۡکَ ۚ سَاَسۡتَغۡفِرُ لَکَ رَبِّیۡ ؕ اِنَّہٗ کَانَ بِیۡ حَفِیًّا (مریم:۴۸) اللہ تعالیٰ آپ پر رحم کرے گو آپ اتنی سختی سے کام لے رہے ہیں لیکن پھر بھی میں آپ کے لئے اپنے رب سے مغفرت کی دعا کروں گا کیونکہ وہ مجھ پر بہت ہی مہربان ہے پس چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کی مغفرت کے لئے دعا کریں گے اس لئے انہوں نے اپنے وعدہ کے مطابق اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وَ اغۡفِرۡ لِاَبِیۡۤ اِنَّہٗ کَانَ مِنَ الضَّآلِّیۡنَ اے میرے خدا! میرے چچا کے گناہ کو معاف فرما دیں۔ وہ یقیناً گنہگاروں میں سے تھا مگر قرآن کریم بتاتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر یہ حقیقت کھل گئی کہ ان کا چچا توحید کا دشمن ہے تو انہوں نے اس سے اپنی برأت کا اظہار کردیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَا کَانَ لِلنَّبِیِّ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ یَّسۡتَغۡفِرُوۡا لِلۡمُشۡرِکِیۡنَ وَ لَوۡ کَانُوۡۤا اُولِیۡ قُرۡبٰی مِنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَیَّنَ لَہُمۡ اَنَّہُمۡ اَصۡحٰبُ الۡجَحِیۡمِ۔ وَ مَا کَانَ اسۡتِغۡفَارُ اِبۡرٰہِیۡمَ لِاَبِیۡہِ اِلَّا عَنۡ مَّوۡعِدَۃٍ وَّعَدَہَاۤ اِیَّاہُ ۚ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَہٗۤ اَنَّہٗ عَدُوٌّ لِّلّٰہِ تَبَرَّاَ مِنۡہُ ؕ اِنَّ اِبۡرٰہِیۡمَ لَاَوَّاہٌ حَلِیۡمٌ (التوبۃ:۱۱۳، ۱۱۴) یعنی نبی اور اس پر ایمان لانے والوں کی شان کے یہ بالکل خلاف ہے کہ وہ مشرکوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی مغفرت طلب کریں خواہ وہ ان کے قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں جبکہ یہ امر ان پر ظاہر ہوجائے کہ وہ توحید کا انکار کرنے کی وجہ سے دوزخی بن چکے ہیں (یعنی یا تو اللہ تعالیٰ ان کا دوزخی ہونا ان پر ظاہر کردے یا وہ شرک کی حالت میں ہی مرجائیں اور اس طرح ان کی مشرکانہ موت سب کو نظر آجائے)۔ ہاں ابراہیمؑ کا اپنے چچا کے لئے استغفار صرف اس وجہ سے تھا کہ اس نے اپنے چچا سے ایک وعدہ کیا تھا مگر جب اس پر یہ امر کھل گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے تو وہ اس سے کلی طور پر بیزار ہو گیا۔ ابراہیم یقیناً بڑا ہی دردمند دل رکھنے والا اور بردبار انسان تھا۔

اس جگہ اب سے چچا اس لئے بھی مراد لیا جاتا ہے کہ قرآن کریم ایک طرف تو یہ بتاتا ہے کہ جب ان پر اپنے اب کے متعلق یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ وہ اللہ تعالیٰ کا دشمن تھا یعنی شرک کی حالت میں ہی اس کا انتقال ہوگیا تو وہ اس کے لئے مغفرت کی دعا کرنے سے پوری طرح دست بردار ہوگئے۔ مگر دوسری طرف قرآن کریم بتاتا ہے کہ بیت اللہ کی تعمیر کے وقت انہوں نے یہ دعا کی کہ رَبَّنَا اغۡفِرۡ لِیۡ وَ لِوَالِدَیَّ وَ لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ یَوۡمَ یَقُوۡمُ الۡحِسَابُ (ابراھیم:۴۲) یعنی اے ہمارے رب تو مجھے بھی اور میرے والدین کو بھی اور تمام مومنوں کو بھی قیامت کے دن اپنی مغفرت کے

دامن میں چھپا لیجیو۔ اور ہمارے گناہوں کو بخش دیجیو ۔ یہ ظاہر ہے کہ خانہ کعبہ کی تعمیر انہوں نے اس وقت کی ہے جبکہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام جوان ہو چکے تھے اور چونکہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ دونوں کی پیدائش آپ کے بڑھاپے کے زمانہ میں ہوئی ہے اس لئے رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَ لِوَالِدَيَّ والی دعا آپ کی عمر کے آخری حصہ سے تعلق رکھتی ہے اور وَ اغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ والی دعا جو انہیں ترک کرنی پڑی اس سے پہلے کی ہے ۔ اگر اب سے مراد ان کے باپ ہی ہوتے تو اس یقینی علم کے بعد کے وہ اللہ تعالیٰ کا دشمن تھا بڑھاپے میں وہ اپنے والدین کی مغفرت کے لئے کیوں دعا کرتے ۔ پس ان کا آخری عمر میں خانہ کعبہ کی تعمیر کے وقت اپنے والدین کی مغفرت کے لئے دعا مانگنا بتاتا ہے کہ چونکہ ان کے والدین کا زمانہ فترت میں انتقال ہو چکا تھا اس لئے انہوں نے ان کی مغفرت کے لئے دعا کر دی ۔ لیکن ان کے چچا نے چونکہ زمانۂ نبوت پایا اور اسے توحید کی تبلیغ بھی کی گئی لیکن پھر بھی وہ اپنے شرک پر مصر رہا اور اسی حالت میں اس کا انتقال ہو گیا اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے وعدہ سے دست بردار ہو گئے ۔ اور یہ امر خود قرآن کریم سے ثابت ہے کہ انبیاء کی بعثت سے پہلے جو لوگ وفات پا جاتے ہیں بوجہ اس کے کہ ان پر حجت تمام نہیں ہوتی ان کا معاملہ ان لوگوں سے بالکل مختلف ہوتا ہے جن پر نبی کے زمانہ میں حجت تمام ہو چکی ہوتی ہے ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّ لَا نَذِيْرٍ ٘ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّ نَذِيْرٌ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (المائدۃ:۲۰) یعنی اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارا رسول آ چکا ہے جو سلسلۂ رسالت کے ایک لمبے انقطاع کے بعد تمہیں ہمارے احکام خوب کھول کھول کر سنا رہا ہے تا کہ قیامت کے دن تم یہ نہ کہو کہ ہمارے پاس کوئی بشارت دینے والا اور ہمیں چوکس اور ہوشیار کرنے والا کوئی نہیں آیا ۔ اب دیکھ لو کہ تمہارے پاس ہمارا بشیر اور نذیر آ چکا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر اس امر پر جس کا وہ ارادہ کرے پوری طرح قادر ہے ۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم نے عدم آگاہی کو ایک معقول عذر قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ چونکہ ایسا عذر لوگوں کے حق بجانب ہونے کی علامت ہو سکتی تھی اس لئے ہم نے ان کے عذر کو توڑ دیا ۔ اور ان کی طرف اپنے انبیاء بھیج دیئے تا کہ وہ دنیا میں ہماری تعلیم پھیلائیں لوگوں پر حجت تمام کریں اور ان کو کسی قسم کے عذر کا موقع نہ ملے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ خود یہ بات بھی تشریح طلب ہے کیونکہ اگر اس کے یہ معنے کئے جائیں کہ جب نبی آتا ہے صرف اسی وقت لوگوں پر حجت ہوتی ہے تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ جس جس زمانہ میں نبی آئے ہیں اسی زمانہ کے لوگوں پر حجت تمام ہوئی ہے باقی لوگوں پر حجت تمام نہیں ہوئی ۔ اگر یہ معنے تسلیم کر لیے جائیں تو اس طرح دنیا کا اکثر حصہ اتمام حجت کے دائرہ سے

باہر نکل جائے گا۔ کیونکہ ہزاروں سال کے لمبے عرصے میں چند زمانوں میں ہی نبی آئے ہیں درمیان میں بڑے بڑے وقفے نظر آتے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نبی لوگوں کی ہدایت کے لئے مبعوث نہیں ہوا۔ پس اگر یہ معنے کئے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ صرف اس زمانہ کے لوگوں پر ہی حجت ہوئی ہے جس زمانہ میں کوئی نبی آیا ہے۔ باقی سب دنیا کسی الزام کے نیچے نہیں آتی۔ پس یہ جو شبہ پیدا ہوتا ہے سب سے پہلے میں اسی کے متعلق بتاتا ہوں کہ قرآن کریم کی اس آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ صرف کسی نبی کی زندگی میں جو لوگ ایمان نہیں لاتے وہی اتمام حجت کے نیچے آتے ہیں بلکہ جیسا کہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے ہر نبی کی حیات دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک اس کی حیات جسمانی ہوتی ہے اور ایک اس کی حیات فیضانی ہوتی ہے۔ ایک وہ زمانہ ہوتا ہے جب کہ وہ اپنے جسم کے ساتھ دنیا میں زندہ ہوتا ہے اور ایک وہ زمانہ ہوتا ہے جب کہ وہ اپنے فیضان کے ساتھ دنیا میں زندہ ہوتا ہے اور کسی نبی کے فیضان کے زمانہ کی زندگی لوگوں کے عذرات کے لحاظ سے ویسی ہی حیثیت رکھتی ہے جیسا کہ اس کی حیات جسمانی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ وہ لوگ زندہ موجود ہوتے ہیں جنہوں نے نبی کی زبان سے خدا تعالیٰ کا کلام سنا ہوتا ہے اور وہ اس کی قوت قدسیہ کے حامل ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رسول رسول ہی ہے اور اس کے اتباع ہی ہیں مگر اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ جس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ایک زندہ خدا لوگوں کو نظر آیا ہے اسی طرح ابوبکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ اور علیؓ کے ذریعہ بھی لوگوں کو ایک زندہ خدا نظر آتا تھا اور پھر ویسا ہی زندہ خدا حضرت حسن بصریؒ، حضرت عمر بن عبد العزیزؒ، حضرت جنید بغدادیؒ حضرت محی الدین صاحب ابن عربیؒ حضرت شہاب الدین صاحب سہروردیؒ، حضرت معین الدین صاحب چشتیؒ، اور سید عبد القادر صاحب جیلانیؒ وغیرہ کے ذریعہ بھی نظر آتا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اسلام کے زندگی بخش اثرات کو برابر قائم رکھا اور اس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضان کی زندگی جاری رہی۔ سوال صرف یہ نہیں ہوتا کہ کوئی چیز کتنی نظر آئی ہے بلکہ اصل سوال یہ ہوتا ہے کہ کوئی چیز نظر آئی ہے یا نہیں آئی۔ اگر کوئی چیز نظر آجائے تو یہ سوال باقی نہیں رہتا کہ وہ چیز چھوٹی ہے یا بڑی۔ دنیا میں مختلف قسم کی گائیں ہوتی ہیں مختلف قسم کے گھوڑے ہوتے ہیں کوئی ادنیٰ قسم کے ہوتے ہیں اور کوئی اعلیٰ قسم کے ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی اعلیٰ درجہ کی گائے یا کسی اعلیٰ درجہ کے گھوڑے کو دیکھ کر یہ کہے کہ مجھے جب تک ایسی ہی گائے یا ایسا ہی گھوڑا دکھائی نہ دے میں مان نہیں سکتا کہ دنیا میں کوئی گائے یا گھوڑا بھی موجود ہے تو یہ اس کی غلطی ہوگی۔ میں ایک دفعہ کپورتھلہ گیا تو وہاں میں نے مہاراجہ کی ایک گائے دیکھی جو تین ہزار روپیہ کی تھی اور جو ولایت سے منگوائی گئی تھی۔ اب اگر کوئی شخص کہے کہ میں نے گائے نہیں دیکھی اور اس کا مطلب وہ یہ لے کہ

مہاراجہ کپورتھلہ کی جو تین ہزار روپیہ کی گائے ہے وہ میں نے نہیں دیکھی تو کوئی معقول انسان اس کی اس بات کو تسلیم نہیں کرے گا۔اسی طرح ہم گھوڑوں کو دیکھتے ہیں تو وہ ٹٹو بھی ہوتے ہیں جو معمولی سی قیمت پر آجاتے ہیں اور وہ گھوڑے بھی ہوتے ہیں جو پچیس پچیس لاکھ روپیہ کو خریدے جاتے ہیں۔اب اگر کوئی شخص پچیس لاکھ روپیہ والے گھوڑے کا ذکر سن کر کہے کہ میں نے کبھی گھوڑا نہیں دیکھا اور اس کا مطلب یہ ہو کہ میں نے پچیس لاکھ روپیہ قیمت والا گھوڑا نہیں دیکھا تو کوئی معقول انسان اس کی اس بات کو تسلیم نہیں کرے گا۔اگر وہ ایک بیمار اور ضعیف اور کمزور گھوڑا بھی دیکھ لیتا ہے تو وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے گھوڑا نہیں دیکھا اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زندگی کا ثبوت کسی انسان کے ذریعہ سے مل جائے تو چاہے وہ اتنا روشن اور بین نہ ہو اور چاہے وہ اس فیضان کا ایک چھوٹا سا ظہور ہو بہر حال جب خدا کا عکس اس کے آئینہ قلب میں سے نظر آجائے اور دنیا اس کا انکار نہ کر سکے بلکہ اسے کہنا پڑے کہ میں نے خدا کو دیکھ لیا تو کسی کا یہ کہنا کہ جب تک مجھے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی طرح خدا نظر نہیں آئے گا۔میں تسلیم نہیں کروں گا درست نہیں ہوگا جب ایک چیز موجود ہو تو اس کا انکار واقعات کو جھٹلانا ہوتا ہے یہ الگ بات ہے کہ کوئی چیز چھوٹی ہو اور کوئی بڑی۔

پس نبی کی جو حیات فیضانی ہوتی ہے اس میں جتنے لوگ ہوں سب پر حجت تمام ہو جاتی ہے کیونکہ نبی کے زیر سایہ اور زیر تعلیم لوگوں کے ذریعہ وہ ایسے نشانات دیکھتے ہیں جن سے زندہ خدا کا ثبوت مل جاتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام میں یہ سلسلہء فیوض اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایسے طور پر جاری ہے کہ اس میں کبھی انقطاع نہیں ہوا۔یہ سلسلہ ابتدائے اسلام سے جاری ہوا اور حضرت سید احمد صاحب شہید بریلویؒ کے زمانہ تک برابر جاری رہا۔اور ان کے اور ان کے اتباع کے ذریعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضان کا ثبوت لوگوں کو ملتا رہا۔ان پر الہامات کا نزول ہوتا تھا۔وہ ان الہامات کو بیان کرتے تھے لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی ہستی پر یقین پیدا ہوتا تھا۔اور یہ تو صرف ہندوستان کا ذکر ہے۔دنیا کے اور حصوں میں بھی مختلف مجددین مبعوث ہوئے اور وہ لوگوں کے لئے ہدایت اور راہنمائی کا موجب بنے۔

مجددین کے متعلق لوگوں میں یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ ایک ہی مجدد ساری دنیا کی طرف مبعوث ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔اصل بات یہ ہے کہ ہر ملک اور ہر علاقہ میں اللہ تعالیٰ مجدّد پیدا کیا کرتا ہے مگر لوگ قومی یا ملکی لحاظ سے اپنی قوم اور اپنے ملک کے مجدّد کو ہی ساری دنیا کا مجدّد سمجھ لیتے ہیں۔حالانکہ جب اسلام ساری دنیا کے لئے ہے تو ضروری ہے کہ دنیا کے مختلف علاقوں اور مختلف ملکوں میں مختلف مجدّدین کھڑے ہوں۔حضرت سیّد احمد

صاحب بریلویؒ بھی بیشک مجدّد تھے۔ مگر وہ ساری دنیا کے لئے نہیں تھے۔ بلکہ صرف ہندوستان کے مجدّد تھے۔ اگر کہا جائے کہ وہ ساری دنیا کے مجدّد تھے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے عرب کو کیا ہدایت دی انہوں نے مصر کو کیا ہدایت دی انہوں نے ایران کو کیا ہدایت دی، انہوں نے افغانستان کو کیا ہدایت دی۔ ان ملکوں کی ہدایت کے لئے انہوں نے کوئی کام نہیں کیا لیکن اگر ان ممالک کی تاریخ دیکھی جائے تو ان میں بھی ایسے لوگ نظر آتے ہیں جو صاحبِ وحی اور صاحبِ الہام تھے اور جنہوں نے اپنے ملک کی راہنمائی کا فرض سرانجام دیا پس وہ بھی اپنی اپنی جگہ مجدّد تھے اور یہ بھی اپنی جگہ مجدّد تھے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کوئی بڑا مجدّد ہوتا ہے اور کوئی چھوٹا۔ ہندوستان میں آنے والے مجدّد دین کی اہمیت اس لئے ہے کہ وہ اس ملک میں آئے جہاں مسیح موعود نے آنا تھا۔ اور اس طرح ان کا وجود حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے بطور ارہاص تھا۔ ورنہ ہمارا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ صرف یہی مجدد ہیں باقی دنیا مجدّد دین سے خالی رہی ہے ہر شخص جو الہام کے ساتھ تجدیدِ دین کا کام کرتا ہے وہ روحانی مجدّد ہے۔ ہر شخص جو اسلام اور مسلمانوں کے لئے تجدید کا کوئی کام کرتا ہے وہ مجدّد ہے۔ چاہے وہ روحانی مجدّد نہ ہو۔ جیسے میں نے کئی دفعہ مثال دی ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک دفعہ فرمایا کہ اورنگ زیبؒ بھی مجدّد تھا۔ حالانکہ اورنگزیبؒ کو خود الہام کا دعویٰ نہیں تھا۔ تو نبی کے فیوضِ روحانی کا زمانہ نبی کی زندگی میں ہی شامل ہوتا ہے اور اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو فترت کا زمانہ بہت قلیل رہ جاتا ہے۔ گو بعض ممالک ایسے بھی ہیں جن پر فترت کا زمانہ کسی قدر لمبا نظر آتا ہے مگر ان ممالک کے اردگرد بھی روحانی فیوض کا سلسلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے برابر جاری تھا۔ جیسے عرب کا ملک ہے۔ اس پر فترت کا ایک لمبا دور آیا۔ گو بعض لوگ کہتے ہیں۔ اس عرصہ میں بھی اللہ تعالیٰ کے بعض انبیاء ان میں مبعوث ہوئے۔ چنانچہ سنان بن خالد کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ بھی نبی تھے (البدایة و النهایة لدمشقی جزء الثانی فصل تفویض قصی امر الو ظائف لابنه عبدالدار، ذکر جماعة مشهورین فی الجاهلیة و السیرة الحلبیة باب یذکر فیه ما یتعلق بالوفود) اور اگر اس کو تسلیم کیا جائے تو اس طرح عرب پر بھی زمانۂ فترت زیادہ عرصہ تک نہیں رہتا۔ لیکن اگر مان بھی لیا جائے کہ ملک عرب پر فترت کا دور لمبے عرصہ تک رہا تو بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ اہلِ عرب کے دائیں اور بائیں ایسے لوگ مبعوث ہوتے رہے تھے جو خدا تعالیٰ کی طرف لوگوں کو بلاتے اور نشانات کے ذریعہ اس کی ہستی کا ثبوت پیش کرتے۔ آخر یہ کوئی ضروری نہیں تھا کہ اہلِ عرب پر کسی ایسے نبی کے ذریعہ ہی اتمام حجت کی جاتی جو ان میں سے ہوتا۔ جب داؤدؑ کے ذریعہ خدا ان پر ظاہر ہو رہا تھا جب سلیمانؑ کے ذریعہ خدا ان پر ظاہر ہو رہا تھا۔ جب عیسیٰؑ کے ذریعہ خدا ان پر ظاہر ہو رہا تھا جب یحییٰؑ کے ذریعہ خدا ان پر ظاہر ہو رہا تھا۔ جب ذوالقرنین کے ذریعہ

جس سے مراد خورس شاہ ایران ہے ان پر خدا ظاہر ہو رہا تھا اور یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے الہام کا دعویٰ کیا۔ اور یہ وہ لوگ تھے جو اہلِ عرب کے دائیں بائیں مبعوث ہوئے تو اس کے بعد اگر عرب میں کچھ وقفہ بھی ہوا تب بھی وہ یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہمیں پتہ نہیں شرک بری چیز ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کی وحدانیت کا عقیدہ بار بار ان انبیاء کے ذریعہ پیش کیا جا چکا تھا۔ اور یہ انبیاء وہ تھے جو اہلِ عرب کے دائیں بائیں مبعوث ہوئے اور جن کے حالات اور جن کی تعلیم سے وہ لوگ بے خبر نہیں ہو سکتے تھے۔ اگر اس طرح ہم دیکھیں تو فترت کا زمانہ بہت ہی قلیل رہ جاتا ہے جب خدا کا نور کہیں نظر نہ آتا ہو۔ اہلِ عرب پر بیشک فترت کا کچھ لمبا زمانہ نظر آتا ہے مگر اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کی برکت کی وجہ سے اور دوسری طرف اہل عرب پر اس رحم کی وجہ سے کہ انہوں نے فترت کا ایک لمبا دور برداشت کیا تھا اپنے خاتم النبیین کو عربوں میں مبعوث فرما دیا اور اس طرح اس کمی کا ازالہ ہو گیا۔ بہرحال لوگوں کے خلافِ توحید اعمال اس وجہ سے معاف نہیں ہو سکتے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی نبی ان پر حجت قائم کرنے کے لئے مبعوث نہیں ہوا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اس عذر کو ہمیشہ توڑتا رہتا ہے اور وہ انبیاء کے ذریعہ لوگوں پر حجت قائم کر دیتا ہے خواہ یہ حجت انبیاء کی جسمانی زندگی میں ہو خواہ ان کی فیضانی زندگی میں ہو۔ لیکن وہ لوگ جو نہ تو انبیاء کی جسمانی زندگی کے زمانہ میں موجود ہوتے ہیں اور نہ ان کی فیضانی زندگی میں موجود ہوتے ہیں ان کا معاملہ ایک جداگانہ نوعیت کا حامل ہوتا ہے۔ چنانچہ احادیث میں آتا ہے کہ ایسے لوگوں کے پاس اللہ تعالیٰ قیامت کے دن دوبارہ اپنا رسول بھیجے گا۔ اور پھر اس کی اطاعت کرنے والوں یا اس کا انکار کرنے والوں کو اپنے اپنے عمل کے مطابق جزا دی جائے گی (تفسیر رُوح المعانی جلد ۴ صفحہ ۴۹۶)۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کے زمانہ میں احکامِ الٰہی کی جو اہمیت ہوتی ہے وہ فترت کے زمانہ میں نہیں ہوتی۔ جب کسی نبی کی فیضانی زندگی بھی ختم ہو چکی ہو یا اس فیضانی زندگی میں کوئی وقفہ پڑ چکا ہو جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ فیضانی موجود تھی مگر چونکہ کوئی ایسا بندہ موجود نہیں تھا جو بنی نوع انسان پر آپؐ کی روحانیت کا پرتو ڈالتا اور آپؐ کا نور اپنے آئینۂ قلب میں جذب کر کے اس کی شعاعوں سے دوسروں کو منور کرتا اس لئے امت محمدیہ پر بھی فترت کا زمانہ آ گیا۔ مگر وہ فترت کا زمانہ بہت ہی تھوڑا تھا۔ آخر حضرت سید احمد صاحب شہید بریلویؒ کے وفات پاتے ہی ان کے تمام شاگرد تو اپنے فرائض سے غافل نہیں ہو گئے تھے کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کی وفات کے ساتھ ہی فترت کا زمانہ شروع ہو گیا تھا۔ آپ کی شہادت ۶؍ مئی ۱۸۳۱ء کو ہوئی ہے (سید احمد شہید از غلام رسول مہر صفحہ ۴۱۴ زیر عنوان کیفیت شہادت) اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ۱۸۶۴ء کے قریب الہامات شروع ہو گئے تھے اور ۱۸۷۲ء میں آپؑ نے اسلام کی صداقت کے متعلق مضامین

وغیرہ لکھنے شروع کر دیئے تھے۔ (سیرت حضرت مسیح موعودؑ از شیخ یعقوب علی عرفانیؓ صفحہ ۷۱ زیر عنوان اخبار پڑھنے کی عادت)

گویا ابھی ایک انسانی عمر بھی نہیں گزری تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ایک اور شخص کو لوگوں کی اصلاح کے لئے کھڑا کر دیا یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زندہ نبی ہونے کا ایک نہایت ہی واضح اور کھلا ثبوت ہے اور بتاتا ہے کہ اسلام میں فترت کا زمانہ نہایت قلیل ہوتا ہے بلکہ بعض دفعہ تو صرف نام کے طور پر ہوتا ہے ورنہ ادھر ایک زمانہ ختم ہوتا ہے اور اُدھر تھوڑے سے وقفہ کے بعد ایک اور دور شروع ہو جاتا ہے اور اس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیضان دنیا میں ہمیشہ جاری رہتا ہے لیکن جن انبیاء کی فیضانی زندگی ختم ہو جائے اور ان کے بعد بھی فترت کا دور لمبا ہو جائے۔ اس دور میں جو لوگ پیدا ہوتے ہیں ان کے متعلق شرعی احکام بالکل اور رنگ اختیار کر لیتے ہیں اور ان کے لئے مغفرت کی دعا بالکل جائز ہوتی ہے۔

زیر تفسیر آیت میں جو مثال دی گئی ہے وہ ایک ایسے شخص کی ہے جو نبوت کے زمانہ میں تھا یعنی وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا چچا تھا اور اس زمانہ میں زندہ موجود تھا۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے توحید کی تعلیم لوگوں کے سامنے پیش کی۔ پس ایسا انسان جس کے سامنے ایک نبی اپنی تعلیم پیش کرتا ہے اور وہ پھر بھی شرک پر اصرار کرتا ہے بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی توحید سے پھرانے کی کوشش کرتا ہے اس کے متعلق یقیناً اور احکام ہوں گے۔ اور زمانہ فترت سے تعلق رکھنے والے لوگوں پر اور احکام نافذ ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے چچا کے متعلق تو مغفرت کی دعا واپس لے لی اور اس سے اپنی بیزاری کا اظہار کر دیا مگر اپنے والدین کے متعلق انہوں نے بڑھاپے میں بھی دعا کی کیونکہ وہ زمانۂ فترت میں انتقال کر چکے تھے۔ اور ان کے متعلق احکام ایک جداگانہ نوعیت کے حامل تھے۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے گذشتہ زمانہ میں جو مسلمان حیاتِ مسیح کے قائل رہے ہیں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کو بزرگ اور صالح قرار دیا ہے لیکن موجودہ زمانہ میں اس عقیدہ کو آپؑ نے عیسائیت کی مضبوطی کا موجب قرار دیا ہے۔ کیونکہ پہلے لوگوں کو علم نہیں تھا کہ یہ عقیدہ اسلام کے لئے کیسا خطرناک ہے مگر اب یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو چکی ہے۔ پس چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والدین زمانۂ فترت میں انتقال کر چکے تھے آپ نے ان کی مغفرت کی دعا کی۔ اور چونکہ ان کا چچا توحید کی تعلیم سننے کے باوجود اپنے شرک پر مصر رہا آپ نے اس سے اپنی بیزاری کا اظہار کر دیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اَب کا نام قرآن کریم میں اٰزَر بتایا گیا ہے (الانعام: ۷۵) لیکن بائیبل کہتی ہے کہ اس کا نام تارا تھا (پیدائش باب ۱۱ آیت ۲۷) عیسائی مستشرقین جو بائیبل کی ہر بات کو وحیٔ آسمانی سے کم نہیں سمجھتے

بالعموم اعتراض کیا کرتے ہیں کہ قرآن کریم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام آزر قرار دے کر غلطی کی ہے۔ حالانکہ بائیبل نہ تو کوئی تاریخ کی کتاب ہے اور نہ ہی ہم پر حجّت ہے۔ اس کے اپنے بیانات اس قدر متضاد اور ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں کہ قرآن کریم کے مقابلہ میں اسے کسی طرح درست نہیں مانا جاسکتا۔ بائیبل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا جو نام لکھا ہے وہ لکھنے والے ان کے وقت میں موجود نہ تھے بلکہ سوا دو سو سال بعد میں پیدا ہوئے۔ پھر ان کی بات تاریخی لحاظ سے کیونکر صحیح مانی جاسکتی ہے۔ اور بائیبل کے بیانات کی جو حالت ہے وہ اس ایک مثال سے ہی ظاہر ہے کہ بائیبل میں لکھا ہے۔ حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کے ساتھ جو لوگ مصر سے نکلے تھے ان کی تعداد چھ لاکھ سے اوپر تھی (گنتی باب ۱ آیت ۴۶) اور یہ وہ لوگ تھے جو لڑائی کے قابل تھے۔ اس لحاظ سے گویا کُل مرد عورتیں اور بچے چوبیس پچیس لاکھ ہو گئے۔ مگر یہ بالکل ناممکن ہے کہ سوا دو سو سال میں بنی اسرائیل کی تعداد اس قدر بڑھ جائے۔ زیادہ سے زیادہ یہ تعداد چار ہزار تک بڑھ سکتی ہے بشرطیکہ ان میں کوئی عورت بانجھ نہ ہو اور کوئی مرد نامرد نہ ہو۔ گویا اگر نسل کی انتہائی ترقی مدّنظر رکھی جائے جو دنیا میں کسی قوم کی نہیں ہوئی۔ اور یہ تسلیم کر لیں کہ ہر چالیس سال میں ان کی تعداد دگنی ہو جاتی تھی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ان کی تعداد چار ہزار ہونی چاہیے۔ مگر بائیبل کہتی ہے کہ ان میں چھ لاکھ سے اوپر جوان لڑنے والے تھے۔ گویا اس وقت بنی اسرائیل کی تعداد چوبیس پچیس لاکھ کے قریب تھی۔ یہ بات حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کے زمانہ کی بیان کی جارہی ہے۔ مگر قرآن کریم دو ہزار سال کے بعد حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کے زمانہ کی یہ بات ان الفاظ میں بیان فرماتا ہے کہ ’’وَھُمْ اُلُوْفٌ‘‘ (البقرۃ:۲۴۴) وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ اور یہ وہی تعداد ہے جو بنی اسرائیل کی زیادہ سے زیادہ نسل بڑھنے کے متعلق اندازہ لگا کر میں نے پیش کی ہے۔ پس جس کتاب کی یہ حالت ہو اُسے تاریخی کتاب کس طرح قرار دیا جاسکتا ہے۔ وہ تاریخ نہیں بلکہ قصوں اور کہانیوں کی کتاب ہے۔ اگر ہم اس کا احترام کرتے ہیں تو اس لئے کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ ورنہ اس میں اتنا بگاڑ پیدا ہو چکا ہے کہ اب اس کی کسی بات پر پورے طور پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا پھر تورات کہتی ہے کہ حضرت ہارونؑ نے شرک کیا (خروج باب ۳۲ آیت ۲ تا ۶)۔ اور اپنے ہاتھ سے پرستش کے لئے بچھڑا بنایا۔ مگر قرآن کریم کہتا ہے کہ حضرت ہارونؑ نے شرک نہیں کیا (طٰہٰ:۹۱) بلکہ انہوں نے دوسروں کو روکنے کی کوشش کی اور یہی بات ایک نبی کی شایان شان ہے۔

غرض جبکہ بائیبل کی کئی باتیں تاریخی لحاظ سے غلط ہیں تو یہ کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا بائیبل نے جو نام بتایا ہے وہ درست ہے اور قرآن کریم نے جو نام بتایا ہے وہ غلط ہے۔ اگر بائیبل کا

بیان کلی طور پر درست ہوتا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام تاراؔ ہی ہوتا تو طالمودؔ میں ان کے باپ کا نام زارا کیوں لکھا جاتا۔ اور جوزیفس جو مشہور یہودی مؤرخ ہے وہ اس کا نام آتھر یعنی آزر کیوں بتاتا (ترجمۃ القرآن از سیلؔ صفحہ ۱۷۷، ۱۷۸) یہ اختلاف جو خود یہودیوں کے اندر پایا جاتا ہے۔ اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے باپ کے نام کے متعلق اختلاف تھا۔ اور چونکہ قرآن کریم کا نزول اسی لئے ہوا کہ وہ پہلی الہامی کتب کے پیدا کردہ اختلافات کو دور کرے اس لئے اس نے اس اختلاف کو بھی دور کر دیا اور بتا دیا کہ اس کا نام آذر ہی تھا۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ تارا سے ہی قرآن کریم نے آزر بنالیا ہو۔ کیونکہ تؔ زؔ سے بدل جاتی ہے۔ اور قلب کے ذریعہ الف پہلے آجاتا ہے معلوم ہوتا ہے عربوں کی زبان پر تارا کا لفظ نہیں چڑھتا تھا۔ انہوں نے تارا کو زارا بنالیا اور پھر زارا سے آزر بن گیا۔ چونکہ قرآن کریم عموماً معرّب نام استعمال کرتا ہے۔ جیسے ابراہام کو ابراہیم۔ اور یسوع کو عیسیٰ اور یوحنا کو یحییٰ اور حنوک کو ادریس کہا گیا ہے۔ اسی طرح تارا کو زارا کہہ دیا گیا ہے۔ پس یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں۔ پھر سوال یہ ہے کہ ہم تو یہ تسلیم ہی نہیں کرتے کہ اس جگہ آب سے ان کا حقیقی باپ مراد ہے۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ اس جگہ اَب کا لفظ چچا کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے اسی لئے دوسرے مقام پر جب انہوں نے اپنے والدین کے لئے دعا کی تو وہاں آب کی بجائے والد کا لفظ استعمال کیا۔ پس جبکہ ہم آزر ان کے چچا کا نام سمجھتے ہیں تو بائیبل میں اگر ان کے باپ کا نام تارا آ گیا ہے تو اس سے قرآن کریم پر کیا اعتراض پڑ سکتا ہے۔ اگر بائیبل ان کے چچا کا نام تارا بتاتی تب تو یہ اعتراض ہوسکتا تھا۔ لیکن بائیبل تو ان کے حقیقی باپ کا نام تاراؔ بتاتی ہے اور قرآن کریم ان کے چچا کا نام آزرؔ بتاتا ہے ان دونوں کا آپس میں کوئی تعلق ہی نہیں کہ ایک نام کو دیکھ کر دوسرے نام پر اعتراض کر دیا جائے۔ اس کی مزید تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ بائیبل حضرت سارا کو جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی تھیں تارہؔ کی بیٹی قرار دیتی ہے۔ (پیدائش باب ۲۰ آیت ۱۲) اگر تارا کو ان کا حقیقی باپ سمجھا جائے تو اس کے معنے یہ بنتے ہیں۔ کہ آپ نے اپنی سگی بہن سے شادی کی حالانکہ بہن سے شادی کرنا ناجائز تھا۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ دراصل وہ باپ نہیں بلکہ چچا تھا۔ مگر چونکہ ان کی پرورش اپنے چچا کے گھر میں ہی ہوئی تھی اس لئے لوگوں کو غلطی لگ گئی اور انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تاراؔ کی طرف منسوب کرنا شروع کر دیا۔ اور پھر مؤرخین نے بھی اسے آپ کا باپ قرار دے دیا۔ اس مقام پر بھی طالمودؔ نے بائیبل کی اصلاح کی ہے اور بتایا ہے کہ حضرت ساراؔ ان کے بھائی کی بیٹی تھیں۔ ان کی حقیقی بہن نہیں تھیں پھر طالمودؔ میں یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب بتوں کے خلاف آواز بلند کی تو آذر نے تنگ آ کر بادشاہ کے پاس اُن کی شکایت کی اور انہیں سزا دلوانے کی کوشش کی۔ اس فعل کی بھی عقلی لحاظ سے ایک باپ سے

توقع نہیں کی جاسکتی ۔ پس یہ تمام قرائن اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ اس جگہ آب سے ان کا چچا ہی مراد ہے اور بائیبل سے نام کا اختلاف کوئی قابلِ اعتراض امر نہیں ۔

پھر فرماتے ہیں وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ۔ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ۔ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۔یعنی اے میرے رب ! مجھے اس دن کی رسوائی سے محفوظ رکھیو جس دن تمام لوگ اپنے اپنے اعمال کی جوابدہی کے لئے اٹھائے جائیں گے اور جس دن انسان کو نہ اس کا مال نفع دے گا اور نہ اس کے بیٹے اس کے کسی کام آئیں گے ہاں وہی شخص فائدہ میں رہے گا جو اللہ تعالیٰ کے پاس ایک پاک اور بے عیب اور مطمئن دل لے کر حاضر ہوگا۔ یہ ظاہر ہے کہ دل تبھی مطمئن ہوتا ہے جب انسان کو یقین ہو کہ اس نے اپنی پیدائش کے مقصد کو حاصل کر لیا ہے اور اسے اپنے انجام کے متعلق کوئی اضطراب لاحق نہ ہو مگر یہ یقین اللہ تعالیٰ کے تعلق کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا پس قلبِ سلیم درحقیقت اُسی شخص کو میسر آتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا تعلق پیدا کر لیتا ہے ورنہ ظاہری مال و دولت کسی انسان کو مطمئن نہیں کر سکتی ۔ یورپین قوموں کو دیکھ لو۔ مال و دولت کے لحاظ سے دنیا کی کوئی قوم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ مگر ہر قسم کی طاقت اور جتھے اور مال کے باوجود ان کے اندر ایک احساس کمتری پیدا ہو رہا ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی چیز ایسی ہے جو ان کے پاس نہیں بلکہ ایشیائیوں کے پاس ہے۔ یہ احساس کمتری ابھی ان میں اتنا نمایاں نہیں کہ بڑوں اور چھوٹوں سب لوگوں میں پایا جائے لیکن تاہم ان کے اندر ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جو سمجھتا ہے کہ ان کے پاس دولت بھی ہے مال بھی ہے لیکن انہیں دل کا چین نصیب نہیں ۔ وہ لوگ شرابیں پیتے ہیں ۔سینما دیکھتے ہیں ۔ناچ اور گانوں میں دن رات کا ایک بڑا حصّہ بسر کرتے ہیں ۔لیکن جب نشہ اتر جاتا ہے اور وہ چارپائی پر جا کر لیٹتے ہیں تو انہیں یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر کوئی خلا پایا جاتا ہے۔ اور وہ خلا سوائے تعلق باللہ اور دین کے اور کوئی چیز پُر نہیں کر سکتی ۔ دنیا کی ہر نعمت کو حاصل لینے کے بعد بھی ان کے اندر یہ بے چینی ہوتی ہے کہ کوئی چیز ایسی ہے جو انہیں حاصل نہیں اور وہ انہیں حاصل ہونی چاہیے۔ دراصل خدا تعالیٰ کی محبت اور اس کا وصال ایک ایسی نعمت ہے کہ جب وہ کسی شخص کو میسر آجاتی ہے تو دنیا کے سارے غم مٹ جاتے ہیں اور اسے کوئی حسرت باقی نہیں رہتی ۔ عارضی غم بے شک آتے ہیں ۔ مثلاً اگر کسی شخص کو کانٹا چبھ جائے تو اس کے نتیجے میں اسے درد تو ہوتا ہے لیکن اسے کوئی شخص بیمار نہیں کہہ سکتا۔ اسی طرح عارضی تکلیفیں اور غم تو ایسے انسان پر بھی آتے ہیں ۔لیکن یہ غم ان کے راستہ میں روک نہیں بنتے اور اپنے اپنے درجہ کے مطابق انہیں اطمینان اور سکون حاصل رہتا ہے ۔ اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ انسانی جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جب وہ ٹھیک ہوتا ہے تو سارا انسانی جسم ٹھیک ہوجاتا ہے اور

جب وہ خراب ہو جاتا ہے تو سارا انسانی جسم خراب ہو جاتا ہے۔ پھر فرمایا اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ (بخاری کتاب الایمان باب فضل من إستبرأ لدينه) سنو! وہ گوشت کا لوتھڑا دل ہے۔

بعض لوگوں نے خصوصاً اس زمانہ کے سائینسدانوں اور تشریح الابدان والوں نے کہا ہے کہ وہ چیز جو انسانی اعمال، افعال اور ارادوں اور خواہشات کو مضبوط کرتی ہے اور انہیں ایک نظام کے نیچے لاتی ہے وہ دل نہیں بلکہ دماغ ہے۔ اور سائینس والوں سے ڈر کر بعض مسلمان علماء نے بھی قرآن کریم کی بعض آیات کی ایسی تفسیر شروع کر دی ہے جس سے یہ نکلتا ہے کہ قلب سے مراد قلبِ انسانی نہیں بلکہ اس سے مراد محض وہ مقام ہے جو انسانی جسم پر حکومت کرتا ہے چاہے وہ دماغ ہی ہو۔ لیکن میرے نزدیک یہ توجیہہ محض ڈر کی وجہ سے کی گئی ہے۔ ورنہ جہاں تک قرآن کریم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے میرے نزدیک قلب سے مراد وہی چیز ہے جو سینہ میں ہوتی ہے اور اس چیز کو دماغ قرار دینا محض دھینگا مُشتی ہے۔ بہرحال اس حدیث سے ظاہر ہے کہ انسانی اعمال کی صفائی دل کی صفائی کے ساتھ وابستہ ہے۔ تم اپنے ہاتھوں کی صفائی کر کے پاک نہیں ہو سکتے۔ تم اپنے منہ کی صفائی کر کے پاک نہیں ہو سکتے تم اپنے سر کی صفائی کر کے پاک نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ پاکیزگی کا منبع دل ہے۔ لیکن اگر تم اپنے دل کی صفائی کر لو تو اللہ تعالیٰ کے حضور تم ایک مطمئن دل لے حاضر ہو گے۔ ہمارا خالق اور مالک جس نے مخلوق کو پاکیزگی کے حصول کے لئے پیدا کیا ہے اس کے نزدیک سب سے مقدم دلوں کی پاکیزگی ہی ہے۔ کیونکہ تقویٰ کا درخت صرف اسی زمین میں پرورش پا سکتا ہے جو پاک اور صاف ہو۔ ناپاک دل اس کی صفات کا جلوہ گاہ نہیں ہو سکتا اور نہ ناپاک ہاتھ اس کے عرش کے پائے کو چھو سکتے ہیں۔

وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۹۱﴾ وَ بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ

اور جس دن جنت متقیوں کے قریب کر دی جائے گی۔ اور گمراہوں کے لئے دوزخ پر سے پردے

لِلْغٰوِيْنَ ﴿۹۲﴾ وَ قِيْلَ لَهُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿۹۳﴾

اٹھا دیئے جائیں گے۔ اور کہا جائے گا کہ کہاں ہیں وہ جن کی تم اللہ کے سوا کے عبادت کرتے تھے۔

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ هَلْ يَنْصُرُوْنَكُمْ اَوْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿۹۴﴾ؕ

کیا وہ تمہاری مدد کر سکتے ہیں؟ یا تمہارا بدلہ لے سکتے ہیں؟ پس اس وقت وہ (جھوٹے معبود اور کافر) اور گمراہ

فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ وَ الْغَاوٗنَ ﴿۹۵﴾ وَ جُنُوْدُ اِبْلِيْسَ

اور ابلیس کے لشکر سارے کے سارے اس (دوزخ) میں اوندھے منہ گرا دیئے جائیں گے۔ وہ آپس میں

اَجْمَعُوْنَ ﴿۹۶﴾ قَالُوْا وَ هُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۹۷﴾ تَاللّٰهِ اِنْ

جب کہ وہ اُس (یعنی جہنم) میں جھگڑ رہے ہوں گے کہیں گے۔ خدا کی قسم ہم کھلی گمراہی میں پڑے

كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۹۸﴾ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۹﴾

ہوئے تھے۔ جب کہ ہم تم کو رب العالمین خدا کے برابر درجہ دیتے تھے۔ اور ہم کو تو مجرموں نے ہی راستہ سے

وَ مَاۤ اَضَلَّنَاۤ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ﴿۱۰۱﴾

بھٹکایا تھا۔ پس (آج) شفاعت کرنے والوں میں سے کوئی ہماری شفاعت نہیں کرتا۔ اور نہ ہمارا کوئی

وَ لَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ ﴿۱۰۲﴾ فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ

غمخوار دوست ہے۔ پس اگر ہمیں لوٹنے کی طاقت ہوتی تو ہم (لوٹ کر) ضرور مومنوں میں (شامل) ہو جاتے۔

الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ

اس (واقعہ) میں ایک بہت بڑا نشان ہے لیکن ان (کافروں) میں سے اکثر ایمان ہی نہیں لاتے۔

مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۵﴾ ع

اور تیرا رب یقیناً غالب (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔

حلّ لُغات۔ اُزْلِفَتْ اُزْلِفَتْ: اَزْلَفَ سے مؤنث کا فعل مجہول کا صیغہ ہے اور اَزْلَفَ کے معنے ہیں قَرَّبَهٗ۔ اس کو قریب کیا۔ (اقرب) پس اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ کے معنے ہوں گے۔ جنت قریب کردی جائے گی۔

بُرِّزَتْ بُرِّزَتْ: بَرَّزَ سے مؤنث کا فعل مجہول کا صیغہ ہے اور بَرَّزَهٗ کے معنے ہیں اَظْهَرَهٗ وَبَيَّنَهٗ کسی چیز کو ظاہر اور واضح کردیا۔ (اقرب) پس بُرِّزَتْ کے معنے ہوں گے ظاہر کردی جائے گی۔

اَلْجَحِیْمُ اَلْجَحِیْمُ اَلنَّارُ الشَّدِیْدَۃُ التَّاَجُّجِ۔ یعنی جحیم کے معنے سخت بھڑکنے والی آگ کے ہیں۔ نیز اس کے معنے ہیں۔ کُلُّ نَارٍ عَظِیْمَۃٍ فِیْ مَھْوَاۃٍ فَھِیَ جَحِیْمٌ یعنی ہر وہ بڑی آگ جو گڑھے میں ہو۔ اَلْمَکَانُ الشَّدِیْدُ الْحَرِّ۔ سخت گرمی والی جگہ۔ اِسْمٌ مِنْ اَسْمَآءِ جَھَنَّمَ ۔جہنم کے ناموں میں سے ایک نام جحیم بھی ہے۔(اقرب)

کُبْکِبُوْا کُبْکِبُوْا کَبْکَبَ سے جمع مذکر کا مجہول کا صیغہ ہے اور کَبْکَبَہٗ کے معنے ہیں قَلَبَہٗ وَصَرَعَہٗ ۔ اس کو پچھاڑ دیا اور شکست دے دی۔ اور جب کَبْکَبَ الشَّیْءَ کہیں تو معنے ہوں گے رَمَاہُ فِی الْھُوَّۃِ۔ اس کو گڑھے میں پھینک دیا۔(اقرب) پس کُبْکِبُوْا کے معنے ہوں گے۔(۱) ان کو پچھاڑ دیا جائے گا۔(۲) ان کو گڑھے میں پھینک دیا جائے گا۔

اَلْغَاوٗنَ اَلْغَاوٗنَ اَلْغَاوِیْ کی جمع ہے جو غَوٰی سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ اور غَوَی الرَّجُلُ کے معنے ہیں۔ ضَلَّ گمراہ ہوگیا خَابَ۔ ناکام ہوگیا۔ اِنْھَمَکَ فِی الْجَھْلِ۔ جہالت میں لگ گیا۔ ھَلَکَ۔ ہلاک ہوگیا۔ پس اَلْغَاوِیْ کے معنے ہوں گے گمراہ ہونے والا۔ ناکام ہونے والا۔ جہالت کے کاموں میں مشغول ہونے والا۔ ہلاک ہونے والا۔(اقرب)

جُنُوْدٌ جُنُوْدٌ: جُنْدٌ کی جمع ہے اور اَلْجُنْدُ کے معنے ہیں اَلْعَسْکَرُ۔ لشکر۔ اَلْاَعْوَانُ۔ مددگار۔(اقرب)

نُسَوِّیْکُمْ نُسَوِّیْکُمْ: سَوّٰی سے فعل مضارع کا جمع متکلم کا صیغہ ہے اور سَوَّاہُ بِہٖ کے معنے ہیں عَدَّلَ۔ کسی کو کسی کے برابر قرار دیا(اقرب) پس اِذْ نُسَوِّیْکُمْ کے معنے ہوں گے جب ہم تم کو برابر قرار دیتے تھے۔

حَمِیْمٍ اَلْحَمِیْمُ: اَلْقَرِیْبُ الَّذِیْ تَھْتَمُّ بِاَمْرِہٖ۔ وہ قریبی جس کے کاموں کی سرانجام دہی کی فکر رہتی ہو۔ اَلصَّدِیْقُ دوست۔(اقرب)

کَرَّۃً کَرَّۃً کَرَّ سے مصدر ہے۔ اور کَرَّ کے معنے ہیں رَجَعَ۔ لوٹا(اقرب) پس کَرَّۃً کے معنے ہیں ایک دفعہ لوٹنا۔

تفسیر ۔فرماتا ہے۔ اس دن جنت متقیوں کے قریب کردی جائے گی۔ یعنی متقی جوں جوں نیک کام کرتا چلا جاتا ہے نیکی اس پر آسان ہوتی جاتی ہے اور جنت اس کے قریب ہوتی چلی جاتی ہے۔ میں نے بالعموم دیکھا ہے کہ جب کسی کو نیکی کی لذّت حاصل ہوجائے تو اس کے بعد وہ بجائے پیچھے ہٹنے کے آگے بڑھتا ہے اور ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری نیکی اس کے لئے آسان سے آسان تر ہوجاتی ہے۔

پارٹیشن سے پہلے میں ایک دفعہ دہلی گیا۔ چوہدری ظفر اللہ خان صاحب اس وقت تک ابھی وزیر نہیں بنے

تھے۔ ویسے وہ حکومت کی طرف سے ایک خاص مقدمہ کی پیروی کے لئے مقرر تھے۔ اُن دنوں ہندوستان کی حکومت نے انگلستان سے مالیات کے ایک ماہر کو منگوایا تھا تا کہ بعض اہم باتوں میں اس کا مشورہ لیا جاسکے ۔ چوہدری صاحب نے اسے مجھ سے ملانے کے لئے دعوت دی۔ اور اس میں اور چیزوں کے علاوہ گلاب جامن یا رس گلے بھی رکھ دیئے۔ اس شخص کے لئے یہ بالکل ایک نئی چیز تھی وہ انہیں دیکھ کر گھبرا گیا۔ مگر چوہدری صاحب نے کہا۔ اسے کھا کر دیکھو۔ چنانچہ اس نے ایک گلاب جامن یا رس گلا اُٹھا کر کھایا۔ چوہدری صاحب نے پھر ایک گلاب جامن یا رس گلا اسے دیا۔ اس نے پھر گریز کیا تو چوہدری صاحب نے اس سے کہا کہ تم نے پہلا گلاب جامن یا رس گلا تو عجوبہ کے طور پر کھایا تھا۔ اب دوسرا گلاب جامن یا رس گلا اس کے مزے کی وجہ سے کھاؤ۔ میں نے چوہدری صاحب سے کہا کہ آپ نے یہ کیا بات کہی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ انگریزی میں یہ محاورہ ہے کہ پہلی چیز عجوبہ کے طور پر ہوتی ہے اور دوسری چیز اس کے مزے کی وجہ سے استعمال کی جاتی ہے۔ یہ تو ایک دنیوی ضرب المثل ہے لیکن میں نے روحانیات میں بھی دیکھا ہے کہ پہلے چسکہ لگانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر خود بخود عادت پڑ جاتی ہے۔ ٹنکچرز جو الکوحل سے تیار ہوتی ہیں بچے اور جوان ان کے پینے سے گھبراتے ہیں لیکن یورپ میں لوگ شراب تک مزے لے لے کر پیتے ہیں۔ اور روکنے کے باوجود اسے نہیں چھوڑتے۔ امریکہ میں جب شراب نوشی کے انسداد کے لئے قانون وضع کیا گیا تو ہزارہا موتیں وہاں صرف اس وجہ سے واقع ہوئیں کہ لوگ شراب پینے کے شوق میں سپرٹ پی لیتے۔ سالہا سال ایسا ہوتا رہا کہ چونکہ لوگوں کو پینے کے لئے شراب نہیں ملتی تھی اس لئے وہ سپرٹ پی لیتے تھے اور سپرٹ میں چونکہ زہریلی چیزوں کی آمیزش ہوتی ہے اس لئے کئی اندھے ہو جاتے اور کئی مر جاتے۔ مگر پھر بھی وہ اپنی خواہش کو نہ روک سکتے۔ پس ہر چیز کے دو مزے ہوتے ہیں ایک تو اس کا ذاتی مزا ہوتا ہے اور دوسرا مزا عادت کے نتیجہ میں ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں لوگ پان میں زردہ کا استعمال کرتے ہیں۔ لیکن جس نے پہلے زردہ استعمال نہ کیا ہو وہ اگر زردہ کھالے تو اس کے سر میں چکر آنے لگتا ہے مجھے یاد ہے ایک دفعہ مجھے نقرس کی تکلیف ہوئی۔ ایک دوست جو ہندوستان کے تھے انہوں نے کہا۔ آپ پان میں زردہ ڈال کر کھائیں۔ درد ہٹ جائے گی۔ میں نے کہا۔ میں نے تو زردہ کبھی نہیں کھایا۔ اس لئے اگر میں نے زردہ کھایا تو سر میں چکر آ جائے گا۔ انہوں نے کہا نہیں آپ استعمال تو کریں۔ چنانچہ انہوں نے پان میں زردہ ڈال کر مجھے دیا اور میں نے کھا لیا۔ اس سے درد میں واقعہ میں کچھ کمی ہو گئی چند گھنٹوں کے بعد انہوں نے پھر مجھے پان میں زردہ ڈال کر دیا۔ غرض دو دن ہم سفر میں رہے اور دونوں دن وہ برابر مجھے پان میں زردہ ڈال کر دیتے رہے۔ دو دن کے بعد میں نے دیکھا کہ درد کی تکلیف کم ہونے لگی ہے تب میں نے اسے چھوڑ

دیا کہ کہیں اس کی عادت ہی نہ پڑ جائے غرض بڑی تکلیف دہ اور بدمزہ چیزیں بھی اگر علاج کے طور پر استعمال کی جائیں تو ان کی عادت پڑ جاتی ہے اور اچھی معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اور جب ادنیٰ چیزوں کی عادت پڑ جاتی ہے تو دین کی قربانی کی عادت کیوں نہیں پڑ سکتی۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ انسان کو ایک دفعہ قربانی کے لئے آگے لایا جائے اس کے بعد خود بخود اس کے اندر ذوق پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اسے دین کے کاموں میں ایسی لذت آنے لگتی ہے کہ ان کو ایک لحہ کے لئے بھی چھوڑنا اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے۔ جس طرح ایک انسان کو روٹی نہیں ملتی تو وہ چلاتا ہے اور خدا تعالیٰ کے حضور گڑگڑاتا ہے کہ خدایا مجھے روٹی دے۔ اسی طرح اگر اسے اشاعتِ دین کی توفیق ملتی ہے تو وہ خدا تعالیٰ کا ممنون ہوتا ہے اور اس کا شکر ادا کرتا ہے۔ اور اگر کسی وقت اسے دین کی خدمت کی توفیق نہیں ملتی تو وہ خدا تعالیٰ کے حضور گڑگڑاتا ہے کہ وہ اس کی کمزوری کو دور کرے اور اس کے اندر دینی خدمات بجا لانے کی زیادہ سے زیادہ طاقت پیدا کرے۔ اس طرح قدم بقدم نیکی اس پر آسان ہوتی جاتی ہے اور جنت اس کے قریب ہوتی چلی جاتی ہے لیکن سچائی سے منحرف لوگوں کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ ان کے لئے دینی قربانیاں جو ایک مومن کے لئے بالکل آسان ہوتی ہیں آگ کے شعلوں کا سا رنگ اختیار کر لیتی ہیں۔ اور وہ ان سے دور بھاگتے ہیں اور اپنے آپ کو ان سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ گویا مومن تو خدا تعالیٰ کی رضا کے لئے قربانیوں کی آگ میں اپنے آپ کو جھونک دیتے ہیں۔ اور وہ آگ ان کے لئے گلزار بن جاتی ہے لیکن ایک منافق اور ایک گمراہ انسان کو وہی آگ جہنم کا ایندھن بنا دیتی ہے۔ کیونکہ اس وقت اس کی بے ایمانی پر جو پردہ پڑا ہوتا ہے وہ اُٹھ جاتا ہے۔

اسی طرح اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ میں یہ بھی خبر دی گئی ہے کہ آخری زمانہ میں جنت متقیوں کے قریب کر دی جائے گی۔ یعنی اللہ تعالیٰ ایسے سامان پیدا کر دے گا۔ کہ مذہبی باتیں لوگوں کی سمجھ میں آنے لگ جائیں گی اور سائنس جو مذہب کی مخالفت کر رہی ہوگی اس کی مخالفت آپ ہی آپ ختم ہو جائے گی اس طرح متقی لوگوں کے لئے جنت کا حصول بہت آسان ہو جائے گا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں یہ پیشگوئی پوری ہو رہی ہے اور احرارِ یورپ میں سے کچھ تو آہستہ آہستہ اپنے بلند بانگ دعاوی کو چھوڑ رہے ہیں۔ اور کچھ ان باتوں کو جو اس سے قبل انہیں غیر قدرتی نظر آتی تھیں قانونِ قدرت میں شامل کر کے مذہب کی طرف آ رہے ہیں گویا دَنَا فَتَدَلّٰى کی سی کیفیت پیدا ہو رہی ہے۔ یعنی سائنس دان اوپر کی طرف چڑھ رہا ہے۔ اور علماء نے جو مبالغہ کا رنگ مذہب پر چڑھا دیا تھا وہ اتارا جا رہا ہے۔ اور اس طرح دنیا خدائی باتوں کی تصدیق کے لئے تیار ہو رہی ہے اور جنت ان کے قریب کی جا رہی ہے۔ مگر ایسے زمانہ میں بھی جو لوگ خدائی ہدایت کو قبول کرنے سے اعراض کریں گے انہیں اپنے اعمال کی جواب دہی

کے لئے خدا تعالیٰ کے سامنے حاضر ہونا پڑے گا۔تب ان سے کہا جائے گا کہ اَیۡنَمَا کُنۡتُمۡ تَعۡبُدُوۡنَ۔ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ ؕ ہَلۡ یَنۡصُرُوۡنَکُمۡ اَوۡ یَنۡتَصِرُوۡنَ وہ تمہارے معبود کہاں ہیں جن کے آستانہ پر تم سر جھکاتے تھے اور جنہیں اپنا خدا سمجھا کرتے تھے۔آج بتاؤ کہ کیا وہ تمہاری کچھ بھی مدد کر سکتے ہیں یا تمہارا بدلہ لینے کی کوئی طاقت رکھتے ہیں۔جب وہ اپنی آنکھوں سے اس انجام کو دیکھ لیں گے تو وہ بھی اور ان کے معبود بھی اور تمام ابلیسی لشکر بھی دوزخ میں اوندھے منہ گرا دیئے جائیں گے۔اور ان کی تمام عزتیں خاک میں مل جائیں گی۔تب وہ آپس میں جھگڑنا شروع کر دیں گے اور وہ لوگ جو دنیا میں اپنے لیڈروں کی اندھی تقلید کرتے رہے اور خدا تعالیٰ کی آواز پر انہوں نے کان نہ دھرا۔وہ ان سے کہیں گے کہ خدا کی قسم ہم تو بڑی غلطی میں مبتلا رہے۔جب کہ ہم تمہیں رب العالمین کے برابر درجہ دیتے رہے اور ہم نے تمہاری باتوں پر تو کان دھرا مگر خدا تعالیٰ کی طرف سے جو منادی آیا۔اس کی آواز کو ہم نے نہ سنا مگر پھر وہ اپنے دلوں کو تسلی دینے کے لئے کہیں گے۔اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔وَمَاۤ اَضَلَّنَاۤ اِلَّا الۡمُجۡرِمُوۡنَ ہمیں تو ان مجرموں نے ہی صحیح راستہ سے بھٹکایا ہے۔اگر یہ لوگ ہماری راہ میں روک بن کر کھڑے نہ ہو جاتے تو آج یہ ہمارا حشر کیوں ہوتا۔یہ تو ہم سے کہا کرتے تھے کہ ہم تمہارے سب بوجھ اٹھا لیں گے اور تمہیں جنت میں پہنچا دیں گے مگر آج یہ حالت ہے کہ فَمَا لَنَا مِنۡ شَافِعِیۡنَ وَلَا صَدِیۡقٍ حَمِیۡمٍ نہ آج شفاعت کرنے والوں میں سے کوئی ہماری شفاعت کرتا ہے اور نہ کوئی دوست اور غمخوار ہمیں اس مصیبت سے چھڑاتا ہے۔

حضرت خلیفۂ اوّل رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ ہماری ایک بہن تھی جو کسی پیر کی مرید تھی۔وہ ایک دفعہ قادیان مجھے ملنے کے لئے آئی۔تو میں نے کہا بہن تم احمدی کیوں نہیں ہوتیں۔وہ کہنے لگی مجھے احمدی بننے کی کیا ضرورت ہے۔میں نے فلاں پیر صاحب کی بیعت کر لی ہے اور انہوں نے مجھے کہہ دیا ہے کہ اب تمہیں کسی نیکی کی ضرورت نہیں جو جی میں آئے کرو۔تمہارے سب گناہ ہم نے اٹھا لئے۔میں نے کہا۔اب جب پیر صاحب سے ملو گی تو ان سے پوچھنا کہ قیامت کے دن جب ایک ایک شخص کو گناہوں کی وجہ سے جوتیاں پڑنی ہیں تو کبھی آپ نے یہ بھی سوچا کہ آپ جنہوں نے اپنے سب مریدوں کے گناہ اٹھا لئے ہیں آپ کو کتنی جوتیاں پڑیں گی۔وہ کہنے لگی اچھا میں یہ بات ان سے ضرور دریافت کروں گی۔چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد جب وہ دوبارہ آپ سے ملنے کے لئے آئی تو آپ نے پوچھا۔کہ بہن پیر صاحب سے وہ بات پوچھی تھی۔وہ کہنے لگی۔ہاں میں نے پوچھی تھی مگر وہ تو انہوں نے فوراً حل کر دی۔میں نے کہا کس طرح؟ کہنے لگی جب میں نے یہ سوال کیا تو پیر صاحب کہنے لگے۔دیکھو جب فرشتے تم سے پوچھیں کہ تم نے فلاں فلاں گناہ کیوں کئے ہیں تو کہہ دینا کہ مجھے اس کا کچھ پتہ نہیں۔یہ پیر صاحب کھڑے ہیں

ان سے پوچھو۔ اس پر وہ تمہیں چھوڑ دیں گے۔ تم اطمینان سے جنت میں چلی جانا۔ میں نے کہا۔ پیر صاحب! پھر آپ کا کیا بنے گا؟ کہنے لگے۔ جب وہ مجھ سے پوچھیں گے تو میں اپنی لال لال آنکھیں نکال کر کہوں گا کہ کربلا میں ہمارے نانا امام حسینؓ نے جو قربانی کی تھی کیا وہ کافی نہیں تھی کہ آج پھر ہمیں تنگ کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ بتاؤ تم نے کیا کیا؟ اس پر فرشتے شرمندہ ہو کر ایک طرف ہو جائیں گے اور ہم دگڑ دگڑ کرتے ہوئے جنت میں چلے جائیں گے۔

اسی طرح دنیا میں روزانہ ہمیں یہ نظارہ نظر آتا ہے کہ لوگ اپنے دوستوں کی خاطر جھوٹ بولنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ وہ ان کے لئے ہر قسم کے دھوکا اور فریب اور جعلسازی سے کام لینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں اور خدا اور اس کے رسول کے احکام کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں۔ مگر قیامت کے دن نہ کسی کی دوستی کام آئے گی اور نہ اپنے سروں پر گناہوں کا بوجھ اٹھا لینے کا وعدہ کرنے والے کسی کو جہنم سے بچا سکیں گے بلکہ انہیں حسرت اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑے گا کہ اگر ہم میں یہ طاقت ہوتی کہ ہم دوبارہ دنیا میں لوٹ کر جا سکتے تو ہم تلافی مافات کرنے کے لئے تیار ہیں مگر اس وقت ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکے گی۔ کیونکہ اس وقت عمل کا دروازہ بند ہو چکا ہو گا۔ فرماتا ہے۔ ابراہیمؑ کے اس واقعہ میں بھی ایک بہت بڑا نشان مخفی ہے کہ کس طرح ابراہیمؑ نے انتہائی کمزوری اور ضعف کی حالت میں بتوں کے خلاف آواز بلند کی۔ کس طرح اس کی قوم نے مخالفت کی اور آخر اسے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا۔ مگر آخر ابراہیمؑ ہی فاتح ہوا۔ اور بت اس کی قوم کو کوئی فائدہ نہ پہنچا سکے۔ مگر اتنا بڑا نشان دیکھنے کے باوجود ابراہیم علیہ السلام کی قوم میں سے اکثر لوگ دنیوی لذات میں ہی منہمک رہے۔ اور انہیں آپ پر ایمان لانے کی سعادت نصیب نہ ہوئی۔ لیکن فرماتا ہے۔ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۔ تیرا رب یقیناً بڑا غالب اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔ یعنی بے شک ابراہیم علیہ السلام کی قوم کی اکثریت اس پر ایمان نہیں لائی مگر تیرا رب بڑا غالب اور مہربان ہے وہ ایک دن تیری قوم کی اکثریت کو تجھ پر ایمان لانے کی سعادت عطا فرما دے گا۔ اور انہیں ایک لمبے عرصہ تک اپنے انعامات سے متمتع فرماتا چلا جائے گا۔ چنانچہ فتح مکہ کے بعد ایسا ہی ہوا۔ آپؐ کی ساری قوم آپ پر ایمان لے آئی اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس ایمان کی برکت سے انہیں سینکڑوں سال تک اپنے انعامات سے نوازا۔ اور انہیں ایک لمبا دور حکومت عطا فرمایا۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ۣالْمُرْسَلِيْنَ ۝۱۰۶ۚۖ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ

نوحؑ کی قوم نے (اپنے) رسولوں کا انکار کیا۔ جب کہ ان سے ان کے

نُوْحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝۱۰۷ۚ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝۱۰۸ۙ

بھائی نوحؑ نے کہا۔ کیا تم تقویٰ نہیں کرتے؟ میں تمہاری طرف ایک امانت دار پیغامبر

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝۱۰۹ۚ وَمَآ اَسْـَٔــلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ

ہوکر آیا ہوں۔ پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔ اور میں اس (خدمت کے سلسلہ) میں کوئی

اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۱۰ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝۱۱۱ۭ

اجر نہیں مانگتا۔ میرا بدلہ تو رب العالمین (خدا) کے ذمہ ہے۔ پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری طاعت کرو۔

تفسیر ۔فرماتا ہے۔ نوحؑ کی قوم نے بھی نوحؑ کی جو کہ اس وقت سب رسولوں کا قائم مقام تھا تکذیب کی۔ نوحؑ نے ان کو سمجھایا مگر وہ نہ مانے اور یہ بھی بتایا کہ آخر میرے سمجھانے کی غرض کیا ہے۔ میں تم سے کچھ مانگتا تو نہیں۔ میری امید اور میرا توکل تو صرف رب العالمین خدا پر ہے۔ پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔

اَطِيْعُوْنِ سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کی اطاعت اور شریعت پر عمل جُدا جُدا چیزیں ہیں۔ اہلِ قرآن کہا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف قرآن کی اطاعت کا حکم ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا حکم نہیں۔ مگر حضرت نوح علیہ السلام جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ادنیٰ نبی تھے کہتے ہیں۔ وَاَطِيْعُوْنِ تم میری ذات کی اطاعت بھی کرو۔ تب تمہارا تقویٰ مکمل ہوگا۔ کیونکہ خدائی تعلق کا پہلا زینہ خدا تعالیٰ کے نبیوں سے تعلق پیدا کرنا ہوتا ہے جس طرح تمہارے لئے یہ ناممکن ہے کہ تم چھلانگ لگا کر چھت پر چڑھ سکو۔ اسی طرح تمہارے لئے یہ ناممکن ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف راہنمائی کرنے والے وجودوں کو چھوڑ کر تم خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا کرسکو مگر جس طرح کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ چھت پر بیٹھا ہوا انسان جب دیکھتا ہے کہ کسی پر شیر یا ڈاکو نے حملہ کردیا ہے تو وہ رسی گرا کر اس کو اوپر کھینچ لیتا ہے۔ اسی طرح کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ جب دیکھتا ہے کہ کوئی شخص اس سے ملنے کی سچی تڑپ رکھتا ہے لیکن وہ ایسے ماحول میں ہے کہ اسے انبیاء کی راہنمائی میسر نہیں آسکتی تو وہ خود اس کو اپنی طرف

کھینچ لیتا ہے۔ مگر ایسا بہت شاذ ہوتا ہے اور شاذ پر کسی قانون کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ عام قانون یہی ہے کہ جو لوگ خدا نما وجود ہوتے ہیں انہی کے ذریعہ انسان کو روحانی ترقی ملتی ہے اور اس ترقی کے حصول کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ انسان دنیوی محبتوں کو سرد کر کے ان کی محبت کو اپنے او پر غالب کر لے۔ جب وہ ان کی محبت کو غالب کر لیتا ہے تو ان کی اطاعت کرنا اور ان کا نمونہ اختیار کرنا اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے۔ اس وقت وہ یہ نہیں سمجھتا کہ یہ کوئی غیر ہے جس کی میں اقتداء کر رہا ہوں۔ بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ میرا باپ ہے اور اس کا خون میری رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے بھی اسی نکتہ کی طرف اپنی قوم کو توجہ دلائی کہ اگر تم نجات حاصل کرنا چاہتے ہو تو اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو۔ اور میری اطاعت کا جؤا اپنی گردنوں پر رکھو کیونکہ خدا تعالیٰ نے مجھے تمہاری ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا ہے۔

قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ قَالَ وَمَا

انہوں (یعنی کافروں) نے کہا کہ کیا ہم تجھ پر ایمان لائیں حالانکہ نہایت حقیر لوگ تیرے متبع ہوئے ہیں۔

عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰى رَبِّيْ

اُس نے کہا مجھے کہاں سے علم آیا ہے کہ ان کے اندرونی اعمال کیسے ہیں۔ ان کا حساب کرنا تو میرے رب کے

لَوْ تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

ذمہ ہے۔ اگر تم سمجھو۔ اور جو شخص مومن ہو کر میرے پاس آتا ہے میرا کام نہیں کہ میں اسے دھتکاروں۔

اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۱۶﴾

میں تو صرف ایک کھلا کھلا ہوشیار کرنے والا انسان ہوں۔

تفسیر ۔ اللہ تعالیٰ کے انبیاء پر ہمیشہ یہ اعتراض ہوتا چلا آیا ہے اور حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں بھی ہوا کہ اس کے ماننے والے تو ادنیٰ لوگ ہیں ہم اس کی بات کس طرح مان لیں۔ حضرت نوح علیہ السلام نے کیا ہی اچھا جواب دیا کہ ہدایت دینا تو خدا تعالیٰ کے اختیار میں ہے اگر اس نے ان کو ہدایت کے قابل سمجھا تو ہدایت دے دی۔ پس جب اس کے نزدیک ان کے عمل اعلیٰ درجہ کے لوگوں کے سے ہیں تو میں ان کو کس طرح دھتکار سکتا

ہوں۔آخران کا حساب تو خدا تعالیٰ کے ذمہ ہے۔میرے ذمہ تو نہیں۔کاش تم عقل سے کام لو۔اور جس کو خدا مومن بنا دے۔اس کی تحقیر نہ کرو۔اور اگر تم تحقیر کرو بھی تو میں بہر حال اسے دھتکار نہیں سکتا کیونکہ اس کو خدا نے میرے حوالہ کیا ہے۔میرا کام تو یہ ہے کہ میں لوگوں کو بری باتوں سے روکوں۔اس کے بعد جب خدا تعالیٰ کسی کو ہدایت دے دے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ بری باتوں سے رک گیا ہے اور نہایت عزت والا انسان بن گیا ہے۔اس کے بعد وہی معزز ہے تم لوگ معزز نہیں۔اسلامی تاریخ میں اس کے متعلق ایک بڑا اچھا واقعہ آتا ہے۔حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک دفعہ حج کے لئے تشریف لے گئے تو حج کے بعد عید کے دن لوگ آپ کو ملنے کے لئے آئے۔شروع میں مکہ کے رؤساء اور رئیسوں کے بیٹے آئے۔اس کے بعد کچھ غلام آئے جو ابتدائے زمانہ میں اسلام لائے تھے۔اُن کے آنے پر حضرت عمرؓ نے رؤساء کو پرے سرکنے کے لئے کہا اور اپنے پاس غلاموں کو بٹھا لیا۔اس کے بعد کچھ اور نومسلم غلام آئے۔حضرت عمرؓ نے پھر ان کو اپنے پاس بٹھا لیا۔اور رؤساء کو پَرے سرکنے کا اشارہ کیا۔اسی طرح متواتر ہوتا رہا۔آخر شرمندہ ہو کر رؤساء کے لڑکے اُٹھ کھڑے ہوئے اور باہر جا کر ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ دیکھ لیا آج تمہاری کیسی بےعزتی ہوئی ہے۔اس پر ان میں ایک ہوشیار لڑکا بولا کہ اس میں قصور کس کا ہے۔یہ غلام جن کو تم ذلیل سمجھتے ہو سب سے پہلے اسلام لانے والوں میں سے تھے۔اور انہوں نے اپنی زندگیاں اسلام کی ترقی کے لئے خرچ کر دیں جبکہ تمہارے باپ دادے اسلامؐ اور محمدؐ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دشمنی کر رہے تھے۔اب اسلام کی حکومت آئی ہے تو عزت انہی کو ملے گی۔ہم کو نہیں ملے گی۔باقی ساتھیوں نے کہا۔تو پھر اس کا علاج کیا ہے۔اس ذہین لڑکے نے کہا۔چلو اس کا علاج حضرت عمرؓ سے ہی پوچھیں چنانچہ وہ پھر جمع ہو کر حضرت عمرؓ کے پاس گئے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو دیکھ کر بات سمجھ لی۔اور کہا۔اے نوجوانو۔مجھے معلوم ہے کہ تمہاری مکّہ میں کیا حیثیت ہے۔مگر میں مجبور تھا۔یہ لوگ جن کو میں نے آگے بٹھایا۔محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بھی ان کو آگے بٹھایا کرتے تھے۔اب میں ان کے درجہ میں فرق کس طرح کر سکتا تھا۔ان نوجوانوں نے کہا۔پھر اس کا کوئی علاج بھی ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو ان کے خاندانوں کی عزت کو جانتے تھے اُن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور انہوں نے اپنا ہاتھ شمال کی طرف اونچا کر دیا۔جس کا مطلب یہ تھا کہ اب شام میں عیسائیوں سے جنگ ہو رہی ہے۔وہاں چلے جاؤ اور اپنے باپ دادا کے گناہوں کا کفارہ ادا کرو۔چنانچہ وہ نوجوان خاموشی سے اُٹھ کر چلے گئے اور اسی وقت اونٹوں یا گھوڑوں پر سوار ہو کر شام چلے گئے اور اسلامی لشکر میں مل گئے اور وہیں کفار سے لڑتے لڑتے شہید ہو گئے ان میں سے کوئی بھی لوٹ کر نہ آیا۔

سوعزت وہی ہوتی ہے جو خدا دے مال ودولت سے عزت نہیں ملتی۔ کافروں کا نبیوں پر ایمان لانے والوں کو اس لئے ذلیل سمجھنا کہ وہ غریب ہیں اول درجہ کی حماقت ہے جو نبی پر پہلے ایمان لاتے ہیں وہی سب سے زیادہ معزز ہوتے ہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلے ابوبکرؓ۔ علیؓ۔ زیدؓ ایمان لائے۔ مکہ کے صنادید کی موجودگی میں ابوبکرؓ کو مسلمانوں نے خلیفہ تسلیم کیا۔ جس پر ان کے باپ نے بھی تعجب کیا۔ (البدایة والنهایة الجزء السابع فصل وقعة القادسية ذكر من توفى فى هذا العام....) مگر ابوجہلؔ۔ عتبہؔ۔ اور شیبہؔ کی عزت تو ابوبکرؓ اور علیؓ کی جوتیوں کے برابر بھی نہیں۔ یہی بات حضرت نوحؑ نے اپنے مخالفین کے سامنے پیش کی اور کہا کہ وَمَا عِلۡمِیۡ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ۔ بیشک یہ تمہیں حقیر نظر آتے ہیں۔ مگر مجھے کیا معلوم کہ ان کی وہ کون سی چُھپی نیکیاں تھیں جن کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے ان کو یہ شرف بخشا کہ انہوں نے اپنے زمانہ کے نبی کو قبول کرلیا۔ اور تمہاری وہ کون سی بداعمالیاں تھیں جو تمہاری راہ میں حائل ہوگئیں اور جنہوں نے تم سے نورِ بصیرت چھین لیا اور تم اللہ تعالیٰ کی آواز پر لبیک کہنے سے محروم رہ گئے۔ اور جب ان کی نیکیوں کی وجہ سے ہی خدا تعالیٰ نے ان پر اتنا بڑا انعام نازل کیا ہے کہ انہیں ایک نبی کو ماننے کی سعادت حاصل ہوگئی ہے تو یہ لوگ ذلیل کس طرح ہوئے۔ ذلیل تو وہ لوگ ہیں جن کی بداعمالیوں نے انہیں اللہ تعالیٰ کے مامور کی شناخت سے محروم کر دیا ہے۔ پھر فرمایا اِنۡ حِسَابُهُمۡ اِلَّا عَلٰی رَبِّیۡ لَوۡ تَشۡعُرُوۡنَ۔ بیشک یہ آج غریب اور کنگال ہیں۔ کوئی مال اور جائداد ان کے پاس نہیں مگر اللہ تعالیٰ ان کی قربانیوں کو کبھی ضائع نہیں کرے گا اور وہ ایک دن انہیں بہت بڑی ترقی عطا کرے گا۔ کاش تم شعور سے کام لیتے۔ اور اس قسم کے بیہودہ عذرات سے کام لے کر خدائی ہدایت کو ٹھکرانے کے لئے تیار نہ ہوجاتے۔

قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اس مضمون کو مختلف مقامات میں مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے۔ کسی جگہ تو فرماتا ہے کہ ہمارے مخالف شعور سے کام نہیں لیتے اور کسی جگہ فرماتا ہے کہ ہمارے مخالف علم سے کام نہیں لیتے۔ شعور اس حِس کو کہتے ہیں جو انسان کے اندر سے پیدا ہوتی ہے اور علم اس حِس کو کہتے ہیں جو باہر سے آتی ہے۔ خواہ سن کر یا دیکھ کر یا چھو کر یا چکھ کر۔ مثلاً ہم چلے جارہے ہوتے ہیں کہ ہمیں ایک جنگل نظر آتا ہے جسے دیکھ کر ہمارا علم بڑھتا ہے۔ یہ علم باہر سے پیدا ہوتا ہے اندر سے نہیں۔ یا کسی شخص کو کوئی چیز چکھ کر جس ذائقہ کا پتہ لگتا ہے وہ علم کہلاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں بعض دفعہ ہم بیٹھے بیٹھے محسوس کرتے ہیں کہ ہماری کیا ضرورتیں ہیں۔ ہماری قوم کی کیا ضرورتیں ہیں۔ ہمارے بچوں کی کیا ضرورتیں ہیں۔ ہمارے خاندان کی کیا ضرورتیں ہیں۔ یہ چیز جب قدرتی طور پر آپ ہی آپ پیدا ہو تو اسے شعور کہتے ہیں۔ گویا انسان جب ان جبلی طاقتوں کو جو اللہ تعالیٰ نے خود اس

کے اندر پیدا کی ہیں محسوس کر کے اپنے لئے ایک نیک راہ تجویز کرتا ہے۔ تو اسے شعور کہتے ہیں اور جب محنت کر کے انسان جب یہ سوچتا ہے کہ فلاں چیز میرے لئے فائدہ مند ہے یا نہیں تو اس کام کا نام فکر ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے اس کی طرف بھی بار بار توجہ دلائی ہے کیوں کہ یہ قوت بیرونی علم سے نتائج اخذ کرنے میں مدد دیتی ہے اسی کے ایک پہلو کا نام عقل بھی ہے۔ عقل اس قوت کو کہتے ہیں جو انسان کو علم ؔ۔ فکر ؔ اور شعور ؔ کے مطابق کام کرنے کی توفیق بخشتی ہے۔ عقل ؔ کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ انسان سوچتا اور فیصلہ کرتا ہے کہ یہ چیز میرے لئے مضر ہے یا مفید۔ جب وہ فیصلہ کرے کہ فلاں چیز میرے لئے مضر ہے اور جب یہ حس اسے بری چیز سے روک دے تو اسے عقل کہتے ہیں یعنی بدی کی طرف لے جانے والی چیز سے روکنے والی عقل ہے۔ اسی کی طرف قرآن کریم نے تفقہ ؔ کے لفظ سے بھی توجہ دلائی ہے۔ تفقہ ؔ کے معنے ہوتے ہیں۔ کسی چیز کی باریکی کو پالینا۔ فرماتا ہے تمہارے سامنے کئے چیزیں آتی ہیں۔ مگر تمہیں یہ نظر نہیں آتا کہ ان سے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ یوں دیکھنے میں ایک مرغا۔ ایک کتا اور ایک بلی انسان کے شریک ہیں پھر تمہارے دیکھنے اور ان کے دیکھنے میں کیا فرق ہے۔ وہ فرق یہی ہے کہ تم ایک چیز کو دیکھ کر نتیجہ نکال لیتے ہو۔ لیکن مرغا اور بلی اور کتا اسے دیکھ کر کوئی نتیجہ نہیں نکال سکتا۔ بلی اور کتا اگر ایک درخت دیکھتے ہیں تو انہیں اتنا ہی نظر آتا ہے کہ ایک لمبا سا ڈنڈا کھڑا ہے۔ لیکن انسان صرف یہی فیصلہ نہیں کرتا کہ یہ ایک درخت ہے بلکہ وہ یہ بھی فیصلہ کرتا ہے کہ اسے پھل کیا لگتا ہے۔ کس موسم میں لگتا ہے اور کس موسم میں نہیں لگتا۔ وہ پھل غذا کے کام آتا ہے یا دوا کے کام آتا ہے یا اس درخت سے محض سائے کا کام لیا جاسکتا ہے۔ لیکن بکری ان باتوں کو نہیں جانتی۔ گیدڑ اتنا ہی جانتا ہے کتّا اتنا ہی جانتا ہے کہ دھوپ لگے تو درخت کے سائے میں بیٹھ جاؤ لیکن انسان کسی درخت کو دیکھ کر یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس کی لکڑی مضبوط ہے اور وہ اسے کاٹ کر دروازے بنالیتا ہے۔ کسی کے متعلق سمجھتا ہے کہ یہ لکڑی بوجھ زیادہ اُٹھا سکتی ہے اس کے وہ شہتیر اور بالے بنالیتا ہے۔ کسی کے متعلق سمجھتا ہے کہ اس کی لکڑی پانی کو زیادہ برداشت کرنے والی ہے اور وہ اس لکڑی کو ایسے مقامات پر استعمال کرتا ہے جہاں بارشیں زیادہ ہوں۔ کسی کے متعلق سمجھتا ہے کہ یہ محض جلانے کے کام آسکتی ہے چنانچہ وہ اس کا ایندھن بنالیتا ہے یا اسے کوئلہ کے لئے استعمال کرتا ہے۔ غرض لکڑی وہی ہے۔ جانور بھی اس کو دیکھتا ہے اور انسان بھی اس کو دیکھتا ہے۔ انسان اس کے کئی کئی استعمال نکال لیتا ہے لیکن جانور آدمؑ کے وقت سے صرف سایہ کے نیچے بیٹھنا جانتا ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا۔

پھر قرآن کریم نے ایک اور طرح بھی اس طرف توجہ دلائی ہے اور اس کا نام استنباط رکھا ہے۔ استنباط کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ مختلف واقعات کو لے کر انسان ان سے ایک نتیجہ نکالتا ہے۔ گویا وہ اپنی قوتِ فکر سے ایک نئی چیز اُگاتا

ہے۔ایک شخص کو زید نظر آتا ہے بکر نظر آتا ہے عمر نظر آتا ہے اور پھر وہ دیکھتا ہے کہ یہ سارے ایک پارٹی کے ہیں اور مختلف راستوں اور مختلف مقامات سے ایک جگہ جمع ہوئے ہیں۔تو وہ ان کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکال لیتا ہے کہ انہوں نے ضرور کوئی سکیم بنائی تھی جس کے یہ ماتحت اکٹھے ہوئے ہیں۔لیکن بکری اور کتا وغیرہ یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے وہ یہی دیکھیں گے کہ زید آیا ہے یا بکر اور عمر اور خالد آیا ہے۔لیکن انسان یہ دیکھ کر کہ ایک پارٹی کے آدمی مختلف راستوں سے ایک مقام پر اکٹھے ہوئے ہیں سمجھ جاتا ہے کہ انہوں نے پہلے سے کوئی فیصلہ کیا ہوا تھا۔یا دشمن کارروائی کرتا ہے تو وہ سمجھ جاتا ہے کہ مجھے کس طرح اسے زک دینی چاہیے۔

غرض قرآن کریم نے بار بار توجہ دلائی ہے کہ تم شعور سے کام لو۔تم علم سے کام لو۔تم فکر سے کام لو۔تم عقل سے کام لو۔تم تفقّہ سے کام لو۔تم استنباط کی قوت سے کام لو اور وہ بار بار دشمنوں کو توجہ دلاتا ہے کہ تمہیں کیا ہوا کہ تم شعور سے کام نہیں لیتے۔تم علم سے کام نہیں لیتے۔تم فکر سے کام نہیں لیتے۔تم عقل سے کام نہیں لیتے۔تم تفقّہ سے کام نہیں لیتے۔تم استنباط سے کام نہیں لیتے۔چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دشمنوں میں یہی فرق بتایا ہے۔فرماتا ہے۔قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۗ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (یوسف:۱۰۹) اے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تو اپنے مخالفوں سے کہہ دے کہ تمہارے اور میرے درمیان ایک فرق ہے تم بھی ایک عقیدہ پر ایمان رکھتے ہو اور میں بھی ایک ہی عقیدہ پر ایمان رکھتا ہوں۔کوئی کہہ سکتا ہے کہ جس طرح محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ایک عقیدہ ہے اسی طرح ہمارا ایک عقیدہ ہے اگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے آپ کو سچّا کہیں تو ہمیں بھی یہ حق حاصل ہے۔ہم کیوں یہ سمجھیں کہ جو بات محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں وہ ٹھیک ہے اور جو ان کے دشمن کہتے ہیں وہ غلط ہے۔بہر حال مکہ کا ایک آدمی کہہ سکتا تھا کہ آپ جو کہتے ہیں کہ ہماری بات مانی جائے۔اس کی وجہ کیا ہے اور کیوں ہم آپ کی بات کو تسلیم کریں۔اس کے کئی جواب ہو سکتے تھے جن میں سے ایک جواب قرآن کریم نے یہ دیا ہے کہ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ۔تو مکہ والوں سے کہہ دے کہ تمہارے جھوٹے ہونے اور میرے سچے ہونے کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ میں اور میرے ساتھی ہر بات کو دلیل کے ساتھ مانتے ہیں اور تم بے دلیل مانتے ہو۔تمہارا بلا دلیل ماننا بتاتا ہے کہ تم نے سوچا نہیں اور میرا با دلیل ماننا بتاتا ہے کہ میں نے سوچ کر مانا ہے اور یہ لازمی بات ہے کہ جو سوچ کر مانے گا وہ زیادہ حق پر ہوگا بہ نسبت اس شخص کے جو بلا سوچے سمجھے کسی بات کو تسلیم کر لیتا ہے قطع نظر اس کے کہ وہ بلا سوچے سمجھے کسی حق بات کو ہی کیوں نہ مان لے۔کیونکہ خواہ وہ حق پر ہو اللہ تعالیٰ اس سے یہ کہے گا کہ تمہیں کیونکر پتہ لگا تھا کہ یہ سچ ہے تم نے تو بلا سوچے سمجھے ہی یہ بات مانی تھی۔

لیکن فرض کرو۔ایک شخص غور کر کے ایک نتیجہ پر پہنچا ہو تو خواہ وہ غلط ہی ہو۔لیکن چونکہ اس نے صحیح جدوجہد سے کام لیا ہوگا اللہ تعالیٰ کے حضور وہ ثواب کا مستحق ہوگا۔کیونکہ اپنی طرف سے اس نے صحیح نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کی تھی۔چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ایک شخص جو سوچ کر کوئی فیصلہ کرتا ہے تو خواہ وہ غلط فیصلہ ہی دے تب بھی وہ ثواب کا مستحق ہوگا (بخاری کتاب الاعتصام، باب اجر الحاکم اذا اجتہد فاصاب او أخطا)۔بیشک فیصلہ غلط ہوگا۔لیکن اس نے سوچ کر اپنی طرف سے پورا زور لگانے کے بعد دیا ہوگا۔اس لئے خواہ وہ فیصلہ کرنے میں غلطی کر جائے۔اللہ تعالیٰ اس کے متعلق یہی کہے گا کہ اس نے اپنے فرض کو ادا کر دیا۔اس لئے وہ انعام کا مستحق ہوگا سزا کا نہیں۔اسی طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ شخص جس پر حجت تمام نہیں ہوئی وہ دوزخ میں نہیں ڈالا جائے گا۔کیونکہ اس کے لئے موقع ہی نہیں تھا کہ وہ سوچتا اور غور کرتا۔اسی طرح آپ نے فرمایا کہ دیوانہ شخص دوزخ میں نہیں ڈالا جائے گا کیونکہ وہ معذور تھا اور سوچ نہیں سکتا تھا۔اسی طرح آپ نے فرمایا کہ بچے جو چھوٹی عمر میں مر جائیں گے یا بڈھا جس کی عقل ماری گئی یا پہاڑوں پر رہنے والا شخص جس تک میری آواز نہیں پہنچی وہ دوزخ میں نہیں ڈالے جائیں گے اس لئے کہ ان کے لئے سوچنے کا موقعہ ہی نہیں تھا۔پس سزا کا مستحق بھی وہی ہوتا ہے جسے سوچنے کا موقع ملے اور پھر وہ نہ سوچے اور انعام کا مستحق بھی وہی ہوتا ہے جو سوچ سمجھ کر کسی سچائی کو قبول کرے۔رسمی اور آبائی مذہب یا رسمی اور آبائی طریقہ خدا تعالیٰ کو خوش کرنے کا نہیں ہوسکتا چنانچہ ظاہری طور پر بھی ہمیں یہی قانون نظر آتا ہے۔رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لو۔آپ نے اپنی قوم کو یہی نصیحت کی کہ ہر بات پر غور کرنے کی عادت ڈالو۔اور صحابہؓ کو بھی آپ یہی نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ سوچو اور سمجھو اور پھر کسی بات کو مانو۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علمی طور پر صحابہؓ کو اتنی فضیلت حاصل ہوگئی کہ اُن کا ان پڑھ بھی لوگوں کے سامنے اس طرح دلائل دیتا کہ مخالفوں کے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ باقی نہیں رہ جاتا تھا کہ وہ ڈنڈے کے زور سے اپنی بات منوانے کی کوشش کریں کیونکہ وہ جانتے تھے کہ دلائل کے میدان میں ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔مثلاً شرک کی تعلیم ہے۔ایک مکہ کا رہنے والا مشرک شرک کی یہ دلیل دیتا تھا کہ میرے ماں باپ نے ایسا کیا ہے۔کیا وہ جھوٹے تھے۔کیا ان میں عقل نہیں تھی۔کیا ان میں تمیز نہیں تھی۔سیدھی بات ہے کہ جب وہ کہیں گے کہ یہ لوگ ہمارے ماں باپ کو جاہل بتاتے ہیں تو نوجوانوں کو جوش آجائے گا اور وہ کہیں گے۔اچھا یہ ہمارے ماں باپ کو جھوٹا کہتے ہیں اور اس طرح وہ مقابلہ کے لئے کھڑے ہو جائیں گے لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ دلیل دی جاتی تھی کہ تم غور کر کے دیکھ لو۔بتوں میں کوئی بھی طاقت اور قوت ہے جب ان میں کوئی بھی طاقت نہیں تو ان کی پرستش کس لئے کی جاتی

ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے کہ مکھی بھی اگر کھانا اُٹھا کر لے جائے تو یہ بُت اس سے چھین نہیں سکتے (الحج:۷۴) جب یہ اس قدر کمزور اور بے بس ہیں تو انہیں خدائی کا مقام دینا کون سی عقلمندی ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جو شخص دلیل سے کسی بات کو تسلیم کرے گا اس کا مقابلہ وہ شخص نہیں کر سکتا جو بلا دلیل اور بلا سوچے سمجھے ماننے کا عادی ہو بے دلیل ماننے والا بہر حال کسی نہ کسی جگہ جا کر رہ جاتا ہے اسی لئے قرآن کریم میں بار بار آتا ہے کہ تفقّہ سے کام لو عقل سے کام لو۔ فکر سے کام لو۔ شعور سے کام لو۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بھی جب کسی پر خوش ہوتے تو اس کے لئے یہی دعا فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اس کو سوچنے کی عادت ڈالے۔ حضرت ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم قضائے حاجت کے لئے اندر تشریف لے گئے۔ میں لوٹا بھر کر باہر کھڑا رہا۔ جب آپ اندر سے نکلے۔ تو میں نے آگے بڑھ کر پانی پیش کیا اور وضو کرایا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم میرے اس فعل سے بہت خوش ہوئے اور آپؐ نے فرمایا اَللّٰھُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ (بخاری کتاب الوضوء باب وضع الماء عند الخلاء)۔ اے اللہ! تو اسے دین کو سوچنے اور مسائل میں غور کرنے کی توفیق بخش۔ اور یہی اصل کام ہوتا ہے کہ انسان سوچے اور پھر کسی نتیجہ پر پہنچے۔ یونہی کسی بات کے پیچھے چل پڑنا اور غور و فکر سے کام نہ لینا انسان کو اس کے اعلیٰ مقام سے گرا دیتا ہے۔ اسلام کی اسی تعلیم کا نتیجہ یہ تھا کہ مسلمان جہاں بھی جاتے لوگ حیران رہ جاتے کہ ان لوگوں کا بچہ بچہ علوم جانتا ہے اور بڑی با دلائل گفتگو کرتا ہے۔ اور پھر یہ سوچنے کا ہی نتیجہ تھا کہ ان کے ایمانوں میں تزلزل واقع نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ جو کچھ مانتے تھے۔ سمجھ کر مانتے تھے سوچ کر مانتے تھے اور ساری تشریحات کو مدِ نظر رکھ کر مانتے تھے اور پھر یہی وجہ تھی کہ مسلمان جان دیتا تھا تو لوگ حیران رہ جاتے تھے کہ یہ کس دلیری اور جرأت کے ساتھ اپنی جان دے رہے ہیں۔ ایک صحابیؓ کہتے ہیں کہ میرے ایمان لانے کی وجہ ہی یہی ہوئی کہ میں نے ایک مسلمان کو اس جرأت کے ساتھ جان دیتے دیکھا کہ میں حیران رہ گیا۔ واقعہ یہ ہوا کہ دشمنوں نے مسلمانوں کی ایک جماعت دھوکا سے گھیر لی۔ اور پھر مزید دھوکا انہوں نے یہ دیا کہ انہوں نے ان گھرے ہوئے مسلمانوں سے یہ کہا کہ اگر تم پہاڑی سے نیچے اتر آؤ تو ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ جب وہ نیچے آئے تو انہوں نے حملہ کر کے ان میں سے اکثر کو شہید کر دیا۔ وہ شخص جو اس واقعہ کو دیکھنے کے بعد ایمان لایا وہ کہتا ہے کہ میں کسی اور قبیلہ کا تھا۔ لیکن ہم سمجھتے تھے کہ یہ مسلمان لوگ بے دین ہیں اور عربوں کے خلاف جذبات رکھتے ہیں۔ اور چونکہ ہمارے کانوں میں بار بار یہ باتیں ڈالی جاتی تھیں کہ مسلمان عربوں کے دشمن ہیں۔ اس لئے میں بھی ان لوگوں کے ساتھ آ کر شامل ہو گیا۔ اور مسلمانوں کا میں نے مقابلہ کیا اس وقت میں نے دیکھا کہ ایک شخص آگے بڑھا اور اس نے ایک مسلمان کے سینہ میں نیزہ مارا۔ جوں ہی وہ

نیزہ اس کے سینہ سے پار گیا بے اختیار اس کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہوئے کہ فُزْتُ وَرَبِّ الْکَعْبَۃِ خدائے کعبہ کی قسم! آج میں نے اپنا مقصد پالیا۔ اور یہ کہتے ہوئے وہ گرا اور شہید ہو گیا۔ میں نے یہ الفاظ سنے۔ تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میں نے اپنے دل میں کہا۔ یہ بات کیا ہے۔ کیا یہ شخص پاگل تھا کہ دشمن اسے نیزہ مارتا ہے۔ اور نیزہ بھی ایسی حالت میں مارتا ہے جب یہ اپنے وطن سے سوڈیڑھ سو میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس وقت بجائے اس کے کہ یہ کہے ہائے اماں! بجائے اس کے کہ یہ کہے ہائے ابا! بجائے اس کے کہ یہ کہے ہائے میری بیوی! وہ کہتا ہے تو یہ کہ خدائے کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا۔ یہ کامیاب کہاں ہوا؟ یہ تو مر گیا تھا پھر اس نے یہ الفاظ کیوں کہے۔ معلوم ہوتا ہے یہ شخص پاگل تھا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ کامیابی کیا چیز ہے اور ناکامی کیا چیز؟ چنانچہ لڑائی کے بعد میں نے ایک شخص سے پوچھا کہ کیا یہ کوئی پاگل تھا کہ جب اس پر حملہ کیا گیا تو بجائے اس کے کہ یہ کسی تکلیف کا اظہار کرتا اس نے کہا تو یہ کہ رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا۔ وہ کہنے لگا۔ مسلمان ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وہ مرنے میں کامیابی سمجھتے ہیں۔ جب اس نے یہ بات کہی تو میرے دل پر اس کا گہرا اثر ہوا اور میں نے کہا۔ تب ضرور کوئی بات ہے ورنہ اس طرح جان دینے کے لئے کوئی تیار نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ایک دن میں چوری چھپے مدینہ گیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی باتیں سنیں۔ تو میرا دل کھل گیا اور میں نے سمجھا کہ اصل میں یہی سچائی ہے۔ تب میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ مسلمان کیوں جان دیتا ہے۔ مسلمان اس لئے جان دیتا ہے کہ اسے روشنی نظر آجاتی ہے۔ اور جسے روشنی نظر آجائے اس کا مقابلہ وہ شخص کہاں کر سکتا ہے جسے تاریکی ہی تاریکی دکھائی دے (بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ الرجیع)۔ غرض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم نے بار بار مسلمانوں کو نصیحت کی ہے کہ تم سوچو اور سمجھو۔ درحقیقت بغیر اس کے ہمیں کسی دوسری قوم پر فضیلت حاصل ہی نہیں ہو سکتی اگر ہم خالی کہیں کہ تم قرآن مانو۔ اور مسلمان بنو تو ہندو کہیں گے ہندو بنو اور وید پڑھو۔ سکھ کہیں گے سکھ بنو اور گرنتھ پڑھو۔ عیسائی کہیں گے عیسائی بنو اور انجیل پڑھو۔ پھر ہم میں اور ان میں کیا فرق رہا۔ صرف ایک ہی فرق ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ ہم سوچ کر مانیں اور سمجھ کر مانیں۔ جب ہم ہر بات کو سوچ کر اور سمجھ کر مانیں جب ہم ہر بات کو سوچ کر اور سمجھ کر ماننے کے عادی ہو جائیں گے تو سچی کتاب والا اپنی کتاب پر زیادہ سے زیادہ مضبوط ہوتا چلا جائے گا اور غلط تعلیم والا زیادہ سے زیادہ اپنی مذہبی تعلیم سے متنفر ہوتا چلا جائے گا۔ مثلاً ہم قرآن کریم پر غور کریں گے اور اس کی تعلیموں کو سوچیں گے تو زیادہ سے زیادہ اس میں سے دلائل نکلتے چلے آئیں گے اور ہمارا ایمان زیادہ سے زیادہ مضبوط ہوتا چلا جائے گا۔ لیکن ایک عیسائی عیسائیت پر جتنا بھی غور کرے گا اس کا ایمان کمزور ہوتا جائے گا۔ ایک یہودی جتنا جتنا تورات پر غور کرے گا چونکہ وہ

محرف ومبدل ہوچکی ہے اس لئے اتنا ہی اس سے بدظن ہوتا چلا جائے گا۔اسی طرح جتنا جتنا کوئی ویدوں پر غور کرے گا اتنا ہی وہ ویدوں سے بدظن ہوتا چلا جائے گا۔گو یا غور اور فکر کا یہ نتیجہ ہوگا کہ مسلمان اپنے ایمان میں مضبوط ہوتا چلا جائے گا اور ہندو اور عیسائی اور موسائی اپنے ایمان میں متزلزل اور کمزور ہوتے چلے جائیں گے۔پس سوچنا اور سمجھنا مذہب کو مضبوط کرتا اور ایمان کو تقویت دیتا ہے۔دنیوی لحاظ سے بھی غور کر کے دیکھ لو ابتدائے اسلام میں مسلمانوں نے سوچا اور علوم پر غور کیا تو وہ کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔آخر مسلمانوں سے پہلے عربی زبان موجود تھی۔بلکہ عربوں کی یہ مادری زبان تھی مسلمانوں سے پہلے تاریخ موجود تھی لیکن باوجود اس کے انہوں نے اسلام سے پہلے کوئی بھی حرکت نہیں کی۔لیکن اسلام کے بعد ان میں ایسی تبدیلی پیدا ہوگئی کہ انہوں نے عربی مدوّن کی۔لغتیں لکھیں۔زبان عربی کے اصول اور قوائد وضع کئے۔صرف ونحو کے اصول تجویز کئے۔فقہ کے اصول تجویز کئے۔تاریخ کے اصول مدوّن کئے۔یہ فرق آخر کیوں ہوا؟ اسی لئے کہ مسلمانوں کو تعلیم دی گئی تھی کہ ہر بات پر سوچو اور غور کرو۔جب انہوں نے سوچا تو وہ ہر میدان میں آگے نکل گئے۔اور ان میں بڑے بڑے نحوی۔بڑے بڑے صرفی۔بڑے بڑے قاضی۔بڑے بڑے مؤرخ اور بڑے بڑے جرنیل نظر آنے لگے۔لیکن جب مسلمانوں نے سوچنا ترک کر دیا اور یورپ نے سوچنا شروع کیا۔تو مسلمان گر گئے اور یورپ کے لوگ کہیں سے کہیں نکل گئے۔

مسلمان جب ایک زندہ قوم تھے۔وہ ہر چیز میں غور وفکر کرنے کے عادی تھے۔اور اس چیز نے ان کے دماغوں کو ایسا روشن کر دیا تھا کہ وہ بڑے بڑے جھگڑے نہایت خوش اسلوبی سے طے کر لیا کرتے تھے۔یورپ میں بچوں کو جو ریڈرز پڑھائی جاتی ہیں ان میں ابن ابی لیلیٰ کا ایک واقعہ آتا ہے۔یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ کے ایک مسلمان جج تھے۔انہوں نے قضا میں جس طرح ترقی کی اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک دفعہ ان کے پاس دو شخص لڑتے ہوئے آئے۔ان میں سے ایک تیلی تھا۔اور دوسرا قصائی۔جھگڑا یہ تھا کہ کچھ روپوں کے متعلق ان میں سے ایک کہتا تھا کہ یہ میرے روپے ہیں۔اور دوسرا کہتا تھا کہ یہ میرے روپے ہیں۔آخر انہوں نے اس کے فیصلہ کی ایک راہ نکالی۔غور کرو وہ کتنی باریک بات تھی جو انہوں نے سوچی۔انہوں نے سوچا کہ ان میں سے ایک قصائی ہے اور ایک تیلی۔ان دونوں کے پاس کہیں سے اکٹھی دولت نہیں آسکتی۔یہی ہوسکتا ہے کہ انہوں نے روپیہ روپیہ لے کر جمع کیا ہو۔مگر سوال یہ ہے کہ روپے کس کے ہیں۔اس کے لئے انہوں نے پانی منگوایا اور اسے گرم کروایا۔پھر وہ روپے اس پانی میں ڈال دیئے۔یہ دیکھنے کے لئے کہ پانی پر کیا چیز آتی ہے۔اگر تیل آیا تو روپے تیلی کے ہوں گے اور اگر چربی آگئی تو روپے قصاب کے ہوں گے۔چنانچہ جو نشان آیا۔اس کے مطابق انہوں نے فیصلہ

کر دیا۔ یہ سوچنے کا نتیجہ تھا کہ ان کے دماغ نے فوراً ایک راہ نکال لی اور اس کے مطابق انہوں نے اس جھگڑے کا فیصلہ کر دیا۔ اس قسم کے ان کے اور بھی بہت سے فیصلے مشہور ہیں اور وہ آج تک یورپ کی ریڈرز میں بچوں کو پڑھائے جاتے ہیں۔ اور انہیں سگیشس قاضی یعنی عقلمند قاضی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ بہت جلد فیصلہ کر دیتے تھے اور فیصلہ نہایت صائب ہوتا تھا۔ مگر اس کی وجہ کیا تھی؟ وجہ یہی تھی کہ انہیں سوچنے اور غور کرنے کی عادت تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں کوفہ کے لوگ بار بار شرارتیں کرتے تھے اور جو بھی گورنر مقرر ہو کر آتا اس کی شکایتیں کرنی شروع کر دیتے اور آخر اسے بدلوا دیتے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایک دفعہ بعض لوگوں نے کہا کہ آپ کوفہ کے گورنر کو بار بار کیوں بدلتے ہیں۔ ان لوگوں کی تو عادت ہی یہی ہے کہ جو شخص بھی ان کا گورنر بن کر جائے اس کی شکایتیں کرنے لگ جاتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب تک یہ لوگ گورنر بدلنے کے لئے کہتے چلے جائیں گے میں بھی بدلتا چلا جاؤں گا تا کہ ان کا کوئی عذر باقی نہ رہے۔ آخر جب ان کی شکایتیں بہت بڑھ گئیں تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اب کی دفعہ میں ایک ایسا آدمی بھیجوں گا جس کے متعلق مجال نہیں کہ کوفہ والے اُف بھی کر سکیں۔ چنانچہ انہوں نے ابنؔ ابی لیلیٰ کو وہاں کا گورنر مقرر کر کے بھیجا۔ اس وقت ان کی عمر ۱۹ سال کی تھی۔ کوفہ والوں کو جب پتہ لگا کہ اب ایک ایسا نوجوان ہمارا گورنر بن کر آیا ہے جس کی عمر صرف ۱۹ سال ہے تو وہ بڑے خوش ہوئے اور انہوں نے سوچا کہ اب ہم اس کا خوب مذاق اڑائیں گے اور اسے اچھی طرح شرمندہ اور ذلیل کریں گے۔ جب ان کے آنے کی وہاں اطلاع پہنچی تو انہوں نے بڑے بڑے آدمیوں کو اکٹھا کیا اور تجویز یہ کی کہ بوڑھوں اور بڑی عمر والوں کا ایک وفد بنایا جائے۔ جو شہر سے باہر نکل کر گورنر کا استقبال کرے۔ اس وفد کے ساتھ عام لوگوں کا ایک بھاری ہجوم ہو۔ تمام شہر میں جلوس نکالا جائے اور جب گورنر صاحب تشریف لائیں تو تمسخر کے طور پر ان سے پوچھا جائے کہ جناب کی عمر کیا ہے؟ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ بڑے بڑے بڈھے اور آزمودہ کار اور شہر کے رئیس ایک وفد کی صورت میں جمع ہوئے۔ ان کے ساتھ شہر کے ہزاروں آدمی ایک جلوس کی صورت میں باہر نکلے تا کہ وہ ابنؔ ابی لیلیٰ کا استقبال کریں۔ جب وہ قریب پہنچے تو ایک بہت بڈھا آدمی جس کو انہوں نے سکھایا ہوا تھا آگے بڑھا اور اس نے کہا۔ حضور آپ کی عمر کیا ہے؟ ان کا خیال تھا کہ وہ جواب میں کہیں گے ۱۹ سال اور اس پر سب لوگ ہنس پڑیں گے کہ ۱۹ سال کا نوجوان کوفہ جیسے شہر میں گورنر بنا کر بھیجا گیا ہے۔ مگر ان کو سوچنے کی عادت تھی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو غور کرنے کا ایسا عادی بنا دیا تھا کہ ان کی نگاہ حقیقت تک فوراً پہنچ جاتی تھی۔ جب انہوں نے کہا۔ حضور آپ کی عمر؟ تو وہ فوراً تاڑ گئے کہ ان کی غرض سوال کرنا نہیں بلکہ تمسخر اور استہزاء کرنا ہے چنانچہ انہوں

نے جواب میں یہ نہیں کہا کہ میری عمر ۱۹ سال ہے۔ بلکہ کہا۔ جناب والا! جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسامہؓ بن زیدؓ کوشام کی فوج کا افسر بنا کر بھیجا تھا۔ جس میں ابوبکرؓ اور عمرؓ جیسے انسان بھی شامل تھے تو جو عمر اس وقت اسامہ کی تھی اس سے ایک سال میں بڑا ہوں۔ جب اسامہ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شام کی فوج کا افسر بنا کر بھیجا ہے اس وقت ان کی عمر ۱۸ سال کی تھی۔ یہ جواب سن کر انہوں نے فیصلہ کرلیا۔ کہ جب تک یہ شخص یہاں رہے اس وقت تک کوئی شرارت نہیں کرنی۔ چنانچہ انہوں نے ایک لمبے عرصہ تک قضا کی۔ مگر پھر کسی نے ان کے تبادلہ کی درخواست نہیں کی۔ تو انسان کو ہمیشہ سوچنے اور صحیح نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اپنے مقام سے گر جاتا ہے۔ اب کُجا تو یہ حالت تھی کہ مسلمان ہر علم میں ترقی کر رہے تھے اور کُجا یہ حالت ہے کہ جب انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ جو ہونا تھا ہو چکا اب علوم میں ترقی نہیں ہو سکتی تو وہ گر گئے۔ اور ایسے گرے کہ اب دنیا کی علمی دوڑ میں غیر مذاہب کے لوگ تو آگے ہیں اور مسلمان پیچھے ہیں۔ اس کے مقابل میں یورپ نے کہا کہ اگر پہلوں نے ترقی کی تھی تو ہم کیوں ترقی نہیں کر سکتے۔ ہم بھی سوچیں گے اور غور کریں گے اور اس طرح اپنی ترقی کے لئے نئے سے نئے راستے نکالیں گے چنانچہ ان کے سوچنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے کئی قسم کی ایجادیں کرلیں۔ مثلاً وہ ریل جس پر تمام دنیا سفر کرتی ہے۔ یہ کس چیز کا نتیجہ ہے۔ یہ سوچنے اور غور کرنے کا ہی نتیجہ ہے ریل کے موجد نے دیکھا کہ ہنڈیا کو جب چولہے پر چڑھایا جاتا ہے تو اس کا ڈھکنا سٹیم کے زور سے اُچھلتا ہے اس پر غور کر کے اس کا دماغ اس طرف چلا گیا کہ سٹیم میں بہت بڑی طاقت ہے۔ اگر سٹیم کو بند رکھا جائے اور ہنڈیا کے نیچے پہیئے لگا دیئے جائیں تو وہ دوڑنے لگ جائے گی۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ ہنڈیا کے نیچے پہیئے لگائے سٹیم کو بند کیا اور وہ دوڑنے لگ گئی۔ اسی پر قیاس کر کے اس نے ریل ایجاد کر لی۔ اب کون کہہ سکتا ہے کہ اس نے ہنڈیا میں سے کبھی سٹیم نکلتے نہیں دیکھی گھروں میں روزانہ عورتیں کھانا پکاتی ہیں اور مرد روزانہ دیکھتے ہیں کہ سٹیم کے زور سے ہنڈیا کا ڈھکنا اچھل رہا ہے۔ مگر ان کا ذہن کبھی اس طرف مائل نہیں ہوتا کہ وہ اس پر غور کریں اور سوچیں کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ریل کے موجد نے اسے دیکھا اور اس نے سوچ کر ایک ایسی چیز بنالی جس سے آج ساری دنیا فائدہ اٹھا رہی ہے۔ اسی طرح اور کئی چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی ہیں جن سے کچھ کا کچھ نتیجہ نکل آتا ہے کولمبسؔ کو دیکھو۔ اس نے مسلمانوں سے یہ سنا ہوا تھا کہ زمین گول ہے۔ حالانکہ علمِ ہیئت کی ترقی اس وقت اتنی نہیں ہوئی تھی۔ دراصل مسلمانوں نے چاند گرہن پر غور کر کے یہ نتیجہ نکال لیا تھا کہ زمین چپٹی نہیں بلکہ گول ہے۔ کیونکہ چاند گرہن کے وقت اس پر ایک گول نشان ہوتا ہے۔ اس نشان سے مسلمانوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ زمین گول ہے۔ جب کولمبسؔ نے یہ سُنا کہ مسلمانوں کے علماء کا یہ

خیال ہے کہ زمین گول ہے تو اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ اگر زمین گول ہے تو میں سپین سے چلوں گا اور ہندوستان پہنچ جاؤں گا ۔ چنانچہ اس نے پہلے بادشاہ اور پھر ملکہ کو تحریک کی کہ وہ اس کی امداد کریں ۔ اور آخر وہ ہندوستان تو نہ پہنچا لیکن ہندوستان سے ایک زیادہ طاقتور ملک امریکہ اُسے مل گیا (انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا زیر لفظ Christopher Columbus)۔ یہ نتیجہ کس بات کا تھا؟ اس بات کا کہ مسلمانوں کو سوچنے اور غور کرنے کی عادت تھی ۔ انہوں نے پہلے سوچا کہ چاند گرہن کیوں لگتا ہے اور پھر انہوں نے سوچ کر یہ نتیجہ نکالا کہ چاند گرہن اس لئے لگتا ہے کہ سورج اور چاند کے درمیان زمین آجاتی ہے ۔ پھر انہوں نے سوچا کہ گرہن کے وقت چاند پر گول نشان کیوں ہوتا ہے؟ اس کا جواب ان کے دماغ نے یہ دیا کہ یہ گول نشان زمین کا ہے ۔ اور یہ گول نشان ثابت کرتا ہے کہ زمین چپٹی نہیں بلکہ گول ہے اور جب مسلمان علماء نے کہا کہ یہ زمین گول ہے ۔ تو کولمبسؔ نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ جب میں سپین سے چلوں گا تو ساری دنیا کے گرد چکر لگالوں گا ۔ کیونکہ گول چیز کے گرد چکر لگایا جاسکتا ہے ۔ چپٹی ہو تو کنارہ پر آکر قدم رک جاتا ہے ۔ غرض چھوٹی چھوٹی چیزوں پر غور کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک نیا ملک دریافت ہو گیا ۔ اتنا بڑا ملک کہ آج ساری دنیا امن کے لئے اس کی طرف دیکھ رہی ہے آج ساری دنیا یہ سمجھتی ہے کہ ہماری حفاظت کا ذریعہ ہی یہی ہے کہ یونائیٹڈ سٹیٹس امریکہ کی مدد ہمارے ساتھ ہو ۔ یہ عظیم الشان نتیجہ آخر کس طرح نکلا؟ اسی طرح کہ پہلے مسلمانوں نے چاند گرہن پر غور کیا پھر چاند گرہن سے یہ نتیجہ نکالا کہ زمین گول ہے اور کولمبسؔ نے زمین کے گول ہونے سے یہ نتیجہ نکالا کہ اگر وہ گول ہے تو میں ساری دنیا کے گرد چکر لگالوں گا ۔ چنانچہ وہ چلا اور اس نے ایک نئی زمین دریافت کر لی جواب اتنا بڑا ملک بن گیا ہے کہ ساری دنیا کی راہنمائی کر رہا ہے اگر مسلمان چاند کو دیکھتے رہتے جس طرح پہلے دیکھا کرتے تھے ۔ اگر مسلمان اس بات پر غور نہ کرتے کہ اس پر گرہن کے وقت گول دائرہ کیوں بن جاتا ہے ۔ اگر کولمبسؔ یہ نہ سوچتا کہ زمین کے گول ہونے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ساری دنیا کا چکر لگایا جاسکتا ہے تو نہ امریکہ دریافت ہوتا ۔ نہ موٹر کاریں ہوتیں نہ ہوائی جہاز نکلتے نہ بجلی ایجاد ہوتی نہ اتنی عظیم الشان طاقت دنیا پر رونما ہوتی کہ جس کے پیچھے آج انگریز اور فرانس بھی چلنے پر مجبور ہیں ۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں جتنی ایجادات ہیں وہ ساری کی ساری بہت چھوٹی چھوٹی چیزوں پر غور کرنے کا نتیجہ ہیں ۔ ایڈیسن جس نے فونوگراف اور بجلی وغیرہ کئی چیزیں ایجاد کی ہیں میں نے اس کی سوانح عمری پڑھی ہے ۔ وہ لکھتا ہے کہ میں نے جس قدر ایجادیں کی ہیں یہ سب کی سب بعض چھوٹے چھوٹے مسائل پر غور کرنے کا نتیجہ ہیں ۔ پس سوچنا اور غور کرنا قومی ترقی کیلئے ایک نہایت ہی ضروری چیز ہے ۔ جو قومیں بلا سوچے سمجھے صرف نعرے لگانا جانتی ہیں وہ کوئی کام نہیں کرسکتیں ۔ وہ نعروں سے اس وقت کی فضا کو مشوّش کرسکتی ہیں ۔ وہ نعروں سے کمزور

بچوں کو ڈرا سکتی ہیں۔ وہ نعروں سے کمزور عورتوں کے دلوں کو دہلا سکتی ہیں۔لیکن اگر وہ کوئی حقیقی کام کر سکتی ہیں تو صرف سوچ بچار سے اور صحیح نتائج کو اخذ کر کے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو شعور کی طرف توجہ دلائی۔اور فرمایا کہ کاش اس قسم کے لغو اعتراضات کرنے کی بجائے تم حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرتے اور وہ مخفی حسّ جو انسان کو اس کے اندرونی قویٰ کا علم دیتی ہے اور جس کے نتیجہ میں فطرتِ صحیحہ بیدار ہوتی ہے اس سے کام لیتے ہوئے تم دوسروں پر اعتراض کرنے کی بجائے اپنے نفس پر غور کرتے کہ اس میں کیا کیا خامیاں ہیں اور بُرے بھلے کی تمیز کرنے کی طاقت پیدا کرتے۔

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ﴿۱۱۷﴾ قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوْمِيْ كَذَّبُوْنِ ﴿۱۱۸﴾ فَافْتَحْ بَيْنِيْ وَ بَيْنَهُمْ فَتْحًا وَّ نَجِّنِيْ وَ مَنْ مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَ مَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۲۰﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبٰقِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۳﴾

انہوں (یعنی کافروں) نے کہا۔اے نوحؑ! اگر تو باز نہ آیا تو تُو سنگساروں میں شامل ہو جائے گا (یعنی ہم تجھے سنگسار کر دیں گے)۔اس پر اُس (یعنی نوحؑ) نے کہا۔اے میرے رب! میری قوم نے مجھے جھٹلا دیا ہے۔ پس تو میرے اور ان کے درمیان ایک قطعی فیصلہ کر اور مجھے اور میرے ساتھی مومنوں کو (دشمن کے) شر سے بچا لے۔ پس ہم نے اس کو اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے ایک بھری ہوئی کشتی کے ذریعہ (شر سے) بچا لیا۔ پھر اس کے بعد جو باقی لوگ تھے ان کو غرق کر دیا۔اس میں ایک بہت بڑا نشان تھا مگر ان (یعنی کافروں) میں سے اکثر ایمان لانے پر آمادہ نہیں تھے۔اور تیرا رب ہی غالب (اور) بار بار کرم کرنے والا ہے۔

ع ۱۸/۱۰

حلّ لُغات۔ اَلْمَرْجُوْمِيْنَ اَلْمَرْجُوْمُ سے جمع کا صیغہ ہے۔اور رَجْمٌ سے اسم مفعول

ہے۔ اور رَجَمَهٗ کے معنے ہیں۔ رَمَاهُ بِالْحِجَارَةِ۔ اس کو پتھر مارے۔ قَتَلَهٗ ۔ اس کو قتل کیا۔ قَذَفَهٗ۔ اس پر الزام لگایا۔ لَعَنَهٗ۔ اُس پر لعنت کی۔ شَتَمَهٗ ۔ اس کو گالی دی۔ هَجَرَهٗ۔ اُس کو جدا کر دیا طَرَدَهٗ۔ اس کو دھتکار دیا۔ (اقرب)

اَلْمَشْحُوْنُ اَلْمَشْحُوْنُ: شَحَنَ سے اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ اور شَحَنَ السَّفِيْنَةَ کے معنے ہیں مَلَأَهَا کشتی کو بھر دیا۔ (اقرب) پس اَلْمَشْحُوْنُ کے معنے ہوں گے۔ بھری ہوئی۔

تفسیر ۔ حضرت نوح علیہ السلام کے مخالفین نے جب دیکھا کہ وہ دلائل سے نوحؑ کو مغلوب نہیں کر سکتے تو انہوں نے کہا کہ اب تو ہمارے پاس ایک ہی علاج ہے۔ اگر تم اپنی ان باتوں سے باز نہ آئے تو ہم تجھے پتھر مار مار کر ہلاک کر دیں گے۔ آخر حضرت نوح علیہ السلام خدا تعالیٰ کے حضور جُھکے اور انہوں نے کہا کہ اے میرے رب! میری قوم نے تو مجھے جھٹلا دیا ہے۔ اب تو ہی میرے اور ان کے درمیان فیصلہ فرما۔ اور مجھے اور میرے ساتھیوں کو ان کے شر سے محفوظ رکھ۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی دعا کو سنا اور اس نے ایک بھری ہوئی کشتی کے ذریعہ انہیں اپنے دشمنوں کے شر سے بچا لیا۔ اور جو باقی لوگ رہ گئے۔ ان کو طوفان میں غرق کر دیا۔ اس واقعہ میں بھی خدا تعالیٰ کی عظمت اور اس کی طاقت کا بڑا بھاری نشان ہے۔ مگر پھر بھی ان میں سے اکثر لوگ ایمان نہ لائے۔ لیکن ان کے ایمان نہ لانے کے باوجود تیرے رب کا عزیز اور رحیم ہونا ثابت ہو گیا۔ نوحؑ اپنے دشمنوں پر غالب آ گیا اور نوحؑ کے حقیر سمجھے جانے والے ساتھی دنیا کے سردار بن گئے۔

اس جگہ نوحؑ کی کشتی کے متعلق اَلْمَشْحُوْن کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنے بھری ہوئی کشتی کے ہیں مگر ظاہر ہے کہ اگر کشتی پہلے ہی بھری ہوئی ہو تو اور لوگ اس میں سوار نہیں ہو سکتے۔ پھر بھری ہوئی کشتی میں نوحؑ کے ساتھی کس طرح بیٹھ سکتے تھے؟ درحقیقت عربی زبان میں بعض دفعہ کسی چیز کو اس حالت کے مطابق نام دے دیتے ہیں جو اس پر بعد میں وارد ہونے والی ہو۔ جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا کہ مَنْ قَتَلَ قَتِيْلًا فَلَهٗ سَلْبُهٗ (ابو داؤد کتاب الجهاد باب فی السلب یعطی القاتل) یعنی جو شخص جہاد میں کسی مقتول کو قتل کر دے اس کا مال و اسباب قتل کرنے والے کو ہی ملے گا۔ اس حدیث میں آپ نے دوسرے کے متعلق قَتِيل کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ حالانکہ وہ بھی زندہ ہوتا ہے۔ اسی طرح چونکہ وہ کشتی حضرت نوحؑ اور ان کی جماعت کے افراد سے بھر جانے والی تھی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے کہہ دیا کہ ہم نے انہیں ایک بھری ہوئی کشتی کے ذریعہ نجات دی۔

كَذَّبَتْ عَادُ ۣ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ

(اسی طرح) عادؔ نے بھی رسولوں کا انکار کیا۔ جب کہ ان سے ان کے بھائی ہودؔ نے کہا۔

اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۲۶﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ

کیا تم تقویٰ نہیں کرتے۔ میں تمہاری طرف ایک امانت دار پیغامبر ہو کر آیا ہوں۔ پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو

اَطِيْعُوْنِ ﴿۱۲۷﴾ وَمَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا

اور میری اطاعت کرو۔ اور میں تم سے اس (خدمت) پر کوئی بدلہ نہیں مانگتا میرا بدلہ صرف

عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۸﴾

رب العالمین خدا کے ذمہ ہے (جس نے مجھے بھیجا ہے)۔

تفسیر۔ ان آیات میں حضرت ہودؑ کو پھر تمام رسولوں کا قائم مقام بتایا گیا ہے۔ اور رسول کی جگہ مرسلینؔ کا لفظ اس کے لئے استعمال کیا گیا کیونکہ ایک رسول کا انکار درحقیقت تمام رسولوں کا انکار ہوتا ہے۔ فرماتا ہے۔ جس طرح نوحؑ کو اس کی قوم نے جھٹلایا تھا۔ اسی طرح ہودؑ کو بھی اس کی قوم عاد نے جھٹلایا۔ حالانکہ اس کے زمانہ میں بھی ہم نے یہی حکم دیا تھا۔ کہ علاوہ کلامِ الٰہی کی اطاعت کے خود ہودؑ کی اطاعت بھی ضروری ہے جس کی طرف اَطِيْعُوْنِ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ﴿۱۲۹﴾ وَتَتَّخِذُوْنَ

کیا تم ہر ٹیلہ پر فضول کام کرتے ہوئے عمارت بناتے ہو۔ اور تم بڑے بڑے محل بناتے ہو تا کہ تم ہمیشہ

مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ

قائم رہو۔ اور جب تم کسی کو پکڑتے ہو تو ظالموں کی طرح پکڑتے ہو۔ پس اللہ (تعالیٰ) کا تقویٰ اختیار کرو

جَبَّارِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿۱۳۲﴾ وَ اتَّقُوا الَّذِيْٓ

اور میری اطاعت کرو۔ پھر میں کہتا ہوں کہ اس (ذات) کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تمہاری ان چیزوں

اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّ بَنِيْنَ ﴿۱۳۴﴾

سے مدد کی ہے جن کو تم جانتے ہو۔ اس نے تمہاری مدد کی ہے چار پائے اور بیٹے۔ اور باغ اور چشمے دے کر۔

وَ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿۱۳۵﴾ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۳۶﴾

میں تم پر ایک بڑے دن کا عذاب نازل ہونے سے ڈرتا ہوں۔

حلّ لُغات۔ رِيْعٌ اَلرِّيْعُ کے معنے ہیں اَلتِّلُّ الْعَالِيْ۔ اونچا ٹیلہ۔ اَلطَّرِيْقُ الْمُنْعَرَجُ فِي الْجَبَلِ۔ پہاڑ میں چڑھائی کا وہ راستہ جو چکر کھا کر جاتا ہو۔ اَلْجَبَلُ الْمُرْتَفِعُ۔ بلند پہاڑ۔ وَقِيْلَ مَسِيْلُ الْوَادِيْ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ مُرْتَفِعٍ۔ اور بعض ائمہ لُغت کہتے ہیں کہ ریع ہر اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں اونچی جگہ سے پانی آئے اور بہہ جائے۔ (اقرب)

تَعْبَثُوْنَ تَعْبَثُوْنَ عَبَثَ سے فعل مضارع مخاطب جمع کا صیغہ ہے۔ اور العَبَثُ (جو عَبَثَ کا مصدر ہے) کے معنے ہیں۔ اِرْتِكَابُ اَمْرٍ غَيْرُ مَعْلُوْمِ الْفَائِدَةِ اَوْلَيْسَ فِيْهِ غَرَضٌ صَحِيْحٌ لِفَاعِلِهٖ۔ کسی ایسی بات کا کرنا جس کا کوئی فائدہ نظر نہ آتا ہو۔ یا ایسا کام کرنا کہ جس کے کرنے والے کی غرض صحیح نہ ہو (اقرب) پس تَعْبَثُوْنَ کے معنے ہوں گے تم بے فائدہ کام کرتے ہو۔

مَصَانِعَ مَصَانِعَ کے معنے ہیں۔ اَلْقُرٰى وَالْمَبَانِيْ مِنَ الْقُصُوْرِ وَالْحُصُوْنِ۔ بستیاں اور بڑی بڑی عمارات۔ (اقرب)

بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ بَطَشَ سے جمع مذکر مخاطب کا صیغہ ہے۔ اور بَطَشَ کے معنے ہیں اَخَذَهٗ بِالْعَنْفِ۔ سختی سے پکڑا۔ وَتَنَاوَلَهٗ بِشِدَّةٍ عِنْدَ الصَّوْلَةِ۔ حملہ کے وقت سختی سے پکڑا۔ (اقرب) پس بَطَشْتُمْ کے معنے ہوں گے تم سختی سے پکڑتے ہو۔

جَبَّارِيْنَ جَبَّارِيْنَ جَبَّارٌ کی جمع ہے اور جَبَّارٌ کے معنے ہیں۔ كُلُّ عَاتٍ مُتَمَرِّدٍ۔ متکبر اور سرکش

شخص۔(اقرب)

تفسیر۔قوم عاد جس کی طرف حضرت ہود علیہ السلام مبعوث ہوئے فنِ تعمیر میں خاص شغف رکھتی تھی کیوں کہ اس کی تہذیب کی بنیاد علم ہندسہ۔کیمسٹری اور ہیئت پر تھی۔اس تہذیب کے بانیوں کا خیال تھا کہ جس طرح خدا تعالیٰ نے مادی عالم میں سورج اور چاند اور ستارے بنائے ہیں اسی طرح انسانی ترقی کے لئے اس نظام کی نقل کرنا ضروری ہے اور اس کا فرض ہے کہ وہ نظامِ شمسی پر غور کرکے اور اس کے راز معلوم کرکے ان کی اتباع کرے۔جس طرح آرینؔ۔رومنؔ اور ایرانی ثقافت نے متمدن دنیا پر ایک گہرا اثر ڈالا۔اور سابق نظاموں کی جگہ ایک نیا نظام قائم کردیا۔اسی طرح بابلی تحریک جس کے بانی قوم عاد سے تعلق رکھنے والے تھے اس نے بھی دنیا کے کلچر اور تہذیب پر نہایت گہرا اثر ڈالا۔اور گو اس تحریک کے بانی کچھ عرصہ بعد سیاسی طور پر اپنی حکومت کو کھو بیٹھے اور اس کی جگہ دوسری اقوام نے لے لی۔مگر ان کو شکست دینے والے ان کے فلسفہ سے آزاد نہ ہوسکے۔یہ تحریک چونکہ انتہائی قدیم تحریک ہے اس لئے موجودہ زمانہ میں اس کے آثار بہت کم ملتے ہیں۔لیکن جتنے آثار بھی ملتے ہیں وہ قرآنی بیانات کی صداقت اور اس کی عظمت کو روشن کردیتے ہیں۔

اس تہذیب کی بنیاد قوم عاد کے ہاتھوں رکھی گئی تھی اور اس کو اپنے زمانہ میں اتنی طاقت حاصل تھی کہ ان کے بعد عرب میں کسی اور قوم کو اس قسم کی طاقت حاصل نہیں ہوئی۔اس تہذیب بابلی کی علمبردار دو قومیں ہوئی ہیں۔ایک وہ جسے عادِ اولیٰ کہتے ہیں۔اور جو تہذیب بابلی کے بانی تھے اور دوسرے ثمودؔ جو بعد میں اس تہذیب کے حامل بنے اور جو اسی عادؔ کی ایک دوسری شاخ تھے۔ان آیات میں انہی پہلے عاد یعنی بانیان تہذیب بابلی کا ہی ذکر کیا گیا ہے۔اور فرماتا ہے۔ہودؑ نے اپنے زمانہ کی مشہور ترین طاقت یعنی قوم عاد سے مخاطب ہوکر کہا۔کہ تم لوگ ہر پہاڑی پر شاندار عمارتیں بناتے ہو۔اور بڑی بڑی فیکٹریاں اور کمیسٹری کے مرکز تیار کرتے ہو اور خیال کرتے ہو کہ تم ہمیشہ قائم رہو گے۔جیسے یورپ اور روس کے لوگ آج کل یہ خیال کرتے ہیں کہ ان کی تہذیب ہمیشہ قائم رہے گی۔اس جگہ جو مصانع کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس سے مراد بڑی بڑی فیکٹریاں اور کیمیکل ورکس ہی ہیں۔

پھر فرمایا وَ اِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ تمہارے اندر اتنی طاقت پائی جاتی ہے۔کہ جب تم کسی ملک پر غلبہ پاتے ہو تو تم اس کی تہذیب کو بالکل تباہ کردیتے ہو۔اس کی جگہ اپنی تہذیب اور اپنا تمدن قائم کردیتے ہو۔جَبَّارٌ کے معنے ہوتے ہیں دوسرے کو نیچا کرکے اپنے آپ کو اونچا کرنے والا۔پس اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم دوسری اقوام کے تمدن اور تہذیب کو تباہ کرکے اپنے تمدن اور تہذیب کو دنیا میں قائم کرتے ہو۔اسی طرح وَ اِذَا بَطَشْتُمْ

بَطَشۡتُمۡ جَبَّارِیۡنَ سے یہ استنباط بھی ہوسکتا ہے کہ آلات جنگ کی بعض حیرت انگیز ایجادات انہی کے زمانہ میں ہوئی ہیں۔ چنانچہ جس رنگ میں انہوں نے پہاڑوں میں عمارتیں بنائی ہیں ان کو دیکھ کر بعض مؤرخین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اس قوم نے بارود اور ڈائنا میٹ ایجاد کرلیا تھا۔ ان معنوں کی رو سے اس آیت کا یہ مطلب ہوگا کہ تم ایسے ایسے سامان جنگ ایجاد کرتے ہو جو نہایت ہی مہلک ہیں اور تم ان کے ذریعہ باقی اقوام کو تباہ کر کے اپنی تہذیب اور اپنا تمدن قائم کردیتے ہو غرض بابلی تحریک میں عمارتوں کی تعمیر اور آلات جنگ کی ایجاد اور رصدگاہوں کے بنانے پر زیادہ زور تھا۔ چنانچہ بابل کی حکومت کا جو بیان تورات میں آتا ہے اس سے بھی قرآنی بیان کی ہی تصدیق ہوتی ہے۔ بائیبل میں آتا ہے۔

> ’’اور انہوں نے کہا۔ آؤ ہم اپنے واسطے ایک شہر بناویں اور ایک برج جس کی چوٹی آسمان تک پہنچے۔ اور یہاں اپنا نام کریں۔ ایسا نہ ہو کہ تمام روئے زمین پر پریشان ہوجائیں۔ اور خداوند اس شہر اور برج کو جسے بنی آدم بناتے تھے دیکھنے اترا اور خداوند نے کہا۔ دیکھ لوگ ایک ہیں اور ان سب کی ایک ہی بولی ہے۔ اب وے یہ کرنے لگے سو وے جس کام کا ارادہ رکھیں گے اس سے نہ رُک سکیں گے آؤ ہم اتریں اور ان کی بولی میں اختلاف ڈالیں تا کہ وے ایک دوسرے کی بات نہ سمجھیں۔‘‘

(پیدائش باب ۱۱ آیت ۴ تا ۷)

اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ یہودی تاریخ کے مطابق بھی ان لوگوں کا بڑا کمال بلند و بالا عمارات بنانا تھا۔ کیونکہ تورات کے اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ دنیا میں زبانوں کے اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ کسی وقت بابل کے لوگوں نے ایک بلند عمارت بنانی شروع کی تا کہ وہ ان کے لئے ایک نشان قرار پائے اور اس کی وجہ سے وہ پراگندگی سے بچ جائیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ ان کی پراگندگی چاہتا تھا اس لئے اس نے ان کو اس ارادہ سے باز رکھنے کے لئے ان کی زبانوں میں اختلاف ڈال دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس قوم میں سے اتحاد مٹ گیا اور ان کی طاقت ٹوٹ گئی اور وہ اس عمارت کے بنانے میں ناکام رہے۔

جو وجہ اس حوالہ میں بتائی گئی ہے وہ تو محض ایک کہانی ہے لیکن اس سے یہ تاریخی شہادت ضرور معلوم ہوجاتی ہے کہ اہلِ بابل اونچی عمارتیں بنانے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اور ایسی بلند عمارتیں بناتے تھے جن کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ چنانچہ عرب میں اب بھی بعض نہایت پرانی عمارتیں ملتی ہیں جو بہت بڑی بڑی ہیں۔ بلکہ سفرِ یورپ کے دوران میں عدن سے چند میل کے فاصلہ پر میں نے خود بعض بڑی بڑی پرانی

اونچی عمارتیں دیکھی ہیں جو اونچے ٹیلوں پر بنی ہوئی تھیں اور ان میں حوض وغیرہ بھی تھے۔ اور لوگ یہی کہتے تھے کہ یہ عاد کی بنائی ہوئی عمارتیں ہیں۔

یورپ کے لوگ ایک زمانہ میں عاد کے وجود سے ہی انکار کیا کرتے تھے۔ اور کہا کرتے تھے کہ عاؔد نام کی کوئی قوم نہیں گزری مگر قریباً نصف صدی سے جب سے کہ عاؔد کے آثار ملے ہیں۔ وہ بھی ماننے لگ گئے ہیں کہ عاؔد نام کی ایک قوم ہوئی ہے۔ بلکہ مشہور عیسائی مؤرخ جرجیؔ زیدان نے ''العرب قبل الاسلام'' میں لکھا ہے کہ عاد کے متعلق مؤرخوں کی سینکڑوں صفحوں کی کتابیں اس سے زیادہ معلومات بیان نہیں کر سکیں جتنے معلومات قرآن کریم نے اپنے چند الفاظ میں بیان کر دیئے ہیں۔

قرآن کریم بتاتا ہے کہ یہ قوم حضرت نوحؑ کی قوم کے معاً بعد گزری ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ (الاعراف:۷۰) یعنی یاد کرو جب خدا نے تم کو نوحؑ کی قوم کے بعد اس کا جانشین بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا جن کی پیشگوئیوں میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر دی گئی تھی۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا جن سے موسوی سلسلہ کی ابتداء ہوئی۔ پھر حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر کیا۔ کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نوحؑ کی شریعت کے پیرو تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ (الصافات:۸۴) یعنی حضرت ابراہیمؑ نوحؑ کی جماعت میں سے ہی تھے۔ پس ابراہیمؑ کے ذکر کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کے سلسلہ کے بانی حضرت نوحؑ کا ذکر فرما دیا۔ اور نوحؑ کے ذکر کے معاً بعد ہود علیہ السلام کا ذکر فرمایا جو قوم عاد کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ کیونکہ عاد ہی نے نوحؑ کی قوم کی جگہ لی تھی۔

حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کو توجہ دلائی کہ تم بڑے بڑے ٹیلوں پر اونچی عمارتیں کھڑی کرتے ہو اور اپنی تہذیب اور تمدن کے قیام کے لئے دوسری اقوام کو ظالمانہ طور پر کچل دیتے ہو۔ مگر یہ سب باتیں عبث ہیں کیونکہ ان ظاہری نشانوں کے باوجود تمہارے نشان مٹ جائیں گے اور قائم صرف تقویٰ رہے گا۔ تم بڑی بڑی فیکٹریاں اور صنعت گاہیں بناتے ہو اور سمجھتے ہو کہ تمہاری قوم ان کے ذریعہ سے زندہ رہے گی اور اپنی مالی ترقی کے گھمنڈ میں غریبوں پر ظلم کرتے ہو۔ مگر یہ جھوٹی عزت تمہارے کسی کام نہیں آئے گی۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔

وَاتَّقُوا الَّذِيْٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ۔ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّ بَنِيْنَ۔ وَجَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ۔ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ

يَوۡمٍ عَظِيۡمٍ ۔فرمایا آخر یہ علم جس تم دنیا میں ترقی کررہے ہو خدا تعالیٰ کے ہی دیئے ہوئے ہیں اور وہ سامان جن سے تم کام لیتے ہو وہ بھی خدا تعالیٰ ہی کے دیئے ہوئے ہیں۔ اسی طرح جانور بھی اور اولاد بھی اور باغات بھی۔ اور چشمے بھی سب اسی کی عطا ہیں۔ اگر تم اس کی طرف توجہ نہ کرو گے تو کسی دن یہ سب کچھ چھینا جائے گا۔

قَالُوۡا سَوَآءٌ عَلَيۡنَاۤ اَوَعَظۡتَ اَمۡ لَمۡ تَكُنۡ مِّنَ

انہوں نے کہا تیرا وعظ کرنا یا نہ کرنا ہمارے لئے برابر ہے (کیونکہ جو باتیں ہم کرتے ہیں)۔ وہ تو پہلے

الۡوٰعِظِيۡنَ ۙ﴿۱۳۷﴾ اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا خُلُقُ الۡاَوَّلِيۡنَ ۙ﴿۱۳۸﴾ وَمَا نَحۡنُ

زمانہ کے لوگوں سے رائج ہیں۔ اور ہم پر (کبھی) عذاب نہیں آئے گا۔ پس ان کافروں نے ان کو جھٹلا دیا

بِمُعَذَّبِيۡنَ ۚ﴿۱۳۹﴾ فَكَذَّبُوۡهُ فَاَهۡلَكۡنٰهُمۡ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ

اور ہم نے ان کو ہلاک کر دیا۔ اس واقعہ میں ایک بہت بڑا نشان ہے لیکن ان میں سے

وَمَا كَانَ اَكۡثَرُهُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۴۰﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ

اکثر مومنوں میں سے نہ بنے۔ اور تیرا رب یقیناً غالب

الۡعَزِيۡزُ الرَّحِيۡمُ ﴿۱۴۱﴾ ع

(اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر ۔حضرت ہود علیہ السلام نے جب انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ دلائی تو انہوں نے کہا۔ میاں ایسی نصیحتیں کرو یا نہ کرو ہم نے ماننا تو ہے ہی نہیں۔ پہلے زمانوں سے ایسے لوگ ہوتے چلے آئے ہیں جو کہتے تو رہے ہیں کہ زیادہ دولتیں نہ کماؤ اور دولتوں کا گھمنڈ نہ کرو۔ مگر پھر بھی یہ دنیا کام کرتی ہی چلی آئی ہے۔ ہم کو کارخانے بنانے اور دولتیں کمانے پر کوئی عذاب نہیں ہوگا۔ اس لئے خواہ تم ہمیں تبلیغ کرو یا نہ کرو ہمارے لئے یہ برابر ہے اور ہم کبھی تمہاری بات نہیں مان سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی انسان سرکشی اور تمرد میں بڑھ جائے تو اسے نیکی کی طرف توجہ دلانا بڑا کٹھن مرحلہ ہوتا ہے۔ لیکن اس مشکل کو تسلیم کرنے کے باوجود قرآن کریم نے مسلمانوں کو یہی ہدایت دی ہے

کہ فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى (الاعلٰی:۱۰) تمہارا کام یہی ہے کہ تم نصیحت کرتے چلے جاؤ۔ کیونکہ نصیحت کرنا بہرحال دوسروں کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ پس خواہ کوئی کتنا ہی مخالف ہو۔ اس کے متعلق کبھی مایوسی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔ دل خدا تعالیٰ کے قبضہ واختیار میں ہیں۔ تمہارا کام یہ ہے کہ تم بار بار خدا تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی باتیں لوگوں کے کانوں میں ڈالتے رہو۔ ایک دن یقیناً ایسا آجائے گا کہ ان کے دل کے زنگ دور ہو جائیں گے۔ اور وہ ہدایت کو خوشی سے قبول کرلیں گے۔

اولیاء کی کتب میں لکھا ہے کہ ایک شخص مسلمانوں کو سخت دکھ دیا کرتا تھا۔ اور باوجود سمجھانے کے باز نہیں آتا تھا۔ آخر کئی لوگوں نے تنگ آکر اس محلہ کو ہی چھوڑ دیا جس میں وہ رہتا تھا۔ ایک دفعہ ایک بزرگ حج کر رہے تھے کہ انہوں نے اسی شخص کو کعبہ کا طواف کرتے دیکھا۔ انہوں نے حیران ہو کر پوچھا کہ تُو کہاں؟ تیرا کام تو سارا دن گانا بجانا اور شرابیں پینا تھا تو کعبہ کا طواف کرنے کے لئے کس طرح آگیا۔ وہ کہنے لگا۔ ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے۔ آپ لوگ مجھے قرآن بھی سناتے اور حدیثیں بھی بتاتے مگر میرے دل پر ذرا بھی اثر نہ ہوتا۔ ایک دن مجلس لگی ہوئی تھی۔ دوست احباب بیٹھے تھے شراب کی صراحیاں قرینے سے رکھی ہوئی تھیں کہ یکدم مجھے گلی میں سے ایک آواز آئی۔ کوئی اجنبی نامعلوم کون گلی میں سے گزر رہا تھا اور قرآن کریم کی یہ آیت بڑی خوش الحانی سے پڑھتا جا رہا تھا کہ اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ۔ کیا مومنوں پر ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل خدا تعالیٰ کے خوف سے بھر جائیں۔ یہ آیت جونہی میرے کان میں پڑی مجھے یوں معلوم ہوا کہ یہ آیت ابھی آسمان سے میرے لئے اُتری ہے۔ میرے آنسو جاری ہو گئے۔ میں نے مجلس برخواست کر دی۔ گانے بجانے کے آلات توڑ دیئے توبہ کی اور حج کے لئے چل پڑا۔ تم نے سارا قرآن مجھے سنا دیا مگر مجھ پر اثر نہ ہوا لیکن وقت ہوتا ہے۔ ایک آیت نے میری کایا پلٹ دی اور اب میں توبہ کر کے حج کرنے آیا ہوں۔ تو قلوب بعض دفعہ ایسے رنگ میں بدلتے ہیں کہ حیرت آجاتی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک دفعہ ایک عورت نے دوسری عورت کو مارا اور اس کا دانت توڑ دیا۔ اسلامی شریعت کی رو سے ضروری تھا کہ اُس عورت کا بھی قصاص کے طور پر دانت توڑا جاتا۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ معاملہ پیش ہوا۔ وہ عورت جس نے دانت توڑا تھا اس کی طرف سے حضرت انسؓ بطور وکیل پیش ہوئے۔ (بخاری کتاب التفسیر باب یایھا الذین امنوا کتب علیکم القصاص البقرۃ:۱۷۹)۔ اور انہوں نے کہا کہ بیشک قصاص کے طور پر اس کا بھی دانت توڑا جانا چاہیے مگر میں معافی کی درخواست کرتا ہوں اگر دوسرا فریق معاف کر دے تو یہ اس کا احسان ہوگا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دوسری عورت کے رشتہ داروں سے کہا کہ

بیشک شریعت نے تمہیں قصاص کا حق دیا ہے۔لیکن اگر تم معاف کر دو تو اچھا ہے۔مگر دوسرے فریق پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ لوگ یہی کہتے چلے گئے کہ دانت کے بدلے جب تک دانت نہ توڑا جائے گا ہم نہیں ٹلیں گے۔آخر حضرت ابوہریرہؓ کو جوش آ گیا۔اورانہوں نے کہا۔خدا کی قسم میری رشتہ دار عورت کا دانت نہیں توڑا جائے گا یہ الفاظ انہوں نے ایسے جوش سے کہے کہ وہ لوگ جو اس بارہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش بھی نہیں مان رہے تھے۔ ڈر گئے اور انہوں نے کہا۔ یارسول اللہ! ہم نے معاف کیا۔اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے بال بکھرے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کے جسم غبار آلود ہوتے ہیں مگر جب وہ کسی معاملہ میں خدا تعالیٰ کی قسم کھالیں تو خدا تعالیٰ ان کے متعلق اپنی غیرت دکھلاتا اور اس بات کو پورا کر دیتا ہے جس کے لئے وہ قسم کھاتے ہیں۔تو دیکھو حضرت ابوہریرہؓ نے جب خدا کی قسم کھا کر یہ کہا کہ میری اس رشتہ دار عورت کا دانت نہیں توڑا جائے گا تو وہ لوگ جو اس بارہ میں خود حضرت ابوہریرہؓ بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش بھی ماننے کے لئے تیار نہیں تھے یکدم ان کی طبیعت بدل گئی۔اور انہوں نے اپنا حق چھوڑ دیا۔پس مومنوں کو اس بات کی اہمیت سمجھنی چاہیے کہ انہیں ہمیشہ ایک دوسرے کو سمجھاتے رہنا چاہیے اور یہ کبھی خیال نہیں کرنا چاہیے کہ دوسرے کی اصلاح نہیں ہوسکتی۔اور اگر بالفرض دوسرے کی اصلاح نہ بھی ہو تو کم سے کم جو شخص دوسرے کو سمجھائے گا اس کی اپنی اصلاح تو ہو جائے گی۔ بہرحال دوسرے کو سمجھانا فائدہ کے بغیر نہیں ہوتا۔پس وعظ ونصیحت کا سلسلہ اپنے اندر بھی جاری کرنا چاہیے اور غیروں میں بھی جاری کرنا چاہیے۔ جہاں دوست ایک دوسرے کے ساتھ مل کر بیٹھیں ان کا فرض ہے کہ وہ ایک دوسرے کو نصیحت کرتے رہیں کہ سچ بولو۔معاملات میں صفائی رکھو۔گالی گلوچ سے کام نہ لو۔جھگڑا نہ کرو۔محبت اور پیار سے رہو۔جب اس قسم کے وعظ ونصیحت کا سلسلہ بند ہو جائے تو نئی پود کئی قسم کی غلطیوں میں مبتلا ہو جاتی ہے پرانے لوگ تو شیطان سے بہت سی لڑائیاں لڑ چکے ہوتے ہیں۔اور ان کے اندر نیکی اور تقویٰ پیدا ہو چکا ہوتا ہے۔مگر نئی پود نے وہ لڑائی نہیں کی ہوتی اس لئے شیطان ان کے اندر آسانی سے داخل ہو جاتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے آدمؑ اور شیطان کا قصہ اسی لئے بیان کیا ہے کہ ذرا سی غفلت بھی بہت بڑے نقصان کا موجب ہو جاتی ہے۔اگر آدمؑ جو شیطان کے ساتھ دیر سے جنگ کرتا چلا آ رہا تھا۔دھوکا کھا سکتا ہے تو جن سے شیطان کی ابھی جنگ ہی نہیں ہوئی وہ تو اس کے فریب میں بہت جلد آ سکتے ہیں۔آدمؑ اسی لئے شیطان کے دھوکا میں آیا کہ شیطان مذہب کا لبادہ اوڑھ کر آدمؑ کے سامنے آیا اور حضرت آدمؑ نے سمجھا کہ اب اس کی اصلاح ہو چکی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس کے ساتھ صلح کر لی۔ اور نتیجہ خراب نکلا۔مگر جس شخص نے شیطان سے ابھی لڑائی شروع ہی نہیں کی۔اس کے سامنے اگر شیطان بزرگ بن

کر آ جائے تو وہ جلدی دھوکا کھا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اس قصہ کے بیان کرنے سے یہی منشاء ہے کہ جب آدمؑ شیطان کو دیکھ کر دھوکا کھا گیا تو وہ لوگ جو ابھی شیطان کے ہتھکنڈوں سے واقف ہی نہیں وہ اس کی طرف سے کیسے مطمئن ہو سکتے ہیں۔ پس موجودہ اور آئندہ نسلوں کو شیطان کے حملوں سے بچانے کے لئے اسلام یہ نصیحت کرتا ہے کہ تم اپنے اندر بھی وعظ و نصیحت کا سلسلہ جاری رکھو اور بیرونی دنیا کو بھی ہمیشہ خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچاتے رہو تا کہ شیطان ذریّتِ آدمؑ کو گمراہ کرنے سے ہمیشہ کے لئے مایوس ہو جائے۔ بہر حال عاد کی قوم نے ہودؑ کی نصیحتوں پر کوئی کان نہ دھرا اور اس کو جھٹلا دیا۔ جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہلاک کر دیا۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً۔ وَمَا کَانَ اَکْثَرُھُمْ مُّؤْمِنِیْنَ وَاِنَّ رَبَّکَ لَھُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ۔ فرماتا ہے انہوں نے تو بڑے بڑے مکانات بنا کر اپنا نشان قائم کیا تھا مگر ہم نے ان کی بستیاں مٹا کر ایک نشان قائم کر دیا۔ لیکن اس نشان کا ہود کی قوم کو کیا فائدہ پہنچا۔ وہ تباہ ہو گئی اور بعد میں آنے والوں کے لئے ایک عبرت کا نشان قائم کر گئی۔

کَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۴۲﴾ۚۖ اِذْ قَالَ لَھُمْ اَخُوْھُمْ

ثمود نے بھی رسولوں کو جھٹلایا تھا۔ جب کہ انہیں ان کے بھائی صالحؑ نے کہا تھا کہ کیا تم تقویٰ نہیں کرتے؟

صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۴۳﴾ۚ اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ﴿۱۴۴﴾ۙ فَاتَّقُوا

میں تمہاری طرف ایک امانت دار پیغامبر بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ پس اللہ (تعالیٰ) کا تقویٰ اختیار کرو

اللّٰہَ وَاَطِیْعُوْنِ ﴿۱۴۵﴾ۚ وَمَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ

اور میری اطاعت کرو۔ اور میں اس کام پر تم سے کوئی اُجرت طلب نہیں کرتا میری اُجرت تو

اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۴۶﴾ؕ اَتُتْرَکُوْنَ فِیْ مَا ھٰھُنَآ

رب العالمین کے ذمہ ہے (جس نے مجھے بھیجا ہے) کیا (تم خیال کرتے ہو کہ) جو کچھ اس (دنیا) میں ہے

اٰمِنِیْنَ ﴿۱۴۷﴾ۙ فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ ﴿۱۴۸﴾ۙ وَّزُرُوْعٍ وَّنَخْلٍ طَلْعُھَا

تمہیں اسی میں ان کے ساتھ (زندگی بسر کرتے ہوئے) چھوڑ دیا جائے گا۔ یعنی باغات اور چشموں میں۔

هَضِيْمٌ ۝۱۴۹ وَ تَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ ۝۱۵۰

اور لہلہاتے کھیتوں میں اور کھجوروں میں جن کے پھل بوجھ کی وجہ سے ٹوٹے جا رہے ہوں۔ اور تم لوگ پہاڑ

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ۝۱۵۱ وَ لَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝۱۵۲

کھود کھود کر (اپنی بڑائی پر) اِتراتے ہوئے گھر بناتے ہو۔ پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔

الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَ لَا يُصْلِحُوْنَ ۝۱۵۳

اور حد سے بڑھ جانے والے لوگوں کی باتوں کو مت مانو۔ وہ لوگ جو ملک میں فساد کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔

حلّ لُغات۔ طَلْعٌ طَلْعٌ مِّنَ النَّخْلِ کے معنے ہیں شَیْءٌ یَخْرُجُ کَاَنَّہٗ نَعْلَانِ مُطْبَقَانِ۔ کھجور کا خوشہ جس کے اندر پھل پیدا ہوتا ہے۔ (اقرب)

هَضِيْمٌ نَخْلٌ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ دَاخِلٌ بَعْضُهَا فِيْ بَعْضٍ کَاَنَّمَا شُدِخَ۔ وہ خوشہ جس کا ایک حصہ دوسرے کے اندر داخل ہو۔ (اقرب)

تَنْحِتُوْنَ تَنْحِتُوْنَ نَحَتَ سے مضارع جمع مخاطب کا صیغہ ہے اور نَحَتَ الْحَجَرَ کے معنے ہیں سَوَّاہُ وَاَصْلَحَہٗ پتھر کو گھڑ کر ٹھیک کیا۔ اور نَحَتَ الْجَبَلَ کے معنے ہیں حَفَرَہٗ۔ پہاڑ کو کھودا۔ (اقرب) پس تَنْحِتُوْنَ کے معنے ہوں گے۔ تم کھودتے ہو۔

فَارِهِيْنَ فَارِهِيْنَ فَارِہٌ سے جمع کا صیغہ ہے اور اَلْفَارِہُ کے معنے ہیں اَلْحَاذِقُ بِالشَّیْءِ۔ کسی کام کا ماہر۔ (اقرب)

تفسیر۔ فرماتا ہے۔ عاد کے بعد ثمود کی قوم آئی اور ان میں صالح ؑ نبی آیا۔ اس نے بھی اپنی قوم کو تقویٰ کی نصیحت کی۔ اور بتایا کہ میں تم سے اس تعلیم کے بدلہ میں کچھ مانگتا نہیں۔ میری مزدوری میرا خدا دے گا۔ تم جن مادی ترقیات پر خوش ہو وہ قائم نہیں رہیں گی۔ نہ یہ باغات رہیں گے۔ نہ چشمے۔ نہ کھیتیاں۔ نہ کھجوریں جن کے خوشے ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑتے ہیں۔ تم لوگ بڑے فخر سے پہاڑ کھود کھود کر مکان بناتے ہو مگر عزت حاصل کرنے کا یہ طریق نہیں۔ عزت حاصل کرنے کا طریق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو اور جو لوگ حد سے نکل جانے والے ہیں اُن کی فرمانبرداری مت کرو۔ اسی طرح وہ لوگ جو زمین میں فساد کرتے ہیں اور اصلاح

نہیں کرتے ان کے پیچھے مت رہو۔

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم ثمود عاد کی قائم مقام تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ (الاعراف:۷۵) یعنی اس وقت کو یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں عاد کے بعد ان کا قائم مقام بنایا۔ فتوح الشام کا مصنف ابواسمٰعیل لکھتا ہے کہ ثمود کی قوم بصریٰ سے لے کر جو شام کا ایک شہر ہے عدن تک پھیلی ہوئی تھی اور وہیں ان کی حکومت تھی۔ یونانی تاریخوں میں بھی ثمود کا ذکر آتا ہے اور انہوں نے اس کا ذکر مسیحؑ کے زمانہ کے قریب کیا ہے اور حجر کو اس کا مرکزی مقام بتایا ہے جو اس قوم کا دارالحکومت معلوم ہوتا ہے۔ یہ مقام مدینہ منوّرہ اور تبوک کے درمیان تھا۔ اور اس علاقہ میں اس قوم کا بڑا زور تھا۔

اَتُتْرَكُوْنَ فِیْ مَا هٰهُنَآ اٰمِنِیْنَ۔ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍ۔ وَّ زُرُوْعٍ وَّ نَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِیْمٌ سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم ثمود کا ملک چشموں اور باغات والا تھا۔ وہاں کھجوریں بھی اچھی قسم کی ہوتی تھیں اور زراعت بھی خوب ترقی پر تھی۔ اسی طرح وَ تَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا فٰرِهِیْنَ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم کو سنگ تراشی میں کمال حاصل تھا۔ چنانچہ پرانے آثار سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ شہروں کے شہر پہاڑوں کی کھوہ میں بناتے چلے گئے تھے۔ حتّٰی کہ بعض جگہ انہوں نے پتھر کاٹ کاٹ کر عجیب و غریب محل بنا لئے تھے مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ اس کے سوا اُن کے اور کسی قسم کے مکان نہیں ہوتے تھے بلکہ اس سے ان کی خاص عمارتوں کی طرف اشارہ ہے جس سے ان کے تمدن کی ترقی ظاہر ہوتی ہے۔ اسی طرح پہاڑ کھود کھود کر اپنی رہائش کے لئے مکانات اور شہر بنانے میں اس طرف بھی اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم سال کا کچھ حصہ پہاڑوں پر سیر و تفریح کے لئے بسر کرتی تھی مگر اس کے باوجود کسی کو ان کے ملک پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ اس قوم نے بھی حضرت صالحؑ کا انکار کیا اور ان کی باتوں پر کان نہ دھرا۔ چنانچہ حضرت صالحؑ کے سمجھانے پر اس قوم نے جو جواب دیا اس کا قرآن کریم اگلی آیات میں ذکر فرماتا ہے۔

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِیْنَ ﴿۱۵۴﴾ مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ

اس پر وہ (لوگ جو کافر تھے) بولے۔ تجھ کو صرف کھانا دیا جاتا ہے۔ تُو ہماری طرح کا ایک آدمی ہے۔

مِّثْلُنَا ۚۖ فَاْتِ بِاٰیَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۱۵۵﴾ قَالَ

پس اگر تو سچا ہے تو کوئی نشان ظاہر کر۔ اُس نے کہا۔ یہ ایک اونٹنی ہے ایک دن

هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّ لَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۱۵۶﴾ وَ لَا

اس کے لئے گھاٹ پر پانی پینا مقرر ہے اور ایک دن تمہارے لئے گھاٹ سے

تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵۷﴾

پانی لینا مقرر ہے۔ اور تم اس (اونٹنی) کو کوئی نقصان نہ پہنچانا ورنہ ایک بڑے دن کا عذاب تم کو آ پکڑے گا۔

فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ ﴿۱۵۸﴾ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ؕ اِنَّ

(یہ سن کر بھی) انہوں نے اس اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں اور (پھر) شرمندہ ہو گئے۔ تب ان کو

فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۹﴾ وَ اِنَّ

(موعود) عذاب نے آ پکڑا۔ اس میں یقیناً ایک بہت بڑا نشان تھا۔ لیکن ان میں سے اکثر

رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۰﴾ ع

ع ۸ ۱۹ ۱۲

مومنوں میں شریک نہ ہوئے۔ اور تیرا رب یقیناً غالب (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔

حلّ لُغات۔ عَقَرُوْهَا عَقَرَہٗ کے معنے ہیں جَرَحَہٗ۔ اُس کو زخمی کر دیا۔ نَحَرَہٗ اس کو ذبح کیا۔ اور جب اونٹ کے متعلق یہ لفظ استعمال کریں اور کہیں کہ عَقَرَ الْاِبِلَ تو معنے ہوں گے قَطَعَ قَوَائِمَهَا بِالسَّيْفِ اس کی ٹانگیں کاٹ ڈالیں۔ (اقرب) پس عَقَرُوْهَا کے معنے ہوں گے انہوں نے اونٹنی کی ٹانگیں کاٹ ڈالیں۔

تفسیر۔ حضرت صالح علیہ السلام نے جب انہیں نصیحت کی تو انہوں نے جواب میں کہا کہ اے صالحؑ! ہمیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تجھے کھانا دیا جا رہا ہے۔ یعنی ہمیں تباہ کرنے کے لئے کوئی غیر حکومت تجھے رشوت دے رہی ہے۔ ہر نبی کے وقت میں ایسا ہی ہوا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی مخالف کہتے تھے کہ بعض اور لوگ اس کی مدد کر رہے ہیں۔ اور بانی سلسلہ احمدیہ کے وقت میں بھی لوگ یہی کہتے تھے کہ انگریز ان کو روپیہ دے کر مسلمانوں کے خلاف کھڑا کر رہے ہیں۔

مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا۔ آخر تجھے کیا لال لگے ہوئے ہیں تو ہمارے جیسا ایک آدمی ہی ہے نا۔ اگر ایسا نہیں اور تو واقعہ میں اپنے دعویٰ میں سچا ہے تو جو نشان تیرے پاس ہے وہ لے آ۔ حضرت صالح علیہ السلام نے جواب

میں کہا کہ لو یہ میری اونٹنی ہے۔ چشمہ پر تم اکٹھے ہوتے ہو تو فساد ہوتا ہے۔ اب تمہارے امتحان کے لئے یہ نشان مقرر کیا جاتا ہے کہ ایک دن یہ پانی پیئے گی اور ایک دن تم پانی پی لینا یعنی اپنے جانوروں کو پانی پلانا اور اپنے لئے بھی پانی لے لینا اور اس کو کوئی تکلیف نہ دینا اگر تم اس کے خلاف عمل کرو گے تو تم کو ایک بڑے دن کا عذاب پکڑ لے گا۔ انہوں نے اس اونٹنی کے پاؤں کاٹ دیئے۔ مگر بعد میں شرمندہ ہو گئے۔

لوگ ان آیات سے اونٹنی کی خصوصیات نکالنا شروع کر دیتے ہیں۔ بلکہ بعض مفسرین نے تو عجیب وغریب قصے بھی بیان کر دئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ لوگ حضرت صالح علیہ السلام کے پاس آئے اور انہوں نے کہا کہ ہم تو تب مانیں گے جب فلاں پہاڑ سے اونٹنی پیدا کر دو۔ انہوں نے دعا کی تو پہاڑ میں سے اونٹنی نکل آئی اور پھر اسی وقت اس اونٹنی نے اپنے جیسا ایک بچہ بھی جن دیا۔ (تفسیر جلالین و درمنثور سورۃ اعراف قولہ تعالیٰ والی مدین اخاھم شعیبا۔۔ الی قولہ تعالیٰ ولکن لا تحبون الناصحین) مگر یہ سب لغو باتیں ہیں جن کا قرآن کریم سے کوئی تعلق نہیں۔ قرآن کریم اس اونٹنی کی پیدائش کو نشان قرار نہیں دیتا بلکہ اس کی آزادی کو نشان قرار دیتا ہے اور فرماتا ہے کہ اگر کفار نے اس اونٹنی کو دکھ پہنچایا تو وہ عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے۔ مگر اس لئے نہیں کہ وہ اونٹنی اپنی ذات میں کوئی اہمیت رکھتی تھی بلکہ اس لئے کہ حضرت صالحؑ اس اونٹنی پر چڑھ کر سارے ملک میں تبلیغ کیا کرتے تھے۔ اُس زمانہ میں موٹر نہیں تھے نہ ریل اور ہوائی جہاز وغیرہ ایجاد ہوئے تھے۔ سفر کا ذریعہ صرف اونٹنی تھی جس پر سوار ہو کر حضرت صالحؑ خدا تعالیٰ کا پیغام لوگوں تک پہنچاتے تھے۔ چونکہ مخالف ان کی اس تبلیغی تگ ودو کو پسند نہیں کرتے تھے اس لئے لازماً وہ آپ کے تبلیغی سفروں میں روک ڈالتے ہوں گے اور آپ کو ادھر اُدھر ہونے نہیں دیتے ہوں گے۔ جب ان کی شوخیاں اور شرارتیں حد سے گزر گئیں تو اللہ تعالیٰ نے اس اونٹنی کو ان کے لئے ایک نشان قرار دے دیا اور فرمایا کہ تم صالح کی اونٹنی کو اِدھر اُدھر پھرنے دو اور اس کی تبلیغی مساعی میں روک مت بنو۔ ورنہ خدا تعالیٰ کے عذاب کا مورد بن جاؤ گے انہوں نے اس انذار کو بھی ایک مجنونانہ بڑ خیال کیا اور تمرّد اور سرکشی سے کام لیتے ہوئے اس اونٹنی کے پاؤں کاٹ دیئے۔ جس کے معنے یہ تھے کہ انہوں نے خدا تعالیٰ کو چیلنج کیا اور کہا کہ ہم اپنے ملک میں تیرے نام کو بلند کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ جب انہوں نے خدا تعالیٰ کے لئے اپنے ملک کے دروازے بند کر دیئے تو اللہ تعالیٰ نے بھی اس ملک کے دروازے ان کے لئے بند کر دیئے۔ اور اس نے انہیں اپنی قہری تلوار کا نشانہ بنا دیا۔ بیشک عذاب کو دیکھ کر آخر میں وہ شرمند بھی ہوئے۔ مگر اس وقت شرمندگی کا کیا فائدہ تھا۔ فرماتا ہے اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً۔ وَمَا کَانَ اَکْثَرُھُمْ مُّؤْمِنِیْنَ اس واقعہ میں بھی ایک بڑا بھاری نشان ہے جو آئندہ آنے والی نسلوں کو یہ سبق دیتا ہے

کہ الٰہی جماعتوں کے تبلیغی راستہ میں روڑے اٹکانا اور خدا تعالیٰ کے نام بلند کرنے کی اجازت نہ دینا قوموں کو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا مستحق بنا دیتا ہے۔ مگر یہ چیز تو بعد میں آنے والے لوگوں کے لئے صرف درس عبرت کا کام دے رہی ہے۔ خود اس قوم کی اکثریت ایمان سے محروم رہی مگر یہ قوم بھی اپنی ہلاکت اور بربادی سے خدا تعالیٰ کے عزیز اور رحیم ہونے کو ثابت کر گئی۔ اُس نے چاہا تھا کہ صالحؑ مغلوب ہو مگر خدا اور اس کا رسول ہی غالب آئے۔ اور پھر اس نے چاہا تھا کہ صالحؑ کی تبلیغی مساعی رنگ نہ لائیں اور خدا اور اس کے رسول کا نام دنیا میں نہ پھیلے مگر خدا تعالیٰ کی رحیمیت نے حضرت صالحؑ کی تبلیغی کوششوں میں برکت ڈالی اور ان کے انفاسِ قدسیہ سے ایک ایسی جماعت تیار ہو گئی جس نے خدا تعالیٰ کے نور کی قندیلیں اپنے سینوں میں روشن کیں اور بھولی بھٹکی دنیا کے لئے ہادی اور راہنما بن گئی۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ِۣالْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٦١﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ

لوطؑ کی قوم نے بھی رسولوں کا انکار کیا۔ جب کہ ان کے بھائی لوط نے کہا کہ کیا تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے؟

لُوْطٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿١٦٢﴾ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿١٦٣﴾ فَاتَّقُوا

میں تمہاری طرف ایک امانت دار پیغامبر بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ پس اللہ (تعالیٰ) کا تقویٰ اختیار کرو

اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿١٦٤﴾ وَ مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ

اور میری اطاعت کرو۔ اور میں اس (کام) کے بدلہ میں تم سے کوئی اُجرت نہیں مانگتا۔

اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٦٥﴾ اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ

میرا بدلہ تو صرف ربّ العالمین کے ذمہ ہے۔ کیا تمام مخلوقات میں سے تم نے نروں کو اپنے لئے چُنا ہے۔

الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٦٦﴾ وَ تَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ

اور تم ان کو چھوڑتے ہو جن کو تمہارے ربّ نے تمہاری بیویوں کی حیثیت سے پیدا کیا ہے (صرف یہی نہیں کہ تم ایسا

اَزْوَاجِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ ﴿۱۶۷﴾

فعل کرتے ہو)۔ بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) تم (انسانی فطرت کے) تقاضوں کو ہر طرح توڑنے والی قوم ہو۔

تفسیر۔فرماتا ہے۔لوط ؑ کی قوم نے بھی رسولوں کا انکار کیا۔اس جگہ بھی لوط ؑ کے لئے مرسلین کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ لوطؑ اپنے زمانہ میں باقی نبیوں کی طرح سب رسولوں کا قائم مقام تھا اور اس کا انکار درحقیقت سب نبیوں کا انکار تھا لوطؑ نے بھی اپنی قوم سے کہا کہ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک رسول امین کی حیثیت میں تمہاری طرف آیا ہوں۔تم اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری سنو تا کہ تم نجات پاؤ۔ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔میرا اجر صرف رب العالمین خدا کے ذمہ ہے۔میں تو اس لئے آیا ہوں کہ تمہیں برائیوں سے بچنے کی نصیحت کروں۔اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی طرف توجہ دلاؤں۔تم میں یہ ایک بڑی خرابی پائی جاتی ہے کہ تم مردوں سے جنسی تعلقات قائم کرتے ہو اور اللہ تعالیٰ نے تسکین جذبات اور باہمی مودّت والفت کے قیام کے لئے جو مرد وعورت کے تعلقات کا سلسلہ قائم کیا ہے اس کو پسِ پُشت ڈال رہے ہو۔یہ چیز بتا رہی ہے کہ تم انسانی فطرت کے تقاضوں کو توڑنے والی قوم ہو۔

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ ﴿۱۶۸﴾

انہوں نے کہا۔اے لوطؑ! اگر تو باز نہ آیا تو تُو ملک بدر کئے جانے والوں میں شامل ہو جائے گا۔اُس

قَالَ اِنِّيْ لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِيْنَ ﴿۱۶۹﴾ؕ رَبِّ نَجِّنِيْ وَ اَهْلِيْ

(یعنی لوط ؑ) نے کہا (بہرحال) میں تمہارے عمل کو نفرت سے دیکھتا ہوں۔اے میرے ربّ! مجھے اور

مِمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۷۰﴾

میرے اہل کو ان کے اعمال سے نجات دے۔

حلّ لُغَات۔ قَالِيْنَ قَالِيْنَ قَلٰی سے اسم فاعل جمع کا صیغہ ہے اور قَلٰی فُلَانًا کے معنے ہیں اَبْغَضَهٗ وَ كَرِهَهٗ غَايَةَ الْكَرَاهَةِ فَتَرَكَهٗ۔کسی کو ناپسند کیا اور ناپسندیدگی کے بنا پر چھوڑ دیا۔(اقرب)

تفسیر ۔انہوں نے لوطؑ کی نصیحتوں سے تنگ آ کر اسے دھمکی دی کہ اگر تو باز نہ آیا تو ہم تجھے اپنے ملک سے نکال دیں گے۔لوطؑ نے کہا! بے شک نکال دو۔ میں تمہارے اعمال کو بڑی نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور خدا تعالیٰ سے دعا کی کہ خدایا مجھ کو اور میرے خاندان کو ان کے برے اعمال سے بچائیو۔

اس آیت میں ایک تو یہ سبق دیا گیا ہے کہ عذاب ظاہری سے نجات مانگنی اتنی اہم نہیں جتنی کہ عملِ بد سے نجات مانگنی اہم ہے۔ اور دوسرا سبق یہ دیا گیا ہے کہ نفرت ہمیشہ برے اعمال سے رکھنی چاہیے نہ کہ گمراہ اور خطا کار انسان کو بھی قابلِ نفرت سمجھنا چاہیے ۔ اصلاح اخلاق کے سلسلہ میں یہ ایک نہایت ہی اہم نکتہ ہے جس پر اسلام نے خصوصیت سے زور دیا ہے اور بد اور بدی میں فرق کیا ہے۔ وہ یہ تو کہتا ہے کہ برائی کو دور کرو مگر وہ یہ نہیں کہتا کہ برائی کو دور کرنے کے ساتھ ہی بد کو مٹا ڈالو۔ بلکہ وہ ان دونوں میں ایک حد قائم کرتا اور اس کو ملحوظ رکھنے کی تاکید کرتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (المائدة:۳) کسی قوم کی دشمنی تمہاری آنکھوں پر ایسا پردہ نہ ڈال دے کہ تم اس کے متعلق ناانصافی اور ظلم پر اُتر آوَ۔تمہارا کام یہ ہے کہ تم اس کے متعلق بھی عدل وانصاف کی حدود کا خیال رکھو ورنہ تقویٰ کے مقام سے تم اپنے آپ کو گرانے والے ہوگے۔ گویا اسلام دشمن کی قابلِ نفرت حرکات سے تو بیزاری کی تعلیم دیتا ہے مگر دشمن کی دشمنی رکھنے سے منع کرتا ہے۔ پھر فرماتا ہے لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ لَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ (الممتحنة:۹) وہ لوگ جو تمہارے دین کے مخالف تو ہیں مگر تمہیں اپنے مظالم کا تختۂ مشق بنا کر تمہیں جبراً اپنے دین سے منحرف کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ نہ تمہیں اپنے وطن سے بے وطن کرتے ہیں ان کے ساتھ نیکی اور حسنِ سلوک کرنے اور ان کے معاملات میں عدل وانصاف سے کام لینے سے اللہ تعالیٰ تمہیں ہرگز نہیں روکتا تمہارا کام یہ ہے کہ تم ان سے نیکی کرو۔ اور ان کے معاملات میں بھی انصاف کا پورا پورا خیال رکھو۔غرض اسلام بنی نوع انسان کو نصیحت کرتا ہے کہ اگر کسی فرد یا قوم کو تم تقویٰ وطہارت کے خلاف عمل کرتا دیکھو تو اس کے فعل سے تو نفرت کرو مگر اس فرد یا قوم کی خیر خواہی کا جذبہ اپنے دل سے کبھی مٹنے نہ دو۔ کیونکہ اگر یہ جذبہ مٹ گیا تو تم ان کی اصلاح سے بھی غافل ہو جاوَ گے ۔حضرت لوط علیہ السلام نے بھی اسی اخلاقی کمال کا مظاہرہ کیا اور فرمایا کہ میں تمہاری اصلاح کے لئے تو رات دن کوشش کر رہا ہوں لیکن تمہارے گندے افعال سے مجھے شدید نفرت ہے۔اس قدر نفرت کہ میں اللہ تعالیٰ سے بھی دعا کرتا رہتا ہوں کہ وہ مجھے بھی اور میرے تمام جسمانی اور روحانی اہل کو بھی ان برائیوں سے محفوظ رکھے مگر تعجب ہے کہ وہی لوط ؑ جن کے اخلاقی کمال کی قرآن کریم نے اس قدر تعریف کی ہے اور جن کے متعلق اس نے

دوسری جگہ یہ خبر دی ہے کہ اَدْخَلْنٰهُ فِیْ رَحْمَتِنَا (الانبیاء: ۷۶) ہم نے اُسے اپنے سایہ رحمت میں جگہ دی۔ اس پر بائیبل یہ نہایت ہی گندہ اور ناپاک الزام لگاتی ہے کہ اس نے اپنی لڑکیوں سے بدکاری کی۔ اور پھر ان لڑکیوں سے ناجائز بچے پیدا ہوئے (پیدائش باب ۱۹ آیت ۳۰ تا ۳۸) مگر پھر وہی بائیبل جو ایک طرف تو حضرت لوط ؑ اور ان کی پاک دامن بیٹیوں پر بدکاری کا الزام لگاتی اور ان کے بطن سے ناجائز بچوں کی ولادت کا اشتہار دیتی ہے دوسری طرف یہ بھی لکھتی ہے کہ اس حرامکاری کے نتیجہ میں ایک بیٹا موآب پیدا ہوا جو موآبیوں کا باپ بنا۔ اور دوسرا بیٹا بن عمی پیدا ہوا جو بنی عمون کا باپ بنا۔ گویا ایک طرف تو وہ حضرت لوط ؑ اور ان کی بیٹیوں پر الزام لگاتی ہے اور دوسری طرف یہ کہتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے ان بچوں پر ایسا فضل کیا کہ وہ دو بڑے بڑے خاندانوں کے بانی قرار پائے اور خدا تعالیٰ نے ان سے ایک لمبا سلسلہ نسل جاری کر دیا۔ اگر حضرت لوطؑ ایسے ہی اخلاق کے حامل ہوتے جس قسم کے اخلاق بائیبل ان کی طرف منسوب کرتی ہے تو کیا اللہ تعالیٰ ان کی نسل کو ایسی ہی برکت دیتا جیسی بائیبل کے بیان کے مطابق انہیں دی گئی۔ پس بائیبل کا اپنا بیان جو خدا تعالیٰ کی ایک فعلی شہادت پر مشتمل ہے اس کے بیان کردہ الزام کو جھوٹا قرار دے رہا ہے۔ اور پھر قرآن کریم جو ایک کتاب مبین کی شکل میں نازل ہوا تھا اُس نے کھلے لفظوں میں بتا دیا کہ لوط ؑ ہمارے مقربین میں سے تھا اور وہ ان تمام گندے اور ناجائز افعال سے منزّہ تھا جن میں اس کی قوم گرفتار تھی۔ بلکہ وہ اللہ تعالیٰ سے بھی دعائیں کرتا رہتا تھا کہ وہ اس کی مدد کرے۔ اور اسے اور اس کے اہل کو ان برائیوں سے ہمیشہ محفوظ رکھے۔

فَنَجَّيْنٰهُ وَ اَهْلَهٗۤ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ اِلَّا عَجُوْزًا فِی

پس ہم نے اس کو۔ اور اس کے اہل کو سب ہی کو نجات دی۔ سوائے ایک بڑھیا کے جو پیچھے رہنے والوں

الْغٰبِرِيْنَ ﴿۱۷۲﴾ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۱۷۳﴾ وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ

میں شامل ہو گئی۔ پھر (لوطؑ کو نجات دینے کے بعد) سب دوسروں کو ہم نے ہلاک کر دیا۔ اور ہم نے

مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۱۷۴﴾ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَ

ان پر (پتھروں کی) بارش برسائی۔ اور جن کو (خدا کی طرف سے) ہوشیار کر دیا جاتا ہے (لیکن پھر بھی باز

مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۵﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ

نہیں آتے) ان پر برسائی جانے والی بارش بہت بری ہوتی ہے۔اس واقعہ میں یقیناً ایک بڑا نشان تھا لیکن ان

الرَّحِيْمُ ﴿۱۷۶﴾ ع

ع ۹ ۱۶ ۱۳

(کفار) میں سے اکثر پھر بھی مومن نہ بنے۔ تیرا ربّ یقیناً وہ ہے جو غالب (اور) بار بار کرم کرنے والا ہے۔

حلّ لُغات۔ عَجُوْزًا اَلْعَجُوْزُ اَلْمَرْأَةُ الْمُسِنَّةُ لِعَجْزِهَا عَنْ أَكْثَرِ الْاُمُوْرِ۔ بڑھیا عورت۔ اور بڑھیا عورت کو عجوز کا نام دینے میں یہ حکمت ہے کہ اکثر امور سرانجام دینے سے وہ عاجز ہوتی ہے۔(اقرب)

غَابِرِيْنَ غَابِرِيْنَ غَبَرَ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے اور غَبَرَ کے معنے ہیں۔ مَكَثَ وَبَقِيَ۔ ٹھہر گیا اور رہ پڑا (اقرب) نیز اَلْغِبْرُ کے معنے ہیں اَلْحِقْدُ۔ کینہ (اقرب) پس غَابِر کے معنے ہوں گے۔ پیچھے رہنے والا اور کینہ رکھنے والا۔

تفسیر۔ فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا کو سن کر اس کو اور اس کے تمام خاندان کو تو بچا لیا مگر اس کی بڑھیا بیوی عذاب کا شکار ہوگئی۔ کیونکہ وہ غابرین میں سے تھی۔ لُغت میں غِبْر کے ایک معنے اَلْحِقْدُ یعنی کینہ کے بھی لکھے ہیں (اقرب) پس غَابِرِيْن کا لفظ استعمال فرما کر اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ حضرت لوطؑ کی بیوی ان لوگوں میں سے تھی جو حضرت لوطؑ کی تعلیم سے کینہ اور بغض رکھتے تھے۔ اور آپ کی مخالفت کے درپے رہتے تھے اس لئے جب عذاب آیا تو وہ بھی اُنہی لوگوں کے ساتھ شامل کر دی گئی۔ بائبل نے اس مقام پر یہ بیان کیا ہے کہ حضرت لوطؑ کی بیوی بھی بچائے جانے والے لوگوں میں شامل تھی بلکہ لکھا ہے کہ فرشتوں نے اس کا اور اس کی جورو کا اور اس کی دونوں بیٹیوں کا ہاتھ پکڑا کیونکہ خداوند کی مہربانی اس پر ہوئی اور اسے نکال کر شہر سے باہر پہنچا دیا۔ (پیدائش باب ۱۹ آیت ۱۶) مگر پھر بائبل ہی بیان کرتی ہے کہ جاتی دفعہ اس نے پیچھے پھر کے دیکھا اور وہ نمک کا کھمبا بن گئی۔ (پیدائش باب ۱۹ آیت ۲۶) اوّل تو جیتے جاگتے انسان کا محض پیچھے مڑ کر دیکھنے کی وجہ سے نمک کا کھمبا بن جانا ایک ایسا امر ہے جو بائبل کے معتقدین کے نزدیک تو ممکن ہے قابلِ تسلیم ہو۔ مگر کوئی اور شخص اس خوش اعتقادی کا قائل نہیں ہوسکتا۔ دوسرے جب اللہ تعالیٰ کا منشاء یہی تھا کہ ان کی بیوی عذاب سے محفوظ رہے تو اسے نمک کا کھمبا کیوں بنا دیا اسی طرح جب خدا تعالیٰ کو معلوم تھا کہ اس عورت نے دس بیس قدم کے بعد پھر تباہ ہونا ہے تو اسے پکڑ کر باہر نکالنے کے کیا معنے تھے؟ بائبل کے یہ متضاد بیانات بتا رہے ہیں کہ انسانی دست بُرد نے اس کی روایات کو انتہائی مخدوش بنا دیا ہے۔

سچی بات وہی ہے جو قرآن کریم نے بیان کی کہ حضرت لوطؑ کی بیوی آپ کے مخالف گروہ سے تعلق رکھتی تھی اسی لئے جب عذاب آیا تو وہ بھی اس کی لپیٹ میں آ گئی۔ چنانچہ فرماتا ہے ہم نے ان پر پتھروں کی بارش برسائی (پتھروں کا ذکر سورۂ حجر ع ۵ میں کیا گیا ہے) یعنی ایک سخت زلزلہ آیا جس سے ان کی زمین جو پتھریلی تھی پہلے نیچے سے اٹھ کر اوپر آئی اور پھر اوپر سے نیچے گری۔ اور بجائے پانی کے اوپر سے پتھر برسے جس سے وہ تباہ ہو گئے۔ شدید زلزلوں میں ایسا ہی ہوتا ہے کہ ان سے زمین کے ٹکڑے اڑ کر پھر وہیں آ کر گرنے لگتے ہیں۔ فرماتا ہے۔ یہ بھی ایک نشان تھا مگر بعد میں آنے والے لوگوں کے لئے۔ وہ قوم تو پھر بھی ایمان نہ لا سکی۔

بائیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت لوطؑ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھائی حارانؔ کے بیٹے تھے اور اُور سے جو عراق کا ایک قصبہ تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ہی ہجرت کر کے فلسطین کی طرف چلے آئے تھے۔ اور پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے الگ ہو کر سدومؔ نامی ایک بستی میں رہنے لگے تھے۔ (پیدائش باب ۱۱ آیت ۲۷ و باب ۱۳ آیت ۱۲) اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کا ذکر کر کے مکہ والوں کو توجہ دلائی کہ اگر تم بھی اپنی شرارتوں سے باز نہ آئے تو لوطؑ کے دشمنوں جیسا سلوک تم سے بھی کیا جائے گا۔ چنانچہ جس طرح لوطؑ کی قوم پر پتھر برسے اسی طرح بدرؔ کی جنگ میں ان پر پتھر پڑے یعنی ایک نشان کے طور آندھی چلی جس کے نتیجہ میں کنکر اُڑ اُڑ کر کفار کی آنکھوں میں گھس گئے اور وہ مقابلہ کی طاقت کھو بیٹھے۔ جس کے نتیجہ میں ان کے بڑے بڑے صنادید بدرؔ کے میدان میں ہی ہلاک ہو گئے۔ (تاریخ الخمیس غزوۃ بدر الکبریٰ) اور قریش کی عظمت اور ان کے دبدبہ کا خاتمہ ہو گیا پھر معنوی طور پر بھی ان سے یہی سلوک ہوا۔ چنانچہ جس طرح سدوم کی بستی کے اوپر کے حصہ کو نیچے کر دیا۔ اسی طرح کفارِ مکہ کی عزتیں خاک میں مل گئیں۔ ان کے بڑے بڑے خاندان تباہ ہو گئے اور وہی بچے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آغوش میں پناہ گزیں ہوئے۔

كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْـَٔيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۷۷﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ

بَن کے رہنے والوں نے بھی رسولوں کا انکار کیا تھا۔ جب کہ ان سے شعیبؑ نے کہا

شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۸﴾ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۷۹﴾

کہ کیا تم تقویٰ نہیں کرتے۔ میں تمہاری طرف ایک امانت دار پیغامبر کی حیثیت سے آیا ہوں۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿۱۸۰﴾ وَ مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ

پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔ اور میں اس کام پر تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا۔

اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۸۱﴾ ؕ

میرا بدلہ صرف رب العالمین (خدا) کے ذمہ ہے۔

تفسیر۔ قومِ لوطؑ کے ذکر کے بعد اب اللہ تعالیٰ اصحاب الائیکہ کا ذکر فرماتا ہے اور بتاتا ہے کہ اصحاب الایکہ نے بھی رسولوں کا انکار کیا تھا۔ آیکہ کے معنے ایسے درخت کے ہوتے ہیں جس کی ٹہنیاں بہت پھیلی ہوئی ہوں یا اس جنگل کے ہوتے ہیں جس میں کثرت سے بیریاں اور پیلو کے درخت اُگے ہوئے ہوں۔ اور اَیْكٌ اس کی جمع ہے۔ اسی طرح عربی زبان کا ایک یہ بھی محاورہ ہے کہ فُلَانٌ فَرْعٌ مِنْ اَيْكَةِ الْمَجْدِ کہ فلاں شخص اَيْكَةُ الْمَجد کی ایک شاخ ہے۔ یعنی اَیْكٌ اعلیٰ خاندان کے لوگوں کو بھی کہتے ہیں (اقرب)۔ پس اصحاب الایکہ کے ایک معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اس میں کسی ایسے علاقہ کا ذکر ہے جس جگہ کے لوگ اپنے آپ کو بڑا خاندانی سمجھتے تھے اور چونکہ اگلی آیت یعنی اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ میں حضرت شعیبؑ کا ذکر ہے اور حضرت شعیبؑ مدین کے رہنے والے تھے جو عربوں کا ایک شہر ہے اور عرب اپنے آپ کو عبرانیوں سے زیادہ اچھی نسل کا سمجھتے تھے۔ اس لئے اس آیت کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ شعیبؑ کی قوم نے جو اپنے آپ کو بڑے خاندان میں سے سمجھتی تھی اپنے رسولوں کا انکار کیا۔ اسی طرح اس کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ شعیبؑ کی قوم نے جو ایک گھنے جنگل کی مالک تھی اپنے رسولوں کا انکار کیا۔ دوسری جگہ قرآن کریم نے حضرت شعیبؑ کو مدیَن کا رسول قرار دیا ہے جیسا کہ فرماتا ہے وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا (ھود:۸۵) ہم نے مدین کی طرف ان کے بھائی شعیبؑ کو رسول بنا کر بھیجا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدیَن کے باشندے ہی اصحاب الایکہ کہلاتے تھے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا واقعہ میں مدیَن کے پاس کوئی ایسا جنگل تھا جس میں بیری اور پیلو کے درخت بکثرت پائے جاتے ہوں۔ سو اس بارہ میں ایک یونانی جغرافیہ نویس کے حوالہ سے مسٹر برٹن نے اپنی کتاب ''گولڈ مائنز آف مدین'' میں لکھا ہے کہ خلیج عقبہ کے پیچھے نباتات اور اشجار کے سوا کچھ نہیں ہوتا جو انسانی قدوقامت کے برابر ہوتے ہیں اور جن کی وجہ سے ہرنوں کے گلّے۔ جنگلی اونٹ اور بارہ سنگھے وہاں کثرت سے رہتے ہیں اسی طرح مویشی اور بھیڑوں کے گلّے بھی (ارض القرآن جلد دوم صفحہ ۲۳، ۲۴) اس تاریخی

شہادت سے ظاہر ہے کہ مدیؔن کے پاس جو خلیج عقبہ کے سر پر واقع تھا ایک بڑا جنگل تھا جس میں قدِ آدم درخت تھے۔ اور پیلو اور جنگلی بیر قد آدم ہی ہوتے ہیں۔ وہاں جنگلی اونٹ رہتے تھے یہ بھی پیلو اور بیر کے درختوں کی موجودگی کا ثبوت ہے کیونکہ اونٹ اسی قسم کے درختوں پر گزارہ کرتے ہیں۔ مویشیوں اور بھیڑوں کے گلّوں کا ذکر بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ مدیؔن کی قوم اسی جنگل میں اپنے جانور چرایا کرتی تھی۔ یہ قوم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے مدیؔن کی اولاد تھی جوان کی بیوی قتورؔہ کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے (پیدائش باب ۲۵ آیت ۱ تا ۴) اور انہی کے نام پر مدیؔن کہلائے اور پھر اسی نام پر انہوں نے ایک شہر بھی بسایا۔

قرآن کریم نے مدین قوم اور مدیؔن شہر دونوں کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ قوم کے معنوں میں تو فرماتا ہے وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا (ھود:۸۵) یعنی مدین قوم کی طرف ہم نے انہی کے بھائی شعیبؑ کو مبعوث کیا۔ اور شہر کے معنوں میں سورۂ توبہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَ اَصْحٰبِ مَدْیَنَ وَ الْمُؤْتَفِکٰتِ (التوبۃ:۷۰) یعنی کیا ان کو مدین شہر کے رہنے والوں اور ان بستیوں کی تباہی کی خبر نہیں پہنچی جو عذاب سے اُلٹا دی گئی تھی یعنی قوم لوطؑ کی بستیاں۔ حضرت شعیبؑ نے بھی اس قوم سے یہی کہا کہ اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔ میں تمہاری طرف خدا تعالیٰ کے ایک رسول کی حیثیت سے آیا ہوں اور اپنے کام کے بدلہ میں تم سے کچھ مانگتا نہیں میرا بدلہ ربّ العالمین خدا مجھے دے گا۔

اس آیت میں اور پہلی کئی آیتوں میں گزر چکا ہے کہ جب ہر پہلے رسول نے کہا کہ میری اطاعت کرو تو ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ جس سے الٰہی حکومت اور دنیوی حکومت میں فرق معلوم ہوتا ہے۔ لوگ اطاعت کروا کے اجر لیا کرتے ہیں مگر ان آیات میں یہ مذکور ہے کہ میری اطاعت کرو۔ میں اس اطاعت کی وجہ سے تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ پس معلوم ہوا کہ آسمان کی طرف سے جس اطاعت کا حکم آتا ہے وہ جبری اطاعت نہیں ہوتی بلکہ اطاعت کروانے والا درحقیقت بندوں کا خادم ہوتا ہے مگر چونکہ خادم ہمیشہ اجرت لیا کرتے ہیں اس لئے ہر رسول کے منہ سے یہ کہلوایا گیا کہ میرے اطاعت ایسے رنگ میں ہوگی کہ میں تمہاری خدمت تو کروں گا لیکن تم سے کوئی اجر نہیں لوں گا۔ گو بظاہر تو تم میرے مطیع نظر آؤ گے لیکن حقیقتاً میں تمہارا خادم ہوں گا۔ گو تمہاری اطاعت بھی نرالی ہوگی اور میری خدمت بھی نرالی ہوگی۔ تم بظاہر اطاعت کرتے ہوئے مجھ سے خدمت کرواؤ گے۔ اور میں انتہا درجہ کی خدمت کرتے ہوئے بھی تم سے کوئی اجرت نہیں لوں گا۔ مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اس سے بھی بلند مقام عطا فرمایا۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا قُلْ لَّاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّاۤ

الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی (الشوریٰ: ۲۴) یعنی اے محمدؐ رسول اللہ! تو لوگوں سے کہہ دے کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا سوائے اس محبت اور پیار کے جو اپنے قریب ترین رشتہ داروں سے کی جاتی ہے۔ مسلمانوں میں سے بعض لوگ غلطی سے اس آیت کے یہ معنی کرتے ہیں کہ تم پر جو میرے احسانات ہیں ان کے بدلہ میں مَیں ذاتی طور پر تم سے کسی چیز کا خواہش مند نہیں ہاں میں تم سے صرف اتنی خواہش کرتا ہوں کہ میرے رشتہ داروں سے حسنِ سلوک کرنا (قرطبی)۔ مگر یہ معنے درست نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں آیت کا یہ مطلب ہوگا کہ میں تم سے کوئی اور اجر نہیں مانگتا ہاں یہ اجر ضرور مانگتا ہوں کہ میرے رشتہ داروں کا خیال رکھنا حالانکہ قرآن کریم کی دوسری آیات میں وضاحتاً کہا گیا ہے کہ میں تم سے کوئی ایسا اجر نہیں مانگتا جس کا دنیا کیساتھ کوئی تعلق ہو۔ صرف یہ چاہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ پر ایمان لاؤ۔ بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تو اللہ تعالیٰ سورۂ سباع ۶/۱۲ میں یہاں تک فرماتا ہے کہ قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ (السبا: ۴۸)۔ یعنی اگر تمہارے خیال میں مَیں نے کوئی اجر تم سے مانگا ہے تو وہ ہرگز نہ دینا اسے اپنے ہی گھر رکھو۔ اور ظاہر ہے کہ یہ کہنا کہ مجھ پر ایمان لاؤ اور میرے احکام کی اطاعت کرو یہ کوئی ایسی بات نہیں جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ذاتی فائدہ ہو۔ ایمان اور اطاعت تو بہرحال لوگوں کے اپنے فائدہ کی چیز ہے۔ پس اس جگہ جو اجر کا لفظ آیا ہے اور جس کے طلب کرنے کی نفی کی گئی ہے اس سے مراد ایسا ہی اجر ہوسکتا ہے جس کا جسمانی طور پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یا آپ کے خاندان کو فائدہ پہنچ سکتا ہو۔ اور جہاں تک ایسے اجر کا تعلق ہے جس کا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جسمانی طور پر فائدہ پہنچ سکتا۔ اس کی نفی دوسری آیت میں جو اسی مفہوم میں آئی ہے موجود ہے۔

پس جب ہم دیکھتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری جگہ بغیر کسی استثنٰی کے کہہ دیا ہے کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا اور ساتھ ہی دوسرے انبیاء نے بھی یہی کہا ہے کہ ہم کوئی اجر نہیں مانگتے تو اب اس آیت میں اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی کے کوئی ایسے معنے کئے جائیں۔ جن کا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے تعلق ہو تو یہ اوّل تو دوسری آیت کے خلاف ہوگا۔ دوسرے اس سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی انبیاء سابقین پر فضیلت ثابت ہونے کی بجائے نقص ثابت ہوگا۔ کیونکہ یہی آیت اللہ تعالیٰ پہلے انبیاء کے مونہہ سے بھی نکلواتا ہے۔ مگر وہاں یہ بتاتا ہے کہ انہوں نے بغیر کسی اجر کی امید کے خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے بنی نوع انسان کی خدمت کی۔ ان سے کسی معاوضہ کا تقاضا نہیں کیا۔ نہ اپنے لئے۔ نہ اپنے رشتہ داروں کے لئے مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ بتایا جاتا ہے کہ آپؐ نے نعوذ باللہ گو یہ تو کہا کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا مگر پہلے انبیاء کے طریق کے خلاف اتنا ضرور کہا

کہ میرے رشتہ داروں کا خیال رکھنا اور ان سے محبت کیا کرنا۔ پس یہ بات ایسی ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص کرنے والی اور آپؐ کے درجہ کو گھٹانے والی ہے پھر ہم دیکھتے ہیں کہ اِلَّا استثنیٰ ہے اور استثنیٰ جو نفی کے بعد آئے اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ پہلے جملہ میں جس چیز کی نفی کی گئی تھی اس کے حکم سے بعد میں آنے والی شئے باہر ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کہے کہ میرے پاس پانچ پانچ روپے کے نوٹوں کے سوا اور کوئی نوٹ نہیں۔ تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ اس نے جو نوٹوں کی نفی کی تھی اس میں سے پانچ پانچ روپے کے نوٹوں پر وہ نفی اثر انداز نہیں۔ ان معنوں کے رُو سے اگر اَلْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى کے معنے رشتہ داروں کی محبت کے کئے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا مگر رشتہ داروں سے حسنِ سلوک کرنے کا اجر چاہتا ہوں اور اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درجہ کی سخت تنقیص ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ (۱) اگر مَوَدَّةٌ کے معنے جسمانی رنگ میں نیک سلوک کے کئے جائیں تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ اے لوگو! میں تم سے جسمانی طور پر نیک سلوک کی امید نہیں رکھتا مگر میرے رشتہ داروں سے جسمانی طور پر نیک سلوک کرتے رہنا اور (۲) اگر مودّۃ کے معنے روحانی تعلق کے کئے جائیں تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ اے لوگو! میں تم سے یہ نہیں چاہتا کہ مجھ سے روحانی تعلق رکھو صرف یہ چاہتا ہوں کہ میرے رشتہ داروں سے روحانی تعلق رکھنا۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں معنے غلط ہیں جسمانی سلوک کے معنے کر کے یہ مراد لینا کہ میرے رشتہ داروں سے جسمانی طور پر نیک سلوک کرنا تو اس لئے غلط ہے کہ اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سوال کی نسبت ہوتی ہے اور دوسرے انبیاء سے بھی آپؐ کا درجہ گر جاتا ہے۔ اور روحانی تعلق کے معنے کرنے سے تو یہ معنے بالکل کفر کے ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہو جاتا ہے کہ مجھ سے روحانی تعلق نہ رکھو حالانکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روحانی تعلق پیدا کر کے ہی ایمان حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ایک دوسرے مقام پر فرماتا ہے کہ جب تک یہ لوگ اپنی بیویوں اور اپنے بچوں اور اپنے بھائیوں اور اپنے عزیزوں سے زیادہ تجھ سے پیار نہیں کرتے اس وقت تک یہ مومن نہیں کہلا سکتے (سورۂ توبہ آیت ۲۴)۔ پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو فرماتے ہیں کہ مجھ سے مؤدّت کرنی ضروری ہے اور ایسی ضروری ہے کہ تمہیں میری خاطر اگر اپنے ماں باپ کو چھوڑنا پڑے۔ اپنی بیویوں کو چھوڑنا پڑے۔ اپنے بچوں کو چھوڑنا پڑے اپنے بھائیوں کو چھوڑنا پڑے۔ اپنے دوستوں کو چھوڑنا پڑے تو ان سب کو چھوڑ دو۔ پس اس محبت کا نہ صرف وجود ثابت ہے بلکہ قرآنِ کریم کی دوسری آیات سے اس قسم کی مؤدّت کا حکم ثابت ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ اگر تم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قسم کی محبت نہیں رکھو گے جو دوسری تمام محبتوں پر غالب ہو تو اس وقت تک تم ایمان دار نہیں کہلا سکتے۔ پس یہ دونوں معنے باطل ہیں۔

اب ایک ہی صورت رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی کے الفاظ کو بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہی چسپاں کیا جائے اور اس آیت کے معنے یہ کئے جائیں کہ میں تم سے کوئی دنیوی اجر نہیں مانگتا ہاں تم سے ایک مطالبہ ضرور کرتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ تم میرے ساتھ روحانی تعلق پیدا کرو اور اس تعلق میں ایسے اعلیٰ درجہ کے ثابت قدم نکلو کہ اس کی نظیر کسی دنیوی رشتے میں نہ مل سکے اور یہ معنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے بالکل شایاں ہیں۔ پس قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی کے یہ معنے ہوئے کہ میں تم سے ایسے ہی تعلقاتِ محبت کا تقاضا کرتا ہوں جیسے اعلیٰ درجہ کے قریب سے قریب رشتہ داروں کا آپس میں ہوتا ہے۔ گویا وہ مودّت جو قریبی رشتہ داروں میں ہوتی ہے میں تم سے ایسی مودّت کا اپنے متعلق تقاضا کرتا ہوں۔ یہ وہی مضمون ہے جسے دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَ اِيْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی (النحل:۹۱) فرماتا ہے اللہ تعالیٰ تمہیں عدل اور احسان اور ایتاء ذی القربیٰ کا حکم دیتا ہے۔ ایتاء ذی القربیٰ سے اس جگہ یہی مراد ہے کہ تمہارا نیکیوں کی طرف ایسا طبعی میلان ہو جائے کہ تمہیں نیکی کا کام کرتے وقت یہ خیال ہی پیدا نہ ہو کہ تمہیں اس کے بدلہ میں کچھ ملے گا یا نہیں۔ گویا تمہیں وہ مقام حاصل ہو جائے جو تمام دنیوی خیالات اور نتائج اور ثمرات کو نظر انداز کر دینے والا ہو۔ پس اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی کے معنے یہ ہوئے کہ میں تم سے وہ محبت چاہتا ہوں جو ایک ماں اور بچہ کے درمیان ہوتی ہے۔ ماں اپنے بچہ سے حسن سلوک کرتے وقت یہ خیال نہیں کرتی کہ اس کے بدلہ میں مجھے کچھ ملے گا یا نہیں بلکہ وہ ایک فطری لگاؤ کے ماتحت اس سے پیار اور محبت رکھتی ہے۔ یہی حال بچے کا ہوتا ہے۔ ماں کی محبت اس کے رگ وریشہ میں سرایت کی ہوئی ہوتی ہے اور وہ اس سے ایک والہانہ تعلق رکھتا ہے یہی امر اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ تم مجھ سے ایسی ہی محبت کرو جیسے ایک بچہ اپنی ماں سے کرتا ہے۔ بلکہ دوسری آیت میں مومنوں سے اس سے بھی بڑھ کر مطالبہ کیا گیا ہے۔ اور فرمایا گیا ہے کہ تمہیں اللہ تعالیٰ کے انبیاء سے اپنے ماں باپ سے بھی زیادہ محبت ہونی چاہیے۔ پس یہ کم سے کم مطالبہ ہے جو مومنوں سے کیا گیا ہے۔ اور اگر اس حد تک بھی کسی شخص کے دل میں محبت نہ پائی جائے تو اسے سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اپنے دعویٔ ایمان میں جھوٹا ہے۔ پس لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی کے اصل معنے یہ ہیں کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ ہاں تمہاری اصلاح اور تمہاری ترقی کے لئے یہ چاہتا ہوں کہ تمہیں میرے ساتھ ویسی ہی محبت ہو جیسے ذی القربیٰ میں ہوتی ہے۔ یعنی تمہیں یہ احساس ہی نہ رہے کہ اس کے بدلہ میں تمہیں ملے گا کیا؟ بدلے اور اجر کا خیال تمہارے دل سے بالکل مٹ جائے۔

مفسرین نے اس جگہ قربیٰ کے معنے یہ کئے ہیں کہ وہ رستہ جس سے خدا تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے اور

اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى کی تشریح انہوں نے یہ کی ہے کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا ہے صرف یہ چاہتا ہوں کہ تمہارے اندر خدا تعالیٰ کے قرب کی محبت پیدا ہو جائے۔ (قرطبی زیر آیت قل لا اسلکم علیہ اجرا الا المودۃ فی القربی...) مگر اس میں مشکل یہ ہے کہ قربیٰ کے معنے لغت میں قرابتِ رحمی کے ہی ہوتے ہیں۔ قُرب کے معنے نہیں ہوتے۔ لُغت والے اَلْقُرْبَةُ۔ اَلْقُرْبُ اور اَلْقُرْبیٰ میں فرق کرتے ہیں۔ گو یا یہ لفظ ۃ کے ساتھ ی اور بغیر ۃ اور ی کے آتا ہے قرب کے معنے قُربِ مکانی کے ہوتے ہیں۔ لیکن جب قُربِ مکانی نہ ہو بلکہ درجہ کا قُرب مراد ہو تو اس کے لئے عربی زبان میں قربۃٌ کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور جب نہ مکانی قرب مراد ہو اور نہ درجہ کا قرب مراد ہو بلکہ رحمی تعلقات کے لحاظ سے کسی کا قُرب مراد ہو تو اس کے لئے قُرْبیٰ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اَقْرَبُ الموارد میں لکھا ہے قِيلَ اَلْقُرْبُ فِي الْمَكَانِ وَالْقُربىٰ فِي الرَّحِمِ وَالْقُرْبَةُ فِي الْمَنْزِلَةِ۔ پس چونکہ لغت اس میں فرق کرتی ہے اس لئے ہمیں قربیٰ کے وہی معنے کرنے پڑیں گے جو لغت کے بھی مطابق ہوں۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی کوئی اعتراض پیدا کرنے کا موجب نہ ہوں اور وہ معنی یہی ہیں کہ میں تم سے ایسی محبت کا تقاضا کرتا ہوں۔ جو ذی الْقُرْبیٰ سے کی جاتی ہے۔ یعنی وہ تعلق جو ماں کا اپنے بچے سے ہوتا ہے یا بچہ کا اپنی ماں سے ہوتا ہے یا باپ کا اپنے بیٹے سے ہوتا ہے یا بیٹے کا اپنے باپ سے ہوتا ہے تم وہی تعلق میرے ساتھ پیدا کرو۔ اس تعلق میں کوئی مادی خواہش نہیں ہوتی بلکہ فطری لگاؤ کے ساتھ ایک دوسرے سے محبت کی جاتی ہے۔ پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ چونکہ میں معلم ہوں اور میرا کام یہ ہے کہ تمہیں دینی تعلیم سکھاؤں اس لئے ضروری ہے کہ طبعی طور پر تمہارے اندر یہ احساس پایا جائے کہ تمہیں میرے پیچھے چلنا چاہیے۔ پس تم ایسی ہی محبت کرو جیسے بچہ اپنی ماں سے کرتا ہے تاکہ تمہیں سوچ سوچ کر میرے احکام کی اطاعت نہ کرنی پڑے بلکہ آپ ہی آپ میرے احکام کے پیچھے چل پڑو۔ گویا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى کے معنے یہ ہوئے کہ تم میرے ساتھ ویسی ہی محبت کرو جیسی بیٹا اپنے باپ سے یا بچہ اپنی ماں سے کرتا ہے اور یہاں تک وہ اپنے ماں باپ کی نقل کرتا ہے کہ اگر ہم غور کریں تو انسانی خد و خال اور حرکات میں بھی بیٹوں اور باپوں اور ماؤں اور لڑکیوں میں اتنی مشابہت پائی جاتی ہے کہ دیکھ کر حیرت آتی ہے۔ بعض دفعہ باپ کو اپنا ہاتھ کسی خاص طرز پر ہلانے کی عادت ہوتی ہے تو بیٹا بھی اسی طرز پر اپنا ہاتھ ہلانے لگ جاتا ہے یا ماں کو عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنی آنکھ کو کسی خاص طریق پر حرکت دے تو اس کی بیٹی بھی اسی طریق پر آنکھ کو حرکت دینے لگ جاتی ہے۔ یا اگر کسی شخص کو خاص طور پر لوچ اور لچک کے ساتھ بات کرنے کی عادت ہو تو بچے بھی اسی طرح لوچ اور لچک کے ساتھ باتیں کرتے ہیں یا باپ کے اندر اگر لکنت پائی جاتی ہو تو عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ بچوں میں بھی لکنت پیدا ہو جاتی

ہے تو بچوں میں نقل کا ایسا مادہ پایا جاتا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کو جس طرح کوئی کام کرتے دیکھتے ہیں اسی طرح خود بھی کرنے لگ جاتے ہیں پس اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبىٰ میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ تم میرے ساتھ صرف ذہنی تعلق نہ رکھو صرف جذباتی تعلق نہ رکھو بلکہ ایسا تعلق رکھو جیسے بچہ کا اپنے ماں باپ سے ہوتا ہے جس طرح وہ اپنے ماں باپ کی خود بخود نقل کرنے لگ جاتا ہے اسی طرح اگر تم مجھ سے فائدہ اٹھانا چاہو تو میرے ساتھ صرف فکری تعلق نہ رکھو بلکہ ایسا تعلق رکھو کہ تم اپنے افکار اور اپنے خیالات اور اپنے اعمال میں خود بخود میری نقل کرنے لگ جاؤ جیسے بچہ اپنے ماں باپ کی نقل کرتا ہے۔ یہ چیز ایسی ہے جو واقعہ میں قابلِ تسلیم ہے کیونکہ آخر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہی شخص فائدہ اٹھائے گا جو ہر کام میں طبعی طور پر آپ کی نقل کرے گا۔ اگر یہ مادہ اس کے اندر نہیں ہوگا تو وہ آپؐ سے فائدہ کیا اٹھائے گا۔

ان معنوں سے آپؐ کی انبیائے سابقین پر فضیلت بھی ثابت ہو جاتی ہے اور وہ اعتراض بھی واقعہ نہیں ہوتا جو بعض لوگوں کے معنے تسلیم کرنے سے آپؐ پر عائد ہوتا ہے اس آیت کے غلطی سے جو معنے کئے جاتے ہیں وہ دوسرے نبیوں کے مقابلہ میں آپ کی تنقیص کرنے والے ہیں کیونکہ باقی نبی تو اپنی امتوں سے یہی کہتے رہے کہ ہم تم سے کوئی اجر نہیں مانگتے مگر ان کے نزدیک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر یہ کہہ دیا کہ بے شک تم مجھے کوئی اجر نہ دو مگر دیکھنا میرے بچوں اور میرے رشتہ داروں کا خیال رکھ لینا۔ لیکن یہ معنے جو میں نے کئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی زیادہ مکمل ہے کیونکہ پہلے انبیاء نے صرف یہی کہا کہ ہم تم سے کوئی اجر نہیں مانگتے۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میں تم سے ایک اجر مانگتا ہوں۔ مگر وہ اجر بھی ایسا ہے جس کا تمہاری ذات کو ہی فائدہ پہنچ سکتا ہے اور وہ یہ کہ تم مجھ سے ایسا تعلق رکھو جیسے بچہ اپنی ماں سے رکھتا ہے تا کہ تم رات اور دن میرے اعمال کی نقل کرتے رہو جو کچھ میں کہوں اس کی تم نقل کرو۔ اور جو کچھ میں کروں اس کی تم نقل کرو جس طرح ماں باپ ہندوستانی لباس پہنتے ہیں تو بچہ بھی ہندوستانی لباس پہننے لگ جاتا ہے۔ ماں باپ جو زبان بولتے ہیں وہی زبان بچہ بھی بولنے لگ جاتا ہے ماں باپ جو حرکات کرتے ہیں وہی حرکات بچہ بھی کرنے لگ جاتا ہے اسی طرح تم میری طرف دیکھو اور میری کامل طور پر اتباع کرو۔ تا کہ جو تعلیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہاری ہدایت کے لئے مجھے ملی ہے وہ تمہاری رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں سرایت کر جائے۔ یہ معنے ایسے ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلے انبیاء پر فضیلت اور برتری ثابت کرنے والے ہیں۔ پہلے انبیاء نے اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبىٰ نہیں کہا۔ اس لحاظ سے ان کی تعلیم یقیناً اس درجہ کی نہیں تھی جس درجہ کی تعلیم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی یہ معنے

جو میں نے اس آیت کے کئے ہیں ان کی تصدیق اسی آیت کا اگلا حصہ بھی کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَمَنۡ یَّقۡتَرِفۡ حَسَنَۃً نَّزِدۡ لَہٗ فِیۡہَا حُسۡنًا۔ جو شخص نیکی کا کوئی کام کرتا ہے ہم اس کی نیکی کو اس کے لئے اور زیادہ حسین بنا دیتے ہیں۔ اب اگر اس آیت کے معنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ داروں سے تعلقاتِ محبت رکھنا ہوتا تو مَنۡ یَّقۡتَرِفۡ حَسَنَۃً نَّزِدۡ لَہٗ فِیۡہَا حُسۡنًا کے ذکر کا موقع ہی کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ جو شخص نیکیوں میں حصہ لیتا ہے ہم اس کے حسن کو بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ اب اس بات کا بھلا اس سے کیا تعلق ہو سکتا ہے کہ میرے رشتہ داروں سے حسنِ سلوک کرنا لیکن میں نے جو معنے کئے ہیں ان کے لحاظ سے یہ آیت بالکل صاف ہے۔ میں نے یہ معنے کئے ہیں کہ تمہارا میرے ساتھ بچوں والا تعلق ہونا چاہیے۔ جس طرح بچہ بغیر فکر اور بغیر دلیل کے اپنے ماں باپ کی نقل کرتا ہے۔ اسی طرح تمہارا فرض ہے کہ تم میری نقل کرو۔ اس پر سوال پیدا ہوتا تھا کہ بچہ تو عقل کے بغیر نقل کرتا ہے پس اگر ہم بھی بچوں کی طرح آپ کی نقل کرتے ہیں اور خود غور اور فکر سے کام نہیں لیتے تو یہ ایک ادنیٰ مقام ہے۔ انسان کو تو جو بات ماننی چاہیے وہ علیٰ وجہ البصیرت ماننی چاہیے نہ کہ اندھا دھند۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ پہلا درجہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا یہی ہوگا کہ تم ان کی ویسی ہی نقل کرو جیسے بچہ ماں باپ کی نقل کرتا ہے مگر مَنۡ یَّقۡتَرِفۡ حَسَنَۃً نَّزِدۡ لَہٗ فِیۡہَا حُسۡنًا (الشوریٰ: ۲۴) جو شخص آپؐ کی نقل کرے گا۔ اعمال میں آپؐ کی نقل کرے گا جذبات میں آپؐ کی نقل کرے گا اقوال میں آپؐ کی نقل کرے گا، معاملات میں آپ کی نقل کرے گا اور اس طرح نیکیاں اپنے اندر پیدا کرتا چلا جائے گا تو گو یہ اوپر کے مقام کی نسبت سے ایک ادنیٰ مقام ہوگا۔ مگر جوں جوں اسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ یقین پیدا ہوتا چلا جائے گا کہ آپؐ خدا تعالیٰ کی طرف سے آئے ہیں اور وہ آپ کی کامل متابعت کرتا رہے گا تو نَّزِدۡ لَہٗ فِیۡہَا حُسۡنًا ہم اسے رفتہ رفتہ ایک ایسے مقام پر پہنچا دیں گے کہ اسے اعمال کے متعلق ایک کامل بصیرت حاصل ہو جائے گی۔ گویا ہم اسے پہلے درجہ پر ہی نہیں رہنے دیں گے بلکہ براہ راست اس کے دل پر نُورِ نبوت نازل کر کے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت اور آپؐ کی کامل فرمانبرداری کے طفیل اسے بصیرت بھی عطا کر دیں گے۔

پس نَّزِدۡ لَہٗ فِیۡہَا حُسۡنًا جو اس آیت کا اگلا حصہ ہے یہ بھی بتا رہا ہے کہ اِلَّا الۡمَوَدَّۃَ فِی الۡقُرۡبٰی سے مراد دنیوی سلوک نہیں ورنہ نَزِدۡ لَہٗ فِیۡہَا حُسۡنًا کے کوئی معنے ہی نہیں بنتے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پہلے انبیاء بھی اپنی اپنی جگہوں پر لوگوں سے یہی کہتے ہوں گے کہ ہم تمہارے باپ ہیں۔ جیسا کہ قرآن کریم سے پتہ لگتا ہے کہ ہر نبی مومنوں کا باپ ہوتا ہے اور وہ ان کو اس امر کی طرف توجہ دلاتے

ہوں گے کہ جیسے بچے اپنے ماں باپ کی اطاعت کرتے ہیں اسی طرح تمہارا فرض ہے کہ ہماری اطاعت کرو۔لیکن جب انہوں نے یہ کہا کہ ہم تم سے کوئی اجر نہیں مانگتے تو اس وقت انہوں نے اس کے ساتھ یہ دوسرا فقرہ نہیں کہا جو قلوب میں ایک گدگدی پیدا کر دیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی شخص سے کوئی بڑا کام لینا چاہتا ہے تو اس کے لئے سامان بھی پیدا کر دیتا ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ نے جو کام لیا وہ کسی اور نبی سے نہیں لیا۔اسی لئے آپؐ پر جو کلام نازل ہوا وہ بھی ایسا مکمل ہے کہ اس کی آیات کو پڑھتے ہوئے یوں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز ہمارے دل کو پکڑ رہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ یہ بھی لے لو اور وہ بھی لے لو۔

اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ ﴿۱۸۲﴾ وَزِنُوْا

(اے لوگو!) پیمانہ پورا (بھر کر) دیا کرو۔اور (دوسروں کو) نقصان پہنچانے والے مت بنو۔

بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ﴿۱۸۳﴾ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ

اور سیدھی ڈنڈی سے تولا کرو۔اور لوگوں کو ان کی چیزیں (ان کے حق سے) کم نہ دیا کرو۔

اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۱۸۴﴾

اور ملک میں ہرگز فساد نہ کیا کرو۔

حلّ لُغَات۔اَلْقِسْطَاسُ الْقِسْطَاسُ اَلْمِيْزَانُ یعنی قسطاس کے معنے ترازو کے ہیں۔وَاَقْوَمُ الْمَوَازِيْنِ۔اور خاص طور پر اُس ترازو کے جو بالکل صحیح تول دیتا ہو۔(اقرب)

تفسیر۔حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ تم دوسروں کو پیمانہ پورا بھر کر دیا کرو۔اور لوگوں کو نقصان پہنچانے والے مت بنو۔اور ترازو کی ڈنڈی بھی سیدھی رکھا کرو۔اور انہیں جائز حق سے کم مت دیا کرو۔اور ملک میں فتنہ و فساد سے کلی طور پر مجتنب رہو۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم میں شرک کے علاوہ تجارتی بد دیانتی کا بھی بڑا زور تھا۔چونکہ ان لوگوں کا گزارہ زیادہ تر تجارت پر تھا اس لئے وہ دھوکا اور فریب سے کام لینے لگ گئے۔وہ اوّل تو

وزن میں کمی کر دیتے تھے۔جس کے لئے ممکن ہے انہوں نے مختلف قسم کے باٹ رکھے ہوئے ہوں۔اشیاء لیتے وقت اور قسم کے بٹے استعمال کرتے ہوں اور دیتے وقت اور قسم کے بٹوں سے وزن کرتے ہوں۔ پھر وہ ڈنڈی مارنے میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ اور ماپ اور تول دونوں میں لوگوں کو لوٹنے کی کوشش کرتے تھے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے انہیں تجارتی بد دیانتی سے باز رکھنے کی کوشش کی۔مگر وہ لوگ جنہیں حرام مال کھانے کی چاٹ لگ گئی تھی اس سے کب باز آنے والے تھے انہوں نے اور بھی اپنے ہاتھ رنگنے شروع کر دیئے اور آخر وہ وقت آیا جب اُن کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور آسمان سے عذاب کے فرشتے ان کی تباہی کے لئے نازل ہو گئے۔

افسوس ہے کہ یہ مرض اس زمانہ میں بھی بڑے زوروں پر ہے اور دیانت ہمارے ملک سے اس حد تک اٹھ چکی ہے کہ ہر شخص چاہتا ہے کہ وہ دوسرے کو جس حد تک ممکن ہو لوٹے اور نقصان پہنچائے۔گاہک چاہتے ہیں کہ دوکاندار کم قیمت وصول کریں۔اور دوکاندار اس کا علاج یہ سوچتے ہیں کہ وہ ناقص اور گندی چیزیں کم قیمت پر گاہکوں کو دے دیتے ہیں میں تو سودا لینے نہیں جاتا لیکن چونکہ سودے ہمارے گھروں میں آتے رہتے ہیں اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ سودوں میں بالعموم دیانت سے کام نہیں لیا جاتا۔آٹے میں مٹی ملی ہوئی ہوتی ہے اور کھانڈ اور شکر میں بھی بہت کچھ میل اور گند ہوتا ہے یہ دو چیزیں ایسی ہیں جو فوراً نظر آجاتی ہیں چنانچہ کھانڈ کے ہر چمچہ میں انسان اگر آنکھیں کھول کر دیکھے تو اسے بہت سی مٹی ملی ہوئی دکھائی دے گی۔جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وزن زیادہ کرنے کے لئے مٹی ملائی جاتی ہے۔اسی طرح آٹے میں ریت اور مٹی ہوتی ہے۔دانت کے نیچے آٹے کو ذرا چبا کر دیکھو تو فوراً اس سے کِرکِر کی آواز آنے لگے گی۔عام طور پر ہمارے ملک میں لوگ اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتے حالانکہ اگر وہ لقمہ چبا چبا کر کھانے کی عادت رکھتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ وہ آٹا نہیں کھا رہے بلکہ گند کھا رہے ہیں۔نوّے فی صدی آٹا ایسا ہوتا ہے جس میں کِرک ہوتی ہے۔ذرا اسے دانتوں کے نیچے دباؤ تو کِرکِر کی آواز آنے لگ جائے گی اور یہ صحت کے لئے سخت مضر ہوتا ہے۔ پھر یہ دھوکہ بازی بھی ہے کہ دوکاندار قیمت خالص آٹا کی وصول کرتے ہیں اور آٹا وہ دیتے ہیں جس میں ریت اور مٹی ملی ہوئی ہوتی ہے۔بد دیانتی صرف اس چیز کا نام نہیں کہ تم کسی کا ناحق روپیہ لے لیتے ہو بلکہ بد دیانتی اس بات کا بھی نام ہے کہ تم کسی کی کوڑی اُٹھا لیتے ہو۔اسی طرح بد دیانتی صرف اس کا نام نہیں کہ تم ۹۵ فی صدی آٹا اور ۵ فیصدی مٹی ملا کر دو بلکہ اگر تم ۹۸ فیصدی آٹا اور ۲ فیصدی مٹی ملاتے ہو۔یا ننانوے فیصدی آٹا اور ا فیصدی مٹی ملاتے ہو یا ساڑھے ننانوے فیصدی آٹا اور نصف فیصدی مٹی ملاتے ہو بلکہ اگر تم ۹۹۹ حصّہ آٹا اور ۱۰۰۰/۱ حصہ مٹی ملاتے ہو تو وہ بھی ویسی ہی بد دیانتی اور گندی عادت ہے جیسے ۵ فیصدی مٹی ملانا۔نیکی اور بدی دل

سے تعلق رکھتی ہے۔ جس طرح اگر کوئی شخص خدا تعالیٰ کی راہ میں اخلاص سے ایک پیسہ دیتا ہے اور وہ یہ امید رکھتا ہے کہ اس کا ایک پیسہ امیر آدمی کے ایک لاکھ روپیہ سے کم نہ سمجھا جائے اور وہ اخلاص سے ایک پیسہ دے کر سمجھتا ہے کہ اس نے ایک لاکھ روپیہ دینے والے جیسی قربانی کی ہے تو اسی طرح اگر کوئی شخص ۵ فیصدی ٹھگی کرتا ہے تو وہ بھی ٹھگ ہے اور جو ۱/۱۰۰۰ حصہ کی ٹھگی کرتا ہے وہ بھی ویسا ہی ٹھگ ہے۔ جس طرح نیکی کی جزا نیت پر ہے اور اسی طرح بدی کی سزا بھی نیت پر ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ یہ نہیں دیکھتا کہ اس کی راہ میں ایک غریب نے اخلاص سے ایک پیسہ دیا اور دوسرے امیر نے ایک لاکھ روپیہ دیا۔ بلکہ وہ اخلاص دیکھتا ہے اور اس کے مطابق جزا دیتا ہے اسی طرح خدا تعالیٰ یہ نہیں دیکھے گا کہ ایک نے ۵ فی صدی ٹھگی کی ہے اور دوسرے نے آدھ فی صدی بلکہ وہ کہے گا کہ دونوں نے ٹھگی کی ہے۔ ۵ فیصدی ٹھگی کرنے والے نے بھی ٹھگی کی ہے اور ۱/۱۰۰۰ حصہ ٹھگی کرنے والے نے بھی ٹھگی کی ہے تقدس اور نجاست کا دل سے تعلق ہوتا ہے اور جس طرح زیادہ نیکی بھی نیکی اور تھوڑی نیکی بھی نیکی سمجھی جاتی ہے اسی طرح زیادہ بدی بھی بدی اور تھوڑی بدی بھی بدی سمجھی جاتی ہے۔ ممکن ہے کسی جگہ دوکاندار خود اس قسم کی حرکات نہ کرتے ہوں اور باہر سے بے احتیاطی سے اس قسم کا ناقص مال لے آتے ہوں۔ لیکن اس صورت میں بھی وہ بری نہیں ہو سکتے کیونکہ اگر کوئی شخص جاتا ہے اور خراس والے سے گندہ آٹا لے آتا ہے تو یہ اسی کا قصور ہے اگر گندہ آٹا تھا تو وہ کیوں لایا۔ اُسے چاہیے تھا کہ وہ نہ لاتا۔ اور اگر وہ ناقص مال سمجھ کر سستا لے آیا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ بلا واسطہ فائدہ اٹھاتا ہے۔ مثلاً دوسری جگہ سے اچھا آٹا خریدتا تو اس کے ایک سو ایک روپے خرچ ہوتے۔ لیکن جس خراس والے سے اس نے خریدا اُسے سو روپے دینے پڑے تو اس صورت میں بھی یہ ٹھگ ہے کیونکہ یہ دوسرے کی ٹھگی میں شریک ہوتا ہے۔ پس اگر اس قسم کی ٹھگی یہ خود نہیں کرتا بلکہ باہر سے ناقص سودا لاتا اور بیچتا ہے تب بھی وہ ویسا ہی ٹھگ ہے جیسے اپنے ہاتھ سے آٹے میں مٹی ملانے والا۔ ولایت میں کئی چور ایسے ہیں جو یتیم بچوں کی پرورش کرتے اور پھر ان کے ذریعہ چوریاں کرواتے ہیں۔ اب کیا تم سمجھتے ہو وہ یتیم بچوں کے ذریعہ چوریاں کروانے کی وجہ سے کم چور ہیں۔ اگر خود چوری کرتے تو زیادہ چور ثابت ہوتے۔ وہ ویسے ہی چور ہیں جیسے اپنے ہاتھ سے چوریاں کرنے والے۔ اسی طرح جب تم خراس سے ناقص آٹا لاتے ہو اور یہ سمجھتے ہو کہ وہ خراب ہے تو تم ویسے ہی مجرم ہو جیسے اپنے ہاتھ سے آٹے میں مٹی یا ریت ملانے والا۔ پھر کئی لوگ بظاہر دیانت دار بھی ہوتے ہیں اور وہ مٹی نہیں ملاتے لیکن جب گیہوں کو صاف کرنے کے لئے زمین پر پھیلاتے ہیں تو اسے سمیٹتے وقت جب جھاڑو دیں گے تو پاؤ یا سیر کے قریب اس میں مٹی بھی ملا دیں گے اور اپنی طرف سے یہ سمجھیں گے کہ ہم تو بڑے دیانت دار ہیں حالانکہ وہ دیانت دار نہیں ہوتے۔ اسی

طرح بعض غلّہ فروش کمپنیوں کے ایجنٹ غلّہ خریدتے ہیں ۔تو اس میں باریک غبار ملادیتے ہیں ۔ چونکہ لاکھوں کا غلّہ ہوتا ہے اس لئے ان کی یہ چالا کی چھپی رہتی ہے اور ہر ایک کو اس کا پتہ نہیں لگتا۔بعض لوگ غلّے کو پانی کا چھینٹا دے دیتے ہیں ۔تا کہ بوجھل ہو جائے ۔ اسی طرح اگر کسی کو کچھ خریدنا ہوتا ہے تو کہتا ہے میں نے اتنا مال لیا مگر تم کچھ بھی رعایت نہیں کرتے اور اگر بیچنا ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ کیا تم ہمارا گھر ہی لوٹ کر لے جاؤ گے ۔اسی طرح بمبئی کے بعض تجار کی نسبت تو عجیب روایات سنی جاتی ہیں ۔ کہتے ہیں کہ بعض تاجروں کے تین قسم کے باٹ ہوتے ہیں (۱) پورے وزن کے (۲) بھاری اور (۳) ہلکے۔ اور ان کے انہوں نے عجیب عجیب نام رکھے ہوئے ہیں ۔کسی کا نام سُبْحَانَ اللہِ رکھا ہوا ہوتا ہے ۔کسی کا نام اَسْتَغْفِرُ اللہ اور کسی کا نام لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ ۔اور جس قسم کا کوئی آدمی دیکھتے ہیں اُسی طرز کا اس سے سلوک کرتے ہیں ۔اگر ہوشیار آدمی ہوا تو اصل بٹہ نوکر کو لانے کا حکم دیا۔اور وہ لفظ بول دیا جس سے اصل بٹوں کی طرف اشارہ ہوتا ہے ۔کوئی سادہ لوح آیا تو چھوٹے بٹے منگوا لئے ۔اسی طرح دھوکا باز عطاروں کا طریق ہے کہ علاقہ میں کوئی وباء شروع ہو جائے اور حکیم لکھنا شروع کر دیتے ہیں کہ مریض کو عرق مکو اور عرق گاؤ زبان پلاؤ تو ایک دیانت دار عطار تو بعض دفعہ کہہ دے گا کہ میرے پاس عرق مکو اور عرق گاؤ زبان تیار نہیں ۔لیکن بددیانت عطار کہے گا ۔میرے پاس دونوں چیزیں موجود ہیں ۔ وہ پانی لے گا بوتل میں بھر دے گا اور کہے گا یہ عرق مکو ہے ۔یہ عرق کاسنی ہے ۔ یہ عرق گلاب ہے ۔تم جو عرق بھی مانگو گے وہ اس کے پاس موجود ہوگا۔

ہماری تاریخ طبّ کی کتابوں میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ ایک عبّاسی بادشاہ نے کہا ۔اب طبّ بڑی ترقی کر رہی ہے ۔اس پر کسی نے کہا۔طبّ ترقی کیسے کر سکتی ہے ۔ جب تک دوائیں بیچنے والوں میں دیانت پیدا نہ ہو۔ طبیب چاہے کوئی نسخہ لکھے اس سے کیا فائدہ ہوگا ۔بادشاہ نے کہا۔ بغداد میں پانچ چھ سو دوکانیں ہیں ۔تم تجربہ کرلو۔ اس پر انہوں نے کسی دوائی کا مصنوعی نام رکھ لیا اور کہا۔ یہ دوا منگوا دو ۔ وہ دوا آنی شروع ہوئی ۔کسی دوا فروش نے ملٹھی بھیج دی اور کہہ دیا یہی وہ دوا ہے ۔کسی نے عناب بھیج دی اور کہہ دیا یہی وہ دوا ہے ۔غرض سب دوکانداروں نے یہی طریق اختیار کیا۔صرف ایک دوکاندار ایسا نکلا جس نے کہا کہ میرے پاس یہ دوا نہیں ۔ میں نے یہ نام پہلے کبھی نہیں سنا۔ بادشاہ نے دریافت کیا کہ کس دوکاندار نے سچ بولا ہے ۔تو طبیبوں نے کہا۔سب جھوٹ بولتے ہیں ۔سچا وہی ہے جو کہتا ہے کہ میں نے یہ نام پہلے نہیں سنا۔ کیونکہ ہم نے مصنوعی نام رکھ کر یہ تجربہ کیا تھا۔اس تجربہ کی وجہ سے مسلمان بادشاہوں نے دوا سازی کا بھی امتحان رکھا تھا اور دواؤں کی پہچان کے لئے سکول بنائے گئے تھے اور جو شخص وہ مخصوص امتحان پاس کر لیتا تھا صرف اس کو دوائی بیچنے کی اجازت دی جاتی تھی ۔ عام لوگوں کو دوا فروشی کی اجازت

نہیں ہوتی تھی۔

کشمیر میں مَیں نے دیکھا ہے وہاں لوگ مشک کا نافہ لاتے ہیں۔اور کہتے ہیں کہ اس کے اندر ایک تولہ مشک ہے۔اور اس کی اصل قیمت بتّیس روپے ہے مگر چونکہ ہمیں روپے کی ضرورت ہے اس لئے ہم آپ کو چوبیس پچّیس روپے میں نافہ دے دیں گے۔ پھر وہی نافہ جس کی وہ پچّیس روپے قیمت بتاتے ہیں بعض دفعہ آٹھ آنہ میں بھی دے دیتے ہیں۔اور جب تم آٹھ آنہ میں مشک کا نافہ لے کر یہ سمجھتے ہو کہ دنیا کے سب سے بڑے ماہر تم ہو کیونکہ تم نے ایک شخص سے مشک کا نافہ آٹھ آنہ میں لے لیا تو اس وقت بھی تم دھوکہ خوردہ ہوتے ہو۔کیونکہ جب اسے کھول کر دیکھا جاتا ہے تو اس میں سے کبوتر کے جمے ہوئے خون کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا اور تمہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ بڑے ماہر تم نہیں بلکہ بڑا ٹھگ وہی تھا جو تمہیں لوٹ کر لے گیا۔وہ نافہ کے باہر تھوڑی سی مشک مل دیتے ہیں اور اندر کبوتر کا خون بھر دیتے ہیں۔کبوتر کے خون کی بعض دوائیوں کے ملانے سے بالکل مشک کی سی شکل ہو جاتی ہے اور ناواقف آدمی سمجھتا ہے کہ آج میں نے بڑا سستا سودا کیا ہے۔میں نے آٹھ آنہ میں مشک کا نافہ خرید لیا ہے۔حالانکہ اس میں صرف کبوتر کا خون ہوتا ہے اور کبوتر کے خون کی قیمت ایک روپیہ بھی نہیں ہوتی۔

اسی طرح ایک دفعہ میں کشمیر گیا۔وہاں ایک قسم کی قالین بنتی ہے جو اونی کپڑے کاٹ کاٹ کر اور پھر ان کو سی کر بناتے ہیں۔اور اس کو گابھا کہتے ہیں۔ہمیں وہ دیکھ کر پسند آیا۔چنانچہ میں نے بھی چاہا کہ یہاں سے دو چار خرید کر لے جائیں۔اپنے گھروں میں تحفہ دیں گے۔ایک شخص اسلام آباد میں اس کام کے لئے اچھا مشہور تھا۔میں نے اس کو جا کر کہا۔کہ میں یہ قالین پنجاب میں تحفۃً لے جانا چاہتا ہوں تم مجھے اچھے سے قالین بنا دو۔اُس نے کہا۔اچھا کچھ پیشگی دے دیں۔چنانچہ ہم نے کچھ رقم اس کو پیشگی دے دی اور ہم آگے پہاڑ پر سیر کے لئے چلے گئے۔میں نے اُسے یہ بھی کہا کہ دیکھنا میں جو اس کی لمبائی چوڑائی بتاؤں گا وہ ٹھیک ہو۔کیونکہ میں کمروں کے لحاظ سے لے رہا ہوں۔اُس نے کہا۔بالکل ٹھیک ہوں گے۔جب وہ آئے تو مجھے دیکھتے ہی پتہ لگ گیا کہ وہ ٹھیک نہیں ہیں اور پھر جو ماپ کر دیکھا تو ایک بالشت چوڑائی میں کمی تھی اور ایک بالشت لمبائی میں کمی تھی۔میں نے اس کو کہا کہ یہ تم نے بڑی دھوکا بازی کی ہے کہ اس کو چھوٹا بنا دیا ہے۔اس پر اس نے شور مچانا شروع کر دیا کہ ’’میں مسلمان ہوں‘‘ ’’میں مسلمان ہوں‘‘ میں نے کہا۔مسلمان تو تم ہوئے۔لیکن سوال یہ ہے کہ ہمارے ساتھ تمہارا وعدہ تھا یا نہیں کہ اتنے لمبے چوڑے قالین بناؤں گا۔اور پھر دو چار آدمیوں کے سامنے یہ بات ہوئی تھی۔میں نے ان آدمیوں سے کہا کہ بتاؤ تمہارے سامنے اس نے یہ وعدہ کیا تھا یا نہیں۔انہوں نے کہا ہمارے سامنے وعدہ کیا تھا۔اس پر میں نے اسے کہا

کہ دیکھو تم نے وعدہ کیا تھا۔ وہ اپنے کشمیری طریق پر کہنے لگا۔''جی میں مسلمان ہوندی۔ میں مسلمان ہوندی''۔ میری عمر اس وقت کوئی اُنیس بیس سال کی تھی۔ مجھے اس پر غصہ چڑھے کہ یہ اپنا فعل اسلام کی طرف کیوں منسوب کرتا ہے یہ کہے میں نے ٹھگی کی ہے جانے دو۔ یہ کیوں کہتا ہے کہ میرے مسلمان ہونے کے لحاظ سے میرا حق تھا کہ میں ٹھگی کرتا۔ غرض میں اصرار کروں کہ اسے پورا کرو۔ اور وہ یہی کہتا جائے کہ میں مسلمان ہوں۔ میں مسلمان ہوں۔ گویا اسلام اتنا گر گیا ہے کہ اب یہ سمجھا جاتا ہے کہ مسلمان اگر ٹھگی کرے تو یہ بھی اس کا ایک قسم کا جائز حق ہے۔

میں جب پہلی دفعہ کشمیر گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ کشمیر کے تاجروں کی صرف چاندی کے کام کی ایک کروڑ روپیہ کی تجارت یورپ والوں سے تھی۔ ایک کروڑ روپیہ کی تجارت کے یہ معنے ہیں کہ بیس پچیس لاکھ روپیہ انہیں بطور منافع حاصل ہوتا تھا اور کام کی مزدوری الگ تھی لیکن مجھے بتایا گیا کہ اب یہ تجارت سولہ لاکھ روپیہ تک رہ گئی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یورپ کے لوگ کہتے ہیں۔ یہاں کے مال کا کوئی معیار نہیں۔ کبھی کوئی چیز بھیج دیتے ہیں اور کبھی کوئی۔ کبھی تو نہایت اعلیٰ مال روانہ کر دیں گے اور کبھی اس میں کھوٹ ملا دیں گے۔ حالانکہ اگر وہ دیانت داری سے کام کرتے تو وہ ایک کروڑ کی تجارت آج تین چار کروڑ روپیہ تک پہنچی ہوئی ہوتی۔ پہلے زمانہ میں تجارتیں بہت کم تھیں۔ تجارت میں زیادتی اسی زمانہ میں ہوئی ہے۔ پھر اگر اس زمانہ میں جب کہ تجارت کا رواج بہت کم تھا ان کی ایک کروڑ روپیہ کی تجارت ہو سکتی تھی تو لازماً اب وہ تجارت تین چار کروڑ روپیہ کی ہو جاتی۔ مگر بجائے اس کے کہ ان کی تجارت تین چار کروڑ روپیہ تک ترقی کرتی اور کروڑ ڈیڑھ کروڑ روپیہ انہیں نفع حاصل ہوتا۔ پہلی تجارت بھی گر گئی اور وہ ایک کروڑ سے اُتر کر سولہ لاکھ روپیہ تک آ گئی۔ اگر وہ تھوڑے سے نفع کی خاطر بددیانتی کر کے اپنے کام کو نقصان نہ پہنچاتے تو نتیجہ یہ ہوتا کہ ان کی یہ تجارت خوب چلتی مگر چونکہ انہوں نے بددیانتی کی اس لئے تجارت میں نقصان ہو گیا انگریزوں کے کئی لوگ دشمن ہیں۔ مگر دشمن بھی اقرار کرتے ہیں کہ تجارت کے معاملہ میں انگریزوں پر زیادہ اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ انگریزوں سے اتر کر امریکہ اور جرمن کے لوگ ہیں اور ان سے اتر کر اور ممالک کے لوگ ہیں۔ مگر ایشیا تجارت میں اتنا خطرناک طور پر بدنام ہے کہ کوئی قوم اس پر اعتبار نہیں کرتی۔ حالانکہ قومی ترقی ہمیشہ امانت اور دیانت داری کی شہرت کے ساتھ ہوتی ہے۔ اگر تمام مسلمان تاجر دیانتدار ہوں تو لوگ سودو کانوں کو چھوڑ کر بھی ان کے پاس جائیں گے اور کہیں گے کہ ان سے سودا اچھا ملتا ہے۔ لیکن اگر کوئی مسلمان دوکاندار بھی ایک من آٹے میں سیر بھر مٹی ملا دیتا ہے تو اس کے اندر وہ کون سے چیز ہو گی جس کی وجہ سے لوگ اس کی طرف توجہ کریں گے۔ پس ہر شخص کو اس بات کا فیصلہ کر نا لینا چاہیئے کہ میں نے بددیانتی کو مٹانا ہے۔ اگر اس کا باپ دوکاندار ہے تو وہ اپنے باپ

سے کہہ دے کہ میں تمہیں بد دیانتی نہیں کرنے دوں گا۔ اگر اس کے بھائی دوکاندار ہیں تو وہ اپنے بھائیوں سے کہہ دے کہ میں تمہیں بد دیانتی نہیں کرنے دوں گا۔ اگر اس کے دوست اور رشتہ دار دوکاندار ہیں تو وہ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سے کہہ دے کہ میں تمہیں بد دیانتی نہیں کرنے دوں گا۔ اگر اس کی بیوی دوکان کرتی ہے تو وہ اپنی بیوی سے کہہ دے کہ میں تمہیں بد دیانتی نہیں کرنے دوں گا۔ اور اگر تم باز نہ آئے اور اصلاح نہ کی تو میں تمہارے خلاف کھڑا ہو جاؤں گا۔ اگر ہر شخص اس بات کا تہیہ کر لے کہ میں نے بد دیانتیوں کا مقابلہ کرنا ہے تو ایک گھنٹہ کے اندر اندر اس عیب کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ اگر تمہارا بھائی تاجر ہے اور وہ بد دیانتی کرتا ہے۔ اگر تمہارا باپ تاجر ہے اور وہ بد دیانتی کرتا ہے اگر تمہاری ماں تاجر ہے اور وہ بد دیانتی کرتی ہے اگر تمہاری بیوی تاجر ہے اور وہ بد دیانتی کرتی ہے تو یہ بد دیانتی اس وقت تک پنپ سکتی ہے۔ جب تک ان کو یقین ہے کہ تم ان کی محبت کی خاطر ان کی بالا افسروں کے پاس رپورٹ نہیں کرو گے۔ لیکن جب ان کو معلوم ہو جائے گا کہ تم ان کی محبت کی پرواہ نہیں کرو گے اور تم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اگر وہ بد دیانتی سے باز نہ آئے تو تم ان کی رپورٹ کرو گے تو کیا یہ ہو سکتا ہے کہ وہ دوسرے منٹ میں بد دیانتی کریں۔ باپ کہے گا بیٹا پچھلا قصور جانے دو آئندہ میں کبھی بد دیانتی نہیں کروں گا۔ بھائی کہے گا پچھلا قصور معاف کرو آج سے میں باز آیا بیوی کہے گی۔ اب یہ قصور معاف کر دو آئندہ میں ایسی حرکت نہیں کروں گی۔ پس قوم کی اصلاح تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ بیٹے کی اصلاح باپ کے ہاتھ میں ہے۔ باپ کی اصلاح بیٹے کے ہاتھ میں ہے۔ بھائی کی اصلاح بھائی کے ہاتھ میں ہے۔ بیوی کی اصلاح خاوند کے ہاتھ میں ہے۔ اور ماں کی اصلاح بیٹوں کے ہاتھ میں ہے۔ اگر تم اس طریق کو استعمال کرو تو چند دن نہیں بلکہ ایک گھنٹہ کے اندر اندر ساری قوم کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر تمہارا دوست دیکھتا ہے کہ وہ بد دیانتی کرے گا۔ تو تم اس پر پردہ ڈالو گے اور جھوٹ بولو گے تو تم اس کو بھی تباہ کرتے ہو اور آپ بھی تباہ ہوتے ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں کوئی جماعت روپے سے زندہ نہیں رہ سکتی بلکہ ایمان سے زندہ رہتی ہے اگر روپیہ ہی اصل چیز ہو تو یہودیوں، عیسائیوں، پارسیوں اور ہندوؤں کے پاس مسلمانوں سے بہت زیادہ روپیہ ہے۔ پھر خدا تعالیٰ نے ان کا ساتھ کیوں چھوڑ دیا۔ اس لئے کہ ایمان کا روپے سے کوئی تعلق نہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو بھی روپیہ دیتا ہے مگر وہ روپیہ یا تو انعام کے طور پر ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اُس کے ذریعہ غرباء کی امداد کی جائے۔ اور یا پھر آزمائش کے طور پر ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ وہ اس روپیہ کا کیسے استعمال کرتے ہیں۔ اگر تو روپیہ کے آنے سے انسان کا ایمان سلامت رہے تو وہ روپیہ اس کے لئے خیر اور

برکت کا موجب ہوتا ہے لیکن اگر وہ روپیہ انسان کے ایمان کو باطل کر دیتا ہے اور وہ بے ایمانوں جیسی چالاکیاں کرنے لگ جاتا ہے اور چوروں اور ٹھگوں کی طرح لوگوں کو لوٹتا ہے۔ مثلاً بلیک مارکیٹ شروع کر دیتا ہے۔ مقررہ نرخ پر چیز فروخت نہیں کرتا بلکہ چیز کی موجودگی سے ہی انکار کر دیتا ہے لیکن اگر اسے کوئی چوری چھُپے حسب منشاء دام دے دے تو وہ فوراً اُسے مہیا کر دیتا ہے تو وہ روپیہ اس کے لئے عذاب کا باعث بن جاتا ہے۔ اس قسم کے ناجائز منافع خوروں کی ایسی ہی کیفیت ہوتی ہے جیسے کہتے ہیں کہ کسی حریص آدمی کے پاس ایک مرغی تھی جو روزانہ سونے کا ایک انڈہ دیا کرتی تھی۔ اس کے دل میں لالچ پیدا ہوا کہ اگر میں اسے زیادہ کھلاؤں تو شاید یہ دو انڈے دینے لگ جائے۔ چنانچہ اس نے مرغی کو پکڑ کر اس کا منہ کھول کر روزانہ اسے زیادہ سے زیادہ دانے کھلانے شروع کر دیئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرغی بیمار ہو کر مر گئی۔ اور وہ ایک انڈے سے بھی محروم ہو گیا۔ اس قسم کے ناجائز منافع خور بھی روپیہ جمع کرتے جاتے ہیں مگر ایک دن آتا ہے جب کسی نہ کسی رنگ میں انہیں اپنی اس بد دیانتی کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ فوری نقصان تو اس رنگ میں پہنچ جاتا ہے کہ جب وہ کسی شخص کو ایک سیر چیز دینے کی بجائے پندرہ چھٹانک دیتے ہیں اور وہ گھر جا کر اس کا وزن کرتا ہے تو اسے پتہ لگتا ہے کہ دوکاندار نے اسے ایک چھٹانک چیز کم دی ہے تو وہ آئندہ کے لئے اس سے سودا لینا بند کر دیتا ہے۔ اس طرح بظاہر تو اسے ایک چھٹانک کا نفع ہوا تھا لیکن اسے نقصان ہزار چھٹانک کا ہو گیا۔ کیونکہ وہ آئندہ کے لئے اس کی دوکان پر نہیں آئے گا۔ اور کسی دوسرے سے سودا خریدنا شروع کر دے گا۔

یہ خیال کہ صرف بے ایمانی سے ہی روپیہ کمایا جا سکتا ہے اوّل درجہ کا احمقانہ خیال ہے۔ صحابہؓ کو دیکھ لو وہ ہر امر میں دیانت کو ملحوظ رکھتے تھے۔ مگر اس زمانہ میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی وفات کے بعد ان کا بچا کھچا روپیہ دو کروڑ نکلا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ دین کے لئے بہت قربانی کرنے والے تھے لیکن اس کے باوجود ان کے پاس دو کروڑ روپیہ بچ گیا تھا۔ جو آج کل کے دو ارب کے برابر ہے۔ اسی طرح تاریخوں میں آتا ہے کہ ایک دفعہ ایک شخص گھوڑے کو فروخت کرنے کے لئے بازار میں لایا اور اس نے کہا کہ اس کی پانچ سو درم قیمت ہے۔ ایک صحابیؓ نے اس گھوڑے کو دیکھا اور اسے پسند کیا اور کہا کہ میں یہ گھوڑا لیتا ہوں۔ مگر اس کی قیمت میں پانچ سو درم نہیں بلکہ دو ہزار درہم دوں گا۔ کیونکہ یہ گھوڑا نہایت اعلیٰ قسم کا ہے اور اس کی قیمت اتنی تھوڑی نہیں جتنی تم بتاتے ہو۔ اس پر گھوڑا بیچنے والا اصرار کرنے لگا کہ میں پانچ سو درہم لوں گا اور گھوڑا خریدنے والا اصرار کرنے لگا کہ میں دو ہزار درہم دوں گا۔ ایک کہتا کہ تجھے گھوڑے کی پہچان نہیں یہ گھوڑا زیادہ قیمت کا ہے اور دوسرا کہتا کہ میں صدقہ لینا نہیں چاہتا۔

میں اپنے گھوڑے کو جانتا ہوں۔ اس کی قیمت پانچ سو درہم ہی ہے۔

اس واقعہ پر غور کرو اور دیکھو کہ اس کے کتنا اُلٹ نظارہ دنیا میں نظر آتا ہے۔ وہاں تو یہ تھا کہ چیز خریدنے والا قیمت بڑھاتا تھا اور چیز بیچنے والا قیمت گراتا تھا۔ اور یہاں یہ حال ہے کہ دو دو آنے کی چیز بعض دفعہ دس دس روپے میں فروخت کی جاتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ خریدار بھی دوکانداروں کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کریں اور دوکاندار بھی گاہکوں کو فریب سے گندی چیزیں نہ دیں۔ اور نہ ماپ اور تول میں انہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کریں۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو تجارتی دیانت اختیار کرنے کی نصیحت کرنے کے بعد ایک اور نصیحت یہ فرمائی کہ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِيْنَ تم زمین میں فساد نہ کرو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم میں قتل و غارت اور ڈاکہ زنی کی وارداتیں بھی کثرت سے ہوتی رہتی تھیں۔ چونکہ یہ علاقہ عرب اور شام اور مصر کے راستوں پر تھا اور شام اور مصر کو جانے والے قافلے ان کے پاس سے گزرا کرتے تھے معلوم ہوتا ہے یہ لوگ مسافروں کو لوٹ لیا کرتے تھے اور بعض کو قتل بھی کر دیا کرتے تھے۔ اِس قیاس کو مزید تقویت اس امر سے بھی حاصل ہوتی ہے کہ یہ لوگ اصحاب الایکہ تھے۔ یعنی ان کے قبضہ میں ایک بہت بڑا جنگل تھا جس میں بیریاں اور پیلو کے درخت بڑی کثرت کے ساتھ تھے اور ایسے جنگل میں ڈاکہ ڈالنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ کیونکہ درختوں کے پیچھے انسان آسانی سے چھپ جاتا ہے۔ پس حضرت شعیب علیہ السلام نے انہیں نصیحت کی کہ تم تجارتی معاملات میں بھی دیانت اختیار کرو اور چوری، ڈاکہ زنی اور قتل و غارت کو بھی ترک کر دو۔

وَاتَّقُوا الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۸۵﴾

اور جس نے تم کو اور تم سے پہلی مخلوق کو پیدا کیا ہے اس کا تقویٰ اختیار کرو۔

حلّ لُغَات۔ جِبِلَّةٌ جِبِلَّةٌ مفرداتِ امام راغب میں ہے۔ جِبِلًّا كَثِيْرًا ای جَمَاعَةً یعنی جِبِلًّا کے معنے جماعت کے ہیں۔ (مفردات) پس اَلْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِيْنَ کے معنے ہوں گے پہلی جماعتیں۔

تفسیر۔ پھر فرمایا تم اس خدا سے ڈرو جس نے تم کو بھی پیدا کیا ہے اور تم سے پہلی قوموں اور جماعتوں کو بھی پیدا کیا ہے یعنی آج تو تم اپنے ان افعال پر نازاں ہو۔ لیکن کیا تم نہیں دیکھتے کہ انہی ناپسندیدہ حرکات کی وجہ سے تم

سے پہلے بھی کئی قومیں ہلاک ہو چکی ہیں۔ پھر کیوں تم ان کی ہلاکت اور بربادی سے سبق حاصل نہیں کرتے اور کیوں ان کے زوال کے اسباب پر غور کر کے اپنے اندر تغیّر پیدا کرنیکی کوشش نہیں کرتے۔

حقیقت یہ ہے کہ قومیں دنیا میں بنتی بھی ہیں اور بگڑتی بھی ہیں۔ اور جب سے دنیا چلی آرہی ہے اُسی وقت سے یہ سلسلہ بھی چلا آرہا ہے۔ ہزاروں قوموں کی تباہی اور ہزاروں قوموں کی ترقی پر تاریخ کے اوراق شاہد ہیں مگر تاریخ کے تمام واقعات بحیثیت مجموعی انسانی زندگی کے واقعات کا سوواں حصہ بھی نہیں ہیں۔ وہ زمانہ جو تاریخی کہلاتا ہے اس سے بھی مدتوں پیشتر انسان دنیا میں موجود تھا۔ اور پھر جو زمانہ تاریخی کہلاتا ہے اس کا بھی اکثر حصہ ایسا ہے جس کی تاریخ محفوظ نہیں۔ مگر وہ زمانے جن کی تاریخ محفوظ ہے اور وہ زمانے جن کی تاریخ محفوظ نہیں ان دونوں قسم کے زمانوں میں ہزاروں قومیں بگڑتی اور بنتی چلی گئیں۔ ہزاروں قوموں نے پہلے بامِ رفعت تک رسائی حاصل کی اور پھر زوال پذیر ہو گئیں اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ جس طرح انسانی پیدائش کا انکار نہیں کیا جا سکتا اور جس طرح انسانی موت کا انکار نہیں کیا جا سکتا اسی طرح قوموں کی پیدائش اور ان کی موت کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر جس طرح بنی نوع انسان ہر روز موت کا مشاہدہ کرنے کے باوجود موت بھلا دیتے ہیں۔ اسی طرح قومیں بھی دوسری قوموں کے تنزل کو دیکھنے کے باوجود اس سے سبق حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتیں۔

قرآن کریم نے اس مسئلہ پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ اور سورۂ فاتحہ سے لے کر سورۂ والناس تک سارا قرآن کریم ان بیانات سے بھرا پڑا ہے کہ قومی ترقی کے کیا گُر ہیں۔ بیشک اور بھی بہت سے مضامین قرآن کریم میں بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے اندر عقلی مضامین بھی بیان کئے گئے ہیں اور علمی بھی۔ روحانی مضامین بھی بیان کئے گئے ہیں اور جسمانی بھی۔ اقتصادی مضامین بھی بیان کئے گئے ہیں اور سیاسی بھی۔ غرض سینکڑوں اور ہزاروں مضامین اس کے اندر بیان ہوئے ہیں لیکن سورۂ فاتحہ کی ابتداء ہی ایسے رنگ میں کی گئی ہے کہ اس میں قومی ترقی اور تنزل سے تعلق رکھنے والے تمام اصول بیان کر دیئے گئے ہیں۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے چھوٹے چھوٹے چشموں سے دریا پھوٹتے ہیں تو ایک کوتاہ اندیش انسان چشمہ میں سے نکلتے ہوئے دریا کو دیکھ کر یہ سمجھنے لگ جاتا ہے کہ یہ چھوٹا سا نالہ چند گز یا چند فرلانگ تک جا کر ختم ہو جائے گا یا خشک ہو جائے گا کیونکہ اس کی آنکھ صرف چشمہ میں سے پھوٹتے ہوئے دریا کے اس پاٹ پر ہی ہوتی ہے جس پر سے وہ اگر چھلانگ مار کر اس کے پار جانا چاہے تو بڑی آسانی کے ساتھ جا سکتا ہے۔ لیکن جب وہ اس چھوٹی سی نالی کے ساتھ ساتھ چلتا ہے تو وہ یہ دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے کہ اب یہ نالی نالے کی صورت اختیار کر رہی ہے۔ تھوڑی دور اور آگے جا کر وہ اور بھی متعجب ہوتا ہے کہ وہ نالہ ایک نہر کی شکل اختیار

کر رہا ہے۔اور جب کچھ اور فاصلہ طے کرتا ہے تو یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہتی کہ وہی چھوٹی سی نالی جو چشمے میں سے دھیمے دھیمے پھوٹ رہی تھی اور جس پر سے چھلانگ لگا کر اس پار ہو جانا ذرا بھی مشکل نہ تھا وہ یہاں پہنچ کر ایک بہت بڑا اور عظیم الشان دریا بن گیا ہے۔دریائے جہلم جو پنجاب میں پہنچ کر ایک بہت بڑے دریا کی شکل اختیار کر لیتا ہے اپنے دہانہ پر اتنا تنگ ہے کہ چند فٹ سے زیادہ نہیں۔اس جگہ کھڑے ہو کر کوئی شخص یہ باور نہیں کر سکتا کہ یہ چشمے میں سے بہنے والا چھوٹا سا نالہ پنجاب کی لاکھوں ایکڑ زمین کو سیراب کرے گا اور لوگ میلوں میل کشتیوں میں بیٹھ کر اپنی مسافتوں کو طے کریں گے۔اسی طرح سورۂ فاتحہ کی شروع ہونے کی مثال ایسی ہی ہے جیسے چشمہ میں سے نکلتے ہوئے نالہ کی لیکن آخر پر پہنچ کر اس کی مثال ایک بہت بڑے دریا کی سی ہو جاتی ہے ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ میں جس مضمون کو چشمے سے نکلتے ہوئے ایک چھوٹے سے نالے کی طرح بیان کیا گیا ہے۔اُسے غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ تک پہنچ کر ایک عظیم الشان دریا کی طرح واضح کر دیا گیا ہے۔کوئی شخص اگر روحانی نابینا ہو تو الگ بات ہے ورنہ ہر شخص آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے کہ ترقی اور تنزل کی تمام منزلیں اس چھوٹی سی سورۃ کے اندر واضح طور پر بیان کی گئی ہیں۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ میں تو ترقی کا مضمون بیان ہوا ہے کہ اے اللہ ہمیں وہ راستہ دکھا جس پر چلنے والے انعام حاصل کر سکتے ہیں۔اور ہمیں ان قوموں میں شامل فرما جن قوموں نے ترقی کی تھی۔مگر آگے چل کر غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ میں بتا دیا کہ ہر وہ قوم جس نے ترقی کی وہ آخر کار گر پڑی مگر یہ دعا سکھا کر اللہ تعالیٰ نے ہمیں تنزل اور پستی سے بچنے کا ایک گُر بھی بتا دیا ہے۔مستقبل کے متعلق تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے اور کیا ہوگا۔لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ دعا سکھا کر اس امر کی طرف ہماری راہنمائی فرمائی گئی ہے کہ اگر مسلمان توجہ سمجھ اور عقل کو کام میں لائیں تو وہ تنزل سے بچ سکتے ہیں۔پچھلے دور میں تو مسلمان اس کی طرف سے توجہ ہٹا لینے کی وجہ سے نہ بچ سکے۔ لیکن اسلام کے لئے ایک نشأۃ ثانیہ کی بھی خبر دی گئی تھی۔اور وہ زمانہ مسیح موعودؑ کی بعثت سے شروع ہونا تھا۔پس یہ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ کی دعا جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں سکھائی ہے مسلمان قوم اس پر عمل کر کے دوسری تمام اقوام سے لمبی عمر پا سکتی ہے۔اور ضلالت سے بچ سکتی ہے۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جو دعا اللہ تعالیٰ خود اپنے بندوں کو سکھاتا ہے اس پر اگر عمل کیا جائے تو وہ ہرگز ضائع نہیں جاتی کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک وعدہ مضمر ہوتا ہے کہ اگر تم مجھ سے مانگو گے تو میں تمہیں دے دوں گا۔اور یہ خدا تعالیٰ کی شان سے بالکل بعید ہے کہ وہ خود اپنے بندوں کو ایک دعا سکھائے اور جب بندے اس دعا پر عمل کریں تو وہ انہیں نہ دے۔اللہ تعالیٰ کا وعدہ تو ایک بہت بڑی چیز ہے ہم دیکھتے ہیں کہ بعض انسانوں کے وعدے بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔کوئی بادشاہ کوئی ڈپٹی کمشنر کوئی گورنر یا

کوئی اور ایسا ہی بڑا حاکم اگر کسی شخص کے ساتھ وعدہ کرے تو وہ شخص اپنے دل میں بڑا خوش ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ لوگ وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے حالانکہ یہ لوگ پیشتر اس کے کہ اپنے وعدہ کا ایفاء کریں مر بھی سکتے ہیں اور یہ بھی امکان ہوتا ہے کہ وہ کہہ دیں کہ اب ہم اس وعدہ کو پورا نہیں کر سکتے۔ یا ممکن ہے کہ وہ وعدہ کرتے وقت تو بااختیار ہوں لیکن وعدے کے ایفاء کے وقت ان سے تمام اختیارات چھن چکے ہوں۔ یا کسی اور محکمہ میں تبدیل ہو گئے ہوں۔ مگر وہ خدا جو ازلی ابدی ہے وہ نہ بدلتا ہے اور نہ مرتا ہے اور نہ ہی اس پر کوئی ایسا وقت آ سکتا ہے کہ اس سے اختیارات چھن جائیں اس لئے ہمیں ایسے شخص سے ہزاروں گُنے زیادہ پُر امید ہونا چاہیے۔ اور ہمیں اس بات میں ذرا بھی شک نہیں لانا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کا ایفاء کرے گا۔ جب خدا تعالیٰ نے خود ہمیں یہ دعا سکھائی ہے تو اس کے اندر یہ وعدہ موجود ہے کہ وہ تنزل جو قوموں پر ان کے عروج کے بعد آتا ہے مسلمانوں کے اس دعا مانگنے کی وجہ سے پیچھے ڈال دیا جائے گا۔ اور ان کے عروج کے زمانہ کو لمبا کر دیا جائے گا۔ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک بزرگ تھے۔ جو وَلَا الضَّآلِّيْنَ کی مدّ اور شدّ سے ایک عجیب استدلال کیا کرتے تھے۔ وہ بزرگ کہتے تھے کہ وَلَا الضَّآلِّيْنَ میں جو شدّ کے بعد مدّ آئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیوں کا زمانہ بہت لمبا ہوگا (حقائق الفرقان تفسیر سورہ فاتحہ آیت ۷) مگر اس سے بھی بڑا نکتہ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ میں یہ موجود ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو پورا ہی نہیں کرنا تھا تو اس دعا پر زور ہی کیوں دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا اس دعا کو ہم سے بار بار منگوانا بتاتا ہے کہ وہ اسے ضرور پورا کرے گا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کا گروہ نہ آنا تھا تو یہ دعا مسلمانوں کو سکھائی ہی کیوں گئی تھی۔ اسی طرح میں کہتا ہوں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بچانا نہ تھا تو غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ والی دعا کیوں سکھائی۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ والی دعا سکھا کر بتا دیا کہ وہ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کا ایک گروہ پیدا کرنا چاہتا ہے اسی طرح غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ والی دعا سکھا کر اس نے بتا دیا ہے کہ اگر مسلمان اس پر عامل رہے تو ان کو مغضوب اور ضالین میں شامل ہونے سے بھی بچایا جائے گا اگر ضآلین کی مدّ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ عیسائیوں کو عروج کا لمبا زمانہ نصیب ہوگا تو غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے بدرجہ اتم یہ استنباط ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو عیسائیوں سے بھی لمبا زمانہ دیا جائے گا اور ضآلین بننے سے بھی بچایا جائے گا۔ حدیثوں سے بیشک یہ معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے قریب دنیا میں اشرار ہی رہ جائیں گے (بخاری کتاب الفتن باب ظهور الفتن) مگر قرب قیامت کی تعیین کوئی شخص نہیں کر سکتا۔ اور خدا تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کب آئے گی۔ کیونکہ قرآن کریم میں ایک ایک دن کو ایک ہزار اور پچاس ہزار سال کا بتایا گیا ہے۔ اس طرح اگر دنیا کی عمر سات ہزار سال شمار کی جائے اور

ایک دن ایک ہزار سال کا شمار کیا جائے تو دنیا کی عمر ستر لاکھ سال بنتی ہے۔ اور اگر ایک دن پچاس ہزار سال کا شمار کیا جائے تو یہ عمر ۳۵ کروڑ سال بنتی ہے۔ اور خدا کے دن تو اس سے بڑے ہو سکتے ہیں اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ دنیا کی عمر کتنی ہے۔ ہم یہ تو مان لیتے ہیں کہ یہ آخری زمانہ ہے مگر اس کی حد بندی کس طرح کی جائے اس کا علم تو صرف خدا تعالیٰ کو ہی ہے لوگوں کی بحثیں محض فلسفیانہ ہیں۔ اور فلسفیانہ بحثیں ہمیشہ عبث اور لا حاصل ہوتی ہیں۔ درحقیقت یہ سب باتیں جو آخری زمانہ کے متعلق بیان ہوئی ہیں استعارات سے پُر ہیں جن کی تفصیلات ہمیں خدا تعالیٰ پر چھوڑ دینی چاہئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ تم قومی لحاظ سے خواہ کتنی بھی ترقی کر جاؤ تمہیں ہمیشہ یہ امر مدّنظر رکھنا چاہیے کہ اگر تمہارا قدم ذرا بھی پھسلا تو یا تو تم مغضوب علیہم میں شامل ہو جاؤ گے اور یا پھر ضآلین میں تمہارا شمار ہو جائے گا۔ اگر تم اللہ تعالیٰ کے دامن کو مضبوطی سے پکڑے رکھو گے اور ہمیشہ اس سے دعائیں کرتے رہو گے کہ وہ تمہارا قدم صراط مستقیم پر قائم رکھے تو اس کا فضل تمہارے شامل حال ہوگا اور وہ تمہیں تنزل اور انحطاط کا شکار ہونے سے محفوظ رکھے گا۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے اسی نکتہ کی طرف اپنی قوم کو توجہ دلائی اور فرمایا کہ کیا تم نہیں دیکھتے کہ تم سے پہلے بھی کئی قومیں گزری ہیں جنہیں اپنے اپنے زمانہ میں بڑی بڑی طاقت حاصل تھی مگر جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی تو وہ تباہ و برباد کر دی گئیں۔ پھر تم کیوں اپنی چند روزہ زندگی میں تقوی اللہ سے کام نہیں لیتے اور مادّی لذات کے حصول کے لئے ناجائز ذرائع اور تدابیر اختیار کرتے ہو۔

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴿۱۸۶﴾ وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ

(اس پر اس کی قوم نے) کہا۔ تُو تو ایسا (شخص) ہے جسے غذا دی جاتی ہے۔ اور تُو صرف

مِّثْلُنَا وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۱۸۷﴾ فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا

ہماری طرح کا ایک انسان ہے اور ہم یقیناً تجھے کاذب سمجھتے ہیں۔ پس اگر تو سچا ہے تو ہم پر کوئی بادل کا ٹکڑا گرا۔

كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۸﴾ قَالَ

(اس پر شعیبؑ نے) کہا۔ میرا ربّ تمہارے اعمال کو خوب جانتا ہے۔ (مگر اس کے سمجھانے کے

رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۹﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ

باوجود) انہوں نے اس کو جھٹلایا۔ پس ان کو سایہ کے دن والے عذاب نے آ پکڑا (یعنی گھنے اور

يَوْمِ الظُّلَّةِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۹۰﴾ اِنَّ فِيْ

دیرپا بادلوں کے عذاب نے) وہ یقیناً ایک بڑے بھاری دن کا عذاب تھا۔ اس واقعہ میں

ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹۱﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ

ایک بڑا نشان تھا اور (اسے دیکھ کر بھی) ان کافروں میں سے اکثر مومنوں میں شامل نہ ہوئے۔

لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۹۲﴾ ع

اور تیرا رب یقیناً غالب (اور) بار بار کرم کرنے والا ہے۔

حلّ لُغات۔ اَلْمُسَحَّرِيْنَ اَلْمُسَحَّرِيْنَ سَحَّرَ سے اسم مفعول کا صیغہ ہے اور سَحَّرَهٗ کے معنے ہیں اَعْطَاهُ السَّحُوْرَ۔ اس کو غذا دی۔ (اقرب) مفردات میں ہے سَمُّوا الْغِذَاءَ سِحْرًا مِنْ حَيْثُ اِنَّهٗ يَدِقُّ وَيَلْطُفُ تَاْثِيْرُهٗ۔ یعنی غذا کو عربی زبان میں سِحر اس لئے کہتے ہیں کہ اس کی تاثیر جسم میں بہت باریک اور لطیف ہوتی ہے۔ پس مُسَحَّرِيْن کے معنے ہوں گے جن کو غذا دی جائے۔

كِسَفًا كِسَفًا كِسْفَةٌ کی جمع ہے اور اَلْكِسْفَةُ کے معنے ہیں اَلْقِطْعَةُ مِنَ الشَّيْءِ کسی چیز کا ٹکڑا۔ (اقرب)

اَلظُّلَّةُ اَلظُّلَّةُ اَوَّلُ سَحَابَةٍ تُظِلُّ۔ بادلوں میں سے پہلا بادل جو زمین پر سایہ ڈالتا ہے۔ (اقرب) عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ۔ سَحَابَةٍ اَظَلَّتْهُمْ فَلَجَاؤُا اِلٰى ظِلِّهَا فَاطْبَقَتْ عَلَيْهِمْ وَاَهْلَكَتْهُمْ۔ شعیبؑ کی قوم پر بادل آئے اور وہ قوم تو ان کو اچھا سمجھتی رہی۔ لیکن ان بادلوں نے ان کو برباد کر دیا۔ اس کو قرآن مجید نے عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ سے تعبیر کیا ہے۔ (اقرب)

تفسیر۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی نصائح پر ان کی قوم نے جو جواب دیا وہ یہ تھا کہ تم نے جو ہم سے ٹکّر لی ہے یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ کوئی اور تمہیں اُکسا رہا ہے اور تمہیں مالی مدد دے رہا ہے تاکہ تم ہمارے خلاف ایسی باتیں کرو اور ہماری طاقت کو کمزور کردو۔

سَحَّرَ کے معنے عربی زبان میں کھانا دیئے جانے کے ہوتے ہیں۔مگر استعارۃً انہوں نے یہ الفاظ مدد دیئے جانے معنوں میں استعمال کئے ہیں۔اور مطلب یہ ہے کہ ہم چونکہ تجارتی قوم ہیں جو لوگ تجارت میں ہم سے بڑھ نہیں سکتے انہوں نے تجھ کو رشوت دی ہے کہ تو ہمیں ان طریقوں سے روک دے جن سے ہماری تجارت ترقی کر رہی ہے۔پھر انہوں نے کہا کہ مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا۔آخر تو ہمارے جیسا ایک آدمی ہے اور کیا ہے وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ اور ہم تو تجھے یقیناً جھوٹا سمجھتے ہیں فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ۔اگر تو سچا ہے تو آسمان سے ہم پر بادل کا کوئی ٹکڑا گرا دے۔یعنی اتنی شدید بارش ہو کہ بجائے اس کے کہ ہماری کھیتیوں اور باغات کا پھل بڑھے سارا ملک تباہ ہو جائے۔ہم تو تیری سچائی کا صرف یہی ایک معیار سمجھتے ہیں۔حضرت شعیبؑ نے ان سے کہا۔میرا رب تمہارے اعمال کو خوب جانتا ہے اور وہ جس قسم کا سلوک چاہے گا تم سے کرے گا۔مگر پھر بھی وہ اس کو جھٹلاتے ہی رہے۔آخر ان کو انہی کے میعار کے مطابق ایک سائے والے دن کے عذاب نے پکڑ لیا۔یعنی بادوباراں کا ایسا شدید طوفان آیا کہ جس نے ملک کو تباہ کر دیا وہ عذاب ایک ہولناک دن کا عذاب تھا اور اس نے بعد میں اس ملک کو آنے والی نسلوں کے لئے ہمیشہ کے لئے ایک نشان بنا دیا۔

یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن کریم نے اس عذاب کے متعلق ایک اور جگہ صَيْحَةٌ اور دوسری جگہ رَجْفَةٌ کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔چنانچہ سورۂ ہود میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ (ہود:۹۵) یعنی جب ہمارا عذاب آ گیا۔تو ہم نے شعیبؑ اور اس پر ایمان لانے والوں کو اپنے فضل سے بچا لیا اور وہ لوگ جنہوں نے ظلم کا شیوہ اختیار کیا تھا انہیں عذاب نے پکڑ لیا اور وہ اپنے گھروں میں زمین سے چمٹے ہوئے تباہ ہو گئے۔

اسی طرح سورۂ عنکبوت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ (العنکبوت:۳۸) یعنی انہوں نے شعیبؑ کو جھٹلا دیا جس کے نتیجہ میں ایک ہلا دینے والے عذاب نے ان کو پکڑ لیا اور اپنے گھروں میں زمین سے چمٹے کے چمٹے رہ گئے۔

ان دونوں مقامات پر یہ امر بیان نہیں کیا گیا کہ آیا یہ عذاب ان پر زلزلہ کی شکل میں آیا یا کسی اور شکل میں۔مگر سورۂ شعراء میں اللہ تعالیٰ نے اس عذاب کے متعلق وضاحت فرما دی کہ یہ عذاب ایک ہولناک بارش کی صورت میں آیا تھا۔جس کے نتیجہ میں وہ اپنے گھروں میں زمین سے چمٹے کے چمٹے رہ گئے۔باقی رہا صَيْحَة یا رَجْفَة کے الفاظ کا استعمال۔سو صَيْحَة کے معنے مطلق عذاب کے بھی ہیں اور صَيْحَة کے معنے ایسی تباہی کے بھی ہیں جو اچانک آ جائے۔

اور رَجْفَة کے لفظ میں اس ہلا دینے والے منظر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو انہیں اپنی بداعمالی کی وجہ سے دیکھنا پڑا اور جس نے ان کی بنیادوں کو ہلا ڈالا۔ چنانچہ رَجَفَ الْاِنْسَانُ کے معنے ہوتے ہیں لَمْ يَسْتَقِرَّ لِخَوْفٍ عُرِضَ لَهٗ کہ کسی خوف کی وجہ سے اس کا قرار چھینا گیا۔ اور ایک جگہ آرام سے بیٹھنا اس کے لئے ناممکن ہو گیا اور رَجَفَ الرَّعْدُ کے معنے ہوتے ہیں تَرَدَّدَتْ هَدْهَدَتُهٗ فِي السَّحَابِ (اقرب) بادلوں میں بڑے زور سے اس کی گڑگڑاہٹ کی آوازیں پیدا ہوئیں۔ پس یہ الفاظ بھی اس تباہ کن بارش کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جس نے اچانک ان کے قرار کو چھین لیا۔ اور انہیں ایک ایسے عذاب میں مبتلا کر دیا جس سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ ہر شخص اپنے اپنے مکان میں محصور رہا۔ یہاں تک کہ ان کے مکانوں کی دیواریں چھتوں سمیت ان پر آ گریں اور وہ زمین کے ساتھ چمٹے کے چمٹے رہ گئے۔

فرماتا ہے۔ شعیبؑ کی قوم کی اکثریت بھی ایمان سے محروم رہی اور بہت تھوڑے لوگ اپنے زمانہ کے نبی پر ایمان لائے۔ مگر اے محمدؐ رسول اللہ! اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ تجھے کسی گھبراہٹ کی ضرورت نہیں کیونکہ تیرا رب جس نے تجھے نہایت ادنیٰ حالت سے ترقی دیتے دیتے اس عظیم الشان مقام تک پہنچایا ہے وہ بڑا غالب اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔ بیشک موسیٰؑ اور ابراہیمؑ اور نوحؑ اور ہودؑ اور صالحؑ اور لوطؑ اور شعیبؑ پر ان کی قوم کی اکثریت ایمان نہیں لائی۔ مگر جس طرح تیری شان ان تمام نبیوں سے نرالی ہے اسی طرح خدا تعالیٰ کا سلوک بھی تیرے ساتھ ان تمام نبیوں سے نرالا ہے وہ کبھی ایسا نہیں کرے گا کہ تیری قوم کی اکثریت ایمان سے محروم رہے۔ بلکہ ان کی شدید ترین مخالفت کے باوجود اللہ تعالیٰ ان کی اکثریت کو اپنے دامنِ رحمت میں جگہ دے گا اور انہیں تجھ پر ایمان لانے کی سعادت سے بہرہ ور فرمائے گا۔ یہی حکمت ہے جس کی بناء پر بار بار اس آیت کو دہرایا گیا ہے اور بار بار رَبَّكَ کے لفظ پر زور دیا گیا ہے۔ رَبَّكَ کہہ کر اللہ تعالیٰ نے خصوصیت سے اپنی اس غیر معمولی ربوبیت کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمائی۔ اور اس طرح بتایا کہ جس خدا نے بچپن سے تجھے اپنے کنار عاطفت میں رکھا اور تجھے قدم بقدم ترقی دیتے دیتے اس عالی شان مقام تک پہنچایا وہ اب تجھے کس طرح چھوڑ سکتا ہے۔ وہ یقیناً تبلیغ ہدایت کے معاملہ میں بھی تجھ سے ممتاز سلوک کرے گا۔ اور تیری افضلیت کو باقی تمام انبیاء پر ثابت کر دے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اللہ تعالیٰ نے جس غیر معمولی رنگ میں ربوبیت فرمائی اور جس طرح نہایت ادنیٰ حالت سے ترقی دیتے دیتے آپؐ کو بلندیوں کے انتہا تک پہنچا دیا اس کی نظیر دنیا کے اور کسی نبی

کی زندگی میں نظر نہیں آتی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بچپن میں ہی یتیم رہ گئے تھے۔ آپؐ کے والد محترم آپؐ کی پیدائش سے بھی پہلے اور آپؐ کی والدہ ماجدہ آپؐ کی پیدائش کے چند سال بعد ہی وفات پا گئی تھیں۔ اس کے بعد کچھ عرصہ آپؐ کو آپؐ کے دادا حضرت عبدالمطلب نے اپنے پاس رکھا مگر جب وہ بھی وفات پا گئے تو آپؐ اپنے چچا ابوطالب کی کفالت میں آ گئے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انہوں نے بڑی محبت اور پیار کے ساتھ آپؐ کی پرورش کی اور ہر نازک سے نازک موقعہ پر انہوں نے آپؐ کا ساتھ دیا۔ مگر آپؐ کی زندگی کا ایک واقعہ ایسا ہے جو ہمیشہ ہی میرے قلب کو مضطرب کر دیا کرتا ہے۔ تاریخوں میں لکھا ہے کہ آپؐ کے چچا کے گھر میں جب کھانا تقسیم ہوتا تھا تو آپؐ کبھی بڑھ کر مانگا نہیں کرتے تھے باقی بچے لڑ جھگڑ کر مانگتے مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف خاموش کھڑے رہتے اور جب آپؐ کی چچی آپؐ کو کچھ دیتی تو آپؐ لے لیتے۔ خود مانگ کر نہیں لیتے تھے (السیرۃ الحلبیۃ وفاۃ عبد المطلب و کفالۃ عمّہ ابی طالب لہٗ)۔ بالعموم اس واقعہ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقار اور آپ کی متانت کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے مگر میں تو جب بھی اس واقعہ کو پڑھتا ہوں میری طبیعت رقّت کے جذبات کے انتہائی مقام پر پہنچ جاتی ہے۔ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا زمانہ نہیں تھا بلکہ بچپن کا زمانہ تھا اور آپؐ زیادہ سے زیادہ اس وقت آٹھ نو سال کی عمر کے تھے۔ اور آٹھ نو سالہ بچے کے متعلق یہ ثابت کرنا کوئی ضروری نہیں ہوتا کہ وہ بڑا باوقار تھا خواہ آئندہ چل کر وہ نبی ہی بننے والا کیوں نہ ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود فرماتے ہیں اَلصَّبِیُّ صَبِیٌّ وَلَوْ کَانَ نَبِیًّا کہ بچہ بچہ ہی ہے خواہ آئندہ زمانہ میں وہ نبی بننے والا ہو۔ میری طبیعت تو یہ واقعہ پڑھ کر اس خیال سے بے تاب ہو جاتی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس بچپن کی عمر میں بوجہ اپنی ذہانت اور سمجھ کے (بعض بچے جو ذہین نہیں ہوتے وہ چچی اور ماں کا فرق کوئی زیادہ نہیں سمجھتے اور وہ اسی طرح چچی سے بھی لڑ جھگڑ کر چیزیں مانگ لیتے ہیں جس طرح ماں سے مانگی جاتی ہیں مگر یہ محبت کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ ان کی عقل کی کمی کا نتیجہ ہوتا ہے) یہ محسوس کرتے تھے کہ میں اس گھر سے بطور حق کے کچھ نہیں مانگ سکتا۔ مجھ پر تو میرے چچا اور چچی کا یہ احسان ہے کہ انہوں نے محبت اور پیار سے مجھے اپنے پاس رکھ لیا ہے۔ پس کبھی بھی اس واقعہ کو پڑھتے ہوئے میں بغیر اس کے کہ رقّت مجھ پر غلبہ نہ پا لے آگے نہیں گزر سکتا۔ اور میں ہمیشہ سوچتا ہوں کہ اس وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب میں کیا جذبات پیدا ہوتے ہوں گے۔ بعض دفعہ آپؐ کے چچا بھی موجود ہوتے اور چچا کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو محبت تھی وہ ایسی تھی کہ باپ کی طرح ہی تھی۔ اسی وجہ سے بعض دفعہ ابوطالب جب گھر میں آتے اور وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عام بچوں سے الگ ایک طرف کھڑے دیکھتے اور یہ بھی دیکھتے کہ باقی بچے شور کر رہے

ہیں اور لڑ جھگڑ کر چیزیں لے رہے ہیں مثلاً مٹھائی تقسیم ہو رہی ہے تو ایک کہتا ہے میں مٹھائی کی ایک ڈلی نہیں دو ڈلیاں لوں گا۔ دوسرا کہتا ہے۔اماں مجھے تو تُو نے کچھ بھی نہیں دیا۔اسی طرح ہر بچہ اپنا اپنا حق جتا کر چیز کا مطالبہ کر رہا ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک کونہ میں خاموش بیٹھے ہوئے ہیں تو ابو طالب ان کو بازو سے پکڑ لیتے اور کہتے میرے بچے تو یہاں کیوں خاموش بیٹھا ہے پھر وہ آپؐ کو لا کر اپنی بیوی کے پاس کھڑا کر دیتے اور کہتے تو بھی اپنی چچی سے چمٹ جا اور اس سے مانگ۔مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہ چمٹتے اور نہ کچھ مانگتے۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت دراصل انہی جذبات کا نتیجہ تھی کہ آپؐ سمجھتے تھے۔میرا اس گھر پر کوئی حق نہیں۔اور جو کچھ مجھے ملتا ہے بطور احسان ملتا ہے۔ مجھ پر یہ نکتہ اس وقت کھلا جب میری بیوی سارہ بیگم فوت ہوئیں اس وقت اخبار میں جو میں نے مضمون شائع کرایا تھا اس میں بھی اس واقعہ کا ذکر کر دیا تھا۔سارہ بیگم کی بچی کی جوتی ایک دفعہ پھٹ گئی۔جس گھر میں مَیں نے اسے رکھا تھا انہوں نے نوکر کو کہا کہ بازار سے جا کر اس بچی کے لئے بوٹ لے آؤ۔ چار پانچ سال اس کی عمر تھی وہ بوٹ لایا میں اس وقت صحن میں ایک طرف کھڑا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس نے بوٹوں کے جوڑے اپنی گودی میں لے لئے اور خوشی سے کودی اور کہا۔آہا میرے بوٹ آ گئے۔میرے بوٹ آ گئے۔مگر پھر میں نے دیکھا کہ یکدم اس کا چہرہ متغیر ہو گیا۔اس نے زمین پر بوٹ رکھ دیئے اور حیران ہو کر کھڑی ہو گئی۔اور بے اختیار اس کی زبان سے نکلا۔ہائے اللہ! اب میں یہ بوٹ دکھاؤں کسے۔تب میرے لئے یہ امر حل ہوا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا علیحدہ بیٹھنا بھی اس قسم کا تھا یہ بچی ۲۹ء؁ میں پیدا ہوئی تھی اور ۳۳ء؁ کا یہ واقعہ ہے ایک چار سال کے بچے کے منہ سے یہ فقرہ مجھے عجیب قسم کا معلوم ہوا کہ حیران ہو کر اس نے بوٹ زمین پر رکھ دیئے اور کہا۔ہائے اللہ! اب میں بوٹ دکھاؤں کسے۔تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو علیحدہ بیٹھنا تھا۔وہ بھی اسی رنگ کا تھا۔اب یہ جذبات خواہ کتنے ہی بے چین کرنے والے ہوں اگر کوئی شخص اپنی زندگی کو خدا تعالیٰ کے لئے خرچ کر دیتا ہے تو پھر یہی غم کے جذبات جو دراصل کمزوری کے جذبات ہیں اسے کہیں کا کہیں پہنچا دیتے ہیں۔چنانچہ ایک طرف اس بچے کو دیکھو جو صحن کے ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا ہے سارے بچے اس کے پاس سے کودتے ہوئے گزر جاتے ہیں اور اپنی والدہ کے پاس پہنچ کر کوئی اس کے کندھے پر چڑھ جاتا ہے کوئی اس کے دامن سے لپٹ جاتا ہے۔کوئی کہتا ہے اماں! میں فلاں چیز ایک نہیں دو لوں گا۔کوئی کہتا فلاں کو کیوں زیادہ دیا میں بھی اتنا ہی لوں گا۔غرض کوئی کچھ کہہ رہا ہے اور کوئی کچھ۔ مگر وہ ایک گوشہ میں خاموش بیٹھا ہے سارے کا خیال اس کے دل میں نہیں آتا۔اس کے دل میں آدھے کا خیال بھی نہیں آتا۔اس کے دل میں چوتھے حصے کا خیال بھی نہیں آتا۔اس کے دل میں یہ خیال بھی نہیں آتا کہ وہ بیسویں حصہ

کا حقدار ہے۔ بلکہ اس کے دل میں یہ خیال بھی نہیں آتا کہ میری چچی مجھے کچھ دیتی ہے یا نہیں۔ باقی تمام بچے چمٹ چمٹ کر مانگتے ہیں اصرار کر کے مانگتے ہیں مگر وہ ایک گوشہ میں کھڑے یہ خیال کرتا ہے کہ دنیا میں میرا حصہ ہے ہی نہیں۔ میں اگر مانگوں تو کیوں مانگوں۔ اور اگر مانگوں تو کس سے مانگوں۔ لیکن خدا تعالیٰ کی راہ میں زندگی بسر کرنے کے بعد وہی بے کس اور یتیم جب فوت ہوتا ہے تو دنیا میں اس کے سوا کسی اور کا حصہ باقی نہیں رہتا۔ ساری ہی دنیا اس کی ہو جاتی ہے۔ اور دنیا ہی نہیں خالق کون ومکاں بھی کہتا ہے کہ لَوْ لَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ (تفسیر روح المعانی للآلوسی قولہ تعالیٰ رب السموت والارض وما بینھما۔) اے محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی زمانہ تھا کہ تو یہ سمجھا کرتا تھا کہ مٹھائی کی ایک ڈلی۔ روٹی کے ایک ٹکڑے اور گوشت کی ایک بوٹی میں بھی تیرا حصہ نہیں اور تو گوشہ تنہائی میں بیٹھا یہ خیال کیا کرتا تھا کہ جن پر میرا حق تھا وہ دنیا میں نہیں رہے۔ مگر اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تجھے پتہ بھی ہے کہ تیری پیدائش سے بھی پہلے جب کہ ابھی کائناتِ عالم وجود میں نہیں آئی تھی۔ ہم نے اسے پیدا ہی تیری خاطر کیا تھا اور ہم نے اسی وقت سے یہ فیصلہ کیا ہوا تھا کہ یہ تمام زمین و آسمان میں تیری خاطر بناؤں گا۔ اگر تو نہ ہوتا تو میں زمین و آسمان کو بھی پیدا نہ کرتا۔ گو یہ حدیث صوفیاء کی احادیث میں سے ہے ان احادیث میں سے نہیں جن کو محدثین صحیح قرار دیتے ہیں مگر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے الہام نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ سچی حدیث ہے۔ کیونکہ آپؑ کا بھی الہام ہے کہ لَوْ لَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ (تذکرہ صفحہ ۶۲۳ ایڈیشن ۲۰۲۲ء، حقیقۃ الوحی روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۱۰۲) اب مقابلہ کرو اس کیفیت کا اس یتیم کا جو گوشہ تنہائی میں بیٹھا ہوا اپنے آپ کو کامل لاوارث سمجھتا تھا۔ جو مکہ کے ایک چھوٹے سے غریب گھر میں پیدا ہوا۔ جو روٹی کے ایک ٹکڑے اور گوشت کی ایک بوٹی پر بھی اپنا حق نہیں سمجھتا تھا۔ وہی ایک دن مکہ میں داخل ہوتا ہے اور مکہ کے تمام بڑے بڑے سردار مجرموں کی طرح اس کے سامنے پیش ہوتے ہیں اور وہ پوچھتا ہے۔ بتاؤ اب تم سے کیا سلوک کیا جائے۔ گویا وہ جن کے گھر کی ایک دھجی پر بھی وہ اپنا تصرف نہیں سمجھتا تھا ان کے جسم کا تسمہ تسمہ اس کے قبضہ میں تھا اور وہ تمام سردار گردن ڈالے ہوئے اس کے سامنے کھڑے تھے اور کہہ رہے تھے آپ ہم سے وہی سلوک کریں جو یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کیا۔ چنانچہ وہ یتیم جس سے دنیا نے حسنِ سلوک نہیں کیا تھا جسے دنیا نے غیر حقدار اور لاوارث قرار دیا تھا۔ جب خدا نے اس کو طاقت دی تو اُس نے اُن سے یہ سلوک کیا کہ کہا لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ جاؤ تم پر کوئی گرفت نہیں۔

غرض یہ وہ شخص تھا جو اپنی وفات سے ستاون اٹھاون سال پہلے اپنے گھر کے صحن میں اس لئے خاموش کھڑا رہتا اور گھر کی مالکہ سے دوسرے بچوں کی طرح نہ چمٹتا کہ وہ سمجھتا تھا کہ میرا اس گھر میں کوئی حق نہیں۔ مگر پھر اس حالت

میں اتنا عظیم الشان تغیر آ گیا کہ یا تو آپؐ ایک یتیم اور بے کس تھے اور یا پھر تمام دنیا کا سہارا آپؐ ہی بن گئے اور تمام دنیا کی ماں آپؐ ہی بن گئے۔ وہی یتیم بچہ جو کسی وقت بے باپ اور بے ماں کے تھا۔ ایک وقت اس پر آیا جب وہ ساری دنیا کا باپ اور ساری دنیا کی ماں بن گیا۔ بلکہ وہی باپ نہیں بنا اس کی بیویاں بھی مومنوں کی مائیں بن گئیں۔ گویا ابوت صرف آپؐ تک محدود نہ رہی بلکہ آپؐ سے تعلق رکھنے والوں کی عظمت بھی آپؐ ہی کے ذریعہ قائم ہوئی۔

غرض اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ میں اللہ تعالیٰ نے ان عظیم الشان احسانات کا ذکر فرمایا ہے جو اس نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر فرمائے اور بتایا ہے کہ جس خدا نے تجھے اتنی عظیم الشان ترقی بخشی وہ اب بھی تجھے کبھی ضائع نہیں کرے گا بلکہ تیری ساری مرادیں تجھے دے گا۔ اور تجھے ساری دنیا پر غلبہ اور فتح عطا کرے گا۔ اور یہ غلبہ صرف ایک زمانہ تک محدود نہیں ہوگا۔ بلکہ جس طرح خدا تعالیٰ بار بار رحم کرنے والا ہے اسی طرح وہ بار بار تجھے غالب کرے گا۔ گویا ہر تاریکی کا دور جب بھی دور ہوگا دنیا دیکھے گی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آفتاب حقانیت اپنی پوری شان کے ساتھ چمک رہا ہے۔

وَ اِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ

اور یقیناً یہ (قرآن) ربّ العالمین خدا کی طرف سے اتارا گیا ہے۔ اس کو لے کر ایک امانت دار کلام بردار فرشتہ

الْاَمِيْنُ ﴿۱۹۴﴾ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۱۹۵﴾

(جبریلؑ) تیرے دل پر اترا ہے۔ تاکہ تو ہوشیار کرنے والی جماعت میں شمار ہو جائے۔ (اس کو جبریلؑ نے

بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴿۱۹۶﴾ وَ اِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۹۷﴾

خدا کے حکم سے) کھول کر بیان کرنے والی عربی زبان میں اتارا ہے۔ اور یقیناً اس کا ذکر پہلی کتابوں میں بھی

اَوَ لَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا

موجود تھا۔ کیا ان کے لئے یہ نشان کم ہے کہ اس (قرآن) کو علمائے بنی اسرائیل بھی پہنچانتے ہیں (یعنی سمجھتے ہیں کہ

بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ﴿۱۹۸﴾

یہ قرآن انبیائے بنی اسرائیل کی پیشگوئیوں کے مطابق ہے)۔

حلّ لُغَات۔ زُبُرٌ زَبُوْرٌ کی جمع ہے اور اَلزَّبُوْرُ کے معنے ہیں اَلْکِتٰبُ۔ کتاب۔ (اقرب)

تفسیر۔ حضرت موسیٰؑ حضرت ابراہیمؑ حضرت نوحؑ اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کا ذکر کرنے کے بعد جو بعض مخصوص اقوام کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے تھے اب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ کلام جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا ہے یہ سب دنیا کو مخاطب کر کے نازل کیا گیا ہے۔ جب کہ پہلے کلام صرف بعض خاص خاص قوموں کی ہدایت کے لئے نازل ہوئے تھے اور جب کہ وہ کلام صرف اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا ثبوت تھے۔ یہ کلام ربوبیت عالمین کا ثبوت ہے اور اس کلام کو رُوح الامین لے کر نازل ہوا ہے۔ کیونکہ پہلے نبیوں کے کلام میں کئی قسم کی خرابیاں واقع ہو گئی تھیں اور بندوں نے اس کی حفاظت میں کوتاہی کی تھی۔ پس خدا تعالیٰ نے اس روح کے ذریعہ سے جو امین ہے محفوظ طور پر یہ کلام آپ پر نازل کیا۔ اور چونکہ کلام الٰہی کے پہنچانے کے لئے اس کا سمجھنا بھی ضروری تھا تا کہ لوگوں تک اس کے پہنچانے میں کسی قسم کی خرابی واقع نہ ہو اس لئے وہ کلام تیرے دل پر نازل کیا گیا ہے اور یقیناً یہ کلام پہلی کتب میں بھی مذکور ہے۔ اس طرح بھی کہ اس کے اصول ان میں پائے جاتے ہیں اور اس طرح بھی کہ ان کتابوں میں اس کی پیشگوئی موجود ہے۔

قرآن کریم کو دوسری الہامی کتب پر جو فضیلتیں حاصل ہیں ان میں سے ایک بہت بڑی فضیلت یہ بھی ہے کہ قرآن کریم سے پہلے ربّ العالمین کا خیال دنیا میں معین صورت میں موجود نہیں تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ ایک ہستی کو سب دنیا کا خالق و مالک مانتے تھے مگر چونکہ ان کی تعلیم قومی تھی اور مشرکین خاص طور پر اپنے اپنے خدا الگ پیش کرتے تھے اس لئے انسانی ذہن محدود خیالات کا مرجع رہتا تھا۔ اسی وجہ سے فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (الشعراء: ۲۴) اے موسیٰؑ یہ رب العالمین کون ہے جس کی طرف سے مبعوث کئے جانے کا تم دعویٰ کرتے ہو۔ اور پھر ڈوبتے وقت بھی اس نے کہا کہ میں ربّ بنی اسرائیل پر ایمان لاتا ہوں (یونس ع ۹) لیکن قرآن کریم نے اس خیال کو ایک معین صورت میں پیش کیا اور اس طرح اتحادِ بین الاقوام کی ایسی داغ بیل ڈال دی جو پہلی تعلیموں کے لحاظ سے ناممکن تھی۔ بائیبل پڑھ کر دیکھ لو۔ اس میں یہی دکھائی دے گا کہ ''خداوند بنی اسرائیل کا خدا مبارک ہے جس نے تجھے بھیجا ہے'' (۱۔سموئیل باب ۲۵ آیت ۳۲) ''خداوند اسرائیل کا خدا

ابدالآباد مبارک ہو‘‘۔ (ا۔تواریخ باب ۱۶ آیت ۳۶) ’’خداوند خدا اسرائیل کا خدا جو اکیلا ہے عجائب کام کرتا ہے۔‘‘ (زبور باب ۷۲ آیت ۱۸) لیکن قرآن کریم نے اس نقطۂ نگاہ کو بالکل بدل دیا۔ اس نے خدا تعالیٰ کو رب العالمین کی شکل میں پیش کیا اور بتایا کہ وہ صرف افراد اور قوموں کا ہی خدا نہیں بلکہ سب مخلوق کا خدا ہے اس کی ابتداء ہی اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سے ہوئی ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ جو سب جہانوں کا رب ہے اس کی برکات کسی خاص قوم سے مخصوص نہیں بلکہ جس طرح جسمانی طور پر اس کے فیوض سب کو پہنچتے ہیں اسی طرح روحانی طور پر بھی اس نے اپنے فیض سے کسی کو محروم نہیں کیا۔ کفار کو اس خیال پر اس قدر حیرت ہوئی کہ وہ بے اختیار کہہ اٹھے کہ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا (ص:۶) یعنی اس نے تو کئی خداؤں کو کوٹ کاٹ کر ایک خدا بنا دیا ہے۔ ان کے خیال میں یہ امر آ ہی نہیں سکتا تھا کہ اصل میں ایک ہی خدا ہے اور باقی سب مصنوعی خدا ہیں کیونکہ وہ یہودیوں اور عیسائیوں سے یہی الفاظ سنتے تھے کہ ’’ہمارا خدا اور تمہارا خدا اور‘‘ گو توحید ان کے سامنے پیش کی جاتی تھی۔ مگر وہ توحید کا یہ مطلب نہیں لیتے تھے کہ سب کا خدا ایک ہے۔ بلکہ یہ سمجھتے تھے کہ خدا تو ایک ہے مگر وہ بنی اسرائیل کا یا مسیحیوں کا خدا ہے اور اگر وہ سچا ہے تو پھر ہم بغیر خدا کے ہیں۔ مگر اسلام نے بتایا کہ وہ مومن و کافر سب کا خدا ہے اور پھر وہ ایک ہی خدا ہے۔ یہ بیان اس صفائی کے ساتھ دنیا کے لئے بالکل نرالہ تھا۔ مگر یہ نرالہ پیغام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دنیا کو دیا گیا اور پھر نرالے طور پر آپ کو ساری دنیا کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا جب کہ پہلے انبیاء صرف ایک ایک قوم کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے تھے اور اس طرح آپ کے ذریعہ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ کا تصور دنیا میں قائم کیا گیا حالانکہ آپؐ ایک ایسے ملک میں پیدا ہوئے تھے جس کے باقی دنیا سے کوئی تعلقات نہیں تھے۔ عرب باقی ساری دنیا سے کٹا ہوا ملک تھا اور عرب کی دنیا صرف عرب تک ہی محدود تھی۔ اور اگر وہ دوسری قوموں کے متعلق کوئی خیال رکھتے بھی تھے تو صرف منافرت کا خیال تھا۔ عربوں میں تکبر اتنا زیادہ پایا جاتا تھا کہ وہ سمجھتے تھے کہ ان سے بڑا کوئی ہے ہی نہیں۔ صرف رومن اور ایرانی حکومتوں کی سیاسی برتری کو وہ تسلیم کرتے تھے گویا سیاسی نقطۂ نگاہ سے تو وہ عرب کو ادنیٰ سمجھتے تھے لیکن قومی نقطۂ نگاہ سے وہ باقی تمام دنیا کو ذلیل خیال کرتے تھے اور قومیت کا خیال آتے ہی وہ عرب کو باقی تمام قوموں سے بالا سمجھنے لگتے تھے۔ ہاں جب سیاست کا سوال آتا تو وہ رومن اور ایرانیوں کے درباروں میں جا کر رومی اور ایرانی بادشاہوں کو حضور کہنے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے کیونکہ جب وہ ان کے درباروں میں جاتے تھے تو کچھ لینے کے لئے جاتے تھے۔ غرض نہ وہ جغرافیائی حیثیت سے ایک دنیا کے قائل تھے اور نہ قومی لحاظ سے ایک دنیا کے قائل تھے۔ پھر جو لوگ رومن اور ایرانی درباروں میں جاتے بھی تھے ان کی تعداد بہت تھوڑی ہوتی تھی بالعموم ان میں وہی لوگ

تھے جنہوں نے اپنے گھروں کے ارد گرد سو سو میل سے باہر قدم نہیں رکھا تھا۔ اس کے مقابلہ میں بنی اسرائیل ایک ترقی یافتہ قوم تھی۔ وہ مصر میں رہتے تھے اور ایک ایسی قوم کے اقتدار میں رہتے تھے جس کی اپنی حکومت تھی۔ پھر مصر ان دنوں سب سے زیادہ متمدن ملک تھا۔ مصر کے جہاز یورپ افریقہ اور ہندوستان وغیرہ دوسرے ممالک میں بھی جاتے تھے اور اس کی بیرونی ممالک سے تجارت تھی جس کے نتیجہ میں وہ ان ممالک سے سیاسی اور تمدنی تعلقات رکھتا تھا۔ غرض مصر میں رہنے والی قوم باقی دنیا کے حالات سے غافل نہیں رہ سکتی تھی۔ مصری قوم اس زمانہ میں ویسی ہی متمدن تھی جیسے آج کل انگلستان کی حکومت ہے۔ انگلستان سیاسی اور تمدنی طور پر اتنی ترقی کر چکا ہے کہ اس میں رہنے والا دنیا کے حالات سے غافل نہیں رہ سکتا۔ افغانستان میں رہنے والا غافل رہ سکتا ہے کیونکہ تمدنی اور سیاسی ترقی میں وہ ابھی بہت پیچھے ہے۔ یہی حالت عرب کی مصر کے مقابلہ میں تھی۔ لیکن مصر میں رہتے ہوئے، مصری اقتدار کے ماتحت رہتے ہوئے اور مصری تہذیب کے ساتھ تعلق رکھتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسرائیل کا خدا پیش کیا۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے تورات میں بار بار یہی ذکر آتا ہے۔ کہ بنی اسرائیل کا خدا یوں کہتا ہے۔ بنی اسرائیل کا خدا یوں کہتا ہے پھر حضرت مسیح علیہ السلام جن کے زمانہ میں تمدن بہت پھیل چکا تھا اور یورپ اور ایشیاء آپس میں مخلوط ہو چکے تھے۔ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ میں بنی اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کو اکٹھا کرنے کے لئے آیا ہوں۔ گویا دنیا میں اتحاد ہو جانے کے باوجود حضرت مسیح علیہ السلام قومی نظریہ سے اوپر نہیں جا سکے حضرت مسیح علیہ السلام بھی یہ خیال نہیں کرتے تھے کہ بنی اسرائیل کے سوا باقی لوگ خدا تعالیٰ کی مخلوق نہیں۔ وہ یہ بھی خیال نہیں کرتے تھے کہ بنی اسرائیل کے علاوہ باقی مخلوق کا خدا خدا نہیں حضرت مسیح موعود علیہ السلام یہی سمجھتے تھے کہ بنی اسرائیل کے علاوہ باقی مخلوق بھی خدا تعالیٰ کی مخلوق ہے اور خدا بنی اسرائیل کے علاوہ دوسرے لوگوں کا بھی خدا ہے مگر باوجود اس کے موسوی نظریہ کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی یہی نظریہ پیش کیا کہ خدا تعالیٰ بنی اسرائیل کا باپ ہے اور باقی لوگ اس کے سوتیلے بیٹے ہیں۔ (متی باب ۱۵ آیت ۲۰ تا ۲۶) اس کے مقابل پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ ایک ایسے ملک میں پیدا ہوئے جو تہذیب اور تمدن کے لحاظ سے بہت پیچھے تھا اور باقی دنیا سے بالکل کٹا ہوا تھا۔ مگر پھر بھی آپؐ نے دنیا کے سامنے پہلی دفعہ یہ نظریہ پیش کیا کہ تمام قومیں خدا تعالیٰ کی مخلوق ہیں اور خدا تعالیٰ تمام قوموں کا خدا ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ بیشک عرب قوم میری مخاطب ہے اور میں اسی میں پیدا ہوا ہوں مگر میں صرف اسی قوم کی بہبودی اور ہدایت کے لئے مبعوث نہیں ہوا۔ بلکہ بُعِثْتُ اِلَی الْاَسْوَدِ وَالْاَبْیَضِ وَالْاَحْمَرِ وَالْاَصْغَرِ (مسند احمد۔ مسند جابر بن عبد اللہ ؓ) میں سیاہ اور سفید اور سرخ اور زرد سب قوموں کی ہدایت کے لئے مبعوث کیا گیا ہوں۔ کوئی چینی ہو

یا افریقی، انگریز ہو یا امریکن ہندوستانی ہو یا جاپانی ان ساروں کے لئے مجھے مبعوث کیا گیا ہے۔ اور میری زندگی ان تمام قوموں کی فلاح و بہبود کے لئے وقف ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام زندہ رہے مگر بنی اسرائیل کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ رہے مگر اپنی قوم کے لئے ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام زندہ رہے مگر فلسطینیوں کے لئے ۔ حضرت نوح علیہ السلام زندہ رہے مگر عراقیوں کے لئے ۔ حضرت کرشن اور حضرت رامچندر علیہما السلام زندہ رہے ۔ مگر ہندوستانیوں کیلئے ۔ انہوں نے تکالیف بھی اٹھائیں اور مصائب بھی برداشت کئے مگر صرف بنی اسرائیل کے لئے یا صرف فلسطینیوں کے لئے یا صرف عراقیوں کے لئے یا صرف ہندوستانیوں کے لئے لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کے حکم سے فرماتے ہیں کہ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ(الانعام: ۱۶۳) یعنی میں اگر تکالیف اور دکھ اٹھاتا ہوں تو صرف ایک قوم کے لئے نہیں بیشک میں عرب قوم میں پیدا ہوا ہوں اور وہ میری پہلی مخاطب ہے لیکن میرے دکھ اور میرے مصائب ساری دنیا کے لئے ہیں ۔ کیونکہ میں نے اپنی ساری زندگی خدا تعالیٰ کے لئے وقف کی ہوئی ہے اور ایسے خدا تعالیٰ کے لئے وقف کی ہوئی ہے جو ربّ العالمین یعنی سب جہانوں کی ربوبیّت کرنے والا ہے ۔ میں صرف عرب قوم کا لیڈر نہیں ہوں ۔ میں تو خدا تعالیٰ کا جو رب العالمین ہے بندہ ہوں اور اس کی خاطر میں نے اپنی ساری زندگی وقف کی ہوئی ہے ۔ وہ اگر ربّ العٰلمین ہے اگر وہ سب جہانوں کی ربوبیّت کرتا ہے تو اس کا خادم ہونے کی حیثیت سے میری تکالیف اور دکھ کسی خاص قوم کے ساتھ کیوں مخصوص ہوں ۔ میں نے خدا تعالیٰ کو ربّ العالمین سمجھ کر مانا ہے ۔ ربِّ عرب یا ربِّ بنی اسرائیل سمجھ کر نہیں مانا ۔ اور جب میں نے اسے ربّ العٰلَمِیْن سمجھ کر مانا ہے تو اس کی جتنی بھی مخلوق ہے سب کی خاطر مجھے اپنے اوپر تکالیف وارد کرنی چاہئیں ۔ اسی وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم میں کثرت سے اس قسم کے احکام پائے جاتے ہیں کہ عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں ۔ اور نہ عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت ہے ۔ مگر حضرت مسیح علیہ السلام کے پاس جب ایک غیر قوم کی عورت نے آ کر کہا کہ اے استاد تو مجھے بھی اس سچائی سے حصّہ دے جو تو بنی اسرائیل کے سامنے پیش کرتا ہے تو اس عورت کی خاطر دکھ اور تکلیف اٹھانا تو الگ رہا ۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے کہا ۔ بیٹوں کی روٹی میں کُتّوں کے آگے کیسے پھینک دوں (متی باب ۱۵ آیت ۲۶) ۔ گو یا ان کی نگاہ میں بنی اسرائیل تو خدا کے بیٹے تھے اور غیر قومیں کتّوں کی مانند تھیں ۔ اس کے مقابلہ میں اسلام کے ابتدائی زمانہ میں ۔ ایسے ابتدائی زمانہ میں جبکہ ابھی تعلیم مکمل نہیں ہوئی تھی ۔ جبکہ قرآن کریم کا ایک پارہ بھی پورا نازل نہیں ہؤا تھا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہدایت اور راستی کے متلاشی آتے

ہیں۔ان میں سے کوئی یونانی ہوتا ہے جیسے سہیلؓ ۔کوئی حبشہ کا ہوتا ہے جیسے بلالؓ ۔کوئی ایران کا ہوتا ہے جیسے حضرت سلمانؓ ۔ یہ لوگ آتے ہیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی یہ خواہش پیش کرتے ہیں کہ ہمیں بھی اپنی تعلیم سنائیے ۔ان کے سوال کے جواب میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ نہیں فرماتے کہ کوئی شخص اپنے بیٹوں کی روٹی کُتّوں کے آگے نہیں پھینک سکتا۔ بلکہ آپؐ سمجھتے ہیں کہ جس طرح عرب قوم ہے ویسے ہی یہ لوگ بھی ہیں۔آپ فوراً انہیں تعلیم دینا شروع کر دیتے ہیں ۔بلکہ دینی تعلیم دینا تو الگ رہا یہاں تک ثابت ہے کہ دو بھائی تھے جو عربی زبان کا ایک لفظ بھی نہیں جانتے تھے یا بہت کم علم رکھتے تھے۔وہ صرف بائیبل جانتے تھے اور لوہا کوٹا کرتے تھے۔آپؐ ان دونوں بھائیوں کو اشاروں کے ساتھ تبلیغ کیا کرتے تھے۔جب آپؐ وہاں سے گذرتے تو ان کے پاس کھڑے ہو جاتے ہیں۔وہ دونوں یونانی تھے اور آپ کی باتیں نہیں سمجھ سکتے تھے۔لیکن آپ محبت کی وجہ سے وہاں کھڑے ہو جاتے اور ان کی باتیں سنتے۔پھر آپؐ انہیں تبلیغ کرنے لگ جاتے۔زبان تو وہ سمجھ نہیں سکتے تھے آپؐ اشاروں سے انہیں تبلیغ کرتے۔مثلاً اللہ کا لفظ کہہ کر آسمان کی طرف اشارہ کر دیا۔آہستہ آہستہ ان دونوں کو آپؐ سے اُنس ہوتا گیا۔اور بالآخر وہ دونوں ایمان لے آئے (القرطبی زیر آیت النحل: ۱۰۳)اسی طرح بلالؓ حبشی تھے۔اور حبشی غلام بنائے جاتے تھے لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں میں سے نہیں تھے جن کے نزدیک کوئی غیر قوم مقہور و ذلیل ہو بلکہ آپؐ کے نزدیک سب قومیں یکساں طور پر خدا تعالیٰ کی مخلوق تھیں آپؐ کو یونانیوں اور حبشیوں سے بھی ویسا ہی پیار تھا جیسے عربوں سے۔یہی محبت تھی جس نے ان غیر قوموں کے دلوں میں بھی آپ کا وہ عشق پیدا کر دیا جس کو عرب کے بھی بہت سے لوگ نہیں سمجھ سکتے تھے۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں پیدا ہوئے۔پھر عرب قوم میں پیدا ہوئے اور عربوں میں سے بھی قریش قبیلہ میں پیدا ہوئے جو دوسری عرب قوموں کو بھی حقیر اور ذلیل سمجھتا تھا۔آپؐ کو حبشیوں سے کیا جوڑ تھا۔اگر آپؐ سے کسی قوم یا قبیلہ کو محبت ہونی چاہیے تھی تو وہ بنو ہاشم کو ہونی چاہیے تھی۔آپؐ سے کسی کو محبت ہونی چاہیے تھی تو قریش کو ہونی چاہیے تھی یا پھر عرب کے لوگوں کو ہونی چاہیے تھی غیر قوموں کے دلوں میں جن کی حکومتوں کو آپؐ کے لشکروں نے تباہ کر دیا تھا جن کی قومی برتری کو اسلامی سلطنت نے بے کار کر کے رکھ دیا تھا محبت ہو ہی کیسے سکتی ہے۔انہیں تو آپؐ سے دشمنی ہونی چاہیے تھی۔مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے عشق کا یہ حال تھا کہ آپؐ کی وفات کے کئی سال بعد ایک دن کچھ لوگ دمشق میں اکٹھے ہوئے اور انہوں نے باتوں باتوں میں کہا۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بلالؓ اذان دیا کرتے تھے۔ہم چاہتے ہیں کہ پھر ان کی اذان سنیں۔چنانچہ انہوں نے بلالؓ سے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مدینہ سے شام

چلے گئے تھے اور پھر شام سے دمشق جا پہنچے تھے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا۔لیکن انہوں نے انکار کر دیا اور کہا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد میں نے اذان دینا چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ جب بھی میں اذان دینے کا ارادہ کرتا ہوں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ مبارک میری آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے اور یہ بات میری برداشت سے باہر ہو جاتی ہے۔حضرت عمرؓ بھی ان دنوں دمشق آئے ہوئے تھے۔لوگوں نے آپ سے عرض کیا کہ آپ بلالؓ سے کہیں کہ وہ اذان دیں۔ہم میں وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے اور ہمارے کان ترس رہے ہیں کہ پھر بلالؓ کی اذان سنیں۔اور ہم میں وہ بھی ہیں جنہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ نہیں دیکھا صرف باتیں سنی ہیں وہ بھی خواہش رکھتے ہیں کہ اس شخص کی اذان سن لیں جس کی اذان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سنا کرتے تھے۔حضرت عمرؓ نے بلالؓ کو بلایا اور فرمایا لوگوں کی خواہش ہے کہ آپ اذان دیں آپ نے فرمایا آپ خلیفہ وقت ہیں آپ کی خواہش ہے تو میں اذان دے دیتا ہوں ۔لیکن میرا دل برداشت نہیں کر سکتا۔حضرت بلال رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے اور انہوں نے بلند آواز سے اُسی رنگ میں اذان دی جس رنگ میں وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اذان دیا کرتے تھے۔بلالؓ کی آواز جونہی فضا میں گونجی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک کو یاد کر کے آپؐ کے صحابہؓ جو عرب کے باشندے تھے ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور بعض کی چیخیں بھی نکل گئیں ۔لیکن حضرت بلالؓ جو حبشی تھے جن سے عربوں نے خدمتیں لیں۔جنہیں عربوں سے کوئی خونی رشتہ نہیں تھا اور نہ بھائی چارے کا تعلق تھا وہ اذان ختم کرتے ہی بے ہوش ہو گئے اور چند منٹ کے بعد ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی (اسد الغابۃ زیر لفظ بلال بن رباحؓ)۔ یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دعویٰ پر غیر قوموں کی گواہی تھی کہ میرے نزدیک عرب اور غیر عرب میں کوئی فرق نہیں۔ یہ گواہی تھی غیر قوموں کی جنہوں نے آپؐ کی محبت بھری آواز کو سنا اور اس کا اثر جو انہوں نے دیکھا اس نے انہیں اس یقین سے بھر دیا کہ ان کی اپنی قوم ان سے وہ محبت نہیں کر سکتی تھی جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کی۔

پھر لوگ مرتے ہیں تو اپنی تکلیف اور دکھ کی وجہ سے انہیں دوسروں کا خیال تک نہیں آتا۔ کیونکہ وفات کے وقت غیر معمولی تکلیف ہوتی ہے۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پہلے جس شخص کو وفات کے وقت زیادہ تکلیف ہوتی تھی ۔ میں خیال کرتی تھی کہ وہ گنہگار ہے۔مگر جب میں نے آپؐ کی وفات دیکھی تو سمجھا کہ یہ بات غلط ہے کیونکہ آپؐ کی نزع کی حالت نہایت تکلیف دہ تھی (بخاری کتاب المرضی باب شدۃ المرض)۔ وفات کے وقت مرنے والوں کو عموماً یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ اپنا کام اپنے عزیزوں اور

رشتہ داروں کو سنبھال جائیں مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوئے اور بیماری کی وجہ سے جب ایسی حالت کو پہنچے کہ آپؐ کے لئے چلنا بھی مشکل ہو گیا۔ تو ایک دن آپ سہارا لے کر مسجد میں آئے اور صحابہؓ کو اکٹھا کیا اور فرمایا۔ ہر ایک انسان آخری وقت میں کوئی نہ کوئی نصیحت کرتا ہے۔ میں بھی تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ یہ غلام تمہاری طرح خدا تعالیٰ کے بندے ہیں اور تمہارے بھائی ہیں اور ان کے ساتھ ہمیشہ نیک سلوک کرنا اور جو شخص یہ برداشت نہ کر سکتا ہو کہ ان کے ساتھ نیک سلوک کرے اسے چاہیے کہ انہیں آزاد کر دے لیکن جو شخص ان سے کام لینا چاہتا ہو وہ جو کچھ خود کھائے وہی انہیں کھلائے جو خود پہنے وہی انہیں پہننے کو دے۔ جس حالت میں وہ خود رہے اسی حالت میں انہیں بھی رکھے۔ اور اگر تم میں سے کوئی شخص ایسا نہیں کر سکتا تو اسے ان سے خدمت لینے کا بھی کوئی حق نہیں پھر فرمایا۔ اے میرے صحابہؓ! عورت پر بہت بڑا ظلم ہوتا رہا ہے۔ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم عورتوں کے ساتھ نیک سلوک کرو اور ان کے حقوق ادا کرو۔ ہمیں انبیاء سابقین کے متعلق یہ معلوم نہیں کہ وہ کیسے فوت ہوئے۔ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق پتہ لگتا ہے کہ جب آپ کو صلیب پر لٹکایا گیا تو اگر چہ وہ ان کی وفات کا وقت نہیں تھا تاہم آپ نے آنکھیں کھول لیں اور حضرت مریم کو رنجیدہ کھڑے دیکھ کر آپ نے سمجھ لیا کہ وہ اپنے بیٹے کے مصلوب ہو جانے کے بعد اپنے کسی ولی اور نگران کی عدم موجودگی پر افسوس کر رہی ہیں۔ آپ نے اپنے حواری تھوماؔ سے کہا۔ گو جذبات کی وجہ سے آپ اپنا فقرہ مکمل نہ کر سکے کہ اے تھوماؔ یہ ہے تمہاری ماں اور اے عورت یہ ہے تمہارا بیٹا۔ جس کے یہ معنے تھے کہ میں تھوماؔ پر اعتبار کرتا ہوں اور اسے تمہارا بیٹا بناتا ہوں۔ اور اے تھوماؔ میں تم پر اعتبار کرتا ہوں اور اسے تمہاری ماں بناتا ہوں۔ یہ بڑا نیک جذبہ ہے جو حضرت مسیحؑ کے دل میں پیدا ہوا۔ مگر اس شخص کی محبت کتنی بالا ہے جو وفات کے وقت اپنے اعزاء اور اقرباء کو بھول جائے اور غریب اور مظلوم کی ہمدردی میں اپنے آخری لمحات گزار دے۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے موت کے وقت اگر کسی کا خیال کیا تو وہ صرف مظلوموں، مقہوروں متروکوں اور ان بے بس اور بے کس لوگوں کا تھا جن کی پرورش کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

پھر عین وفات کا وقت آتا ہے تو آپؐ کی زبان پر یہ کلمہ جاری ہوتا ہے کہ خدا یہود اور نصاریٰ پر لعنت کرے جنہوں نے اپنے بزرگوں کی قبروں کو عبادت گاہیں بنا لیا ہے (مسلم کتاب المساجد باب النھی عن بناء المساجد علی القبور) یہود اور نصاریٰ بھی موحّد تھے مگر ان میں سے جو قبروں کو سجدہ کرتے تھے۔ انہیں آپؐ نے حقارت سے دیکھا اور ان سے اظہارِ نفرت فرمایا۔ اس فقرے کے معنے درحقیقت یہ تھے کہ اے مسلمانو! تم کسی کو رَبُّ العٰلمین نہ بنانا۔ ربُّ العٰلمین صرف خدائے واحد ہے جو زمین و آسمان کا مالک ہے۔ پھر جب موت کا وقت اور قریب آتا

ہے تو اس وقت آپؐ کی زبان پر جو الفاظ جاری ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ اَللّٰھُمَّ الرَّفِیْقَ الْاَعْلٰی اَللّٰھُمَّ الرَّفِیْقَ الْاَعْلٰی (بخاری کتاب المغازی باب اخر ما تکلم به صلی الله علیه و سلم) بے شک آپؐ نے یہاں رفیق کا لفظ استعمال فرمایا ہے مگر اَلْاَعْلٰی کا لفظ ربّ العٰلمین کی طرف ہی اشارہ کرتا ہے۔ گویا رفیق کہہ کر آپ نے اپنے تعلق باللہ کی طرف اشارہ کیا۔ اور اَلْاَعْلٰی کہہ کر اس کے رَبُّ الْعٰلَمِیْن ہونے کی طرف اشارہ کیا۔

غرض رَبّ الْعٰلَمِیْن کا صحیح معنوں میں تصور صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہی دنیا میں قائم ہوا۔ چنانچہ اسی امر کی طرف زیرِ تفسیر آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ پہلے تمام انبیاء صرف اپنی اپنی قوم کی ہدایت کے لئے آئے تھے اور ان پر جو کلام نازل ہوئے وہ بھی مختص القوم اور مختص الزمان تھے مگر اب یہ کلام رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ خدا کی طرف سے دنیا کی تمام قوموں، دنیا کے تمام ملکوں اور قیامت تک آنے والے تمام زمانوں کے لئے نازل کیا گیا ہے اور پھر اس کلام کو ایک بڑی خصوصیت یہ حاصل ہے کہ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ۔ عَلٰی قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ۔ روح الامین اس کلام کو لے کر تیرے دل پر نازل ہوا ہے تاکہ تو لوگوں کو ہوشیار اور بیدار کرنے والے لوگوں میں شامل ہو جائے۔ عیسائی اس بات کو ہمیشہ بڑے فخر کے ساتھ پیش کیا کرتے ہیں کہ مسیح پر روح القدس نازل ہوا تھا۔ حالانکہ قرآن کریم نہ صرف یہ دعویٰ کرتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر روح القدس نازل ہوا تھا بلکہ وہ اس سے بڑھ کر یہ دعویٰ بھی کرتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر روح الامین نازل ہوتا ہے روح القدس کے نازل ہونے کا وہ ان الفاظ میں ذکر فرماتا ہے کہ قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هُدًى وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ (النحل: ۱۰۳) یعنی اے محمدؐ رسول اللہ تو لوگوں سے کہہ دے کہ اس کلام کو روح القدس نے تیرے رب کی طرف سے حق و حکمت کے ساتھ اتارا ہے۔ تاکہ جو لوگ ایمان لائے ہیں انہیں وہ ایمان پر ثبات بخشے۔ اسی طرح یہ کلام اللہ تعالیٰ کے اطاعت گزار بندوں کے لئے مزید ہدایت اور انہیں بشارت دینے کے لئے اس نے نازل کیا ہے۔ پس یہ بالکل غلط ہے کہ روح القدس کا نزول صرف حضرت مسیحؑ کے ساتھ مخصوص تھا قرآن کریم کو بھی روح القدس ہی لے کر نازل ہوا ہے۔ اور پہلے نبیوں پر بھی روح القدس ہی نازل ہوتا رہا ہے بلکہ اس سے بڑھ کر قرآن کریم یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ ہر فرشتہ ہی پاک اور معصوم ہے اور اس لحاظ سے جو فرشتہ بھی کلام لے کر نازل ہو وہ روح القدس ہی کہلاتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ملائکہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (التحریم: ۷) یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں جس بات کا بھی حکم دیا جائے اس کی نافرمانی کرنے کی ان میں طاقت ہی نہیں ہوتی بلکہ جو کچھ انہیں کہا جائے وہی کچھ وہ عمل کرتے ہیں۔ پس

روح القدس کا مفہوم درحقیقت فرشتہ کے لفظ میں ہی شامل ہے۔لیکن قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک مزید امتیاز یہ بھی حاصل ہے کہ آپؐ پر روح الامین نازل ہوا۔یعنی وہ فرشتہ نازل ہوا جس کے ذمہ یہ بھی فرض تھا کہ وہ قرآن کریم کو صحیح وسالم صورت میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچائے گویا قرآن کریم کے دونوں حصوں کی حفاظت کا انتظام کر دیا گیا۔ایک طرف تو اس کے نزول میں کسی غلطی یا نسیان کا امکان باقی نہ رہا۔کیونکہ روح الامین اسے لے کر نازل ہوا اور دوسری طرف نزول کے بعد مستقل طور پر اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرما دیا کہ اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ (الحجر:۱۰) یعنی ہم نے ہی اس ذکر کو اتارا ہے اور ہم یقیناً اس کی حفاظت کریں گے۔ گویا قرآن کریم کے متعلق دونوں زمانوں میں حفاظت کا انتظام کر لیا گیا۔لیکن انجیل کے دونوں زمانوں کے متعلق کوئی وعدہ نہیں ۔نہ تو انجیل میں کوئی ایسی آیت ہے جس میں یہ ذکر ہو کہ جب انجیل کی وحی آئی تو رستہ میں اس کی حفاظت کا انتظام کیا گیا۔یا جب تک وہ حضرت مسیحؑ کے دماغ میں رہی اور دنیا میں نہیں پھیلی اس وقت تک اس کی حفاظت کی گئی اور نہ کوئی ایسی آیت ہے جس میں یہ ذکر ہو کہ جب مسیحؑ نے وہ وحی لکھوا دی یا سنا دی تو اس کے بعد قیامت تک خدا تعالیٰ نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری لے لی۔پس انجیل کی حفاظت کا ثبوت خود انجیل سے کوئی نہیں ملتا۔لیکن قرآن کریم کی مکمل حفاظت کا ثبوت خود قرآن کریم سے ہی ملتا ہے۔چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مطہّر پر وحی الٰہی کے نازل ہونے تک بلکہ جب تک وہ وحی دنیا میں شائع نہیں ہوئی اس وقت تک کی حفاظت کا ثبوت اس آیت سے ملتا ہے۔اور دنیا میں شائع ہو جانے کے بعد اس کی حفاظت کا ثبوت اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ سے ملتا ہے۔گویا خدا تعالیٰ کی طرف سے وحی الٰہی کے نازل ہونے کے وقت سے لے کر قیامت تک قرآن کریم کی حفاظت کا وعدہ موجود ہے جس کے مشابہ وعدہ بھی انجیل میں کوئی موجود نہیں۔

غرض روح الامین میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس کلام کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص طور پر انتظام کیا گیا ہے تا کہ پہلی کتب کی طرح اس میں کوئی بگاڑ پیدا نہ ہو۔ورنہ ہر فرشتہ اپنی ذات میں امین ہی ہوتا ہے۔اصل بات یہ ہے کہ جب کسی صفت کا خاص طور پر ذکر کیا جائے تو اس سے مراد اس کے خاص ظہور کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے مثلاً جہاں روح القدس کا لفظ استعمال کیا جائے وہاں اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہوگا کہ یہ کلام اپنے اندر قدوسیت کی صفت رکھتا ہے اور یہ صفت سب نبیوں کے الہام میں مشترک طور پر پائی جاتی ہے۔لیکن امین کی صفت سے جبریلؑ صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے یہی وجہ ہے کہ صرف آپؐ کے کلام کی حفاظت کی گئی جب کہ پہلی الہامی کتب انسانی دست بُرد کا شکار ہو چکی ہیں۔

اس کے بعد فرماتا ہے کہ روح الامین نے یہ کلام تیرے دل پر نازل کیا ہے یعنی روح الامین کا فرض حفاظت اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ وحی تیرے دل پر نازل نہ ہو جائے تا کہ اس کے نتیجہ میں تو لوگوں تک اس وحی کو عمدگی سے پہنچا دے۔ اس جگہ وحی الٰہی کو قلب پر نازل کرنے کے یہ معنے ہیں کہ جس طرح کلامِ الٰہی لفظوں میں نازل ہوتا ہے اسی طرح نبی کے دل کو بھی ساتھ ساتھ تقویت دی جاتی ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کا کلام جس شخص پر نازل ہوتا ہے اسے ایک قلبی پاکیزگی اور استقامت بھی عطا کی جاتی ہے تا کہ وہ اسے دنیا میں قائم کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ پس قلب پر نازل ہونے کے یہ معنے ہیں کہ وہ صرف پیغامبر ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ کلام اس کے دل کے اندر جذب ہو جاتا ہے اور وہ اس کا جزو ہو جاتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ شرعی اور غیر شرعی یا ظلّی وحی میں ایک فرق ہوتا ہے اور وہ فرق یہ ہے کہ ہر شرعی وحی نبی کے قلب پر بھی نازل ہوتی ہے۔ چونکہ اس وحی کی متعلق یہ حکم ہوتا ہے کہ اس پر اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ کہو۔ اس لئے یہ قلب پر نازل ہوتی ہے اور جوں جوں نازل ہوتی ہے وہ ایمان کو مضبوط کرتی چلی جاتی ہے۔ بعض لوگوں نے اس آیت سے ایک غلطی کھائی ہے۔ خصوصاً بہائیوں کو اس سے غلطی لگی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ جو خیال بھی دل میں آ جائے وہ وحی ہوتا ہے حالانکہ قرآن کریم اور احادیث سے پتہ لگتا ہے کہ وحی زبان پر بھی نازل ہوتی ہے۔ مثلاً قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتا ہے لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ (القیامۃ:۱۸) کہ تو زبان کو جلدی جلدی حرکت نہ دیا کر۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ وحی زبان پر بھی نازل ہوتی ہے۔ اصل میں یہ دوہری وحی ہوتی ہے۔ یہ وحی زبان پر بھی نازل ہوتی ہے اور دل پر بھی اس کا نزول ہوتا ہے۔ لیکن دوسروں کو جو وحی ہوتی ہے وہ بروزی اور ظلی طور پر ہوتی ہے اور اس قسم کی ہر وحی قلب پر نازل نہیں ہوتی۔ وہ بعض دفعہ کان پر نازل ہوتی ہے۔ مثلاً انسان ایک کلام سنتا ہے۔ اور کہتا ہے مجھے یہ الہام ہوا ہے۔ یا اس کی زبان پر کوئی الفاظ جاری ہو جاتے ہیں اور وہ کہتا ہے مجھے الہام ہوا ہے یا فلاں کلام میری زبان پر جاری ہوا ہے۔ مگر تشریعی انبیاء کی جو وحی ہوتی ہے یا بعض اوقات ظلی اور بروزی انبیاء کی وحی بھی صرف کان اور زبان پر ہی نازل نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک ہی وقت میں کان یا زبان اور اس کے ساتھ قلب پر بھی نازل ہوتی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ تین جگہ نازل ہوتی ہے۔ ایک تو وہ زبان یا کان پر نازل ہوتی ہے۔ دوسرے قلب پر نازل ہوتی ہے اور تیسرے دماغ پر نازل ہوتی ہے جیسے قرآن کریم میں آتا ہے کہ یہ وحی کتاب مکنون میں ہے یعنی یہ وحی ایک طرف تو اس قرآن میں نازل کی گئی ہے۔ اور دوسری طرف اسے انسانی فطرت کے اندر رکھ دیا گیا ہے پس تشریعی انبیاء کی وحی زبان یا کان پر نازل ہونے کے علاوہ قلب پر بھی نازل ہوتی ہے اور میخ کی طرح دل میں گڑ جاتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ۔ عَلٰى قَلْبِكَ یعنی چونکہ یہ وحی تیرے قلب پر نازل ہوتی ہے اس لئے تیرے اندر اس وحی کے متعلق غیر معمولی استقامت پائی جاتی ہے۔ اور تُو کہتا ہے کہ اگر تم سورج کو میرے دائیں اور چاند کو میرے بائیں لاکر بھی رکھ دو۔ اور پھر مجھ سے کہو کہ میں خدائے واحد کی توحید کی اشاعت کرنے سے رک جاؤں تو میں ایسا نہیں کروں گا۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کی وحی میرے دل پر نازل ہوئی ہے۔ اگر وہ میرے قلب پر نازل نہ ہوتی تو میں تمہاری باتوں کو بھی سنتا لیکن اب یہ سوال ہی باقی نہیں رہا کہ میں تمہاری بات سنوں۔ کیونکہ خدا تعالیٰ نے میرے دل پر اپنی وحی نازل کی ہے اور میرے دل میں آہنی میخ کی طرح توحید کا عقیدہ راسخ کر دیا ہے۔

بہرحال جیسا کہ میں نے بتایا ہے بعض لوگوں نے اس آیت سے دھوکہ کھایا ہے اور وہ یہ سمجھنے لگ گئے ہیں کہ جو خیال بھی دل میں پیدا ہو وہ وحی ہوتا ہے۔ حالانکہ وحی زبان اور کان پر بھی نازل ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کا قلب پر بھی نزول ہوتا ہے تاکہ اس کی تائید ہو جائے۔ لیکن بہاء اللہ ایک طرف تو اقرار کرتے تھے کہ مجھے لفظی وحی نہیں ہوتی اور دوسری طرف ان کے دل میں جو خیالات بھی پیدا ہوں ان کو وہ الہام قرار دے دیتے تھے۔ یہی کیفیت گاندی جی کی تھی۔ وہ بھی بعض دفعہ اپنے خیالات کا نام الہام رکھ لیا کرتے تھے۔ لیکن اس جگہ جس وحی کا ذکر ہے اس میں مقررہ الفاظ ہوتے ہیں جو تکرار کے ساتھ دہرائے جاتے ہیں اور زبان یا کان کے علاوہ انسانی قلب پر بھی جاری ہوتے ہیں اور ان میں اس قدر تکرار ہوتا ہے کہ بعض دفعہ آدھ آدھ گھنٹہ تک ایک ایک فقرہ کو دہرایا جاتا ہے۔

پھر اگر قرآن کریم میں صرف یہی آیت ہوتی کہ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ۔ عَلٰى قَلْبِكَ تو ہمیں دھوکہ لگ سکتا تھا کہ شاید اس میں دل کے خیالات کو ہی وحی قرار دیا گیا ہے لیکن اس کے علاوہ بعض اور آیات بھی قرآن کریم میں آتی ہیں جن سے صراحتاً معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اور آپؐ کے کان پر بھی وحی نازل ہوتی تھی اور وہ وحی معیّن الفاظ میں ہوتی تھی۔ مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ۔ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ۔ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ (القیامۃ: ۱۷ تا ۱۹) یعنی اے محمدؐ رسول اللہ! تُو اپنی زبان کو جلدی جلدی حرکت نہ دیا کر۔ اس قرآن کو جمع کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے اور اس کا دنیا کو سنانا بھی ہمارا کام ہے۔ پس جب ہم اسے پڑھ لیا کریں تو اس کے بعد تُو بھی اسے پڑھ لیا کر۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی الٰہی بڑی سرعت سے نازل ہوتی تھی اس لئے آپؐ جلدی جلدی اس کلام کو اپنی زبان سے دہرانے لگتے تھے تاکہ ان الفاظ پر قابو پا سکیں اور وہ آپؐ کے دماغ میں پوری طرح محفوظ رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی دی کہ ایسا کرنے کی ضرورت

نہیں آپ پر جو کلام نازل کیا جا رہا ہے۔ یہ شریعتِ الٰہیہ کا حامل ہے اور شرعی الہام بھولا نہیں کرتا۔ کیونکہ اگر وہ بھول جائے تو وحی متلوّ ہی ادھوری رہ جائے۔ ہاں ہم یہ کلام پڑھ لیا کریں تو اس کے بعد تو بھی اسے پڑھ لیا کر۔ یہ آیت اس امر پر نصِ صریح ہے کہ قرآن کریم صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مطہّر پر ہی نازل نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ التزاماً آپ کو پڑھایا بھی جاتا تھا اور پڑھایا اسی صورت میں جا سکتا ہے جب کہ وہ آپؐ پر معین الفاظ میں نازل ہوتا۔

اسی طرح قرآن کریم صراحتاً اس کلام کو کلام اللہ قرار دیتا ہے جس سے نہ صرف اس وسوسہ کو دور کیا گیا ہے کہ نعوذ باللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں جو خیالات پیدا ہوتے تھے انہی کو آپؐ وحی الٰہی قرار دے دیتے تھے۔ بلکہ کلام اللہ کہہ کر اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ اس کتاب میں شروع سے لے کر آخر تک جو کچھ لکھا ہے یہ سب کا سب اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اس میں کسی کے دل کے خیالات کا تو کیا ذکر ہے کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں جو کسی انسان کا بنایا ہوا ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ اسْتَجَارَکَ فَاَجِرْہُ حَتّٰی یَسْمَعَ کَلٰمَ اللّٰہِ ثُمَّ اَبْلِغْہُ مَاْمَنَہٗ (التوبۃ:۶) یعنی اگر ان مشرکوں میں سے جو تجھ سے برسرِ جنگ ہیں کوئی شخص پناہ مانگے۔ تو تُو اسے پناہ دے تا کہ وہ اس کتاب کو سن سکے جو تجھ پر نازل ہوئی ہے اور جو ساری کی ساری کلام اللہ ہے۔ پھر جب وہ اللہ تعالیٰ کے کلام کو سن لے اور چاہے کہ اپنی قوم کے لوگوں کے پاس واپس چلا جائے تو چاہیے کہ اسے پوری حفاظت کے ساتھ اس علاقہ میں پہنچا دیا جائے جو اس کے لئے امن کا مقام ہے۔ اسی طرح قرآن کریم کا یہ فرمانا کہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ (العلق:۲،۳) یعنی اے محمدؐ رسول اللہ! تو اپنے رب کا نام لے کر پڑھ جس نے سب اشیاء کو پیدا کیا ہے۔ تُو اپنے اس رب کا نام لے کر پڑھ جس نے انسان کو خون کے ایک لوتھڑے سے پیدا کیا ہے۔ یہ بھی بتاتا ہے کہ قرآنی آیات معین الفاظ میں آپؐ پر نازل ہوتی تھیں جن کی آپ پوری طرح تلاوت فرما سکتے تھے۔ پھر قرآن کریم کا بار بار یہ فرمانا کہ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ یا قُلْ یٰۤاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ یا قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ یا قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ یہ سب آیات وحیٔ الفاظ پر دلالت کرتی ہیں۔ اسی طرح حدیث میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بعض اوقات مجھ پر وحی صلصلۃ الجرس کی طرح آتی ہے اور صلصلۃ الجرس یعنی گھنٹی کی آواز کو کان کے ذریعہ سنا جاتا ہے۔ اسی طرح آپ فرماتے ہیں وَاَحْیَانًا یَتَمَثَّلُ لِیَ الْمَلَکُ رَجُلًا فَیُکَلِّمُنِیْ فَاَعِیْ مَا یَقُوْلُ (بخاری باب کیف کان بدء الوحی) یعنی کبھی اللہ تعالیٰ کا فرشتہ آدمی کی شکل میں متمثّل ہو کر میرے پاس آ جاتا ہے اور وہ مجھ سے کلام کرتا ہے جسے میں اپنے دماغ میں محفوظ رکھ

لیتا ہوں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی زبان اور کان اور آنکھوں پر بھی نازل ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی اس کا دل پر بھی نزول ہوتا ہے۔جس کی وجہ سے وہ شخص جس پر وحی نازل ہوتی ہے سب سے بڑا مومن ہوجاتا ہے کیونکہ اس کے کانوں اور زبان کے ساتھ ساتھ اس کے دل پر بھی وحی کا نزول ہوتا ہے۔اور چونکہ سارے عقائد اور خیالات دل سے ہی پیدا ہوتے ہیں اس لئے اگر دل پر وحی نازل ہوگئی تو یہ ساری چیزیں آپ ہی آپ درست ہوجاتی ہیں۔غرض وحی کے کئی مراتب ہوتے ہیں۔انبیائے تشریعی کی وحی اَور درجہ کی ہوتی ہے اور انبیائے بروزی اور ظلّی کی وحی اَور درجہ کی ہوتی ہے انبیائے بروزی اور ظلّی وحی کو بھی بھول سکتے ہیں۔انبیائے تشریعی شرعی وحی کو نہیں بھولتے۔کیونکہ اگر شریعت ہی بھول جائے تو ان کی امت تباہ ہوجائے۔اسی طرح انبیائے بروزی اور ظلّی کی ایسی وحی بھی جو کسی پہلی وحی کی تفصیل بیان کرنے یا کسی خاص نکتہ معرفت کے بیان کرنے کے لئے آتی ہے وہ بھی نہیں بھولتی کیونکہ اس کے لئے بھی وہی قانون جاری ہے جو شرعی وحی کے لئے ہے اور اس کی بھی لوگوں کو ضرورت ہوتی ہے۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عام وحی کی بھی ایک قسم کی حفاظت ہوتی ہے مثلاً اگر یہ وحی ہو کہ فلاں شخص مرجائے گا یا طاعون آجائے گی تو اس وحی کی بھی ایک قسم کی حفاظت ہوتی ہے کیونکہ اگر وہ اخبار غیبیہ جن پر خدا تعالیٰ اپنے کسی بندہ کو اطلاع دیتا ہے ساری کی ساری بھول جائیں تو وہ لوگوں کو سنائی کیسے جاسکیں۔لیکن بہرحال اسے وہ مقام حاصل نہیں ہوتا جو تشریعی وحی کو حاصل ہوتا ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک شعشہ کی حفاظت ہوتی ہے۔

پھر فرماتا ہے بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ اسے خدا تعالیٰ نے ایک ایسی زبان میں نازل کیا ہے جو اپنے مطالب کو خوب کھول کر بیان کرنے والی ہے۔درحقیقت کسی کلام کی حفاظت کا ایک یہ بھی پہلو ہوتا ہے کہ جو کلام نازل ہو اس کو سمجھنے والے لوگ دنیا میں پائے جاتے ہوں۔چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس نے قرآن کریم کو حفاظت کے اس پہلو سے بھی نوازا ہے اور اسے ایک ایسی زبان میں نازل کیا ہے جو اپنے مضمون کو آپ واضح کرتی ہے اور پھر وہ ہر قسم کے دلائل بھی اپنے اندر رکھتی ہے۔

مفرداتِ راغب جو قرآنی لغت کی مشہور کتاب ہے اس میں اَلْعَرَبِيُّ کے معنے اَلْمُفْصِحُ کے لکھے ہیں یعنی اپنے مدعا کو خوب صفائی اور وضاحت کے ساتھ بیان کرنے والا اور اَلْاِعْرَابُ کے معنے کھولنے اور واضح کرنے کے لکھے ہیں۔پس بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ میں تو یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا آخری شرعی کلام اس زبان میں نازل فرمایا ہے جو مطالب کے اظہار کے لئے اپنے اندر پورا سامان رکھتی ہے اور ہر مسئلہ پوری وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بیان کرتی ہے اور مُبِین میں یہ بتایا کہ وہ صرف مقاصد کے اظہار پر ہی قدرت نہیں رکھتی بلکہ اپنے ساتھ دلائل

اور براہین کا بھی ذخیرہ رکھتی ہے۔گویا قرآن کریم کا صرف عربی زبان میں ہونا معجزہ نہیں بلکہ قرآن کا عَرَبِیٌّ مُّبِیۡنٌ ہونے میں معجزہ ہے۔یعنی اس کی ایسی زبان ہے کہ اس کے اندر دلائل بھی بیان کئے گئے ہیں اور بتایا گیا ہے کہ ہم کیوں حکم دیتے ہیں۔خدا تعالیٰ کو کیوں منواتے ہیں فرشتوں کو کیوں منواتے ہیں۔رسولوں کو کیوں منواتے ہیں۔جھوٹ سے کیوں منع کرتے ہیں۔سچ کی کیوں تائید کرتے ہیں ظلم سے کیوں روکتے ہیں۔انصاف کی کیوں تائید کرتے ہیں۔غرض یہ عَرَبِیٌّ مُّبِیۡنٌ میں ہے اور اپنے احکام کی دلیلیں بھی دیتا ہے۔جھوٹا آدمی بات تو کہہ دے گا مگر اس کی دلیل کہاں سے لائے گا۔مگر یہ کلام تو ایسی زبان میں نازل ہوا ہے جو عربی ہی نہیں بلکہ مبین بھی ہے۔یعنی جو بات بھی کہتی ہے اس کو کھول کر رکھ دیتی ہے اور اس کی معقولیت کے دلائل بھی دیتی ہے۔

پھر فرمایا وَ اِنَّهٗ لَفِیۡ زُبُرِ الۡاَوَّلِیۡنَ۔قرآن کریم کو ایک اور فضیلت یہ بھی حاصل ہے کہ اس کا ذکر پہلے نبیوں کی کتابوں میں بھی موجود ہے۔اور ان میں صراحتاً اس کے نزول کی خبر دی گئی ہے۔بلکہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ کلام دنیا کو ایک عربی نبی کی زبان سے سنایا جائے گا۔چنانچہ مثال کے طور پر اس کے ثبوت میں یسعیاہ نبی کی ایک پیشگوئی کا ذکر کیا جاتا ہے۔وہ اپنی کتاب کے اٹھائیسویں باب میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی پیشگوئی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

> ’’وہ کس کو دانش سکھائے گا۔کس کو وعظ کر کے سمجھائے گا۔ان کو جن کا دودھ چھڑایا گیا جو چھاتیوں سے جدا کئے گئے کیونکہ حکم پر حکم۔حکم پر حکم۔قانون پر قانون۔قانون پر قانون ہوتا جاتا۔تھوڑا یہاں تھوڑا وہاں۔وہ وحشی کے سے ہونٹوں اور اجنبی زبان سے اس گروہ کے ساتھ باتیں کرے گا کہ اس نے ان سے کہا کہ یہ وہ آرام گاہ ہے۔تم ان کو جو تھکے ہوئے ہیں آرام دیجیو۔اور یہ چین کی حالت ہے۔پر وَے شنوانہ ہوئے۔سو خدا کا کلام ان سے یہ ہوگا حکم پر حکم۔حکم پر حکم۔قانون پر قانون۔قانون پر قانون۔تھوڑا یہاں تھوڑا وہاں۔تاکہ وَے چلے جاویں اور پچھاڑی گریں اور شکست کھائیں اور دام میں پھنسیں اور گرفتار ہوویں۔‘‘ (یسعیاہ باب ۲۸ آیت ۹ تا ۱۳)

یسعیاہ نبی نے اس کلام میں یہ پیشگوئی فرمائی تھی کہ ایک زمانہ میں اللہ تعالیٰ پھر لوگوں کی روحانی تشنگی اور بھوک کو دور کرنے کے لئے آسمان سے اپنا دودھ نازل فرمائے گا۔مگر یہ دودھ اس قوم کو پلایا جائے گا جس کے افراد ایک لمبے عرصہ سے چھاتیوں سے جدا رہ چکے ہوں گے۔یعنی جن پر فترت کا ایک لمبا زمانہ آچکا ہوگا۔اور اس کلام کی ایک خصوصیت یہ ہوگی کہ وہ یکدم نازل نہیں ہوگا اور نہ کسی ایک شہر اور مقام میں نازل ہوگا۔بلکہ قانون پر قانون اور حکم پر

حکم مختلف مقامات میں نازل ہوگا اور ایک لمبے زمانہ میں اس الٰہی قانون کی تکمیل ہوگی۔

پھر اس کلام کا ایک اَور وصف یہ ہوگا کہ وہ ایک اجنبی یعنی غیر زبان میں نازل ہوگا۔ اور آنے والا مقدس رسول وحشی کے سے ہونٹوں کے ساتھ گفتگو کرے گا۔ یہ وحشی کا لفظ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عربی نبی ہونے کی طرف اشارہ کر رہا ہے کیونکہ بائیبل کی اصطلاح میں عربوں کے لئے وحشی کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اسی بناء پر پیدائش باب ۱۶ آیت ۱۲ میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بھی ’’وحشی‘‘ قرار دیا گیا ہے۔ درحقیقت یہ لفظ اس تعصّب کے اظہار کے لئے بنو اسرائیل نے اختیار کیا تھا جو ان کے دلوں میں بنو اسماعیل کے متعلق پایا جاتا ہے۔ اگر وہ تعصب کا شکار نہ ہوتے تو آسانی سے وہ عرب کا لفظ استعمال کر سکتے تھے۔ مگر انہوں نے اس لفظ کو اختیار کرنے کی بجائے پہلے اس کا ترجمہ کیا اور پھر ترجمہ کے لئے بھی وحشی کا لفظ اختیار کر لیا۔ اس لفظ کا انتخاب اس بناء پر کیا گیا کہ عربی زبان میں ع ر ب کے معنے اپنے مافی الضمیر کو پوری عمدگی کے ساتھ بیان کرنے کے ہوتے ہیں اور عربوں کا نام عرب بھی اسی لئے رکھا گیا تھا کہ وہ ادب کے دلدادہ اور نہایت فصیح و بلیغ کلام کرنے کے عادی تھے۔ مگر چونکہ وہ جنگلوں میں رہتے تھے اور خیموں میں ان کی زندگی کٹتی تھی ان کے مخالف انہیں خیموں اور جنگلوں میں رہنے والا کہنے کی بجائے وحشی کہنے لگ گئے۔ اور بائیبل نے بھی یہی طریق اختیار کیا۔ اسی وجہ سے یسعیاہ نبی کی پیشگوئی میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ ’’وحشی کے سے ہونٹوں سے کلام کرے گا‘‘ یعنی وہ عرب میں مبعوث ہوگا۔ اور عربی میں اس پر کلام الٰہی نازل ہوگا۔ چنانچہ اسی امر کی طرف اشارہ کرنے کے لئے پہلے بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ کے الفاظ لائے گئے ہیں اور پھر کہا گیا ہے کہ تمہیں اس کلام کے قبول کرنے میں کسی قسم کے تردّد اور ہچکچاہٹ سے کام نہیں لینا چاہیے کیونکہ تمہارے اپنے نبیوں کی کتابوں میں اس کے متعلق پیشگوئیاں موجود ہیں (اس بارہ میں تفصیلات کے شائق تفسیر کبیر سورۂ بقرہ آیت ۴۳ ملاحظہ فرمائیں جہاں بائیبل کی ان پیشگوئیوں کا تفصیلی ذکر موجود ہے)۔

پھر فرمایا۔ اَوَ لَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ۔ کیا ان کے لئے یہ نشان کم ہے کہ اس قرآن کو علمائے بنی اسرائیل بھی پہچانتے ہیں۔ یعنی بنی اسرائیل کے انبیاء نے جب اس قرآن کی خبر دی ہے۔ اور وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مدتوں پہلے گذر چکے تھے اور ان کی بتائی ہوئی خبریں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم پر پوری اتر آئی ہیں تو کیا قرآن کریم کے ماننے کے لئے یہ نشان کافی نہیں۔

اس آیت سے ایک اور مسئلہ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اور وہ یہ کہ اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ یعنی قرآن کریم کا پہلی کتابوں میں بھی ذکر ہے۔ اور کتابیں ہمیشہ نبیوں پر ہی نازل

ہوا کرتی ہیں۔ اس آیت میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ کیا ان لوگوں کے لئے یہ نشان کافی نہیں کہ بنی اسرائیل کے علماء اس کو جانتے ہیں۔ پس سیاقِ کلام کو مدنظر رکھتے ہوئے صاف ظاہر ہے کہ اس جگہ علماء سے وہی لوگ مراد ہیں۔ جن پر زُبر نازل ہوئیں اور چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے کہ عُلَمَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَآءِ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (مکتوب امام ربانی دفتر اول حصہ چہارم ص ۳۳ مکتوب نمبر ۲۳۴) اس لئے ہم اس آیت کو مدنظر رکھتے ہوئے کامل یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کلام کا صرف یہی مفہوم ہے کہ اَنْبِیَآءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَآءِ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ یعنی جس قسم کے نبی بنی اسرائیل میں گذرے ہیں ویسے ہی نبی میری امت میں بھی آئیں گے۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ صاحب شریعت نبی میری امت میں آسکتے ہیں۔ کیونکہ مشابہت کبھی تمام اجزاء پر مشتمل ہوتی ہے اور کبھی چند اجزاء پر۔ چونکہ قرآن کریم کی دائمی حفاظت کا ذکر پہلے آچکا ہے اس لئے قرآن کریم کے بعد کسی نئی شریعت کا آنا تو ناممکن ہے۔ پس ایسے ہی انبیاء آسکتے ہیں جو بغیر شریعت کے ہوں اور حدیث بتاتی ہے کہ اس قسم کے انبیاء کا آنا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تسلیم فرمایا ہے۔

ان آیات پر غور کر کے ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس جگہ قرآن کریم کی صداقت اور اس کی عظمت اور اس کی ضرورت پر کیسا کامل اور لطیف مضمون بیان کیا گیا ہے۔ ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ (۱) یہ وہ کتاب ہے جو خدا نے اتاری ہے۔ (۲) یہ وہ کتاب ہے جو جبریل لایا ہے۔ (۳) یہ وہ کتاب ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے پاک اور مقدس انسان کے دل پر اتاری گئی ہے۔ (۴) یہ وہ کتاب ہے جس کی غرض گمراہوں کو ہوشیار کرنا اور ان کو آئندہ زندگی میں پیش آنے والے خطرات سے آگاہ کرنا ہے (۵) یہ وہ کتاب ہے جس کا ذریعہ بیان عربی مبین ہے۔ (۶) یہ وہ کتاب ہے جس کی خبر پہلی کتب میں بھی موجود ہے۔ یا یہ کہ اصولی تعلیم میں اس کی پہلی کتب کے ساتھ مشابہت ہے اس لئے اس کا انکار درحقیقت تمام مذاہب اور رسولوں کا انکار ہے۔ اور اس پر ایمان لانا انسان کو مجموعی طور پر ان تمام برکات اور انوار سے مستفیض کرتا ہے جن انوار اور برکات سے انفرادی طور پر پہلے صرف ایک ایک قوم مستفیض ہوا کرتی تھی بلکہ ذوق ایمان رکھنے والے کے لئے تو صرف یہی ایک نشان کافی ہے کہ انبیاء بنی اسرائیل بھی اپنی پیشگوئیوں میں ذکر کرتے رہے ہیں۔ پھر اگر اتنے بڑے شواہد کی موجودگی میں بھی کوئی شخص اس کا انکار کرتا ہے تو سوائے اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس کی آنکھیں روحانی بینائی سے محروم ہو چکی ہیں۔

وَ لَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰی بَعْضِ الْاَعْجَمِیْنَ ۝۱۹۹ فَقَرَاَهٗ عَلَیْهِمْ مَّا

اور اگر ہم اس کو عجمیوں میں سے کسی پر اتارتے۔ اور وہ اس کو اِن (کفار) کے سامنے پڑھ کر سناتا تو

كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِیْنَ ۝۲۰۰ كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ فِیْ قُلُوْبِ

وہ کبھی بھی اس پر ایمان نہ لاتے۔ اسی طرح ہم نے مجرموں کے دلوں میں یہ (بات) داخل کر چھوڑی ہے۔

الْمُجْرِمِیْنَ ۝۲۰۱ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ حَتّٰی یَرَوُا الْعَذَابَ

(پس) وہ اس پر ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ دردناک عذاب دیکھ لیں۔ پس وہ (عذاب)

الْاَلِیْمَ ۝۲۰۲ فَیَاْتِیَهُمْ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ۝۲۰۳

ان کی لاعلمی میں ان کے پاس اچانک آجائے گا۔ تب وہ کہیں گے کیا ہمیں ڈھیل مل سکے گی۔ سو (بتاؤ

فَیَقُوْلُوْا هَلْ نَحْنُ مُنْظَرُوْنَ ۝۲۰۴ اَفَبِعَذَابِنَا

کہ) کیا یہی لوگ ہمارے عذاب کو جلدی مانگا کرتے تھے۔ پس کیا تجھے یقین نہیں ہے کہ اگر ہم ان کو

یَسْتَعْجِلُوْنَ ۝۲۰۵ اَفَرَءَیْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِیْنَ ۝۲۰۶

سالوں تک فائدہ پہنچاتے جاتے۔ پھر ان کے پاس وہ (عذاب) آجاتا جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے۔

ثُمَّ جَآءَهُمْ مَّا كَانُوْا یُوْعَدُوْنَ ۝۲۰۷ مَاۤ اَغْنٰی عَنْهُمْ مَّا

تو جو کچھ بھی ان کو دیا گیا ہے وہ ان سے اس (عذاب) کو ٹلا نہیں سکتا تھا۔ اور ہم نے کسی بستی کو بغیر

كَانُوْا یُمَتَّعُوْنَ ۝۲۰۸ وَ مَاۤ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْیَةٍ اِلَّا لَهَا

اس کے کہ اس کی طرف نبی بھیجے ہوں ہلاک نہیں کیا۔ یہ اس لئے کیا گیا

مُنْذِرُوْنَ ﴿۲۰۹﴾ ذِکْرٰی قف وَمَا کُنَّا ظٰلِمِیْنَ ﴿۲۱۰﴾

کہ ان کو نصیحت پہنچ جائے۔ اور ہم ظالم نہیں۔

حلّ لُغَات۔ اَلْاَعْجَمِیْنَ اَلْاَعْجَمِیْنَ اَلْاَعْجَمُ کی جمع ہے۔ اور اَلْاَعْجَمُ کے معنے ہیں مَنْ لَا یُفْصِحُ وَلَا یُبَیِّنُ کَلَامَہٗ وَاِنْ کَانَ مِنَ الْعَرَبِ۔ وہ شخص جو اپنے مافی الضمیر کو عربی زبان میں پوری طرح کھول کر ادا نہیں کرسکتا خواہ وہ شخص عرب کے علاقہ کا ہو اور عربی جانتا ہو۔ اسی طرح اَلْاَعْجَمُ کے معنے ہیں مَنْ لَیْسَ بِعَرَبِیٍّ وَاِنْ اَفْصَحَ بِالْعَجَمِیَّۃِ۔ وہ شخص جو عرب کے علاقہ کا نہ ہو اور خواہ وہ اپنی زبان خوب فصاحت سے بولتا ہو لیکن اس کو بھی اعجم ہی کہیں گے۔ (اقرب)

سَلَکْنٰہُ سَلَکْنٰہُ سَلَکَ سے جمع متکلم کا صیغہ ہے اور سَلَکَ الشَّیْءَ فِی الشَّیْءِ کے معنے ہیں اَدْخَلَہٗ فِیْہِ۔ کسی چیز کو کسی چیز میں داخل کیا۔ کَمَا تُسْلَکُ الْیَدُ فِی الْجَیْبِ وَالْخَیْطُ فِی الْاِبْرَۃِ۔ جیسے ہاتھ جیب میں داخل کیا جاتا ہے یا دھاگہ سوئی میں۔ (اقرب) پس سَلَکْنٰہُ کے معنے ہوں گے ہم نے اس کو داخل کیا۔

مُنْظَرُوْنَ مُنْظَرُوْنَ مُنْظَرٌ کی جمع ہے جو اَنْظَرَ سے اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ اور اَنْظَرَہٗ کے معنے ہیں اَمْھَلَہٗ اس کو مہلت دی۔ (اقرب) پس مُنْظَرُوْنَ کے معنے ہوں گے مہلت دیئے ہوئے۔

تفسیر۔ اب فرماتا ہے کہ اگر ہم اس کلام کو کسی اعجمی پر نازل کرتے اور وہ انہیں اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھ پڑھ کر سناتا تو یہ لوگ اس پر کبھی ایمان نہ لاتے۔

لغت عرب کے لحاظ سے اَعْجَم اس شخص کو کہتے ہیں جس کا کلام فصیح نہ ہو اور اپنے مافی الضمیر کو اچھی طرح واضح نہ کرسکے۔ خواہ وہ شخص عرب ہی کیوں نہ ہو اور اعجم کا لفظ ایسے شخص کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے جو عربی نہ ہو۔ خواہ عجمی زبان میں وہ بڑا فصیح ہو (اقرب) اس میں بتایا کہ اگر کلام کا حامل کوئی غیر عربی شخص ہوتا تو یہ لوگ کہہ سکتے تھے کہ یہ ایک غیر قوم کا آدمی ہے ہم اس کے حالات سے واقف نہیں ہم کس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ یہ ہم کو دھوکا دے رہا ہے یا نہیں دے رہا۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی اپنی قوم کے آدمی ہیں اور یہ لوگ آپؐ کے حالات کو خوب جانتے ہیں۔ پھر یہ کیوں فیصلہ نہیں کرسکتے کہ وہ سچا ہے یا جھوٹا۔ جس نے ساری عمر انسانوں پر جھوٹ نہیں بولا وہ خدا پر کس طرح جھوٹ بول سکتا ہے۔ اسی لئے ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ اعلان فرمایا کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْکُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِہٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (یونس ع ۲) یعنی اے لوگو! میں اپنی

زندگی کا ایک بیشتر حصہ تم میں گذار چکا ہوں کیا اس کو دیکھتے ہوئے تم پھر بھی عقل سے کام نہیں لیتے اور یہ نہیں سمجھ سکتے کہ جس شخص کی راستبازی اور دیانت کے تم آج تک قائل رہے ہو وہ اب صداقت کے خلاف اتنا بڑا قدم کس طرح اٹھا سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ پر افترا کرنے لگ جائے۔

زیر تفسیر آیت میں بھی اسی نکتہ کی طرف کفار کو توجہ دلائی گئی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود عربوں میں سے ہیں اور ہیں بھی مکہ کے رہنے والے۔ اگر انہوں نے کسی غیر ملک میں زندگی بسر کی ہوتی تو تم کہہ سکتے تھے کہ گو یہ شخص ہماری قوم کا ہے مگر رہا باہر ہے۔ اس لئے ہم اس کے حالات کو نہیں جانتے۔ اور یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ یہ شخص سچا ہے یا جھوٹا۔ لیکن اب تو تمہارے لئے انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔ کیونکہ ایک تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود تمہاری قوم میں سے آئے ہیں اور دوسرے انہوں نے اپنے بچپن اور جوانی کی عمر تم میں گذاری ہے اور تم لوگ ان کے اخلاق سے اچھی طرح واقف ہو۔ اور تم خود اس بات کے گواہ ہو کہ اس نے صداقت کے خلاف کبھی کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ بلکہ اس کی صداقت اور دیانت کا یہ عالم ہے کہ تم لوگ اسے اپنی قوم کا سب سے بڑا راستباز اور دیانتدار انسان قرار دیتے رہے ہو۔ ایسے حالات میں تم اس کو کس طرح جھوٹا قرار دے سکتے ہو۔ جبکہ اس کی صداقت کے خارجی ثبوت بھی موجود ہیں اور پرانے انبیاء کی پیشگوئیاں بھی اس پر صادق آرہی ہیں۔ مگر چونکہ ان تمام شواہد کو نظر انداز کرتے ہوئے اہل عرب نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت پر کمر بستہ ہو جانا تھا اس لئے فرمایا۔ كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ۔ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کا انکار بتا رہا ہے کہ یہ صرف پہلی امتوں کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ پہلی اُمتوں نے بھی موسیٰؑ اور ابراہیمؑ اور نوحؑ اور ہودؑ اور صالحؑ اور لوطؑ اور شعیبؑ کے نشانات دیکھنے کے باوجود اپنے نبیوں کا انکار کیا تھا۔ اسی طرح یہ لوگ کر رہے ہیں۔ اور اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ وہ خدائی عذاب کو نہیں دیکھ لیں گے۔ پھر بتایا کہ وہ عذاب تو آکر رہے گا مگر فَيَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ وہ اچانک آئے گا جیسا کہ قدیم سے اللہ تعالیٰ کی سنت چلی آرہی ہے اور اسی طرح پوشیدہ بڑھتے ہوئے آئے گا کہ ان کو پتہ نہیں لگے گا۔ چنانچہ دیکھ لو فتح مکہ کا واقعہ ایسا اچانک ہوا کہ ابوسفیان جیسا جہاندیدہ سردار بھی حیران رہ گیا اور جب اس نے مکہ کے ارد گرد رات کی تاریکی میں دس ہزار سپاہیوں کے خیموں کے سامنے بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے دیکھے تو گھبرا کر اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا کہ یہ کیا ہے کیا آسمان سے اچانک کوئی لشکر اتر آیا ہے۔ کیونکہ عرب کی کسی قوم کا اتنا بڑا لشکر نہیں ہو سکتا۔ اس کے ساتھیوں نے مختلف قبائل کے نام لینے شروع کر دیئے کہ شاید فلاں ہو مگر ابوسفیان ان کی ہر بات کو ردّ کرتا چلا گیا اور کہنے لگا

نہیں نہیں عرب کی کسی قوم کا لشکر بھی اتنا بڑا نہیں۔ ابھی وہ یہ باتیں ہی کر رہے تھے کہ اسلامی گارد جو پہرہ پر مقرر تھی پہنچ گئی اور انہوں نے ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کرلیا (بخاری کتاب المغازی باب این رکز النبی صلی اللہ علیہ وسلم الرایۃ یوم الفتح)۔ پھر دیکھو کس طرح قرآنی پیشگوئی کے مطابق اس عذاب کو دیکھ کر وہ لوگ ایمان لے آئے جبکہ پہلے نبیوں کی قوموں میں سے اکثر ان پر ایمان نہیں لائے اور اس طرح خدا تعالیٰ نے اپنے عزیز اور رحیم ہونے کا ثبوت دے دیا۔

پھر فرماتا ہے۔ فَيَقُوْلُوْا هَلْ نَحْنُ مُنْظَرُوْنَ۔ اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ۔ اَفَرَءَيْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِيْنَ۔ ثُمَّ جَآءَهُمْ مَّا كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ۔ مَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ۔ یہ لوگ اپنی مجالس میں عذاب آنے میں دیر لگنے کی وجہ سے کہتے ہیں کہ شاید ہمارا حال پہلی امتوں جیسا نہیں ہوگا۔ شاید ہم کو ڈھیل دی جائے گی اور عذاب جلدی نہیں آئے گا۔ فرمایا۔ اس کے معنے تو یہ ہیں کہ یہ لوگ اپنی ہنسی اور تمسخر سے ہمارے غضب کو بھڑکانا چاہتے ہیں اور عذاب بہت جلدی لانا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ اتنا تو سوچیں کہ اگر ہم کچھ مدت تک ان پر عذاب نہ بھی لائیں اور اس کے بعد ان پر عذاب آجائے تو عذاب کے وقفہ کا درمیانی عرصہ ان کو کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ فائدہ تو انہیں ہدایت سے ہی پہنچ سکتا ہے مگر وہ ہدایت اختیار کرنے کی طرف کوئی توجہ نہیں کر رہے۔

پھر فرماتا ہے۔ وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ۔ ذِكْرٰى ۛ وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ۔ ان لوگوں کو اتنا تو سوچنا چاہئے کہ کیا کبھی ایسا ہوا کہ ہم نے کسی بستی کو اتمام حجت کے بغیر ہلاک کر دیا ہو۔ ہر قوم پر جب بھی عذاب آیا تاریخی شہادت موجود ہے کہ اس سے پہلے ایک نبی آیا جس کی بڑی غرض یہی تھی کہ انہیں سمجھائے اور بدیوں سے باز رہنے کی نصیحت کرے۔ اگر بغیر اس انذار کے ہم ان لوگوں پر عذاب نازل کر دیتے۔ تو ہم لوگوں کی نگاہ میں ظالم ٹھہرتے مگر ہم ایسے نہیں ہیں۔ اور ہم بغیر ہوشیار کرنے کے کسی قوم کو اپنے عذاب سے ہلاک نہیں کیا کرتے۔ پس ان لوگوں کو بھی سمجھ لینا چاہئے کہ جب ان کی طرف ایک ہوشیار کرنے والا انسان آگیا ہے تو اس کے انکار پر عذاب بھی ضرور آئے گا کیونکہ جس طرح ڈرانے والے کے بغیر عذاب نہیں آتا اسی طرح ڈرانے والے کے بعد اس کے انکار پر ضرور عذاب آتا ہے کیونکہ اگر اس وقت عذاب نہ آئے تو ڈرانے والا جھوٹا قرار پاتا ہے۔

ذِكْرٰى کہہ کر بتایا کہ ڈرانے والے کی اصل غرض یہ ہوتی ہے کہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔ یہ غرض نہیں ہوتی کہ لوگ تباہ ہو جائیں اسی لئے ڈرانے والے کے بعد بھی عذاب میں ڈھیل دی جاتی ہے۔ تا کہ جو لوگ ایمان لا سکتے ہوں وہ ایمان لے آئیں۔ اگر کسی نبی کی بعثت کے معاً بعد عذاب آجائے تو نصیحت حاصل کرنے کا کوئی موقع نہیں رہتا۔

وَ مَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۱۱﴾ وَ مَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَ مَا

اور شیطان اس (قرآن) کو لے کر نہیں اُترے۔ اور نہ یہ کام ان کے مطابق حال تھا اور نہ وہ اس کی طاقت

يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۲۱۲﴾ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ﴿۲۱۳﴾

رکھتے تھے۔ وہ یقیناً (کلام الٰہی کے) سننے سے دور رکھے گئے ہیں۔ پس تُو اللہ (تعالیٰ) کے ساتھ کسی اَور کو

فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ ﴿۲۱۴﴾

معبود نہ پکار۔ ورنہ تُو مبتلائے عذاب لوگوں میں سے ہوجائے گا۔

تفسیر۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے کفار کے ایک اعتراض کی تردید فرمائی ہے۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ اس شخص کے ساتھ شیطان کا تعلق ہے اور اس کی طرف سے اس پر کلام نازل ہوتا ہے۔ چنانچہ گو قرآن کریم نے ان کے اس اعتراض کو الفاظ کی شکل میں نقل نہیں کیا۔ لیکن اس اعتراض کی طرف قرآن کریم کے مختلف مقامات میں اشارات ضرور پائے جاتے ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ سورۂ تکویر میں فرماتا ہے وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ (التکویر:۲۶) یعنی اس رسول پر نازل ہونے والا کلام کسی دھتکارے ہوئے شیطان کا قول نہیں ہے۔ اسی طرح زیر تفسیر آیات میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَ مَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ۔ شیطانوں نے اس کلام کو نہیں اُتارا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ اس پر شیطان نازل ہوتا ہے۔ افسوس ہے کہ بعض مسلمان مفسرین نے اس قول کو اَور بھی پکّا کر دیا اور کفار کے ہاتھوں میں انہوں نے ایک خطرناک ہتھیار دے دیا اور وہ اس طرح کہ وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ کفار مکہ کے سردار رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور انہوں نے کہا کہ آپؐ کے ماننے والے تو ادنیٰ لوگ ہیں۔ اگر آپؐ دین میں کچھ نرمی کر دیں تو ہم لوگ بھی آپ کے پاس آ کر بیٹھا کریں۔ اس طرح دوسرے لوگ بھی آپؐ کے پاس آنے لگیں گے۔ اتنے میں آپ نماز پڑھنے لگے جب آپؐ نے یہ آیت پڑھی کہ اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَ الْعُزّٰى۔ وَ مَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى (النجم:۲۰،۲۱) کہ تم بھی ذرا لات اور عزّیٰ کا حال سناؤ اور تیسرے مناۃ کا بھی جو ان کے علاوہ ہے۔ تو شیطان نے آپ کی زبان پر یہ کلمات جاری کر دیئے کہ تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى۔ یعنی یہ لمبی گردنیں رکھنے والے بت بڑی اعلیٰ شان کے مالک ہیں اور ان کی

شفاعت کی یقینی طور پر امید کی جاسکتی ہے۔ کفار نے یہ بات سنی تو وہ بڑے خوش ہوئے۔ چنانچہ جب آپؐ نے سورۃ ختم کی اور سجدہ کیا تو سب کفار نے بھی آپ کے ساتھ سجدہ کر دیا۔ کیونکہ انہوں نے سمجھا کہ آپؐ نے دین میں نرمی کر دی ہے (فتح البیان قوله تعالیٰ وما ارسلنا من قبلک من رسول ۔۔۔)۔ اس روایت کو اتنے طریقوں سے بیان کیا گیا ہے کہ ابن حجرؒ جیسے آدمی بھی کہتے ہیں کہ اس کی تاویل کی ضرورت ہے۔ میں اس وقت اس کی تاویل میں نہیں پڑتا کیونکہ اس پر تفصیلی بحث سورۂ حج میں گذر چکی ہے۔ میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کیا واقعہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا ہوا۔ مجھے قاضی عیاض کا یہ قول بے انتہا پسند ہے کہ بعض محدثین کی قلم سے شیطان نے یہ حدیث لکھوادی ہے۔ گویا اگر شیطان کا تسلط تسلیم ہی کرنا ہے تو کیوں نہ اس کا تسلط محدثین پر تسلیم کر لیا جائے۔ یہ تو قاضی عیاض کا جواب ہے۔ قرآنی جواب یہ ہے کہ تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى کا فقرہ جہاں جہاں بیان کیا جاتا ہے۔ اس کے معاً بعد یہ آیت آتی ہے کہ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَ لَهُ الْاُنْثٰى ۔ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى۔ اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ (النجم : ۲۲ تا ۲۴) یعنی کیا تمہیں تو اپنے لئے بیٹے پسند ہیں اور خدا تعالیٰ کے لئے تم لڑکیاں تجویز کر رہے ہو۔ یہ تقسیم تو نہایت ہی ناقص اور ظالمانہ تقسیم ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے رکھ لئے ہیں ورنہ اللہ تعالیٰ نے ان بتوں کی تائید کے لئے کوئی دلیل نازل نہیں کی۔ اب بتاؤ کہ کیا اس فرضی کلام کے بعد جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کوئی شخص ان آیتوں کو سن کر یہ خیال بھی کر سکتا تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عقائد میں نرمی اختیار کر لی ہے اور اس پر کوئی بیوقوف سے بیوقوف مشرک بھی سجدہ کر سکتا تھا۔ پس یہ آیات ہی بتا رہی ہیں کہ ان میں وہ فقرے داخل ہی نہیں ہو سکتے تھے جو بتوں کی تعریف میں بیان کئے جاتے ہیں۔ آخر کفار عربی تو جانتے تھے۔ کیا وہ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے تھے کہ اس سورۃ کے تو لفظ لفظ میں شرک کی مذمت کی گئی ہے پھر یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ آپؐ نے اپنے دینی عقائد میں نرمی اختیار کر لی ہے۔

یہی مضمون زیر تفسیر آیات میں بیان کیا گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کفار کا یہ الزام کہ اس شخص پر شیطان کلام نازل کرتا ہے درست نہیں کیونکہ (الف) اس شخص کا اپنا چال چلن ایسا اعلیٰ اور پاکیزہ ہے کہ ایسے آدمیوں کا شیطان سے کوئی تعلق ہو ہی نہیں سکتا۔ (ب) پھر جو تعلیم اس پر نازل ہوئی ہے وہ ایسی مطہر اور پاک ہے کہ ناپاک شیطان اس تعلیم کو اتار ہی نہیں سکتا۔ آخر یہ کس طرح ممکن ہے کہ شیطان خود اپنے خلاف تعلیم اتارے۔ پھر جبکہ اس کلام میں شیطان کے خلاف تعلیم ہے۔ تو یہ کلام اس کی طرف سے کیسے نازل ہو سکتا ہے۔ (ج) اس کتاب میں آسمانی علوم

ہیں اور اس میں شیطانی کلام کا اس قدر ردّ ہے کہ اگر شیطان یا اس کے ساتھی اس میں کچھ ملانا بھی چاہیں تو نہیں ملا سکتے کیونکہ کہیں کوئی عبارت کھپ ہی نہیں سکتی اور پھر وہ آسمانی علوم کے بیان کرنے کی طاقت بھی نہیں رکھتے کیونکہ اِنَّهُمۡ عَنِ السَّمۡعِ لَمَعۡزُوۡلُوۡنَ خدا تعالیٰ نے انہیں آسمان کی باتیں سننے سے محروم کیا ہوا ہے گویا آسمان پر جا کر باتیں سننا تو الگ رہا وہاں تک کسی کے جانے کی طاقت بھی قرآن کریم نے تسلیم نہیں کی مگر عجیب بات یہ ہے کہ بعض مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ شیطان آسمان پر جاتا ہے اور وہ ملاء اعلیٰ اور جبریلؑ اور عرش کی باتوں کو سن کر زمین پر آ جاتا ہے اور پھر وہ اپنے چیلے چانٹوں کو وہ خبریں بتاتا پھرتا ہے۔ حالانکہ خدا تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ شیطان آسمانی کلام سننے کی طاقت ہی نہیں رکھتا۔ خدا تو خدا ہے۔ اس دنیا کے معمولی معمولی بادشاہوں کے پاس پھٹکنے کی بھی لوگوں میں طاقت نہیں ہوتی اور وہ ان کے قریب جانے سے لرزتے اور گھبراتے ہیں۔ پھر یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ زمین و آسمان کے خدا کے راز شیطان اُچک کر لے آئے۔ اور وہ انہیں بگاڑ کر دنیا میں پھیلانا شروع کر دے۔ غرض قرآن کریم کفار کے اس الزام کی تردید کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ شیاطین نے اس کلام کو نازل نہیں کیا اور یہ کام نہ ان کے مناسب حال تھا اور نہ وہ اس کی طاقت رکھتے تھے۔ یعنی قرآن کریم میں تو وہ وہ نصیحتیں ہیں جو شیطانی تعلیموں کے بالکل خلاف ہیں۔ پھر یہ کس طرح تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ شیطان نے خود اپنے خلاف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تعلیم نازل کر دی۔ یہ دلیل حضرت مسیحؑ نے بھی انجیل میں استعمال کی ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ:۔

"پھر وہ ایک گونگی بدروح کو نکال رہا تھا۔ اور جب وہ بدروح نکل گئی تو ایسا ہوا کہ گونگا بولا اور لوگوں نے تعجب کیا۔ لیکن ان میں سے بعض نے کہا۔ یہ تو بدروحوں کے سردار بعلزبول کی مدد سے بدروحوں کو نکالتا ہے۔ بعض اور لوگ آزمائش کے لئے اس سے آسمانی نشان طلب کرنے لگے۔ مگر اس نے ان کے خیالات کو جان کر ان سے کہا جس سلطنت میں پھوٹ پڑے وہ ویران ہوجاتی ہے اور جس گھر میں پھوٹ پڑے وہ برباد ہوجاتا ہے اور اگر شیطان بھی اپنا مخالف ہوجائے تو اس کی سلطنت کس طرح قائم رہے گی کیونکہ تم میری بابت کہتے ہو کہ یہ بدروحوں کو بعلزبول کی مدد سے نکالتا ہے۔" (لوقا باب ۱۱ آیت ۱۴ تا ۱۸)

اسی طرح متی میں لکھا ہے کہ حضرت مسیحؑ نے ان سے کہا:۔

"اگر شیطان ہی نے شیطان کو نکالا تو وہ آپ اپنا مخالف ہوگیا۔ پھر اس کی بادشاہی کس طرح قائم رہے گی۔" (متی باب ۱۲ آیت ۲۶)

قرآن کریم بھی یہی دلیل مخالفوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔اور انہیں توجہ دلاتا ہے کہ اگر تمہارا یہ اعتراض صحیح ہو کہ شیطان نے یہ کلام نازل کیا ہے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ شیطان نے اپنا بیڑہ آپ غرق کر لیا۔کیونکہ اس کتاب کے لفظ لفظ میں شیطان کو دھتکارا گیا ہے اور اس کی ایک ایک تعلیم میں اس پر پھٹکار ڈالی گئی ہے۔اب یہ کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ شیطان نے خود اپنے خلاف اتنا بڑا مواد فراہم کر دیا۔یہ تو عقل کے بالکل خلاف ہے۔

اسی طرح وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ میں جو دلیل استعمال کی گئی ہے کہ اس قرآن میں تو غیب کی خبریں ہیں اور غیب کی خبریں بیان کرنا شیطان کے اقتدار سے باہر ہے۔اسے بھی انجیل میں استعمال کیا گیا ہے اور حضرت مسیحؑ نے واضح کیا ہے کہ علم غیب صرف خدا تعالیٰ کو حاصل ہے اور شیاطین تو الگ رہے فرشتے بھی اس کے رازوں سے آگاہ نہیں۔چنانچہ ایک دفعہ حضرت مسیحؑ نے جب اپنی آمد ثانی کی علامات بتائیں تو اس کے ساتھ ہی آپ نے اس امر کی بھی وضاحت فرما دی کہ گو میری یہ باتیں کبھی نہیں ٹلیں گی۔

”لیکن اس دن اور اس گھڑی کی بابت کوئی نہیں جانتا۔نہ آسمان کے فرشتے۔نہ بیٹا۔مگر صرف باپ۔جیسا نوح کے دنوں میں ہوا ویسا ہی ابن آدم کے آنے کے وقت ہوگا۔کیونکہ جس طرح طوفان کے پہلے سے دنوں میں لوگ کھاتے پیتے اور بیاہ شادی کرتے تھے اس دن تک کہ نوح کی کشتی میں داخل ہوا۔اور جب تک طوفان آکر ان سب کو بہا نہ لے گیا ان کو خبر نہ ہوئی اسی طرح ابن آدم کا آنا ہوگا۔“ (لوقا باب ۲۴ آیت ۳۶ تا ۴۰)

غرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک اور بے عیب زندگی اور آپؐ کی تعلیم کا پاک اور مطہر ہونا اور پھر قرآن کریم میں آسمانی علوم اور غیب کی خبروں کا بکثرت اظہار اور شیاطین کا آسمانی علوم کے بیان کرنے کی طاقت ہی نہ رکھنا بتا رہا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو یہ الزام لگایا جا رہا ہے کہ آپؐ کے ساتھ شیطان کا تعلق ہے اور اس نے آپ پر یہ کلام نازل کر دیا ہے سراسر غلط اعتراض ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شیطان سے نہیں بلکہ خدا سے تعلق ہے اور اسی نے آپ پر یہ کلام نازل فرمایا ہے۔

پھر فرماتا ہے فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ۔اے مسلمان! تُو خدا کے سوا کسی معبود سے دعا نہ کر۔کیونکہ فطرت صحیحہ کے راز صرف خدا سے مل سکتے ہیں۔اور کوئی غیر اللہ اس میں تیری مدد نہیں کر سکتا۔اگر تو فطرت صحیحہ کے راز معلوم کرنے کے لئے غیر اللہ کی طرف جائے گا تو فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ اس کی طرف سے جو تعلیم تجھے ملے گی۔اس کے نتیجہ میں تو دکھ ہی دکھ اٹھائے گا کوئی سکھ تجھے نصیب نہ ہوگا۔

وَ اَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ ﴿۲۱۵﴾ۙ وَ اخۡفِضۡ جَنَاحَکَ

اور تُو (سب سے پہلے) اپنے سب سے قریبی رشتہ داروں کو ڈرا۔ اور جو تیرے پاس مومن ہو کر آئیں ان

لِمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۲۱۶﴾ فَاِنۡ عَصَوۡکَ فَقُلۡ اِنِّیۡ

کے لئے محبت کے بازو جھکا دے پھر اگر وہ گروہ تیری نافرمانی کر بیٹھیں تو کہہ دے کہ میں تمہارے عمل سے بیزار ہوں

بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲۱۷﴾ۚ وَ تَوَکَّلۡ عَلَی الۡعَزِیۡزِ الرَّحِیۡمِ ﴿۲۱۸﴾ۙ

اور غالب (اور) بار بار کرم کرنے والی ہستی پر توکل کر۔ جو تجھے اس وقت بھی دیکھتا ہے جب تو اکیلا نماز کے

الَّذِیۡ یَرٰىکَ حِیۡنَ تَقُوۡمُ ﴿۲۱۹﴾ۙ وَ تَقَلُّبَکَ فِی السّٰجِدِیۡنَ ﴿۲۲۰﴾

لئے کھڑا ہوتا ہے۔ اور اس وقت بھی جبکہ تُو (نماز با جماعت کے لئے) سجدہ کرنے والی جماعت میں اِدھر اُدھر پھر

اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۲۲۱﴾

رہا ہوتا ہے۔ یقیناً وہ (خدا ہی) بہت سننے والا (اور) بہت جاننے والا ہے۔

حلّ لُغات۔ عَشِیۡرَۃٌ اَلۡعَشِیۡرُ اَلۡقَبِیۡلَۃُ وَالۡقَرِیۡبُ وَالصَّدِیۡقُ وَزَوۡجُ الۡمَرۡأَۃِ وَالۡمُعَاشِرُ۔ یعنی عَشِیۡرَۃٌ کے معنے قبیلہ کے بھی ہوتے ہیں۔ دوست کے بھی ہوتے ہیں۔ خاوند کے بھی ہوتے ہیں اور ہمسائے کے بھی ہوتے ہیں۔ (اقرب)

اِخۡفِضۡ اِخۡفِضۡ خَفَضَ یَخۡفِضُ سے امر کا صیغہ ہے اور خَفَضَ کے معنے ہیں۔ نیچا کیا۔ اور وَاخۡفِضۡ جَنَاحَکَ لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ کے معنے ہیں تَوَاضِعۡ لَھُمۡ۔ کہ مومنوں کے ساتھ خاکساری کے ساتھ پیش آ۔ اور ان سے ملتا رہ تا کہ ان کی تربیت ہوتی رہے۔ (اقرب)

تَقَلُّبَکَ تَقَلُّبٌ تَقَلَّبَ کا مصدر ہے۔ اور تَقَلَّبَ عَلٰی فِرَاشِہٖ کے معنے ہیں تَحَوَّلَ مِنۡ جَانِبٍ اِلٰی جَانِبٍ۔ وہ اپنے بستر میں ایک طرف سے دوسری طرف ہوتا رہا نیز جب یہ فقرہ کہیں کہ ھُوَ یَتَقَلَّبُ فِیۡ اَعۡمَالِ السُّلۡطَانِ تو معنے ہوتے ہیں یَتَنَقَّلُ مِنۡ عَمَلٍ اِلٰی عَمَلٍ۔ یعنی وہ بادشاہ کے مختلف کاموں میں ادھر سے ادھر جاتا ہے۔ (اقرب)

اَلتَّقَلُّبُ اَلتَّصَرُّفُ یعنی تَقَلُّبٌ کے معنے ادھر سے ادھر آنے جانے کے ہیں۔(مفردات)

تفسیر ۔ان آیات میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۔یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تُو دنیا کو ڈرا اور اسے بیدار اور ہوشیار کر مگر پہلے اپنے رشتہ داروں اور قریبیوں کو ڈرا کیونکہ ان کا تجھ پر دوہرا حق ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ رشتہ داریاں دنیا میں بڑا بھاری اثر رکھتی ہیں۔اور تاریخ میں اس کے اثرات کی بعض حیرت انگیز مثالیں ہمیں نظر آتی ہیں۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت جب تبلیغ شروع کی اور کفار نے انتہائی طور پر ہر رنگ میں اپنا اثر استعمال کر لیا اور کسی طرح بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم اور حق کے اعلان کو نہ چھوڑا۔تو مکہ کے لوگ ابوطالب کے پاس آئے اور انہیں کہا کہ آپ اپنے بھتیجے کو سمجھا لیجئے ورنہ ہم مجبور ہو جائیں گے کہ اس کے ساتھ آپ کا بھی بائیکاٹ کر دیں۔حضرت ابوطالب نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا اور ان سے کہا کہ اے میرے بھتیجے آج تک میں نے تیرا ساتھ دیا ہے مگر آج میری قوم کے لوگ میرے پاس آئے ہیں۔اور انہوں نے کہا ہے کہ ابوطالب ہم تیرا بہت لحاظ کرتے رہے ہیں مگر آج ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اگر تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نہیں چھوڑے گا اور اس کی حمایت بدستور کرتا چلا جائے گا تو ہم تیری سرداری سے بھی انکار کر دیں گے۔ابوطالب ایک غریب آدمی تھے۔مگر وہ سارا وقت اپنی قوم کی خدمت میں لگاتے تھے اس لئے ان کی ساری جائیداد ہی قوم کی محبت تھی۔دنیا کے کچھ لوگ کمانے میں لگے ہوئے ہوتے ہیں۔اور کچھ قوم کی خدمت میں لگے ہوئے ہوتے ہیں۔کمانے والے اپنا بدلہ روپیہ کی صورت میں لے لیتے ہیں۔مگر خدمت کرنے والے اپنا بدلہ قوم کی محبت کی صورت میں لیتے ہیں۔ابوطالب چونکہ دن رات اپنی قوم کی خدمت میں مصروف رہتے تھے۔اس لئے ان کی ساری کمائی ہی یہی تھی کہ وہ قوم کی خدمت کرتے تھے اور قوم انہیں سلام کرتی تھی اس لئے جب قوم کی طرف سے انہیں یہ نوٹس ملا تو انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا اور کہا۔اے میرے بیٹے میری قوم آج کہہ رہی ہے کہ اگر تُو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نہیں چھوڑ سکتا تو پھر ہم بھی تجھ کو چھوڑ دیں گے۔اس وقت یہ خیال کر کے کہ ساری عمر میں نے اپنی قوم کی خدمت میں لگا دی تھی مگر آج بڑھاپے میں آ کر وہی قوم مجھے چھوڑنے کے لئے تیار ہو گئی ہے حضرت ابوطالب پر رقت طاری ہوئی اور ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی یہ دیکھ کر کہ میرے چچا باوجود اس کے کہ مسلمان نہیں ہمیشہ میری خدمت کرتے رہے ہیں اور ہمیشہ انہوں نے میری تائید کی ہے اور اب میری خدمت اور میری تائید کی وجہ سے ان کی ایک ہی قیمتی دولت جو ان کے پاس تھی یعنی قوم میں عزت وہ کھوئی جانے لگی ہے رقت طاری ہو گئی۔آپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور آپ نے بھرائی ہوئی آواز

میں کہا اے چچا جو پیغام میں لایا ہوں وہ خدا نے میرے سپرد کیا ہے۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ کسی کے کہنے پر میں اسے چھوڑ دوں۔ اے میرے چچا! میں جانتا ہوں کہ خدا ایک ہے لیکن میں اپنی قوم کی خاطر یہ نہیں کہہ سکتا کہ خدا ایک نہیں۔ اگر میری قوم سورج کو میرے دائیں اور چاند کو میرے بائیں بھی لا کر کھڑا کر دے اور اتنا بڑا نشان دکھائے جس کی دنیا میں کوئی مثال نہیں ملتی اور پھر کہے کہ اب بھی یہ مان جاؤ کہ دنیا کا پیدا کرنے والا خدا ایک نہیں تب بھی میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اے میرے چچا! میں آپ سے بھی یہ امید نہیں کرتا کہ آپ میری خاطر اتنی بڑی قربانی کریں۔ آپ نے جو خدمت کی ہے۔ میں اس کا ممنون ہوں۔ لیکن آئندہ کے لئے میں یہ بوجھ آپ پر ڈالنا نہیں چاہتا۔ آپ بیشک میرا ساتھ چھوڑ دیں اور اپنی قوم سے کہہ دیں کہ میں نے اپنے بھتیجے کو چھوڑ دیا ہے اور اب میں تمہارے ساتھ ہوں۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور یقین کے ساتھ یہ حیرت انگیز محبت ایک طرف تھی اور دوسری طرف وہ محبت کھڑی دیکھ رہی تھی جو ابوطالب کو اپنے بھتیجے کے ساتھ تھی۔ ابوطالب اس وقت ان دو محبتوں کے درمیان آگئے۔ یوں تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ابوطالب کے بھتیجے تھے مگر ابوطالب نے اپنے بیٹوں سے بڑھ کر آپؐ سے محبت کی اور اپنے بیٹوں سے زیادہ آپ کی خبر گیری کی۔ پس ایک طرف وہ محبت کھڑی تھی جو ابوطالب کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھی اور دوسری طرف بھتیجے کا یہ یقین اور ایمان تھا کہ میں نے جس صداقت کو قبول کیا ہے میں اسے چھوڑنے کے لئے تیار نہیں۔ ان کی ایک آنکھ کے سامنے بیک وقت یہ دو محبتیں آکر کھڑی ہو گئیں اور دوسری آنکھ کے سامنے ان کے باپ عبدالمطلب کی روح آکر کھڑی ہو گئی جنہوں نے مرتے وقت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ ابوطالب کے ہاتھ میں یہ کہتے ہوئے دیا تھا کہ ابوطالب اس کا باپ فوت ہو گیا ہے اس کی ماں بھی فوت ہو گئی ہے۔ میں نے اس کو اپنے بچوں سے زیادہ عزیز سمجھ کر پالا ہے۔ اب میں مرنے لگا ہوں اور مجھ کو تجھ پر یہ اعتبار ہے کہ تو اس کام میں سستی اور کوتاہی نہیں کرے گا۔ میں اپنی سب سے زیادہ قیمتی امانت تیرے سپرد کرتا ہوں۔ غرض باپ کی روح ایک طرف کھڑی تھی اور صداقت کے فدائی اور سچائی پر جان دینے والے بھتیجے کی روح دوسری طرف کھڑی تھی مگر باوجود اسلام نہ لانے کے ابوطالب ان دو محبتوں کا مقابلہ نہ کر سکے اور انہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہہ دیا کہ اے میرے بیٹے! جاؤ! اور جس چیز کو سچا سمجھتے ہو پھیلاؤ۔ قوم کا مذہب تو میں نہیں چھوڑ سکتا۔ لیکن تیری خاطر اگر قوم مجھے چھوڑ دے تو میں تیرے لئے یہ قربانی بھی کروں گا۔ اور ہمیشہ تیرا ساتھ دوں گا۔ تب قوم نے یہ فیصلہ کیا کہ بنو ہاشم کا مقاطعہ کیا جائے اس اعلان پر بنو ہاشم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر ایک وادی میں جو ابوطالب کی ملکیت میں تھی چلے گئے۔ وادی سے مراد کوئی سبز وشاداب علاقہ یا وسیع زمین کا ٹکڑا نہیں بلکہ مکہ میں

بے پانی اور بے سبزی کے وادیاں ہوا کرتی ہیں گویا بے آب و گیاہ زمین کے کچھ ٹکڑے ہوتے ہیں۔لیکن چونکہ ان میں کوئی کوئی جھاڑی بھی پائی جاتی ہے جس میں اونٹ وغیرہ چر لیتے ہیں اس لئے انہیں وادی کہہ دیا جاتا ہے۔مکہ کے پاس ایک ایسی ہی وادی ابوطالب کی تھی۔ ابوطالب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر اور ان چند مسلمانوں کو لے کر جو اس وقت مکہ میں تھے اس وادی میں چلے گئے جب وہ اس وادی میں گئے تو وہ ہاشمی دشمن جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مونہہ پر بعض دفعہ گالیاں دیا کرتے تھے وہ ہاشمی دشمن جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھر پھینکنے میں خوشی محسوس کیا کرتے تھے۔وہ ہاشمی دشمن جو ابوجہل کو اُکسا اُکسا کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تکالیف پہنچایا کرتے تھے وہ بھی قومی عصبیت اور رشتہ داری کی وجہ سے اپنے گھروں کو چھوڑ کر اس وادی میں محصور ہو گئے۔اور ان سب نے کہا کہ ہم اپنے رشتہ داروں کو نہیں چھوڑ سکتے (السیرۃ الحلبیۃ جلد اول صفحہ ۳۷۵)

تو رشتہ داری بڑا بھاری اثر رکھتی ہے۔اور خونی تعلق کبھی کبھی ایسی قربانیاں بھی کروالیتا ہے جو دوسرے حالات میں ناممکن نظر آتی ہیں۔

اسی لئے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے۔ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو دنیا کے کونے کونے کے لوگوں کو ڈرا۔لیکن پہلے اپنے عزیزوں کو ڈرا۔اس لئے کہ ان کا تجھ پر دوہرا حق ہے۔ایک حق تو یہ ہے کہ باقی دنیا کی طرح یہ بھی تباہ ہو رہے ہیں اور ایک حق یہ ہے کہ یہ تیرے رشتہ دار ہیں اور ان کے باپ دادوں نے تیرے ساتھ کبھی حسن سلوک کیا تھا۔انگریزی میں بھی مثل مشہور ہے کہ Charity begins at home یعنی صدقہ و خیرات پہلے گھر سے شروع ہوتا ہے۔اسی طرح وعظ و نصیحت کا سلسلہ بھی ہمیشہ گھر سے ہی شروع ہونا چاہیے۔چنانچہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم کی اس طرح تعمیل کی کہ آپ مکہ کے دستور کے مطابق کوہِ صفا پر کھڑے ہو گئے اور آپ نے مختلف قبائل کو نام لے لے کر بلانا شروع کیا۔ پہلے آپؐ نے آلِ غالب کو بلایا اور وہ مسجد حرام سے نکل کر کوہِ صفا کے دامن میں آ گئے۔اس وقت ابولہب نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آلِ غالب تو آ گئے ہیں آپ نے جو کچھ کہنا ہے کہہ دیں مگر آپ نے ابولہب کی بات کی طرف کوئی توجہ نہ کی اور لوئی قبیلہ کے افراد کو آپ نے آواز دی۔وہ پہنچ گئے تو ابولہب نے پھر کہا کہ اب تو لوئی قبیلہ بھی آ گیا ہے اب تو آپ بتائیں کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر بھی اس کی بات کو درخورِ اعتناء نہ سمجھا اور آلِ مرّہ کو آواز دی۔چنانچہ وہ بھی آ گئے۔پھر آپؐ نے آلِ کلاب اور آلِ قصّی کو بلایا۔ یہاں تک کہ سب لوگ جمع ہو گئے اور جو لوگ خود نہ آ سکے انہوں نے اپنا ایلچی بھیج دیا تا کہ وہ معلوم کر کے انہیں اطلاع

دے کہ آج انہیں کس غرض کے لئے جمع کیا گیا ہے۔ جب مکہ کے تمام قبائل قریش سمیت جمع ہو گئے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے خطاب شروع کیا اور فرمایا۔ دیکھو اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک بہت بڑا لشکر جمع ہے جو تم پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو کیا تم میری اس بات کو مانو گے یا نہیں۔ انہوں نے کہا۔ کیوں نہیں ہم آپ کی بات ضرور مانیں گے کیونکہ ہم نے ہمیشہ آپ کو راستباز پایا ہے مکہ کے حالات سے باخبر لوگ جانتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مطالبہ درحقیقت ایسا ہی تھا جیسے کسی ناممکن چیز کو ممکن تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا جائے کیونکہ مکہ کے لوگوں کے جانور وادی میں چرا کرتے تھے اور وہ ایسا علاقہ ہے کہ اس میں کسی لشکر کا چھپ رہنا ناممکنات میں سے ہے۔ مگر ان لوگوں پر آپ کی راستبازی کا اس قدر اثر تھا کہ انہوں نے کہا۔ خواہ ہماری آنکھیں اس بات کو تسلیم نہ کریں ہم آپ کی بات کو ضرور مانیں گے کیونکہ آپ کی راستبازی ہمارے نزدیک مسلّم ہے۔ جب انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یک زبان ہو کر اپنے اس یقین اور اعتماد کا اظہار کیا۔ تو آپ نے فرمایا لو سُنو! میں تمہیں ایک اہم خبر سناتا ہوں۔ اور وہ خبر یہ ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔ پس میں تمہیں کہتا ہوں کہ تم اگر اللہ تعالیٰ کے عذاب سے محفوظ رہنا چاہتے ہو تو میری اتباع کرو۔ آپ کا یہ کہنا تھا کہ ابولہب جوش سے کہنے لگا کہ تَبًّا لَكَ سَائِرَ الْاَيَّامِ اَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا۔ یعنی نعوذ باللہ تجھ پر ہلاکت ہو۔ اتنی سی بات کے لئے تُو نے ہمیں اکٹھا کیا تھا۔ اور اسی طرح دوسرے لوگ ہنسی مذاق کرتے اور تمسخر اڑاتے ہوئے منتشر ہو گئے (بخاری کتاب التفسیر زیرِ آیت و انذر عشیر تک الاقربین و تفسیر رازی زیرِ آیت تبت یدا ابی لھب و تب۔ و تفسیر رُوح المعانی زیرِ آیت سورۃ لھب)۔ مگر جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر قسم کی مخالفت اور تمسخر اور استہزاء کے باوجود اشاعت توحید کے کام کو جاری رکھا اور متواتر لوگوں کو پیغامِ حق پہنچاتے رہے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں میں سے ایسے لوگ پیدا کر دیئے جنہوں نے اسلام کی اشاعت کے لئے اپنی جانیں تک قربان کر دیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان پر کچھ نہ کچھ بیداری کے اوقات بھی آتے ہیں۔ اور جب کسی پر بیداری کی گھڑی آتی ہے اور اس کے دل کی کھڑکی کھلتی ہے تو وہ سچائی کو قبول کر لیتا ہے۔ آخر وہ لوگ بھی تھے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلے دن ایمان لائے۔ جیسے حضرت ابوبکرؓ۔ حضرت خدیجہؓ۔ حضرت علیؓ اور حضرت زیدؓ۔ اور وہ لوگ بھی تھے جو آپ پر کئی سال بعد ایمان لائے جیسے حضرت خالد بن ولیدؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ وغیرہ۔ بیشک خالد بن ولیدؓ میں پہلے سال بھی عقل موجود تھی۔ لیکن فرق یہ تھا کہ پہلے سال ان کے دل کی کھڑکی نہیں کھلی تھی۔ حضرت عمرو بن العاصؓ میں بھی عقل موجود تھی جو انہیں پہلے سال مسلمان بنا سکتی تھی لیکن ان کے دل کی کھڑکی بھی نہیں کھلی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ۔

حضرت خدیجہؓ۔حضرت علیؓ اور حضرت زیدؓ کی کھڑکیاں کھلی تھیں۔اس لئے وہ پہلے دن ہی ایمان لے آئے۔اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب فرمایا کہ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہوا ہوں تو ان سب نے آمنا و صدّقنا کہا۔لیکن کچھ لوگوں کی کھڑکیاں ایک سال بعد کھلیں، کچھ لوگوں کی کھڑکیاں دو سال بعد کھلیں، کچھ لوگوں کی کھڑکیاں چار سال بعد کھلیں، اور بعض لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے قریب ایمان لائے۔پس کھڑکی کھلنے کی بات ہے ورنہ صداقت کبھی اثر کئے بغیر نہیں رہتی۔

میں دیکھتا ہوں کہ ہماری جماعت کے دوستوں میں یہ کمزوری پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے رشتہ داروں کو تبلیغ نہیں کرتے اور ان پر اتنا دباؤ نہیں ڈالتے جتنا ڈالنا چاہیے۔ میں نے ایک دفعہ اس پر خاص طور پر زور دیا اور بعض احمدیوں نے ایسا کیا تو اس کا نمایاں اثر ہوا۔ چنانچہ ایک احمدی دوست نے بتایا کہ میں ایک دن اپنے ایک رشتہ دار کے گھر میں بیٹھ گیا اور اسے کہہ دیا کہ یا تو تم مجھے اپنا ہم خیال بنالو اور یا تم احمدی بن جاؤ۔نتیجہ یہ ہوا کہ میرے دلائل چونکہ معقول تھے وہ اس پر اثر کر گئے اور وہ احمدی ہو گیا۔حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ہمیں سمجھا دے کہ ہم غلطی پر ہیں تو ہمیں اس کی بات ماننے میں کوئی حرج نہیں لیکن افسوس تو یہ ہے کہ جماعت کے دوست دلیری سے کام نہیں لیتے ۔آخر یہ صاف بات ہے کہ جس کی دلیل پختہ ہوگی وہ یقیناً دوسرے شخص کو اپنی طرف مائل کرلے گا۔پس اگر لوگ اپنے اپنے رشتہ داروں کے پاس جائیں تو یقیناً لاکھوں لاکھ لوگ احمدیت کی طرف متوجہ ہو جائیں گے آگے پھر ان کے رشتہ دار ہوں گے جنہیں وہ تبلیغ کریں گے اور اس طرح یہ سلسلہ اتنا غیر معمولی وسیع ہو سکتا ہے کہ ہمارے احساس اور اندازہ سے بھی بالا ہو سکتا ہے۔آخر غور کرو کہ کیا صحابہؓ نے تبلیغ کی تھی یا نہیں۔مگر کیا صحابہؓ کے پاس پریس ہوا کرتے تھے۔کیا اُن کے ہاں کتابیں چھپا کرتی تھیں۔کیا وہ تنخواہ دار مبلغ رکھا کرتے تھے۔کیا ان کے ہاں جلسے ہوا کرتے تھے؟ ان میں سے کچھ بھی نہیں تھا۔صرف یہی ہوتا تھا کہ بھائی اپنی بہن کو ملنے گیا۔تو وہ پوچھتی کہ بھائی کہ تم نے اپنے باپ دادے کے مذہب کو کیوں چھوڑ دیا ہے وہ جواب دیتا کہ میں تو اپنے باپ دادا کی عزت کرتا ہوں۔لیکن بتوں کو خدا کا شریک بنالینا بڑی بھاری غلطی ہے۔بُت ہمیں کیا دے سکتے ہیں۔دینے والا تو صرف خدا ہے۔اس طرح وہ توحید کا سبق سکھاتا اور پھر اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو دوسرا شخص بھی مان لیتا۔نہ کوئی تقریریں کرتا تھا نہ لٹریچر شائع کرتا تھا نہ جلسے منعقد کرتا تھا خود بخود رشتہ داروں سے میل جول اور ملاقات کے ذریعہ ہی سلسلہ وسیع ہوتا چلا جاتا۔مگر میں دیکھتا ہوں کہ ہماری جماعت میں سے بعض نے اپنے رشتہ داروں کو تبلیغ کرنی چھوڑ دی ہے اور اپنے تعلقات ایسے محدود کر لئے ہیں کہ گویا وہ اپنے رشتہ داروں سے بالکل کٹ چکے ہیں۔حالانکہ مذہباً اور اخلاقاً اور شرعاً ان کا

فرض تھا کہ وہ بار بار اپنے رشتہ داروں سے ملتے اوران کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے مگر ادھر وہ احمدی ہوتے ہیں اوراُدھر اپنے رشتہ داروں سے بچنا شروع کر دیتے ہیں۔تم اپنے آپ کو اتنا کمزور کیوں سمجھتے ہو۔تمہارے پاس ایمان ہے۔تمہارے پاس زندہ صداقت ہے تمہارے پاس تازہ معجزات اورنشانات ہیں ۔تمہارے پاس خدائی تائید کے نشانات ہیں ۔تمہارے اندر تو اتنی دلیری ہونی چاہیے کہ اگر تمہارا کوئی چچا ایسا ہے جس سے تم دس سال سے نہیں ملے ۔تو احمدی ہونے کے فوراً بعد اس کے پاس جاؤ اس سے اپنے تعلقات بڑھاؤ اوراُسے اپنے ساتھ شامل کرنے کی کوشش کرو۔اگر تم اپنے رشتہ داروں کو تبلیغ کرنا شروع کر دو تو میں سمجھتا ہوں کہ پچاس لاکھ احمدیوں کا رشتہ دار اس ملک میں موجود ہوگا ۔پس تمہیں غیروں کے پاس جانے کی ضرورت ہی نہیں تم اپنے پچاس لاکھ رشتہ داروں کے پاس جاؤ اور حق ان پر واضح کرو۔یہی کام اتنا بڑا ہے کہ ایک لمبے عرصہ تک تمیں اسی کام سے فرصت نہیں مل سکتی۔ اور جب تم ان پچاس لاکھ کو احمدی بنالو گے تو ان پچاس لاکھ سے دو کروڑ اور رشتہ دار نکل آئیں گے جن کو سمجھانے کیلئے پھر تمہیں ایک لمبی جدوجہد کی ضرورت ہوگی ۔پس تم تبلیغ کا وہ طریق اختیار کرو جو قرآن کریم نے اس آیت میں بتایا ہے ۔جب تم اپنے رشتہ داروں سے ملو گے اوران کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کرو گے تو تم دیکھو گے کہ ان میں سے ہزاروں ہزار سعید روحیں احمدیت کو قبول کرنے کے لئے دوڑتی چلی آئیں گی اوراگر احمدیت قبول نہیں کریں گی تو کم ازکم سلسلہ پر اعتراض کی آئندہ انہیں جرأت نہیں ہوگی ۔

میں نے کئی دفعہ سنایا ہے کہ جب میں حج کے لئے گیا تو میں مصر کے راستہ گیا تھا۔اصل میں میری سکیم یہ تھی کہ میں مصر میں عربی تعلیم حاصل کروں گا اوراگلے سال حج کروں گا مگر اتفاقاً قاہرہ جانے سے پہلے میں پورٹ سعید میں ٹھہر گیا۔اسی رات میں نے رؤیا میں دیکھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام تشریف لائے ہیں اورفرماتے ہیں کہ اگر تم نے حج کرنا ہے تو سب سے پہلے جہاز میں چلے جاؤ چنانچہ میں نے اسی وقت پتہ لیا اورتین چار دن کے بعد جو جہاز جانے والا تھا اس میں حج کے لئے سوار ہو گیا۔خدا تعالیٰ کی قدرت ہے کہ اس کے بعد ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ مصر کے لوگ ایک دو سال تک حج کے لئے نہ جا سکے ۔اس سفر میں میرے ساتھ دو مسلمان اورایک ہندو بیرسٹر بھی تھے ۔ ان کو کسی طرح پتہ لگ گیا کہ میں احمدی ہوں ۔چنانچہ انہوں نے میرے ساتھ بحث شروع کر دی ۔مگر میں نے انہیں یہ پتہ نہ لگنے دیا کہ میں بانیٔ سلسلہ احمدیہ کا لڑکا ہوں ۔آخر بڑھتے بڑھتے انہوں نے نہایت ناشائستہ اعتراضات شروع کر دیئے ۔میں پھر بھی دلیل کے ساتھ ان کے اعتراضات کو ردّ کرتا رہا۔گیارہ دن میں ہم پورٹ سعید پہنچے۔ ہم نے اپنا بھاری سامان پورٹ سعید میں رکھوا دیا جب میں گودام سے اپنا ٹرنک نکلوا کر باہر نکلا۔تو اتفاقاً میرے

ٹرنک پر کسی نے مرزا بشیر الدین محمود احمد Son of the founder of the Ahmadiyya Movement لکھا ہوا تھا۔ میں جہاز کی سیڑھیوں سے اُتر رہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ وہ تینوں سرپٹ دوڑے میری طرف چلے آرہے ہیں۔ میں نے کہا کیا بات ہے کہنے لگے۔ معاف کیجئے ہم نے بڑی بیوقوفی کی۔ میں نے کہا کیا ہوا۔ کہنے لگے ہم آپ سے بڑی گستاخی سے باتیں کرتے رہے۔ اگر ہمیں پتہ لگ جاتا کہ آپ بانیٔ سلسلہ احمدیہ کے فرزند ہیں تو ہم اپنے خیالات کے اظہار میں یہ ناشائستہ طریق کبھی اختیار نہ کرتے۔ میں نے کہا آپ جسمانی تعلق کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں اور میرے نزدیک روحانی تعلق زیادہ اہم ہوتا ہے۔ بہرحال میں نے اس کا اظہار اس لئے نہیں ہونے دیا کہ میں چاہتا تھا کہ آپ کے دل میں جو اعتراضات ہیں وہ سامنے آجائیں۔ تو جب مذہبی بات چیت کی جائے دوسرا شخص بعض دفعہ غصہ بھی نکال لیتا ہے۔ برا بھلا بھی کہہ لیتا ہے۔ لیکن اگر دل میں خشیت پیدا ہو جائے تو پھر وہ معذرت بھی کرنے لگتا ہے۔ ہم نے کئی ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو سلسلہ کو شدید گالیاں دیا کرتے تھے۔ مگر پھر وہ اخلاص کے ساتھ اس جماعت میں شامل ہوئے اور انہوں نے اپنے تعلقات کو آخر تک بڑی وفاداری سے نبھایا۔ تاریخوں میں آتا ہے حضرت عمرو بن العاصؓ جب وفات پانے لگے تو انتہائی کرب کی حالت میں رونے لگ گئے۔ ان کے لڑکے نے انہیں کہا کہ آپ کیوں گھبراتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اسلام کی خدمت کی بڑی توفیق بخشی ہے اور اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی بہتر جزا دے گا۔ انہوں نے کہا اصل بات یہ ہے کہ مجھ پر دو زمانے گذرے ہیں۔ ایک زمانہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاندان کا اتنا بغض میرے دل میں پایا جاتا تھا کہ میں نے انتہائی نفرت کی وجہ سے کبھی آنکھ اٹھا کر آپؐ کی شکل نہیں دیکھی۔ پھر خدا نے مجھے ہدایت دی اور میرے دل میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتنی محبت پیدا ہوگئی کہ فرطِ محبت اور عشق کی وجہ سے مجھے کبھی جرأت نہیں ہوئی کہ میں آنکھ اٹھا کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھ سکوں۔ چنانچہ اب اگر مجھ سے کوئی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ پوچھے تو میں بتا نہیں سکتا۔ لیکن آپؐ کی وفات کے بعد ہم سے کئی غلطیاں ہوئیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ ان غلطیوں کا خدا تعالیٰ کو کیا جواب دوں گا؟ (مسلم کتاب الایمان باب کون الاسلام یھدم ما قبلہ) تو دیکھو ایک ایسا شخص جس کے دل میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اتنا بغض تھا کہ وہ آنکھ اٹھا کر بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھتا تھا ایک دن اس کے دل میں اتنا عشق پیدا ہو گیا کہ پھر اس عشق کی وجہ سے وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھ سکا۔ سرسری طور پر تو انہوں نے آپؐ کو دیکھا ہوگا۔ لیکن پوری شکل دیکھنے کی انہیں ہمت نہیں پڑی۔ پس لوگوں کی ہدایت سے مایوس مت ہو۔ اور اس غرض کے لئے سب سے پہلے اپنے رشتہ داروں کے پاس جاؤ۔ تمہارے اپنے بھائی بہنیں سالے خسر

اور دوسرے رشتہ دار موجود ہیں ۔تم ان کے پاس جاؤ اور ان سے اپنے تعلقات کو وسیع کرو۔ پھر تم دیکھو گے کہ کس طرح خدا تعالیٰ تمہاری تبلیغ میں برکت پیدا کر دیتا ہے۔

مجھے یاد ہے میں چھوٹا تھا اور اپنے ایک رشتہ کی نانی کے ہاں دِلّی میں ٹھہرا ہوا تھا کہ ان کے ایک بھائی حیدر آباد دکن سے ان کے ملنے کے لئے آئے ۔انہوں نے ایک دن مجھے بلایا اور کہا۔میاں تمہارا اور دوسرے مسلمانوں کا آپس میں کس بات پر اختلاف ہے۔میں اس وقت زیادہ علمی باتیں تو جانتا نہیں تھا۔میں نے کہا۔ہم کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو چکے ہیں اور دوسرے مسلمان کہتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں۔کہنے لگے ۔تم کس طرح کہتے ہو کہ عیسیٰ علیہ السلام وفات پا چکے ہیں۔میں نے اس پر قرآن کریم کی یہ آیت پڑھی یٰعِیۡسٰۤی اِنِّیۡ مُتَوَفِّیۡکَ وَ رَافِعُکَ اِلَیَّ وَ مُطَہِّرُکَ مِنَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ جَاعِلُ الَّذِیۡنَ اتَّبَعُوۡکَ فَوۡقَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ (آل عمران:۵۶)۔میں نے کہا دیکھئے اس میں صاف لکھا ہے کہ اے عیسیٰ ؑ میں تجھے وفات دوں گا اور پھر تجھے اپنی طرف اٹھاؤں گا۔پس وفات پہلے ہے اور رفع بعد میں ۔اس پر باوجود اس کے کہ وہ ستر سال کے بڈھے تھے ۔کہنے لگے تمہاری باتیں تو سب معقول ہیں۔پھر مولوی کیوں مخالفت کرتے ہیں۔ہماری نانی بڑی متعصّب تھیں وہ غصہ سے کہنے لگیں کہ آگے ہی لڑکے کا دماغ خراب ہے اور اب تم اس کو اَور خراب کر رہے ہو۔اب دیکھو وہ حیدر آباد دکن سے اپنی بہن کو ملنے آئے تھے اور میں ایک چھوٹا بچہ تھا۔مگر محض اس وجہ سے کہ میں ان کی بہن کا نواسہ بلکہ پڑنواسہ تھا انہوں نے مجھ سے بات پوچھ لی۔اگر ایک چھوٹے بچے سے بات پوچھی جاسکتی ہے تو اپنے جوان اور بالغ داماد سے اپنے خسر سے، اپنی ساس سے، اپنے چچا اور ماموں سے کیوں دریافت نہیں کیا جاسکتا۔اور جب وہ تم سے کوئی بات دریافت کریں گے تو ان کی مثال اس شخص کی سی ہو جائے گی جو کمبل کو تو چھوڑنا چاہتا تھا مگر کمبل اسے نہیں چھوڑتا تھا۔

کہتے ہیں کسی نہر کے کنارے دو شخص جا رہے تھے سردی کا موسم تھا کہ ایک شخص نے نہر میں کمبل تیرتے دیکھا۔ وہ دراصل ریچھ تھا مگر اس نے غلطی سے اسے کمبل سمجھ لیا اس نے اپنے ساتھی سے کہا کہ میں نہر سے کمبل نکال لوں تم ذرا ٹھہرو۔جب وہ نہر میں کودا اور اس نے کمبل پکڑنا چاہا۔تو آپس کی رسہ کشی سے ریچھ کے ہاتھ پاؤں جو سردی کی وجہ سے سکڑے ہوئے تھے کھل گئے اور اس نے آدمی کو پکڑ لیا۔اب باہر والے نے آوازیں دینی شروع کیں کہ جلدی باہر نکلو سفر خراب ہو رہا ہے۔اگر کمبل ہاتھ نہیں آتا تو اسے چھوڑو۔اور باہر آجاؤ۔وہ کہنے لگا کہ میں تو کمبل کو چھوڑنے کے لئے تیار ہوں مگر کمبل مجھے نہیں چھوڑتا۔اسی طرح پہلے وہ تم سے پوچھیں گے کہ بتائیے ۔آپ کے کیا اعتقادات ہیں مگر اس کے بعد تمہارے لئے تبلیغ کا ایسا رستہ کھل جائے گا کہ جس پر نہ شرعی طور پر کوئی اعتراض ہوگا اور نہ قانونی

طور پر کوئی اعتراض ہوسکتا ہے جب وہ آپ سوال کریں گے تو کون سا مولوی انہیں کہہ سکتا ہے کہ ان کی بات نہ سنو۔ اگر کوئی کہے بھی تو ماں کہے گی یہ میرا بچہ ہے میں اس سے ایک بات پوچھ رہی ہوں تم بیچ میں دخل دینے والے کون ہوتے ہو۔خسر کہے گا یہ میرا داماد ہے میں نے اس سے ایک بات پوچھی ہے تم مجھے روکنے والے کون ہو۔اور چونکہ حق تمہارے ساتھ ہے اس لئے آخری نتیجہ یہی ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ایک دن اس کا دل بھی کھول دے گا۔اور اسے کھینچ کر صداقت کی طرف لے آئے گا۔

یہ امر یاد رکھو کہ تبلیغ کوئی وقتی چیز نہیں بلکہ ہمیشہ کے لئے ہے۔خدا تعالیٰ قرآن کریم میں حضرت مسیح علیہ السلام کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ تمہارے ماننے والے نہ ماننے والوں پر قیامت تک غالب رہیں گے اب اس کے صاف یہ معنے ہیں کہ ہمیشہ ایسے آدمی موجود رہیں گے جو حضرت مسیح علیہ السلام پر ایمان نہیں لائیں گے اور جب حضرت مسیح علیہ السلام پر ایمان لانا قرآن کریم نے بھی ضروری قرار دیا ہے تو جو لوگ مسیحؑ کو نہیں مانیں گے وہ قرآن کریم کو بھی نہیں مانیں گے۔پس لازماً قیامت تک کچھ ایسے لوگ موجود رہیں گے جو اسلام میں داخل نہیں ہوں گے اور اگر قیامت تک ایسے لوگ موجود رہیں گے جو اسلام میں داخل نہیں ہوں گے تو ان کو منوانے کے لئے تبلیغ کی بھی ضرورت رہے گی۔ہمارے ملک میں لڑکیاں ایک کھیل کھیلتی ہیں۔اب تو وہ کھیل کھیلتے میں نے لڑکیوں کو نہیں دیکھا لیکن پہلے اس کھیل کا رواج زیادہ تھا۔وہ کھیل اس طرح ہوتی ہے کہ پانچ چھ لڑکیاں ایک طرف کھڑی ہوجاتی ہیں اور پانچ چھ لڑکیاں دوسری طرف کھڑی ہوجاتی ہیں۔ایک طرف کی لڑکیاں دوسری طرف کی لڑکیوں کے پاس آتی ہیں تو وہ غالباً ان سے رشتہ مانگتی ہیں یا کوئی اور چیز مانگتی ہیں۔بہرحال وہ سائل بن کر آتی ہیں اور اپنا سوال پیش کرتی ہیں تو دوسری طرف کی لڑکیاں کہتی ہیں ہم نے نہیں دینا۔اور جب وہ کہتی ہیں نہیں دینا تو کھیل شروع ہوجاتا ہے۔ایک طرف کی لڑکیاں کہتی ہیں ''نہیّوں دینا'' اور دوسری طرف کی لڑکیاں کہتی ہیں۔''لَے کے رہنا'' اور دیر تک یہ مشغلہ جاری رہتا ہے دونوں فریق اپنی ضد پر مُصر رہتے ہیں۔اسی طرح قرآن کریم کہتا ہے کہ قیامت تک کچھ ایسے لوگ موجود رہیں گے جو کہیں گے ہم نے نہیں ماننا۔پس تمہارا بھی یہی کام ہے کہ تم کہو ہم نے منوا کر چھوڑنا ہے۔تمہارا ایمان اور جذبہ بہرحال چھوٹی بچیوں سے زیادہ ہونا چاہیے۔تمہاری غیرت ان سے زیادہ ہونی چاہیے۔اگر ان میں سے ایک فریق کہتا ہے کہ ہم نے نہیں دینا تو دوسری لڑکیاں کہتی ہیں کہ ہم نے لے کر جانا ہے۔اسی طرح تمہارا بھی یہ کام ہے کہ اگر کچھ ایسے لوگ ہوں جو کہیں ہم نے نہیں ماننا تو تم کہو ہم نے منوا کر چھوڑنا ہے اور اپنے اس عزم کو کبھی ترک نہیں کرنا۔

میں نے دیکھا ہے لوگ عام طور پر یہ عذر کیا کرتے ہیں کہ ہمارے بھائی یا بھتیجے یا دوسرے رشتہ دار ہماری بات نہیں سنتے یا ہماری تبلیغ کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ مگر وہ یہ نہیں سوچتے کہ آخر وہ بھی تو کسی کے بھائی تھے۔ وہ بھی تو کسی کے بھتیجے تھے۔ وہ بھی تو کسی کے بھانجے تھے۔ وہ بھی تو کسی کے داماد یا خاوند تھے۔ پھر اگر انہیں خدا تعالیٰ نے ہدایت دے دی تو ان کے رشتہ داروں کو کیوں ہدایت نہیں مل سکتی۔ اصل بات یہ ہے کہ جماعت کے دوست اپنے رشتہ داروں اور قریبی دوستوں کو صحیح طور پر تبلیغ ہی نہیں کرتے۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ ان پر اثر نہ ہو۔ آخر ہر رشتہ دار کا اپنے رشتہ دار پر اور ہر دوست کا اپنے دوست پر اور ہر بھائی کا اپنے بھائی پر حق ہوتا ہے۔ دنیا میں کوئی بیوی ایسی نہیں ہوسکتی جو یہ کہے کہ میرا خاوند خواہ جہنم میں چلا جائے مجھے اس کی پرواہ نہیں اور نہ کوئی خاوند ایسا ہوسکتا ہے جو کہے کہ خواہ میری بیوی جہنم میں چلی جائے مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ پس خاوند کا اپنی بیوی کو یا بیوی کا اپنے خاوند کو حق بات پہنچانا دراصل تبلیغ کرنا نہیں بلکہ اپنے فرض کو ادا کرنا ہے۔ اسی طرح بھائی کا اپنے بھائی کو حق پہنچانا تبلیغ کرنا نہیں کہلا سکتا بلکہ بھائی کا اپنے بھائی کو حق پہنچانا فرض ہے۔ اسی طرح دوست کا اپنے دوست کو حق پہنچانا تبلیغ نہیں بلکہ اس کا فرض ہے اور اگر وہ اپنے اس فرض کو ادا نہیں کرتا تو وہ دوست نہیں بلکہ دشمن سمجھا جائے گا۔ اور اس کا دوست بھی اسے اپنا خیر خواہ نہیں بلکہ بدخواہ قرار دے گا کہ اس نے اسے سچائی سے محروم رکھا۔ اگر اس رنگ میں ہر رشتہ دار اپنے رشتہ دار کو اور ہر دوست اپنے دوست کو اپنا فرض سمجھتے ہوئے حق پہنچائے تو تھوڑے عرصہ میں ہی لاکھوں افراد تک صداقت پہنچ سکتی ہے۔

پھر فرماتا ہے وَ اخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو لوگ تیری بات مان لیا کریں ان کے ساتھ ہمیشہ نیک برتاؤ کرتا کہ تیرے حسن سلوک کی وجہ سے وہ اور بھی زیادہ اسلام کے گرویدہ ہو جائیں اور ان کی تربیت کا ہمیشہ خیال رکھ تا کہ ان کی طاقت سے صحیح رنگ میں فائدہ اٹھایا جا سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح دریا نکلتے اور بہتے چلے جاتے ہیں لیکن نا اہل قومیں ان سے فائدہ اٹھانے کی بجائے صرف اتنا نقصان اٹھاتی ہیں کہ دریا کی طغیانیوں سے ان کے دیہات غرق ہو جاتے یا ان کی زمینیں بیکار اور بنجر ہو جاتی ہیں یا زیادہ سے زیادہ وہ لوگ اتنا فائدہ اٹھا لیتے ہیں کہ دریاؤں سے مچھلیاں پکڑ لیتے ہیں۔ لیکن جو عقلمند اور ذہین قومیں ہوتی ہیں وہ ان سے نہریں نکالتی اور بنجر زمینوں کو آباد کرتی ہیں اور اس طرح اربوں ارب روپیہ کماتی ہیں۔ اسی طرح اگر افراد کی صحیح تربیت کی جائے اور ان کے اندر جذبۂ قربانی پیدا کیا جائے تو ان کی طاقت سے اتنا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے کہ قوم ترقی کے میدان میں کہیں کی کہیں نکل جاتی ہے۔ درحقیقت پرانی نسل کی مثال

ایسی ہی ہوتی ہے جیسے کسی چشمہ یا دریا کا منبع۔ لیکن نئی نسل کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے ایک نالہ اور اس سے اگلی نسل کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے ایک چھوٹا دریا اور پھر اس سے اگلی نسل کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے ایک بڑا دریا۔ اور پھر اس سے اگلی نسل کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے ایک بڑا سمندر۔ چشمہ سے پانی پینے کے لئے ہمیں خود چشمہ پر جانا پڑتا ہے۔ لیکن نالہ جوش وخروش سے گھروں کے پاس سے گذرتا ہے۔ اس کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پھر جب وہ ایک چھوٹا دریا بن جاتا ہے تو صرف یہی نہیں کہ وہ گھروں کے پاس بہتا ہے بلکہ اور زیادہ پھیل کر وہ گھروں کے قریب آجاتا ہے۔ پھر جب وہ چھوٹا دریا وسیع ہوتا ہے تو اور بھی زیادہ گھروں کے پاس سے گذرتا ہے اور اس کے زمین میں جذب ہونے یا ریت میں غائب ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں رہتا۔ وہ پہاڑیوں اور ٹیلوں پر سے کودتے اور ریتوں پر سے بہتے ہوئے سمندر کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے اور جب وہ دریا سمندر بن جاتا ہے۔ تو ساری زمینوں کے کنارے اس سے ملنے لگ جاتے ہیں اور کوئی حصہء زمین بھی ایسا نہیں رہتا جو اس سے متصل نہ ہو۔ اسی طرح جب جماعت کے افراد کی صحیح تربیت کی جائے اور اگلی نسلوں میں قربانی اور ایثار اور فدائیت کا زیادہ سے زیادہ جذبہ پیدا کیا جائے تو وہ دنیا میں امن کے قیام کا ایک بہت بڑا ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔ دنیا کا ایٹم بم جو یورینیم دھات سے بننے والی ایک چیز ہے دنیا کی تباہی اور بربادی کا ایک مہلک ہتھیار ہے لیکن افراد جماعت کی طاقت کو صحیح استعمال کرنا اور آئندہ نسل کے اندر جذبہء قربانی پیدا کرنا اور اس کی صحیح تربیت کرنا قوموں کو زندہ رکھنے کا ایک حتمی اور یقینی ذریعہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اس طرح ہر فرد کے دل میں یہ احساس قائم رہتا ہے کہ دنیا کو فتح کرنے اور اسلام کو دوسرے ادیان پر غالب کرنے کے لئے میری ذاتی جدوجہد کی بھی ضرورت ہے۔ یہی نکتہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے۔ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا ہے کہ تیرے دو طریق ہونے چاہئیں۔ ایک مخالفین کے ساتھ اور ایک موافقین کے ساتھ۔ مخالفین کے ساتھ تو تیرا یہ طریق ہونا چاہیے کہ تُو ان کو ڈرا جن میں تیرے رشتہ دار بھی شامل ہیں اور جو ایسے راستہ پر چل رہے ہیں۔ جو ان کے لئے نقصان دہ ہے۔ لیکن اس کے علاوہ تیرا دوسرا کام یہ بھی ہے کہ تُو مومنوں کی تربیت کرے کیونکہ اب دنیا کی نجات انہی لوگوں کی صحیح تربیت پر منحصر ہے۔ ان میں سے کئی ایسے ہیں جو تیرے رشتہ دار نہیں مگر وہ تیرا حکم مانتے اور تیری اطاعت کرتے ہیں۔ پس تُو لوگوں کو بتادے کہ تیرے رشتہ داروں میں سے جو کوئی تیرے خلاف چلے گا اور تیری باتیں نہیں مانے گا وہ سزا پائے گا اور جو تیرا رشتہ دار تو نہ ہوگا مگر تیری باتوں پر ایمان لے آئے گا وہ انعام پائے گا۔ یعنی تیرا منکر اگر قریبی بھی ہوگا تو سزا پائے گا اور تیرا متبع اگر بعیدی بھی ہوگا تو انعام پائے گا۔ ایسے ایمان لانے والوں کے لئے خواہ وہ قریبی ہوں یا بعیدی تُو اپنا

بازو جھکا دے۔ گویا ایک طرف تو تُو قریبی کو ڈراتا رہ کہ اگر وہ ایمان نہ لائے تو سزا ملے گی اور دوسری طرف وہ بعیدی جو تیرے رشتہ دار تو نہیں مگر تجھ پر ایمان لے آئے ہیں جن میں سے بعض روم کے ہیں۔ بعض ایران کے ہیں۔ بعض حبشہ کے ہیں۔ بعض شام کے ہیں اور بعض قبائلِ عرب میں سے ہیں ان کی طرف تیری بہتر سے بہتر توجہ ہونی چاہیے۔ کیونکہ تیرے اصل رشتہ دار اب وہی ہیں۔ جو لوگ تیرے قریبی رشتہ دار تو ہیں مگر تجھ پر ایمان نہیں لائے وہ ایمان نہ لانے کی وجہ سے تیرے رشتہ داروں میں سے نکل گئے ہیں اور اب تیرے اصل رشتہ دار وہی ہیں جو تجھ پر ایمان لائے ہیں اور تیری ہر بات کو مانتے اور تیری پیروی کرتے ہیں۔

آگے فرماتا ہے۔ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ۔ یہاں عَصَوْكَ کے یہ معنے نہیں کہ اِنْ عَصَوْكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ بلکہ یہ عَصَوْكَ مخالفین کے لئے آیا ہے۔ قرآن کریم کا یہ عام قاعدہ ہے کہ جب ایک ہی آیت میں دو باتوں کا ذکر ہو تو ان میں سے ایک فقرہ الگ گروہ کے لئے ہوتا ہے اور دوسرا فقرہ الگ گروہ کے لئے۔ یہاں جو عَصَوْكَ کا لفظ ہے اس کے معنے ہیں اِنْ عَصَوْكَ عَشِيْرَتُكَ یعنی تیرے رشتہ دار اگر باوجود ڈرانے کے بھی نہ مانیں اور اپنے پہلے راستہ پر ہی گامزن رہیں تو تُو ان کو کہہ دے اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے میں بری الذمہ ہوں۔ یعنی پھر تُو ان سے قطع تعلق کر لے اور کہہ دے کہ میں تمہارے اعمال سے بیزار ہوں۔ تم اس گھمنڈ میں نہ رہنا کہ ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار اور قریبی ہیں۔ اس لئے اگر ہم نے اس کی بات نہ مانی تب بھی ہم نجات پا جائیں گے۔ بے شک تم میرے رشتہ دار ہو۔ مگر نجات رشتہ داری اور قرابت پر موقوف نہیں ہے۔ نجات کا راستہ صرف یہی ہے کہ تم میری پیروی کرو۔ ورنہ تم باوجود میرے ساتھ رشتہ داری اور قرابت رکھنے کے سزا پاؤ گے۔ یہ ایک نہایت اعلیٰ درجہ کا طریقۂ تبلیغ ہے۔ جو قرآن کریم نے بتایا ہے۔ اگر مسلمان اس پر عمل کرتے تو بڑی کامیابی کا منہ دیکھتے۔ جہاں جہاں اسلام پھیلے وہاں نئے ماننے والوں کو یہ سمجھانا چاہئے کہ فوراً اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کی طرف جاؤ اور تبلیغ کے علاوہ ان سے نیک سلوک بھی کرو۔ اور اگر وہ تمہاری بات نہ سنیں تو ان سے ایک حد تک الگ ہو جاؤ تاکہ ان کے اندر ندامت پیدا ہو اور تم بھی ان کے بداثر سے بچ جاؤ۔ جیسا کہ حضرت مسیحؑ نے بھی اپنے حواریوں کو نصیحت کی کہ

''اگر کوئی تم کو قبول نہ کرے۔ اور تمہاری باتیں نہ سنے تو اس گھر یا اس شہر سے باہر نکلتے وقت اپنے پاؤں کی گرد جھاڑ دینا۔'' (متی باب ۱۰ آیت ۱۴)

اس کے بعد دوسرے گروہ یعنی مومنین کے متعلق فرمایا وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ یعنی

اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تُو اپنے بازو ان مومنوں پر جھکا دے جو تیری اتباع کرتے ہیں۔ بازو جھکانا عرب میں ایک محاورہ ہے اور یہ محاورہ جانوروں کی مناسبت سے لایا گیا ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ جب تک جانوروں کے بچے کمزور ہوتے ہیں۔ اور اُڑنے کے قابل نہیں ہوتے یا اچھی طرح چل پھر نہیں سکتے جانور ان پر اپنے پر پھیلائے رکھتے ہیں تا کہ بچوں کو چیل وغیرہ نہ لے جائے۔ انسان تو اپنے بچوں کو کپڑے پہنا دیتے ہیں۔ مگر جانوروں کے پاس کپڑا نہیں ہوتا اس لئے وہ بچوں کو اپنے پروں کے نیچے چھپائے رکھتے ہیں۔ مرغیوں کو دیکھو۔ اگر بچوں والی مرغی کسی جگہ بیٹھی ہو اور اسے کوئی اٹھا دے تو اس کے پروں کے نیچے سے آٹھ دس بچے نکل کر دوڑ پڑتے ہیں۔ پس وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ کے یہ معنے ہیں کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تجھے چاہیے کہ تو اپنی تمام تر توجہ مومنوں کی طرف رکھ اور ان کی اعلیٰ سے اعلیٰ تربیت کرنے کی کوشش کر۔ اب ظاہر ہے کہ یہ تربیت کا کام اور مومنین کو اعلیٰ مدارج تک لے جانے کا کام اس قسم کا تھا کہ اس میں تکالیف اور مشکلات پیش آنے کا احتمال ہو سکتا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ۔ الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ۔ وَ تَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ۔ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ انذار کا کام تو صرف منہ سے ہوتا ہے اور زبان سے ڈرا دینا کافی ہوتا ہے لیکن تربیت اور اصلاح کا کام محنت طلب ہے اور یہ کام ایسا ہے جو کسی کے اپنے اختیار میں نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض دفعہ ایک باپ چاہتا ہے کہ میرا بیٹا جج بن جائے مگر وہ چٹھی رسان بھی نہیں بن سکتا۔ یا ایک باپ چاہتا ہے کہ اس کا بیٹا عالم دین بن جائے لیکن جب وہ بڑا ہوتا ہے تو علم دین کی طرف اسے کوئی رغبت ہی نہیں ہوتی۔ حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک عالم دین جو صرف ونحو کے متبحر عالم تھے اور سارے ہندوستان میں ان کی علمیّت کا شہرہ تھا۔ وہ بہت سادہ طبع تھے اور اگر انہیں کوئی ایسا شخص دیکھتا جو ان کو پہلے سے نہ جانتا تو وہ یہی سمجھتا کہ یہ گھاس کاٹ کر آئے ہیں۔ ان کا نام مولوی خان ملک صاحب تھا۔ وہ کہیں سے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دعویٰ کے متعلق خبر سن کر قادیان آئے اور آپ کی باتیں سن کر ایمان لے آئے۔ واپسی پر جب وہ لاہور پہنچے تو انہوں نے ارادہ کیا کہ مولوی غلام احمد صاحب سے ملتے چلیں۔ مولوی غلام احمد صاحب شاہی مسجد میں درس دیتے تھے اور وہ مولوی خان ملک صاحب کے شاگرد رہ چکے تھے۔ مولوی غلام احمد صاحب بھی بہت مشہور عالم تھے اور چونکہ لاہور کے لوگ اچھے متموّل تھے اس لئے مولوی غلام احمد صاحب کی مالی حالت بہت اچھی تھی اور سینکڑوں طالبعلم ان کے پاس پڑھتے تھے۔ جب مولوی خان ملک صاحب شاہی مسجد میں پہنچے تو وہاں کے طلباء کو تو اس بات کا علم نہ تھا کہ یہ کس پایہ کے آدمی ہیں انہوں نے ان کے معمولی لباس اور ظاہری صورت سے یہ اندازہ لگایا کہ یہ کوئی معمولی آدمی ہیں۔ مولوی غلام احمد صاحب نے مولوی

خان ملک صاحب سے پوچھا۔فرمایئے۔کہاں سے تشریف لا رہے ہیں۔انہوں نے کہا۔’’قادیان سے۔‘‘انہوں نے حیران ہوکر پوچھا۔’’قادیان سے‘‘۔انہوں نے کہا۔ہاں قادیان سے۔انہوں نے کہا۔کیوں؟ کہنے لگے۔ مرزا صاحب کا مرید ہونے کے لئے گیا تھا۔انہوں نے کہا۔آپ اتنے بڑے عالم ہیں آپ نے ان میں کیا خوبی دیکھی کہ ان کے مرید ہونے کے لئے چلے گئے۔مولوی خان ملک صاحب نے پنجابی میں انہیں کہا کہ’’ تُوں اپنا کم کر تینوں تے قَالَ یَقُوْلُ وی چنگی طرح نہیں آوندا۔‘‘یعنی تُو اپنا کام کر تجھے تو ابھی قَالَ یَقُوْلُ بھی اچھی طرح نہیں آتا۔چونکہ مولوی غلام احمد صاحب بھی بڑے مشہور عالم تھے اس لئے جب مولوی خان ملک صاحب نے یہ الفاظ کہے تو مولوی غلام احمد صاحب کے شاگردوں کو سخت غصہ آیا اور انہوں نے مولوی خان ملک صاحب سے مخاطب ہوکر کہا۔بڈھے تُو نے یہ کیا بات کہی ہے۔مولوی غلام احمد صاحب نے ان کو منع کیا اور کہا خاموش رہو کہ جو کچھ کہہ رہے ہیں بالکل ٹھیک ہے۔غرض مولوی خان ملک صاحب مرحوم کو صرف ونحو پر اتنا عبور تھا اور وہ اپنے فن میں اتنے ماہر تھے کہ تمام ہندوستان میں ان کا شہرہ تھا اور ان کی بعض تصانیف کے متعلق لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ان کتب کا لکھنے والا چار پانچ سو سال پہلے کا کوئی عالم ہے۔حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ ان کا ایک واقعہ سنایا کرتے تھے۔ان کے بڑے لڑکے کا نام عبداللہ تھا۔انہوں نے ایک دفعہ عبداللہ کے متعلق حضرت خلیفہ اولؓ سے شکایت کی کہ میرا یہ لڑکا علم کی طرف بالکل توجہ نہیں کرتا آپ اس کو سمجھائیں کہ اگر آج اس نے تعلیم حاصل نہ کی تو یہ نقصان اٹھائے گا۔حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے عبداللہ کو بلوایا اور کہا۔تمہارے والد صاحب اپنے علمی پایہ کی وجہ سے سارے ہندوستان میں شہرت رکھتے ہیں تم کیوں نہیں پڑھتے۔وہ کہنے لگا۔میں پڑھتا تو ہوں مگر وہ مجھے پڑھاتے ہی نہیں۔حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔وہ تو میرے پاس شکایت لے کر آئے تھے کہ تم پڑھتے نہیں اور تم کہتے ہو کہ میں پڑھتا ہوں اور وہ مجھے پڑھاتے نہیں۔وہ کہنے لگا۔بات دراصل یہ ہے کہ وہ مجھے عربی پڑھنے کے لئے کہتے ہیں اور میں عربی پڑھنا نہیں چاہتا بلکہ میں انگریزی پڑھنا چاہتا ہوں۔حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔تم عربی کیوں پڑھنا نہیں چاہتے اور انگریزی کیوں پڑھنا چاہتے ہو۔وہ کہنے لگا۔بات یہ ہے کہ جب نئی نئی ریل آئی تو میں اور والد صاحب ایک سفر پر گئے۔اور آپ تو کہتے ہیں وہ بڑے عالم ہیں مگر ان کو اتنا بھی پتہ نہ تھا کہ گاڑی میں فرسٹ اور سیکنڈ کلاس بھی ہوتی ہے۔چنانچہ یہ اپنی گٹھڑی اٹھائے ہوئے فسٹ کلاس کے ڈبہ میں گھس گئے۔ وہاں کوئی اینگلو انڈین ٹکٹ کلکٹر کھڑا تھا اس نے انہیں کہا۔ہٹ بابا تیرا یہاں کیا کام ہے۔جب اینگلو انڈین نے ان کو جھڑکا تو یہ پلیٹ فارم پر ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔میں ان کے پیچھے دوڑا۔مگر یہ اسٹیشن سے دور نکل گئے اور کوئی میل

بھر تک بھاگتے چلے گئے۔آخر میں نے انہیں جا کر پکڑا اور پوچھا۔آپ بھاگتے کیوں ہیں۔کہنے لگے۔مجھ سے غلطی ہوگئی تھی اس لئے خطرہ تھا کہ مجھے سرکاری آدمی پکڑ کر نہ لے جائیں۔اس دن سے میں نے اپنے دل میں یہ تہیہ کرلیا کہ چاہے کچھ ہو جائے میں نے عربی نہیں پڑھنی اور اگر پڑھنی ہے تو انگریزی پڑھنی ہے۔کیونکہ عربی کے اتنے بڑے عالم ہونے کے باوجود جب اس قدر جہالت رہتی ہے کہ گاڑی کے فرسٹ اور تھرڈ کلاس کے ڈبوں کی شناخت بھی نہیں ہوسکتی تو اس علم کا فائدہ ہی کیا ہے اس لئے اگر یہ مجھے پڑھانا چاہتے ہیں تو انگریزی پڑھائیں عربی تو میں کبھی بھی نہیں پڑھوں گا۔اب دیکھو اتنا اعلیٰ پایہ کے عالم و فاضل کا بیٹا باوجود باپ کی خواہش کے کہ وہ علم حاصل کرے دینی علم سے محروم رہ گیا۔پس وَ اخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ تربیت اور اصلاح کا کام اتنا عظیم الشان ہے کہ یہ بہت زیادہ محنت چاہتا ہے اور یہ کام ایسا ہے کہ جب تک تربیت اور اصلاح پانے والوں کے اندر جوش اور اخلاص اور فرمانبرداری کا مادہ موجود نہ ہو۔اس کو سرانجام نہیں دیا جاسکتا۔اس لئے اللہ تعالیٰ نے جہاں مخالفین منکرین اور غیر متبعین کے متعلق فرمایا کہ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ۔یعنی ان کو تو ڈرا لیکن اگر وہ تیری بات نہ مانیں تو تُو ان سے کہہ دے کہ میں تمہارے اعمال کا ذمہ وار نہیں ہوں وہاں مومنوں کے متعلق فرمایا وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ۔ الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ۔ وَ تَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ۔ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔درحقیقت اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو مومنوں کی خبر گیری اور تربیت کا حکم دیا تھا وہ پورا نہیں ہوسکتا تھا جب تک تین باتیں نہ ہوں۔ایک تو یہ کہ خدا تعالیٰ کی تائید ہو دوسرے یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر ان کی تربیت کا کامل جذبہ موجود ہو اور تیسرے یہ کہ جن کی آپؐ تربیت اور خبر گیری کرنا چاہتے تھے ان کے اندر ماننے کا جذبہ موجود ہو۔ان تینوں چیزوں کے متعلق فرماتا ہے (۱) وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ تو اللہ پر توکل کر کے اس کام کو شروع کردے وہ تیری ضرور مدد کرے گا۔یعنی میں تیری مدد کروں گا۔(۲) الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ تیرے اندر کیا روح کام کر رہی ہے۔یعنی تُو اپنے اندر یہ جذبہ رکھتا ہے کہ ان کی تربیت کرے۔آگے فرماتا ہے (۳) وَ تَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ۔ پھر تیسری بات بھی تجھے حاصل ہے یعنی تُو ان لوگوں میں پھرتا ہے جو ہر رنگ میں تیری اطاعت اور فرمانبرداری کا جذبہ اپنے اندر رکھتے ہیں۔یہ تین مشکلات تھیں جن کا اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں ذکر کیا ہے۔فرماتا ہے یہ کام اللہ تعالیٰ کی تائید چاہتا ہے۔سو میں تیری مدد کرنے کے لئے تیار ہوں۔یہ کام تیرے اندر دوسروں کی تربیت اور اصلاح کرنے کا جذبہ چاہتا ہے۔سو وہ تیرے اندر موجود ہے۔یہ کام ان لوگوں کے اندر جن کی تو تربیت اور خبر گیری کرنا چاہتا ہے کامل اطاعت اور فرمانبرداری کی

روح چاہتا ہے سو وہ ان کے اندر موجود ہے۔ اس لئے تجھے اس کام میں کسی قسم کی تکلیف کا سامنا نہیں ہوسکتا۔

بعض مفسرین نے غلطی سے وَ تَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ۔ کے یہ معنے کئے ہیں کہ اس جگہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بتایا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام آباء مومن یعنی ساجد تھے۔ حالانکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق احادیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا۔ کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی تھی کہ وہ مجھے اپنی والدہ کے لئے استغفار کی اجازت دے دے مگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کی اجازت نہیں دی (مسند احمد بن حنبل: مسند ابی ھریرہؓ) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مفسرین کا یہ نظریہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام آباء مومن تھے درست نہیں۔ حضرت عبدالمطلب کے متعلق بھی جہاں توحید کی باتوں کا ذکر آتا ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک دُبدبہ کی حالت میں تھے۔ کبھی توحید کی طرف مائل ہوجاتے تھے اور کبھی شرک کی طرف۔ ان کا چاہِ زمزم کی تلاش کے وقت یہ نذر ماننا کہ اگر خدا انہیں دس بچے دے گا اور وہ ان کی آنکھوں کے سامنے جوان ہوں گے تو وہ ان میں سے ایک کو قربان کردیں گے۔ اور پھر ہبل کے سامنے ان کا قرعہ اندازی کرنا بتا رہا ہے کہ توحید کا صحیح مقام انہوں نے نہیں سمجھا تھا۔ پس یہ کہنا کہ تَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ کے معنے یقینی اور حتمی طور پر یہی ہیں درست نہیں۔ اصل معنے یہ ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کی تعریف کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ تمہارا رات دن ایسے لوگوں میں گذر رہا ہے جو اللہ تعالیٰ کے پرستار اور اس کی عبادت کرنے والے ہیں۔ تقلّب کا لفظ ایسا ہی ہے جیسے دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ یعنی ہم دیکھتے ہیں کہ تیری نظر بار بار اس معاملہ میں آسمان کی طرف اُٹھتی ہے۔ پس تَقَلُّبٌ کے معنے کسی چیز کی طرف بار بار جانے کے ہوتے ہیں۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تقلّب صحابہؓ میں ہی تھا۔ کبھی جنگی مشاورت ہو رہی ہوتی تھی اور جرنیل آپؐ کے گرد جمع ہوتے تھے۔ کبھی قضاء کے معاملات کا فیصلہ ہو رہا ہوتا تھا اور قاضی اور تفقہ رکھنے والے صحابہؓ آپؐ کے گرد جمع ہوتے تھے کبھی تصوّف کے دریا بہائے جاتے تھے اور صوفیاء کا گروہ آپؐ کے اردگرد جمع ہوتا تھا۔ کبھی صدقہ وخیرات کا ذکر ہو رہا ہوتا تھا اور صدقہ وخیرات دینے والے آپ کے اردگرد جمع ہوتے تھے۔ غرض اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور اس کی اطاعت کا نمونہ دکھانے والے ہر قسم کے لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھے۔ جس قسم کے کام کی آپؐ کو ضرورت ہوتی تھی نہ صرف اس کام کے ماہر آپ کے پاس موجود تھے بلکہ اس کے ساتھ ہی وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والے اور دن رات اس کی پرستش کرنے والے بھی تھے۔ اور رات دن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسے ہی لوگوں میں چکر لگا رہتا تھا۔ تَقَلُّبٌ بھی یہی ہوتا ہے کہ اِدھر اُدھر چکر کاٹنا۔

اور آپؐ کا ادھر ادھر چکر کاٹنا صحابہ کی ذات کے لحاظ سے ہی تھا۔ پس تَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ کے معنے یہ ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے اعلیٰ درجہ کے ساتھی ملے ہوئے تھے کہ آپ جس طرف بھی منہ کرتے ادھر ساجد ہی ساجد نظر آتے تھے۔ جرنیلوں کی طرف منہ کرتے تو آپؐ کے پاس ساجد جرنیل تھے۔ قاضیوں کی طرف منہ کرتے تو آپؐ کے پاس ساجد قاضی تھے۔ مدرسوں کی طرف منہ کرتے تو آپؐ کے پاس ساجد مدرس تھے۔ صوفیاء کی طرف منہ کرتے تو آپؐ کے پاس ساجد صوفیاء تھے۔ اقتصاد اور تمدن کے ماہرین کی طرف منہ کرتے تو آپ کے پاس ساجد ماہرین اقتصاد اور ساجد ماہرین تمدن تھے۔ غرض جس طبقہ کی طرف بھی آپ منہ کرتے آپ کو ایسے لوگ مل جاتے جو اس فن کے بھی ماہر ہوتے اور اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار اور عبادت گذار بھی ہوتے۔ اسی احسان کا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تیرے گردوپیش سب موحد ہی موحد ہیں اور تُو رات دن ان موحدین میں پھرتا ہے۔ یہ ہمارا کتنا بڑا احسان ہے کہ مکہ جیسی شرک کی سرزمین میں ہم نے موحد ہی موحد پیدا کر دیئے ہیں اور ان لوگوں کو توحید پر عامل کر دیا ہے۔ جو ایک نہیں دو نہیں سینکڑوں بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ تُو دائیں جاتا ہے تو تجھے موحد نظر آتے ہیں۔ تو بائیں جاتا ہے تو تجھے موحد نظر آتے ہیں۔ تو ادھر جاتا ہے تو تجھے موحد ملتے ہیں اور تو اُدھر جاتا ہے تو تجھے موحد ملتے ہیں۔ غرض تو جہاں بھی جاتا ہے تجھے موحد نظر آتے ہیں۔ اور مکہ جیسی بستی میں جہاں رات دن بتوں کی پرستش ہوتی تھی ہم نے تیرے ساتھ موحدین پیدا کر دیئے ہیں۔ پس تَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ کا وہ مفہوم نہیں جو مفسرین نے سمجھا ہے بلکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے اس احسان کا ذکر کیا گیا ہے جو اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا کہ اس نے آپؐ کے گرد ساجد ہی ساجد جمع کر دیئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض انبیاء کی بیویاں ان پر ایمان نہیں لائی تھیں۔ بعض کی اولاد نے ان کی نبوت کا انکار کر دیا تھا۔ اور گو بیویوں یا اولاد کے انکار سے نبی کی شان میں کوئی فرق نہیں آتا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں تھیں تو خدا تعالیٰ کے دین پر فدا۔ آپؐ کی اولاد تھی تو وہ بھی دین پر قربان۔ آپؐ کے ساتھی تھے تو وہ اسلام کے سچے عاشق۔ یہاں تک کہ سب تعلق رکھنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے ساجد بنا دیا۔ اور یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو اور کسی نبی کو نصیب نہیں ہوئی۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو جہاں کہیں جاتا ہے موحدین اور ساجدین میں پھرتا ہے تیرے گھر میں توحید۔ تیرے دوستوں میں توحید۔ پھر تُو جدھر جاتا ہے توحید کا بیج بوتا جاتا ہے اور تو نے ہزاروں مشرکین کو ساجد بنا دیا ہے۔

اس جگہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ایک حوالہ پر بھی کچھ روشنی ڈالی

جائے۔جس کا اسی آیت کے ساتھ تعلق ہے۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی کتاب ’’تریاق القلوب‘‘ میں فرماتے ہیں:

’’ایک اور جگہ قرآن شریف میں فرماتا ہے وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ۔ الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ۔ وَ تَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ یعنی خدا پر توکل کر جو غالب اور رحم کرنے والا ہے۔وہی خدا جو تجھے دیکھتا ہے۔جب تو دعا اور دعوت کے لئے کھڑا ہوتا ہے۔وہی خدا جو تجھے اس وقت دیکھتا تھا کہ جب تو تخم کے طور پر راستبازوں کی پشتوں میں چلا آتا تھا۔یہاں تک کہ اپنی بزرگ والدہ آمنہ کے پیٹ میں پڑا۔‘‘ (تریاق القلوب، روحانی خزائن جلد ۱۵ صفحہ ۲۸۱)

یہ حوالہ چونکہ بظاہر اوپر کی تشریح کے خلاف نظر آتا ہے اس لئے یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ ساجد کے لفظی معنے ایسے فرمانبردار کے ہوتے ہیں جو ہر بات کو تسلیم کرتا ہو اور بغاوت اور نشوز کے آثار اس میں نہ پائے جاتے ہوں۔لیکن اگر ہم گہرا غور کریں تو ساجد کا لفظ دو جگہ استعمال ہوسکتا ہے ایک مومن ساجد کے لئے اور ایک سوسائٹی کے ساجد کے لئے۔مومن ساجد وہ ہوگا جو خدا تعالیٰ کی باتیں ماننے والا ہو اور خدا تعالیٰ کے قوانین سے بغاوت کرنے والا نہ ہو۔اور سوسائٹی کا ساجد وہ ہوگا جو سوسائٹی کی باتیں ماننے والا ہو اور سوسائٹی کے قوانین سے بغاوت کرنے والا نہ ہو۔اب ہم اس آیت کے معنوں کی طرف آتے ہیں۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کے کئی بطن ہیں۔ایک بطن تو قرآن کریم کا یہ ہے کہ کسی آیت کے معنے کرتے وقت اس کے سیاق وسباق کی تمام آیات کو دیکھا جاتا ہے اور اس کے معنے سیاق وسباق کی آیات کو مدنظر رکھ کر کئے جاتے ہیں۔کیونکہ اگر سیاق وسباق کو مدنظر نہ رکھا جائے تو معنوں میں غلطی کا امکان ہوتا ہے۔پھر ایک بطن یہ ہے کہ معنے کرتے وقت اس کے کچھ آگے آنے والی آیتوں اور کچھ پیچھے آنے والی آیتوں کو دیکھا جاتا ہے اور ان کے معنوں میں تطابق کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔پھر ایک بطن یہ ہے کہ جس آیت کے معنے مطلوب ہوں اس ساری سورۃ کو دیکھا جاتا ہے۔پھر ایک بطن یہ ہے کہ کئی سورتوں کو ملا کر اس کے معنے اخذ کئے جاتے ہیں۔پھر ایک بطن یہ ہے کہ سارے قرآن مجید کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے۔اسی طرح اور بھی بعض بطن ہیں۔یہ علم اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے مجھے عطا فرمایا ہے۔بعض دفعہ ایک مضمون کا تعلق ابتدائی سورتوں کے ساتھ ہوتا ہے اور بعض دفعہ بعد والی سورتوں کے ساتھ۔پھر ایک معنے کسی آیت کے منفرداً ہوتے ہیں اور ایک معنے دوسری آیتوں کے ساتھ ملا کر کئے جاتے ہیں۔اب ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بیان فرمودہ معنوں کی اس جگہ کیا صورت ہے۔اس نقطۂ نگاہ سے اگر ہم غور

کریں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ نے اس آیت کے معنے منفرداً لئے ہیں۔ سیاق وسباق کو نہیں لیا۔ آپ نے جس مضمون میں اس آیت کو بیان فرمایا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مرسل اچھے اور شریف خاندانوں میں سے آتے ہیں اور ان کی قوم ایسی اعلیٰ ہوتی ہے کہ کوئی شخص اس سے کراہت نہیں کرسکتا۔ کیونکہ اگر وہ ایسی قوم سے تعلق رکھتے ہوں جس کو اس شہر یا علاقہ یا ملک کے لوگ ذلیل اور حقیر سمجھتے ہوں تو ان کا ماننا طبائع پر گراں گذرتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی مصلحت اور حکمت کے خلاف ہے کہ وہ حقیر قوموں میں سے نبیوں کو مبعوث کرکے لوگوں کو تکلیف مالا یطاق میں ڈال دے۔ پس چونکہ ایسے خاندان سے کسی نبی یا رسول کا مبعوث ہونا جو رذیل سمجھا جاتا ہو طبائع کے لئے ٹھوکر کا موجب ہوتا ہے اور اس میں مشکلات پیش آتی ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنے نبیوں اور ماموروں کو شریف اور وجیہہ خاندانوں میں سے مبعوث کرتا چلا آیا ہے تا کہ لوگوں کے قلوب میں ان کے خلاف نفرت اور حقارت کے جذبات پیدا نہ ہوں۔ پس آپ نے اس آیت کے جو معنے لئے ہیں وہ منفرداً لئے ہیں سیاق وسباق کے لحاظ سے نہیں لئے۔ آپ نے ان معنوں کو اس رنگ میں لیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے آباو اجداد سوسائٹی کے ساجد تھے سوسائٹی سے بغاوت نہ کرتے تھے بلکہ اچھے شہری تھے اور وہ ان لوگوں میں سے نہ تھے جن کو قوم حقیر، نافرمان یا غدار سمجھتی تھی۔ بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کا ہر نبی ہی ایسا ہوتا ہے۔ اس طرح یہ معنے صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہی چسپاں نہیں ہوں گے بلکہ سب نبیوں پر ہو جائیں گے۔ ان معنوں کے لحاظ سے یہاں ساجد کے معنے خدا تعالیٰ کو سجدہ کرنے والے کے نہیں ہوسکتے۔ کیونکہ یہ تو مسلمہ امر ہے کہ بعض انبیاء کے آباء واجداد ساجداً للہ نہ تھے۔ اس لئے لازماً اس کے یہ معنے کرنے پڑیں گے کہ سوسائٹی کے ساجد اور سوسائٹی کے قوانین سے بغاوت نہ کرنے والے۔ ہر سوسائٹی کے اندر شرافت کا ایک خاص معیار ہوتا ہے۔ مثلاً شراب پینا ایک فعل ہے۔ اب فرض کرو ایک مسلمان بھی شراب پیتا ہے اور ایک انگریز بھی شراب پیتا ہے۔ تو جب مسلمان شراب پئے گا تو اسے اس کی سوسائٹی غیر شریف قرار دے گی اور جب انگریز شراب پئے گا اسے اس کی سوسائٹی شریف کہے گی۔ غرض فعل ایک ہی ہے مگر جب اسے دو الگ الگ سوسائٹیوں کے معیاروں پر رکھا جائے گا تو ایک سوسائٹی کے معیار کے مطابق وہ فعل گناہ بن جائے گا اور اس کا مرتکب سخت گناہگار قرار پائے گا اور دوسری سوسائٹی کے معیار کے مطابق وہ فعل عین شرافت سمجھا جائے گا اور اس کا مرتکب سوسائٹی کا فرمانبردار قرار پائے گا۔ پس شرافت کا معیار ہر سوسائٹی کے اپنے اپنے قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آباء واجداد عرب کی سوسائٹی کے مطابق شریف تھے۔ لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ معیارِ اسلام کے مطابق ان میں نیکیاں نہیں پائی

جاتی تھیں۔ پس حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اس آیت کے جو معنے لئے ہیں منفرداً لئے ہیں۔ سیاق وسباق کے لحاظ سے نہیں لئے۔ اور قرآن کریم کے ایک بطن کے لحاظ سے وہ بھی درست ہیں۔ اور چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قرآن کریم کے سات بطن ہیں۔ اس لئے ایک ایک آیت کے کئی معنے کئے جاسکتے ہیں جو اپنے اپنے رنگ میں سب کے سب درست ہوں گے۔ ایک معنے منفرد آیت کے ہوتے ہیں۔ ایک معنے کئی آیتوں کے تسلسل کے لحاظ سے ہوتے ہیں۔ ایک معنے پوری سورۃ کے تسلسل کے لحاظ سے ہوتے ہیں۔ ایک معنے کئی سورتوں کے تسلسل کے لحاظ سے ہوتے ہیں۔ اور ایک معنے سارے قرآن کریم کے تسلسل کے لحاظ سے ہوتے ہیں اور وہ سارے معنے ہی صحیح ہوتے ہیں۔ پس حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس آیت کے جو معنے کئے ہیں وہ انفرادی لحاظ سے کئے ہیں اور آپ نے یہ ثابت کیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آباء واجداد سوسائٹی میں شریف اور معزز سمجھے جاتے تھے اور سوسائٹی کے قوانین کے پابند تھے۔ گویا عرب کی سوسائٹی کے لحاظ سے جن خاندانوں کو شرفاء کے خاندان قرار دیا جاتا تھا اس کو مدنظر رکھتے ہوئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان نہایت شریف تھا۔ چنانچہ اس فرق کو قرآن کریم نے بھی اتنا تسلیم کیا ہے کہ اہل کتاب کے ہاتھ کا کھانا جائز قرار دیا ہے اور مشرک کے ہاتھ کا کھانا ناجائز قرار دیا ہے۔ حالانکہ اہل کتاب شراب بھی پیتے ہیں اور سؤر کا گوشت بھی کھاتے ہیں اور ان کے مقابلہ میں مشرکین میں سے بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو سؤر نہیں کھاتے (یہاں مشرک کے معنے یہ ہیں کہ وہ جو کسی کتاب کو ماننے والا نہ ہو۔ یہ نہیں کہ جو اہل کتاب ہو وہ شرک کرتا ہی نہیں۔ باریک معنوں کی رو سے تو اہل کتاب بھی مشرک ہوتے ہیں اور دہریہ بھی مشرک ہوتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم کی اصطلاح میں مشرک کا اَور مفہوم ہے اور عرف عام میں مشرک کا اَور مفہوم ہے۔ قرآن کریم نے اہل کتاب ان کو قرار دیا ہے جو کسی کتاب کے قوانین کو مانتے ہیں چاہے وہ ان قوانین پر عامل نہ ہوں۔ ان کا قوانین کو تسلیم کرنا ہی ان کو اہل کتاب کا نام دینے کے لئے کافی ہے۔ جیسے بہت سے مسلمان بھی قرآن کریم کے احکام پر نہیں چلتے مگر وہ کہلاتے مسلمان ہی ہیں) بہرحال اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے کھانے کو اس لئے جائز قرار دیا ہے کہ ان میں کسی کتاب کو ماننے کی وجہ سے کچھ نہ کچھ اخلاق ضرور ہوں گے اور ہم ان پر یہ حسن ظنی کر سکتے ہیں کہ چونکہ اہل کتاب میں سے کسی بھی کتاب میں دھوکا دینا جائز نہیں اس لئے یہ دھوکا دے کر ہمیں کوئی ایسی چیز نہیں کھلا دیں گے جو ہمارے مذہب کی رو سے ناجائز ہو۔ لیکن جو شخص خود کہتا ہے کہ میں کسی قانون کا پابند نہیں تو چاہے وہ شریف ہی کیوں نہ ہو ہم اس پر حسن ظنی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہم یہ سمجھیں گے کہ چونکہ اس کے لئے کسی قانون کے پابند نہ ہونے کی وجہ سے دھوکا یا فریب کرنے میں کوئی روک نہیں

ہے اس لئے ممکن ہے کہ یہ ہمارے ساتھ دھوکا کر جائے اور ہمیں کوئی ایسی چیز کھلا دے جو ہمارے مذہب میں ناجائز ہو۔ پس قرآن کریم نے جو اہل کتاب کا ذبیحہ کھانے کی اجازت دی ہے وہ بھی اسی لئے ہے کہ وہ ایک قانون کے پابند ہیں۔ حالانکہ وہ سؤر کا گوشت بھی کھاتے ہیں۔ مگر مشرک کے ہاتھ کا کھانے کی صرف اس لئے اجازت نہیں دی کہ وہ کسی قانون کا پابند نہیں۔ اور اس کو دھوکا یا فریب دینے سے کوئی چیز روکنے والی نہیں ہے۔ ایک اہل کتاب چاہے دنیوی لحاظ سے بااخلاق نہ ہو اس کا کھانا کھانے کی اجازت ہے۔ اور مشرک چاہے دنیوی لحاظ سے بااخلاق ہو اس کا کھانا کھانے کی اجازت نہیں۔ کیونکہ اہل کتاب کسی نہ کسی قانون کے پابند ہیں۔ یہودی تورات کو مانتے ہیں۔ عیسائی انجیل کو مانتے ہیں اور ہندو ویدوں کو مانتے ہیں اور ان سب کا قانون اس امر پر متفق ہے کہ کسی کے ساتھ دھوکا کرنا جائز نہیں ہے۔ اسی لئے شریعت اسلامیہ نے اہل کتاب کو دوسروں سے زائد حقوق دیئے ہیں۔ پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آباء و اجداد چونکہ اچھے شہری تھے اور سوسائٹی کے قانون کے پابند تھے اس لئے انہیں ساجد کہا گیا۔ مگر وہ ساجداً للہ نہیں تھے بلکہ ملکی قانون کے ساجد تھے۔ اور شریف خاندان رکھتے تھے۔ اور انبیاء ہمیشہ شریف اور اعلیٰ خاندانوں میں سے ہی آتے ہیں۔ اگر کوئی نبی ادنیٰ اقوام میں سے آجائے (جو سنت اللہ کے خلاف ہے) تو لوگ اس کو مان نہیں سکتے۔ وہ کہیں گے کہ اس کا خاندان اچھا نہیں ہے۔ یا یہ غلام ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہی دیکھ لو۔ آپ غلام نہ تھے مگر چونکہ کچھ عرصہ آپ نے فرعون مصر کے گھر سے روٹی کھائی تھی اس لئے فرعون نے کہہ دیا کہ یہ وہی ہے جس کو ہم نے روٹیاں کھلا کھلا کر پالا ہے (الشعراء: ۱۹)۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھو۔ عیسائی آج تک آپؐ کے متعلق یہ طعنہ دیتے ہیں کہ آپ لونڈی کی نسل میں سے تھے۔ وہ لوگ حضرت ہاجرہؓ کو لونڈی قرار دیتے ہیں (پیدائش باب ۱۶ آیت ۲)۔ حالانکہ تورات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ہاجرہؓ مصر کے بادشاہ کے رشتہ داروں میں سے تھیں۔ اور اس بادشاہ نے انہیں اخلاص کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں تحفۃً پیش کیا تھا مگر عیسائیوں نے صرف اس لئے کہ حضرت ہاجرہؓ تحفۃً دی گئی تھیں ان کو لونڈی قرار دے دیا۔ غرض دشمن تو ہمیشہ تعصب کی نگاہ سے دیکھنے کا عادی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مرسل اعلیٰ اور شریف خاندانوں میں سے آتے ہیں تا کہ لوگوں کے دلوں میں ان کو مانتے ہوئے انقباض پیدا نہ ہو۔ اسی لئے جب ہرقل قیصر روم نے ابوسفیان سے سوال کیا کہ یہ شخص (یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس کا خاندان کیسا ہے تو ابوسفیان نے یہی جواب دیا کہ وہ اچھے خاندان کا ہے اور میرے رشتہ داروں میں سے ہے (بخاری کتاب بدء الوحی باب کیف کان بدء الوحی)۔ پس حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس آیت کے

معنے سیاق و سباق کے تسلسل میں بیان نہیں فرمائے۔ بلکہ صرف یہ ثابت کیا ہے کہ نبی اپنی قوم میں شریف ہوتے ہیں۔ اور ابتدائے آفرینش سے آج تک جتنے انبیاء آئے ہیں وہ سب کے سب معزز خاندانوں میں سے تھے۔ اچھے شہریوں اور قانون وقت کے ساتھ چلنے والوں اور سوسائٹی کے مفید ترین لوگوں کی اولادوں میں سے تھے اس لئے لوگ ان کی تحقیر و تذلیل نہ کر سکتے تھے بلکہ ان کا پورا ادب اور احترام کرتے تھے۔ غرض اس آیت کے ایک معنے تو وہ ہیں جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے منفرداً کئے ہیں اور دوسرے معنے وہ ہیں جو میں نے سیاق و سباق کے تسلسل کے لحاظ سے بیان کئے ہیں۔ لیکن اس آیت کے ایک تیسرے معنے ساری سورۃ کے تسلسل کے لحاظ سے بھی ہیں۔

اس سورۃ (الشعراء) میں سب سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر آتا ہے۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر آتا ہے۔ پھر حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر آتا ہے۔ پھر حضرت صالح علیہ السلام کا ذکر آتا ہے۔ پھر حضرت لوط علیہ السلام کا ذکر آتا ہے اور پھر حضرت شعیب علیہ السلام کا ذکر آتا ہے۔ ان سب انبیاء کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر فرماتا ہے۔ ان کے علاوہ بہت سے انبیاء ایسے بھی ہیں جن کے نام قرآن کریم میں نہیں آئے اور ان کی تاریخ بھی محفوظ نہیں۔ قرآن کریم نے قاعدہ کلیہ کے طور پر بیان کر دیا ہے کہ تمام انبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر دیتے چلے آئے ہیں اور سب نے آپ کے متعلق پیشگوئیاں کیں۔ مگر ان میں سے بعض کی پیشگوئیاں تو محفوظ ہیں اور باقی انبیاء کی پیشگوئیاں محفوظ نہیں ہیں جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیشگوئیاں موجود ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیشگوئیاں تورات میں موجود ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیشگوئیاں انجیل میں موجود ہیں یہ تو ایسے ہیں جن کی پیشگوئیاں ان کی کتابوں میں موجود ہیں۔ لیکن جن انبیاء کے نام قرآن کریم میں بیان نہیں ہوئے اور نہ ہی ان کی کوئی تاریخ موجود ہے۔ ان کی پیشگوئیاں بھی محفوظ نہیں ہیں۔ ان تمام انبیاء کا جن کے نام میں نے اوپر بتائے ہیں ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کیا اس پر شیطان اتر سکتا ہے اگر شیطان اترتا تو ان کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت بھی ہونا چاہیے۔ آخر ان منکرین میں سے بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو کسی نہ کسی نبی کو مانتے ہیں۔ ان میں عیسائی بھی ہیں یہودی بھی ہیں اور کچھ دوسرے لوگ بھی ہیں۔ عیسائی حضرت عیسیٰؑ کو مانتے ہیں۔ یہودی حضرت موسیٰؑ۔ نوحؑ ابراہیمؑ اور لوطؑ کو مانتے ہیں اور دوسرے کفار ہودؑ اور صالحؑ کو مانتے ہیں۔ ان سارے گروہوں میں سے مکہ والوں کے جدامجد حضرت ابراہیمؑ کی پیشگوئیاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق موجود تھیں۔ عیسائیوں کے جدامجد موسیٰ کی پیشگوئیاں موجود تھیں۔ غرض اللہ تعالیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے

فرماتا ہے تَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ۔ تیری صداقت کا ایک بہت بڑا ثبوت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام انبیاء تیری خبر دیتے چلے آئے ہیں۔ تَقَلُّبٌ کے معنے ہوتے ہیں چلنا پھرنا۔ یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تُو موسیٰ ؑ کے سامنے کشفی حالت میں موجود تھا۔ تُو ابراہیمؑ کے سامنے موجود تھا۔ تو نوح ؑ کے سامنے موجود تھا۔ تو ہودؑ کے سامنے موجود تھا۔ تو صالح ؑ کے سامنے موجود تھا۔ فرماتا ہے جب تو ان تمام انبیاء کے سامنے موجود تھا جن کو یہ لوگ اپنے بزرگ تسلیم کرتے ہیں تو یہ کس طرح تیرا انکار کر سکتے اور کہہ سکتے ہیں کہ تو راستبازوں میں سے نہیں ہے۔ ابراہیمؑ نے کشفی حالت میں تجھے دیکھا۔ اسی لئے اس نے تیری آمد کی خبر دی۔ موسیٰ ؑ نے کشفی حالت میں تجھے دیکھا اسی لئے اس نے تیری آمد کی خبر دی اور عیسیٰؑ نے تجھے دیکھا۔ اسی لئے اس نے تیری خبر دی اور ان تمام نبیوں نے بتایا کہ اس شان کا ایک نبی پیدا ہونے والا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ان انکار کرنے والوں کے جتنے باپ دادے تھے۔ وہ تیرے متعلق گواہیاں دے چکے ہیں کہ اس اس شان کا ایک نبی آئے گا اس کو مان لینا۔ اب یہ کس طرح تیرا انکار کر سکتے ہیں اور اپنے بزرگوں کی شہادت کو ردّ کر سکتے ہیں۔ غرض ساری سورۃ کے تسلسل کے لحاظ سے تَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ کے معنے ہیں۔ تَقَلُّبَكَ فِي الْاَنْبِيَاءِ۔ یعنی ابراہیمؑ نے انگلی اٹھائی اور کہا یہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) راستباز ہے۔ نوح ؑ نے انگلی اٹھائی اور کہا۔ یہ راستباز ہے۔ موسیٰ ؑ نے انگلی اٹھائی اور کہا۔ یہ راستباز ہے۔ عیسیٰؑ نے انگلی اٹھائی اور کہا یہ راستباز ہے۔ ہود ؑ، صالح ؑ، لوط ؑ اور شعیبؑ نے انگلیاں اٹھائیں اور کہا یہ راستباز ہے۔ فرماتا ہے ان تمام انبیاء نے جن کو تم اپنے بزرگ تسلیم کرتے ہو خبر دی تھی کہ یہ راستباز ہے۔ اب تم اس کا کس طرح انکار کر سکتے ہو؟

اس کے بعد فرماتا ہے اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ یقیناً وہ خدا جس نے تجھے مبعوث کیا ہے دعاؤں کو قبول کرنے والا اور اپنے بندوں کے حالات کو جاننے والا ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ پہلی آیت میں نمازوں اور دعاؤں کا ہی ذکر ہے۔ نہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے باپ دادوں کا۔ تبھی وہ فرماتا ہے کہ خدا تعالیٰ دعائیں سننے والا اور جاننے والا ہے۔ یعنی تیری اور تیرے ساتھیوں کی دعائیں تعلیم اسلام کو مکمل سے مکمل تر کرتی چلی جاتی ہیں۔ اسی کی طرف دوسری جگہ قرآن کریم میں ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ قُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا (طٰهٰ:۱۱۵) یعنی تو ہمیشہ اللہ سے یہ دعا کرتا رہ۔ کہ اے میرے رب! میرے علم کو بڑھا۔ چونکہ یہ قرآنی دعا ہے۔ اس لئے صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی یہ دعا نہیں مانگتے تھے بلکہ سارے مسلمان مانگتے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد تو اس دعا سے یہ ہوتی تھی کہ اے خدا! تو مجھ پر قرآن کریم کو مکمل سے مکمل تر کر کے اتار اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی یہ مراد ہوتی تھی کہ اے خدا! ہمارے رسول کے ذریعہ سے ہمیں کامل سے کامل تر شریعت عطا فرما۔

هَلۡ اُنَبِّئُكُمۡ عَلٰى مَنۡ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيۡنُ ؕ﴿۲۲۲﴾ تَنَزَّلُ عَلٰى

کیا میں تجھے بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتے ہیں؟ (شیطان) ہر جھوٹے گناہگار پر اترتے ہیں وہ اپنے کان

كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيۡمٍ ۙ﴿۲۲۳﴾ يُّلۡقُوۡنَ السَّمۡعَ وَاَكۡثَرُهُمۡ كٰذِبُوۡنَ ؕ﴿۲۲۴﴾

(آسمان کی طرف) لگاتے ہیں اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔

حلّ لُغات۔ اَفَّاكٍ اَفَّاكٌ کے معنے ہیں اَلَّذِیْ یَصُدُّ النَّاسَ عَنِ الْحَقِّ بِبَاطِلِہٖ۔ وہ شخص جو لوگوں کو حق وصداقت کے قبول کرنے سے اپنے جھوٹ اور باطل طریقوں سے روکتا ہے۔ (اقرب)

تفسیر۔ پہلے تو اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا تھا کہ اس قرآن کو شیاطین نے نازل نہیں کیا اور نہ ان میں طاقت تھی کہ وہ ایسا کر سکتے۔ اب اس آیت میں اللہ تعالیٰ کفار کے اس اعتراض کے جواب میں یہ مضمون بیان فرماتا ہے کہ شیاطین جن لوگوں پر نازل ہوتے ہیں ان کی کیا علامات ہوتی ہیں۔ چنانچہ فرماتا ہے تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيۡمٍ۔ شیطان ہر جھوٹے گناہگار پر اترتا ہے۔ یعنی شیطان کا تعلق تو اَفَّاك اور اَثِیْم کے سوا کسی سے ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ شیطان خود جھوٹ بولتا ہے اور اس کا نام شیطان ہی بتاتا ہے کہ وہ بڑا گناہگار ہوتا ہے مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو نہ جھوٹا ہے اور نہ گناہگار پھر اس پر شیاطین کس طرح اتر سکتے ہیں۔ بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو وہ ہیں جن کی صداقت اور راستبازی کے تم بھی قائل ہو۔ چنانچہ تاریخوں میں لکھا ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعویٰ کیا تو چونکہ مکہ عرب کے لوگوں کا مرکز تھا۔ اور لوگ وہاں حج کرنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ اس لئے چند سر برآوردہ لوگوں نے جمع ہو کر تجویز کی کہ اس سال جب باہر سے لوگ حج کرنے کے لئے آئیں گے تو اگر ہم ان کو آپؐ کے متعلق مختلف باتیں بتائیں گے تو وہ ہماری رائے کو غلط سمجھیں گے۔ چاہیے کہ مل کر ایک فیصلہ کر لیا جائے اور وہی جواب انہیں دیا جائے۔ اس پر ان میں سے ایک شخص نے کہا کہ ہم کہہ دیا کریں گے کہ وہ جھوٹا ہے۔ جب اس نے یہ بات کہی۔ تو اسی وقت ایک شدید دشمن النضر بن الحارث جوش سے کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔ تم یہ کیا بات کر رہے ہو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تو ہم صادق اور امین کے طور پر پیش کیا کرتے تھے اس لئے اب اس کو کیسے جھوٹا کہیں گے۔ وہ لوگ تو اس جواب سے ہمیں ملزم قرار دیں گے اور کہیں گے کہ تم غلط بیانی سے کام لے رہے ہو (شفاء للقاضی عیاض جلد اول صفحہ ۷۹) تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی راستبازی کے تم بھی قائل ہو

تو پھر اسی منہ سے یہ کس طرح کہہ رہے ہو کہ اس پر شیطان کلام لے کر نازل ہوتا ہے۔ شیطان تو جھوٹوں اور گنہگاروں پر نازل ہوا کرتا ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منہ جھوٹوں والا نہیں بلکہ اس کا چالیس سالہ عمل اور کردار تمہارے سامنے ہے اور تم سب جانتے ہو کہ یہ شخص تم سب میں سے زیادہ راستباز تھا۔ پھر یہ کیسے تعجب کی بات ہے کہ تم شیطان کے نزول کے لئے اسی شخص کا نام لے رہے ہو جو شیطان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔

پھر فرماتا ہے یُلْقُوْنَ السَّمْعَ وَ اَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ۔ وہ لوگ اپنے کان آسمان کی طرف لگائے رکھتے ہیں اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔ آسمان کی طرف اپنے کان لگائے رکھنے کے دو معنے ہیں۔ ایک معنے تو یہ ہیں کہ وہ اس بات کی خواہش اور تمنا کیا کرتے ہیں کہ ان پر الہام نازل ہو اور انہیں کچھ غیب کی خبریں معلوم ہو جائیں۔ اور وہ اپنی اس خواہش میں اس قدر بڑھ جاتے ہیں کہ آخر انہیں شیطانی الہام ہونے لگ جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ خود بھی ٹھوکر کھاتے ہیں اور دوسروں کے لئے بھی ٹھوکر کا موجب بنتے ہیں۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تو یہ حالت ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ خدا تعالیٰ سے کہے کہ مجھ پر کلام نازل کر خدا خود اس پر کلام نازل کرتا ہے اور وہ نفسانی رنگ میں کبھی یہ خواہش نہیں کرتا کہ خدا اس پر کلام نازل کرے تا کہ وہ دوسروں پر اپنی بڑائی ظاہر کرے۔ ہاں جو کلام خود اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتا ہے اس پر وہ اس کا شکر بجالاتا ہے لیکن جو اَفّاك اور اَثیم ہوتے ہیں ان کے دلوں میں ہر وقت یہی خواہش موجزن رہتی ہے کہ کسی طرح ان پر کلام نازل ہو جائے۔ وہ لوگ کہیں مسمریزم کرتے ہیں۔ کہیں ہپناٹزم کا عمل کرتے ہیں اور کہیں وظیفے کرتے اور چلّے کاٹتے ہیں اور اس تمام جدوجہد سے ان کا مقصد صرف اتنا ہوتا ہے کہ انہیں کچھ غیب کی خبریں معلوم ہو جائیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی فرمایا کرتے تھے کہ تم کبھی یہ خواہش نہ کرو کہ خدا تعالیٰ کا کلام تم پر نازل ہو۔ ہاں اگر خدا تعالیٰ کا کلام تم پر نازل ہوتا ہے اور تم کو کوئی الہام ہوتا ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ تم اگر اللہ تعالیٰ سے مانگنا چاہتے ہو تو اس کا فضل مانگو۔ ہاں اگر کسی خاص موقعہ پر انسان استخارہ کر کے خدا تعالیٰ سے ہدایت طلب کرے تو اَور بات ہے۔ لیکن کلام الٰہی مانگنا اور اس کی خواہش کرنا تو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس کے مدنظر صرف اپنی بڑائی کا خیال ہے خدا تعالیٰ کے قرب کی اسے کوئی خواہش نہیں۔ اسی لئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے الہامات کی خواہش رکھنے سے اپنی جماعت کو سختی سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ آپ اپنی جماعت کو اس بارہ میں ہدایت دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

”مکالمات الٰہیہ کی اپنے نفس سے خواہش نہیں ظاہر کرنی چاہیے۔ خواہش کرنے کے وقت

شیطان کو موقعہ ملتا ہے اور ہلاک کرنا چاہتا ہے۔ بلکہ اپنا مدّعا اور مقصود ہمیشہ یہ ہونا چاہیے کہ خدا تعالیٰ کی مرضی کے موافق تزکیہ نفس حاصل ہو اور اس کی مرضی کے موافق تقویٰ حاصل ہو۔ اور کچھ ایسے اعمالِ حسنہ میسر آجاویں کہ وہ راضی ہو جائے۔ پس جس وقت وہ راضی ہوگا تب اس وقت ایسے شخص کو اپنے مکالمات سے مشرف کرنا اگر اس کی حکمت اور مصلحت تقاضا کرے گی تو وہ خود عطا کر دے گا۔ اصل مقصود اس کو ہرگز نہیں ٹھہرانا چاہیے کہ یہی ہلاکت کی جڑ ہے۔ بلکہ اصل مقصود یہی ہونا چاہیے کہ قرآن شریف کی تعلیم کے موافق احکام الٰہی پر پابندی نصیب ہو اور تزکیہ نفس حاصل ہو۔ اور خدا تعالیٰ کی محبت اور عظمت دل میں بیٹھ جائے اور گناہ سے نفرت ہو۔'' (الحکم ۲۴ر نومبر ۱۹۰۷ء ص ۷)

اسی طرح فرماتے ہیں:

''وہ لوگ جو اپنے نفس میں پوری پاکیزگی نہیں رکھتے اور پھر خوابوں کی خواہش رکھتے ہیں اور الہامات کی طرف اپنا دل لگاتے ہیں ان کو حدیث النفس اور اضغاث احلام کے سوائے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔'' (تقریر جلسہ سالانہ ۱۹۰۶ء مندرجہ اخبار بدر ۱۰ر جولائی ۱۹۰۷ء ص ۱۶)

اس کے مقابلہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ کیفیت تھی کہ آپؐ پر کلام الٰہی نازل ہوا تو آپ گھبراہٹ کی حالت میں اپنے گھر تشریف لائے اور حضرت خدیجہؓ سے فرمایا کہ لَقَدْ خَشِيْتُ عَلٰى نَفْسِيْ مجھے تو اپنے نفس کے متعلق ڈر پیدا ہو گیا ہے کہ نہ معلوم میں اس ذمہ واری کو ادا بھی کر سکتا ہوں یا نہیں۔ لیکن جو جھوٹے اور شیاطین کی پیروی کرنے والے لوگ ہوتے ہیں ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ رمل اور نجوم کے ذریعہ اور اسی طرح اَور کئی قسم کے ذرائع سے غیب کی خبریں معلوم کرنے کی رات دن کوشش کرتے رہتے ہیں تاکہ لوگ ان کی بزرگی تسلیم کریں اور انہیں اپنا ملجاء و ماویٰ سمجھنے لگ جائیں۔

يُلْقُوْنَ السَّمْعَ کے دوسرے معنے یہ ہیں کہ شیطان کوشش تو کرتے ہیں کہ خدائی باتوں کو سنیں۔ لیکن ان میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں وہ جھوٹ کو چھوڑ نہیں سکتے وہ خدا کی سنی ہوئی باتوں میں جھوٹ ملا دیتے ہیں۔ اور اس طرح ان کا فریب کھل جاتا ہے یعنی جب وہ مسلمانوں سے قرآن کریم سنتے ہیں تو اس میں غلط باتیں ملا کر لوگوں میں مشہور کر دیتے ہیں اور کہنے لگ جاتے ہیں کہ مسلمانوں کے قرآن میں یہ یہ باتیں بیان ہوئی ہیں۔ حالانکہ وہ بالکل جھوٹ ہوتا ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں جیسا کہ مفسرین نے لکھا ہے کہ شیاطین آسمان پر جا کر خدا تعالیٰ کی وحی کو معلوم کر لیتے ہیں۔

کیونکہ قرآن کریم کی رو سے ایسا نہیں ہوسکتا۔جیسا کہ اسی رکوع میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ (الشعراء:۲۱۳)یعنی شیطان آسمانی باتوں کے سننے سے دور رکھے گئے ہیں۔اسی طرح ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ فَلْيَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطَانٍ مُّبِيْنٍ(الطور:۳۹)یعنی کیا ان کے پاس کوئی ایسی سیڑھی ہے جس کے ذریعہ وہ آسمان پر جا کر خدا تعالیٰ کی باتیں سن سکتے ہیں۔اگر ان میں کوئی اس امر کا مدعی ہے کہ وہ آسمان پر گیا تھا۔اوراس نے خدا تعالیٰ کی باتیں سنی تھیں تو وہ اپنے دعوے کا ثبوت پیش کرے۔ ان آیات سے ظاہر ہے کہ آسمان کی باتیں سننا تو الگ رہا وہاں تک کسی کے جانے کی اہلیت بھی قرآن کریم نے تسلیم نہیں کی۔اور جب یہ حقیقت ہے تو یُلْقُوْنَ السَّمْعَ کے یہ معنے کرنے کس طرح جائز ہو سکتے ہیں کہ وہ آسمان کی باتیں سننے کے لئے اپنے کان لگائے رکھتے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ اس جگہ آسمان کی باتیں سننے کے معنے یہ ہیں کہ وہ مومن انسانوں سے خدا تعالیٰ کی باتیں سنتے ہیں۔لیکن ان میں جھوٹ ملا کر قرآن کریم کو بدنام کرنے کے لئے لوگوں میں مشہور کر دیتے ہیں اوراس طرح ان کا جھوٹ لوگوں پر واضح ہو جاتا ہے۔پس اس کے یہ معنے نہیں کہ شیطان آسمان پر جا کر ملاء اعلیٰ اور جبریلؑ اورعرش کی باتوں کو سن لیتا ہے اور پھر وہ زمین پر آجاتا ہے بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ جو لوگ شیطان کے مثیل ہوتے ہیں اور جنہوں نے ابلیسی جامہ زیبِ تن کیا ہوا ہوتا ہے۔وہ آسمانی باتوں کو ایسے رنگ میں بگاڑ کر دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ ایک فتنہ برپا ہو جاتا ہے اور کئی لوگ ان کے فریب میں آجاتے ہیں۔گویا براہ راست کلام الٰہی کے سننے سے تو وہ محروم ہی ہوتے ہیں۔آسمانی کتابوں سے وہ جو کچھ آسمانی باتیں حاصل کرتے ہیں ان میں بھی اپنی عادت کے مطابق اپنے پاس سے جھوٹ ملا دیتے ہیں۔اوراس طرح لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہی حقیقت اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بھی بیان فرمائی ہے کہ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا (الانعام:۱۱۳) یعنی اے ہمارے رسول! جس طرح تیرے زمانہ میں ہو رہا ہے۔اسی طرح ہم نے ہر نبی کے زمانہ میں انسان شیطانوں اور جن شیطانوں کو چھوڑ رکھا تھا اور وہ ایک دوسرے کو دھوکا دینے کے لئے جھوٹی باتیں سناتے تھے۔یہ آیت بھی بتاتی ہے کہ انبیاء کے دشمن جو بڑے لوگوں میں سے بھی ہوتے ہیں اور عوام الناس میں سے بھی ہوتے ہیں۔وہ ایک دوسرے کو غیب کی باتیں نہیں بتاتے بلکہ جھوٹی باتیں بتاتے ہیں۔چنانچہ دیکھ لو مسلمان علماء نے قرآن کریم کی تفاسیر لکھی ہیں۔اور وہیریؔ اور بعض دوسرے مستشرقین نے بھی قرآن کریم کی تفاسیر لکھی ہیں۔لیکن عیسائی پادریوں نے اپنی تفاسیر میں اسلام کو بدنام

کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ پس آسمانی باتیں سننے کے لئے کان تو مومن بھی رکھتے ہیں اور کافر بھی۔ مگر مومن تو اس لئے کان رکھتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کلام کو سنیں اور اس پر عمل کریں۔ اور کفار اس لئے رکھتے ہیں کہ وہ اس میں جھوٹ ملا کر لوگوں کو اور زیادہ گمراہ کریں اور انہیں خدا اور اس کے رسول سے دور رکھنے کی کوشش کریں۔ پھر فرماتا ہے۔ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ۔ ان میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس آیت میں پہلے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا کہ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ شیطان ہر جھوٹے گنہگار پر نازل ہوتے ہیں اور یہاں فرماتا ہے کہ اَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ۔ ان میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔ جب اکثر جھوٹے ہوتے ہیں تو معلوم ہوا کہ سارے کے سارے جھوٹے نہیں ہوتے حالانکہ كُلُّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ کہہ کر ان میں سے ہر ایک کو بلا استثناء جھوٹا کہا گیا تھا۔ سو یاد رکھنا چاہیے کہ اَكْثَرُهُمْ کے الفاظ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ کے متبعین کے لئے آئے ہیں یعنی اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ کے متبعین میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ کے متبعین سارے کے سارے جھوٹے ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں سے بعض غلطی خوردہ ہوں اور وہ اپنے لیڈروں کو سچا سمجھ کر ان کے پیچھے چل رہے ہوں۔ پس چونکہ دنیا میں اس قسم کے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو جھوٹ کو سچ سمجھ کر اختیار کرتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ ان کے تمام متبعین جھوٹے اور کذاب ہوتے ہیں۔ بلکہ فرمایا کہ اَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ ان میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔ ہاں ایک قلیل تعداد غلطی خوردہ لوگوں کی بھی ہوتی ہے۔

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿۲۲۵﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ

اور شعراء کی جماعت ایسی ہوتی ہے کہ ان کے پیچھے چلنے والے گمراہ ہوتے ہیں۔ (اے مخاطب) کیا تیری سمجھ میں

يَّهِيْمُوْنَ ﴿۲۲۶﴾ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۲۲۷﴾ اِلَّا

(اب تک) نہیں آیا کہ وہ (یعنی شعراء) تو ہر وادی میں بے مقصود کے پھرتے ہیں۔ اور وہ ایسی باتیں کہتے ہیں

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ

جو کرتے نہیں۔ سوائے (شاعروں میں سے) مومنوں اور نیک عمل کرنے والوں کے اور ان کے جو اللہ (تعالیٰ)

انْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ؕ وَ سَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا

کا (اپنے شعروں میں) کثرت سے ذکر کرتے ہیں اور (اگر ہجو کرتے ہیں تو ابتداءً نہیں کرتے بلکہ) مظلوم ہونے

اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ﴿۲۲۸﴾

ع ۱۱/۱۵

کے بعد (جائز) بدلہ لیتے ہیں اور وہ لوگ جو ظالم ہیں ضرور جان لیں گے کہ کس مقام کی طرف ان کو لوٹ کر جانا ہوگا۔

حلّ لُغات۔ يَهِيْمُوْنَ يَهِيْمُوْنَ هَامَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور هَامَ عَلٰى وَجْهِهٖ کے معنے ہیں ذَهَبَ مِنَ الْعِشْقِ اَوْ غَيْرِهٖ لَا يَدْرِيْ اَيْنَ يَتَوَجَّهُ کہ اپنے عشق یا کسی اور مقصد کی خاطر ادھر ادھر گھومتا پھرا اور اس کو معلوم نہ ہوا کہ وہ کدھر جا رہا ہے۔ (اقرب) پس يَهِيْمُوْنَ کے معنے ہوں گے وہ سرگردان پھرتے ہیں۔

اِنْتَصَرُوْا اِنْتَصَرُوْا اِنْتَصَرَ سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اِنْتَصَرَ مِنْهُ کے معنے ہیں اِنْتَقَمَ مِنْهُ اس سے بدلہ لیا۔ اور جب اِنْتَصَرَ عَلَيْهِ کہیں تو معنے ہوتے ہیں اِسْتَظْهَرَ ۔اس پر غالب آ گیا۔ وَامْتَنَعَ مِنْ ظُلْمِهٖ ۔اس کے ظلم سے محفوظ ہو گیا۔ (اقرب) پس اِنْتَصَرُوْا کے معنے ہیں۔ وہ انتقام لیتے ہیں۔

تفسیر۔ کفار مکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کو سن کر اپنے جن خیالات کا اظہار کیا کرتے تھے قرآن کریم نے ان کا مختلف مقامات میں ذکر کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ وہ کبھی آپ کو مجنون کہنے لگ جاتے تھے۔ کبھی کہتے کہ اسے پریشان خوابیں آتی ہیں۔ جن کی وجہ سے یہ ایسا دعویٰ کر بیٹھا ہے۔ کبھی کہتے یہ ساحر ہے۔ کبھی کہتے کہ یہ خود تو نیک بخت ہے۔ لیکن کسی اور نے اس پر جادو کر دیا ہے۔ گویا یہ ساحر نہیں بلکہ مسحور ہے۔ کبھی کہتے یہ کاہن ہے۔ کبھی کہتے کہ اسے کوئی اور شخص باتیں سکھا دیتا ہے یہ کلام اس کا اپنا نہیں۔ کبھی کہتے کہ اس کے ساتھ شیطان کا تعلق ہے کبھی کہتے یہ مفتری اور کذاب ہے اور کبھی کہتے کہ یہ شاعر ہے۔ چنانچہ سورۂ انبیاء میں اللہ تعالیٰ ان میں سے بعض اعتراضات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ بَلْ قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۭ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۔(الانبیاء:۶) یعنی مخالف کہتے ہیں کہ یہ کلام تو پریشان خوابیں ہیں بلکہ پریشان خوابیں بھی نہیں اس نے دیدہ و دانستہ یہ باتیں اپنے پاس سے بنالی ہیں بلکہ اصل بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ ایک شاعرانہ مزاج رکھنے والا آدمی ہے جس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات اٹھتے رہتے ہیں اور جس طرح مشہور اور قادر الکلام شعراء کے اشعار میں بڑی بھاری فصاحت و بلاغت اور بلند پروازی پائی جاتی ہے۔ اسی طرح اس کا کلام بھی شاعرانہ فصاحت و بلاغت کا حامل ہے۔

پس درحقیقت یہ بھی ایک شاعر ہے کوئی روحانی آدمی نہیں۔

اللہ تعالیٰ زیر تفسیر آیات میں کفار کے اس ادّعا کو بھی باطل ثابت کرتا ہے۔ اور فرماتا ہے کہ تمہارا یہ خیال بھی کلّی طور پر غلط ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ شعراء پر ایسے لوگ ہی گرویدہ ہوتے ہیں جن کا تقویٰ اور روحانیت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ چونکہ شعراء اپنے شعروں میں عموماً عشق اور محبتِ نفسانیہ اور شہوانیہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اس لئے ایسے ہی لوگ ان کے پیچھے چلتے ہیں جو خود بھی تقویٰ سے دور ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ بعض آوارہ نوجوانوں کو ان کے سینکڑوں اشعار یاد ہوتے ہیں اور بعض شاعروں کی غزلیں رنڈیاں گاتی ہیں کیونکہ ان میں خدا اور اس کے رسول کا کہیں ذکر نہیں ہوتا بلکہ عموماً ان کے ذریعہ نوجوانوں کے شہوانی جذبات کو تحریک دی جاتی ہے اور واعظ اور ناصح پر پھبتیاں اڑائی جاتی ہیں جس کی وجہ سے ان کی ایسے ہی لوگوں میں مقبولیت ہوتی ہے جن کا روحانیت سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین تو ایسے ہیں جنہوں نے اپنی صداقت اور دیانت اور عفت اور پاکیزگی کا ایک بے مثال نمونہ لوگوں کے سامنے پیش کر رکھا ہے۔ ان کی راتیں قیام و سجود میں۔ اور ان کے دن ذکر الٰہی اور اعلاءِ کلمۂ اسلام میں بسر ہوتے ہیں۔ پھر تم یہ کس طرح کہہ سکتے ہو کہ جس مقدس انسان کا دامن چھوکر ان کے اندر ایسی پاکیزگی پیدا ہوئی ہے وہ تمہارے بدعمل شاعروں کی طرح ایک ایسا انسان ہے جو جذبات کو بھڑکا کر لوگوں کو اپنے اردگرد جمع کر رہا ہے۔ اس کی جماعت کی پاکیزگی اور ان کا تقویٰ و طہارت میں بے مثال نمونہ قائم کرنا خود اس بات کا ثبوت ہے کہ تمہارا یہ ادّعا بالکل باطل ہے۔ اور تم نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام سمجھنے میں سخت غلطی کھائی ہے۔

پھر فرماتا ہے اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ شاعر مختلف طبائع کو خوش کرنے کے لئے کبھی اِدھر کی بات کر دیتے ہیں کبھی اُدھر کی۔ ان کے سامنے کوئی خاص مقصد اور مدّعا نہیں ہوتا بلکہ جو چیز بھی ان کے ذہن میں آجائے اسی کے متعلق وہ کچھ نہ کچھ کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ شاعروں کی کوئی غزل لے لو فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ کا تمہیں ان کی ہر غزل میں نظارہ نظر آجائے گا۔ ایک شعر میں تو لکھا ہوگا۔ میں مر گیا۔ میرا معشوق مجھ سے بے وفائی کرتا ہے۔ اور میں اس کے ہجر میں اس کی بے التفاتی کی وجہ سے جاں بلب ہوں۔ مگر ساتھ ہی اگلے شعر میں یہ لکھا ہوتا ہے کہ مجھے اپنے معشوق کا وصال نصیب ہوا۔ میں جی اٹھا اور میں زندہ ہو گیا۔ ساری غزل کا ایک شعر بھی دوسرے شعر سے جوڑ نہیں رکھتا۔ ایک شعر میں وہ کچھ اَور بیان کر رہے ہوتے ہیں اور دوسرے شعر میں وہ کہیں اَور نکل جاتے ہیں۔ ایک شعر میں تو وہ کہتے ہیں۔ میں محبوب سے ملنے کی تیاری کر رہا ہوں۔ اور دوسرے میں

کہتے ہیں ہائے مرا جا رہا ہوں ۔غرض ان کی غزلوں کا ہر شعر دوسرے سے متناقض ہوتا ہے اور ان کی باتوں کا کوئی سر پیر ہی نہیں ہوتا۔کبھی ادھر کی کہتے ہیں کبھی اُدھر کی ۔کبھی کہتے ہیں میں اپنے محبوب کے عشق میں مر گیا حالانکہ وہ زندہ اپنے شعر سنا رہے ہوتے ہیں ۔کبھی کہتے ہیں میں اپنے معشوق کے عشق میں سرگردان ہوں ۔حالانکہ وہ اچھے بھلے دنیا کے کام کر رہے ہوتے ہیں ۔کبھی کہتے ہیں معشوق ہر وقت ہمارے دل میں ہے اور یہ بالکل جھوٹ ہوتا ہے ۔کبھی کہتے ہیں کہ میں اپنے محبوب کے لئے خون کے آنسو پی رہا ہوں ۔حالانکہ وہ آرام سے زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں ۔نہ مر رہے ہوتے ہیں نہ خون کے آنسو پی رہے ہوتے ہیں ۔ان کا مطلب صرف اتنا ہوتا ہے کہ لوگوں کے جذبات کو ابھارا جائے چاہے وہ ابھارنا اچھے رنگ میں ہو یا برے رنگ میں ۔کبھی وہ خوشی کی باتیں کرتے ہیں اور کبھی غمی کی ۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۔فِیْ کُلِّ وَادٍ یَّھِیْمُوْنَ یعنی وہ ہر جنگل میں اور ہر وادی میں سرگردان پھرتے ہیں ۔ان کو کسی جگہ بھی جذبات کے ابھارنے کا سامان مل جائے چاہے کہیں سے ملے لے لیتے ہیں ۔وہ عاشقوں کو بھی خوش کرتے ہیں اور معشوقوں کو بھی ۔وہ غریبوں کو بھی خوش کرتے ہیں اور امیروں کو بھی ۔وہ مظلوموں کو بھی خوش کرتے ہیں اور ظالموں کو بھی ۔وہ غالب کو بھی خوش کرتے ہیں اور مغلوب کو بھی ۔ان کو تو ہر کسی کی خوشی مطلوب ہوتی ہے چاہے ان کو اپنے شعروں میں کتنا بھی جھوٹ کیوں نہ بولنا پڑے ۔وہ چاہتے ہیں کہ کوئی غریب ہمارے شعر پڑھے یا امیر۔ ظالم پڑھے یا مظلوم ۔عاشق پڑھے یا معشوق ،غالب پڑھے یا مغلوب سب کے سب خوش ہو جائیں چاہے ان کے اشعار حقیقت سے کتنے ہی دور ہوں ۔پس شعراء کا مقصد اور مدعا یہی ہوتا ہے کہ ہر خاص و عام ان سے خوش ہو جائے اور ان کے شعروں کی داد دے ۔چنانچہ کبھی وہ کسی امیر کی تعریف کرنے لگ جاتے ہیں اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ کچھ روپے مل جائیں یا کوئی وظیفہ مقرر ہو جائے ورنہ اس کی ذات سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی ۔لطیفہ مشہور ہے کہ ایک شخص نے جو سخت بھوکا تھا ایک دفعہ چند لوگوں کو جو اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھے کہیں جاتے دیکھا تو اس نے خیال کیا کہ یہ غالباً دعوت پر جا رہے ہیں میں بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاؤں ۔جب یہ کھانا کھانے لگیں گے تو میں بھی وہیں سے کھانا کھا لوں گا ۔چنانچہ وہ ان کے ساتھ شامل ہو گیا ۔جاتے جاتے وہ بادشاہ کے دربار میں جا پہنچے اور انہوں نے اس کی تعریف میں قصائد پڑھنے شروع کر دیئے ۔تب اسے پتہ لگا کہ یہ تو شاعر ہیں اور اپنے اپنے قصائد سنانے آئے ہیں ۔چنانچہ ہر شاعر نے اپنی اپنی باری پر اٹھ کر قصیدہ سنانا شروع کر دیا ۔یہ اب سخت حیران ہوا کہ میں کیا کروں ۔شعر کہنے کی اس میں قابلیت نہیں تھی ۔مگر طبیعت لطیفہ سنج تھی ۔جب سب شاعر اپنے اپنے قصائد سنا چکے اور بادشاہ سے انعام لے کر گھروں کو روانہ ہو گئے تو بادشاہ اس سے مخاطب ہوا اور کہنے لگا ۔اب آپ قصیدہ شروع

کریں وہ کہنے لگا حضور میں شاعر نہیں ہوں۔ بادشاہ نے پوچھا آپ یہاں کیوں آئے ہیں۔ وہ کہنے لگا۔ حضور میں وہی ہوں جس کا قرآن کریم میں اس طرح ذکر آتا ہے کہ وَ الشُّعَرَآءُ یَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ۔ شاعروں کے پیچھے غاوی آیا کرتے ہیں۔ وہ شاعر تھے اور میں غاوی ہوں۔ بادشاہ کو اس کا یہ لطیفہ پسند آ گیا اور اس نے حکم دے دیا کہ اسے بھی کچھ انعام دے دیا جائے۔ اب یہ ہے تو ایک لطیفہ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شاعروں کے پیچھے چلنے والے عموماً گمراہ لوگ ہی ہوتے ہیں کیونکہ شاعر کبھی کچھ کہہ دیتے ہیں کبھی کچھ۔ ان کا کوئی اصول نہیں ہوتا۔ کبھی ہزلیہ کلام سے لوگوں کو ہنساتے ہیں۔ کبھی شہادتِ امام حسینؓ کا واقعہ لکھ کر لوگوں کو رُلاتے ہیں۔ کبھی مدحیہ قصائد پڑھتے ہیں اور کبھی اس کی ہجو کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ غرض ہر جنگل میں سرگردان پھرتے ہیں۔ کوئی ایک مقصد اور مدعا لے کر کھڑے نہیں ہوتے مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو دنیا میں توحید پھیلانے کے لئے آیا ہے اور یہی ایک مقصد ہے جو رات اور دن اس کے دماغ پر حاوی رہتا ہے اور اسی کے لئے وہ تکلیفیں اٹھا رہا ہے۔ پھر تم یہ کس طرح کہہ سکتے ہو کہ یہ ایک شاعر ہے۔ اگر شاعر ہوتا تو اس کا بھی کوئی مقصد نہ ہوتا۔ جدھر لوگوں کی اکثریت ہوتی ادھر ہی چل پڑتا اور ان کو خوش کرنے کی کوشش کرتا۔ مگر اس نے تو سب دنیا کو اپنا مخالف بنا لیا ہے اور ہر ایک کو توحید کی طرف لانے کی کوشش کر رہا ہے پھر یہ شاعر کس طرح ہوا؟

پھر فرماتا ہے وَ اَنَّهُمْ یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ شاعروں میں ایک یہ بات بھی پائی جاتی ہے کہ ان کا قول اَور ہوتا ہے اور فعل اَور۔ اور وہ جو کچھ منہ سے کہتے ہیں عملاً وہ ایسا نہیں کرتے۔ یعنی اگر وہ اپنے اشعار میں لوگوں کو اخلاق حسنہ اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں تو خود شرابیں پیتے ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی نصیحت کرتے ہیں تو آپ نماز اور روزہ کے قریب بھی نہیں جاتے۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو قول ہے وہی اس کا عمل ہے اور جو بات اس کے عمل میں ہے۔ وہی اس کی زبان پر ہے۔ پس تمہارا یہ کہنا کہ محمد رسول اللہؐ ایک شاعر ہے محض حقائق پر غور نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ اگر تم غور کرو تو تمہیں نظر آ جائے گا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور شعراء کے کلام اور ان کے کردار میں بُعد المشرقین پایا جاتا ہے اور دونوں کی آپس میں کوئی نسبت ہی نہیں ہے۔

پھر فرماتا ہے اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ ذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِیْرًا وَّ انْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا۔ ہاں ان شاعروں کو ہم مستثنیٰ کرتے ہیں جو مومن ہیں اور مناسب حال عمل کرتے ہیں۔ وہ اگر شعر کہتے ہیں تو ان کا شعر حقیقت پر مبنی ہوتا ہے اور وہ وہی کچھ شعر میں کہتے ہیں جو عملی زندگی میں ان کے اندر پایا جاتا ہے۔ اس کی مثال کے طور پر ہم حضرت حسان بن ثابتؓ کے وہ اشعار پیش کرتے ہیں جو انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات

پر کہے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے ہیں تو انہوں نے اپنے درد اور کرب کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ

كُنْتَ السَّوَادَ لِنَاظِرِيْ فَعَمِيَ عَلَيَّ النَّاظِرُ
مَنْ شَآءَ بَعْدَكَ فَلْيَمُتْ فَعَلَيْكَ كُنْتُ أُحَاذِرُ

(دیوان حسان بن ثابت الانصاری صفحہ ۳۰۸)

یعنی اے محمدؐ رسول اللہ! تُو تو میری آنکھوں کی پتلی تھا آج تیرے مرنے سے میری آنکھیں اندھی ہو گئیں۔ اب خواہ کوئی مرے۔ میرا باپ مرے۔ میری ماں مرے۔ بیوی مرے۔ بھائی مرے۔ بیٹا مرے۔ مجھے ان میں سے کسی کی موت کی پرواہ نہیں مَیں تو تیری موت سے ہی ڈرا کرتا تھا۔ حضرت حسان بن ثابتؓ جنہوں نے یہ شعر کہے۔ وہ خود بھی نیک تھے اور ان کے یہ اشعار بھی حقیقت پر مبنی تھے۔ پس یقیناً ایسے لوگ پہلے گروہ میں شامل نہیں۔

پھر فرمایا۔ ان کی عادت میں یہ بات داخل ہوتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کثرت سے ذکر کرتے ہیں۔ اور غیر مومن شاعروں کی طرح صرف مونہہ سے یہ نہیں کہتے رہتے کہ ہم اپنے محبوب کے لئے یہ یہ قربانیاں کریں گے بلکہ جب دین کے بارہ میں ان پر ظلم کیا جاتا ہے تو وہ عملاً اس کا بدلہ لیتے ہیں اور ثابت کر دیتے ہیں کہ جس فدائیت کا انہوں نے اپنے شعروں میں ذکر کیا تھا عملاً بھی وہ فدائیت ان کے اندر پائی جاتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ان کا یہ رویہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے مخالف پر ظلم کریں بلکہ وہ ہمیشہ ظلم کے بعد بدلہ لیتے ہیں خود کسی دوسرے پر ظلم نہیں کرتے۔

اس آیت میں بھی اور قرآن کریم کی متعدد دوسری آیات میں بھی اللہ تعالیٰ نے ایمان کے ساتھ عمل صالح کو لازمی قرار دیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض دفعہ منافق بھی زبان سے کہہ دیتا ہے کہ میں ایمان لایا ہوں یا میں خدا تعالیٰ اور اس کی شریعت کو مانتا ہوں اور لوگ بھی اس کے اس ظاہری قول کے مطابق یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ وہ مومن ہے۔ حالانکہ نہ تو وہ خود اپنے دل میں اسلام کو مان رہا ہوتا ہے اور نہ ہی خدا تعالیٰ اس کے اس ایمان کو تسلیم کرتا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ بعض دفعہ لوگ تیرے پاس آتے ہیں اور قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ تُو اللہ کا رسول ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم بھی گواہی دیتے ہیں کہ تو اللہ کا رسول ہے۔ مگر یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں صرف زبان سے ہی کہتے ہیں ان کے دل میں ایمان نہیں (المنافقون: ۲)۔ اس کے مقابلہ میں بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے دل میں تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ایمان کی حقیقت کو پوری طرح جانتے ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں جانتے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے۔ جیسے بعض باتیں جو اشاروں

میں کہی جاتی ہیں ان کے متعلق بعض دفعہ دوسرا سمجھتا ہے کہ میں نے فلاں کے اشارے کو سمجھ لیا ہے اور اشارہ کرنے والا بھی سمجھتا ہے کہ دوسرے نے میرا اشارہ سمجھ لیا ہے۔لیکن جب بات کھلتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ دونوں نے ایک دوسرے کے مطلب کو نہیں سمجھا تھا۔لطیفہ مشہور ہے کہ اکبر بادشاہ کے دربار میں ایک دفعہ ایران کا کوئی صوفی آیا۔ اور اس نے کہا آپ اپنے علماء کو بلائیں میں ان سے کچھ سوال کرنا چاہتا ہوں۔اکبر نے علماء کو بلوایا۔جب وہ پہنچ گئے تو اس صوفی نے اشارے کرنے شروع کر دیئے۔اکبر نے کہا یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔کوئی بات کریں جس کی سمجھ بھی آسکے۔صوفی نے کہا باتیں تو جہلاء بھی کر لیتے ہیں۔علماء کا کام تو صرف اشارے سمجھنا ہے۔اگر یہ اشارے نہ سمجھ سکیں تو علماء کیسے ہوئے۔آخر جب علماء ان اشاروں کو نہ سمجھ سکے تو ان کو مقابلہ سے عاجز سمجھا گیا۔اور کہا گیا کہ یہ ہار گئے ہیں۔اس پر ملّا ابوالحسن بن ابومحاسن جو ملّا دوپیازہ کے نام سے مشہور ہے اٹھا۔اور اس نے کہا۔میں اس صوفی کے ساتھ مقابلہ کرتا ہوں۔بادشاہ نے ایرانی صوفی سے کہا۔اب کوئی سوال کرو۔صوفی نے ہاتھ کی ایک انگلی دکھائی ملّا دوپیازہ نے اس کے جواب میں دو انگلیاں دکھا دیں۔صوفی نے ہاتھ کی انگلیاں کھول کر پنجہ دکھایا۔اس کے جواب میں ملّا دوپیازہ نے مٹھی بند کر کے مکّا دکھا دیا۔اس کے بعد صوفی نے زمین پر ایک گول دائرہ بنایا۔اور ملّا دوپیازہ نے اس گول دائرہ کے درمیان ایک نقطہ لگا دیا۔اس پر وہ صوفی کہنے لگا۔واقعی یہ شخص قابل ہے۔اور میں اس کے سامنے اب کوئی سوال نہیں کر سکتا۔لوگوں نے صوفی سے پوچھا۔کہ تمہارا انگلی دکھانے سے کیا مطلب تھا۔اس نے کہا میرا یہ مطلب تھا کہ اللہ ایک ہے اور ملّا دوپیازہ نے اس کا بالکل ٹھیک جواب دیا کہ اللہ تو ایک ہے مگر اس کے ساتھ اس کا رسول بھی ہے۔پھر میں نے پانچ انگلیاں دکھائیں جس سے میرا یہ مطلب تھا کہ پنج تن ہی ہیں جن پر اسلام کی بنا ہے۔اس کے جواب میں ملّا دوپیازہ نے کہا کہ واقعی پنج تن ہیں لیکن حقیقت میں وہ ایک ہی ہیں اور اس کے مکا دکھانے کا یہی مطلب تھا۔پھر میں نے زمین پر گول دائرہ بنایا۔جس کا مطلب یہ تھا کہ زمین گول ہے۔اس کے جواب میں ملّا دوپیازہ نے اس میں نقطہ لگا کر یہ کہا کہ زمین تو گول ہے مگر وہ اپنے محور کے گرد گھومتی ہے۔جب ملّا دوپیازہ سے پوچھا گیا کہ تم نے کیا سمجھا تھا۔تو اس نے کہا کہ جب صوفی نے ایک انگلی دکھائی تو میں یہ سمجھا کہ یہ کہتا ہے کہ میں تیری ایک آنکھ پھوڑ دوں گا۔اس پر میں نے اس کے جواب میں دو انگلیاں دکھا کر کہا کہ میں تیری دونوں آنکھیں پھوڑ دوں گا۔پھر اس نے پنجہ دکھایا تو میں نے سمجھا کہ یہ مجھے کہتا ہے کہ میں تیرے منہ پر تھپڑ ماروں گا۔میں نے اس کے جواب میں کہا کہ میں تمہیں گھونسہ ماروں گا۔پھر اس نے زمین پر جب گول دائرہ بنایا۔تو میں نے سمجھا کہ یہ کہتا ہے کہ انسان کے لئے روٹی ضروری چیز ہے۔اس پر میں نے درمیان میں نقطہ لگا کر کہا کہ صرف روٹی

سے کچھ نہیں بنتا ساتھ پیاز بھی ہونا چاہیے۔

اسی طرح ایک شخص زبان سے تو کہہ دیتا ہے کہ میں ایمان لایا اور وہ سمجھتا بھی یہی ہے کہ میں ایمان کی حقیقت سے واقف ہوں مگر وہ ایمان کی حقیقت کو نہیں سمجھ رہا ہوتا۔ پس ایک ایمان تو اس قسم کا ہوتا ہے کہ ایک شخص منافقانہ طور پر صرف زبان سے کہتا ہے میں ایمان لے آیا اور اس کے قول کے مطابق لوگ بھی سمجھنے لگ جاتے ہیں کہ یہ ایمان لے آیا ہے مگر خدا تعالیٰ اس کے ایمان کی حقیقت کو اچھی طرح جانتا ہے اور وہ منافق بھی اپنے دل میں کہتا ہے کہ میں تمسخر کر رہا ہوں۔لیکن دوسرا ایمان اس قسم کا ہوتا ہے کہ ایک شخص سمجھتا ہے کہ میں اچھی طرح ایمان کی حقیقت کو سمجھتا ہوں مگر دراصل وہ کچھ بھی نہیں سمجھا ہوتا۔ اس کے مقابلہ میں تیسری قسم کا ایمان یہ ہے کہ ایک شخص فی الحقیقت ایمان کو سمجھ جاتا ہے اور لوگ بھی کہتے ہیں یہ ایماندار ہے اور اللہ تعالیٰ بھی کہتا ہے کہ یہ ایماندار ہے۔ اس کی مثال اس درخت کی سی ہوتی ہے جس کی جڑ زمین کے اندر دور تک چلی گئی ہو اور کسی قسم کی آندھیاں اس پر اثر انداز نہ ہوسکیں۔ پہلی قسم کے ایمان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے کوئی چھوٹا سا پودا اکھیڑ کر ہاتھ میں پکڑا ہوا ہو۔ اور اس کی جڑوں کا زمین کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو۔ اور دوسری قسم کے ایمان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک درخت بظاہر زمین میں لگا ہوا ہو مگر اس کی جڑیں بالکل زمین کی اوپر والی مٹی میں ہوں۔ اور وہ کسی کے ذرا سے دھکے کے ساتھ ہی زمین پر آرہے اور تیسری قسم کے ایمان کی مثال ایسی ہے۔ جیسے ایک بڑا تناور درخت ہو۔ اور اس کی جڑیں بھی پاتال تک چلی گئی ہوں۔ یہی اصل ایمان ہے جو انسان کی نجات کا موجب بنتا ہے اور اس ایمان کے ساتھ عمل صالح کا ہونا بھی ضروری ہے۔لیکن یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارے ہاں جن باتوں کو نیک عمل کہتے ہیں یا انگریزی میں جنہیں گڈ ایکشنز (Good actions) کہتے ہیں قرآن کریم انہیں عمل صالح قرار نہیں دیتا۔ سارے قرآن میں شاذ و نادر کے طور پر شاید ہی کسی ایک مقام پر نیک عمل کے لئے خیر کا لفظ استعمال ہوا ہو تو ہوا ہو۔ ورنہ قرآن کریم ہمیشہ عمل صالح کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک نیکی وہی ہے جو مطابق حالات ہو۔ اور اگر حالات کے مطابق کوئی عمل نہ ہو تو وہ عمل صالح نہیں کہلائے گا۔ مثلاً اگر لوگوں سے دریافت کیا جائے کہ نیک عمل کون سے ہیں تو وہ کہیں گے۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور جہاد وغیرہ۔ حالانکہ قرآن کریم سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ بعض نمازیں بری ہوتی ہیں۔ اسی طرح روزے اور بعض صدقہ و خیرات انسان کو ثواب پہنچانے کی بجائے اسے خدا تعالیٰ کی ناراضگی کا مورد بنا دیتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ خالی نماز نیک عمل نہیں۔ اگر خالی نماز نیک عمل ہوتا تو وَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ (الماعون:۵) کیوں آتا۔ اور کیوں اللہ تعالیٰ فرماتا کہ بعض نمازیں پڑھنے والے جو ریاء کے لئے

پڑھتے ہیں جو اس لئے پڑھتے ہیں کہ لوگ کہیں یہ بڑے بزرگ ہیں ۔یہ بڑے زاہد اور عابد ہیں ۔ ان پر ہماری لعنت ہوتی ہے ۔اسی طرح بعض روزے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا انسان کو مورد بنا دیتے ہیں ۔مثلاً انسان عید کے دن روزہ رکھے تو وہ اسلامی نقطہ نگاہ سے شیطان بن جائے گا (بخاری کتاب الاضاحی ،باب ما یؤکل من لحوم الاضاحی) ۔ یا حج ہے ۔اگر انسان ایسی حالت میں کرے جب اس میں حج کی شرائط نہ پائی جاتی ہوں ۔ یا زکوٰۃ ایسی حالت میں دے جبکہ زکوٰۃ اس پر فرض نہ ہو تو یہ اعمال صالح نہیں کہلا سکتے ۔عمل صالح وہی عمل ہے جو مطابق حالات اور موقع کے مناسب ہو ۔اسی لئے خدا تعالیٰ نے بار بار قرآن کریم میں ایمان کے ساتھ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کا ذکر کیا ہے ۔لوگ غلطی سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ نماز نجات دلائے گی ۔ یا روزہ نجات دلائے گا ۔ یا حج نجات دلائے گا یا زکوٰۃ نجات دلائے گی ۔حالانکہ نماز وہ نجات دلا سکتی ہے جو نماز پڑھنے کے موقعہ پر پڑھی جائے ۔ اگر کسی وقت کفار سے جہاد ہو رہا ہو ۔لڑائی لڑی جا رہی ہو ۔مسلمان مارے جا رہے ہوں ۔کفار بڑھتے چلے آ رہے ہوں اور کوئی شخص مصلّٰی بچھا کر نماز پڑھنے لگ جائے ۔تو ہم کہیں گے اس کی نماز کوئی نماز نہیں ۔اس وقت جہاد کا کام کرنے کا وقت تھا ۔مصلّٰی پر بیٹھ کر تسبیح پھیرنے کا وقت نہیں تھا ۔اسی طرح اگر کوئی شخص نماز کے وقت نماز نہ پڑھے اور کہے میں جہاد کے لئے چلا ہوں تو ہم کہیں گے وہ نماز سے بچنے کا بہانہ تلاش کر رہا ہے غرض اپنی ذات میں نہ نماز نجات دلا سکتی ہے ۔نہ روزہ نہ زکوٰۃ نہ حج نہ جہاد ۔ بلکہ جو نیک کام بھی موقع اور محل کے مطابق ہو وہی انسان کے کام آتا ہے ۔

مومنوں کی دوسری خصوصیت اس آیت میں بتائی گئی ہے کہ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا ۔ وہ اللہ تعالیٰ کا بڑی کثرت کے ساتھ ذکر کرتے ہیں ۔ چونکہ دنیا میں بعض طبائع ایسی ہوتی ہیں جو صرف اس وقت ذکر کی طرف توجہ قائم رکھ سکتی ہیں ۔جب وہ اکیلے ذکر میں مشغول ہوں اور بعض طبائع ایسی ہوتی ہیں جو دوسروں کو ذکر کرتا دیکھیں تب ان میں ذکر کرنے کا جوش پیدا ہوتا ہے ۔اس لئے اللہ تعالیٰ نے انفرادی اور جماعتی دونوں قسم کے ذکر نمازوں میں جمع کر دیئے ہیں ۔ چنانچہ ظہر اور عصر کی نمازیں اس طرح پڑھی جاتی ہیں کہ ہر شخص اپنا اپنا ذکر کر رہا ہوتا ہے ۔امام اپنے طور پر خاموشی سے ذکر کر رہا ہوتا ہے اور مقتدی خاموشی سے اپنے طور پر ذکر کر رہے ہوتے ہیں ۔لیکن مغرب عشاء اور فجر کے وقت اللہ تعالیٰ نے یہ طریق مقرر کر دیا کہ جب امام سورۃ فاتحہ پڑھے تو تم بھی سورۃ فاتحہ پڑھو ۔مگر جب وہ قرآن پڑھے تو تم خاموش رہو ۔غرض نماز میں بھی اللہ تعالیٰ نے ایسا طریق رکھا ہے کہ بعض جگہ لوگوں کو کلیۃً امام کے تابع کر دیا ہے ۔امام کہتا ہے اللہ اکبر تو مقتدی بھی کہتا ہے اللہ اکبر ۔امام رکوع میں جاتا ہے ۔تو مقتدی بھی رکوع میں

چلا جاتا ہے۔امام سجدہ میں جاتا ہے تو مقتدی بھی سجدہ میں جھک جاتا ہے۔لیکن جو خاموشی کا حصہ ہوتا ہے اس میں ہر شخص آزاد ہوتا ہے۔مقتدی کوئی دعا مانگ رہا ہوتا ہے اور امام کوئی دعا مانگ رہا ہوتا ہے۔اس طرح اللہ تعالیٰ نے دونوں طبائع کا علاج کر دیا۔ان کا بھی جو دوسروں کو ذکر میں مشغول دیکھ کر ذکر کرنے کی عادی ہوتی ہیں اور ان کا بھی جنہیں اس وقت عبادت میں لذت آتی ہے جب وہ علیحدہ ہوں۔چنانچہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں مجلس میں دعا کرتے وقت رقّت آتی ہی نہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ جونہی وہ کسی کی چیخ سنتے ہیں۔ان کی بھی چیخیں نکل جاتی ہیں پہلے انہیں جوش نہیں آتا۔لیکن دوسرے کی گریہ وزاری دیکھ کر انہیں بھی رونا آجاتا ہے۔لیکن کامل مومن وہ ہوتا ہے کہ جب وہ علیحدہ بیٹھتا ہے تب بھی خدا تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے اور جب مجلس میں بیٹھتا ہے تب بھی اس کا ذکر کرتا ہے۔اسی وجہ سے اسلام نے انفرادی ذکر پر بھی بڑا زور دیا ہے اور اجتماعوں کے مواقع پر بھی ذکرِ الٰہی پر زور دیا ہے۔چنانچہ مسلمان جب حج کے لئے جاتے ہیں تو وہاں بھی ذکرِ الٰہی ہوتا ہے۔عیدین کے لئے جاتے ہیں تو وہاں بھی ذکرِ الٰہی ہوتا ہے۔شادی اور بیاہ کے لئے جاتے ہیں تو وہاں بھی ذکرِ الٰہی ہوتا ہے۔جنازہ کے لئے جاتے ہیں تو وہاں بھی ذکرِ الٰہی ہوتا ہے۔گویا ہر قسم کے اجتماعوں کو بابرکت بنانے کا نسخہ اسلام نے یہی بتایا ہے کہ ذکرِ الٰہی پر زور دیا جائے۔اس کے مقابلہ میں انفرادی ذکر کی اہمیت بھی اسلام نے بار بار بتائی ہے۔یہاں تک کہ کھانا کھاتے وقت۔کھانے سے فارغ ہوتے وقت،سوتے وقت جاگتے وقت۔سفر پر جاتے وقت۔سفر سے آتے وقت۔غم کے وقت خوشی کے وقت۔مسجد میں آتے وقت اور مسجد سے جاتے وقت۔بلندی پر چڑھتے وقت اور بلندی سے اترتے وقت۔اسی طرح آئینہ دیکھتے وقت۔کپڑے بدلتے وقت۔نیا چاند دیکھتے وقت۔یہاں تک کہ بیوی کے پاس جاتے وقت بھی دعاؤں اور ذکرِ الٰہی کی تاکید کی ہے۔اور پھر فرمایا ہے کہ ہر کام شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ پڑھ لیا کرو۔ورنہ تمہارا کام بے برکت ہو جائے گا(ترمذی ابواب الاطعمة، ابواب الدعوات، ابواب اللباس و بخاری کتاب الدعوات و کتاب الجہاد و السیر)۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام نے یہ بھی کہا ہے کہ ہر نماز کے بعد تینتیس دفعہ سُبْحَانَ اللّٰہِ تینتیس دفعہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اور چونتیس دفعہ اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہہ لیا کرو۔مگر اسلام نے یہ بھی کہا ہے کہ مومن کثرت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں اور وہ صرف تینتیس یا چونتیس دفعہ تسبیح و تحمید کرنے پر اکتفاء نہیں کرتے بلکہ بات بات پر وہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سُبْحَانَ اللّٰہِ یا اَللّٰہُ اَکْبَر کہتے رہتے ہیں۔اور درحقیقت اگر غور سے کام لیا جائے تو یہ دونوں باتیں ہی ضروری تھیں۔کیونکہ عشق میں انسان کی دونوں حالتیں ہوتی ہیں۔عشق میں ایک حالت تو وہ ہوتی ہے جب انسان اور کاموں سے فارغ ہو کر اپنے محبوب سے باتیں کرنے میں مشغول ہو جاتا ہے

۔اور عشق کی دوسری حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ خواہ اَور کاموں میں مشغول رہے اس کا دل اپنے محبوب کی طرف ہی رہتا ہے۔ پس عشق دونوں باتوں کا تقاضا کرتا ہے۔ عشق یہ بھی چاہتا ہے کہ عاشق اپنے معشوق کے لئے اور کاموں سے فارغ ہوجائے۔ اور عشق یہ بھی چاہتا ہے کہ عاشق اپنے معشوق کا ہروقت ذکر کرتا رہے۔ پس چونکہ یہ دونوں چیزیں ضروری ہیں اس لئے اسلام نے بعض جگہ تسبیح وتحمید کی ایک معین مقدار بھی مقرر کردی اور پھر یہ بھی کہہ دیا کہ مومن صرف اس تعداد پر انحصار نہیں رکھتے بلکہ وہ اٹھتے بیٹھتے اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اور ہروقت ان کی زبانیں ذکر الٰہی سے تر رہتی ہیں۔ اس طرح یہ دونوں چیزیں مل کر ایک مومن کے عشق کو مکمل کرتی ہیں۔ اگر اسے یہی خیال آتا رہے کہ میں فلاں وقت میں ذکر کروں گا آگے پیچھے نہیں کروں گا تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ وہ اپنے اوقات کو کلی طور پر خدا تعالیٰ کی یاد میں صرف کرنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ اس بات کا منتظر رہتا ہے کہ مقررہ وقت آئے تو وہ ذکر کرے۔ حالانکہ مومن وہی ہے جو ہر حالت میں خدا تعالیٰ کو یاد رکھتا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کسی بزرگ کا یہ مقولہ سنایا کرتے تھے کہ ’’دست در کار و دل بایار‘‘ یعنی انسان کے ہاتھ تو کاموں میں مشغول ہونے چاہئیں لیکن اس کا دل خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ اسی طرح ایک بزرگ کے متعلق مشہور ہے کہ ان سے کسی نے پوچھا کہ میں کتنی دفعہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا کروں۔ تو انہوں نے کہا کہ ’’محبوب کا نام لینا اور پھر گن گن کر‘‘۔ تو اصل ذکر وہی ہے جو اَن گنت ہو۔ مگر ایک معین وقت مقرر کرنے میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ انسان اس وقت اپنے محبوب کے لئے اور کاموں سے بالکل الگ ہوجاتا ہے۔ اور چونکہ یہ دونوں حالتیں ضروری ہیں اس لئے صحیح طریق یہی ہے کہ معین رنگ میں بھی ذکر الٰہی کیا جائے اور غیر معین طور پر بھی اُٹھتے بیٹھتے اللہ تعالیٰ کو یاد کیا جائے۔ اور اس کے فضلوں اور احسانات کا بار بار ذکر کیا جائے۔

تیسری خصوصیت اللہ تعالیٰ نے اس جگہ مومنوں کی یہ بتائی ہے کہ وَانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ۔ وہ خود تو کسی پر ظلم نہیں کرتے لیکن اگر کوئی دوسرا ان پر ظلم کرے تو پھر وہ پیچھے نہیں ہٹتے بلکہ دلیری سے ظالم کا مقابلہ کرتے ہیں۔ چونکہ یہ سورۃ مکی ہے جب کہ ابھی جہاد کا حکم نازل نہیں ہوا تھا اس لئے درحقیقت اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ پیشگوئی فرمائی ہے کہ اس وقت تو مسلمان دشمن کے ظلم وستم سہہ رہے ہیں لیکن مت سمجھو کہ دشمن کے یہ مظالم رائیگاں چلے جائیں گے۔ بلکہ ایک دن آئے گا کہ ہم انہی مظلوم اور بے کس بندوں کو دشمن کے مقابلہ کی اجازت دے دیں گے۔ مگر اس وقت بھی یہ اپنے دشمن پر کوئی ظلم نہیں کریں گے بلکہ صرف جائز حد تک اس کے مظالم کا انتقام لیں گے۔ اور پھر آخر میں سب سے بڑی دلیل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی اللہ تعالیٰ یہ دیتا ہے کہ وَسَيَعْلَمُ

الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۔ وہ لوگ جو ظلم کر رہے ہیں عنقریب جان لیں گے کہ ان کا انجام کیسا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے نبیوں اور شیطان کے بندوں میں یہ فرق ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو ہر امر پر قادر ہے اپنے بندوں کی مدد کرتا ہے۔ لیکن شیطان ایسا نہیں کرسکتا۔ پس عنقریب خدا تعالیٰ اپنی مدد کو ظاہر کر دے گا اور اسلام کے ظالم معترض دیکھ لیں گے کہ ان کا آخری ٹھکانہ کہاں ہے اور اس طرح دنیا کو پتہ لگ جائے گا کہ آیا وہ شیطان کے پیچھے چل رہے تھے یا مسلمان شیطان کے پیچھے چل رہے تھے۔

انڈیکس

جلد نہم

✡✡✡✡✡✡

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

اشاریہ کلیدِ مضامین

و

ہ

ی

اسماء

مقامات

حل اللغات

☆☆☆☆☆

کلیدِ مضامین

مرتبہ۔ سید عبدالحیٔ۔

آ

اِ

دیگر ادیان سے موازنہ

صداقت

غلبہ

اشاعت

تاریخ

تلقین و نصیحت

قربانیوں کی اہمیت

تربیت

جنّ

جنت

جنگ

جنگِ عظیم دوم ۴۲

جنگِ یرموک

جنون

ح

ص

ف

ق

☆☆☆☆☆

اسماء

آ

ا

ن

و

ہ

ی

☆☆☆☆☆

مقامات

گ

ل

م

☆☆☆☆☆

حلّ اللّغات

ا

ب

ت

ث

ج

☆☆☆☆☆

کتابیات

BIBLIOGRAPHY

تفسیر

تفسیر ابن کثیر

معالم التنزیل

تفسیر المنار مصنفہ علامہ رشید رضا

کمنٹری آن دی قرآن از ریورنڈ وہیری

تفسیر جلالین

تفسیر الدر المنثور

تفسیر روح المعانی

فتح البیان

التفسیر الکبیر للامام الفخر الرازی

تفسیر الکشاف

تفسیر البحر المحیط

تفسیر القرطبی

حقائق الفرقان

ترجمۃ القرآن از پادری سیل

حدیث

جامع صحیح البخاری

صحیح مسلم

مشکاۃ المصابیح

سنن ابی داؤد

سنن الترمذی

مسند احمد بن حنبل

کنز العمال

ریاض الصالحین

موضوعاتِ کبیر

نصب الرایۃ تخریج احادیث الھدایۃ

فقہ

کتاب الخراج للامام ابی یوسف

ادب

تاریخ الادب العربی للزّیات

کتب حضرت مسیح موعود علیہ السلام

تذکرۃ الشہادتین

اعجاز المسیح

انجام آتھم

ازالہ اوہام

تحفہ قیصریہ

تریاق القلوب

سرمہ چشم آریہ

کتاب البریہ

آئینہ کمالات اسلام

چشمہ معرفت

حقیقۃ الوحی

براہین احمدیہ

تذکرہ مجموعہ الہامات حضرت مسیح موعود علیہ السلام

ملفوظات
مجموعہ اشتہارات
تحفہ گولڑویہ

سیرت و تاریخ

حیاتِ احمد
اصحاب احمد
سیرۃ المہدی
سیرت حضرت مسیح موعودؑ از شیخ یعقوب علی
المواھب اللدنیۃ
البدایۃ والنھایۃ
الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب
اسد الغابۃ
تاریخ بغداد للخطیب بغدادی
السیرۃ النبویۃ لابن ھشام
الکامل فی التاریخ لابن اثیر
تاریخ ابن خلدون
بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد
الفخری
زاد المعاد
مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ۔ ڈاکٹر حمید اللہ
الفاروق مصنفہ علامہ شبلی نعمانی
تاریخ التمدن الاسلامی از جرجی زیدان
تاریخ عرب مصنفہ پروفیسر ہٹی
اخبار اندلس ترجمہ تاریخ اندلس از سکاٹس
اسباب بغاوتِ ہند مصنفہ سر سید احمد خاں
السیرۃ الحلبیۃ
لائف آف محمد مصنفہ سر ولیم میور
اَلْاِصَابَۃ
تذکرۃ الاولیاء مصنفہ رئیس احمد جعفری
مشاہیر اسلام شائع کردہ ادارہ صوفی
تاریخ الطبری
تاریخ الخمیس
تاریخ فرشتہ
فتوح الشام مصنفہ ابو اسماعیل
- History of the Saracens by Syed Ameer Ali

اسلامیات

فوائد المجموعہ مصنفہ علامہ شوکانی
کتاب الشفاء لقاضی عیاض
مکتوبات امام ربانی دفتر اول حصہ چہارم
کلیات ابی البقاء
مثنوی مولانا روم
تاریخ ارض القرآن سید سلیمان ندوی
تعطیر الانام
تذکرۃ الاولیاء

کتب اہلِ کتاب

بائبل (عہد نامہ قدیم وجدید)
تفسیر بائبل مصنفہ میتھیو پول
- The Text & Canon of the New Testament by dr. Alexander Souter, Ma. LLB
- Encyclopedia of Religion & Ethics

کتب ہندومت

وید
شریمد بھاگوت پران

برہم دی ورت پران

متفرق

سید احمد شہید از غلام رسول
دیوان غالب
دیوان حافظ شیرازی
دیوان حسان بن ثابت
انوار حقیقت مترجم ستیارتھ پرکاش
اورنگزیب از رشید اختر ندوی

- Mohammad and Teachings of Quran NL 3000 Proverbs by Sam Philips.
- Anecdotes of Aurangzeb by Sir Jadunath Sarkar.
- Preachings of Islam by Sir Thomas Arnold.
- A New Account of the East Indies.

کتاب المغازی للواقدی

لغت

اقرب الموارد
لسان العرب
تاج العروس
المفردات فی غریب القرآن للامام راغب اصفہانی
انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا + ببلیکا
جیوش انسائیکلوپیڈیا
نیلسنز انسائیکلوپیڈیا
اردو لغت

اخبارات و رسائل

اشاعۃ السنۃ
روزنامہ الفضل ۲۰/نومبر ۱۹۲۴
شیرِ پنجاب (سکھ اخبار)
بدر ۱۰/جولائی ۱۹۰۷ء
الحکم ۲۸/فروری ۱۹۰۳ء
الحکم ۲۴/نومبر ۱۹۰۷ء
الفضل ۱۵/ستمبر ۱۹۴۴ء
الفضل ۱۳ / دسمبر ۱۹۱۴ء
الفضل ۱۵ / مارچ ۱۹۳۰ء
اخبار الفضل قادیان ۱۹ / جولائی ۱۹۲۹ء
اخبار عام لاہور مورخہ ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء

☆☆☆☆☆